افلا یتدبرون القرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

الانعام ٦ — التوبۃ ٩

تدبرِ قرآن —————— جلد سوم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

جلد سوم

تفاسیر

سورۂ انعام (۶) ——— تا ——— سورۂ توبہ (۹)

امین احسن اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ——— پاکستان

اہتمام — حسن خاور

مطبع — کیو۔ وائی پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

تدبرِ قرآن

٦

الانعام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورتوں کے دوسرے گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ مائدہ پر، جیسا کہ ہم مقدمے میں واضح کر چکے ہیں، سورتوں کا پہلا گروپ تمام ہوا۔ اب یہ انعام سے دوسرا گروپ شروع ہو رہا ہے۔ اس میں چار سورتیں ہیں۔ انعام، اعراف، انفال، برأت۔ انعام اور اعراف کی ہیں، انفال اور برأت مدنی۔ انعام و اعراف دونوں میں خطاب اہلِ مکہ سے ہے۔ انعام میں توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی مسائل زیرِ بحث آئے ہیں اور اصل دینِ ابراہیمؑ کی وضاحت کی گئی ہے۔ بنائے استدلال تمام تر عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے شواہد پر ہے یا پھر ان مسلمات پر جن کو اہلِ عرب تسلیم بھی کرتے تھے اور جو صحیح بھی تھے۔

اعراف میں انذار کا پہلو غالب ہے۔ اس میں قریش پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ کسی قوم کے اندر ایک رسول کی بعثت کے مقتضیات و تضمنات کیا ہوتے ہیں، اس باب میں اللہ تعالیٰ کے قاعدے اور ضابطے کیا ہیں، اگر کوئی قوم اپنے رسول کی تکذیب پر جم جاتی ہے تو اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں، اس معاملے میں تاریخ کی شہادت کیا ہے اور اگر وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی اس روش سے باز نہ آئے تو اسے اپنے لیے کس روزِ بد کا انتظار کرنا چاہیے۔

انفال میں مسلمانوں کو اپنی کمزوریاں دور کر کے اللہ اور رسول کی اطاعت پر مجتمع ہونے اور کفارِ قریش سے جہاد پر ابھارا ہے۔ قریش کے متعلق صاف صاف یہ اعلان فرمایا ہے کہ ان کو بیت اللہ پر قابض رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس وراثتِ ابراہیمی کے حق دار مسلمان ہیں نہ کہ قریش۔ مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ تم ان سے مرعوب نہ ہو، اب ان کے لیے ذلت اور عذاب کا وقت آ چکا ہے۔ اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو منہ کی کھائیں گے اور دنیا و آخرت دونوں میں کوئی بھی ان کو پناہ دینے والا نہیں ہوگا۔

سورۂ برأت میں کھلم کھلا قریش کو الٹی میٹم ہے۔ ان کے لیے صرف دو راہیں کھلی چھوڑی گئی ہیں۔ اسلام یا تلوار۔ مسلمانوں کو ان سے ہر قسم کے روابط قطع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جو مسلمان رشتہ و قرابت کی بنا پر ان سے درپردہ تعلق رکھتے تھے ان کو سخت سرزنش کی گئی ہے اور ان کے سامنے بھی واضح طور پر دو شکلیں رکھ دی گئی ہیں، یا تو اپنے آپ کو نفاق کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے سچے اور پکے مسلمان بن جائیں یا پھر اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں جو اللہ و رسولؐ کے ان دشمنوں کا ہونے والا ہے۔

اس روشنی میں اگر تدبر کے ساتھ آپ اس گروپ کی تلاوت کریں گے تو معلوم ہو گا کہ ان چاروں سورتوں میں نہایت گہری حکیمانہ ترتیب ہے۔ انعام میں قریش پر اتمامِ حجت ہے، اعراف میں ان کو انذار ہے، انفال میں مسلمانوں کو جہاد کی تیاری کی ہدایت اور بیت اللہ کی تولیت سے قریش کی معزولی کا فیصلہ ہے۔ برأت میں قریش کو الٹی میٹم اور منافقین کو آخری تہدید ہے۔

پہلے گروپ میں اصل بحث اہلِ کتاب سے تھی، قریش سے اگر کہیں خطاب ہُوا تھا تو ضمناً۔ برعکس اس کے اس گروپ میں اصل خطاب قریش سے ہے۔ اہلِ کتاب کا اس میں ذکر آیا ہے تو ضمناً۔ موادِ استدلال میں بھی مخاطب کے اختلاف کے لحاظ سے بنیادی فرق ہے۔ اس گروپ میں بیشتر استدلال عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے شواہد سے ہے اور پہلے گروپ میں اہلِ کتاب کے تعلق سے وہ ساری چیزیں استدلال کے طور پر استعمال ہُوئی ہیں جن کو اہلِ کتاب مانتے تھے۔ پہلے گروپ میں اہلِ کتاب کو امامت کے منصب سے معزول کیا گیا ہے اور ان کی جگہ مسلمانوں کو دی گئی ہے۔ اس گروپ میں قریش کو بیت اللہ کی تولیت سے معزول کیا گیا ہے اور اس کی خدمت امتِ مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے۔

یہ پورے گروپ پر ایک اجمالی تبصرہ ہُوا۔ اب ہم اس کی ایک ایک سورہ کو الگ الگ لے کر اس کی تفسیر کریں گے۔ گروپ کی پہلی سورہ انعام ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر اس کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وبیدہ اللہ التوفیق۔

ب ۔ سورہ کا عمود

سورۂ انعام میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مخاطب قریش ہیں۔ ان کے سامنے توحید، معاد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے دلائل واضح کرتے ہُوئے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ ہے کہ اگر انھوں نے یہ دعوت قبول نہ کی تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے ان کو تیار رہنا چاہیے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کو دوچار ہونا پڑا۔ اہلِ عرب چونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جس مذہب پر وہ ہیں یہ ان کو حضرت ابراہیم ہی سے وراثت میں ملا ہے اس وجہ سے اس سورہ میں اس حجت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی تاکہ قریش پر یہ واضح ہو جائے کہ اصل ملتِ ابراہیم کیا ہے اور اس کے حقیقی پیرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ ہیں یا قریش ـــــ سورہ کے اس عمود کو پیشِ نظر رکھتے ہُوئے اب ایک اجمالی نظر سورہ کے مطالب پر ڈال لیجیے۔

ج ۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ ـ ۵) توحید اور معاد کے بعض واضح دلائل کی طرف اشارہ۔ بالکل بدیہی حقائق سے اعراض پر اظہارِ تعجب۔ قرآن کی تکذیب ایک امرِ حق کی تکذیب ہے جس کا خمیازہ یہ بھگتیں گے۔ قرآن انھیں جن نتائج کی خبر دے رہا ہے وہ سب پیش آکے رہیں گے۔

(۶ ـ ۷) رسولوں کی تکذیب کرنے والے عذابِ الٰہی میں پکڑے گئے۔ عرب کی پچھلی تاریخ کی طرف اشارہ۔

(۸ ـ ۱۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان جھٹلانے والوں کو قائل نہیں کر سکتا۔ جو معجزہ یہ مانگتے ہیں وہ بھی ان کو دکھا دو گے جب بھی یہ اپنے انکار سے باز نہیں آئیں گے۔ تم سے پہلے جو رسول آئے اس

قماش کے لوگوں نے ان کا بھی مذاق اڑایا بالآخر وہ اس عذاب میں مبتلا ہو کے رہے جس کا انھوں نے مذاق اڑایا، ان کو اُن کے ملک کی تاریخ کی طرف توجہ دلاؤ۔

(۱۲-۱۳) آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ جزا اور سزا کا دن لائے۔

(۱۴-۱۸) شرک سے اظہار برأت۔ خیر و شر سب خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ سب اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ حکیم و خبیر ہے۔

(۱۹-۲۴) توحید اور شرک کے باب میں فیصلہ کن شہادت اللہ کی ہے اور اللہ کی شہادت توحید کے حق میں ہے۔ یہ قرآن اسی شہادت کے ساتھ اُترا ہے۔ سچے اہل کتاب بھی اس سے آشنا ہیں، صرف بدبخت ہی ہیں جو اس پر ایمان لانے سے محروم رہیں گے۔ جو لوگ شرک کے مدعی ہیں وہ خدا پر جھوٹ افترا کر رہے ہیں۔ ایسے ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔ قیامت کے دن جب ان سے سوال ہوگا کہ تمھارے شرکاء کہاں ہیں تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔

(۲۵-۳۲) یہ لوگ اگر سنتے بھی ہیں تو سمجھنے اور ماننے کے لیے نہیں بلکہ کٹ حجتی کے لیے سنتے ہیں، قرآن ان کو پچھلے مکذبین کی جو سرگزشتیں سناتا ہے ان سے سبق حاصل کرنے کے بجائے یہ ان کو اگلوں کا فسانہ کہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں تو اسی وقت کھلیں گی جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ اپنی بدبختی پر ماتم اور حسرت کریں گے کہ کاش پھر دنیا میں جانا ہوتا کہ ایمان لاتے۔ آج ان کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے جس دن یہ اپنے رب کے حضور پیش کیے جائیں گے اس دن حسرت سے کہیں گے ہائے ہماری بدبختی ہم نے اپنی زندگی کس طرح برباد کی۔

(۳۳-۳۹) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ نشانیٔ عذاب کا مطالبہ پورا نہ کیے جانے پر یہ جو تمھارا مذاق اڑا رہے ہیں یہ چیز تمھارے لیے غم کا باعث نہ بنے۔ یہ تمھارا مذاق نہیں بلکہ خدا کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس معاملے کو خدا پر چھوڑ دو۔ تم سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں ان کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا تو انھوں نے صبر کیا۔ اس کے بعد اللہ کی نصرت ظاہر ہوئی۔ یہی سنت اللہ ہے اور سنت اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تمھیں اس معاملے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ایمان تو وہی لائیں گے جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے، جن کے دل بالکل مردہ ہو چکے ہیں وہ بڑی سے بڑی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ خدا کے آسمان و زمین نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن جو اندھے ہو چکے ہیں ان کو ان نشانیوں سے کیا فائدہ؟

(۴۰-۵۰) یہ عذاب کی نشانی مانگتے ہیں، ان سے پوچھو کہ اگر خدا کا عذاب آیا تو اس سے بچاؤ کا کیا سامان انھوں نے کر رکھا ہے؟ پچھلی قوموں کا حوالہ کہ انھوں نے بھی اپنے رسولوں سے نشانیاں مانگیں تو اللہ نے ان کو مختلف مصیبتوں میں مبتلا کیا لیکن خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے ان کے دل اور سخت ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے ان کی جڑ ہی کاٹ دی۔ پیغمبر کی طرف سے یہ اظہار و اعلان کہ میں خدا کے خزانوں کا مالک اور غیب کا عالم ہونے کا مدعی نہیں ہوں میں تو بس وحی الٰہی کا پیرو ہوں۔

(۵۱-۵۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ جن کے اندر خدا اور آخرت کا خوف موجود ہے وہی اس قرآن

سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ سو ان کو اس کے ذریعہ سے جگاؤ۔ رہے وہ جو معجزات کے طالب ہیں تو ان کو نظرانداز کرو۔ جو غریب لوگ اللہ کی خوشنودی کے طالب اور تمہاری باتوں کے سننے والے ہیں ان کو ان متکبرین کے مطالبہ پر اپنے سے دور نہ کرو۔ اگر یہ متکبرین اس وجہ سے تمہارے پاس نہیں آتے کہ تمہاری مجلس میں غربا ہوتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، تم ان کے ایمان و اسلام کے ذمہ دار نہیں ہو۔ ان کے لیے غریبوں کی غریبی اور ان کی اپنی امیری فتنہ بن گئی ہے۔ تم ان غربائے مسلمین کا بہرحال خیر مقدم کرو اور ان کو بشارت دو۔

(۵۶-۶۷) شرک سے اعلانِ بیزاری کی ہدایت اس لیے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں۔ پیغمبر ایک واضح شہادت اپنے پاس رکھتا ہے اور یہ مکذبین اس شہادت کو تو جھٹلاتے ہیں اور نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عذاب کا لانا پیغمبر کے اختیار میں نہیں، خدا کے اختیار میں ہے۔ ہر جان خدا کی مٹھی میں ہے۔ اللہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے عذاب بھیج سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک وقت مقرر ہے۔ یہ جھٹلانے والے عنقریب جان لیں گے۔

(۶۸-۷۰) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ جب دیکھو کہ ان مکذبین کو اعتراض و مخالفت کا بخار چڑھ گیا ہے تو ان سے بحث میں نہ اُلجھو، بلکہ کنارہ کش ہو جاؤ۔ تمہارا کام تذکیر و موعظت ہے۔ جب دیکھو کہ وہ سننا نہیں چاہتے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ خود بھگتیں گے، تم ان کے ایمان و اسلام کے ذمہ دار نہیں ہو۔

(۷۱-۷۳) ان سے کہہ دو کہ حق واضح ہو جانے اور اللہ کی ہدایت آ جانے کے بعد کیا ہماری مت ماری ہوئی ہے کہ ہم صحرا میں گم کردہ راہ قافلے کی طرح بھٹکتے پھریں؟ ہم تو اب اسی راہ پر چلیں گے جو خدا نے ہمارے لیے کھولی ہے۔

(۷۴-۸۳) توحید کے ثبوت میں حضرت ابراہیمؑ نے جو دلیل اپنی قوم پر قائم کی اس کا بیان۔

(۸۴-۹۰) حضرت ابراہیمؑ سے پہلے اور ان کے بعد ان کی ذریت میں جو انبیاء و رسل اس دینِ توحید کے حامل اُٹھے ان کی طرف ایک سرسری اشارہ اور اس بات کی تاکید کہ اصل ہدایت کی راہ یہی ہے جو ان پیغمبروں نے بتائی ہے تو اس پر مضبوطی سے استوار رہو۔ اگر کفار قریش اس کا انکار کرنا چاہتے ہیں تو ان کی پروا نہ کرو۔ اللہ دوسروں کو اس کی تائید و حمایت میں کھڑا کر دے گا۔

(۹۱-۹۲) یہود کا اٹھایا ہوا ایک اعتراض اور اس کا جواب۔

(۹۳-۹۴) ان بدد ماغوں کی تردید جو دعویٰ کرتے تھے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ بھی اسی طرح کا کلام پیش کر سکتے ہیں جس قسم کا کلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی طرف منسوب کر کے پیش کرتے ہیں، انھیں بھی وحی کا تجربہ ہوتا ہے۔

(۹۵-۹۹) توحید کے آفاقی دلائل۔

(۱۰۰-۱۰۵) شرک کی تردید اور یہ تنبیہ کہ ہدایت تمہارے پاس آ چکی، اب جو گمراہی اختیار کرے گا تو ذمہ داری خود اس پر ہے۔

(۱۰۶-۱۰۸) پیغمبر کو مضبوطی سے وحی الٰہی کے اتباع پر جمے رہنے اور مشرکین سے اعراض کی ہدایت اور مسلمانوں کو یہ نصیحت کہ مشرکین کے بتوں اور معبودوں کی بے ضرورت تحقیر و تذلیل نہ کی جائے کہ وہ مشتعل ہو کر تمہارے خدا کو برا بھلا کہنے لگیں۔

(۱۰۹-۱۱۱) کفار کی اس قسم کی تردید کہ اگر ان کی طلب کے مطابق ان کو معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ ضرور ایمان لائیں گے۔

فرمایا کہ اگر ان کو دنیا جہان کے معجزے دکھا دیے جائیں جب بھی جو ایمان لانے والے نہیں ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

(۱۱۲-۱۱۷) اس سنت اللہ کا بیان کہ جب نبی کی دعوت بلند ہوتی ہے تو شیاطین جن و انس کو بھی یہ مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے باطل کو ملمع کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر لیں تاکہ جن کو ان کی راہ اختیار کرنی ہے وہ ان کی راہ اختیار کریں پیغمبر کو یہ ہدایت کہ تم ان الجھنے والوں کو بتا دو کہ جب میرے پاس خدا کی کتاب آچکی ہے تو میں اس کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں۔

(۱۱۸-۱۲۳) مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ تم ورغلانے والوں کی باتوں سے ہوشیار رہو۔ انھوں نے اپنے مشرکانہ عقاید کے تحت جو چیزیں حرام کر رکھی ہیں ان کے باب میں تم ان کی بدعات کی پروا نہ کرو بلکہ وہ چیزیں کھاؤ جن کی حرمت کی کوئی دلیل نہ ملت ابراہیم میں موجود ہے نہ قرآن نے ان کے حرام ہونے کی خبر دی ہے۔ اب خدا نے تمھیں تاریکی سے روشنی میں لا کھڑا کیا ہے تو تم ان لوگوں کی بدعات اور کج بحثیوں کی پروا نہ کرو جو کفر و شرک کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

(۱۲۴-۱۲۷) ان مغروروں کی تردید جو قرآن پر ایمان لانے کی شرط یہ ٹھہراتے تھے کہ جب تک ان پر بھی اسی طرح وحی نہ آئے جس طرح پیغمبر پر آتی ہے اس وقت تک وہ اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ فرمایا کہ نبوت کے مرتبۂ بلند کا سزاوار ہر شخص نہیں ہوتا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون اس کا اہل ہے، کون نہیں۔ جو لوگ کبر نفس میں مبتلا ہو کر دنیا اور آخرت دونوں کی سرفرازیوں کا اجارہ دار صرف اپنے کو سمجھتے ہیں وہ اپنے اس غرور کی سزا پائیں گے۔ رہا ایمان لانے اور نہ لانے کا معاملہ تو یہ اللہ کی توفیق پر منحصر ہے اور اس توفیق کے لیے ایک مخصوص سنتِ الٰہی ہے۔

(۱۲۸-۱۳۵) آخرت میں جنوں اور انسانوں کے گمراہ لوگ اعتراف کریں گے کہ وہ اتمامِ حجت کے باوجود محض اپنی شامتِ اعمال سے اس انجام کو پہنچے۔ قریش کو دھمکی کہ سنبھلنا چاہتے ہو تو اب بھی سنبھل جاؤ ورنہ جس عذاب کی دھمکی تمھیں سنائی جا رہی ہے وہ آ کے رہے گا اور کوئی اس سے بچ نہ سکے گا۔

(۱۳۶-۱۴۴) مشرکین نے اپنے مشرکانہ عقائد کے تحت کھیتی اور چوپایوں میں سے جن چیزوں کو حرام ٹھہرا لیا تھا یا اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے انسانی جانوں کی جو قربانیاں پیش کرتے تھے ان کی تردید و مذمت کہ یہ سب باتیں بے سروپا اوہام پر مبنی ہیں، عقل، فطرت اور ملتِ ابراہیمؑ میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔

(۱۴۵-۱۵۰) ملتِ ابراہیمؑ اور ملتِ موسیٰؑ میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئیں ان کی طرف ایک اشارہ۔ مشرکین کے اس عذر کی تردید کہ وہ جس راستہ پر ہیں، خدا ہی کے چلانے سے اس پر ہیں، اگر اللہ کو یہ راستہ پسند نہیں ہے تو وہ ان کو صحیح راستہ پر کیوں نہیں چلا دیتا۔

(۱۵۱-۱۶۵) اس قرآن کے ذریعہ سے جو اتمامِ حجت ہوا ہے اس کا بیان۔ اب اس کے بعد بھی اگر لوگ کسی نشانی کے ظہور کے منتظر ہیں تو وہ انتظار کریں، اس قسم کی نشانی دکھانا پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہے۔ پیغمبر کی طرف سے یہ اعلان کہ خدا نے مجھے ملتِ ابراہیم کی ہدایت بخشی ہے اور میں اس پر چل کھڑا ہوا ہوں۔ اب جس کا جی چاہے اس صراطِ مستقیم پہ آئے اور جس کا جی چاہے بھٹکتا پھرے۔ اللہ کے ہاں ہر ایک اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ (۶)

مَکِّیَّۃٌ ——— اٰیَاتُهَا ۱۶۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

آیات ۱ - ۱۱

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ﴿۲﴾ وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴿۳﴾ وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ﴿۴﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۵﴾ اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۶﴾ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَیْدِیْهِمْ لَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا

سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝۸ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝۹ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۱

ع ۱

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۱

شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا تاریکیوں اور روشنی کو، پھر تعجب ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ہم سر ٹھہراتے ہیں۔ وہی ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک مدت ٹھہرائی اور مدت مقررہ اسی کے علم میں ہے، پھر تعجب ہے کہ تم کج بحثیاں کرتے ہو! اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور وہی زمین میں بھی۔ وہ تمھارے خفیہ اور علانیہ کو جانتا ہے اور جو کمائی تم کر رہے ہو اسے بھی جانتا ہے۔ اور نہیں آتی ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی مگر یہ اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔ سو انھوں نے واضح حق کو بھی جھٹلا دیا جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو عنقریب اس چیز کی خبریں ان کے پاس آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا جن کو ہم نے ملک میں وہ قوت و سطوت دے رکھی تھی جو تم کو نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب مینہ برسائے اور نہریں جاری کیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں۔ ۱-۶

اور اگر ہم تم پر کوئی ایسی کتاب اتارتے جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہوتی اور یہ اس کو اپنے

ہاتھوں سے چھو بھی لیتے جب بھی یہ کفر کرنے والے یہی کہتے کہ یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے اور یہ کہتے ہیں کہ اس پر علانیہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترتا اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو بس معاملے کا فیصلہ ہی ہو جاتا۔ پھر ان کو ذرا مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم اس کو کوئی فرشتہ بناتے جب بھی آدمی ہی کی شکل میں بناتے تو جو گھپلا وہ پیدا کر رہے ہیں ہم اسی میں ان کو ڈال دیتے اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ کہو، ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔ ۷ - ۱۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۬ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (۱)

توحید کی دلیل عرب کے مسلمات سے

لفظ حمد کی تحقیق تفسیر سورۂ فاتحہ میں گزر چکی ہے اور یہ بات بھی اس کتاب میں بار بار بیان ہو چکی ہے کہ مشرکین عرب آسمان و زمین اور نور و ظلمت سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ یہاں قرآن نے ان کے اسی مسلمہ پر توحید کی دلیل قائم کی ہے کہ جب یہ تسلیم ہے کہ آسمانوں اور زمین اور نور و ظلمت کا خالق اللہ ہی ہے تو پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہ کفار دوسروں کو خدا کا ہمسر اور شریک ٹھہراتے ہیں۔ ’ثُمَّ‘ اظہار تعجب کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں اور آگے والی آیت میں بھی، اظہار تعجب ہی کے مفہوم میں ہے۔ شرک پر اظہار تعجب کا ایک پہلو تو یہی ہے کہ جب ساری چیزوں کا خالق خدا ہی ہے تو پھر شرک کی گنجائش کہاں سے نکلی؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کائنات کی چیزوں میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے مثلاً زمین اور آسمان، روشنی اور تاریکی، سردی اور گرمی، تو اس تضاد کے اندر اس کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے ایسی حیرت انگیز سازگاری بھی ہے کہ کوئی عاقل تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کے خالق و مالک الگ الگ ہیں۔ بلکہ ہر صاحب نظر یہ ماننے پر مجبور رہے کہ پوری کائنات ایک ہی کارفرما کے ارادے اور مشیت کے تحت حرکت کر رہی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ وَ هُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ (۲-۳)

'خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ' سے مقصود انسان کی ابتدائی خلقت کی طرف اشارہ ہے جیساکہ فرمایا وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۔ السجدہ ۷ (اور انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا) تمام ارضی مخلوقات کی زندگی کا آغاز مٹی ہی سے ہوا ہے۔ اس مضمون کو قرآن نے بار بار مختلف شکلوں سے بیان کیا ہے اور اس سے عام طور پر دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے، ایک تو انسان کی بے حقیقتی کی طرف کہ مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوق کو اپنی ہستی پر زیادہ مغرور نہیں ہونا چاہیے، دوسرے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کیے جانے پر کہ جب انسان کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا اور اس پیدا کرنے میں اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو اب دوبارہ اس کے پیدا کرنے سے وہ کیوں عاجز رہے گا۔ یہاں اسی دوسری حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اس کا ذکر ہوا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۔ ۵ ۔ الرعد (اور اگر تم تعجب کرنا چاہو تو نہایت ہی عجیب ہے ان کی یہ بات کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ نئی خلقت میں آئیں گے!) كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۱۰۴ - انبیا (جس طرح ہم نے پہلی بار مٹی سے بنایا اسی طرح مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ اس کو پیدا کر دیں گے، یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے، یہ ہم کرکے رہیں گے) وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۔ ۲۷ - روم (اور وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ اس کے لیے سہل ہے)

اجل کے مختلف مفہوم

ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا ، 'اجل' کے معنی مدت مقررہ کے ہیں۔ 'اجل' یا 'اَجَلٌ مُّسَمًّى' کا لفظ فرد یا اقوام کے تعلق سے مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک تو اس مدت حیات کے لیے جو ہر فرد کو تقدیر کی طرف سے ملی ہے، دوسرے اس روز بعث کے لیے استعمال ہوا ہے جو خلق کے اٹھائے جانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے، تیسرے اس مقررہ پیمانہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو کسی قوم کی ہلاکت کے لیے مقرر ہے۔ پہلے معنی کے لیے نظیر آیت زیر بحث میں بھی ہے اور اسی سورہ کی آیت ۶۰ میں بھی۔ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ ۶۰ (اور وہی خدا ہے جو تمہیں وفات دیتا ہے شب میں اور وہ جانتا ہوتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہوتا ہے، پھر وہ تم کو دوسرے دن میں اٹھاتا ہے تاکہ تمہاری مقررہ مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمہارا لوٹنا ہوگا، پھر وہ تم کو آگاہ کرے گا ان سارے کاموں سے جو تم کرتے رہے ہو) دوسرے معنی کے لیے نظیر آیت زیر بحث میں ہے۔ اس میں اجل کا ذکر دو مرتبہ ہے۔ ایک اجل تو ظاہر ہے کہ وہی ہے جو ہر فرد کی مدت حیات کے طور پر مقرر ہے، دوسری اجل جس کے ساتھ 'مُسَمًّى' کی صفت لگی ہوئی ہے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے وہ مدت مقررہ مراد ہے جو خلق کے اٹھائے جانے کے لیے مقرر ہے۔ تیسرے معنی کے لیے نظیر آیت وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۔ ۳۴ - اعراف، اور اس مضمون کی دوسری آیات میں ہے۔ اس 'اجل' سے، جیساکہ ہم نے اشارہ کیا، وہ مقررہ پیمانہ مراد ہے جو کسی قوم کے

اخلاقی زوال کی اس آخری حد کی خبر دیتا ہے جب قانونِ الٰہی اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ پیمانہ افراد کی مدتِ حیات کی طرح نہیں ہے کہ کوئی نیک ہو یا بد، جو مدتِ حیات اس کے لیے مقرر ہے اس کے ختم ہو جانے پر وہ لازماً مر جاتا ہے بلکہ یہ اخلاقی قوانین کے تابع ہے، جب تک کوئی قوم اپنے ایمان و کردار کو محفوظ رکھے گی خدا اس کو قائم رکھے گا، یہاں تک کہ وہ اجل مسمیٰ آجائے جو اس پوری کائنات کے لیے خدا کی طرف سے مقرر ہے۔ اس پیمانہ کے اخلاقی ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک قوم کا پیمانہ لبریز ہونے کی آخری حد پر پہنچ رہا ہو اور اس کی اجل مسمیٰ آئی کھڑی ہو لیکن سوئی کے آخری نقطہ پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ قوم توبہ اور اصلاح کے ذریعہ سے اپنے زندہ رہنے کا حق پھر بحال کر لے۔ یہاں ہم اشارے پر کفایت کرتے ہیں ــــ انشاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں اس نکتہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

'امتراء'، 'مَری' سے ہے جس کے معنی مَتھنے، مسلنے، نچوڑنے کے ہیں 'امتری اللبن' کے معنی ہوں گے اس نے تھن سے دودھ نچوڑا۔ یہیں سے یہ لفظ اس بحث و جدال کے لیے استعمال ہوا جس میں کوئی کٹ حجتی کرنے والا مناظر اس بات میں سے بھی شک و اعتراض کا کوئی پہلو نکال ہی لے جس میں اعتراض و بحث کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہی خدا ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تمھیں بھی انکار نہیں۔ پھر ہر ایک کے لیے اس نے زندگی کی ایک مدت ٹھہرا دی۔ یہ نہیں ہے کہ جو پیدا ہوتا ہو وہ غیر فانی ہو کر پیدا ہوتا ہو، پھر اس میں کیا شک کی گنجائش ہے کہ جس خدا نے تمھیں مٹی سے بنایا وہ تمھیں دوبارہ اسی مٹی سے اٹھا کھڑا کرے گا۔ اس کے لیے اس نے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس کا علم صرف اسی کو ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جس میں کسی بحث و جدال کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن تم ہر بات میں کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے ہو۔

'وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ الاٰیۃ' یعنی زمین و آسمان میں الگ الگ الٰہ نہیں ہیں بلکہ وہی اللہ آسمان و زمین دونوں کا مالک ہے اور دونوں میں اسی کا حکم چل رہا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۸۴۔ زخرف (وہی ہے جو آسمان کا بھی معبود ہے اور وہی زمین کا بھی معبود ہے اور وہ علیم و حکیم ہے) آسمان و زمین دونوں کا قیام و بقا ہی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ ان دونوں کے اندر ایک ہی خدا کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر ان کے اندر الگ الگ ارادے کارفرما ہوتے تو جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے 'دونوں درہم برہم ہو جاتے'۔ یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ آسمان و زمین کا خالق تو خدا ہی ہے لیکن چونکہ زمین اس کی مملکت کا دور دراز حصہ ہے اس وجہ سے اس نے اس کا انتظام و انصرام اپنے دوسرے کارندوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے۔ آسمان و زمین سب براہِ راست اسی کے کنٹرول میں ہیں اور اس کا علم تمھارے ظاہر و باطن اور تمھارے قول و فعل ہر چیز پر محیط ہے اس وجہ سے اس کو اپنی اس

مملکت میں کسی مددگار کی احتیاج بھی نہیں ہے۔

توحید اور معاد کا باہمی تعلق

توحید کا یہ مضمون اوپر قیامت والے مضمون کی تاکید ہے۔ یہ حقیقت قرآن میں بار بار واضح کی گئی ہے کہ قیامت کا ماننا اس لیے ضروری ہے کہ قیامت کو مانے بغیر یہ سارا کارخانہ ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتا ہے اور یہی بات اس صورت میں بھی لازم آتی ہے جب قیامت کے ساتھ شرک اور شفاعت باطل کی گنجائش تسلیم کرلی جائے۔ اس لیے کہ جب شرکا اپنے پرستاروں کو بہرصورت بخشوا لیں گے، جیسا کہ مشرکین کا دعویٰ ہے، خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں تو پھر قیامت کا آنا نہ آنا دونوں یکساں ہی رہا۔

تکذیب حق کا انجام اور تاریخ کی شہادت

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۴-۵) یعنی توحید اور قیامت کی ان باتوں کی تکذیب کی کوئی گنجائش تو نہیں ہے لیکن یہ لوگ اللہ کی آیات سے اعراض کر رہے ہیں اور اس طرح انھوں نے اس حق کو جھٹلایا ہے جو اللہ کی طرف سے ان کے پاس آیا ہے، تو عنقریب اس چیز کی خبریں ان کے پاس آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہاں 'حق' سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب سے ڈرا رہا تھا لوگ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ فرمایا کہ جس عذاب کا مذاق اڑا رہے ہیں اس کے آثار کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ (۶)

یہ تاریخ کی شہادت پیش کی گئی ہے اوپر والے دعوے پر۔ مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ غرہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کو بڑی قوت و شوکت حاصل ہے، ان کو ہلایا نہیں جا سکتا۔ ان سے پہلے کتنی قومیں گزری ہیں جن کو ان سے زیادہ اقتدار حاصل ہوا، ان کو رزق و فضل میں سے بھی ان سے کہیں زیادہ حصہ ملا لیکن جب انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو خدا نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ان کی جگہ دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں۔ یہاں تاریخ کا یہ حوالہ اجمال کے ساتھ آیا ہے۔ اس کی پوری تفصیل اعراف میں آئے گی جو اس سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'سماء' کا لفظ بادلوں کے لیے بھی آتا ہے۔ 'مِدْرَارًا' کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور بارش کی کثرت رزق و فضل کی کثرت کی تعبیر ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ ہود آیت ۵۲ اور سورہ نوح آیت ۱۱۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝ وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكًا لَقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا

لَجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (۷-۹)

نمونۂ بدرا بہانہ بسیار

اوپر آیت ۴ میں قرآن سے ان کے اعراض کا جو ذکر فرمایا تو یہ ان کے ان مطالبات و اعتراضات کا جواب بھی دے دیا جو وہ اس اعراض کے لیے بطور بہانہ کے پیش کرتے تھے۔ مقصود اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ یہ نہ خیال کرو کہ ان کے اعراض کے لیے فی الواقع کوئی عذر ہے، جو دور ہو جائے تو یہ قرآن کو مان لیں گے۔ نہیں، بات وہیں رہے گی جہاں اب ہے۔ یہ کوئی نہ کوئی نیا بہانہ تراش لیں گے اس لیے کہ نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھیں معجزے نہیں دکھائے گئے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کے خلاف کوئی بات ماننے کے لیے یہ تیار نہیں ہیں۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ الاٰية۔ یہ اس مطالبے کا جواب ہے جو اہل کتاب کی زبانی سورۂ نساء آیت ۱۵۳ میں نقل ہوا ہے۔ وہاں اس کا وہ جواب دیا ہے جو اہل کتاب کے لیے موزوں تھا۔ یہاں فرمایا کہ ان کے مطالبہ کے مطابق اگر فی الواقع ان پر لکھی لکھائی ما بین الدفتین کتاب بھی اتار دی جاتی جب بھی یہ ایمان نہ لاتے بلکہ کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

منتہائے ایمان کی شرط

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ الاٰية۔ یہ ان کا ایک دوسرا مطالبہ اور اس کا جواب ہے۔ یہ مطالبہ بھی قرآن میں دوسری جگہ نقل ہوا ہے۔ یہ مطالبہ یہ تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فرشتہ آتا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے تو وہ فرشتہ یوں کیوں آتا ہے کہ صرف انھی کو نظر آتا ہے، کھلم کھلا ان کی نبوت کی منادی کرتا ہوا کیوں نظر نہیں آتا کہ سب دیکھیں اور سب سنیں۔ اس کا جواب یہ دیا کہ جب بات یہاں تک پہنچ جائے گی کہ فرشتے علانیہ اترنے لگیں تو پھر اللہ کا عذاب آ دھمکے گا۔ پھر ان کو مہلت نہیں دی جائے گی۔ یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ ایمان وہ معتبر ہے جو غیب میں رہتے، آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے ان دلائل کی بنیاد پر لایا جائے، جن کی انبیاء دعوت دیتے ہیں نہ کہ وہ جو کشفِ حجاب اور حقائق کا بچشم سر مشاہدہ کر لینے کے بعد لایا جائے۔

فرشتوں کو رسول بنا کر نہ بھیجنے کی مصلحت

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا الاٰية۔ یہ ایک تیسرے مطالبے کا جواب ہے اور یہ بھی قرآن میں دوسری جگہ نقل ہوا ہے۔ مثلاً وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۹۴-اسراء (اور ہدایت الٰہی کے آجانے کے بعد لوگوں کو ایمان سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ انھوں نے اعتراض کیا کہ کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا) فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۶-تغابن (پس وہ بولے کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے، پس انھوں نے انکار کر دیا اور پیٹھ پھیر لی اور اللہ بھی ان سے بے نیاز ہو گیا) اس کا جواب یہ دیا کہ اگر رسول بالفرض فرشتہ ہی بھیجا جاتا جب بھی لازماً وہ آدمی ہی کی شکل و صورت میں ہوتا تو پھر وہی گھپلا پیش آجاتا جو اب پیش آیا ہے مطلب یہ ہے کہ کسی فرشتے کو رسول بنا کر نہ بھیجنا اس بنا پر نہیں ہے کہ خدا کے لیے یہ ناممکن تھا بلکہ اس بنا پر ہے کہ انسان فرشتوں کو فرشتوں کی شکل میں نہیں بلکہ

انسانوں ہی کی شکل میں دیکھ سکتے اور اسی صورت میں ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو جب وہ انسان ہی کے روپ میں آتا تو یہ پھر وہی اعتراض اٹھاتے جو اب اٹھا رہے ہیں۔ مَا یَلْبِسُوْنَ سے یہاں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ فی الواقع یہ شبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ لوگ یہ شبہ پیدا کر رہے ہیں تاکہ اس طرح اپنے سادہ لوح پیروؤں کو گھپلے میں ڈالیں۔ لَبَسْنَا میں فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے تو یہ نسبت اسی طرح کی ہے جس طرح کی نسبت فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ میں ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۱۰-۱۱)

حَاقَ یَحِیْقُ حَیْقًا بِہٖ کے معنی ہیں احاطہ کر لینا، گھیر لینا اور چھا جانا۔

اوپر آیت ۵ میں قریش کو یہ دھمکی جو دی ہے کہ وہ ایک امر حق کا مذاق اڑا رہے ہیں جو شدنی اور اٹل ہے، وہ عنقریب اس عذاب کے آثار دیکھ لیں گے جس کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ اب یہ اس امر واقعی کی ان شہادتوں اور مثالوں کی طرف اشارہ فرمایا جو خود ان کی تاریخ اور ان کے ملک کے آثار میں موجود ہیں کہ تم سے پہلے جو رسول آئے انھوں نے بھی اپنی اپنی قوموں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا تو ان کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا بالآخر اس عذاب نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور وہ تباہ ہو گئیں۔

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ الاية یہ اشارہ ہے خود ملک عرب کی طرف کہ اگر اس نگاہ سے اپنے ملک کے حالات و آثار کا مشاہدہ کرو تو تمھیں اس میں رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کی تباہی کے بہت سے آثار ملیں گے۔ یہاں صرف اجمالی اشارہ فرمایا ہے۔ بعد والی سورہ میں اس اجمال کی تفصیل آئے گی۔ وہاں قوم نوح، عاد، ثمود، مدین، قوم لوط وغیرہ کی سرگزشتیں سنائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کے انذار کا مذاق اڑایا اور اس عذاب کو انھوں نے محض خالی خولی دھمکی سمجھا جس کی رسول نے خبر دی۔ بالآخر وہ واقعہ کی شکل میں نمودار ہو گیا اور مذاق اڑانے والوں کا بیڑا غرق ہو گیا۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۲-۳۲

آگے توحید، معاد اور رسالت کے وہی مطالب جو اوپر گزرے اپنے بعض نئے پہلوؤں اور نئے اسلوب سے آ رہے ہیں۔ ارشاد ہے۔

آیات ۱۲-۳۲

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِى الَّيْلِ

وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ

اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ

اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ

عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ

اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ

الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ

بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ

بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾

وقف لازم

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ

باختلاف وقف لازم

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ

ع ۲ / ۱۰ / ۸

افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ

الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَ

اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ

ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ

وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ وُقِفُوْا عَلَی النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَقَالُوْۤا اِنْ هِیَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع ۳/۱۰ ۹ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمۂ آیات ۱۲ - ۳۲

ان سے پوچھو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دو اللہ ہی کا ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا قیامت کے دن کی طرف جس میں ذرا شبہ نہیں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا

وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے جو چیز شب میں ساکن ہوتی ہے اور جو دن میں متحرک ہوتی ہے اور وہ سمیع و علیم ہے - ۱۲-۱۳

کہو کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں اور وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں، کہہ دو مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور تم ہرگز مشرکوں میں سے نہ بنو۔ کہہ دو کہ اگر میں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی تو میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۔ جو شخص اس دن اس سے دور رکھا گیا در حقیقت وہی ہے جس پر خدا نے رحم فرمایا اور یہی کھلی کامیابی ہے - ۱۴-۱۶

اور اگر اللہ تجھ کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کا دور کرنے والا بن سکے اور اگر کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے ۔ پوچھو شہادت کے لیے سب سے بڑا کون ہے؟ کہو، اللہ، وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعہ سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے ۔ کیا تم اس بات کے گواہ بنتے ہو کہ خدا کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں؟ کہہ دو، میں اس کی گواہی نہیں دیتا ۔ کہہ دو وہ تو بس ایک ہی معبود ہے اور میں ان سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔ ۱۷، ۱۹

جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا یا اس کی آیات کی تکذیب کی ۔ بیشک یہ ظالم فلاح پانے والے نہیں ۔ یاد کرو اس دن کو جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے پھر

پوچھیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمھارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم ہمارا شریک گمان کرتے تھے؟ پھر ان کے فریب کا پردہ چاک ہو جائے گا مگر یہ کہ وہ کہیں گے کہ اللہ اپنے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو، یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولے اور ان کا سارا افترا ہوا ہو گیا۔ ۲۰-۲۴

اور ان میں ایسے بھی ہیں جو تمھاری بات پر کان لگاتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ ان کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرا پن پیدا کر دیا ہے کہ اس کو نہ سن سکیں اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں گے تو بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں تک کہ جب یہ تمھارے پاس حجت کرتے آئیں گے تو یہ کافر کہیں گے کہ یہ تو بس اگلوں کا فسانہ ہے اور یہ اس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی گریز کرتے ہیں اور یہ درحقیقت اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں لیکن احساس نہیں کر رہے ہیں۔ اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ دوزخ کے کنارے پر کھڑے کیے جائیں گے، پس کہیں گے کہ کاش ہم پھر واپس کیے جائیں کہ مانیں اور اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں اور ایمان والوں میں سے بنیں۔ بلکہ یہ تو ان پر وہی حقیقت ظاہر ہوئی ہے جو اس سے پہلے اپنے دل میں چھپاتے تھے۔ اور اگر یہ لوٹائے جائیں تو وہی کریں گے جس سے روکے گئے۔ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۲۵-۲۸

کہتے ہیں کہ زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اور مرنے کے بعد ہم اٹھائے نہیں جانے کے۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب یہ اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے، وہ ان سے پوچھے گا، کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے؟ وہ جواب دیں گے، ہاں، ہمارے رب کی قسم، یہ امر واقعہ ہے! فرمائے گا پس چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ گھاٹے میں رہے وہ لوگ

جنھوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا ۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی اچانک آ پہنچے گی وہ کہیں گے کہ ہائے افسوس ہماری اس کوتاہی پر جو اس باب میں ہم سے ہوئی! اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوتے ہوں گے ۔ جان رکھو کہ نہایت ہی برا ہو گا وہ بوجھ جو یہ اٹھائیں گے اور یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے البتہ دارِ آخرت ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ رکھتے ہیں ۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں! ۲۹-۳۲

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قل لمن ما فی السموت والارض ط قل للہ ط کتب علی نفسہ الرحمۃ ط لیجمعنکم الی یوم القیمۃ لاریب فیہ ط الذین خسروا انفسھم فھم لا یومنون ○ ولہ ما سکن فی الیل والنھار ط وھو السمیع العلیم (۱۲-۱۳)

سوال و جواب کا ایک خاص اسلوب

'قل لمن ما فی السموت والارض، قل للہ'، قرآن میں جہاں جہاں سوال کر کے مخاطب کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود اس کا جواب دیا ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع میں اصل جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے، اگر اس کا کوئی عقیدہ یا عمل اس کے خلاف ہے تو وہ خود اس کے اپنے مسلّمہ کے خلاف ہے۔ جواب میں سبقت سے اس امر کا بھی اظہار ہو جاتا ہے کہ بہر حال اصل حقیقت کا اظہار کر دیا جائے قطع نظر اس سے کہ مخاطب اس کے جواب میں کیا ہٹ دھرمی اختیار کرتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود آسمان و زمین کا خالق و مالک خدا ہی کو مانتے تھے۔ اس کی وضاحت دلائل کے ساتھ ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔

قیامت خدا کی صفتِ رحمت کا لازمی تقاضا ہے

'کتب علی نفسہ الرحمۃ' یہ اللہ تعالیٰ کے صفت رحمت سے کمال درجہ متصف ہونے کی تعبیر بھی ہے اور اس امر کا اظہار بھی کہ ہر وہ بات جو اس صفت کا مقتضیٰ ہے اس کا ظہور میں آنا قطعی اور اٹل ہے، کوئی چیز اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکے گی۔

'لیجمعنکم الی یوم القیمۃ لاریب فیہ' میں عربیت کا جو اسلوب ہے اس پر سورۂ نساء کی آیت ۸۷ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ یہاں جو بات نگاہ میں رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کا آنا خدا کی صفت رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر قیامت نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات کا خالق رحمان و رحیم نہیں ہے۔ اس کے نزدیک نعوذ باللہ عدل و ظلم، نیکی اور بدی، خیر اور شر دونوں یکساں ہیں، یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک اندھیر نگری ہے۔ یہ باتیں چونکہ بالبداہت باطل ہیں، رحمان و رحیم خدا کی شان کے بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے غایت و بے مقصد کام کرے، اس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اس کی رحمت کاملہ کا ظہور ہو، اپنے نیک بندوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور جو بدکار و نابکار ہیں وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔

اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ قیامت کا اصل مقصود مجرموں کو سزا دینا نہیں بلکہ نیکوکاروں کو جزا دینا ہے۔ مجرموں کی سزا درحقیقت نیکوکاروں کی جزا کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ آگے آیت ۵۲ کے تحت۔ اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

اصل خسران — 'اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ' کے مضمون کی وضاحت آگے آیت ۳۱ میں فرمادی ہے۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰہِ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَتْھُمُ السَّاعَۃُ بَغْتَۃً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْھَا وَھُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَھُمْ عَلٰی ظُھُوْرِھِمْ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ (گھاٹے میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی اچانک آدھمکے گی تو کہیں گے ہائے افسوس ہماری اس کوتاہی پر جو ہم سے اس بارے میں ہوئی اور وہ اس دن اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے اور آگاہ، نہایت برا بوجھ ہو گا جو وہ اٹھائے ہوئے ہوں گے)

حذف کا ایک اسلوب — 'وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّھَارِ' یہاں لیل ونہار دونوں کے ذکر کا تقاضا یہ ہے کہ 'سکن' کے بالمقابل کوئی ایسا فعل محذوف مانا جائے جو لفظ 'نہار' کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ہو۔ چنانچہ ہم نے 'تحرک' محذوف مانا ہے اور ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے اور آگے اسی سورہ میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں آرہی ہیں۔

آیات کا مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ اپنی موجودہ دنیوی کامیابیوں کے غرے میں آخرت اور جزا و سزا کو جھٹلا رہے اور تمھارا اور قرآن کا مذاق اڑا رہے ہیں تو ان سے پوچھو کہ یہ آسمان و زمین کس کے ہیں؟ ظاہر ہے کہ خدا ہی کے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انھیں بھی مجال انکار نہیں۔ پھر انھیں بتاؤ کہ خدا نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تمھیں پیدا کر کے اور پرورش کے تمام اسباب فراہم کر کے یوں ہی شتر بے مہار بنا کے نہ چھوڑ دے بلکہ ضروری ہے کہ وہ تم سب کو کشاں کشاں روز قیامت کی طرف لے جائے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے تو آج جو لوگ اکڑتے اور اس کا مذاق اڑاتے اور اپنی دنیوی خود فراموشیوں میں مگن ہیں اس دن اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے کہ ہائے ہم نے چند روزہ عیش دنیا کی خاطر اس زندگی کو فراموش رکھا اور اپنے لیے ابدی نامرادی کا سامان کیا۔ پھر فرمایا کہ یہ لوگ یاد رکھیں کہ شب کی تاریکیوں میں جو چیز ساکن ہوتی ہے اور دن کی روشنی میں جو چیز بھی متحرک ہوتی ہے سب خدا ہی کے اختیار، اسی کے قبضۂ قدرت اور اسی کے کنٹرول میں ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکے اور اس کے اذن کے بغیر اپنی جگہ سے سرک سکے۔ رات کی تاریکی اور دن کی روشنی دونوں اس کے لیے یکساں ہے اور وہ ہر جگہ سے سب کو اکٹھا کرے گا اور جس طرح اس کی قدرت سب کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم بھی ہر چیز پر حاوی ہے اس لیے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔ آگے یہی مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ آیات ۵۹-۶۲ میں آرہا ہے۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ

اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○
مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ○ (۱۴-۱۶)

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یہ اس مسلمہ حقیقت کا، جو اوپر مذکور ہوئی، دوسرا لازمی نتیجہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جب سب کچھ خدا ہی کا ہے، آسمان و زمین سب کا خالق وہی ہے تو تم خواہ کتنا ہی زور لگاؤ، لیکن میرے لیے یہ کس طرح روا ہے کہ خدائے فاطر السموات والارض کے سوا کسی اور کو اپنا مولیٰ و مرجع بناؤں۔

بتوں پر ایک لطیف تعریض

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ، یہ خدا کی ربوبیت اور پروردگاری کی طرف اشارہ بھی ہے اور مشرکین کے بتوں پر ایک نہایت لطیف تعریض بھی۔ مطلب یہ ہے کہ مولیٰ و مرجع بنائے جانے کا سزاوار تو وہ ہے جو آسمان و زمین کا عدم سے وجود میں لانے والا بھی ہے اور جس کے فضل و کرم سے سب کو روزی بھی مل رہی ہے نہ کہ تمھارے وہ اصنام خیالی جن کے متعلق تمھیں خود یہ تسلیم ہے کہ وہ خالق و موجد کسی چیز کے بھی نہیں، رہی ان کی پروردگاری تو اس کا بھانڈا پھوڑ دینے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ان کے آگے حلوے مانڈے تم پیش کرتے ہو تب وہ راضی و آسودہ ہوتے ہیں۔ یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ مشرکین اپنے بتوں کے آگے جو کچھ پیش کرتے ہیں اس تصور کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ ان کی پسندیدہ اور مرغوب غذائیں ہیں جن کو وہ نوش کرتے اور جن کی خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ایک خدا پرست خدا کے نام پر جو کچھ پیش کرتا ہے اس کا کوئی حصہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، خدا کو نہیں پہنچتا بلکہ سب کا سب خدا کے حقدار بندوں کو پہنچتا ہے۔

نبی کا عزم دوسروں سے بے نیاز ہوتا ہے

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ، یعنی اگر تم مدعی ہو کہ خدا نے تمھارے ان مزعومہ بتوں کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے اور تمھیں ان کی عبادت کا حکم دیا ہے تو تم جانو، مجھے تو جو حکم ملا ہے وہ یہ ہے کہ میں سب سے پہلا اسلام لانے والا اور اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دینے والا بنوں۔ سو میں تو اسی حکم کی تعمیل کرنے والا ہوں، تم میں سے کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے۔ اس اسلوب بیان سے، جیسا کہ ہم دوسری جگہ تصریح کر چکے ہیں، جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ نبی جس بات کی تعلیم دنیا کو دیتا ہے اس پر پہلا عمل کرنے والا وہ خود بنتا ہے، وہیں یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس امر سے اس کی اس یکسوئی اور اس کے عزم میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا کہ جن کو اس نے پکارا ان میں سے کسی نے اس کا ساتھ دیا یا نہیں دیا۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، کا عطف اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ، پر نہیں ہے بلکہ یہ مستقل بات ہے یعنی تم ان کو بتا دو کہ مجھے یہ حکم ملا ہے اور تم مشرکین میں سے نہ بنو۔ اس طرح کی نہی میں اگرچہ بظاہر خطاب آنحضرت صلعم سے ہوتا ہے لیکن اس میں زجر کا جو پہلو نکلتا ہے اس کا رخ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جن

کا مدعا زیر بحث ہوتا ہے۔

قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ الایۃ۔ یعنی جب مجھے حکم یہ ملا ہے کہ میں سب سے پہلا اسلام لانے والا بنوں تو میرے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اپنے رب کے اس حکم کی نافرمانی کروں؟ اگر میں نافرمانی کروں تو میں اس ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں جس سے ہر نافرمانی کرنے والے کو سابقہ پیش آنا ہے۔

ڈرنے کی اصل چیز اور چاہنے کی اصل چیز

مَنْ یُّصْرَفْ عَنْهُ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ، یعنی ڈرنے کی اصل چیز یہ خوفناک دن اور اس کا عذاب ہی ہے، جو اس سے محفوظ رہا، درحقیقت وہی ہے جس پر خدا کا رحم ہوا اور چاہنے کی اصل چیز اس دن کی رحمت ہی ہے اس لیے کہ جو اس رحمت کا سزاوار قرار پایا درحقیقت وہی ہے جس نے اصل کامیابی حاصل کی۔ اس میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ بھی ہے کہ جو لوگ اس دنیا کی کامیابیوں ہی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ان کے پیچھے آخرت کی 'فوز مبین' کو بھول بیٹھے ہیں انھیں اپنی بدبختی اور محرومی کا اندازہ کل ہوگا۔

وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝ ۱۷-۱۸

نفع و ضرر صرف خدا کے اختیار میں ہے۔

'وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ' میں خطاب اگرچہ لفظاً بصیغہ واحد ہے لیکن مراد عام ہے اور یہ بات اوپر والی بات ہی کی توضیح مزید کی حیثیت رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفع و ضرر دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ اگر وہ کسی کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو دور کر سکے۔ اسی طرح اگر وہ کسی کو کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو جس خیر سے چاہے بہرہ مند کر دے، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔ پھر کسی اور کو مولیٰ و مرجع بنانے اور کسی اور سے دعا و استرحام کی ضرورت کیا باقی رہی؟

لفظ قہر کا مفہوم

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ، 'قہر' کا لفظ عربی میں اس معنی میں بالکل نہیں آتا جس معنی میں اردو میں آتا ہے بلکہ اس کے معنی اختیار اور قابو، حکومت اور تسلط میں رکھنے کے آتے ہیں۔ انگریزی میں لفظ (Control) کا جو مفہوم ہے وہی مفہوم عربی میں اس لفظ کا ہے۔ اسی سے لفظ 'قہار' مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جس کے معنی (Controller) کے ہیں۔ یعنی تمام جہان اور اس کے تمام بندے ہر آن اس کی مٹھی اور اس کے قابو میں ہیں۔ وہ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے نہ کسی مددگار کا محتاج ہے اور نہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ جب وہ ان کو پکڑنا چاہے یا اکٹھا کرنا چاہے تو کوئی اس کی گرفت سے باہر نکل سکے۔ آگے اس مضمون کی وضاحت بھی ہوگئی ہے۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۔ ۶۱ (اور وہ اپنے تمام بندوں پر اپنا قابو جمائے ہوئے ہے اور وہ تم پر اپنے نگران بھیجتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو اس کو ہمارے فرستادے ہی قبض کرتے ہیں اور وہ اس کام میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے)

صفات حکیم و خبیر کے لوازم

وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ خدا کا حکیم و خبیر ہونا ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ کئی باتوں کو مستلزم

ہے، مثلاً یہ کہ وہ ایک روز جزا و سزا کو لائے اس لیے کہ اس کے بغیر یہ دنیا بالکل بے مقصد ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس کے ہاں کسی ایسی شفاعت کی گنجائش نہ ہو جو حق کو باطل اور باطل کو حق بنا سکے اس لیے کہ یہ اس کی حکمت کے بھی منافی ہے اور اس کے خبیر ہونے کے بھی۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۟ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۫ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۱۹)

'وَمَنْ بَلَغَ' کا عطف

'لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ' عام طور پر مفسرین نے 'وَمَنْ بَلَغَ' کو ضمیر منصوب پر معطوف مانا ہے یعنی یہ قرآن اس لیے مجھ پر وحی کیا گیا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تم کو اور ان سب کو بیدار و ہوشیار کروں جن تک یہ پہنچے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ ضمیر متکلم پر معطوف ہے یعنی میں اس کے ذریعے سے تم کو خبردار کروں اور جن کو یہ پہنچے وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر دوسروں کو اس کے ذریعے سے خبردار کریں۔ یہ گویا اس ذمہ داری کی یاددہانی ہے جس کا ذکر دوسرے مقام میں یوں ہوا ہے فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَیْهِمْ - ۱۲۲ توبہ۔ (پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت دین کا علم حاصل کرنے کے لیے اٹھتی اور تاکہ وہ اپنی قوم کو خبردار کرتی جبکہ ان کی طرف واپس آتی) یہی حقیقت احادیث میں بھی واضح کی گئی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام صحابہ پر انذار و تبلیغ کی ذمہ داری ڈالی اور فرمایا فلیبلغ الشاھد الغائب پس چاہیے کہ جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا میں اس امت کا جو فریضۂ منصبی بیان ہوا ہے اور جس کی وضاحت ہم اس کے مقام میں کر چکے ہیں، اس سے بھی اسی مفہوم کی تائید نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

توحید اور شرک کے معاملے میں فیصلہ کن گواہی خدا کی ہے

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں، اس معاملے میں فیصلہ کن گواہی خود خدا ہی کی ہو سکتی ہے وہی بتا سکتا ہے کہ اس نے اپنی خدائی میں کسی کو شریک بنایا ہے یا نہیں اور بنایا ہے تو وہ کون کون ہیں اور وہ کس نوعیت کے شریک ہیں۔ اگر اس نے کسی کا شریک ہونا تسلیم نہیں کیا ہے تو تم کو یا کسی کو کیا حق ہے کہ کسی کو اس کی خدائی میں حصہ دار بناتے۔ اب آؤ، میں اس نزاع کے فیصلے کے لیے اپنے اور تمہارے درمیان خدا ہی کو گواہ مانتا ہوں۔ اس نے میرے اوپر یہ قرآن اسی گواہی کے لیے نازل کیا ہے کہ میں تم کو خبردار کر دوں کہ کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور جن جن کو یہ پہنچے وہ بھی دوسروں کو خبردار کریں کہ وہ وحدہٗ لا شریک ہے۔ کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اب اس کے بعد بھی اگر تم مدعی ہو کہ دوسرے معبود خدا کے شریک ہیں تو میں اس بے دلیل گواہی کے لیے تیار نہیں۔ مجھے خدا کا حکم یہی ہے کہ میں اعلان کروں کہ وہ ایک ہی معبود ہے اور میں ان تمام چیزوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک

گردانتے ہو۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۠ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۰-۲۱)

'اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ' اس ٹکڑے پر تفصیلی بحث بقرہ کی تفسیر میں آیت ۱۴۶ کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ اس سے مراد صالحین اہل کتاب ہیں۔ قرآن میں اچھے اہل کتاب کا ذکر بالعموم بصیغۂ معروف ہی ہوا ہے۔ 'یَعْرِفُوْنَهٗ' میں ضمیر منصوب کا مرجع قرآن ہے جس کا ذکر اوپر 'وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ' میں گزر چکا ہے۔ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مراد لیا گیا ہے لیکن چونکہ یہاں سیاق کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کا ہے اس وجہ سے آپ کے لیے ضمیر غائب موزوں نہیں ہے ویسے باعتبار مدعا کوئی فرق واقع نہیں ہوگا اس لیے کہ نبی اور قرآن دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایسے لازم و ملزوم کہ قرآن میں، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کریں گے، ایک دوسرے سے بدل پڑے ہوئے ہیں۔ بقرہ میں ہم 'اَبْنَآءَهُمْ' کی تشبیہ پر بھی بحث کر چکے ہیں کہ جس طرح ایک مہجور باپ کا اپنے موعود و منتظر بیٹے کا انتظار ہوتا ہے اور جب وہ آتا ہے تو دور سے اس کے پیراہن کی خوشبو اس کے لیے نوید مسرت لاتی ہے اسی طرح صالحین اہل کتاب کو قرآن اور پیغمبر کا انتظار تھا اور اسی جذبے کے ساتھ جیسا کہ 'وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ' الآیۃ کے تحت گزر چکا ہے، انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔

صالحین اہل کتاب کی گواہی

اب یہ قرآن کی گواہی کو مزید موثق کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ کوئی غیر معروف گواہی نہیں ہے بلکہ جانی پہچانی ہوئی گواہی ہے۔ اس کا ذکر پچھلے آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے۔ تم سے پہلے جن کو کتاب عطا ہوئی وہ اس کو پہچانتے ہیں اور جو ان میں اہل ایمان ہیں وہ اس کے منتظر و مشتاق رہے ہیں۔ اس پر ایمان لانے سے محروم تو صرف وہ رہیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا۔ فرمایا جب خدا کی گواہی یہ ہے تو ان سے بڑھ کر بدقسمت ظالم اور نامراد کون ہو سکتا ہے جو اس گواہی کے خلاف خدا پر یہ جھوٹ باندھیں کہ اس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا ہے یا اس کی آیات کی تکذیب کریں جب کہ وہ توحید کی واضح تعلیم کے ساتھ ان کے پاس آگئی۔ ایسے ظالم کبھی فلاح پانے والے نہیں بن سکتے۔

یہ سورہ اگرچہ مکی ہے لیکن یہ اس دور کی سورہ ہے جب مدینہ کے اہل کتاب اس دعوت سے غیر متعلق نہیں رہے تھے بلکہ ان کے اشرار اس کی مخالفت کو شہ دے رہے تھے اور جو اچھے لوگ تھے وہ اس کو سابق صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی تصدیق سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے قرآن کا یہ اشارہ یہاں بڑا معنی خیز ہے۔ اس سے اخیار کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی اور ساتھ ہی ان لوگوں پر ایک چوٹ بھی لگا دی گئی جو جان کر انجان بن رہے تھے۔ اس مضمون کی مزید تفصیل اسی سورہ میں آگے آیت ۱۱۴ کے تحت آئے گی۔

وَیَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَیْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ

تَزْعُمُوْنَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۲-۲۴)

'جمیعاً' کی تاکید کا فائدہ

'وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا' میں 'جمیعاً' کی تاکید نے ان تمام گروہوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا۔ یعنی ان کو بھی جنھوں نے خدا پر جھوٹ گھڑ کے اس کے لیے شرکا ایجاد کیے ان کو بھی جنھوں نے مرنے کے بعد اٹھائے جانے اور جزا و سزا کا انکار کیا اور ان کو بھی جنھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی۔ اگرچہ یہ تمام جرائم ان تمام مشرکین کے مشترک جرائم تھے تاہم ان کے ذوقی رجحانات کچھ الگ الگ بھی تھے اس وجہ سے آگے کی آیات میں ان کا الگ الگ بھی ذکر ہوا اور ان سب پر ان کے جرائم کی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے ضرب لگائی گئی ہے۔

'فتنہ' کا مفہوم

'ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ' لفظ 'فتنہ' کی تحقیق دوسرے مقام میں گزر چکی ہے اگر اس کو اس معنی میں لیا جائے جس معنی میں مال و اولاد، دنیا اور زخارفِ دنیا کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے تب تو یہ اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ جس فتنۂ شرک اور جن جھوٹی اور موہوم آرزووں میں آج یہ مبتلا ہیں اس کے پردے اٹھ جائیں گے اور ان کو نظر آ جائے گا کہ جن سہاروں پر وہ جی رہے ہیں وہ محض فریب تھے۔ اس وقت ان کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آئے گا کہ جس طرح آج خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اسی طرح اپنے اوپر جھوٹ بولیں۔ اور اگر اس لفظ کو ظلم و تشدد سے دین سے پھیرنے کے معنی میں لیا جائے تو یہ اپنے فاعل کی طرف مضاف ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ آج جس فتنہ میں یہ کمزور مسلمانوں کو بجرم انکارِ شرک، مبتلا کر رہے ہیں وہ ختم ہو جائے گا، اور وہ خود ایسی آفتوں میں مبتلا ہو جائیں گے کہ آج جس شرک کی حمایت میں وہ مسلمانوں کو مظالم کا ہدف بنائے ہوئے ہیں خدا کی پکڑ میں آتے ہی اس سے برأت کا اعلان کریں گے اور جھوٹ بولیں گے۔ ان دونوں میں سے جو مفہوم بھی لیا جائے دونوں ہی صورتوں میں اندازِ کلام طنزیہ ہوگا اور استثنا منقطع۔ میرا غالب رجحان پہلے مفہوم کی طرف ہے اور ترجمہ میں اسی کا میں نے لحاظ رکھا ہے۔

مشرکین کا جھوٹ دنیا اور آخرت میں

'اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ' میں 'اُنْظُرْ' تصویرِ حال کے لیے ہے تاکہ مستقبل کا ایک ماجرا چشم تصور کے سامنے آ جائے 'كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ' کے معنی ہیں انھوں نے اپنے اوپر جھوٹی گواہی دی، یعنی دنیا میں جس شرک کی حمایت میں لڑتے مرتے رہے آخرت میں پہلے ہی قدم پر قسم کھا کر اس کا انکار کریں گے۔ اس میں یہ لطیف تعریض بھی ہے کہ دنیا میں یہ خدا کے خلاف جھوٹی گواہی دیتے رہے، جیسا کہ آیت ۱۹ میں مذکور ہے: اور آخرت میں اپنے اوپر جھوٹی گواہی دیں گے 'وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ' کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں خدا پر جھوٹ باندھ کر جن کو شرکا و شفعا کا درجہ دیا گیا تھا اور جن سے تمام امیدیں باندھی گئی تھیں وہ سب ہوا ہو گئے، ان میں سے کوئی کام نہ آیا۔

ایک سوال کا جواب

اجزا کی تشریح سے آیات کا مدعا خود بخود واضح ہوگیا ہے، مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ البتہ ایک سوال ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو۔ وہ یہ کہ قرآن کے بعض مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز مشرکین اپنے شرک کا اقرار کریں گے بلکہ اپنے شرکا کو پکاریں گے بھی اور آیت زیر بحث میں یہ تصریح ہے کہ وہ قسم کھا کے شرک سے اپنی برأت کا اعلان کریں گے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ احوال روز قیامت کے مختلف مراحل کے بیان ہوئے ہیں۔ اس روز مشرکین کو جس حیرانی و پریشانی سے سابقہ پیش آئے گا وہ ایسی ہوگی کہ اس میں ان کو نجات کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے گی اس وجہ سے جس مرحلے میں جو بات بنتی نظر آئے گی وہ بنانے کی کوشش کریں گے لیکن۔ ع

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْــــَٔـوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓي اِذْ وُقِفُوْا عَلَي النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۲۵-۲۸)

ایک سنتِ الٰہی کا بیان

وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا، اَكِنَّةً، کِنٌّ اور کِنَان، کی جمع ہے اس کے معنی پردہ اور ڈھکنے کے ہیں۔ 'وَقْر' بوجھ، ثقل اور گرانی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے وہ گرانی مراد ہے جو کانوں کو بہرہ کر دے۔ یہ جس حجاب اور جس بہرے پن کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ معنوی اور روحانی حجاب اور گرانی ہے جو دلوں اور کانوں کو سننے اور سمجھنے کی اس صلاحیت سے محروم کر دے جو انسانیت کا اصلی خاصہ ہے، جس سے محروم ہو کر انسان چوپایہ بلکہ چوپائے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ انسان پر یہ محرومی اس کی اپنی شامت اعمال کے نتیجہ میں مسلط ہوتی ہے جس کا ایک مخصوص ضابطہ ہے۔ اس ضابطہ یا بالفاظِ دیگر اس سنت اللہ کی پوری تفصیل ہم بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔ چونکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی ایک خاص سنت کے تحت واقع ہوتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف منسوب فرماتا ہے۔ بقرہ میں ختم قلوب کی بحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس آیت میں اَنْ يَّفْقَهُوْهُ کا متقابل فعل جو لفظ اٰذان کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ہو، محذوف ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

ایک حقیقتِ نفس الامری

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا، یہ محض مبالغہ کا ایک اسلوب بیان نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے عجائب اور کرشمے ظاہر نہیں ہوئے۔ آخر یہ ساری کائنات، آسمان و زمین، سورج، چاند، دریا، پہاڑ، ابر، ہوا، رات، دن کیا ہیں؟ کیا یہ کرشمے اور عجائب نہیں ہیں؟ ساری کائنات کرشموں اور عجائب سے بھری پڑی ہے لیکن

جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہی نہ ہوں، ان کا کیا علاج؛ جس طرح ان سارے عجائب اور کرشموں سے ان کی آنکھیں بند ہیں اگر اور کرشمے بھی ان کو دکھا دیے جائیں جب بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے اور اپنی ہٹ پر جمے ہی رہیں گے۔ ان کا علاج تو یہ ہے کہ یہ اپنی آنکھوں کی پٹیاں کھولیں اور گوش دل سے پیغمبر کی باتیں اور قرآن کی دعوت سنیں۔ یہ وہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو معجزوں اور کرشموں سے ان کو کیا نفع پہنچے گا۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ، 'اساطیر'، 'سطر' کے مادے سے 'اسطورۃ' اور 'اسطیرۃ' کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں بے سروپا داستان، بے اصل قصہ، فسانہ۔

قوموں کے عروج و زوال سے متعلق عربوں کا نظریہ اور اس کی تردید

قرآن نے اپنی دعوت کے سلسلہ میں بعض قوموں کی تاریخ جو پیش کی ہے وہ اس پہلو سے پیش کی ہے جو تاریخ کا اصلی مفید پہلو ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قوموں کا ابھرنا اور فنا ہونا اتفاقی واقعات کے طور پر ظہور میں نہیں آتا بلکہ اس میں اصلی دخل اخلاقی عوامل کو ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زندگی کے اخلاقی عناصر سے خالی ہو جاتی ہے تو قدرت کا قانون اس کو فنا کر دیتا ہے اور کوئی دوسری قوم اس کی جگہ اٹھا کھڑی کرتا ہے جو کہ کردار و اخلاق میں اس سے بہتر ہوتی ہے اور پھر اس کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ اقتدار پا کر کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔ اگر اس کا رویہ بھی بگڑ جاتا ہے تو پھر اس کو بھی فنا کر دیتا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لاتا ہے۔ عروج و زوال کے اس اصول کو بنیاد قرار دے کر قرآن نے عربوں کے سامنے، خود ان کے ملک اور ان کے گردوپیش کی تاریخ رکھی کہ عاد، ثمود، مدین، سبا، قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ کے فنا ہونے کے واقعات اتفاقی واقعات نہیں ہیں بلکہ یہ عروج و زوال کے اس خدائی ضابطے کے تحت ظہور میں آئے ہیں جو قوموں کی زندگی اور موت کے لیے خدا نے مقرر فرمائے ہیں۔ یہ قومیں اخلاقی و روحانی بیماریوں میں مبتلا ہوئیں تو اللہ نے ان کی اصلاح اور ان کے علاج کے لیے روحانی و اخلاقی طبیب یعنی انبیا بھیجے۔ ان انبیاء نے سرتوڑ کوشش کی کہ اپنی قوم کی بیماریاں دور کریں لیکن ان کی قوموں نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فنا کر دیا۔ یہ تاریخ سنا کر قرآن نے عربوں کو تنبیہ کیا کہ اس وقت تمہارے سامنے بھی زندگی اور موت کا یہی مرحلہ ہے۔ تمہارے اندر بھی خدا کا رسول آگیا ہے اور اگر تم نے اس کی بات نہ سنی تو تم بھی اسی طرح فنا کر دیے جاؤ گے جس طرح تمہاری پیشرو قومیں فنا کر دی گئیں۔

اہل عرب کے پندار پر قرآن کے اس انذار سے سخت چوٹ پڑتی تھی۔ اول تو ان پر یہی بات شاق گزرتی تھی کہ وہ کسی اخلاقی و روحانی بیماری میں مبتلا ہیں جس کے نتیجے میں ان پر عذاب الٰہی آنے والا ہے، دوسری یہ کہ وہ اس بات کو بالکل بعید از عقل سمجھتے تھے کہ قومی عروج و زوال میں اخلاقی عوامل کو کوئی دخل ہوتا ہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ قومیں بھی افراد و اشیا کی طرح جیتی اور مرتی ہیں، جس طرح ایک

فرد یا ایک درخت پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے پھر مرجاتا ہے یا سوکھ جاتا ہے اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی، جوان ہوتی اور فنا ہوجاتی ہیں۔ اس چیز کو کردار وایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اہل عرب کا یہ قول جو قرآن میں نقل ہوا ہے کہ 'وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ' (ہمیں نہیں تباہ کرتی مگر گردشِ روزگار) وہ بھی قرآن اور پیغمبر کے اسی انذار کے جواب میں کہتے تھے کہ یہ غلط ہے کہ قومیں اخلاق وایمان کی بنا پر تباہ ہوتی ہیں، ایمان واخلاق کو اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب گردشِ روزگار کے کرشمے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ان کا نظریہ یہ تھا تو قرآن کے اس تاریخی نقطۂ نظر پر ان کو غصہ آنا ہی تھا اور ان کا یہ غصہ اور بھی بڑھ جاتا تھا جب وہ یہ دیکھتے کہ بہت سے لوگ اس تاریخی حقیقت سے اثر پذیر ہو کر یہ اندیشہ بھی کرنے لگے ہیں کہ اگر انھوں نے پیغمبر اور قرآن کی بات نہ مانی تو وہ عذاب کی گرفت میں آجائیں گے۔ اس بوکھلاہٹ میں وہ یہ کہتے کہ 'إِنْ هٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ' یہ قرآن ہے کیا، بس اس میں پچھلی قوموں کے کچھ بے سروپا افسانے ہیں جن کو نعوذ باللہ ایک سرپھرا سناتا پھر رہا ہے۔ اس پر نحل کی آیت ۲۴ کے تحت مزید بحث آئے گی۔

حذف کا ایک اسلوب

'فَقَالُوا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا' یہاں تمنی کا جواب 'فنصدق' یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے اور 'وَلَا نُكَذِّبَ' اسی محذوف پر معطوف ہے اس وجہ سے مضارع خفیف کی شکل میں آیا ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں اس سے پہلے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔ مثالیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چونکہ مذکورہ بالا تمنا کے جواب میں فنصدق یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا آنا بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور 'ولا نکذب' میں جو حرف عطف ہے اس کے ذریعہ سے محذوف کا پتا دے دیا۔ 'ولا نکذب' کے اظہار میں جو بلاغت ہے وہ یہ ہے کہ اس سے ان کی حسرت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور اعتراف جرم کا بھی۔ یعنی آج تو یہ اکڑ رہے ہیں اور قرآن کو ایک داستانِ پارینہ قرار دے رہے ہیں لیکن کل حسرت کریں گے کہ کاش ہم پھر دنیا میں جائیں کہ اپنے رب کی آیات کی تصدیق کریں اور ان کی تکذیب نہ کریں۔

اجزائے کلام کی وضاحت کے بعد ایک اجمالی نظر ان آیات پر پھر ڈال لیجیے۔

قرآن کی تکذیب کرنے والے سرہنگوں کا انجام

اوپر آیات ۲۱-۲۴ میں شرک کے سرغنوں کا انجام واضح کیا گیا تھا، زیر بحث آیات میں قرآن کی تکذیب کرنے والے سرہنگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ ان کے کچھ اشرار تمھاری باتیں اور تمھارا پیش کردہ کلام سنتے تو ہیں لیکن سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے نہیں بلکہ بحث وجدال کے لیے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس کو بہانہ بنا کر تم سے کٹ حجتی کر سکیں۔ ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر ان کی بداعمالیوں کے سبب سے مہر ہو چکی ہے اس وجہ سے اب یہ اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نہ خیال کرو کہ ان کی طلب کے مطابق اگر ان کو معجزہ دکھا دیا جائے تو اس کو مان لیں گے اور پھر اس قرآن پر ایمان لائیں گے۔ نہیں، اگر یہ دنیا جہان کے

معجزے بھی دیکھ لیں گے جب بھی یہ اسی طرح کٹ حجتی کریں گے اس لیے کہ ان کے انکار اور ان کی تکذیب کی اصل علت جب بھی باقی رہے گی۔ ان کے اندر بات کے سننے اور سمجھنے کا کوئی ارادہ ہی موجود نہیں ہے چنانچہ سب کچھ سن کر تمھارے پاس جھگڑنے کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں اس قرآن میں رکھا ہی کیا ہے، اگلوں کی داستانیں اور پچھلوں کے فسانے!! فرمایا کہ اس طرح یہ دوسروں کو بھی اس سے روک رہے ہیں اور خود بھی اس سے متکبرانہ اعراض کر رہے ہیں لیکن اطمینان رکھو، نہ یہ خدا کا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ تمھارا، بلکہ یہ اپنے آپ ہی کو ہلاکت کے گڑھے میں جھونک رہے ہیں لیکن ابھی چونکہ وہ انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے جس سے ان کو خبردار کیا جا رہا ہے اس وجہ سے ان کو اس کا احساس نہیں ہے۔ اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ اپنے انجام سے دوچار ہوں گے تو دیکھتے کہ جب یہ دوزخ کے کنارے پر کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے، اے کاش ہم پھر دنیا میں لوٹائے جائیں کہ قرآن کی تصدیق کریں اور اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں اور اہل ایمان میں سے بنیں۔ فرمایا کہ وہ اپنے اس اعتراف میں بھی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ پھر لوٹائے جائیں تو وہی کریں گے جس سے وہ روکے گئے ہیں اس لیے کہ ان کی تکذیب کی علت یہ نہیں تھی کہ اصل حقیقت ان پر واضح نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر سچا ہے، قرآن حق ہے، جزا و سزا شدنی ہے لیکن حُبِ دنیا، غرور اور حسد کے حجابات نے ان کی آنکھیں کھلنے نہ دیں۔ اب اگر دنیا میں جائیں گے تو جس طرح دل کی شہادت کے خلاف پہلے حق کو جھٹلاتے رہے ہیں اسی طرح پھر اس کو جھٹلائیں گے اور اس مشاہدے کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک ڈراؤنا خواب قرار دے لیں گے۔

وَقَالُوٓا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۝ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ وُقِفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۚ قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَآءِ اللَّهِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا يَٰحَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ۚ أَلَا سَآءَ مَا يَزِرُونَ ۝ وَمَا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَآ إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ ۖ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۲۹-۳۲)

قیامت کو جھٹلانے والوں کا انجام

ان آیات میں کوئی ادبی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ مکذبین قرآن کے بعد اب یہ مکذبین قیامت کا انجام بیان کیا جا رہا ہے جو اس دنیا کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے تھے اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے یا تو قائل ہی نہ تھے یا اس کو بہت ہی بعید از قیاس و امکان چیز سمجھتے تھے۔ فرمایا کہ اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے تو دیکھتے کہ ایک دن یہ سب اپنے رب کے حضور لا کھڑے کیے جائیں گے اور ان سے سوال ہوگا کہ کیوں یہ دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اور قیامت کا آنا ایک امر واقعہ ثابت ہوا یا نہیں؟ اس وقت وہ کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم! یہ تو ایک امر واقعہ ہے۔ حکم ہوگا کہ پھر اب اس دن کے انکار کی پاداش میں چکھو مزا عذاب کا۔ اس کے بعد مکذبین کو تنبیہ کے ساتھ اہل ایمان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ جن شامت زدوں نے

اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا وہ سخت گھاٹے میں پڑے، جب قیامت کی گھڑی اچانک آ دھمکے گی تو یہ حسرت سے اپنے سر پیٹیں گے اور کہیں گے ہم نے دنیا کی زندگی پر ریجھ کر اس دن کی تیاریوں میں جو کوتاہی کی اس پر افسوس! فرمایا کہ اس دن ان کی تصویر یہ ہوگی کہ سب اپنے اپنے گناہوں کے بوجھ اپنی اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے۔ نہ ان کے ساتھ ان کے اعوان و انصار ہوں گے نہ شرکا و شفعاء، نفسی نفسی کا عالم۔ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (کوئی جان بھی کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہ بنے گی) پھر آگاہی دیتے ہوئے فرمایا کہ کیا ہی برا ہوگا وہ بوجھ جس کو یہ اٹھائے ہوئے ہوں گے اس لیے کہ یہ بوجھ ان کے سروں سے پھر کبھی اترنے والا نہیں۔ اس کے بعد آخرت سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے والوں کے لیے تسلی کا پہلو اور زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ یہ دنیا کی زندگی جس نے انھیں آخرت سے غافل کر دیا ہے کیا ہے؟ محض بے نتیجہ لہو و لعب، چند روزہ دل کا بہلاوا! اصل شئے تو دار آخرت اور اس کی زندگی ہے جو آخرت سے ڈرنے والوں کے لیے اس دنیا کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ پس کیا تم سمجھتے نہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۳۳-۵۰

پیغمبر صلعم کو تسلی

اوپر کا مجموعہ آیات، جیسا کہ آپ نے دیکھا، تسلی کے مضمون پر ختم ہوا ہے۔ اب وہی تسلی کا مضمون آگے بڑھ رہا ہے البتہ اس تسلی میں کچھ تیزی بھی آ گئی ہے، اگرچہ یہ تیزی، جہاں تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا تعلق ہے، اپنے اندر نہایت دلنواز ٹھنڈک رکھتی ہے اس لیے کہ اس میں عتاب و غضب کا جو پہلو ہے اس کا رخ تمام تر ان ہٹ دھرم منکرین کی طرف ہے جو در پے تھے کہ پیغمبر کوئی معجزہ دکھائیں تب وہ مانیں گے کہ یہ پیغمبر ہیں اور جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں یہ خدا کا کلام و پیغام ہے۔ قدرتی طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اور عام مسلمانوں پر بھی ان کے اس مطالبے کا اثر پڑتا تھا۔ خاص طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو سراپا رافت و رحمت تھے اور اپنی قوم کے ایمان کے لیے اپنے اندر نہایت گہری تڑپ رکھتے تھے اس مطالبے سے متاثر ہو کر اس بات کے خواہش مند ہو جاتے تھے کہ ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر ہو جائے، شاید یہ اس طرح ایمان لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی کہ ان کا یہ مطالبہ تمھارے لیے وجہ پریشانی نہ بنے۔ یہ تمھاری تکذیب نہیں بلکہ آیات الٰہی کی تکذیب ہو رہی ہے تو جب خدا سب کچھ دیکھا اور سن رہا ہے اور ان کا مطالبہ پورا کرنے کی قدرت کے باوجود، پورا نہیں کر رہا ہے تو تم کیوں پریشان ہو۔ تم سے پہلے جو انبیا آئے ان کی بھی اسی طرح تکذیب ہوئی، انھوں نے برداشت کیا اسی طرح تم بھی برداشت کرو۔ سنت الٰہی یہی ہے۔

اس کے بعد نہایت تیکھے اور تند انداز میں فرمایا کہ اگر اللہ بجبر و زور ان کو ایمان کی راہ پر لانا چاہتا تو سب

کو آن کے آن میں مومن و مسلم بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے یہی پسند فرمایا کہ لوگ اپنی عقل و فہم سے کام لیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان کی راہ اختیار کریں تو تم ان کے ایمان کی خواہش سے مغلوب ہو کر کیوں اس بات کے لیے بے قرار ہوتے ہو کہ لازماً کوئی ایسا معجزہ ظاہر ہو ہی جائے جو ان کو قائل کر کے خدا کے آگے جھکا ہی دے، خدا تو یہ بات نہیں چاہتا۔ تم اگر چاہتے ہو تو آسمان و زمین جہاں سے ہو سکے اس طرح کا معجزہ لا کر دکھا دو۔

اس کے بعد بتایا کہ کن صفات کے لوگ ایمان لائیں گے، کن صفات کے لوگ معجزے ہی مانگتے رہیں گے۔ پھر ان کے مطالبہ کے مطابق معجزہ نہ بھیجنے کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا اور اس کائنات میں قدرت کے جو بے شمار معجزات ہیں اور اللہ نے اپنی کتاب میں جو دلائل و براہین بیان فرمائے ہیں ان کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ جو لوگ ان چیزوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں وہ گونگے بہرے اور اندھے ہیں۔ ان کی آنکھیں کوئی چیز بھی نہیں کھول سکتی۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر یہ لوگ کوئی نشانئ عذاب مانگتے ہیں تو ان سے پوچھو کہ اگر کوئی عذاب آیا یا قیامت ہی آگئی تو اس سے بچاؤ کا کیا سامان انھوں نے کر رکھا ہے؟ اس وقت تو خدا خدا ہی پکاریں گے۔ اس سلسلے میں انبیا اور ان کی قوموں کی تاریخ کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان قوموں کو ہم نے اپنی اس طرح کی نشانیاں دکھائیں لیکن انھوں نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تباہ کر دی گئیں۔ اسی طرح اگر یہ کسی ظاہری یا باطنی پکڑ میں آگئے تو اس سے ان کو خدا کے سوا کون بچانے والا بنے گا؟

آخر میں انبیاء کا فریضۂ منصبی بتا دیا کہ ان کا کام انذار و تبشیر ہے نہ کہ معجزے اور عذاب کی نشانیاں دکھانا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرا دیا کہ نہ میں خدا کے خزانوں کا مالک ہوں، نہ غیب جانتا ہوں، نہ فرشتہ ہونے کا مدعی ہوں، بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مجھ پر آتی ہے۔ جس کا جی چاہے اس کو مانے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر بہرحال ثابت ہے کہ خدا کے ہاں اندھے اور ڈھٹیارے دونوں ایک درجہ میں نہیں ہوں گے ـــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۳-۵۰

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ
اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾

النصف

وقف غفران

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ

وقف منزل

اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ

عند البعض لا يسمعون

رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ
بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ
ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ
بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ
عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ
اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾
بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ
مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ

ع ۴ ۱۱ ۱۰

بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ
بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ
اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً

فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾

ع ۵ ۹ ۱۱

ترجمۂ آیات ۳۳-۵۰

ہم آگاہ رہے ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے تم کو غم ہوتا ہے تو صبر کرو، یہ تو تمھیں نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور ایذا دیے جانے پر صبر کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آگئی۔ اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور پیغمبروں کی کچھ سرگزشتیں تو تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ ۳۳-۳۴

اور اگر ان کا اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ ڈھونڈ سکو کہ ان کے پاس کوئی نشانی لا دو تو کر دیکھو۔ اگر اللہ چاہتا تو

ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا تو تم جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ بات تو وہی مانیں گے جو سنتے سمجھتے ہیں، رہے یہ مُردے تو اللہ ان کو اٹھائے گا پھر یہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ۳۵-۳۶

اور یہ کہتے ہیں، اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی نشانی اتار دے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور کوئی جانور نہیں جو زمین پر چلتا ہو اور کوئی پرندہ نہیں جو فضا میں اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتا ہو مگر یہ سب تمھاری ہی طرح اُمتیں ہیں۔ اور ہم نے اپنی کتاب میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے پروردگار کے حضور اکٹھے کیے جائیں گے۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا یہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہُوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ۳۷-۳۹

کہہ دو، بتاؤ، اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے یا قیامت آدھمکے تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ بلکہ اسی کو پکارو گے تو وہ دُور کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس کے لیے تم اس کو پکارتے ہو اگر چاہتا ہے اور جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان کو بھول جاتے ہو۔ ۴۰-۴۱

اور ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی اُمتوں کے پاس اپنے رسول بھیجے پس ان کو مالی اور جسمانی تکالیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ خدا کے آگے جھکیں تو کیوں جب ہماری پکڑ آئی وہ خدا کی طرف نہ جھکے بلکہ ان کے دِل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کی نگاہوں

ہیں اسی عمل کو کھبا دیا جو وہ کرتے رہے تھے تو جب انھوں نے فراموش کر دیا اس چیز کو جس سے ان کو یاد دہانی کی گئی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ جب وہ اس چیز پر اترانے لگے جو انھیں دی گئی تو ہم نے ان کو دفعتہً پکڑ لیا، وہ بالکل ہک دک رہ گئے۔ پس ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کا ارتکاب کیا۔ اور شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے تمام عالم کا رب! ۴۵

کہو، بتاؤ، اگر اللہ تمھارے سمع و بصر کو سلب کر لے اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو اس کو واپس لا دے، دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں، پھر بھی وہ اعراض کر رہے ہیں۔ پوچھو، بتاؤ کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر بے خبری میں اچانک آ دھمکے یا ڈنکے کی چوٹ آئے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہوگا؟ اور ہم رسولوں کو تو صرف خوش خبری دینے والے اور خبردار کرنے والے ہی بنا کر بھیجتے ہیں تو جو ایمان لائے اور جنھوں نے اصلاح کر لی تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم ہوگا۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ان کی نافرمانی کی پاداش میں ان کو عذاب پکڑے گا۔ ۴۶-۴۹

کہہ دو، میں تمھارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب جانتا اور نہ یہ دعویٰ کرتا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ کہہ دو، کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟ ۵۰

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ۝ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ (۳۳-۳۴)

زبان کا ایک اسلوب

کفار کے مطالبات سے بے اعتنائی کی حکمت

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ، بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ جب مضارع پر اس طرح قد آتا ہے تو وہ پتہ دیتا ہے کہ یہاں فعل ناقص محذوف ہے۔ گویا قد نعلم اصل میں قد کنا نعلم ہے جس سے مضمون میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ یہ بات برابر خدا کے علم میں رہی ہے اور ہے۔ وہ اس سے کبھی بے خبر نہیں ہوا کہ جو کچھ یہ ہٹ دھرم منکرین و مکذبین کہتے ہیں اس سے تمھیں غم پہنچتا ہے۔ "جو کچھ کہتے ہیں" سے مراد اسی طرح کی باتیں ہیں جن کی طرف آیت ۸ میں اشارہ گزر چکا ہے یا آگے آیات ۳۷، ۵۰ میں آ رہا ہے کہ اگر یہ خدا کے فرستادہ ہیں تو یہ کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھاتے، ان پر ان کی صداقت کی منادی کے لیے کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترتا، یہ آسمان سے براہ راست کوئی کتاب ما بین الدفتین اترتی کیوں نہیں دکھاتے، یہ کسی خزانے کے مالک کیوں نہ ہوئے، جس عذاب کے ڈراوے سنا رہے ہیں اس کا کوئی نمونہ کیوں نہیں دکھاتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا کہ یہ سب باتیں ہم جانتے، دیکھتے، سنتے رہے ہیں تو پھر علم اور قدرت کے باوجود اگر ہم نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو اطمینان رکھو ہم نے اسی میں حکمت اور بہتری سمجھی۔

نبی کے لیے تسلی کا ایک دلنواز پیرایہ

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ، یہ تسکین و تسلی کا نہایت دلنواز جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے علم و قدرت کے باوجود ان کی ان خرافات کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو تم بھی صبر کرو، یہ تمھاری تکذیب تو نہیں ہو رہی ہے بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس تمام خاکبازی اور اس تمام استہزا کے ہدف تنہا تمھی تو نہیں ہو، اصل ہدف تو ہم اور ہماری کتاب ہے، پھر تم اپنے دل کو آزردہ کیوں کرو، معاملے کو ہم پر چھوڑ دو۔ ساتھ ہی ان کے لیے 'ظالمین' کا لفظ استعمال کر کے یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ اس سے نقصان کسے پہنچ رہا ہے؟ خود انھی کو۔ یہ بدقسمت اور نامراد لوگ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ نہ تمھارا کچھ بگاڑ رہے ہیں، نہ خدا کا۔

نصرت الٰہی کے ظہور کے لیے سنت الٰہی

'وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ' یہ اسی تسکین و تسلی کے مضمون کی تائید و تقویت کے لیے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور ان کی امتوں کے امتحان کے لیے پسند فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی براہ راست مدد سے ہمکنار ہونے کے لیے ابتلاء و امتحان کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر خدا کی نصرت ظاہر نہیں

ہوتی۔ اس دوران میں ان انبیاء کی قوموں کی طرف سے برابر ان کی تکذیب ہوتی ہے۔ ان کو ہر قسم کی ایذائیں دی جاتی ہیں اور ہر پہلو سے ان کو زچ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح جو کچھ حق کے مخالفین کے اندر رہتا ہے وہ بھی اُبھر کر باہر آجاتا ہے اور جو جوہر نبی اور اس کے ساتھیوں کے اندر ہوتا ہے وہ بھی نکھر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ منکرینِ حق پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور نبی اور ان کے ساتھی سزاوار ہوتے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی مدد ظاہر ہو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی سنت ہے اور اللہ کی سنت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ تمام رسولوں کی سرگزشتیں اس سنت اللہ پر شاہد ہیں اور تمھیں ان سرگزشتوں کا کچھ حصہ سنایا بھی جا چکا ہے جس سے تم پر اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ جس طرح کے حالات سے انھیں گزرنا پڑا اسی طرح کے حالات سے تمھیں بھی گزرنا ہے۔

وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۘ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (۳۵-۳۶)

'وَإِنْ كَانَ .... فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ'۔ اس جملہ میں جوابِ شرط محذوف ہے اور فصیح عربی میں جوابِ شرط کا حذف ایک معروف بات ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں بہت ہیں۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

نبی ہر پہلو سے کسوٹی ہوتا ہے

جہل کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں تفصیل کے ساتھ بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ علم اور حلم دونوں کے ضد کی حیثیت سے آتا ہے بلکہ اس کا غالب استعمال 'حلم' کے ضد کی حیثیت ہی سے ہے اسی وجہ سے اس کے معنی ہوتے ہیں جذبات سے مغلوب ہو جانا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی طہارتِ فطرت کے سبب سے جذباتِ نفس اور خواہشاتِ نفس سے تو کبھی مغلوب نہیں ہوتے لیکن جذباتِ خیر میں سے کسی جذبہ کا غلبہ ان پر بھی کبھی کبھی اتنا ہو جاتا ہے جو حدِ مطلوب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بجائے خود نہایت اعلیٰ بات ہے لیکن حضرات انبیاء چونکہ معیار اور کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس پہلو میں بھی ان کو حدِ مطلوب سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ نبی کے اندر اس بات کی شدید آرزو ہوتی ہے کہ اس کی قوم ایمان لائے تاکہ وہ عذابِ الٰہی سے بچ جائے۔ یہ جذبہ نبی کی رافت و رحمت کی دلیل اور اس کی غیرتِ حق کی شہادت ہے لیکن یہ جذبہ بھی مطلوب اسی حد تک ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ کی اس سنت سے ہم آہنگ ہے جو لوگوں کے کفر و ایمان کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کی طرف آیت ۳۴ میں اشارہ گزرا۔ اگر اس حد سے اس کے آگے بڑھنے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اس سے روک دیتا ہے۔

'إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ وَالْمَوْتَىٰ ....'، 'يَسْمَعُونَ' یہاں اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی جو سنتے

اور سمجھتے ہیں۔ جو سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں ان کا سننا اور نہ سننا دونوں برابر ہے۔ 'موتٰی' سے مراد یہاں عقل اور دل کے مردے ہیں اس لیے کہ زندگی درحقیقت عقل اور دل ہی کی زندگی ہے۔ ع مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔

نبیؐ کے لیے محبت آمیز عتاب

ان آیات میں بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب ہے لیکن یہ عتاب بڑا محبت آمیز عتاب ہے اور اگر اس میں کوئی تلخی اور ترشی ہے تو اس کا رخ تمام تر ان ضدیوں اور ہٹ دھرموں کی طرف ہے جن کے ایمان کی آرزو پیغمبرؐ کے اندر اتنی شدید تھی کہ آپ ان میں سے کسی کو بھی ایمان سے محروم دیکھنے پر راضی نہ تھے اور چاہتے تھے کہ ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی نہ کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ فرمایا کہ اگر ان کا ایمان نہ لانا تم پر اتنا ہی شاق گزر رہا ہے تو تم زمین کے اندر کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی تلاش کر کے ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ لاسکو تو لا دو۔ ہم تو معجزوں کے بل پر دلوں کے اندر ایمان اتارنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم نے تو ایمان کے لیے جو راہ پسند کی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے کان، آنکھ اور عقل و ادراک کو استعمال کریں، آفاق و انفس کے دلائل پر غور کریں، پیغمبر کی باتیں سنیں، سوچیں اور سمجھیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان کی راہ اختیار کریں۔ اگر جبر اور بزور لوگوں کو ہدایت پر جمع کر دینا ہوتا تو ہمارے لیے یہ کیا مشکل کام تھا۔ ہم چشم زدن میں سب کو ایمان و ہدایت کی راہ پر چلا دیتے۔ تو تم ان کے ایمان کی آرزو میں اتنے جذبات سے مغلوب نہ ہو جاؤ کہ اس باب میں جو اللہ کی حکمت اور سنت ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

اس کے بعد فرمایا کہ تمہاری دعوت تو وہی قبول کریں گے جو سننے سمجھنے والے ہیں اور جن کے دل زندہ ہیں، جو گونگے بہرے ہیں اور جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں ان کو بس اللہ کے حوالے کرو، جب یہ قیامت کو اٹھیں گے تو ان پر سارے حقائق کھل جائیں گے۔ ان کے پیچھے تم اپنے کو مبتلائے غم نہ کرو۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۷-۳۹)

نشانیٔ عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ، اس سے مراد یوں تو ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی بھی ہو سکتی ہے جن کا کفار کی طرف سے مطالبہ تھا لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان لوگوں کو جواب دیا جا رہا ہے جو کسی ایسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے جو یہ ثابت کر دے کہ اگر انھوں نے پیغمبر کی تکذیب کی تو ان پر عذاب آ جائے گا۔ آگے کی آیات سے بالتدریج یہ قرینہ خود بخود ابھر کر

سامنے آجائے گا اس وجہ سے دلائل کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سورہ میں بھی اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی کفار کا یہ مطالبہ اپنے اپنے زمانے کے پیغمبروں سے نقل ہوا ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہم نے تمھاری تکذیب کی تو ہم پر عذاب آجائے گا تو اس عذاب کا کوئی نمونہ ہمیں دکھا دو جس کی دھمکی سنا رہے ہو، بس اسی سے ہمارے اور تمھارے جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے گا۔

قُلْ إِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى أَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ فرمایا کہ خدا تو اس طرح کا کوئی نشان دکھا دینے پر ہر وقت قادر ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں۔ "اکثر لوگ جانتے نہیں" بظاہر نہایت مجمل جواب ہے لیکن اس اجمال کے اندر بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ اس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ یہ نادان اور مغرور لوگ اس طرح کی نشانی کے ظہور کے نتائج سے آگاہ نہیں۔ ان کے نزدیک یہ محض ایک کھیل تماشہ ہے حالانکہ یہ نشانی اگر ظاہر ہوگئی تو سب کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ دوسری یہ کہ یہ خدا کی اس حکمت اور سنت سے واقف نہیں ہیں جو انبیا اور ان کے مکذبین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو فوراً پکڑ لے بلکہ وہ ان کو ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے جس میں ان پر ہر پہلو سے خدا کی حجت پوری کر دی جاتی ہے۔ جب یہ حجت پوری ہو چکتی ہے تب خدا ان کو پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو پھر ان کو کوئی چھڑا نہیں سکتا۔ تیسری یہ کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ پیغمبر کی دھمکی جھوٹی ہے یا خدا کے ہاتھ ہی بے بس ہیں حالانکہ خدا سرکشوں کو جو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے تو اس وجہ سے کہ اس کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے۔ وہ رسی کتنی ہی دراز کر دے لیکن اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے قابو سے باہر نکل سکے۔ چوتھی یہ کہ یہ بدقسمت لوگ اس رحمت سے ناآشنا ہیں جو اس مہلت کے اندر مضمر ہے بشرطیکہ اس سے فائدہ اٹھائیں اللہ تعالیٰ رحمت میں سبقت کرتا ہے، غضب میں سبقت نہیں کرتا۔ وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ وہ توبہ اور اصلاح کے دروازے اس وقت تک کھلے رکھتا ہے جب تک بندے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے خود ان کو اپنے اوپر بند نہ کر لیں۔

حذف کے بعض اسلوب

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ۔ اس ٹکڑے میں حذف کا وہی اصول ملحوظ ہے جو سورہ نساء کی آیت ۱۴۴ میں ہے۔ یعنی جملے میں متقابل کے بعض الفاظ حذف ہو گئے ہیں اس لیے کہ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا ہے۔ مثلاً جملہ کے پہلے حصہ میں فِي الْاَرْضِ کا لفظ ہے تو دوسرے حصے میں فِي السَّمَآءِ کا لفظ حذف ہو گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے حصے میں يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ کے الفاظ ہیں تو پہلے حصے میں تَدِبُّ عَلٰى رِجْلَيْهَا یا عَلٰى اَرْجُلِهَا کے الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ فصیح عربی میں اس طرح کا حذف معروف ہے لیکن اردو میں یہ اسلوب نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے مواقع میں محذوف کو کھول دینا زیادہ بہتر ہے ورنہ یا تو پوری بات ادا نہیں ہو پاتی یا جملہ کا

درد بست ٹھیک نہیں ہوتا چنانچہ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

آفاق کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ کے الفاظ تو بظاہر نہایت مجمل ہیں لیکن غور کیجیے تو ان میں بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ نشانیاں مانگنے والوں کو یہ آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم کوئی ایک نشانی مانگتے ہو، خدا کی تو یہ پوری کائنات نشانیوں سے بھری پڑی ہے، زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ خدا کی ایک نشانی ہے۔ غور کرو تو تم دیکھ سکتے ہو کہ جس طرح تمھارے انفرادی اور اجتماعی وجود کے اندر خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت کی بے شمار نشانیاں ہیں جو تم پر توحید، جزا و سزا اور پیغمبر کی دعوت کی صداقت کی گواہی دے رہی ہیں اسی طرح اس کائنات کی دوسری مخلوقات کے اندر بھی خالق کی قدرت حکمت اور ربوبیت کے دلائل موجود ہیں، جس طرح تم ایک نوع ہو اسی طرح یہ بھی الگ الگ نوعیں ہیں، جس طرح تم ایک فطرت رکھتے ہو، اسی طرح یہ بھی اپنی ایک مخصوص جبلت رکھتے ہیں، جس طرح تم شعور، ادراک اور جذبات رکھتے ہو اسی طرح اپنے جبلی تقاضوں اور اپنے منشائے تخلیق کے اعتبار سے یہ بھی اپنے اندر شعور، ادراک اور جذبات رکھتے ہیں، جس طرح تمھارے اجتماعی شعور نے تمھیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ تم اپنے آپ کو ایک سیاسی نظام کے اندر باندھ کر رکھو اسی طرح ان کی ہر نوع کے اندر بھی اپنی اجتماعی ہستی کا ایک شعور ہے جو انھیں آمادہ کرتا ہے کہ یہ ایک وحدت کے اجزا کی طرح اپنے اجتماعی وجود کے بقاء و تحفظ کا سامان کریں اور اپنے نوعی مقصد تخلیق کی تکمیل میں ان کا ہر فرد اپنا حصہ ادا کرے۔ سورۂ نحل میں قرآن نے اسی حقیقت کے ثبوت میں، جس کی طرف یہاں اشارہ ہے، شہد کی مکھی کا ذکر فرمایا ہے اور اس کے نوعی نظام میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار نمایاں ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آج سائنس نے حیوانات کی مختلف انواع کے جبلی خصائص و عجائب سے جو پردے اٹھائے ہیں یوں تو ان میں سے ہر انکشاف انسان کو حیران کر دینے کے لیے کافی ہے لیکن نہایت حقیر اور چھوٹی چیزوں میں سے شہد کی مکھی اور چیونٹی ہی کو لیجیے اور ان کا مشاہدہ کیجیے تو آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی۔ ان کے اندر اولاد کی پرورش کا کیسا انتظام ہے، خطرات سے بچاؤ کے لیے کیسی بیداری ہے، مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیسی پیش بینی ہے، جماعتی فرائض کا کیسا شدید احساس ہے، کیسی اعلیٰ تقسیم کار ہے، کس درجہ مضبوط نظام امر و طاعت ہے، ضروریات کی فراہمی کے لیے کیسی انتھک سرگرمی ہے، رہائش اور اپنے ذخائر کی حفاظت کے لیے تعمیر کا کیسا کمال فن ہے، تلاش و جستجو کا کیسا ثمین جذبہ اور حصولِ مطلوب کے لیے کیسی زیرکی و ہوشیاری اور پھر کتنی جان بازی و قربانی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ وجود میں آگیا ہے اور اپنے ہی بل پر چل رہا ہے یا اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہے؟ اگر اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہے تو کیا وہ سب کچھ بنا کر ایک گوشہ میں بے تعلق ہو کر بیٹھ گیا ہے یا براہِ راست اس پوری کائنات کی حفاظت فرما رہا ہے، کیا یہ

سب کچھ کسی اندھی بہری قوت قاہرہ کا ظہور ہے یا کسی قادر و قیوم، علیم و حکیم اور رحمان و رحیم ہستی کی قدرت و رحمت کا فیضان ہے؟ کیا یہ مختلف ارادوں، متضاد قوتوں اور بے شمار دیویوں، دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے یا ایک ہی خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کی ایک جلوہ گاہ ہے؟ کیا یہ سارا کارخانہ بالکل بے مقصد، بے غایت اور بے انجام نظر آتا ہے یا اس کی ایک ایک چیز پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے جس کا ظہور قطعی اور یقینی ہے؟ کیا اس کے ظاہر و باطن سے یہ شہادت مل رہی ہے کہ انسان اس کے اندر شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ کھائے پیے، عیش کرے اور ایک دن ختم ہو جائے یا اس سے یہ شہادت مل رہی ہے کہ جس قادر نے یہ دنیا بنائی ہے، جس حکیم نے اس کے ایک ایک ذرے میں اپنی حکمت کی شان دکھائی ہے، جس رحیم نے اپنی ربوبیت و رحمت کے یہ خوانِ نعمت بچھائے ہیں وہ ایک دن سب کو ضرور اکٹھا کرے گا اور ہر ایک کی نیکی بدی کو ضرور تولے گا اور پھر اس کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

انسان کی فطرت اگر مسخ اور اس کی عقل اگر مفلوج نہ ہو گئی ہو تو وہ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ ان سب باتوں میں سے دوسری ہی بات صحیح ہے۔ اگر یہی بات صحیح ہے اور بدیہی طور پر یہی صحیح ہے تو قرآن اسی کو ماننے کی دعوت دے رہا ہے۔ پھر اس کو ماننے کے لیے کسی معجزے کی کیا ضرورت ہے؟ اس حقیقت کی شہادت تو اس کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ اس کا گواہ ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کے اندر کی شہادتوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے تو باہر کی ان نشانیوں ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھ لے جو نیچے بھی موجود ہیں اور اوپر بھی۔

قرآن دلائل کا خزانہ ہے

'مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ' میں عام طور پر لوگوں نے 'کتاب' سے وہ خدائی رجسٹر مراد لیا ہے جس میں سب کچھ مندرج ہے۔ اگرچہ یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے لیکن سیاق و سباق کی روشنی میں ہمارا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ یہاں 'اَلْكِتٰب' سے مراد قرآن مجید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ کائنات ان نشانیوں سے مملو ہے جو پیغمبر کی دعوت کی حقانیت کی شاہد ہیں اسی طرح ہم نے قرآن میں بھی اپنے دلائل و براہین بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ایک ایک دعوے کو ایسے ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت کیا ہے اور اتنے مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے حجت قائم کی ہے کہ صرف عقل و دل کے اندھے اور بہرے ہی ان کے سمجھنے سے قاصر رہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ 'ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ' کے الفاظ میں یہ لطیف تعریض ہے کہ جہاں تک نشانیوں اور دلائل کا تعلق ہے ان سے تو یہ صحیفۂ کائنات بھی مملو ہے اور یہ صحیفۂ قرآن بھی معمور ہے لیکن جو کسی بات کو سمجھنا ہی نہ چاہیں ان کا کیا علاج؟ یہ تو اب اپنے رب کے سامنے جب حاضر کیے جائیں گے تب ہی آنکھیں کھولیں گے اور مانیں گے۔

قرآن کو جھٹلانے والوں کی تمثال

'وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ'، 'بِاٰيٰتِنَا' میں 'آیات' سے مراد

قرآن مجید کی آیات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کو جھٹلا رہے ہیں ان کی مثال ایسے گونگے اور بہرے لوگوں کی ہے جو گونگے بہرے ہونے کے ساتھ تاریکی میں گھرے ہوئے بھی ہیں، نہ سن سکتے ہیں نہ کسی کو پکار سکتے، نہ کسی پکارنے والے کی بات کا جواب دے سکتے، نہ کسی کے اشارے کو دیکھ سکتے، نہ کسی نشانی سے رہنمائی حاصل کر سکتے۔ ایسے اندھے بہرے لوگوں کا کیا علاج؟

ہدایت اس کو ملتی ہے جو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں

مَنْ یَّشَاِ اللّٰہُ یُضْلِلْہُ الاٰیۃ، میں، جیسا کہ ہم مختلف مواقع میں واضح کر چکے ہیں، اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت کسی کو ہدایت کی توفیق ملتی ہے اور کوئی گمراہی کا سزاوار قرار پاتا ہے۔ اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو لوگ اپنی آنکھیں اور اپنے کان نہیں کھولتے خدا ان کے اندر زبردستی اپنی ہدایت نہیں اتارتا۔ خدا کی توفیق صرف ان کو سہارا دیتی ہے جو راہِ حق پر چلنے کا خود ارادہ کرتے ہیں اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں۔

اجزا کی اس تشریح سے آیات کا مفہوم اور نظم خود بخود واضح ہو گیا ہے۔ سورہ نحل میں یہ مضمون مختلف پہلوؤں سے زیر بحث آئے گا۔ اس وجہ سے ہم یہاں اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

قُلْ اَرَءَیْتَکُمْ اِنْ اَتٰىکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ اَوْ اَتَتْکُمُ السَّاعَۃُ اَغَیْرَ اللّٰہِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ہ بَلْ اِیَّاہُ تَدْعُوْنَ فَیَکْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْہِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِکُوْنَ (۴۰-۴۱)

اَرَءَیْتُمْ اور اَرَءَیْتَکُمْ کا محلِ استعمال اور مفہوم ایک ہی ہے۔ چنانچہ آگے آیت ۴۶ میں بالکل اسی محل میں اَرَءَیْتُمْ آیا ہے۔

توحید کی ایک نفسی دلیل

یہ مطالبۂ نشانیِ عذاب کا جواب بھی ہے اور انسانی فطرت کے ایک خاص پہلو سے توحید کی ایک ناقابلِ تردید انفسی دلیل بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے کہو کہ اس طنطنہ کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اس کے مقابلہ یا اس سے بچاؤ کا کیا سامان کر رکھا ہے؟ کون سی ناقابلِ تسخیر دفاعی لائن تم نے بنالی ہے کہ اس زعم کے ساتھ خدا کو چیلنج کر رہے ہو؟ فرض کرو، جس عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو خدا وہی بھیج دیتا ہے یا جس قیامت سے تمھیں خبردار کیا جا رہا ہے وہی آدھمکتی ہے تو کون ہے جس کو اپنی مدد کے لیے پکارو گے؟ کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے جس کو پکارو گے اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ اس کے کچھ دوسرے شریک بھی ہیں؟ فرمایا کہ تمھارا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ اگر ایسا وقت آگیا تو تم خدا کے سوا سب کو بھول جاؤ گے اور صرف اسی کو پکارو گے اور وہی ہے جو اس مصیبت کو اگر چاہے گا تو دور کرے گا۔

اوپر والی آیات میں، جیسا کہ ہم نے بیان کیا، توحید کے آفاقی دلائل کی طرف اشارہ تھا، یہاں توحید کی اس انفسی دلیل کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اس دلیل کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں چونکہ ایک ہی خدا کی شہادت موجود ہے، دوسرے اصنام اللہ، جن کو وہ مانتا ہے، ان کی کوئی شہادت اس کی فطرت کے باطن میں موجود نہیں ہوتی بلکہ وہ محض خیالی

ہوتے ہیں، اس وجہ سے جب اس کی زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ آجاتا ہے جو اصل آزمائش کا ہوتا ہے تو انسان اپنے ان تمام فرضی سہاروں کو بھول جاتا ہے، صرف اسی خدا کو پکارتا ہے جس کی شہادت وہ اپنی فطرت میں پاتا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو نہایت دل آویز تمثیلوں اور نہایت حقیقت افروز دلائل سے واضح کیا ہے۔ آگے یہ ساری چیزیں زیرِ بحث آئیں گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔[1]

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ۝ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۴۲-۴۵)

کسی قوم پر عذاب بھیجنے کے معاملہ میں سنتِ الٰہی

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ الآیۃ۔ تضرع کے معنی تذلل کے ہیں یعنی خضوع و خشوع اور احساسِ عجز و فروتنی کے ساتھ کسی کی طرف جھکنا۔ یہاں یہ لفظ دل کی خشیت اور احساسِ عبدیت و انابت کے ساتھ خدا کی طرف جھکنے کے لیے آیا ہے۔ اس کا مقابل لفظ 'قساوت' استعمال ہوا ہے جو دل کی سختی، بے خوفی اور رعونت کی تعبیر کے لیے قرآن کا معروف لفظ ہے۔

اب یہ ایک سنت اللہ بیان ہوئی ہے جس سے ایک طرف تو یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ کسی قوم پر جس میں اللہ تعالیٰ اپنا رسول بھیجتا ہے، عذاب بھیجنے کے معاملے میں وہ کیا طریقہ اختیار فرماتا ہے، دوسرے اس تاریخی شہادت کو سامنے لانا ہے کہ جس قوم نے بھی ایمان لانے کی شرط نشانیٔ عذاب کو ٹھہرایا اس کو ایمان کی سعادت حاصل نہیں ہوئی بلکہ بالآخر عذاب ہی کے ذریعہ سے اس کی جڑ کاٹ دی گئی۔ فرمایا کہ تم سے پہلے (خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ہم نے بہت سی قوموں کے پاس اپنے رسول بھیجے تو ان کو مختلف قسم کی مالی و جسمانی مصیبتوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو اور وہ سوچیں کہ اگر انھوں نے نبی کی بات نہ مانی تو بالآخر خدا کی فیصلہ کن پکڑ آجائے گی اور وہ تباہ کر دیے جائیں گے لیکن دیکھو تاریخ شاہد ہے کہ بجائے اس کے کہ ان خدائی تنبیہات سے ان کے دل کچھ نرم پڑتے وہ اور زیادہ سخت ہوگئے اور جن بداعمالیوں میں وہ مبتلا تھے شیطان نے ان کو ان کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دیا کہ وہ ان سے باز آنے کے بجائے ان میں کچھ اور دلیر ہوگئے۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ الآیۃ، مَا ذُكِّرُوا بِهِ کے معنی ہوں گے جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاددہانی کی گئی۔ یہاں اس سے اشارہ اسی بأساء و ضراء یعنی مالی و جسمانی مصائب کی طرف ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اس لیے مبتلا کیا کہ وہ چونکیں کہ اگر انھوں نے پیغمبر کی بات نہ مانی تو ان تنبیہات کے بعد

---

[1] تفصیل کے طالب ہماری کتاب 'حقیقتِ شرک و توحید' حصہ توحید میں 'توحید کے فطری دلائل' کا باب [illegible]

اب آگے فیصلہ کن عذاب ہی کا مرحلہ ہے لیکن ان سے یہ سبق لینے کے بجائے انھوں نے ان کے گزر جانے کے بعد ان کو نظر انداز کر دیا کہ قوموں کی زندگی میں اس طرح کے حوادث تو پیش آیا ہی کرتے ہیں، قحط، سیلاب، طوفان، وبا اور امراض سے کس قوم کو سابقہ نہیں پیش آیا ہے قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ اس طرح کے نرم و گرم حالات تو ہمارے اگلوں کو بھی پیش آ چکے ہیں۔ پھر یہ کیوں فرض کیا جائے کہ یہ کسی شخص کی تکذیب کا نتیجہ ہے۔

فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً اب یہ مذکورہ بالا سنۃ اللہ کا آگے کا مرحلہ بیان ہو رہا ہے جس کو قرآن کے دوسرے مقامات میں 'امہال' یعنی ڈھیل دینے سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب پیغمبر کی تکذیب کرنے والے خدا کی تنبیہات کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو خدا ان کی رسی دراز کر دیتا ہے، ان کی تمام مطلوبات کے دروازے ان پر کھول دیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنی کامیابیوں پر مگن ہونے، اترانے اور اکڑنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ان کے پیمانہ کے لبریز ہو جانے کا ہوتا ہے۔ اس وقت خدا دفعۃً ان کو پکڑتا ہے پھر وہ بالکل مایوس اور ششدر ہو کے رہ جاتے ہیں۔ 'ابلس' کے لفظ پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔

کسی قوم کی جڑ کب کٹتی ہے؟

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، 'دابر' کے معنی اصل اور جڑ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب مکذبین رسول اپنی بدبختی کی اس حد کو پہنچ جاتے ہیں تب ایسے ظالموں کی خدا جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ اس سے پہلے اس طرح کے مجرموں پر ابتلا کے جو جھونکے آتے ہیں ان سے ان کے شجر ہستی کے صرف برگ و بار متاثر ہوتے ہیں اور وہ بھی وقتی طور پر، ان کی جڑ محفوظ رہتی ہے لیکن جب یہ وقت آجاتا ہے تو خدا ان پر عذاب بھیجتا ہے جو ان کے وجود قومی ہی کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیتا ہے اس لیے کہ جو درخت زہر یلا ہو چکا اور اب صرف زہریلے ہی پھل دے رہا ہے اس کا باقی رہنا اس دنیا کی مصلحت کے خلاف ہے جو اس کے رحمان و رحیم خالق و مالک نے اپنی رحمت اور اپنے عدل کے ظہور کے لیے 'بالحق' پیدا کی ہے۔ وہ عالم کا رب ہے۔ رب کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے چمن میں ایک ایسے درخت کو جگہ گھیرے رکھنے کے لیے چھوڑ دے جس کی زہریلی ہوا اور جس کے مسموم برگ و بار پورے چمن کو غارت کر کے رکھ دیں۔ پس حمد و شکر کا سزاوار ہے وہ رب العلمین جو ایسی نابکار قوموں کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔

اجزا کی تشریح کے ذیل میں آیات کا نظم اور مدعا واضح ہو گیا ہے البتہ جس سنت اللہ کا یہاں حوالہ ہے اس کی تاریخی شہادت کی طرف یہاں صرف اشارہ ہے، اس کی تفصیل نہیں آئی ہے۔ یہ تفصیل آگے والی سورہ ـــ اعراف ـــ میں آئے گی جو اس سورہ کے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں عرب کی پچھلی معذب قوموں کی تاریخ بیان ہوئی ہے جس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان قوموں نے بھی

اپنے اپنے رسولوں سے عذاب کی نشانیوں کا مطالبہ کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو نرم کرنے اور ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ان کو مختلف مالی و جسمانی آزمائشوں میں مبتلا کیا لیکن انھوں نے ان سے سبق لینے کے بجائے ان کو اتفاقی حوادث پر محمول کر کے بالکل نظر انداز کر دیا۔ ان کی اس سرکشی کے بعد خدا نے ان کو پوری ڈھیل دے دی۔ ہر راہ میں ان کو کامیابی ہی کامیابی نظر آنے لگی۔ شیطان نے ان کو پٹی پڑھائی کہ جس راہ پر چل رہے ہو یہی کامیابی کی راہ ہے، شاباش، آگے بڑھے چلو۔ بالآخر جب ان کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آنے لگا اور کامیابیوں کے نشہ نے ان کو بدمست کر دیا تو دفعۃً خدا کے عذاب نے ان کو آدبوچا اور ان کا سارا نشہ ہرن ہو گیا ــــــ مطلب یہ ہے کہ یہی مرحلہ تمھارے جھٹلانے والوں اور تم سے عذاب کی نشانی مانگنے والوں کو بھی درپیش ہے۔ اگر انھوں نے حالات سے سبق نہ لیا تو وہی تاریخ یہ بھی دہرائیں گے تم مطمئن رہو۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰہُ سَمْعَکُمْ وَاَبْصَارَکُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ مَّنْ اِلٰـہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِہٖ ؕ اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ ھُمْ یَصْدِفُوْنَ ہ قُلْ اَرَءَیْتَکُمْ اِنْ اَتٰـکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ بَغْتَۃً اَوْ جَھْرَۃً ھَلْ یُھْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ (۴۶-۴۷)

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰہُ الآیۃ، صَدَفَ یصدِف، صدفٌ کے معنی کسی چیز سے اعراض و انحراف اختیار کرنے اور اس سے رک رہنے کے ہیں۔

مطالبۂ عذاب کا جواب ایک اور پہلو سے

یہ اسی مطالبۂ عذاب کا جواب ایک دوسرے پہلو سے ہے۔ اوپر فرمایا تھا کہ اگر خدا تم پر کوئی ارضی یا سماوی آفت بھیج دے تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ اب ارشاد ہوا کہ اگر خدا تمھیں کسی عقلی، باطنی اور روحانی عذاب میں گرفتار کرے تو بھی تمھیں کوئی بچانے والا نہیں۔ ابھی تو تمھارے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں زندہ ہیں لیکن تم ان سے کام نہیں لے رہے ہو۔ اگر خدا تمھارے سمع و بصر کو سلب کر لے اور تمھارے دل پر ٹھپہ لگا دے تو بتاؤ اللہ کے سوا کون ہے جو تمھاری ان صلاحیتوں اور قوتوں کو پھر بحال کر سکے؟ پھر فرمایا، یہ تو ایک نشانی مانگ رہے ہیں۔ دیکھو ہم اپنی آیتیں کتنے گوناگوں پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں لیکن یہ سننے اور سمجھنے کے بجائے بدستور اعراض ہی کیے جا رہے ہیں۔

قُلْ اَرَءَیْتَکُمْ اِنْ اَتٰـکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ بَغْتَۃً اَوْ جَھْرَۃً الآیۃ، بَغْتَۃً کے معنی کسی چیز کے اچانک، دفعۃً، بغیر کسی نوٹس کے، بالکل بے خبری میں آجانے کے ہیں۔ جَھْرَۃً کے معنی ہیں، کھلم کھلا، ڈنکے کی چوٹ، دن دہاڑے۔ مطلب یہ ہے کہ نشانیٔ عذاب کا مطالبہ تو یہ کر رہے ہیں، ان سے پوچھو کہ خدا کا عذاب چپکے سے یا کھلم کھلا دن دہاڑے آئے، اول تو اس کو روکے گا کون، پھر ان سے یہ پوچھو کہ یہ بجلی گری تو کن پر گرے گی، انھی ظالموں پر تو گرے گی جو اپنی شامت سے اس کو دعوت دے رہے ہیں اور جو اپنی بداعمالیوں سے اس کے سزاوار ہیں یا کسی اور پر؟

فیصلہ کن عذاب کے باب میں سنتِ الٰہی

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو انبیاء کی تکذیب کرنے والی اقوام پر اتمامِ حجت کے بعد آتا ہے۔ اس عذاب کے معاملے میں سنت اللہ یہ ہے کہ نبی کے جھٹلانے والے ہلاک کر دیے جاتے ہیں اور اہل ایمان بچا لیے جاتے ہیں۔ رہی وہ آزمائشیں اور تکلیفیں جو تنبیہ و تذکیر کے لیے آتی ہیں، جن کا ذکر اوپر بَأْسَاءُ اور ضَرَّاءُ کے الفاظ سے گزرا ہے تو وہ اس امتیاز کے ساتھ نہیں آتیں بلکہ ان میں سب حصہ پاتے ہیں۔ البتہ اہل ایمان ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اہل کفر بدستور اپنی شرارت پر جمے ہی رہ جاتے ہیں بلکہ جیساکہ اوپر گزرا، اس سے کچھ اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۴۸-۴۹)

رسولوں کی بعثت کی اصل غایت

اب یہ اسی مطالبہ کے تعلق سے رسولوں کی بعثت کا اصل مقصد واضح فرما دیا کہ وہ عذاب کی نشانیاں دکھانے یا عذاب لانے یا خوارق و عجائب کی نمائش کرنے کے لیے نہیں بھیجے جاتے بلکہ وہ خدا کی رحمت کی خوش خبری دینے والے اور بصورت تکذیب و نافرمانی اس کے عذاب سے خبردار کر دینے والے بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ خوش خبری کی وضاحت یوں فرما دی کہ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے رویہ کی اصلاح کر لی نہ ان کے لیے مستقبل میں کوئی اندیشہ ہے اور نہ ماضی کا کوئی غم) اور انذار کی تفصیل یوں فرمائی کہ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں گے ان کو ان کی نافرمانی کی پاداش میں خدا کا عذاب پکڑے گا) اس سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ اللہ کے رسول خدا کی رحمت کے مظہر ہوتے ہیں، عذاب ان کی بعثت کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ ان کی تکذیب کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ دوسری یہ کہ رسولوں سے لوگوں کو چاہئی وہ چیز چاہیے جس کے لیے وہ آتے ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح کی ہدایت نہ کہ وہ چیز جس سے وہ لوگوں کو بچانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ تیسری یہ کہ یہ خوارق و عجائب نہ رسولوں کے خصائص میں سے ہیں اور نہ ان کی تعلیم و دعوت کے لوازم میں سے بلکہ ان کا ظہور اگر ہوتا ہے تو محض اتمامِ حجت کے طور پر ہوتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ چوتھی یہ کہ اس میں رسول کے لیے پیام تسکین ہے کہ وہ اپنا تعلق اپنے اصل مقصد بعثت ـــ بشارت اور انذار ـــ سے رکھے، جو باتیں اس کے فرائض سے غیر متعلق ہیں ان کو خدا پر چھوڑے، بلاوجہ ان کے لیے پریشان نہ ہو۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ (۵۰)

فیصلہ کن اعلان

اب یہ پیغمبر کی زبان سے اس باب میں ایک آخری اور فیصلہ کن اعلان کرا دیا کہ مجھ سے بحث کرنی ہے تو اس چیز پر کرو جو میں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں اور جس کا داعی ہوں۔ ان چیزوں پر کیوں جھگڑتے

ہو جن کا میں نے سرے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا؟ اگر میرے پاس خزانے نہیں ہیں تو میں نے کب کہا کہ میرے پاس خزانے ہیں؟ اگر میں یہ نہیں بتا سکتا کہ تم پر عذاب کب آئے گا یا قیامت کب آئے گی تو میں نے کب دعویٰ کیا کہ میں غیب جانتا ہوں؟ اگر میں فرشتہ نہیں ہوں تو میری زبان سے کب نکلا کہ میں فرشتہ ہوں؟ میں تو اس وحی کی پیروی کر رہا ہوں جو مجھ پر آئی ہے اور اسی کی دعوت تمہیں دے رہا ہوں۔ آخر میں ارشاد ہوا کہ ان سے پوچھو کہ اگر یہ ذرا بھی سوچنے سمجھنے والے ہیں تو یہ بتائیں کہ کیا خدا کے ہاں اندھے اور بینا یعنی آنکھیں کھول کر چلنے والے اور اپنی خواہشوں کے پیچھے اندھے ہو کر چلنے والے یکساں ہو جائیں گے؟ کیا اپنی عقل و بصیرت سے کام لینے والے اور اپنی عقلوں پر پٹی باندھ کر زندگی گزارنے والے برابر ہو جائیں گے؟ کیا نیکوکار اور بدکار دونوں کا انجام ایک ہی ہوگا؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور بالبداہت نفی میں ہے تو یہی سورج سے زیادہ بدیہی حقیقت وہ وحی تمہارے سامنے پیش کر رہی ہے جس کی میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں تو اس پر تمہارا یہ معارضہ کیا معنی رکھتا ہے کہ میں تمہیں کوئی نشانی عذاب کیوں نہیں دکھاتا؟ میں آج تمہیں عذاب کی کوئی نشانی نہیں دکھاتا تو کیا اس سے جزا اور سزا کا وہ قانون باطل ہو گیا جس کی میں منادی کر رہا ہوں۔ خدا کے بندو، تم اس پر غور نہیں کرتے؟

۶۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۵۱-۵۵

آگے فرمایا کہ جو لوگ نشانیوں اور عذاب کے طالب و منتظر ہیں، ان کو تو تم (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ان کے حال پر چھوڑو۔ البتہ جن لوگوں کے اندر خوف خدا اور خوف آخرت ہے ان کو اسی کتاب کے ذریعہ سے ڈراؤ جو تم پر وحی کی جا رہی ہے۔

پھر فرمایا کہ تمہاری شفقت و تربیت اور تمہاری توجہ و عنایت کے اصلی مستحق تو یہ غربائے مسلمین ہیں جو خدا کی رضا کے طالب ہیں اور جن کو دین کی طلب نے تمہارے ارد گرد جمع کر دیا ہے۔ رہے یہ مغرور و متمرد لوگ جو تم سے نشانیاں اور معجزے مانگتے اور اکڑتے پھر رہے ہیں تو تم نہ ان کی پروا کرو، نہ ان کے پیچھے اصلی حقداروں کے حقوق میں غفلت کرو اور نہ ان کے لیے پر تم غریب مسلمانوں کو اپنے سے دور کرو۔ یہ لوگ اس بات میں اپنی ہتک سمجھتے ہیں کہ ان غریبوں کے پہلو بہ پہلو تمہاری مجلس میں بیٹھیں یا تمہاری بات سنیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اگر تم ان کو اپنے سے قریب کرنا چاہتے ہو تو پہلے ان لوگوں کو اپنے سے دور کرو جو ان کے ہم سر نہیں ہیں اور جن کے پاس آنے میں ان کی سبکی ہے۔ تم ان کی اس رعونت کی ذرا حوصلہ افزائی نہ کرو۔ اگر وہ اپنے اس غرور کے سبب سے ایمان سے محروم رہتے تو اس کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ ان کی پرسش خدا کے ہاں تم سے نہیں ہونی ہے۔ اسی طرح جو مسئولیت تم پر ہے اس کا کوئی حصہ قیامت کے دن یہ اٹھانے والے نہیں بنیں گے کہ ان کے مطالبے پر تم اہل ایمان

کو اپنے سے دور کر کے اپنے سر ایک ظلم عظیم کی ذمہ داری لو۔

پھر فرمایا کہ ان مغروروں کے لیے ان کا مال و جاہ اور ان کا حسب و نسب ایک حجاب بن گیا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ حب دنیا کی ساری سرفرازیاں ہمارا حصّہ ہیں تو اگر یہ نیا دین اپنے اندر کوئی خیر کا پہلو رکھتا ہوتا تو کیا اس کے لیے خدا کو یہی لوگ ملے جن کو دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو صحیح سالم کپڑے بھی نصیب نہیں۔ ان ظالموں کو یہ پتہ نہیں کہ اس دُنیا کے خزف ریزے تو خدا اہلوں اور نا اہلوں دونوں ہی کو دے دیتا ہے لیکن دین کی دولت گرانمایہ صرف اس کے شکر گزار بندوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

اس کے بعد ان غربائے مسلمین کی دلداری فرمائی تاکہ ان مغروروں کے اس طعن سے اگر ان کی کچھ دل شکنی ہوئی ہو تو اس کا اندمال ہو جائے۔ اس دلداری کے لیے خود خدائے رب العزت کی طرف سے جو سلام و پیام ان غریبوں کے نام آیا ہے اس کا ایک ایک حرف اپنے اندر زندگی جاوید کی خوش خبری اور خواجگی کون و مکان کی سرفرازی رکھتا ہے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۱-۵۵

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾

ع ۶ ۵ ۱۲

ترجمۂ آیات ۵۱ - ۵۵

اور تم اسی کے ذریعہ سے خبردار کرو ان لوگوں کو جو ڈر رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اپنے رب کے پاس اکٹھے کیے جائیں گے اس حال میں کہ اس کے سامنے نہ ان کا کوئی حامی ہو گا نہ شفیع، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ ۵۱

اور تم ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجیو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے۔ ان کی ذمہ داری کا کوئی حصہ تم پر نہیں اور نہ تمہاری ذمہ داری کا کوئی حصہ ان پر ہے کہ تم ان کو اپنے سے دور کر کے ظالموں میں سے بن جاؤ۔ اور اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے کہ وہ کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کے لیے چنا ؟ کیا اللہ شکرگزاروں سے اچھی طرح واقف نہیں ؟ اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آیا کریں جو ہماری آیات پر ایمان لائے تو تم ان کو کہو کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ جو کوئی تم میں سے نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے گا پھر وہ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے گا تو وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ اہلِ ایمان کی روش بھی واضح ہو جائے اور مجرموں کا رویہ بھی بے نقاب ہو جائے۔ ۵۲ - ۵۵

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَـيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ (۵۱)

پیغمبر کو اہلِ خشیت کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت

اوپر کے پیرے میں یہ اعلان پیغمبر کی زبان سے کرا دیا گیا کہ نہ میں خزانوں کا مالک ہوں، نہ غیب

جانتا ہوں نہ فرشتہ ہونے کا مدعی ہوں، میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اب یہ ارشاد ہوا کہ جو لوگ کسی نشانیٔ عذاب کے منتظر ہیں ان کو تو ان کے حال پر چھوڑ دو، البتہ جو عقل و فکر سے کام لینے والے ہیں اور جو اپنے دلوں کے اندر یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ ایک دن بہرحال خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور اس طرح حاضر ہونا ہے کہ ان کا کوئی حامی و شفیع ایسا نہ ہوگا جو ان کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے، ان کو اس کتاب کے ذریعہ سے جو تم پر وحی کی جا رہی ہے بیدار اور خبردار کرو۔ جن لوگوں کے اندر یہ ڈر موجود ہوگا وہی اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے اور وہی تقویٰ اختیار کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کریں گے۔ جن کے اندر آخرت کا کوئی اندیشہ ہی نہیں یا جو نہر کا رو شفعا بنائے بیٹھے ہیں جن کی نسبت ان کا گمان ہے کہ خواہ کچھ ہی ہو وہ ان کو خدا سے چھڑا ہی لیں گے، وہ دنیا جہان کی نشانیاں دیکھ کر بھی اسی طرح ایمان سے محروم رہیں گے۔

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ انذار کے لیے فطری اور عقلی چیز یہ قرآن ہے نہ کہ عذاب کی نشانیاں۔

دوسری یہ کہ یہ قرآن بھی نافع ان لوگوں کے لیے ہے جن کے اندر فطرت کی صلاحیتیں زندہ ہیں۔ جن کی فطری صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہیں ان کو قرآن سے بھی نفع نہیں پہنچے گا۔

تیسری یہ کہ تقویٰ اور خدا ترسی کے لیے سب سے بڑا حجاب شفاعت باطل کا عقیدہ ہے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۲)

سردارانِ قریش کے غرور پر ضرب

اوپر کی آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ پیغمبر کو کن لوگوں کے ساتھ مشغول ہونا چاہیے اور کن لوگوں سے بے پروا ہو جانا چاہیے۔ اب یہ اس بات کی مزید وضاحت ہو رہی ہے کہ جو شامت زدہ لوگ اپنے غرور مال و جاہ میں مست ہیں، تمھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ تم خزانوں کے مالک نہیں، تمھارے ساتھیوں کو اس وجہ سے حقیر سمجھتے ہیں کہ وہ بے نوا، غریب، مفلس اور عزت و جاہ سے محروم لوگ ہیں، ان کے پیچھے اپنا وقت ضائع نہ کرو اور ان کے ایمان کی فکر میں ان لوگوں کے حقوق میں غفلت نہ ہو جو اللہ کی آیات پر ایمان لائے اور صبح و شام اس کی عبادت و طاعت میں سرگرم ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قریش کے اکابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت کے جہاں وہ بہانے پیدا کرتے تھے جن کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے، یہ دلیل بھی لاتے تھے کہ آپ کے ساتھی بالکل غربا اور عوام کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں غلام اور لونڈیاں بھی شامل ہیں۔ اوّل تو یہ دین، اگر اللہ کا دین ہوتا، تو کیا اللہ اپنے دین کے لیے (نعوذ باللہ) انھی اراذل و انفار کو منتخب کرتا اور اگر یہی لوگ اس کے حامل قرار پاتے ہیں تو پھر کسی شریف کے لیے کہاں گنجائش باقی رہی کہ ان کے اندر شامل ہو کر اپنی

عزت خاک میں ملائے، ان کی اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اپنے
کے لیے تم اپنوں کو کھونے کی غلطی نہ کرنا۔ کھوئی ہوئی آوارہ بھیڑوں کی جستجو میں اپنے اصلی گلہ سے غفلت
نہ ہونے پائے۔ تم نے ان کو اللہ کی دعوت پہنچادی۔ اب اگر یہ اپنی گمراہی میں پڑے رہے تو اس کی پرسش
خدا کے ہاں بہرحال تم سے نہیں ہوگی۔ اب مواخذہ انھی سے ہونا ہے۔ ان کے حساب کی کوئی ذمہ داری
تم پر نہیں ہے اور اگر ان کے پیچھے تم نے ان اللہ کے بندوں سے بے پروائی کی تو کل کو تمھاری طرف سے یہ
جواب دہ بننے والے نہیں ہیں کہ تم ان کی خاطر اپنے کو ظالموں میں شامل کر لو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ آپ سے یہ اندیشہ تھا کہ آپ اپنے
ان ساتھیوں کو نظر انداز فرما دیں گے یا ان کو اپنے پاس سے الگ کر دیں گے، بلکہ یہ سرداران قریش کے غرور
پر ضرب لگائی گئی ہے لیکن بات ان کو مخاطب کر کے کہنے کے بجائے پیغمبر کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے تاکہ
ان پر یہ واضح ہو جائے کہ ان کی یہ بات اس قابل بھی نہیں ہے کہ ان کو براہ راست مخاطب کر کے اس کا جواب
دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو بکواس کرتے ہیں کرنے دو۔ اگر یہ چیز ان کے لیے اسلام کی طرف بڑھنے میں
رکاوٹ ہے تو وہ جس جہنم میں چاہیں گریں، تم پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں، جو خدا کے طالب بن کر تمھارے پاس
آتے ہیں تم ان کو اپنے پاس سے کس طرح دھتکار سکتے ہو، تمھاری ذمہ داریاں تم پر ہیں۔ کل کو یہ تو تمھاری طرف
سے ذمہ دار نہیں ہوں گے کہ تم ان کی خاطر ان لوگوں کے حقوق تلف کرو جو تمھاری توجہ اور شفقت کے اصلی حقدار
ہیں۔ یہاں 'طرد' کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ اپنے معنی کے اعتبار سے سخت ضرور ہے اس لیے کہ اس کے
معنی کسی کو دھتکارنے اور دور دفع کرنے کے ہیں لیکن یہ لفظ سرداران قریش کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر
استعمال ہوا ہے اس لیے کہ ان کی خواہش یہی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو اپنے پاس سے دھتکار
دیں تب ہم بات کرنے کے روادار ہوں گے۔

انبیاء کے کردار کا ایک حسین پہلو

حضرات انبیاء علیہم السلام کے کردار کا یہ پہلو بھی یہاں نگاہ میں رہے کہ وہ اپنی قوم کے ایمان کے
جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، نہایت حریص ہوتے ہیں۔ سیدنا مسیح نے اس باب میں ایک تمثیل بھی بیان فرمائی
ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ جب تم میں سے کسی کی کوئی بھیڑ کھو جاتی ہے تو وہ اس کی
تلاش میں ندیوں نالوں اور جنگلوں میں پریشان پھرتا ہے اور اپنے اصلی گلہ کو بھول جاتا ہے۔ پھر جب وہ مل
جاتی ہے تو اس کو اپنے کندھے پر اٹھا کر لاتا ہے اور اپنے لوگوں میں آکر کہتا ہے، اے لوگو، میرے ساتھ
خوشی مناؤ اس لیے کہ میری کھوئی ہوئی بھیڑ مجھے مل گئی۔ یہ تمثیل جس طرح اللہ تعالیٰ کی اس رافت کو ظاہر
کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کے لیے رکھتا ہے جو گمراہی کے بعد ہدایت کی طرف رجوع کرتے
ہیں اسی طرح حضرات انبیاء کی اس بیقراری کو بھی ظاہر کرتی ہے جو ان کے اندر اپنی قوم کے گمراہوں کے ایمان
اور ان کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے۔ حضرات انبیاء کی اس صفت میں اللہ تعالیٰ کی صفت کا ایک عکس

ہے اس وجہ سے یہ ایک محبوب اور پسندیدہ صفت ہے۔ لیکن یہ صفت بھی اپنے کچھ حدود و قیود رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں پسند فرماتا کہ پیغمبر کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں اتنا سرگردان رہے کہ اپنے اصل گلے کی دیکھ بھال میں غفلت ہو جائے جو سرکش اور آوارہ بھیڑ قابو میں نہیں آتی وہ کسی بھیڑیے ہی کا حصہ ہے۔ اسی طرح بیان فرمایا کہ یہ مغرور لوگ اگر اپنی نازبرداری اس حد تک چاہتے ہیں کہ تم ان کی خاطر ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو جو صبح و شام رضائے الٰہی کی طلب میں سرگرم ہیں تو یہ کرنے کے تم مجاز نہیں ہو۔ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اس مضمون کو سورۂ عبس کی تفسیر میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے اور اس کے بعض نہایت اہم پہلو ہم بھی مناسب مواقع پر ظاہر کریں گے۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (۵۳)

اس دنیا میں امارت و غربت دونوں امتحان کے لیے ہیں

'لِيَقُوْلُوْا' میں حرف 'ل' لام عاقبت ہے جو علت کو نہیں بلکہ نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک سنت بیان فرمائی ہے کہ ہم نے دنیا میں کسی کو دولت دی ہے تو اس بنا پر نہیں دی ہے کہ وہ اسی کا حقدار تھا۔ اسی طرح کسی کو غربت دی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسی کا سزاوار تھا بلکہ ایک کو دولت اور دوسرے کو غربت دے کر دونوں کا امتحان کیا ہے۔ وہ جن کو مال و جاہ دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ دیکھے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر اس کے شکرگزار، متواضع اور فرمانبردار بندے بنتے ہیں یا مغرور و متکبر ہو کر اکڑنے والے، اترانے والے، غریبوں کو دھتکارنے والے اور خدائی نعمتوں کے اجارہ دار بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جن کو غربت دیتا ہے تو یہ دیکھنے کے لیے دیتا ہے کہ وہ اپنی غربت پر صابر، حاصل نعمتوں اور اپنی نان جویں پہ قانع، اپنی تقدیر پر راضی اور اپنے فقر میں خود دار رہتے ہیں یا مایوس و دل شکستہ ہو کر پست ہمت، بے حوصلہ، تقدیر سے شاکی، خدا سے برہم اور ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اسی امتحان میں ہم نے ان کو ڈالا ہے۔ ہم نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تاکہ یہ ہمارے شکرگزار بندے بنیں۔ لیکن ان کی کج فہمی کے باعث ہماری نعمت ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہی ساری نعمتوں کے پیدائشی حق دار اور ہر عزت و جاہ کے خاندانی اجارہ دار ہیں۔ نتیجہ اس کج فہمی کا یہ نکلا کہ اب وہ یہ کہنے لگے کہ اسلام اگر کوئی فضیلت کی چیز ہوتی تو کیا اس سے سرفراز کرنے کے لیے خدا کو یہی اراذل و اجلاف اور یہی حقیر و نادار لوگ مل سکے؟ آخر ہم اشراف و اعیان، سردارانِ قریش اور رؤسائے طائف کہاں مر گئے تھے کہ آسمان سے یہ نعمت اتری تو ہمارا پتہ اس کو نہ مل سکا اور وہ ان پر جا کر نازل ہو گئی! سردارانِ قریش کے اس غرور کا حوالہ قرآن نے بعض دوسرے مقامات میں بھی دیا ہے۔ مثلاً وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۱۱- احقاف (اور کافروں نے ایمان لانے والوں کے باب میں کہا کہ اگر یہ دین کوئی خیر والی چیز ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم

سے سبقت نہیں لے جا سکتے تھے) دوسری جگہ ہے وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا ۳۱ ھود (اور میں ان لوگوں کے بارے میں، جو تمھاری نگاہوں میں حقیر ہیں، یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ خدا کبھی ان کو کوئی نعمت دے ہی نہیں سکتا) ایمان و اسلام تو درکنار نبوت کو بھی یہ لوگ اپنا اجارہ سمجھتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ اگر خدا کسی کو نبی بنانے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو بناتا، اس منصب کے لیے یہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو ملے تھے۔

دین کی نعمت کے اصلی حق دار

قرآن نے ان کے اس تمرد کے جواب میں فرمایا کہ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِیْنَ (کیا اللہ اپنے شکرگزار بندوں کو نہیں جانتا) مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین سونا اور چاندی، ریشم اور مخمل نہیں ہے جس کی کاٹھی اور جس کے جھول گدھوں اور خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں پر بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ تو آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے جو صرف ان کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکرگزار رہے ہے، جنھوں نے خدا کی نعمتوں کی قدر کی، جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق ادا کیا، جنھوں نے اپنے کان کھلے رکھے، جنھوں نے اپنی آنکھوں پر غرور کی پٹی نہیں باندھی اور جنھوں نے اپنے دلوں کو مردہ نہیں ہونے دیا۔ رہے وہ نابکار و ناشکرے لوگ جنھوں نے خدا کی بخشی ہوئی تمام ظاہری و باطنی نعمتوں کو خدا ہی کے خلاف استعمال کیا ان کے لیے اس نعمت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ دنیا نیک و بد دونوں کو مل جاتی ہے لیکن دین کی نعمت صرف انھی کو ملتی ہے جو خدا کے شکرگزار ہوتے ہیں۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵۴)۔

'سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ' جس طرح ملاقات یا رخصت کا کلمہ ہے اسی طرح خیر مقدم کا کلمہ بھی ہے۔ مثلاً فرشتے توحید پر ثابت قدم رہنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہیں گے سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۳۲ نحل (تم پر سلامتی ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ اپنے اعمال کے صلے میں)

غربائے مسلمین کے خیر مقدم کی ہدایت

اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غربائے مسلمین کے ساتھ بالکل اس کے ضد طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی جس کا مطالبہ سرداران قریش کرتے تھے۔ سرداران قریش تو، جیسا کہ بیان ہوا، یہ چاہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو اپنے پاس سے دھتکار دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ جب ہماری آیتوں پر ایمان لانے والے ہمارے یہ بندے تمھارے پاس آیا کریں تو تم سلامتی اور رحمت کی دعا کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا کرو اور ہماری طرف سے ان کو بشارت دو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کے لیے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا۔ اگر تم میں سے کسی سے نادانی کے سبب کوئی غلطی صادر ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ توبہ و اصلاح کر لے گا تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اہل ایمان کی صلاحیات

یہاں اللہ تعالیٰ نے جو بشارت دی ہے وہ صرف رحمت ومغفرت کی ہے۔ اس کے ساتھ کسی دنیوی مال وجاہ کا کوئی لوث نہیں ہے۔ اس سے اللہ کے ان غریب، لیکن دنیا اور سروسامانِ دنیا سے بے نیاز، بندوں کے باطن پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ، سروسامانِ دنیا سے محروم ہونے کے باوجود اپنے دل میں اس دنیا کا کوئی ارمان نہیں رکھتے تھے۔ ان کے دل کو اگر لگن تھی تو اس بات کی تھی کہ ان کو اپنے خالق ومالک کی رضا حاصل ہو۔ اوپر ان کی صفت بھی یہی بیان ہوئی ہے یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس باطنی آرزو کے لحاظ سے ان کو اسی چیز کی بشارت دی جس کے وہ سب سے زیادہ طلب گار تھے۔ اس سے اشارۃً یہ بات بھی نکلی کہ دنیا کے پرستار جن چیزوں پر مرتے ہیں، اللہ کے باایمان بندوں کی نگاہوں میں ان کی قدروقیمت بالِ مگس کے برابر بھی نہیں، نہ اس دنیا میں نہ آخرت میں۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (۵۵)

یہاں وَلِتَسْتَبِیْنَ کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اگر پوری بات کھول دی جائے تو یوں ہوگی وَکَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں۔ اوپر تفصیل سے بیان ہوا کہ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کی روش کیا ہوتی ہے اور جو ایمان لاتے ہیں ان کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ آخر میں یہ اشارہ فرما دیا کہ یہ ساری تفصیل ہم نے اسی لیے سنائی ہے کہ تم پر دونوں کی روش اور دونوں کا اندازِ فکر واضح ہو جائے تاکہ بلاسبب کوئی چیز وجہ پریشانی نہ بنے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۶-۶۷

آگے وہی مضمون جو اوپر سے چلا آرہا ہے نئے انداز اور نئے پہلوؤں سے بیان ہوا ہے۔

پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ تم خدا کے شریک ٹھہراتے ہو اور اس شرک کی حمایت میں مجھ سے لڑتے ہو لیکن مجھے ان شریکوں کی عبادت سے میرے رب نے روک دیا ہے، اس وجہ سے میرے لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ میں تمہاری بدعتوں کی پیروی کروں۔ یہ بات کہ خدا نے مجھے اس بات سے روک دیا ہے، ایک واضح دلیل اور ایک قطعی حجت پر مبنی ہے۔ اس باب میں میرے رب کی شہادت اس وحی کی صورت میں موجود ہے جو مجھ پر آتی ہے لیکن تم اس وحی کو جھٹلاتے ہو اور اس وقت تک اس کی تصدیق کے لیے تیار نہیں ہو جب تک تم کو خدا کا عذاب نہ دکھا دیا جائے۔ یہ چیز میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کا اختیار خدا ہی کو ہے۔ اگر یہ چیز میرے اختیار میں ہوتی تو اس جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا رب اس جھگڑے کا فیصلہ فرمائے گا لیکن کب اور کس طرح؟ اس کا جواب صرف اسی کے پاس ہے جو اپنی اس کائنات کے تمام رازوں اور بھیدوں کو جاننے والا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ بات کہ مرنے کے بعد ایک روز اٹھنا ہے اور اٹھنے کے بعد ایک ہی خدا کے

آگے حاضر ہونا ہے پھر سب کو اپنے مولائے حقیقی کے آگے جواب دہی کرنی ہے، ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ریہرسل (REHEARSAL) اس دنیا کے سٹیج پر ہر روز ہو رہا ہے لیکن جو لوگ آنکھیں بند کیے ہوئے ہوں ان کا کیا علاج!

اس کے بعد انسان کی اس نفسیاتی بیماری کی طرف توجہ دلائی کہ یہ جب کسی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تب تو خدا خدا پکارتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے لیکن اس آزمائش سے خدا جب اس کو نجات دے دیتا ہے تو چھوٹتے ہی اپنی پچھلی سرمستیوں اور حماقتوں میں پھر کھو جاتا ہے، گویا کوئی بات سرے سے ہوئی ہی نہیں اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اب وہ خدا کے قابو سے بالکل باہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی بیماری میں یہ لوگ مبتلا ہیں جو آج عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ہر بات کے لیے خدا کے ہاں ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجائے گا تو دیکھ لو گے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۶-۶۷

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾ قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ

ع ۵ / ۱۳

عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

ترجمۂ آیات ۵۶-۶۷

کہہ دو کہ مجھے تو ان کی عبادت سے روکا گیا ہے جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ کہہ دو میں تمہاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چل سکتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو جاؤں گا اور پھر راہ پانے والوں میں سے نہ بن سکوں گا۔ کہہ دو میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، وہ چیز میرے پاس نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہی حق کو واضح کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں سے خوب باخبر ہے۔ اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اس کے سوا

ان کو کوئی نہیں جانتا۔ بر و بحر میں جو کچھ ہے اس سے وہ واقف ہے۔ کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور نہ زمین کی تہوں میں کوئی دانہ گرتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے۔ ۵۷-۵۹

اور وہی ہے جو تمھیں رات میں وفات دیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے، پھر تمھیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدت معین پوری کی جائے۔ پھر اسی طرف تمھارا لوٹنا ہے، پھر وہ تمھیں باخبر کرے گا اس چیز سے جو تم کرتے رہے ہو اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ تم پر اپنے نگران مقرر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچتا ہے تو ہمارے فرستادے ہی اس کی روح قبض کرتے ہیں اور وہ اس کام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر وہ سب اللہ، اپنے مولائے حقیقی، ہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ آگاہ کہ فیصلہ کا سارا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ سب سے زیادہ تیز حساب چکانے والا ہے۔ ۶۰-۶۲

ان سے پوچھو، خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم کو کون نجات دیتا ہے جبکہ اسی کو تم پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکرگزار بندوں میں سے بن جائیں گے؟ کہہ دو اللہ ہی تم کو نجات دیتا ہے اس مصیبت سے بھی اور دوسری ہر تکلیف سے لیکن تم پھر شرک کرنے لگتے ہو۔ کہہ دو، خدا قادر ہے اس بات پر کہ تم پر تمھارے اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب اٹھا دے یا تم کو گروہ در گروہ کر کے آپس ہی میں گتھم گتھا کر دے اور ایک کو دوسرے کے تشدد کا مزا اچھی طرح چکھا دے۔ دیکھو، کس کس طرح

ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔ ۶۲-۶۵

اور تمہاری قوم نے اس کی تکذیب کر دی حالانکہ وہ بالکل حق ہے۔ کہہ دو میں تمہارے اوپر کوئی داروغہ نہیں مقرر ہوا ہوں۔ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم عنقریب جان لوگے۔ ۶۶-۶۷

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ (۵۶)

لفظ 'قُل' کا اہم محل استعمال

لفظ 'قُل' اس آیت میں بھی ہے اور بعد کی آیات میں بھی بار بار آیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ سب باتیں ان شبہات، اعتراضات، سوالات اور مطالبات کے جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلائی گئی ہیں جو اس وقت بحث کی گرما گرمی میں کفار کی طرف سے پیش کیے گئے۔ ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کے پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے اس لیے کہ قرآن میں یہ وضاحت ہر جگہ موجود نہیں ہوتی کہ فلاں بات کفار کی کس بات کے جواب میں کہلائی گئی۔

شرک کی بنیاد خواہش پر ہے

اوپر آیت ۱۴ میں ارشاد ہوا ہے کہ مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور مشرکوں میں سے نہ بنوں۔' اس کے بعد یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اس باب میں کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں، سب سے بڑی شہادت تو خدا ہی کی ہو سکتی ہے اور خدا کی شہادت جو بشکل قرآن مجھ پر نازل ہوئی ہے وہ تو یہی ہے کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس وجہ سے میں اس شہادت کے خلاف کسی کو اس کا شریک ٹھہرانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یہاں اسی اعلان کو منفی پہلو سے دہرایا کہ تم جن چیزوں کو اللہ کے سوا پکارتے ہو مجھے ان کی بندگی سے منع کیا گیا ہے۔ یہاں پکارنے سے مراد ظاہر ہے کہ وہ پکارنا ہے جو دعا اور استمداد کی نوعیت کا ہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو پکارنا درحقیقت اس کی عبادت ہے اور یہ چیز شرک ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم اعلان کر دو کہ میں تمہاری خواہشوں کی پیروی نہیں کر سکتا۔ 'خواہشوں' سے مراد مشرکانہ بدعات ہیں اور 'اھوا' کے لفظ سے تعبیر کر کے قرآن نے ان کے بے بنیاد ہونے کو واضح فرمایا ہے کہ ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے نہ خدا کے کلام و الہام میں محض اپنے جی سے تم نے یہ چیزیں گھڑی ہیں اور چونکہ ان کی موہوم شفاعت کی امید نے تمہیں ایمان و عمل اور فکر آخرت کی تمام

ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے، اس وجہ سے یہ تمھارے نفس کو بہت پسند ہیں۔ بہر حال تمھیں پسند ہیں تو ہوں لیکن حقیقت اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں حقیقت کو نظر انداز کر کے تمھاری جھوٹی آرزوؤں، باطل خواہشوں اور بے سند بدعات کی پیروی کروں۔ فرمایا کہ اگر میں ایسا کروں تو میں راہِ ہدایت سے بھٹک جاؤں گا اور پھر کبھی راہِ ہدایت پانے والا نہ بن سکوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ اوّل تو شرک کی ضلالت ہے ہی ایسی ضلالت کہ آدمی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر ایسی کج پیچ کی پگڈنڈیوں میں گم ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے اصل راہ پر آنا ناممکن ہو جاتا ہے، دوسرے خدا کی صریح ممانعت کے بعد اگر میں نے یہ غلطی کی تو پھر کون ہے جس کی توفیق بخشی میرا سہارا بنے گی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر صحیح راہ پر لائے گا؟

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُم بِهِ ۚ مَا عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ۝ قُل لَّوْ أَنَّ عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَقُضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ (۵۷-۵۸)

بَيِّنَةٌ سے مراد قرآن ہے

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُم بِهِ، بَيِّنَةٍ سے مراد قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے بطور شہادت اتارا ہے کہ اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔ اس شہادت کا ذکر پیچھے آیت ۱۹ میں گزر چکا ہے۔ آگے آیت ۱۵۷ میں قرآن کے لیے یہی لفظ استعمال ہوا ہے أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَاءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ (یا کہیں تم یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، سو دیکھ لو تمھارے پاس بھی تمھارے رب کی جانب سے ایک واضح شہادت اور ہدایت و رحمت آگئی) وَكَذَّبْتُم بِهِ میں ضمیر کا مرجع 'بَيِّنَة' ہے، لیکن لحاظ مفہوم کا ہے اس وجہ سے ضمیر مذکر آئی ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے کہ ضمیر لفظ کے ظاہر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے مفہوم کے لحاظ سے استعمال ہوتی ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے اپنی کتابوں میں اس اسلوب پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ مناسب مواقع پر ہم اس کی بلاغت پر بحث کریں گے۔ یہاں قرآن کے لیے 'بینة' کا لفظ استعمال کر کے اس کا ایک حجتِ قاطع اور شہادتِ واضح ہونا ظاہر کر دیا ہے پھر ضمیر اس کے لیے مذکر کی استعمال کر کے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔

قرآن ایک حجت قاطع ہے

مطلب آیت کا یہ ہے کہ تم تو محض ہوا میں تیر چلا رہے ہو اور اپنی خواہشوں کی پرستش کر رہے ہو۔ تمھارے پاس اپنے ان فرضی معبودوں کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے جس سے تم یہ ثابت کر سکو کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔ اس کے برعکس میں خدا کی طرف سے ایک حجت، ایک برہان اور ایک قطعی شہادت پر ہوں اور اسی کو تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ خدا نے یہ 'بینة' خود مجھ پر اتاری ہے اور یہ ایسی واضح ہے کہ اس کی تکذیب کی گنجائش نہیں ہے لیکن تم اس کی تکذیب کرتے ہو اور بجائے اس کے کہ اس کو سمجھو اور مانو مجھ سے مطالبہ کرتے ہو کہ میں تمھیں خدا کا عذاب دکھا دوں تو تم اس کتاب کی صداقت تسلیم کرو گے۔ مَا

عندی ما تستعجلون بہٖ' سو یہ عذاب، جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو، میرے پاس نہیں ہے۔ اس معاملہ کا فیصلہ کرنا خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ حق کو واضح اور اس نزاع کا فیصلہ کرے گا اور نہایت بہتر طریقہ پر فیصلہ کرے گا۔ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو میرے اختیار میں ہوتی تو میرے اور تمھارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا۔

'وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ' میں دو پہلو ہیں۔ ایک تو ان کفار کے لیے دھمکی ہے کہ خدا ان ظالموں سے خوب باخبر ہے چنانچہ وہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ دوسرا پہلو اس میں تفویض کا ہے کہ خدا ان ظالموں سے خوب واقف ہے، پس ان کا معاملہ اسی کے حوالے ہے۔ یہاں ظلم سے مراد اپنی جان پر ظلم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ خدا ان کو اپنی رحمت دے رہا ہے لیکن یہ اس کے عذاب کے طالب ہیں۔ ان کو روٹی دی جا رہی ہے لیکن یہ پتھر مانگتے ہیں۔ ان کو مچھلی عنایت ہوئی ہے مگر یہ سانپ پکڑنے کے درپے ہیں۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۵۹)

خدا کا علم محیط کل ہے

'مفاتح'، 'مفتح' کی جمع ہے جس کے معنی کنجی کے ہیں۔ یعنی غیب کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کا علم کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہی مضمون دوسرے الفاظ میں یوں بیان ہوا ہے لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ - ۱۲ شوریٰ (اسی کے قبضہ میں ہیں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں، وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے) 'برو بحر'، 'رطب و یابس' وغیرہ الفاظ احاطہ کے مضمون کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ 'ظلمات الارض' سے مراد زمین کی تہیں اور اس کے طبقات ہیں۔

علم الٰہی اور توحید و آخرت کا باہمی ربط

یہ اوپر والے مضمون کی مزید توسیع ہے۔ جب فرمایا کہ 'میرے اختیار میں وہ چیز نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو، اس امر میں فیصلہ کا اختیار صرف خدا کو ہے' تو علم الٰہی کی وسعت اور اس کے احاطہ کے بیان کے لیے ایک نہایت موزوں تقریب پیدا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی اس وسعت کا اعتقاد ہی ہے جو اہل ایمان کے اندر کامل تفویض، کامل اعتماد اور کامل رضا بالقضا کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں معمولی غلط فہمی بھی شرک کی راہیں کھول دیتی ہے۔ یہی چیز آخرت پر سچے اور پکے ایمان کی بنیاد ہے اور اسی کے صحیح تصور و تذکر سے انسان کے اندر وہ خشیت بھی پیدا ہوتی ہے جو زندگی میں اس کو صحیح روش اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ قرآن کے اس بیان سے ان لوگوں کی بھی پوری پوری تردید ہو گئی جو خدا کو صرف کلیات کا عالم مانتے ہیں۔ خدا صرف کلیات ہی کا نہیں بلکہ تمام جزئیات کا بھی عالم ہے۔ درخت سے جو پتا

گرتا ہے، زمین کی تہوں میں جو دانہ ڈالا جاتا ہے، سب اس کے علم میں ہوتا ہے اور ہر خشک و تر اس کے رجسٹر میں درج ہے اور یہ رجسٹر ایسا نہیں ہے جس میں اس کو کوئی چیز ڈھونڈنی پڑتی ہو بلکہ اس کی ہر چیز ہر آن بالکل واضح ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے محیط کل علم کی ایک تعبیر ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ ۖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ ۝ ثُمَّ رُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۚ أَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ (۶۰ - ۶۲)

موت، برزخ اور حشر کا تمثیلی شاہدہ

علم الٰہی کے اس بیان نے موت کے بعد زندگی، اس زندگی کے بعد حساب کتاب اور جزا سزا کی یاددہانی کے لیے اس طرح تقریب پیدا کر دی گویا بات ہی سے بات نکل آئی ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ آخرت کے باب میں بڑا مغالطہ لوگوں کو علم الٰہی کے صحیح تصور کے فقدان ہی سے پیدا ہوا ہے۔ کم فہم انسان سمجھتا ہے کہ اتنی بے شمار مخلوق کے مرنے اور جینے اور اس کے قول و فعل کے ایک ایک جزئیہ کا علم بھلا کس کو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے، ان کو جمع کرے اور پھر ان کا حساب کرنے بیٹھے۔ قرآن نے اسی استبعاد اور اسی مغالطہ کو یہاں دور فرمایا ہے۔

پہلے فرمایا کہ وہی خدا جو درخت سے گرنے والے ہر پتے اور زمین میں دفن ہونے والے ہر دانے کو جانتا ہے تمہیں مرنے کے بعد پھر اٹھائے گا اور جو کچھ تم نے اس دنیا میں کیا ہوگا اس سے تمہیں آگاہ کرے گا۔ اس بات کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ یہ مرنا اور مرنے کے بعد از سر نو اٹھنا اور اپنے سارے کیے دھرے سے آگاہ کیا جانا کوئی بہت بعید از قیاس چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ریہرسل ہر شب و روز تمہاری اپنی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ہر شب میں خدا تمہیں وفات دیتا ہے اور جب وفات دیتا ہے تو وہ سب کچھ اس کے علم میں ہوتا ہے جو دن میں تم نے کیا ہوتا ہے۔ پھر دوسرے دن میں خدا تم کو اٹھاتا ہے اور اس طرح تمہاری وہ مدت حیات اور اجل معین پوری ہوتی ہے جو خدا نے تم میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کی ہوئی ہے۔ گویا زندگی، موت، برزخ اور موت کے بعد اٹھائے جانے کا تمثیلی مشاہدہ تم میں سے ہر شخص کو ہر روز کرایا جا رہا ہے، خدا نے یہ دنیا بنائی ہی اس طرح ہے کہ وہ اپنی رات اور دن کی گردشوں سے ان تمام حقائق کا درس دے رہی ہے جن کی تمہیں دعوت دی جا رہی ہے بشرطیکہ تمہارے پاس دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والے دل ہوں۔ قرآن نے یہاں ہر شب میں سونے کو 'وفات' سے اور ہر صبح کے اٹھنے کو 'بعث' سے تعبیر کر کے توجہ دلائی ہے کہ مرنا اور اٹھنا تو ہر روز ہو رہا ہے، جس طرح تمہارا سونا اور جاگنا ہے اسی طرح تمہارا مرنا اور اٹھنا ہے اور جس طرح تم میں سے کسی سونے والے کے دن کے اعمال سے خدا لاعلم نہیں ہوتا اسی طرح جب تم موت کی نیند سو گے تو خدا تمہاری زندگی کے اعمال بھول نہیں جائے گا اور جس طرح تمہاری ہر شب کی نیند

کے بعد صبح ہوتی ہے اور تم آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی اور تم ایسا محسوس کرو گے کہ یہ جو کچھ ہوا سب صبح و شام کا قصہ ہے۔

ہر جان پر خدا کی نگرانی ہی ہے

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ الآیۃ، لفظ 'قہر' کا مفہوم آیت ۱۸ اور 'تفریط' کا مفہوم آیت ۳۸ کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ 'حَفَظَۃً' 'حافظ' کی جمع ہے جس کے معنی کسی شے کی نگرانی کے ذمہ دار کے ہیں۔ اس سے مراد یہاں وہ خدائی پہرہ دار ہیں جو ہر جان پر خدا کی طرف سے برابر مقرر رہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ خدا اپنی مخلوق کے کسی فرد اور اپنے گلے کی کسی بھیڑ سے کبھی غافل ہوتا ہے، سب ہر وقت اسی کے کنٹرول میں ہیں۔ وہ برابر اپنے نگران فرشتوں کو ان پر مقرر رکھتا ہے جو ایک پل کے لیے بھی ان کی نگرانی سے غافل نہیں ہوتے۔ پھر جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو فرمایا ہمارے فرستادہ فرشتے ہی اس کی روح قبض کرتے ہیں اور مجال نہیں ہے کہ وہ اس کام میں کوئی کوتاہی کریں: نہ ان کے قابو سے کوئی باہر نکل سکتا، نہ کسی کو وہ فراموش کر سکتے، نہ کسی کی موت ایک لمحہ کے لیے بھی آگے پیچھے ہو سکتی۔

'ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ' پھر سب اللہ ہی کی طرف، جو سب کا مولائے حقیقی ہے لوٹائے جائیں گے یعنی مرنے کے بعد سابقہ ہر ایک کو خدا ہی سے پیش آنا ہے اس لیے کہ مولائے حقیقی وہی ہے۔ دوسرے شرکاء و شفعاء جو لوگوں نے گھڑ رکھے ہیں وہ کچھ کام نہیں آئیں گے۔ 'اَلَا لَهُ الْحُكْمُ' اور کان کھول کر سن لو کہ فیصلہ کا سارا اختیار تنہا اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی اس کے سامنے زبان نہ کھول سکے گا 'وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ' یعنی یہ نہ سمجھو کہ ساری خدائی کے اتنے لمبے چوڑے حساب میں اس کو کچھ زحمت پیش آئے گی یا اس میں زمانہ صرف ہو جائے گا۔ وہ سارا حساب ایک لمحہ میں سب کے سامنے رکھ دے گا۔ اس کی 'کتاب مبین' ہر شخص کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا سارا ریکارڈ اس کے آگے پیش کر دے گی۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۶۳-۶۷)

ظلمت بحر و بر سے مراد

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ - 'ظُلُمٰت' مصائب اور آفات کی تعبیر ہے۔ سمندر کی تاریکیوں کا ذکر قرآن نے سورۂ نور میں یوں فرمایا ہے۔ 'اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌ ۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا

۴۰- نور

دیا کسی گہرے سمندر کی تاریکیاں جس میں موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو، اور اس کے اوپر بادل چھائے ہوئے ہوں، تاریکیوں کے اوپر تاریکی، جب اپنا ہاتھ نکالے تو وہ بھی اس کو سجھائی نہ دے، اسی طرح کے طوفانوں اور مصائب سے آدمی کو خشکی میں بھی سابقہ پیش آجاتا ہے۔

تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً۔ تَدْعُوْنَ، يُنَجِّيْكُمْ کی ضمیر مفعول سے حال پڑا ہوا ہے۔ لفظ کی تحقیق آیت ۴۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے بالمقابل 'خفیۃ' کا لفظ ہے جس کے معنی چپکے چپکے کے ہیں۔ اس وجہ سے تضرع کے معنی گڑگڑانے اور آہ وزاری کے ساتھ التجا و فریاد کرنے کے ہوں گے لَئِنْ اَنْجٰنَا الایۃ، اسی دعا کا بیان ہے جو اس طرح کے حالات میں ہر شخص کے دل اور زبان پر ہوتی ہے۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا الایۃ، 'لبس' کے معنی خلط، یعنی ملانے اور گڈمڈ کرنے کے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ تم کو گروہ در گروہ کر کے آپس میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا کر دے۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ، میں ضمیر کا مرجع وہ عذاب بھی ہو سکتا ہے جس کا آیت ۶۵ میں ذکر ہے اور قرآن بھی ہو سکتا ہے جو اس عذاب کی خبر دے رہا ہے اور جس کی طرف آیت ۶۵ میں اشارہ ہے۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ، 'نبأ' کسی اہم حادثہ کی خبر کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اس عذاب کی خبر ہے جو قرآن دے رہا تھا۔ 'مستقر'، موضع استقرار اور وقت استقرار دونوں مفہوم میں ہو سکتا ہے۔ نیز مصدر کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے وقت استقرار کے مفہوم میں لیا ہے۔

انسان کی ایک نفسیاتی بیماری

ان آیات میں انسان کی ایک نفسیاتی بیماری سے بھی پردہ اٹھایا ہے اور ساتھ ہی توحید کی ایک نفسیاتی دلیل کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ سیاق کلام وہی مطالبۂ عذاب کی تردید کا ہے جو اوپر سے چلا آرہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کا عجیب حال ہے کہ جب کسی آفت میں گرفتار ہوتا ہے تب تو گڑگڑا کر بھی اور دل میں چپکے چپکے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے اور یہ عہد کرتا ہے کہ اس مصیبت سے خدا نے نجات دی تو اب اس کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بن کر زندگی گزاروں گا۔ لیکن جب اس سے نجات پا جاتا ہے تو پھر ناشکری و نافرمانی کی وہی زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں پہلے مبتلا تھا اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے گویا خدا کی خدائی سے باہر ہو گیا ہے اور اب کبھی خدا کی پکڑ میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اگر خدا کی پکڑ سے اس کو ڈرایا جاتا ہے تو ڈھیٹ ہو کر عذاب کا مطالبہ کرتا ہے کہ عذاب دکھا دو تو مانوں گا۔ فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ سمندر میں یا خشکی میں جب تم کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہو تو کون تم کو اس گرداب مصیبت سے نجات دیتا ہے جبکہ تم خدا ہی کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارتے ہو اور یہ عہد کرتے ہو کہ اگر خدا نے ہمیں آفت سے بچا لیا تو ہم اس کے شکر گزار بندے بن کر زندگی بسر کریں گے؛ پھر خود ہی اس کا جواب دلوایا کہ وہ خدا ہی ہے جو تمہیں اس آفت سے بھی نجات دیتا ہے اور دوسری تمام مصیبتوں سے بھی وہی نجات دیتا ہے، خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی اور خواہ تم ان کے لیے اس کو پکارو یا نہ پکارو، لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ اس کے بعد پھر تم شرک کرنے لگتے ہو۔

توحید کی ایک نفسی دلیل

یہاں دو باتیں خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہیں۔ ایک توحید کی نفسیاتی دلیل جو ضمناً بیان ہوگئی ہے وہ یہ ہے کہ جب انسان کسی سخت مصیبت میں پھنستا ہے تو وہ خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، دوسرے تمام سہارے اس کے نزدیک بے حقیقت ہوجاتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی اصل فطرت کے اندر صرف خدا ہی کا اعتماد جاگزیں ہے، دوسری چیزیں محض بناوٹی ہیں جو آزمائش کی بھٹی میں پڑنے کے بعد جھوٹے ملمع کی طرح اڑ جاتی ہیں۔ یہ دلیل قرآن میں مختلف اسلوبوں سے نہایت موثر تمثیلوں میں بیان ہوئی ہے۔ ہم نے اس کی پوری وضاحت اپنی کتاب 'حقیقت توحید' میں مستقل عنوان سے کی ہے۔

دوسری یہ کہ یہاں شکر اور شرک کو دو متقابل چیزوں کی حیثیت سے رکھا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی بتوں کو پوجے بلکہ وہ استکبار بھی شرک ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان اللہ کی نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ اور اپنی تدبیر و قابلیت کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے اور پھر فخر و غرور کے نشہ میں اکڑتا، دندناتا، اتراتا اور من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ حالت شکر کی ضد ہے اور جس کے اندر یہ خناس سما جاتا ہے وہ خود اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتا ہے۔ قرآن نے اس ذہنیت کی تصویر سورہ کہف میں اس طرح کھینچی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا وَفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهَرًا ۝ وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ ج قَالَ مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا ۝ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُدِدْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا ۝ لَٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝

اور ان کے لیے دو شخصوں کی تمثیل بیان کرو۔ ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ بنائے، ان کو کھجور کے درختوں سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی اگائی۔ دونوں باغ خوب پھل لائے، کچھ کمی نہیں کی۔ ہم نے ان کے درمیان ایک نہر جاری کی۔ اس میں پھل آئے تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور وہ اس سے مفاخرت کر رہا تھا کہ میں تم سے مال میں زیادہ اور جمعیت میں قوی ہوں اور وہ اپنے باغ میں آیا اور وہ اپنی جان پر آفت لا رہا تھا اور بولا میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی برباد ہو سکے گا اور میں قیامت کے ہونے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف جانا ہی ہوا تو اس سے بہتر ٹھکانا پاؤں گا۔ اس کے ساتھی نے جواب میں کہا کیا تم نے اس خدا کی ناشکری کی جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر ایک مرد بنا کر کھڑا کیا لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے، میں کسی کو اپنے

(کہف ۳۲ - ۳۸) رب کا شریک نہ بناؤں گا۔

'قل ھو القادر الآیۃ' یعنی یہ نہ سمجھو کہ آج اگر امن واطمینان کی زندگی حاصل ہے تو پھر کبھی خدا کی پکڑ میں آہی نہیں سکتے، خدا جب چاہے تمہارے اوپر سے پتھر برسا دے، بجلی گرا دے، گردباد بھیج دے۔ اسی طرح جب چاہے، عین تمہارے پاؤں کے نیچے سے زلزلہ، سیلاب یا کوئی اور آفت ارضی بھیج دے۔ یہ نہیں تو تمہیں آپس ہی میں قبیلہ قبیلہ گروہ گروہ اور قوم قوم کو باہم دگر ٹکرا دے اور ایک دوسرے کے ظلم وتشدد کا مزا چکھا دے۔ ان میں سے ہر بات، ہر وقت خدا کی قدرت میں ہے۔ فرمایا، دیکھو کس طرح ہم اپنی قدرت کی نشانیاں اور اپنے اختیار وتصرف کی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے بیان کرتے ہیں کہ یہ سمجھیں لیکن یہ سمجھنے کے بجائے ہمارا عذاب ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

'وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ' یعنی قرآن نے ان کو جس عذاب کی دھمکی دی ہے وہ ایک امر واقعی اور شدنی ہے لیکن تمہاری قوم نے اس کی تکذیب کر دی ہے۔ اب ان کا معاملہ ہم پر چھوڑو اور ان سے کہہ دو کہ 'لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ' میں تم پر کوئی داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں کہ لازماً تمہیں ایمان واسلام کی راہ پر چلا ہی دوں ورنہ مجھ سے پرسش ہو جائے گی۔ میرے اوپر تو ذمہ داری صرف انذار وتبلیغ کی تھی وہ میں نے ادا کر دی۔ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا۔ اب اگر تم عذاب کے لیے مچلے ہوئے ہو تو 'لِكُلِّ نَبَإٍ مُسْتَقَرٌّ'، ہر بات کے ظہور کے لیے خدا کی تقویم میں ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت مقرر آجائے گا تم خود اس کو دیکھ لو گے۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۶۸-۷۳

آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف التفات ہے کہ جو ضدی اور ہٹ دھرم لوگ بات سننا چاہتے ہی نہیں ان کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جب دیکھو کہ یہ لوگ کج بحثیوں اور استہزا پر اتر آتے ہیں تو ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤ، صرف اسی وقت ان کے سامنے کوئی بات پیش کرو جب وہ کچھ سننے سمجھنے کے موڈ میں نظر آئیں۔ تمہاری ذمہ داری تبلیغ وتذکیر تک محدود ہے۔ تم ان کے ایمان کے ذمہ دار تو ہو نہیں کہ ان کے دلوں میں ایمان اتار ہی دو۔ ان کی نت نئی فرمائشوں کی بھی پروا نہ کرو۔ بس اسی قرآن کے ذریعہ سے حق نصیحت ادا کر دو کہ جس کو سنبھلنا ہو سنبھل جائے، اپنے عمل کی پاداش میں مارا نہ جائے۔ خدا کے ہاں نہ کسی کی حمایت وسفارش کام آنی ہے اور نہ کوئی معاوضہ پیش کرنے کی گنجائش ہو گی۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرا دیا گیا ہے کہ ہم اللہ کی ہدایت پا جانے کے بعد شرک کی حیرانی وسرگشتگی میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے حوالے

کرنے، اسی کی نماز پڑھنے اور اسی سے ڈرتے رہنے کی ہدایت ہوئی ہے، ہم نے اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دیا ہے۔ جس کا جی چاہے یہ راہ اختیار کرے، ورنہ جہاں چاہے بھٹکتا پھرے۔ مطلب یہ ہے کہ اب اس معاملے میں کسی بحث و جدال کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم اپنے مذہب و مسلک کا واضح طور پر اعلان کیے دیتے ہیں۔

آخر میں اس کارخانۂ کائنات کے 'بالحق' ہونے کی طرف اشارہ فرمایا جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قیامت لازماً آنی ہے۔ اس دن خدا ہی کے اختیار میں فیصلہ ہوگا۔ وہ حکیم و خبیر ہے۔ اس دن حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا سب پر واضح ہو جائے گا، اس وجہ سے یہ نہیں سنتے تو ان کا معاملہ اسی دن پر چھوڑ دو ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۶۸-۷۳

وَاِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِهٖ ؕ وَاِمَّا یُنۡسِیَنَّكَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّکۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۶۸﴾ وَمَا عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّلٰکِنۡ ذِکۡرٰی لَعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۶۹﴾ وَذَرِ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا دِیۡنَهُمۡ لَعِبًا وَّلَهۡوًا وَّغَرَّتۡهُمُ الۡحَیٰوةُ الدُّنۡیَا وَذَکِّرۡ بِهٖۤ اَنۡ تُبۡسَلَ نَفۡسٌۢ بِمَا کَسَبَتۡ ٭ۖ لَیۡسَ لَهَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیۡعٌ ۚ وَاِنۡ تَعۡدِلۡ کُلَّ عَدۡلٍ لَّا یُؤۡخَذۡ مِنۡهَا ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اُبۡسِلُوۡا بِمَا کَسَبُوۡا ۚ لَهُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِیۡمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ بِمَا کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۷۰﴾ ع ۱۴ قُلۡ اَنَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنۡفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰۤی اَعۡقَابِنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ کَالَّذِی اسۡتَهۡوَتۡهُ الشَّیٰطِیۡنُ فِی الۡاَرۡضِ حَیۡرَانَ ۪ لَهٗۤ اَصۡحٰبٌ یَّدۡعُوۡنَهٗۤ اِلَی الۡهُدَی ائۡتِنَا ؕ قُلۡ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰی ؕ وَاُمِرۡنَا لِنُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۱﴾ وَاَنۡ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوۡهُ ؕ وَهُوَ الَّذِیۡۤ اِلَیۡهِ

تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَیَوْمَ یَقُوْلُ کُنْ فَیَکُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْکُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۷۳﴾ الثلثة

ترجمۂ آیات ۶۸-۷۳

اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں عیب میکھ نکالتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں۔ اور اگر شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان پر ان لوگوں کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ بس یاد دہانی کر دینا ہے تاکہ وہ بھی ڈریں۔ ان لوگوں کو چھوڑو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور اسی کے ذریعہ سے یاد دہانی کرو کہ نہ ہو کہ کوئی جان اپنے کیے کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کی جائے۔ اللہ کے آگے نہ اس کا کوئی کارساز ہو گا نہ سفارشی اور اگر وہ ہر معاوضہ بھی دے تو بھی اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے کیے کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کیے جائیں گے۔ ان کے لیے کھولتا پانی پینے کو اور ایک دردناک عذاب ہو گا ان کے کفر کی پاداش میں۔ ۶۸ - ۷۰

کہہ دو، کیا ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جو نہ تو ہمیں نفع پہنچاتی ہیں نہ نقصان اور ہم پیٹھ پیچھے پھینک دیے جائیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت بخشی ہے، اس شخص کے مانند جس کو شیطانوں نے بیابان میں سرگشتہ و حیران چھوڑ دیا ہو، اس کے ساتھی اسے سیدھی راہ کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہماری طرف آجا۔ کہہ دو اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم اپنے آپ کو عالم کے رب کے حوالہ کریں۔ اور یہ کہ نماز قائم

کرو اور اس سے ڈرتے رہو اور وہی ہے جس کے حضور تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے غایت کے ساتھ۔ جس دن کہے گا ہو جا تو ہو جائے گا۔ اس کی بات شدنی ہے اور اسی کی بادشاہی ہوگی جس دن صور پھونکا جائے گا۔ وہ غائب و حاضر سب کا علم رکھنے والا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔ ۷۱-۷۳

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَٰكِنْ ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۚ وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ ۚ وَإِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا ۖ لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ (۶۸-۷۰)

خوض کا مفہوم

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ الآیۃ، 'خوض' کے معنی کسی چیز میں گھس جانے کے ہیں 'خاض الماء' وہ پانی میں گھس گیا۔ اسی سے 'خوض فی الحدیث' کا محاورہ نکلا ہے جس کے معنی ہیں بات میں سے بات نکالنا بال کی کھال ادھیڑنا، کسی بات میں اعتراض، نکتہ چینی اور کٹ حجتی کے نت نئے پہلو پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اسی طرح کی سخن گستری کے لیے استعمال ہوا ہے جس کا مقصد کسی بات کو ہنسی دل لگی اور مذاق میں اڑا دینا ہو۔ مثلاً وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۝ (اگر تم ان سے پوچھو تو جواب دیں گے ہم تو بس ذرا سخن گستری اور ٹھٹول کر رہے تھے) یہاں بھی آگے والی آیت وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا میں لفظ کی اس حقیقت کو کھول دیا ہے اس لیے کہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو آیات الٰہی میں خوض کرتے ہیں۔ گویا 'خوض' کے بعد اس کا مقصد واضح کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے سورۂ نساء میں اس 'خوض' کی تفسیر بھی فرما دی ہے۔ چنانچہ اسی آیت کا حوالہ دے کر جیسا کہ ہم تفسیر سورۂ نساء میں واضح کر چکے ہیں، وہاں فرمایا ہے۔ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ (۱۴۰- نساء) (اور وہ قرآن میں تمھیں ہدایت دے چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے پاس نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری

قرآن کا مذاق اڑانے والوں کے پاس بیٹھنے کی ممانعت

بات میں لگ جائیں)یہاں اس غوض کی وضاحت اللہ کی آیات کے کفر اور ان کا مذاق اڑانے سے کی گئی ہے۔

خطاب اگرچہ بصیغہ واحد ہے مگر عام ہے

یہاں خطاب اگرچہ واحد کے صیغہ سے ہے جس کا غالب قرینہ یہی ہے کہ خطاب آنحضرتؐ سے ہو لیکن یہ خطاب آنحضرتؐ کے واسطہ سے تمام مسلمانوں سے ہے۔ چنانچہ اشارۃً آگے بتا بھی دیا ہے کہ یہ خطاب معناً عام ہی ہے۔ چنانچہ بعد والی آیت میں یہ جو فرمایا کہ 'وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ' کہ خدا سے ڈرنے والوں پر ان کافروں کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس نے اس خطاب کے پہلو کو واضح کر دیا کہ خطاب بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں سے ہے۔ پھر سورۂ نساء کی اس آیت میں جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے، صاف لفظوں میں بتا دیا کہ یہ خطاب عام ہی ہے۔ اس لیے کہ وہاں سورہ انعام کی اسی ہدایت کی بنا پر ان لوگوں پر گرفت فرمائی جنھوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔

اس ہدایت کے دو پہلو

اس ہدایت کے دو پہلو ہیں اور دونوں نہایت اہم ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ رویہ اس حکمتِ دعوت کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے پسند فرمائی ہے۔ جس وقت کسی گروہ پر کسی چیز کی مخالفت، اس کی تضحیک اور اس کی تردید کا بخار چڑھا ہوا ہو اور بخار کی شدت سے مریض کی کیفیت ہذیانی ہو رہی ہو عین اسی حالت میں اس کے سامنے اس چیز کو پیش کرنا گویا اس کے بخار اور ہذیان دونوں کو مزید بڑھا دینا ہے۔ اگر کوئی معالج مریض کی بیماری ہی میں اضافہ چاہتا ہو تو وہ تو آزاد ہے جو چاہے کرے لیکن کوئی مہربان طبیب جو مریض کی صحت کا خواہاں ہے وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ اسی رعایت احوال کے پیش نظر یہاں مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ جب تم دیکھو کہ یہ اسلام کے مخالفین قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے، طنز و تضحیک کے ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت کے لیے آستین چڑھائے ہوئے ہیں تو اس وقت طرح دے جاؤ اور کسی ایسے وقت کا انتظار کرو جب یہ بحرانی کیفیت ذرا دور ہو جائے تو اس وقت ان کو سنانے اور سمجھانے کی کوشش کرو۔

دوسرا یہ کہ یہ اس غیرتِ حق کے منافی ہے جو اہل ایمان کے اندر ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ علانیہ خدا اور رسول کے خلاف بکواس کرتا ہے تو اس سے لڑنا بھی ایک داعی کے لیے غلط، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور خاموش رہنا بھی غلط، اس لیے کہ اس سے وہ حمیت حق مجروح ہوتی ہے جو علامت ایمان ہے اور جس کا ضعف بالآخر درجہ بدرجہ آدمی کو اس نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد اللہ، رسول، قرآن اور شریعت ہر چیز کی توہین و تذلیل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا ہے لیکن اس کو ایسا سانپ سونگھ جاتا ہے کہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہاں اس ہدایت کے اندر یہ دونوں ہی پہلو ملحوظ ہیں۔ پہلا تو سیاقِ کلام ہی سے واضح ہے اور دوسرے کو قرآن نے سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں واضح فرما دیا اس لیے کہ اسی ہدایت کا حوالہ دے کر وہاں منافقین پر گرفت فرمائی ہے کہ یہ لوگ مخالفینِ اسلام کی ان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں جہاں اللہ کی آیات

کا علانیہ مذاق اڑایا جاتا ہے حالانکہ ان کو قرآن میں اس سے روکا جا چکا ہے۔

شریعت کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ بیٹھنا بے غیرتی اور اس پر راضی رہنا نفاق ہے

'آیات' سے مراد یہاں ظاہر ہے کہ قرآن کی آیات ہیں اس لیے کہ جن لوگوں کا حال یہ بیان ہو رہا ہے ان کے سامنے قرآن ہی پیش کیا جا رہا تھا اور وہ اسی کو مذاق بنا رہے تھے لیکن یہی حکم بعینہٖ ساری شریعت اور اس کے سارے احکام کا ہوگا۔ شریعت کا مذاق جہاں بھی اڑایا جاتے وہاں بیٹھنا بے غیرتی اور اس پر راضی رہنا نفاق اور کفر ہے۔

'وَاِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ' یہ اوپر والی ہدایت کی تاکید مزید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی شیطان اس بات سے غافل ہی کر دے تو یاد آجانے کے بعد ایسے ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ اس تاکید کی ضرورت اس لیے تھی کہ بسا اوقات، آدمی کسی مجلس میں جا پہنچتا ہے اور وہاں بات بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ دین و شریعت کے استہزا تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے وقت میں آدمی محسوس تو کرتا ہے کہ اب یہ جگہ بیٹھنے کی نہیں رہی لیکن خیال کرتا ہے کہ بھری مجلس سے کس طرح اٹھ کر چلا جائے۔ یا اگر مناظر قسم کا ہوتا ہے تو یہ خیال کرتا ہے کہ اب میدان چھوڑ کر کس طرح وہاں سے ہٹ جائے، حریف کیا کہے گا۔ یہ دونوں ہی خیال آدمی کے لیے فتنہ ہیں۔ اگر مجلس کا پاس و لحاظ مانع ہے تو یہ قلت غیرت کی دلیل ہے۔ آدمی سوچے کہ اگر اس کے منہ پر اس کے ماں باپ کو گالی دی جائے تو کیا وہ اس کو خاموشی سے گوارا کرے گا تو خدا اور اس کی شریعت کا حق تو ماں باپ بلکہ تمام دنیا جہان سے بڑا ہے۔ اور اگر وہ بحث و مناظرہ کے لیے وہاں جما رہے گا تو گو اس کی نیت احقاق حق اور ابطال باطل ہی کی ہو لیکن جب ان لوگوں کے ذہن خراب ہو چکے ہیں جن کو بات سنانی ہے اور ان کو سنانا ان کو مزید اشتعال دلانے کے مترادف ہے تو اس کا ایسے لوگوں کے ساتھ الجھنا صرف مونچھ کی لڑائی بن کر رہ جائے گا۔ مقصد حق کو اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی تقویت نہیں پہنچے گی بلکہ الٹا اس سے شدید قسم کا نقصان پہنچے گا۔ اس وجہ سے صحیح روش یہی ہے کہ آدمی اس کو شیطان کا چکمہ سمجھے اور ایسی مجلس سے کان جھاڑ کے اٹھ آئے۔

یہ بات یہاں یاد رہے کہ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر کبھی شیطان کسی چکر میں ڈال کر ایسی صورت حال سے دوچار کر ہی دے یا ایسے ظالموں سے بھڑا ہی دے تو تمہیں یہ رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اول تو آدمی برابر چوکنا رہے کہ شیطان اس کو اس طرح کے فتنہ میں ڈالنے نہ پائے لیکن اگر وہ کہیں اللہ کی اس ہدایت سے غافل کر کے کسی فتنے میں ڈال ہی دے تو آدمی متنبہ ہوتے ہی ایسی مجلس کو سلام کرے اور وہاں سے چل دے۔ اس لیے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں وہ اپنی جانوں پر سب سے بڑا ظلم ڈھانے والے ہیں اور ان کی معیت معلوم نہیں خدا کے کس غضب میں مبتلا کر دے۔

'وَمَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰی لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ' یہ مسلمانوں کو تسلی اور

مسلمانوں کو تبلیغ اور حکمتِ تبلیغ کی تلقین

تبلیغ دین کے معاملے میں اس نقطۂ اعتدال اور طریقۂ حکمت کو اختیار کرنے کی تلقین ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کے اوپر ان کافروں اور ظالموں سے متعلق جو ذمہ داری ہے وہ صرف اللہ کی دعوت اور اس کے دین کو پہنچا دینے کی ہے تاکہ جس طرح وہ خدا سے ڈرنے والے ہیں اسی طرح یہ کفار بھی خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ ان کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہے۔ یہ اگر ایمان لائیں گے تو اس کا صلہ خود پائیں گے اور اگر کفر پر اڑے رہیں گے تو قیامت کو اللہ کے حضور جواب وہ خود ہوں گے۔ مسلمانوں سے جب کہ انھوں نے خدا سے ڈرتے رہنے کا حق ادا کیا، کوئی مواخذہ ان سرکشوں کے باب میں نہیں ہوگا کہ یہ لوگ خدا سے ڈرنے والے کیوں نہ بنے؛ خدا کے ہاں کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داریوں سے متعلق مسئول نہیں ہوگا۔ خدا سے ڈرنے والوں پر جو ذمہ داری دوسروں کے باب میں عائد ہوتی ہے وہ صرف تبلیغ و تذکیر کی ہے اور اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے یہ کافی ہے کہ اہل ایمان جب دیکھیں کہ کوئی سازگار موقع ان کے کانوں میں بھی بات ڈال دینے کا ہے تو ان کو اللہ کی بات پہنچا دیں۔ اپنے آپ کو ان کی ہدایت و ضلالت کا مسئول سمجھ کر ان کے تعاقب کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مضمون سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۵ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ الاٰیۃ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔

اس آیت سے کئی باتیں واضح ہوئیں جو ذہن میں رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ اوپر والی آیت میں خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد تھا لیکن کلام کا رخ مسلمانوں کی طرف تھا۔ چنانچہ کلام کے تدریجی ارتقا سے یہ حقیقت خود واضح ہوگئی اور یہی قرآن کا معروف اسلوب ہے۔

دوسری یہ کہ اس سے اس جوش دعوت و تبلیغ کا اظہار ہو رہا ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر پایا جاتا تھا۔ آیت سے صاف مترشح ہو رہا ہے کہ صحابہؓ کو شہادتِ حق کی ذمہ داری کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر لوگوں نے ہدایت نہ قبول کی تو شاید آخرت میں یہ ان کی کوتاہیِ خدمت میں محسوب ہو۔

تیسری یہ کہ اس سے دعوت و تبلیغ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آیت سے صاف واضح ہے کہ اہل ایمان سے مواخذہ تو نہیں ہوگا کہ لوگوں نے ہدایت قبول کیوں نہیں کی لیکن مواخذہ ان سے ہوگا کہ انھوں نے لوگوں کو تذکیر و تبلیغ کی یا نہیں۔

بازی بازی باریش بابا ہم بازی

وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا۔ 'دین' سے مراد یہاں وہ دین ہے جو اللہ نے ان کے لیے اتارا تھا اور جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ ان لوگوں کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے شامت زدہ ہیں کہ جس چیز کو اللہ نے ان کے دین کی حیثیت سے اتارا ہے اس کا مذاق اڑائیں ان سے کس خیر کی امید رکھتے ہو؛ ان کو چھوڑو، ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں۔ بازی بازی باریش بابا ہم بازی! جو لوگ زندگی کے معاملے میں اتنے غیر سنجیدہ، اتنے بے فکرے اور ایسے لاابالی ہیں کہ دین کو بھی وہ اپنے مسخرا پن کا موضوع بنا لیں۔ ان کو مطمئن کرنے کے لیے فکر مند ہونے

کی ضرورت نہیں۔

منکرین کا اصل مغالطہ

وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا یہ ان کی اس ساری شرارت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ اصل چیز جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے وہ تو اس دنیا کی، ان کے زعم کے مطابق، وہ کامیاب زندگی ہے جو ان کو حاصل ہے اور جس میں وہ مگن ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کھا رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں اور دندنا رہے ہیں، اور کہیں سے ان کے اطمینان میں کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اگر ان کی زندگی غلط ہے، جیسا کہ قرآن کہہ رہا ہے، تو پھر وہ تباہ کیوں نہیں کر دیے جاتے، اور جب وہ یہاں مسلمانوں سے بہتر حالت میں ہیں تو بالفرض موت کے بعد اٹھنا ہی ہوا تو آخر وہ آخرت میں کیوں اچھے نہیں رہیں گے؟ ان کا اصلی مغالطہ یہی ہے کہ جب ہماری زندگی کامیاب ہے تو ہمارا رویہ بھی لازماً صحیح ہے۔ وہ اسی دنیا کی زندگی کو کل کی زندگی سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ زندگی چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں چل رہی ہے بلکہ امتحان و آزمائش کے اصول پر چل رہی ہے، یہاں حق کے ساتھ خدا نے باطل کو بھی ڈھیل دے رکھی ہے، اس وجہ سے وہ اپنی خواہشوں کی پیروی میں باطل ہی کو اپنا دین بنا بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی زندگی اور یہی رویہ صحیح ہے اور قرآن ان کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے وہ محض ایک موہوم ڈراوا ہے۔

وَذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ 'بہ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے جس کا اوپر آیت ۶۸ میں ذکر ہے۔ 'ابسلہ'، اسلمه للهلكة، اس کو ہلاکت کے حوالہ کیا۔ ابسل فلاناً لعمله وبه، وكله اليه، فلاں کو اس کے عمل کے حوالہ کر دیا۔ 'ان' سے پہلے عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق مضاف لفظ 'مخافۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ محذوف ہے۔ اس کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس قرآن کے ذریعے سے تذکیر کرو، نہ ہو کہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کی جائے۔ دوسرا یہ کہ اس قرآن کے ذریعے سے یاددہانی کرو، نہ ہو کہ کوئی جان اپنی کرتوت کے حوالہ کی جائے یا اپنی کرتوت کے بدلے رہن ہو کے رہ جائے۔ دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہ ہوگا۔

تذکیر کے لیے قرآن کافی ہے

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دین کو مذاق بنائے ہوئے ہیں نہ زیادہ ان کے درپے ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ان کے نت نئے مطالبات کے لیے فکرمند ہونے کی، بس اسی قرآن کے ذریعہ سے اپنا فرض تذکیر و تبلیغ جو تم پر عائد ہوتا ہے، ادا کرتے رہو کہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں گرفتارِ عذاب نہ ہو۔

تمہارا فریضہ لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کر دینا ہے کہ آگے کی منزل میں ہر ایک کو اپنے عمل سے سابقہ پیش آنا ہے۔ عمل ہی ہلاک کرے گا اور عمل ہی نجات دے گا۔ نہ کوئی کسی کا حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع و سفارشی اور نہ کسی کے پاس کوئی معاوضہ دینے کو ہوگا اور نہ کسی کا کوئی بڑے سے بڑا معاوضہ قبول ہوگا۔ اس خطرے سے آگاہ کر دینا ضروری ہے تاکہ کوئی بے خبری میں اپنے ہی عمل کی گرفت میں نہ آ جائے۔ اس آگاہی کے بعد اگر کوئی خود اپنی شامتِ اعمال میں گرفتار ہونا چاہتا ہے تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے۔

تم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو۔ جو لوگ اس آگاہی کی پروا نہیں کریں گے وہ اپنی کرتوتوں کے حوالے ہوں گے اور ان کے کفر کی پاداش میں ان کے لیے کھولتا پانی پینے کو اور عذاب دردناک ہوگا۔

اہل دوزخ کے لیے اولین سامانِ ضیافت

'کھولتے پانی' کا ذکر یہاں بطور 'نُزُل' یعنی اولین سامانِ ضیافت کے ہے جیسا کہ دوسری جگہ اس کی تصریح ہے 'وَاَمَّآ اِنْ کَانَ مِنَ الْمُکَذِّبِیْنَ الضَّآلِّیْنَ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِیْمٍ' ۹۳ واقعہ (اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو اس کے لیے اولین سامانِ ضیافت کھولتا ہوا پانی ہوگا) یعنی وہاں اترتے ہی پہلی ضیافت تو ان کی ماءِ حمیم سے ہوگی پھر اس کے بعد ان کے لیے 'عذابِ الیم' کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

'وَاِنْ تَعْدِلْ کُلَّ عَدْلٍ' کا صحیح زور سمجھنے کے لیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قیامت کے دن مجرمین یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ اپنی اولاد، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے خاندان اور ساری دنیا کو فدیہ میں دے کر اس عذاب سے چھوٹ جائیں لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوگی۔ ملاحظہ ہوں آیات ۱۱-۱۴ سورۂ معارج۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ ھَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ ۪ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَی الْهُدَی ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَاَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِیْٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَیَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ (۷۱-۷۳)

خدا کی ہدایت آجانے کے بعد کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا

قُلْ اَنَدْعُوْا .... بَعْدَ اِذْ ھَدٰىنَا اللّٰهُ۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا کہ یہ لوگ جو ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ تمھیں پھر اسی گمراہی میں پھنسائیں جس سے خدا نے تمھیں نکالا ہے تو تم ان کو صاف صاف سنا دو کہ کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جن کو نہ ہمیں نفع پہنچانے پر کوئی اختیار نہ ضرر پہنچانے پر اور اس طرح ہم الٹے پاؤں پھر اسی گمراہی میں جا گریں جس سے خدا نے ہمیں نکلنے کی توفیق بخشی اور ہماری رہنمائی فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے ہم اس گمراہی میں مبتلا رہے تو اس کے لیے کچھ عذر تھا لیکن اب اگر ہم رجعت اختیار کریں گے تو ہمارے پاس کیا عذر ہوگا؟ 'مَا لَا یَنْفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا' میں ان معبودوں کے لیے 'مَا' کا لفظ ان کی تحقیر پر دلیل ہے اور نفع و ضرر کی نفی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے اس لیے کہ ان چیزوں میں سے اگر کسی چیز سے نفع و ضرر پہنچتا ہے تو اللہ کے حکم سے پہنچتا ہے نہ کہ ان میں سے کوئی چیز بذاتِ خود یا با اختیارِ خود نافع و ضار ہے۔ 'بَعْدَ اِذْ ھَدٰىنَا اللّٰهُ' مخاطبوں کے لیے نہایت موثر موعظت بھی ہے کہ اس آفتابِ ہدایت کے طلوع ہو جانے کے بعد بھی جو لوگ خود ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور دوسروں کو بھی ٹھوکریں کھلانا چاہتے ہیں وہ ذرا اپنے انجام پر غور کریں۔

كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِی الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗ اِلَی الْهُدَی ائْتِنَا ؕ

'استھواء' کے معنی کسی کی عقل گم کر دینا، ہوش اڑا دینا، حیران و درماندہ کر دینا۔ 'ارض' کے معنی یوں تو زمین کے ہیں لیکن یہاں گم گشتگی کی تمثیل بیان ہو رہی ہے اس وجہ سے قرینہ بتا رہا ہے کہ اس سے مراد صحرا اور بیابان ہے جہاں راہ بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ فعل 'استھوا' کی نسبت شیاطین کی طرف اس مفہوم کے اعتبار سے ہے جو تمثیل میں مضمر ہے۔ یہ تمثیل ایمانی و اخلاقی گم گشتگی کی ہے جس میں زیادہ دخل شیاطین جن وانس کا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے فعل کی نسبت شیاطین کی طرف کر کے اصل حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا۔ 'ھدای' کے معنی تفسیر سورۂ بقرہ کے آغاز میں ہم بتا چکے ہیں کہ سیدھی راہ کے بھی آتے ہیں۔

مخالفین اسلام کی تمثیل

یہ اوپر والے ٹکڑے 'وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ' کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت الٰہی کی شاہراہ پا جانے کے بعد اگر ہم تمہارے کہے پر چلے اور مڑ کے اس کفر و شرک میں پھر مبتلا ہو گئے جس سے خدا نے ہمیں نکالا ہے تو ہماری مثال بالکل اس شخص کی ہو گی جس کو شیاطین نے کسی صحرا میں بھٹکا دیا ہو، وہ حیران و درماندہ ادھر ادھر پھر رہا ہو، اس کے کچھ ساتھی اس کو پکار رہے ہوں کہ راستہ ادھر ہے، ہماری طرف آؤ لیکن اس کی عقل ایسی گم ہو کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو کہ کدھر جائے۔

اس تمثیل کا اسلوب اگرچہ بظاہر ایک عمومی تمثیل کا ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ فی الحقیقت یہ ان مخالفین اسلام کی تمثیل ہے جو یہاں زیر بحث ہیں۔ اس تمثیل میں ان کے سامنے یہ بات رکھی گئی ہے کہ تم صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی مانند ہو، شیاطین اور گمراہ لیڈروں نے تمہاری مت مار دی ہے اور تمہارے کچھ راہ یاب ساتھی (اشارہ اہل ایمان کی طرف ہے) تمھیں اصل راہ کی طرف بلا رہے ہیں لیکن تم ان کی پکار نہیں سن رہے ہو ـــــ دیکھیے کس خوبی کے ساتھ ان کی پوری تصویر ان کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ حکایت بظاہر دوسروں کی لیکن بات ساری کی ساری ان کی۔

'قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی' یعنی ان کو بتا دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے تو اللہ کی ہدایت پا جانے کے بعد اب ہم کسی اور طریقے کی پیروی کس طرح کر سکتے ہیں؟

'وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' یہ مشرکین کی دعوت شرک کا جواب ہے کہ تم ہمیں ان چیزوں کی پرستش کی دعوت دے رہے ہو جو نہ ہمیں نفع پہنچا ئیں نہ نقصان پہنچا سکیں اور حکم ہمیں اللہ رب العالمین کے آگے سرفگندگی اور حوالگی کا ہوا ہے۔ یہاں لفظ 'امر' کے بعد 'ل' اس امر کے موکد ہونے کو ظاہر کر رہا ہے اور 'رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' کی صفت اس امر موکد کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی تمام عالم کا رب ہے تو اس کے سوا کون حقدار ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کیا جائے۔

'وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِیْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ' یہ 'اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' کے تحت اور اسی کی عملی تصویر ہے لیکن اسلوب غائب سے بدل کر حاضر کا کر دیا گیا ہے جس سے

اس کے اندر براہ راست خطاب کا زور پیدا ہوگیا ہے۔ نماز کا ذکر یہاں اس اسلام کے اولین عملی مظہر کی حیثیت سے ہوا ہے جس کا ذکر 'اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' میں ہے۔ 'تقویٰ' یہاں ان تمام حدود کی پابندی کے مفہوم میں ہے جن کی پابندی کا خدا نے حکم دیا ہے۔ 'وَاِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ' میں آخرت اور توحید دونوں چیزیں جمع کردی گئی ہیں اور یہ اوپر والے احکام کی دلیل ہے کہ نماز کا قیام اور حدودِ الٰہی کا احترام اس لیے لازم ہے کہ ایک دن خدا کے آگے حاضر ہونا ہے اور صرف اسی کے آگے حاضر ہونا ہے۔ اس دن کوئی اور مرجع و مولیٰ نہیں ہوگا 'وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ الاٰیۃ' یہ ایک نہایت جامع آیت ہے جس میں نہایت مختصر الفاظ میں اوپر والے ٹکڑے 'ھُوَ الَّذِیْٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ' کے ہر جزو کی دلیل بیان ہوگئی ہے۔

کارخانۂ کائنات کے 'بالحق' ہونے کا لازمی نتیجہ

آسمان و زمین میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار و دلائل موجود ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے جو اس نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو بلکہ یہ ایک قدیر، علیم، حکیم اور رحمان و رحیم ذات کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اگر یہ یونہی چلتی رہے، اس کے اندر جو ظلم ہے اس کے انصاف کے لیے کوئی دن نہ آئے، جو عدل ہے اس کی داد کا کوئی وقت نہ آئے، اس کے اندر جو بُرے، شریر، بدکار ہیں ان کو کوئی سزا نہ ملے، جو نیک، حق شناس اور عدل شعار ہیں ان کو ان کی نیکیوں کی جزا نہ ملے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سارا کارخانہ بالکل عبث، بے غایت اور باطل ہے جس کے بنانے والے کے نزدیک خیر اور شر، ظلم اور عدل، حق اور باطل میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ یہ بات انسان کی عقل و فطرت کسی طرح بھی قبول نہیں کرسکتی اس لیے کہ جس خالق کی خلقت کے ہر گوشے میں اس کی حکمت، قدرت، رحمت اور ربوبیت کے آثار موجود ہیں اور اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ انسان کسی طرح ان کا احاطہ نہیں کرسکتا اس کی نسبت وہ کس طرح یہ باور کرلے کہ اس کو ہماری نیکی بدی اور ہمارے عدل و ظلم سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اگر بحث ہے اور ضرور بحث ہے اس لیے کہ یہ بحث نہ ہو تو یہ دنیا بالکل کھیل بلکہ نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اس دنیا کے لیے ایک یوم انصاف آئے جس میں خدا کی کامل رحمت اور اس کی کامل حکمت ظاہر ہو اور ہر نیکی اپنا صلہ پائے اور ہر بدی اپنی سزا۔

'وَیَوْمَ یَقُوْلُ کُنْ فَیَکُوْنُ، قَوْلُہُ الْحَقُّ' یعنی کوئی اس وہم میں مبتلا نہ ہو کہ اس دن کے لانے میں خدا کو کوئی دشواری پیش آئے گی۔ جس نے یہ دنیا مجرد اپنے حکم 'کن' سے بنائی ہے وہ جب حشر برپا کرنا چاہے گا تو اسی کلمۂ 'کن' سے حشر بھی برپا کردے گا۔ آخر جب اس کو پہلی بار دنیا کے پیدا کردینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئی تو دوبارہ کیوں پیش آئے گی؟ 'قَوْلُہُ الْحَقُّ' میں 'حق' کے معنی شدنی کے ہیں یعنی خدا کی ہر بات ہو کے رہتی ہے۔ اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوسکتی۔

'وَلَہُ الْمُلْکُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ' یعنی جس دن حشر کے لیے صور پھونکا جائے گا اس دن سارا اختیار اور ساری بادشاہی صرف خدائے واحد و قہار ہی کی ہوگی۔ اس دن نہ کسی کا کوئی زور چلے گا،

نہ کسی کو کوئی اختیار حاصل ہوگا نہ کسی کی سعی و سفارش اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو کچھ نفع پہنچا سکے گی۔ سب خدا کے آگے سرافگندہ ہوں گے صرف اسی کا حکم ناطق و نافذ ہوگا۔

'عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ' وہ سارے غائب و حاضر کا علم رکھنے والا ہے اس وجہ سے نہ کسی کی کوئی ظاہر یا پوشیدہ بات اس سے مخفی ہوگی، نہ وہ کسی سے کوئی بات پوچھنے کا محتاج ہوگا، نہ کوئی اس کے علم میں کوئی اضافہ کر سکے گا، نہ کوئی غلط فہم کا عذر کر سکے گا۔

'وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ' وہ حکیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کا ہر فیصلہ عدل و حکمت اور علم و خبر پر مبنی ہو۔ نہ اس کے عدل و حکمت میں کوئی نقص ہے کہ وہ کسی باطل کو حق اور حق کو باطل بنا دے۔ نہ اس کے علم و خبر میں کوئی خلا ہے کہ لاعلمی اور بے خبری کے سبب سے کسی مغالطے میں پڑ جائے یا کوئی اس کو مغالطہ میں ڈال کر حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دے۔

۱۱۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۷۴-۹۰

سورہ کے شروع سے جو بحث چلی آ رہی تھی یہاں آ کر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ اب آگے حضرت ابراہیمؑ اور ان سے پہلے اور ان کے بعد پیدا ہونے والے تمام نبیوں کا حوالہ دے کر بتایا گیا ہے کہ ان سب کی دعوت یہی تھی جو یہ پیغمبر دے رہے ہیں۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم بہر شکل اسی ہدایت یافتہ گروہ کی ہدایت کی پیروی کرو۔ اگر تمہاری یہ قوم تمہاری بات نہیں سنتی تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو، تمہاری ذمہ داری صرف دعوت و تبلیغ کی ہے۔ ان کے دلوں میں ایمان و ہدایت اتار دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں خاص اہمیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعوتِ توحید کا ذکر فرمایا ہے جو بالکل ابتداہی میں انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی دعوت کے خاص طور پر ذکر کی وجہ، جیسا کہ ہم تفسیر سورۂ بقرہ میں وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، یہ ہے کہ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں ہی ان کو مسلم طور پر اپنا خاندانی بزرگ اور روحانی پیشوا مانتے تھے اور مدعی تھے کہ جس دین پر وہ ہیں ان کو انہی سے وراثت میں ملا ہے اور اپنی تمام مشرکانہ بدعات میں انہی کے نامِ نامی کو بطور سند پیش کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی چونکہ ملتِ ابراہیمؑ پر ہوئی تھی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جس طرح بقرہ اور آل عمران میں بنی اسرائیل پر یہ واضح کر دیا گیا کہ ان کی ایجاد کردہ یہودیت و نصرانیت کو ملت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی طرح بنی اسمٰعیل پر بھی یہ واضح کر دیا جائے کہ انھوں نے جو دینِ شرک اختیار کر رکھا ہے یہ ان کی اپنی ایجاد ہے، حضرت ابراہیمؑ سے اس کو کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں حضرت ابراہیم کی دعوت اور ان کی زندگی کے ہر پہلو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو سبق حاصل ہو سکتے تھے وہ کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ آپ اسی ملت بیضا کی تجدید و تکمیل کے لیے آئے تھے جس کی دعوت حضرت ابراہیمؑ نے دی تھی اور اسی قوم کے اندر آئے تھے جو حضرت ابراہیمؑ کی نام لیوا تھی۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۴-۹۰

وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ لِأَبِيهِ ءَازَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا ءَالِهَةً ۖ إِنِّىٓ أَرَىٰكَ وَقَوْمَكَ فِى ضَلَـٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٧٤﴾ وَكَذَٰلِكَ نُرِىٓ إِبْرَٰهِيمَ مَلَكُوتَ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ ٱلْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ ٱلَّيْلُ رَءَا كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَـٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ ٱلْـَٔافِلِينَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَءَا ٱلْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَـٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِى رَبِّى لَأَكُونَنَّ مِنَ ٱلْقَوْمِ ٱلضَّآلِّينَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَءَا ٱلشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَـٰذَا رَبِّى هَـٰذَآ أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّآ أَفَلَتْ قَالَ يَـٰقَوْمِ إِنِّى بَرِىٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿٧٨﴾ إِنِّى وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِى فَطَرَ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾ وَحَآجَّهُۥ قَوْمُهُۥ ۚ قَالَ أَتُحَـٰٓجُّوٓنِّى فِى ٱللَّهِ وَقَدْ هَدَىٰنِ ۚ وَلَآ أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِۦٓ إِلَّآ أَن يَشَآءَ رَبِّى شَيْـًٔا ۗ وَسِعَ رَبِّى كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٨٠﴾ وَكَيْفَ أَخَافُ مَآ أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِٱللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِۦ عَلَيْكُمْ سُلْطَـٰنًا ۚ فَأَىُّ ٱلْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِٱلْأَمْنِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨١﴾ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَلَمْ يَلْبِسُوٓا۟ إِيمَـٰنَهُم بِظُلْمٍ أُو۟لَـٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٨٢﴾

وقف لازم

ع ۹ ۱۲ ۱۵

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾

ع ۱۰ ۸ ۱۶

ترجمۂ آیات ۷۴-۹۰

اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا، کیا تم بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو؟ میں تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور کاملین یقین میں سے بنے۔ ۷۴-۷۵

پس یوں ہوا کہ جب رات نے اس کو ڈھانک لیا اس نے ایک تارے کو دیکھا۔

بولا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا اس نے کہا میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتے دیکھا بولا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ بھی ڈوب گیا اس نے کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا۔ پھر جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا بولا کہ یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو اپنا رُخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ ۷۶ - ۷۹

اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ اس نے جواب دیا کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو، درآنحالیکہ اس نے میری رہنمائی فرمائی ہے۔ اور میں ان سے نہیں ڈرتا جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ کوئی بات میرا رب ہی چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ تو کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے؟ اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم شریک ٹھہرائے ہو اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے باب میں اس نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری۔ تو ہم دونوں گروہوں میں سے امن و اطمینان کا زیادہ سزاوار کون ہے، اگر تم جانتے ہو؟ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن و چین ہے اور وہی راہ یاب ہیں۔ ۸۰ - ۸۲

یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم پر قائم کرنے کے لیے بخشی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں۔ بیشک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔ اور ہم نے اس کو

اسحٰق اور یعقوب عطا کیے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہدایت بخشی اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت بخشی اس سے پہلے اور اس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی، یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے اور اسمٰعیل، الیسع، یونس اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے عالم والوں پر فضیلت بخشی۔ اور ان کے آبا و اجداد، ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے ہدایت یافتہ بنائے اور ان کو برگزیدہ کیا۔ اور ان کو ہم نے صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت ہو کے رہ جاتا۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور قوتِ فیصلہ اور نبوت عطا فرمائی تو اگر یہ لوگ اس کا انکار کر دیں گے تو کچھ پروا نہیں ہم نے اس کے لیے ایسے لوگ مامور کر دیے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تو تم بھی انہی کے طریقے کی پیروی کرو۔ اعلان کر دو، میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں۔ یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ ۸۳-۹۰

۱۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّىْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۷۴)

آزر کے نام کے بارے میں روایات کا اختلاف

آزر، حضرت ابراہیم کے والد کا نام ہے۔ تورات کے عربی اور انگریزی ترجموں اور تالمود، سب میں اس کا تلفظ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ قرآن نے یہاں جس تصریح کے ساتھ اس نام کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں یہود کے ہاں روایات کا جو اختلاف ہے وہ اس کو رفع کرنا چاہتا ہے اور قرآن چونکہ قدیم صحیفوں کے لیے کسوٹی (مہیمن) کی حیثیت رکھتا ہے اور براہِ راست وحی الٰہی پر مبنی ہے اس وجہ سے ماننا چاہیے کہ یہی نام صحیح ہے۔

انبیاکی صداقت کا ایک نمایاں اسلوب

یہود کے مذہبی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزر صرف بت پرست ہی نہیں بلکہ بت گر اور بت فروش بھی تھے بلکہ عجب نہیں کہ بت خانے کے پروہت بھی رہے ہوں۔ ایسے حالات میں آزر کے گھر میں ابراہیم کا پیدا ہونا اور باپ کے سارے کاروبار بت پرستی و بت فروشی پر بیٹے ہی کے ہاتھوں یہ ضرب کاری لگنا قدرتِ الٰہی کا ایک کرشمہ ہے۔ حضرات انبیاء کی صداقت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ انھوں نے جس حق کی دعوت دنیا کو دی ہے اس کی اذان سب سے پہلے ان کے کانوں میں دی ہے جو ان کے سب سے زیادہ قریب بھی تھے اور ان کو سب سے زیادہ عزیز بھی۔

حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کو جو دعوت دی ہے اس کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے۔ قرآن میں دوسرے مقامات میں اس کی تصریح بھی ہے۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا ۝ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا ۝ يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ۝ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ۝ (۴۲ - ۴۶ سورۃ مریم)

یاد کرو جب اس نے اپنے باپ سے کہا۔ اے میرے باپ، آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔ اے میرے باپ، میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا تو میری پیروی کیجیے میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ شیطان کی بندگی نہ کیجیے۔ شیطان خدائے رحمان کا بڑا نافرمان ہے۔ اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہ آپ کو خدائے رحمان کی طرف سے کوئی عذاب نہ آپکڑے کہ آپ شیطان کے ساتھی بن کے رہ جائیں۔ اس نے جواب دیا، ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے منحرف ہو رہے ہو۔ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمھیں سنگسار کر دوں گا۔ اب تم میرے پاس سے یک دم دفع ہو جاؤ۔

أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً یعنی اپنے ہی ہاتھوں کے گھڑے ہوئے بت اور ان کو معبود بنا ڈالا ہے، یہ تو ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں آپ بھی مبتلا ہیں اور آپ کی قوم بھی! دوسری جگہ فرمایا ہے أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ ۹۵۔ صافات (کیا تم پوجتے ہو ان چیزوں کو جن کو خود اپنے ہی ہاتھوں گھڑتے ہو)

وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ۔ (۷۵)

وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ، دوسرے مقام میں ہم اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ دراصل كُنَّا نُرِي إِبْرَاهِيمَ ہے۔ عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق یہاں كُنَّا محذوف ہو گیا ہے۔

لفظ 'ملکوت' کی تحقیق

'ملکوت' جس طرح 'رہبۃ' سے 'رہبوت' ہے اسی طرح 'ملک' سے 'ملکوت' ہے۔ 'ملکوت' کا لغوی مفہوم تو عزت، واقتدار، بادشاہی اور سلطنت ہے لیکن قرآن میں یہ لفظ خدا کی اس تکوینی بادشاہی کے لیے استعمال ہوا ہے جو آسمان اور زمین بلکہ ہر چیز پر قائم و دائم ہے۔ اس 'ملکوت الٰہی' پر غور کرنے کی دعوت مختلف اسلوبوں سے قرآن میں بار بار دی گئی ہے اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۱۸۵۔ اعراف (کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین میں خدا کی بادشاہی پر غور نہیں کیا) سُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۸۳۔ یس (پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے)

ملکوتِ الٰہی میں تفکر تمام علم کی کلید ہے

یہاں یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق بخشی سے ان پر اپنی معرفت کے وہ اسرار و حقائق کھولے جو انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم پر واضح کیے۔ یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ اسی ملکوت پر غور کرنے سے وہ کلید ہاتھ آتی ہے جس سے صحیح فکر اور صحیح عمل کے دروازے کھلتے ہیں۔ اسی سے زندگی کا سرا بھی ہاتھ آتا ہے اور اسی سے اس کے منتہا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس دنیا کا کوئی خالق ہے یا یہ خود ہی آدھمکی ہے؟ اگر کوئی خالق ہے تو وہ یکہ و تنہا ہے یا اس کے اور بھی شریک و سہیم ہیں؟ یہ پیدا ہو کر کبھی ختم ہو گی یا اسی طرح ہمیشہ ہمیش چلتی رہے گی؟ اگر اس کا کوئی خالق و مالک ہے تو اس کی صفات و خصوصیات کیا ہیں اور کس لیے اس نے اتنا بڑا عالم کھڑا کر دیا ہے؟ اس دنیا میں حق و باطل کے لیے کوئی معیار ہے یا یہ کوئی اندھیر نگری ہے؟ انسان اپنے اقوال و افعال کے لیے مسئول اور جوابدہ ہے یا بالکل مطلق العنان اور شتر بے مہار ہے؟ آسمانوں اور زمین میں ایک ہی قادر و قیوم کی تدبیر و حکمت کارفرما ہے یا ان کے اندر الگ الگ مشیتیں اور الگ الگ ارادے زور آزمائی کر رہے ہیں؟ یہ اور اس قبیل کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کے صحیح حل پر ہی صحیح فکر اور صحیح عمل کی بنیاد ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے آسمان و زمین کے اس نظام پر غور کرنے کی دعوت بھی دی ہے اور صحیح نتائج تک پہنچنے میں ہمارے فکر کی رہنمائی بھی فرمائی ہے۔

جہاں تک غور کرنے کا تعلق ہے اس ملکوت پر غور تو ایک سائنس دان بھی کرتا ہے لیکن وہ سارا غور و فکر اپنی ذات یا اپنے محدود ماحول کو محور بنا کر کرتا ہے۔ اس کی نگاہ صرف اپنے نفع عاجل پر ہوتی ہے اس وجہ سے وہ ان حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا جو اس کی نگاہ کو اس کے مطلوب نفع عاجل سے ہٹا دیں۔ وہ چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اس سے گل قند یا اسی طرح کی کوئی اور چیز تیار ہو سکتی ہے جس سے فلاں فلاں فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس چکر میں نہیں پڑتا کہ اس پھول کے حسن و جمال، اس کی رعنائی و دل کشی، اس کی عطر بیزی و مشام نوازی میں اس کے صانع کی قدرت، کاریگری، حکمت، رحمت اور ربوبیت کے جلوے دیکھنے کی کوشش کرے اور ان جلووں سے بے خود

ہو کر پھول سے گزر کر پھول کے پیدا کرنے والے کے جمال و کمال کے مشاہدے میں غرق ہو جائے۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

حالانکہ ایک صاحبِ نظر کے لیے پھول کا یہی پہلو زیادہ جاذبِ نظر ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر پھول سے مقصود صرف گل قند ہی ہوتا تو صرف اس مقصد کے لیے اس کی ایک ایک پنکھڑی پر قدرت کو اس فیاضی کے ساتھ گل کاری کی کیا ضرورت تھی؟ یہ گل کاری اور صنعت گری تو اسی لیے فرمائی گئی ہے کہ پھول کی ایک ایک پتی معرفتِ کردگار کے دفتر کا کام دے۔

نیوٹن نے سیب کے درخت سے ایک سیب زمین پر گرتے دیکھا۔ اس سے اس کا ذہن زمین کی کشش کے اصول کی طرف منتقل ہو گیا۔ پھر اس اصول سے بہت سے اصول دریافت ہو گئے جو علمی تحقیقات و انکشافات میں بہت کار آمد ثابت ہوئے لیکن نگاہ ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس اصول کی تمام کارفرمائیاں بس اسی دنیا کی تنگنائے کے اندر محدود رہ گئیں۔ ورنہ یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے کائنات کی ایک ایک چیز کو خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، جذب و کشش کے اس قانون سے باندھ رکھا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا ایماندارانہ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ یہ سارا کارخانہ ایک غالب و مقتدر اور ایک حکیم و علیم کا بنایا ہوا ہے لیکن اس سوال اور اس کے جواب سے چونکہ بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عاید ہوتی ہیں اس وجہ سے ہمارے سائنس دان اس سے بھاگتے ہیں۔

حضرات انبیاء کی بلند نگاہی

زیرِ بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان و زمین میں ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے" تو اس سے اسی بلند نگاہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی ہدایت سے حضرات انبیاء کرام کو بالخصوص حاصل ہوتی ہے اور بقدر استعداد اس توفیق میں سے وہ لوگ بھی حصہ پاتے ہیں جو ایماندارانہ اس کائنات پر غور کرتے ہیں اور اپنے غور و فکر کے نتائج سے گریز کے بجائے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا میں اسی گروہ کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

'وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ' یہاں عربی زبان کے اس معروف قاعدے کے مطابق جس کی ایک سے زیادہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، معطوف علیہ محذوف ہے جس کا تعین قرینہ کرے گا۔ یہاں آگے وضاحت موجود ہے کہ اس مشاہدۂ ملکوت سے اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنی وحدانیت کی اس دلیل کی طرف رہنمائی فرمائی جو انھوں نے اپنی قوم پر قائم فرمائی۔ چنانچہ فرمایا ہے وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ (اور یہ ہے ہماری وہ دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابل میں عطا فرمائی) اس قرینہ کی روشنی میں اگر اس محذوف کو کھولا جائے تو پوری بات یوں ہو گی کہ "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور تاکہ وہ اہل یقین میں سے بنے۔"

یقین کے مدارج

یہاں جس 'یقین' کا ذکر ہے یہ وہ یقین ہے جو ایمان کے اوپر کا درجہ ہے جس کو حق الیقین سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایمان ایک عام چیز ہے جس کے لیے اگر فطرت سلیم ہو تو اندر کا وجدان بھی کافی ہوتا ہے لیکن یقین، فکر و نظر، تفکر و تدبر اور ملکوت الٰہی کے علم و مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے مراتب و مدارج کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے چنانچہ آگے نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ میں اسی کے مراتب عالیہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہی یقین جب ایمان کے اندر پیدا ہوتا ہے تب اس کا فیضان متعدی ہوتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات اس سے دشت و جبل گونج اٹھتے ہیں۔ حضرات انبیا چونکہ خلق کی ہدایت پر مامور ہوتے ہیں اس درجہ سے وہ اس میں سے حصہ وافر پاتے ہیں اور پھر ان کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہوتا ہے جو ان کے متبعین باحسان میں شامل ہوتے ہیں۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۷۶-۷۹)

ان آیات میں لغت یا اسلوب زبان کا کوئی اشکال نہیں ہے۔ نظم کے پہلو سے یہ اوپر والی آیات کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پہلے حوالہ دیا کہ کس طرح ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے دین کے کھوکھلے پن کو ان کے سامنے بے نقاب کیا اور ان کی کھلی ہوئی گمراہی پر ان کو ملامت کی۔ پھر اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح ہم ابراہیم (علیہ السلام) پر آسمان و زمین میں اپنی ملکوت کے اسرار و حقائق بے نقاب کرتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر ہماری حجت تمام کرے اور تاکہ وہ کاملین یقین میں سے بنے۔ اس کے بعد اب یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ ابراہیمؑ نے کس طرح اپنی قوم پر یہ واضح کیا کہ وہ اس کائنات کی جن چیزوں کو معبود سمجھ کر ان کی پرستش کر رہی ہے وہ ساری چیزیں خود اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہیں کہ وہ ملکوتِ الٰہی کے تابع اور اس کے احکام و قوانین کے تحت مسخر ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ سرِمو ادھر ادھر ان سے تجاوز کر سکیں۔ اس وجہ سے عبادت کا اصلی مستحق وہ ہے جو ان سب کا خالق و فاطر ہے نہ کہ یہ جو محکوم و مقہور ہیں۔ اب ہم حضرت ابراہیمؑ کے اس استدلال کی وضاحت کریں گے لیکن اس وضاحت سے پہلے چند باتیں حضرت ابراہیمؑ کے طرزِ خطاب و استدلال سے متعلق سمجھ لینی ضروری ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے طرز استدلال کی بعض خصوصیات

حضرات انبیاء علیہم السلام یوں اپنی دعوت اور اپنے مقصد کے اعتبار سے تو بالکل یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے ہیں لیکن اپنے مخاطبوں کے مزاج، ان کی افتادِ طبع اور ان کے ذوق کے اختلاف کے سبب سے ہر نبی کے طرزِ خطاب اور طریقۂ استدلال و بحث میں کچھ امتیازی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زیادہ تر تمثیلوں میں بات کرتے تھے۔ بعض انبیا میں موعظت کا رنگ غالب ہے بعض کے ہاں قانون کا انداز نمایاں ہے۔ یہ فرق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، زیادہ تر نتیجہ ہے مخاطبوں کے

ذوق و مزاج کے فرق و اختلاف کا لیکن کچھ اس میں اس ذوقی رجحان کو بھی دخل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر طبیعت میں الگ الگ ودیعت فرمایا ہے۔

استدراج

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، جیسا کہ قرآن میں بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، بڑی مناظرہ باز اور حجت طراز قوم تھی۔ اول تو لوگ بات سننے کے لیے آسانی سے تیار ہی نہ ہوتے اور اگر کبھی سنانے کا کوئی موقع نکلتا بھی تو بڑی جلدی بدک جاتے اور مباحثہ و مناظرہ کے لیے آستینیں چڑھا لیتے۔ ان کے مزاج کی اس وحشت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ بحث و خطاب میں استدراج کا طریقہ زیادہ اختیار فرماتے۔ استدراج کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب پر اس راہ سے درجہ بدرجہ گھیرے ڈالتے جدھر سے اس کو سان گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ گھیرے میں آسکتا ہے۔ اس کی ایک مثال اس واقعہ میں موجود ہے جو سورۂ انبیاء میں بیان ہوا ہے۔ انھوں نے ایک دن موقع نکال کر قوم کے بت خانے کے سارے بت ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے۔ صرف بڑے بت کو سلامت چھوڑ دیا۔ جب پوچھ گچھ شروع ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ سے سوال ہوا کہ کیا یہ تمھارا فعل ہے، انھوں نے جھٹ جواب دیا کہ یہ تو اس بڑے بت کی کارستانی معلوم ہوتی ہے اور ٹوٹے ہوئے بتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے جن پر یہ مصیبت گزری ہے۔ اگر یہ بولتے ہیں تو اپنی مصیبت کی داستان خود ہی سنا دیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات سن کر پہلے تو سب پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ گیا کہ فی الواقع ہم کتنے احمق ہیں کہ ایسی چیزوں کو معبود بنائے بیٹھے ہیں جو خود اپنی حفاظت سے بھی قاصر ہیں۔ جب یہ خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں تو بھلا ہماری حفاظت کیا کریں گی۔ اس طرح اندر سے ان کا اعتقاد متزلزل ہو گیا۔ لیکن پھر حمیت جاہلیت کے جوش میں حضرت ابراہیمؑ کی بات کا جواب دینے کی کوشش کی تو اس کوشش میں اپنی حماقت کا اعتراف بھی کر گئے۔ بولے کہ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ ان کے اس اعتراف پر حضرت ابراہیمؑ کو ایک نہایت عمدہ موقع ان کی حماقت پر توجہ دلانے کا مل گیا اور انھوں نے ایک نہایت مؤثر تقریر کی کہ تم پر افسوس ہے کہ تم ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو نہ کسی نفع پر قادر ہیں نہ کسی نقصان پر۔

توریہ

اس طریقۂ استدراج کے تقاضے سے حضرت ابراہیمؑ کبھی کبھی توریہ سے بھی کام لیتے تھے۔ توریہ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی کوئی اسکیم پوری کرنے کے لیے حریف کے سامنے اپنی بات اس طرح پیش کرتے کہ بات تو بالکل صحیح ہوتی لیکن اس کے پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا کہ حریف اس سے مغالطہ میں پڑ جاتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ہوشیاری کے باوجود وہ اسکیم کے بروئے کار آ جانے سے پہلے اس سے آگاہ نہ ہو پاتا۔ اس کی نہایت لطیف مثال سورۂ صافات میں ہے۔ انشاء اللہ ہم اس پر اس کے مقام میں گفتگو کریں گے اور وہیں بعض الفاظ کی وضاحت بھی کریں گے جن کے صحیح مفہوم سے بے خبری کے باعث بہت سے لوگ نہایت افسوسناک قسم کی غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے۔

مزاح

اس استدراج اور اس توریہ میں کہیں کہیں پاکیزہ ظرافت بھی شامل ہو جاتی ہے جو کچھ تو اس استدراج اور توریہ کا فطری تقاضا ہوتی ہے اس لیے کہ ہر کام ایک مخصوص انداز اور مخصوص اسلوب کا طالب ہوتا ہے اور کچھ اس میں اس لطافتِ ذوق کی نمود بھی ہوتی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے مزاج کی ایک خصوصیت ہے اس کی نہایت عمدہ مثالیں سورۂ انبیا اور سورۂ صافات میں آئیں گی۔

اس تمہید کے بعد اب زیرِ بحث آیات پر غور فرمائیے۔

'حجتِ ابراہیمی' کی وضاحت

ایک دن انھوں نے ایک تارے کو چمکتے دیکھا (ہوسکتا ہے کہ یہ تارہ زہرہ ہو جس کو ان کی قوم پوجتی تھی یا کوئی اور تارہ ہو) تو بولے کہ "ہاں بھائی یہ میرا رب ہے"۔ قرینہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ بات انھوں نے خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے اس طرح فرمائی ہوگی کہ دوسروں کے کان میں بھی پڑ جائے۔ سننے والوں نے جب ان کی زبان سے یہ بات سنی ہوگی تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ چلو، یہ بھی غنیمت ہے۔ ایک ایسا شخص جو باپ دادا کے دین اور ہمارے معبودوں سے بالکل بیزار ہے جس حد تک بھی ہمارے ساتھ موافقت کر رہا ہے اسی پر قناعت کرو اور زیادہ اس کے درپے نہ ہو۔ حضرت ابراہیمؑ یہ بات لوگوں کے کانوں میں ڈال کر خاموش ہو رہے۔ پھر جب تارہ ڈوب گیا تو انھوں نے بالکل اسی انداز میں اپنے کو مخاطب اور دوسروں کو سناتے ہوئے کہا کہ میں ان ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ آس پاس والوں کا سابق اطمینان تو ان کی یہ بات سن کر رخصت ہوگیا ہوگا لیکن وہ اس سوچ میں ضرور پڑ گئے ہوں گے کہ اس نوجوان کا ہمارے معبودوں سے انحراف محض نوجوانی کی ترنگ اور بے قیدی و آزادی کی لاابالیانہ خواہش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی سوچ نے اس کے عقیدے کو متزلزل کر دیا ہے۔ چونکہ بات ان کو براہِ راست مخاطب کر کے تحدی کے انداز میں نہیں کہی گئی تھی اس وجہ سے وہ زیادہ مشتعل بھی نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ وہ اس فکر میں پڑ گئے ہوں گے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہماری بات ہی میں کوئی کمزوری ہے۔

کسی جمود کا اس حد تک ہل جانا بھی ایک بڑی کامیابی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس طرح ان کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ ان تاروں کا طلوع ہونا اور چمکنا ہی کیوں دیکھتے ہو۔ طلوع ہونے کے بعد ان کا ڈوب جانا کیوں نہیں دیکھتے؟ جب طلوع کے ساتھ غروب اور آنے کے ساتھ جانا بھی ہے اور اس پابندی اور محکومی کے ساتھ کہ مجال نہیں ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی وقت یا سمت میں یا ہیئت اور شکل میں سرمو تغیر ہو جائے تو یہ تو گویا وہ خود زبانِ حال سے بتا رہے ہیں کہ ہم آتے نہیں بلکہ لائے گئے ہیں اور جاتے نہیں بلکہ لے جائے جاتے ہیں۔ ع

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اس حقیقت کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات بھی ان کے کانوں میں ڈال دی کہ خالق و مالک کے

ساتھ بندے کا تعلق محبت کی بنیاد پر ہے، نہ کہ مجرد خوف کی بنیاد پر۔ مجرد خوف ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی کا کوئی حق قائم ہو جائے اور حق بھی اس کی عبادت کا۔ مشرکین کے لیے یہ بات بھی ایک نئی رہنمائی دینے والی بات تھی اس لیے کہ شرک کی بنیاد تمام تر خوف پر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے گویا بتایا کہ میں مجرد خوف کی بنیاد پر کسی کی عبادت کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ محبت کی بنا پر عبادت کرتا ہوں اور محبت کی سزاوار یہ آنی جانی چیزیں نہیں بلکہ صرف وہ ہے جس کے حکم سے یہ چیزیں آتی جاتی ہیں۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا الایۃ اسی طرح کسی دن، پورے چاند کی پھیلی ہوئی چاندنی میں انھوں نے پھر اس تعلیم کے لیے موقع پیدا کر لیا اور بالکل اسی لب ولہجہ اور اسی انداز میں انھوں نے چاند کے متعلق وہی بات کہی جو پہلے ستارے کے متعلق کہی تھی۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو انھوں نے اسی طرح اپنے کو مخاطب کرتے ہوئے اور آس پاس والوں کو سناتے ہوئے فرمایا کہ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا) غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں تعلیم کا قدم پہلے کی نسبت سے آگے ہے۔ یہاں صرف اتنی ہی بات نہیں ظاہر ہوئی کہ ڈوبنے والے سزاوار عبادت نہیں بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ان ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ نیز یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ یہ ضلالت کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ بڑے حسرت واندوہ کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف خدا ہے، وہ ہدایت نہ بخشے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے درپے ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں حضرت ابراہیمؑ نے چونکہ اپنے آپ سے کہیں اس وجہ سے سننے والوں میں سے جس کے کان میں پڑی ہوں گی اس کے لیے ان سے چڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی بلکہ جس کے اندر کچھ بھی غور و فکر کی صلاحیت رہی ہوگی وہ اس سوچ میں پڑ گیا ہوگا کہ ایک یہ شخص ہے جو طلب ہدایت میں اس طرح بے قرار ہے اور ایک ہم ہیں کہ پتھر کی طرح اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔

ایک حقیقت کا اظہار

یہاں حضرت ابراہیمؑ نے جو یہ بات فرمائی کہ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ تو یہ ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے۔ ہدایت ہمیشہ خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے، اگر وہ ہدایت نہ دے تو کسی کو بھی ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بعض لوگوں نے اس کو شرط فی الماضی کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ ان کے یہ بات کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سے پہلے گمراہی میں تھے یا اپنے کو گمراہی پر سمجھتے تھے بلکہ انھوں نے اپنی فطرت سلیم کا آئینہ دوسروں کے سامنے رکھا ہے کہ وہ لوگ اس آئینہ میں اپنے منہ دیکھیں۔ لیکن بس آئینہ رکھ دیا ہے خود ان کو مخاطب کر کے کچھ نہیں کہا ہے کہ وہ وحشت زدہ اور بدگمان نہ ہوں۔

اسی طرح ایک دن انھوں نے سورج کے طلوع و غروب کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنا لیا۔ سورج جب آب و تاب سے نکلا اور نصف النہار پر پہنچا تو اسی انداز میں جس کا ذکر اوپر گزرا، انھوں نے سورج کے متعلق بھی وہی بات فرمائی جو ستارے اور چاند کے متعلق فرمائی تھی۔ البتہ اس کے ساتھ اتنا اضافہ بھی فرما دیا کہ هٰذَآ اَكْبَرُ (یہ

سب سے بڑا ہے ؟ قرینہ صاف پتہ دے رہا ہے کہ یہ بات انھوں نے طنز، تحقیر اور استہزار کے طور پر فرمائی لیکن سننے والوں نے پھر اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ چلو! اس سرپھرے آدمی سے یہ بھی غنیمت ہے۔ زہرہ اور چاند کو نہیں مانتا نہ سہی، ہمارے بڑے دیوتا سورج کو تو مانتا ہے لیکن ان کا یہ اطمینان بھی زیادہ دیرپا نہ ثابت ہوا آخر سورج کو بھی ڈوبنا ہی تھا، وہ بھی ڈوب گیا۔ جب وہ بھی ڈوب گیا تو حضرت ابراہیم نے بالکل کھل کر اور سب کو مخاطب کر کے حق کا اعلان فرما دیا کہ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اے میری قوم کے لوگو! تم جن چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے اپنے آپ کو بری کرتا ہوں۔ اب تک انھوں نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی نوعیت خود اپنے اوپر اپنے تاثرات کے اظہار کی تھی، اگرچہ اس سے مقصود بالواسطہ قوم کی عقل اور اس کے ضمیر کو بیدار کرنا ہی تھا لیکن قوم کو براہِ راست مخاطب نہیں فرمایا تھا۔ اب انھوں نے ان کو براہِ راست مخاطب کر کے ان کے دین اور ان کے معبودوں سے اپنی برأت کا اعلان فرما دیا۔

اعلانِ برأت اور توحید کا زندۂ جاوید کلمہ

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ یہ اس اعلانِ برأت کی تعبیر اور اس کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمام معبودانِ باطل سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنا رخ اس رب کی طرف کر لیا ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ 'لِلَّذِیْ' کا 'لِ' اس بات پر دلیل ہے کہ وَجَّهْتُ کا لفظ 'اَسْلَمْتُ' کے مضمون پر بھی مشتمل ہے۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو بالکلیہ آسمان و زمین کے خالق و مالک کے حوالہ کر دیا۔ یہ توحید اور اسلام کی عظیم آیت اور ملتِ ابراہیمی کا کلمۂ جامعہ ہے اور ہم چونکہ اپنی نمازوں میں اسی حقیقت کا اظہار و اعتراف کرتے ہیں اس وجہ سے ان کا آغاز اسی کلمۂ جامعہ سے کرتے ہیں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَكَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝
(۸۰-۸۲)

قوم کی طرف سے ڈراوے اور حضرت ابراہیم کا جواب

'وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ' جب یہ بات یہاں تک پہنچ گئی، حضرت ابراہیم نے صاف صاف نہ صرف توحید کا بلکہ شرک اور مشرکوں سے اپنی برأت کا بھی اعلان کر دیا تو ان کی قوم ان سے بحث و جدال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور شرک کی بنیاد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چونکہ تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے اس وجہ سے قوم کے لوگوں نے طرح طرح سے ان کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ معبودوں سے نفرت و بغاوت کا اعلان کرتے ہو تو ان کی پکڑ میں آ جاؤ گے، اندھے ہو جاؤ گے، اپاہج ہو جاؤ گے، تم پر بجلی گرے گی، بری موت مرو گے۔ حضرت ابراہیم نے جواب میں فرمایا کہ تم خدا کے باب میں مجھ سے جھگڑتے ہو کہ میں تنہا اسی کو کیوں مانتا ہوں، اس کے شریک کیوں نہیں ٹھہراتا، اسی خدا نے تو مجھے یہ ہدایت بخشی ہے کہ اس کا کوئی شریک

نہیں ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم خدا کی منکر نہیں تھی بلکہ اس کے شریک ٹھہراتی تھی اور یہ بات صرف حضرت ابراہیمؑ کی قوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کی کوئی قوم بھی خدا کی منکر نہیں ہوئی ہے، جس نے بھی ٹھوکر کھائی ہے اس کی توحید کے باب میں ٹھوکر کھائی ہے۔ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا' یہ قوم کے ڈراووں کا جواب ہے کہ میں تمہارے ان فرضی شریکوں سے ذرا نہیں ڈرتا، مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تک میرا رب مجھے کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہے، نفع نقصان اسی کے اختیار میں ہے، اس کے اذن کے بغیر کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرا بال بیکا کر سکے۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس وجہ سے مجھے یہ بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کوئی اس کی لاعلمی میں مجھے کوئی نقصان پہنچا دے گا۔ یہ تم لوگ کیسی باتیں کرتے ہو، کیا تم لوگ سوچتے نہیں؟ 'اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ' میں تفویض الی اللہ کا مضمون ہے جس سے اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے کہ میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں خدا کے اعتماد پر کہہ رہا ہوں۔ یہ مضمون حضرت شعیبؑ کی زبان سے سورۂ اعراف میں بھی آیا ہے قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۭ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا (۸۹۔ اعراف) (اگر ہم تمہاری ملت میں پھر لوٹ گئے بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات بخشی تو یہ ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھیں گے، یہ ہم سے تو ہوگا نہیں کہ ہم پھر اس میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارا رب چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا) اس سے معلوم ہوا کہ پاک سے پاک ارادے اور سچے سے سچے عزم کی تکمیل بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق پر ہی منحصر ہے۔ اس وجہ سے بندے کو کوئی بات بھی مجرد اپنے اعتماد پر دعوے کے ساتھ نہیں کہنی چاہیے بلکہ خدا کے اعتماد پر کہنی چاہیے۔ اس لیے کہ ہر راہ میں اس کی آزمائشیں ہیں اور ان آزمائشوں میں پورا اترنا اس کی مدد اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

'وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ' یعنی ڈرنا تو تمہیں چاہیے خدا کے غضب اور اس کے قہر سے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے بارے میں تمہارے پاس خدا کی اتاری ہوئی کوئی سند اور دلیل نہیں ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے لیکن الٹے تم ڈرا مجھے رہے ہو۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم بھی مانتے ہو، میں بھی مانتا ہوں۔ یہ تو ایک مسلم بات ہوئی۔ اب خدا کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو خدا کے شریک و سہیم ہیں تو اس کا بارِ ثبوت تم پر ہے۔ اگر تم بے ثبوت ان کو شریک خدا بنائے بیٹھے ہو تو تم خدا کے اقراری مجرم ہو۔ اور اگر وہ تم کو اس کی سزا دے تو تم سزا کے مستحق ہو۔ میں نے کس کا جرم کیا ہے جس سے ڈروں؟ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو تو بتاؤ کہ خدا کی امان کا حقدار میں ہوں یا تم؟ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ تم چور ہو کر الٹے کوتوال کو ڈانٹتے ہو۔

'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ الاية' ظلم سے مراد، جیسا کہ ایک سے زیادہ

توحید کی اصل حقیقت

مقامات میں ہم واضح کر آئے ہیں، شرک ہے۔ اب یہ توحید کے باب میں اصل حقیقت کا بیان ہے کہ خدا کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔ جس ایمان کے اندر شرک کی ملاوٹ ہو وہ ایمان خدا کے ہاں معتبر نہیں۔ تم اس کا ضامن اپنے شرکا کو سمجھتے ہو اور خدا سے بے نیاز ہو حالانکہ اس کے سزاوار وہ ہیں جو ہر معاملے میں صرف خدا پر اعتماد رکھتے ہیں اور شرک سے بری ہیں۔ یہی لوگ ہدایت پر ہیں اس کے سوا ہر راہ گمراہی کی راہ ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۸۳)

یہ ارتقائے فکر نہیں بلکہ ارتقائے دعوت ہے

'تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ' یہ اشارہ توحید کی اس دلیل کی طرف ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم پر قائم فرمائی اور جو اوپر تفصیل سے مذکور ہوئی۔ اس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابل میں عطا فرمائی، اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو لوگ اس کو حضرت ابراہیمؑ کا فکری ارتقا سمجھتے ہیں ان کا خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے یہ حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا ارتقا نہیں بلکہ اس کو کہہ سکتے ہیں تو ان کی دعوت کا ارتقا کہہ سکتے ہیں۔ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا ارتقاء بیان ہوا ہوتا تو 'عَلٰى قَوْمِهٖ' کے الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔

یہاں چند اور باتیں بھی ذہن میں رکھیے۔

انبیاء نبوت سے پہلے بھی فطرتِ سلیم پر ہوتے ہیں

ایک یہ کہ حضرات انبیا علیہم السلام فطرتِ سلیم پر پیدا ہوتے اور فطرتِ سلیم ہی پر پروان چڑھتے ہیں۔ نبوت سے پہلے بھی ان کو کبھی توحید و شرک کے معاملے میں اشتباہ پیش نہیں آتا۔ توحید تو عہد فطرت ہے جو خدا نے اولادِ آدم سے ان کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی لیا ہے اور قرآن سے یہ ثابت ہے کہ اس عہد ہی کی بنا پر توحید کے معاملے میں ہر شخص عنداللہ مسئول ہوگا خواہ اسے کسی نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ ایسی حالت میں کسی نبی کے متعلق یہ گمان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی کبھی کسی شرک سے آلودہ ہو سکتا ہے[1]۔ نبوت سے پہلے بھی حضرات انبیاء جہاں تک مبادی فطرت کا تعلق ہے بالکل فطرۃ اللہ پر ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ نخلِ فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں اس دور میں انھیں جو جستجو ہوتی ہے وہ خدا کی نہیں بلکہ خدا کی مرضیات اور اس کے احکام کی ہوتی ہے۔ یہ جستجو بھی درحقیقت ان کی فطرتِ سلیم ہی کی پیاس ہوتی ہے جو اپنے بلوغ پر بھڑکتی ہے اور سیرابی و آسودگی کی خواہاں ہوتی ہے۔ یہ سیرابی ان کو وحی کے ابرِ نیساں سے حاصل ہوتی ہے۔ انبیا کے لیے وحی کی حیثیت تاریکی کے اندر روشنی کی نہیں بلکہ روشنی

---

[1] اس مسئلہ پر مفصل بحث سورۂ اعراف کی آیت ۲، کے تحت آئے گی۔ اپنی کتاب 'حقیقتِ شرک و توحید' میں بھی ایک فصل 'شرک کا اصل سبب' کے عنوان سے ہم نے اس مسئلہ پر لکھی ہے۔

کے اوپر روشنی کی ہوتی ہے نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو ہم سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

دوسری یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کا ملکوتِ الٰہی سے جو استشہاد اوپر مذکور ہوا ہے وہ نبوت سے پہلے کا نہیں بلکہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد کا ہے جب انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا ہے۔ پہلے انھوں نے اپنے باپ کو دعوت دی اور یہی حضرات انبیاء کی معروف سنت رہی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اپنے سب سے زیادہ قریبی عزیزوں کو دعوت دی ہے۔ اس کے بعد اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے سامنے بالتدریج اس طرح اعلانِ حق فرمایا جس کی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ اس بات کی دلیل کہ یہ نبوت کے بعد کا واقعہ ہے آیات ۷۹-۸۰ میں موجود ہے۔ ان آشکارا الفاظ میں یہ زندۂ جاوید کلمات ایک نبی کے سوا کون کہہ سکتا ہے۔

یہ حجت حضرت ابراہیمؑ نے نبی ہونے کے بعد پیش کی ہے

تیسری یہ کہ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کا فکری ارتقا ہوتا تو واقعات کی یہ ترتیب بالکل خلاف فطرت ماننی پڑے گی۔ آخر سب سے پہلے ان کو ایک چھوٹے سے تارے ہی نے کیوں اپنی طرف متوجہ کیا، ہر صبح کو اس کو دفر سے طلوع ہونے والا سورج کہاں چلا گیا تھا؛ اس قسم کے خلاف فطرت مشاہدے کے لیے پھر اس سے زیادہ خلاف فطرت یہ روایت لوگوں کو گھڑنی پڑی کہ حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ایک غار میں ہوئی تھی، اسی میں وہ پلے اور جوان ہوئے اور جب اس سے نکلے تو شب کا وقت تھا اور پہلی چیز جس کا انھوں نے اس کائنات کی جاذب نظر چیزوں میں سے مشاہدہ کیا وہ زہرہ ستارہ تھا۔

ترتیبِ واقعات شاہد ہے کہ یہ ارتقائے فکر نہیں ہے

چوتھی یہ کہ استدراجی طریقۂ استدلال میں متکلم اگر حریف کی کسی بات کو مانتا ہے تو ماننے کے لیے نہیں مانتا بلکہ وہ اس کو اسی داؤں پر شکست دینا چاہتا ہے جس کو حریف اپنا خاص داؤں سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیا کے مکذبین کے لیے اپنی جس سنتِ استدراج کا ذکر قرآن میں فرمایا ہے اس کی بھی خاص خصوصیت یہی بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ وہیں سے ان کو دھر لیتا ہے جہاں سے ان کو اپنی کامیابی و فتح مندی کا غرہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم اگر سورج، چاند، زہرہ کی پرستش کرتی تھی تو آخر اس کے نزدیک ان کی خدائی کی دلیل کیا تھی؟ یہی نا کہ وہ طلوع ہوتے اور چمکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی کو پکڑ لیا کہ اگر طلوع ہونا اور چمکنا ہی ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو آؤ ان کا ڈوبنا اور تاریک ہونا بھی دیکھ لو اور بتاؤ تمھاری وہ دلیل کہاں گئی! نفسیات انسانی کا یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ جن کی خدائی کی دلیل ان کے ذہنی کرو فر ہی سے اخذ کی گئی ہو ان کی بے ثباتی اور ناپائداری پر سب سے مؤثر تقریر کا وقت وہی ہوتا ہے جب ان کی لاش ان کے پرستاروں کے سامنے پڑی ہو۔

استدراجی طریقۂ استدلال کی ایک خصوصیت

پانچویں یہ کہ انبیا کے طریقۂ کار اور خطاب و استدلال میں، استدراج، مزاح، طنز، توریہ اور تدریج وغیرہ کے انداز جو کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، یہ سب انسانی فطرت کے مقتضیات پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر اسلوب کا ایک محل ہوتا ہے اور ہر انداز اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ بسا اوقات ایک وتفہ، جو بظاہر ٹھہراؤ ہوتا

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

ہے، سفر کی ہزاروں منزلیں طے کرا دیتا ہے اور ایک دلآویز طنز، جو بظاہر طنز ہوتا ہے، ہزاروں حجتوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ خدا نے چاہا تو قرآن کے آخری گروپ میں دعوتِ انبیا کے یہ نفسیاتی پہلو تفصیل سے زیربحث آئیں گے۔

حکمتِ الٰہی میں تفکر کی برکتیں

'نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ' 'درجات' جمع بھی ہے اور اس پر تنوین بھی ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں۔ اوپر وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ کے تحت ہم نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اسی کی تعبیر یہ دوسرے الفاظ میں ہے کہ جو لوگ ملکوتِ الٰہی پر غور کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسی طرح علم و معرفت اور ایمان و یقین میں ان کے مدارج بلند کرتا جاتا ہے۔ حکیم و علیم کی صفات کا یہاں حوالہ اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ نے اپنے اس 'چاہنے' کے لیے مقرر فرمائی ہے۔ یعنی اس کا یہ 'چاہنا' اس کے علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے قرب کے مدارج آنکھ بند کر کے نہیں بانٹتا بلکہ ان کو بخشتا ہے جو اس کے سزاوار ہوتے ہیں اور جو اس کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ اس میں نہایت لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ آدمی اگر عقل و فکر سے کام نہ لے تو اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو معبود بنا کر سجدے کرتا اور ان سے حاجت روائی کا امیدوار ہوتا ہے اور اگر عقل و فکر سے کام لے تو شمس و قمر اور زہرہ و مشتری سب اس کی راہ کی گرد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۙ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (۸۴-۹۰)

اس دنیا میں حضرت ابراہیمؑ کے لیے رفع ذکر کی سرفرازی

اوپر کی آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے ساتھ ان کے روحانی و ایمانی مدارج کا بیان ہوا۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں بھی اللہ نے ان کو اور ان کی دعوت کو رفع ذکر اور شہرت دوام کی عزت و سرفرازی عطا فرمائی۔ ان کی ذریت میں بڑے بڑے انبیاء اور بلند مرتبہ صالحین و مجددین اٹھے اور ان سب کا دین وہی دین توحید تھا جس کی دعوت ابراہیمؑ نے اور ان سے پہلے نوحؑ نے دی۔ مطلب یہ ہے کہ یہی دین تمام انبیاء کا مشترک دین ہے اور تم بھی اسی دین کی دعوت دے رہے ہو۔ اگر تمھاری قوم اس کو قبول نہیں کرنا چاہتی تو تم اس کی پروا نہ کرو۔ اللہ نے دوسروں کو کھڑا کر دیا ہے جو اس کے حامل بنیں گے۔ تمہیں ان کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر بہرحال انہی لوگوں کے دین کی پیروی کرنی ہے جن کو اللہ کی ہدایت نصیب ہوئی۔

تو تم انھی کی پیروی کرو اور ان مخالفوں سے صاف صاف کہہ دو کہ میں تم سے کسی عوض کا طالب تو ہوں نہیں کہ اگر تم نے میری دکان سے مال نہ خریدا تو میری دکان میٹھ جائے گی۔ میں تو تمھارے سامنے جو کچھ پیش کر رہا ہوں تمھارے لیے ایک یاد دہانی ہے۔ اس کو قبول کرو تو تمھارا اپنا نفع ہے، نہ قبول کرو گے تو تم خود بھگتو گے میرا کچھ نہیں جائے گا۔

انبیاء جن کو

ایں خانہ تمام آفتاب است

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ الاٰیۃ حضرت اسحٰقؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اور حضرت یعقوبؑ پوتے ہیں۔ فرمایا کہ كُلًّا هَدَيْنَا ان میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت بخشی یعنی اسی دینِ توحید اور اسی صراطِ مستقیم کی جس کی دعوت ابراہیمؑ نے دی۔ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ یہ حضرت ابراہیمؑ سے اوپر کے سلسلۂ ہدایت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ابراہیمؑ سے پہلے نوحؑ کو بھی ہم نے اسی راستے کی ہدایت کی تھی اور اس نے اسی کی دعوت دی۔ تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے حضرت ابراہیمؑ کی تربیت بھی فرمائی تھی۔ اس پہلو سے گویا اوپر اور نیچے دونوں کی کڑیاں مل گئیں۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ میں ضمیر حضرت ابراہیمؑ کی طرف لوٹتی ہے۔ فرمایا کہ اس کی ذریت میں سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی اسی صراطِ مستقیم کی ہدایت سے نوازا۔

انبیاء جن کو نبوت کے ساتھ سیاسی اقتدار بھی حاصل ہوا

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ سارے حضرات جلیل القدر انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خصوصیت بھی ان میں مشترک ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو بادشاہت یا کسی نہ کسی نوع کی سیاسی سیادت حاصل ہوئی۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انھیں یہ ہدایت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ یہ خوب کار لوگ تھے، اللہ نے ان کو جو صلاحیتیں بخشیں ان کو انھوں نے صحیح استعمال کیا تو اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا۔ گویا اس کا کوئی تعلق خاندان کی وراثت سے نہیں بلکہ تمام تر صفات داخلاق سے تھا۔

انبیاء جن کا مشترک وصف زہد و توکل ہے

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى الاٰیۃ زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام مشہور پیغمبروں میں سے ہیں۔ 'الیاس' سے مراد توریت کے ایلیا نبی ہیں۔ ان پیغمبروں کی نسبت بھی فرمایا کہ اللہ نے ان کو بھی اسی صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی جس کی ہدایت ابراہیمؑ اور دوسرے نبیوں کو بخشی۔ یہ بھی توحید اور اسلام ہی کے داعی تھے، کسی اور دین کے داعی نہیں تھے۔ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ یہ سب کے سب زمرہ صالحین میں سے تھے۔ اس سے ایک تو وہی بات نکلی جس کی طرف اوپر اشارہ گزرا کہ یہ جو کچھ انھیں حاصل ہوا ان کے صلاح و تقویٰ کی بنا پر حاصل ہوا، دوسری بات یہ نکلی کہ یہ تھے بہرحال خدا کے صالح بندوں ہی میں سے، ان میں سے کسی کو خدائی کا مقام حاصل نہیں تھا جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق گمان کیا۔ جس طرح مذکورہ بالا انبیاء میں حکومت و سیادت مشترک وصف کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح ان انبیا میں زہد، فقر اور تبتل کی شان مشترک ہے۔

'الیسع' کی تحقیق

وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَالۡيَسَعَ وَيُوۡنُسَ وَلُوۡطًا الآیۃ ان ناموں میں سے تین نام اسمٰعیلؑ، یونسؑ اور لوطؑ تو مشہور ہیں، قرآن میں بھی ان انبیاء کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں البتہ الیسع سے ملتے جلتے دو نبیوں کے نام ہیں۔ ایک الیشع جن کا زمانہ ۸۳۸ق م بتایا جاتا ہے، دوسرے یسعیاہ جن کا زمانہ ۷۶۲ق م بتایا گیا ہے۔ پہلا نام قرآن کے تلفظ سے قریب تر ہے۔ 'وَكُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ' میں اسی منصبی فضیلت کی طرف اشارہ ہے جو ہر نبی کو اس کے منصب کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ نبی چونکہ خلق کی ہدایت پر مامور ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ان انبیا کے لیے جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ تمام انبیا کی مشترک صفات ہیں۔ الگ الگ بیان کرنے سے مقصود ان کی تخصیص نہیں، محض تعدید ہے تاکہ ہر صفت پر قاری کی الگ الگ توجہ ہو جائے۔

'وَمِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ' الآیۃ یعنی یہ ہدایت صرف ان نبیوں تک ہی محدود نہیں رہی، ان کے باپ دادوں، ان کی آل اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی کتنوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ فرمایا کہ ہم نے انھیں بھی اپنی راہ دکھائی، انھیں برگزیدہ کیا اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ 'اجتباء' سے مراد یہاں وہ برگزیدگی ہے جو اللہ نے اپنی توحید اور ہدایت کی دعوت و اشاعت کے لیے ان کو بخشی۔ 'صراط مستقیم' سے مراد یہاں توحید کی راہ ہے۔ اور اس کی تنکیر یہاں تفخیم شان کے پہلو سے ہے۔

ہدایت وہ ہے جو انبیاء کو حاصل ہوئی

'ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ' یعنی یہی ہدایت جو ان تمام نبیوں کو اور ان کی پیروی کرنے والوں کو حاصل ہوئی یہی اللہ کی ہدایت ہے۔ باقی اس کے سوا جتنی راہیں ہیں سب شیطان کی نکالی ہوئی ہیں۔ یہ راہ اللہ اپنے ان بندوں پر کھولتا ہے 'جن کے لیے چاہتا ہے'۔ 'جن کے لیے چاہتا ہے' سے اشارہ اس سنت اللہ کی طرف ہے جو اس نے ایمان و ہدایت کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اس کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ بھی، جن کو اللہ نے یہ مرتبے عطا فرمائے اگر کہیں شرک میں مبتلا ہو جاتے تو ان کا سارا کیا دھرا برباد ہو کے رہ جاتا۔ مجرد اس بنیاد پر ان کی برگزیدگی قائم نہ رہتی کہ یہ نوحؑ یا ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ یہ تنبیہ اہل عرب کے لیے بھی ہے اور بنی اسرائیل کے لیے بھی کہ توحید سے منحرف ہو کر جو لوگ مجرد اس نسبت پر برگزیدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں جو انھیں ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کے سبب سے حاصل ہے وہ نری حماقت میں مبتلا ہیں۔ یہ تو درکنار اگر وہ بھی شرک میں آلودہ ہو جاتے تو خدا کے ہاں ان کا بھی کوئی وزن باقی نہ رہ جاتا۔

'حکم' اور 'حکمت' کی وضاحت

'اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ' الآیۃ کتاب کے ساتھ حکمت کا لفظ قرآن میں اکثر آیا ہے۔ یہاں حکم کا لفظ ہے۔ مولانا فراہیؒ اپنی کتاب مفردات القرآن میں لفظ حکم پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حکم سے مراد صحیح فہم اور صحیح فہم کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ کرنا ہے۔ یہی چیز جب پختہ ہو کر ایک ملکۂ راسخہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو اس کو حکمت کہتے ہیں۔ حکم اور حکمت کتاب الٰہی کے لوازم میں سے ہیں اس لیے کہ کتاب الٰہی کا اصل مقصد ہی زندگی کے معاملات میں رہنمائی دینا ہے، عام اس

سے کہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی اور عام اس سے کہ پیش آمدہ صورتِ معاملہ صریحاً کتاب میں بیان ہوئی ہو یا اجتہاداً واستنباطاً اس کا حکم نکالنا پڑے۔ کتاب کی طرح یہ حکم بھی عطیۂ الٰہی ہے اور اسی سے کتابِ الٰہی زندگی کی ایک عملی حقیقت بنتی ہے۔ اگر حاملینِ کتاب اس چیز سے محروم ہو جائیں تو پھر کتاب زندگی کے معاملات ومسائل سے بے تعلق ہو کر محض ایک ایسی تاریخی دستاویز بن کے رہ جاتی ہے جو نوادرات کے کسی عجائب خانہ میں رکھی ہو۔

صحابہ کرامؓ کا عظیم رتبہ

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ (جن کا اوپر بیان ہوا) ہیں جن کو ہم نے کتاب، حکم اور نبوت کی نعمت سے سرفراز کیا اور انھوں نے اس نعمت کی قدر کی۔ اب انھی نعمتوں سے ہم نے تمھارے واسطہ سے (اشارہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے) ان لوگوں کو (اشارہ اہلِ مکہ کی طرف ہے) نوازنا چاہا ہے۔ حق تو یہ تھا کہ یہ اس نعمت کی قدر کرتے لیکن یہ لوگ اس نعمت کی اگر ناقدری کرتے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو، ہم نے ایسے لوگوں کو اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے مقرر کر دیا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں۔ 'وَکَّلْنَا بِھَا' میں ذمہ دار بنائے جانے کے ساتھ ساتھ ضامن اور راہبن بنائے جانے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ 'بِ' اس پر دلیل ہے۔ 'قَوْمًا' سے مراد یہاں صحابہؓ کی وہ جماعت بھی ہے جو اس وقت تک داخلِ اسلام ہو چکی تھی اور وہ لوگ بھی ہیں جن کے لیے بعد میں اس کے حاملین میں داخل ہونا مقدر تھا، اگرچہ ان آیات کے نزول کے وقت تک وہ ان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس ٹکڑے میں صحابہؓ کی استقامت اور مستقبل میں امت کی کثرت کی پیشینگوئی ہے اور اس پہلو سے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم بشارت ہے جو اس دور میں آپ کو دی گئی جب آپ مخالفتوں کے طوفان سے گزر رہے تھے۔ الفاظ سے تقدیرِ الٰہی کا وہ اٹل فیصلہ بھی مترشح ہو رہا ہے جو اس دعوت کو فتح مند کرنے کے لیے ہو چکا ہے اور یہ اشارہ بھی نکل رہا ہے کہ اللہ نے اپنے جن بندوں کو اس کے لیے کھڑا کر دیا ہے ان کی قلتِ تعداد پر نہ جاؤ، یہی لوگ اس دعوت کے علمبردار ہوں گے اور یہی قطرے ایک دن سمندر بنیں گے۔

یہ دعوت ہے نہ کہ تجارت

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ، میں 'ہ' وقفہ اور سکتہ کی ہے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی ہدایت سے سرفراز فرمایا تو تم انھی کے نقشِ قدم پر چلو اور انھی کی ہدایت کی پیروی کرو۔ رہے یہ لوگ جو مدعی تو ہیں ابراہیم کے وارث ہونے کے لیکن پیروی کر رہے ہیں شیطان کی اور تمھاری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان سے کہہ دو کہ میں اس پر کوئی معاوضہ تو تم سے مانگ نہیں رہا ہوں کہ تم اس کا بوجھ محسوس کر رہے ہو، میں نے اپنے رب سے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہا ہوں۔ اگر قبول کرو گے تو تمھارا ہی نفع ہے، رد کر دو گے تو خود محروم رہو گے۔ یہ اللہ کے دین کی دعوت ہے، یہ کوئی تجارت اور دکانداری نہیں ہے کہ تم گاہک نہ بنو گے تو میرا کاروبار بیٹھ جائے گا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔

زندگی کے دو مفہوم

'اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ' میں 'ھُوَ' کا مرجع قرآن ہے اور یہ اسی مضمون کی مزید توضیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن تو محض لوگوں کے لیے ایک تذکیر اور ایک یاد دہانی ہے۔ پیغمبر نے اگر یہ یاد دہانی پہنچا دی تو وہ

اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا۔ اگر لوگ اس کو قبول نہیں کرتے تو اس کا انجام وہ خود دیکھیں گے۔ پیغمبر پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو قبول ہی کرلیں۔ قرآن کے لیے 'ذکریٰ' کے لفظ سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ کوئی اوپری اور انوکھی بات نہیں ہے بلکہ انھی حقائق کی یاد دہانی ہے جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں لیکن لوگوں نے ان کو اپنی خواہشات و بدعات کے نیچے دبا دیا ہے۔ دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ یہ اسی ہدایت الٰہی کی یاد دہانی کر رہا ہے جس کو نوحؑ، ابراہیمؑ اور تمام انبیاء لے کر آئے لیکن ان کے ساتھ نسبت کے مدعیوں نے اس ہدایت الٰہی کی جگہ مختلف ناموں سے مختلف ضلالتیں ایجاد کرلیں اور انہی ضلالتوں کو اپنے بزرگوں کا دین سمجھ بیٹھے۔ قرآن اپنی اس تذکیر سے تاریخ کے فراموش کردہ اوراق کو بھی یاد دلا رہا ہے اور فطرت کے فراموش کردہ اسباق کو بھی۔ پس جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔

۱۳۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۹۱-۹۴

اوپر بیان ہوا کہ قرآن، توحید اور اسلام کی جو دعوت دے رہا ہے یہ تمام انبیا کی مشترک دعوت ہے۔ جو لوگ اس کی تکذیب کر رہے ہیں یہ ان کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے۔ اب آگے چند آیتوں میں ان تکذیب کرنے والوں کے رویہ پر تبصرہ فرمایا ہے اور ان کے اقوال کا حوالہ دے کر ان کی لغویت واضح کی ہے۔ ان تکذیب کرنے والوں میں پیش پیش تو قدرتی طور پر رؤسائے مکہ تھے لیکن ابتدا ہی سے یہود نے ان کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کردی تھی اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے فروغ میں اصلی خطرہ وہ اپنے ہی لیے سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کے ذہن میں بات تو یہ بسی ہوئی تھی کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا اجارہ ہے، اگر کوئی نبی آنے والا ہی ہے تو بنی اسرائیل میں آئے گا، اس خانوادہ سے باہر کیسے آسکتا ہے۔ اب جو یہ صورت حال ان کے سامنے آئی تو سخت کش مکش میں پڑ گئے کہ اس خطرے کو کیسے روکیں۔ غیر جانبدار بن کے بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا لیکن مخالفت کریں تو کس انداز سے کریں۔ اگر یہ بات کہیں کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا حصہ ہے اور تورات کی موجودگی میں اب کسی اور قرآن و کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہی تو اندیشہ تھا کہ اس سے عربوں کی حمیت بھڑکے گی اور عجب نہیں کہ اس جوش میں وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس اندیشے کی بنا پر انھوں نے اپنے دل کی بات تو دل میں رکھی لیکن آنحضرت کے مخالفین کو شہ دینے کے لیے یوں کہنا شروع کر دیا کہ جو بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر خدا نے کوئی کتاب اتاری ہے بالکل برخود غلط ہے، خدا نے کسی پر بھی کوئی چیز نہیں اتاری ہے۔ یہ بات وہ کہتے تو تھے اپنے مخصوص ذہنی تحفظ کے ساتھ ہی لیکن اس سیاسی مصلحت سے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، وہ اس کو ایک عام کلیہ کے رنگ میں پیش کرتے تھے۔ قرآن نے یہاں ان کی یہ شرارت بھی بے نقاب کی اور قریش کے ان

متکبرین کو بھی جواب دیا جو محض اپنے غرور سیادت میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کے حلقے سے باہر بھی کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جس کو خدا کوئی شرف و عزت بخش سکتا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۹۱-۹۴

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰي عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ تَرٰٓي اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰي كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰي مَعَكُمْ شُفَعَاۗءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰۗؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

ع ۱۱ / ۱۷

ترجمۂ آیات ۹۱-۹۴

اور انھوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی جب کہ یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر بھی

کوئی چیز نہیں اتاری۔ ان سے پوچھو، وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے، جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو، اور تم کو ان باتوں کی تعلیم دی گئی جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا، کہہ دو اللہ ہی نے، پھر ان کو ان کی کج بحثیوں میں چھوڑ دو، کھیلتے رہیں اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری بابرکت، تصدیق کرنے والی اپنے سے پہلے کی چیز کی (تاکہ تو خوش خبری دے) اور تاکہ ہوشیار کر دے ام القریٰ اور اس کے ارد گرد والوں کو اور جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لائیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۹۱-۹۲

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے یا دعوے کرے کہ مجھ پر وحی آئی ہے درآنحالیکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو اور اس سے جو دعوے کرے کہ جیسا کلام خدا نے اتارا ہے میں بھی اتار دوں گا۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب کہ یہ ظالم موت کی جانکنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں حوالہ کرو، آج تم ذلت کا عذاب دیے جاؤ گے بوجہ اس کے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے اور تم متکبرانہ اس کی آیات سے اعراض کرتے تھے اور بالآخر تم آئے ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسا کہ ہم نے تم کو اول بار پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا سب تم نے پیچھے چھوڑا اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ وہ تمہارے معاملہ میں ہمارے شریک ہیں۔ تمہارا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا اور جو چیزیں تم گمان کیے بیٹھے تھے وہ سب ہوا ہو گئیں۔ ۹۳-۹۴

۱۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ (۹۱)

یہود کی ایک شرارت

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ، اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ قول کہ "اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری ہے" یہود کا ہے۔ اگرچہ ان کے ذہن میں تو بات یہ رہی ہوگی کہ اب موسیٰ کی کتاب اور ان کی شریعت کے بعد کسی نئی کتاب و شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن یوں صاف صاف بات کہنے میں عربوں کی قومی حمیت کے بھڑکنے کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اندیشہ تھا اس وجہ سے انھوں نے اس پہلو کو بچاتے ہوئے کہہ دیا کہ خدا نے کسی پر بھی کچھ نہیں اتارا ہے کہ اپنا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور کسی کو کوئی بدگمانی بھی نہ ہو۔ یہاں جواب میں ان کے قول کا ظاہری اور باطنی دونوں ہی پہلو ملحوظ ہے۔

خلق کی ہدایت کا سامان کرنا خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے

پہلے ان کے قول کے ظاہر الفاظ پر گرفت فرمائی اور اس کی تمہید یوں اٹھائی کہ انھوں نے یہ بات کہہ کر خدا کی قدردانی کا کچھ اچھا ثبوت نہیں دیا۔ اگر یہ بات اُمّی عرب کہتے تو ان کے لیے کچھ عذر ہو سکتا تھا کہ کتاب و شریعت سے ناآشنا لوگ ہیں اس وجہ سے ایک عامیانہ بات کہہ گزرے۔ لیکن جب یہ بات ان لوگوں نے کہی جو تمام نبیوں اور رسولوں کے وارث اور تمام کتاب و شریعت کے حامل ہونے کے مدعی ہیں تو ثابت ہوا کہ خدا شناسی کے ان مدعیوں نے خدا کو بہت کم پہچانا ہے۔ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ جس خدا نے انسان کے اندر ودیعت کردہ ہر طلب اور ہر تقاضے کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا آخر وہ اس کے سب سے قوی داعیہ ــــ طلبِ ہدایت ــــ ہی کی تسکین و تسلی کا سامان کیوں نہ کرتا؟ اس نے ہمیں پیاس دی تو اس کی تسکین کے لیے زمین کے اندر بھی پانی کی سوتیں جاری کر دیں اور آسمان سے بھی اپنی رحمت کی گھٹائیں برسائیں پھر اس خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے کسی پر اپنی ہدایت و شریعت نہیں اتاری، ایک ایسی بات ہے جو وہی کہہ سکتے ہیں جو نہ خدا کی صفتوں سے واقف ہوں اور نہ اس کے ان افضال و عنایات سے جن کے مورد پشتہا پشت سے وہ خود رہ چکے ہیں۔

یہود کو ایک مسکت جواب

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ۔ تمہید کے بعد اب یہ ان سے سوال ہے کہ اگر خدا نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ بتائیں کہ وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ لے کر آئے اور جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت بن کر نازل ہوئی۔ اس کے بعد تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا (جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو) فرما کر

ان کی اس ناقدری کا بھی اظہار فرما دیا جو انھوں نے اس کتاب کی کی اور اس سے ضمناً ان کے مذکورہ بالا قول کے باطنی پہلو کا بھی ایک جواب ہو گیا کہ اگر انھوں نے یہ بات یہ پیش نظر رکھ کر کہی ہے کہ اب موسیٰ کی کتاب کے بعد کسی اور کتاب و شریعت کی ضرورت نہیں ہے تو ان کو یہ کہنے کا بھی حق نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے اس کتاب کی جو قدر کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو ورق ورق کر رکھا ہے، اس کے کچھ حصہ کو تو یہ ظاہر کرتے ہیں اور زیادہ حصے کو چھپاتے ہیں تو جو چیز روشنی اور ہدایت بن کر آئی تھی اس کے ساتھ انھوں نے جب یہ سلوک کیا تو آخر خدا اپنی مخلوق کو تاریکی میں بھٹکنے کے لیے کس طرح چھوڑے رکھتا اور وہ روشنی و ہدایت ان کے لیے کیوں نہ نازل فرماتا جو ان کو تاریکی سے نکالے اور گمراہی سے نجات دے۔

یہود کی اخفائے کتاب کی سازش

'قراطیس'، قرطاس کی جمع ہے۔ 'قرطاس' لکھنے کے صحیفہ اور ورق کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ کسی چیز سے بھی بنایا گیا ہو۔ اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہوں گی جو اس زمانے میں لکھنے کے کام آتی تھیں۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ یہود نے تورات اس شکل میں جمع نہیں کی تھی جس شکل میں مسلمانوں نے قرآن کو ما بین الدفتین جمع کیا بلکہ انھوں نے اس کو مختلف اجزا میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر جزو کو الگ الگ قلمبند کیا تھا اس طرح ان کو اس کی ان تعلیمات اور پیشین گوئیوں کے چھپانے کا آسانی سے موقع مل جاتا تھا جن کو وہ اپنی خواہشات اور مصالح کے خلاف پاتے۔ جب ایک کتاب کے اجزا الگ الگ کراسوں کی شکل میں ہوں اور اس پر اجارہ داری بھی مخصوص ایک گروہ کی ہو تو وہ بڑی آسانی سے یہ کر سکتا ہے کہ اس کے جس جزو کو چاہے اپنے مخصوص حلقے سے باہر کے لوگوں کے علم میں نہ آنے دے۔ قرآن نے یہود پر کتاب الٰہی کے اخفا کا جو جرم عاید کیا ہے اس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی تھی اور قرآن کے اندازِ بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کتاب الٰہی کا زیادہ حصہ یہود نے چھپا لیا تھا، صرف اس کا تھوڑا حصہ وہ ظاہر کرتے تھے اس لیے کہ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو حصہ چھپایا جاتا تھا وہ زیادہ تھا، اس کے معنی لازماً یہی ہوئے کہ جو حصہ ظاہر کیا جاتا تھا وہ تھوڑا تھا۔ اپنی روشنی اور ہدایت اللہ تعالیٰ اس لیے عطا فرماتا ہے کہ لوگ اس سے رہنمائی حاصل کریں نہ اس لیے کہ وہ ڈھانک کے رکھی جائے۔ حضرت مسیحؑ اور بعض دوسرے نبیوں نے بھی یہود کے اس اخفائے کتاب پر ان کی سرزنش کی ہے کہ تم کو چراغ اس لیے دیا گیا تھا کہ اس کو طاق پر رکھو کہ پورے گھر میں روشنی پھیلے لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانک کے رکھا ہے۔

'وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ' یہ جملہ بھی معناً اوپر کے استفہامیہ جملہ ہی پر عطف ہے یعنی وہ کون ہے جس نے موسیٰ کو کتاب دی جس کے ذریعہ سے تم کو وہ باتیں بتائی اور سکھائی گئیں جن کا علم نہ تم کو تھا اور نہ تمھارے باپ دادا کو تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان تمام احسانات سے واقف ہوتے ہوئے اگر کہتے ہو کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ دیدہ دلیری کی آخری حد ہے۔

'قُلِ اللّٰهُ، ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ' یعنی اگر یہ بھول گئے ہیں تو انھیں یہ بتا دو کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کا کیا ہوا ہے اور بتا دینے کے بعد ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو کہ جس کھیل میں یہ لگے ہوئے ہیں وہ کھیل لیں تا آنکہ خدا ان کے باب میں اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ (۹۲)

قرآن کا مرتبہ و مقام

'وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ' اوپر کا جواب تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان کے قول کے ظاہری پہلو کو سامنے رکھ کر تھا، اب یہ ان کے ذہن کے اندر چھپے ہوئے خیال کو سامنے رکھ کر جواب دیا جا رہا ہے کہ تورات کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب کیوں نازل فرمائی ؟ اس کے نزول سے کیا کمی پوری ہوئی ؟ اوپر والی آیت میں ضمناً یہ اشارہ ہو چکا ہے کہ تورات پر ناز کرنے والے مدعیوں نے تورات کے ساتھ کیا سلوک کیا لیکن وہ ایک ضمنی جواب تھا۔ اب یہ قرآن کی مستقل حیثیت اور مستقل ضرورت واضح فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو ان کے علم میں پہلی بار آئی ہو۔ یہ تو وہ کتاب مبارک ہے جس کی بشارت ابراہیم کو دی گئی اور جس کی پیشین گوئی موسیٰ اور مسیح سب نے کی ہے۔ یہ اسی بشارت براہیمی کا ظہور اور انہی پیشینگوئیوں کی تصدیق ہے جو پہلے سے موجود ہیں۔ یہاں قرآن کے لیے 'مبارک' اور 'مصدق' کے الفاظ اس سند کو ظاہر کر رہے ہیں جو پچھلے صحیفوں میں اس کی موجود ہے۔ ہم بقرہ اور آل عمران کی تفسیر میں حوالے نقل کر آئے ہیں۔ 'مبارک' کا لفظ اس عالم گیر برکت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کی بشارت حضرت ابراہیم کو دی گئی تھی کہ اس کا ظہور حضرت اسمٰعیل کی نسل سے پیدا ہونے والے نبی خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے سے ہوگا۔ پیدائش باب ۲۲ میں ہے۔

> "خداوند فرماتا ہے، اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا ...... اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔"

ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ یہاں زمین کی ساری قوموں کے لیے جس برکت کی بشارت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول سے پوری ہوئی۔

'مصدق' کے لفظ پر ہم ایک سے زیادہ مقامات پر بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو اس کے متعلق پچھلے صحیفوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ تثنیہ باب ۱۸ کے حوالہ سے حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئی اور یوحنا باب ۱۶ کے حوالہ سے حضرت عیسیٰؑ کی پیشینگوئی تفسیر سورہ بقرہ میں نقل ہو چکی ہے۔ ان پیشینگوئیوں سے اس کتاب کی خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور وہ ضرورت بھی واضح ہوتی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے اتارنے کا پہلے سے وعدہ فرمایا۔

قرآن اہل عرب کے لیے انذار اور بشارت ہے

وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا' اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو پہلے جملہ سے نکلتا ہے یعنی اس کو ہم نے ایک تو اس مقصد سے اتارا کہ یہ اس عالم گیر رحمت و برکت کی بشارت ہو جس کی پیشین گوئی پہلے سے آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ دوسرے اس لیے کہ تم اس کے ذریعے سے ام القریٰ اور اس کے اردگرد کے لوگوں پر اللہ کی حجت تمام اور انھیں اچھی طرح آگاہ کر دو کہ انھوں نے اس کتاب کو اور تمھاری رسالت کو اگر قبول نہ کیا تو وہ اللہ کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آجائیں گے۔

اُم القریٰ کی دینی و سیاسی اہمیت

قرآن کی یہ ضرورت قریش کے تعلق سے واضح کی گئی ہے اور یہ ضرورت بھی ایک ایسی ضرورت تھی جس کا پورا ہونا ضروری تھا۔ قریش بنی اسمٰعیل کے سربراہ تھے اور ان کی مرکزی آبادی مکہ تھی۔ بنی اسمٰعیل کتاب و نبوت سے ناآشنا امی لوگ تھے۔ حضرت ابراہیم سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اسمٰعیل کی نسل سے وہ ایک رسول اُٹھائے گا جس سے تمام دنیا کی قومیں برکت پائیں گی۔ آنحضرتؐ کی بعثت سے یہ وعدہ پورا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے وہ قوم اگر اس کو قبول کر لیتی ہے تو وہ قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز ہوتی ہے اور اگر اس کو رد کر دیتی ہے تو چونکہ اس پر اللہ کی حجت پوری ہو چکی ہے، وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی اسمٰعیل کے اندر مبعوث فرمایا۔ رسولوں کے باب میں سنت اللہ یہ بھی ہے کہ وہ جس قوم کے اندر بھیجے جاتے ہیں خاندانی اعتبار سے اس کے اشراف میں سے ہوتے ہیں اور وہ اپنی دعوت و انذار میں اول مخاطب قوم کے اعیان و اکابر ہی کو بناتے ہیں اسی وجہ سے آنحضرتؐ کی بعثت مکہ میں ہوئی جو اہل عرب کا دینی و سیاسی مرکز اور قریش کا مستقر تھا۔ اسی اعتبار سے اس کو یہاں ام القریٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صالحین اہل کتاب اور ان کی علامت

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ الاٰية۔ یہ اشارہ صالحین اہل کتاب کی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے رہے وہ لوگ جن کے اندر سرے سے آخرت کا کوئی خوف ہی باقی نہیں رہ گیا ہے ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو۔ یہ لوگ اسی طرح کی کج بحثیوں میں پڑے رہیں گے جن میں پڑے ہوئے ہیں۔ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ' یہ خوفِ آخرت رکھنے والوں کی شناخت بتا دی کہ جن کے اندر آخرت کا خوف موجود ہے وہی ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون بقرہ کے شروع میں بھی گزر چکا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا

خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۹۳-۹۴)

مشرکین مکہ کی ہفوات کا جواب

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ۔ اہل کتاب کے مفسدین کے بعد مشرکین مکہ کے لیڈروں کی طرف توجہ فرمائی اور جو ہفوات وہ قرآن کی نسبت بکتے تھے ان کا مختصراً حوالہ دینے کے بعد ان کے انجام کی طرف ان کو توجہ دلائی۔ ان کی باتیں چونکہ بالکل لالعینی محض ان کے کبر و غرور کا مظاہرہ تھیں اس وجہ سے ان باتوں کے جواب کے بجائے اصل ضرب ان کے کبر و غرور پر لگائی۔ ان کے ذکر کا آغاز ان کے سب سے بڑے ظلم یعنی شرک کے ذکر سے فرمایا، شرک کی نسبت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا ارتکاب کر کے انسان اپنے رب کا بھی سب سے بڑا حق تلف کرتا ہے اور خود اپنے نفس کی بھی سب سے بڑی توہین کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ پھر مزید یہ کہ اللہ کے اوپر یہ جھوٹا افترا ہے اس لیے کہ مشرک محض اپنے جی سے کسی چیز کو خدا کا شریک ٹھہراتا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنا شریک قرار دیا ہے حالانکہ اس دعوے کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

قریش کے لیڈروں کی ایک دھونس

اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ اس افترا پر مزید افترا یہ کہ قریش کے بعض اکابر یہ کہتے کہ جس وحی کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دعویٰ کرتے ہیں اس طرح کی وحی تو ان پر بھی آتی ہے اگر وہ چاہیں تو اسی طرح کا کلام وہ بھی پیش کر سکتے ہیں اس سے ان کا مقصود محض اس اثر کو اپنے عوام کے دلوں سے زائل کرنا ہوتا جو ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات سے پڑتا کہ جو کلام آپ پیش کر رہے ہیں وہ آپ کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی وحی ہے جو وہ اپنے ایک فرشتے کے ذریعے سے آپ پر نازل فرماتا ہے۔ ان مفتریوں نے جواب میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا تجربہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کو ہوتا ہو، اس طرح کی وحی ہم پر بھی آتی ہے۔ ہم بھی چاہیں تو اپنی وحی پیش کر سکتے ہیں لیکن ہم چونکہ اس طرح کی چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس وجہ سے کوئی دعویٰ لے کر نہیں اٹھے۔ دوسری جگہ ان کی یہی بات یوں نقل ہوئی ہے۔ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۳۱ انفال (اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، کہتے ہیں بس کرو، سن لیا، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی اسی طرح کا کلام پیش کر دیتے، یہ ہے کیا، یہ تو بس اگلوں کا فسانہ ہے) یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی صداقت ظاہر ہوتی ہے تو جن لوگوں کے پندار پر اس کی زد پڑتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کے مقابل میں بے بس محسوس کرتے ہیں تو اسی طرح کی دھونس سے وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے دام فریب میں پھنسے ہوئے عوام ان کی صلاحیتوں سے مایوس ہو کر اس صداقت کو اختیار نہ کر لیں۔ لیکن اس قسم کی نمائشی اور ادعائی شہ زوری اصل حقیقت کے مقابل میں کیا کام دے سکتی ہے اور کتنے دن کام دے

سکتی ہے۔ بالآخر ان زبان کے سورماؤں کو میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑتا ہے۔

رعونت کی پاداش میں ذلت کا عذاب

'وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ الاٰیۃ' شرط کا جواب، اس طرح کے مواقع میں حذف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے حذف سے اس کی ہولناکی کی جو تصویر چشم تصور کے سامنے آتی ہے وہ اس کے اظہار کی صورت میں نہیں آسکتی۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قرآن کے متعلق یہ باتیں قریش کے متمردین کہتے تھے۔ فرمایا کہ آج یہ لوگ اللہ کی کتاب کے باب میں اس رعونت کا اظہار کر رہے ہیں لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہ موت کی سکرات میں گرفتار ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر ان سے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ لاؤ، اپنی جانیں حوالہ کرو، اب وقت آگیا کہ تم کو تمہارے افترا اور آیاتِ الٰہی سے تمہارے متکبرانہ اعراض کی پاداش میں تم کو ذلت کا عذاب چکھایا جائے۔ ذلت کا عذاب اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کے مقابل میں رعونت اور تکبر کا اظہار کیا۔ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ سے ان کے قول 'اوحی الی' اور ان کے شرک کی طرف اشارہ ہے کُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِہٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ میں استکبار کا لفظ اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے اس وجہ سے یہاں اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آیا ہے۔ اللہ کی کتاب سے اعراض کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں سب سے زیادہ مہلک اعراض وہ ہے جو غرور اور رعونت کے سبب سے ہو۔ یہاں اسی اعراض کا ذکر ہے اور یہ ابلیس کی خاص وراثت ہے۔ قریش کے لیڈروں پر یہ بات بڑی شاق تھی کہ خدا کی طرف سے کوئی نعمت یا عزت ان کے سوا کسی اور کو حاصل ہو۔ اسی وجہ سے وہ کہتے تھے کہ اگر خدا کسی کو اپنا رسول بنانے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی سردار کو بناتا۔ اسی غرور کا مظاہرہ ان کی ان باتوں سے بھی ہوا جو اوپر نقل ہوئی ہیں۔

'وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی الاٰیۃ' یہاں غائب کو حاضر کے اسلوب میں کر دیا ہے تاکہ 'وَلَوْ تَرٰٓی' میں ان کے جس انجام بد کا حوالہ دیا ہے اس کی ہولناکی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ گویا قیامت آگئی اور ان سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ دیکھ لو جس طرح تم دنیا میں بے سر و سامان گئے تھے اسی طرح بے سر و سامان آج ہمارے حضور میں حاضر ہو گئے، نہ تمہارے ساتھ وہ مال و متاع اور وہ لاؤ لشکر ہے جس کے بل پر تم اتراتے تھے اور نہ وہ شرکاء و شفعاء ہی ہیں جن کو تم ہمارا ساجھی گمان کیے بیٹھے تھے اور جن سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے مقابل میں تمہارے کام آئیں گے۔ 'خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو ایک مضغۂ گوشت اور عملاً تمام صلاحیتوں سے خالی ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی تمام صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے اور اس کو ان وسائل و ذرائع اور ان اموال و املاک کا مالک بناتا ہے جو اس کے لیے مقدر ہوتے ہیں تاکہ وہ دیکھے کہ خدا کی یہ نعمتیں پا کر وہ اس کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا اکڑنے والا اور اترانے والا بن جاتا ہے۔ پھر ایک دن آتا ہے کہ وہ اسی طرح خالی ہاتھ خدا کے حضور میں حاضر کیا جاتا ہے، ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی اس کے ساتھ نہیں جاتی جن کے ل

پردہ بیاں اکڑتا تھا۔

لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ میں فاعل میرے نزدیک حذف ہے یعنی لَقَدْ تَّقَطَّعَ الْحَبْلُ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔ اس میں اشارہ شرکا و شفعا کی طرف ہے یعنی یہ سب ہوا ہو جائیں گے۔

۱۵۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۹۵-۱۰۸

اوپر کا مجموعۂ آیات توحید کے مضمون پر ختم ہوا تھا۔ اسی مضمون کے تعلق سے آگے توحید کے دلائل کی مزید وضاحت ہوئی۔ یہ دلائل توحید کے آفاقی دلائل ہیں جو بیان اس طرح ہوئے ہیں کہ ان سے معاد اور رسالت پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔ گویا وہ پورا مضمون ایک نئے اسلوب سے سامنے آ گیا ہے جو اس سورہ میں زیر بحث ہے نیز کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے اس صحیح نقطۂ نظر کی طرف بھی اس سے رہنمائی ہو رہی ہے جو اوپر حجت ابراہیمی کے سلسلہ میں واضح ہوا ہے۔ پھر اسی تعلق سے قریش کو مخاطب کر کے ان کو مناسب حال تنبیہ کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے آپ کو تسلی دی گئی ہے، مسلمانوں کو مخاطب کر کے مقتضائے وقت کے مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ شروع سے سورہ اسی انداز پر چل رہی ہے۔ مرکزی مضمون، توحید، معاد، رسالت، بار بار مختلف اسلوبوں سے سامنے آتا ہے اور بار بار مخاطبین کے اعتراضات اور ان کے رویے کے تعلق سے کلام تردید یا توضیح یا تسکین یا موعظت کی طرف مڑ جاتا ہے لیکن سررشتۂ کلام کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۵-۱۰۸

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٩٧﴾ وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ﴿٩٨﴾ وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ

السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِیْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰی یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۰۱﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۱۰۲﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۰۳﴾ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ۚ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ﴿۱۰۷﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

ع ۱۲ / ۱۸

ترجمۂ آیات ۹۵-۱۰۸

بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ برآمد کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور وہی برآمد کرنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، بس وہی اللہ ہے تو تم کہاں اوندھے مُوئے جاتے ہو! وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی اور سورج اور چاند اس نے ایک حساب سے رکھے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے پھر ہر ایک کے لیے ایک مستقر اور ایک مدفن ہے، ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو سمجھیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے ہر چیز کے انکھوے نکالے، پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخیں ابھاریں جن سے ہم تہ بہ تہ دانے پیدا کر دیتے ہیں اور کھجور کے گابھے سے لٹکتے ہُوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار، باہمدگر ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو جب وہ پکتا ہے۔ بے شک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۹۵-۹۹

اور انھوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں سے آئی جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہی

اللہ تمھارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے۔ اس کو نگاہیں نہیں پاتیں لیکن وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے، وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔ ۱۰۰-۱۰۳

اب تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت بخش آیتیں آ چکی ہیں تو جو بصیرت سے کام لے گا اپنے ہی کو نفع پہنچائے گا اور جو اندھا بنا رہے گا اس کا وبال اسی پر آئے گا، اور میں تم پر کوئی نگران مقرر نہیں ہوں اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اس کو اچھی طرح واضح کر دیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ ۱۰۴-۱۰۵

تم بس اس چیز کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کر پاتے اور ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں مقرر کیا ہے اور نہ تم ان کے ضامن ہو۔ ۱۰٦-۱۰۷

اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دیجیو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبرانہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نگاہوں میں اس کا عمل کھبا رکھا ہے۔ پھر ان کے رب ہی کی طرف ان سب کا پلٹنا ہے تو وہ انھیں اس سے آگاہ کرے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۰۸

۱٦- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ ۝ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ

الْعَلِيْمِ ○ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۹۵-۹۷)

ایک ایک ذرہ توحید کا شاہد ہے

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى، حَبّ، اور نَوٰی، دانے اور گٹھلی کو کہتے ہیں۔ پہلے چھوٹی چیزوں سے آیاتِ الٰہی کے بیان کا آغاز کیا ہے، پھر کائنات کی بڑی چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا کہ ایک چھوٹے سے دانے اور چھوٹی سی گٹھلی پر بھی خدا کے سوا کسی اور کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ ان کو پھاڑ کر ان کے اندر سے انکھوے نکالے، پھر ان کو پودے اور درخت بنا دے۔ یہ خدا ہی کی قدرت اور اس کی حکمت ہے کہ وہ ایک ایک بیج اور ایک ایک گٹھلی کے اندر صلاحیتیں ودیعت فرماتا ہے، پھر ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے زمین، آسمان، ابر، ہوا، گرمی اور سردی، خزاں اور بہار سب کو امر فرماتا ہے کہ سب مل کر اس کی پرورش میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔ گویا اس زمین میں نشوونما پانے والا ایک ایک دانہ اپنے وجود سے اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اسی کے تصرف سے وہ وجود میں آیا ہے جس کے تصرف میں یہ پوری کائنات ہے۔ اگر اس کائنات کی خدائی مختلف خداؤں اور دیوتاؤں میں بٹی ہوئی ہوتی اور وہ سب اپنے اپنے دائروں اور علاقوں میں خود مختار ہوتے تو اس دنیا کا نظام چلنا تو الگ رہا رائی کا ایک دانہ بھی اپنی صلاحیتیں اجاگر نہیں کر سکتا تھا۔

خدا کے قانون سے کوئی باہر نہیں

'يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ' بعینہٖ یہی ٹکڑا، معمولی فرق کے ساتھ آل عمران کی آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم بقدر ضرورت اس کی شرح کر چکے ہیں۔ یہ بے جان چیزوں سے زندگی کے اظہار اور پھر زندگی کے اوپر موت اور فنا کے طاری ہونے کی ایک جامع تعبیر ہے جس کا مشاہدہ ہم اس کائنات کے ہر گوشے میں برابر کر رہے ہیں۔ آم کی بے جان گٹھلی اور گیہوں کے بے جان دانہ سے ہرا بھرا درخت اور لہلہاتا ہوا پودا پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اسی سبز و شاداب درخت اور لہلہاتے ہوئے پودے پر زردی، خشکی اور مردنی طاری ہونی شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ ختم ہو جاتا ہے یہی مشاہدہ ہم انسانوں اور حیوانوں میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قوموں اور ملتوں کے اندر بھی موت اور زندگی، عروج اور زوال کی یہی داستان برابر دہرائی جا رہی ہے۔ ایک قوم پردۂ عدم سے نکلتی ہے ساری دنیا پر چھا جاتی ہے اور پھر وہی قوم ایک دن آتا ہے کہ پردۂ عدم میں جا چھپتی ہے۔ موت اور زندگی کے اس قانون سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کا بھی اس کائنات میں مالکانہ و خود مختارانہ تصرف ہے تو کسی ایک ہی گوشہ میں وہ اس قانون کو باطل کیوں نہیں کر دیتا اور اگر خدا سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ یہ سب کچھ مجرد مادے یا کسی اندھی بہری طاقت کا بروز ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بروز قائم و دائم رہے، نہ اس میں کبھی انقطاع ہو، نہ اس کے رخ میں کوئی تبدیلی واقع ہو، نہ اس پر کوئی تغیر طاری ہو۔

زبان کا ایک حکمت

یہاں زبان کا ایک نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ پہلے تو فرمایا يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ لیکن دوسرے

ٹکڑے میں اسلوب بدل کر فرمایا مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ مردہ سے زندہ کو نکالنے کے لیے فعل استعمال فرمایا جو صرف تصویرِ حال کا فائدہ دیتا ہے لیکن زندہ سے مردہ کو برآمد کرنے کے لیے فاعل کا صیغہ استعمال فرمایا جس کے اندر عزم اور فیصلہ کا مفہوم بھی مضمر ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ زندگی حاصل ہو جانے کے بعد کوئی جاندار بھی اپنی زندگی موت کے حوالے کرنے پر راضی نہیں ہوتا لیکن قدرت کا قانون ایسا اٹل ہے کہ وہ بہرحال اس کو موت میں تبدیل کر ہی کے رہتا ہے۔ یہ نہایت واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ خدا کے سوا اس کائنات میں کسی کا کوئی دخل نہیں۔ اگر ہے کسی کا تو وہ اپنی محبوب زندگی کو موت کے پنجہ سے کیوں نہیں بچا لیتا؟ یہی مضمون سورۂ واقعہ میں یوں بیان ہوا ہے فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۰۰۰ (اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو تو اپنی حلق میں آئی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لوٹا لیتے، اگر تم سچے ہو)۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو انڈے اور مرغی اور انڈے کی حکایت تک محدود رکھا ہے لیکن اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ تعبیر ہے قدرت کے ان قوانین کی جو اس نے بے جان چیزوں کے اندر زندگی کے اور جاندار چیزوں کے اندر موت کے ودلیعت کیے ہیں، جن کو صرف قدرت ہی بروئے کار لاتی ہے اور جن کی گرفت سے کوئی آزاد نہیں ہے۔

ایک قدم صحیح دوسرا قدم غلط

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ آگے فرمایا ہے ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ (وہی اللہ تمہارا رب ہے) اگر اس جملے کی تفسیر اس دوسرے جملے کی روشنی میں کی جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہاں خبر محذوف ہے اور اگر اسی کو پورا جملہ مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب اللہ ہی کا کرشمۂ قدرت ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو؟ یہ واضح رہے کہ اہلِ عرب اللہ کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ ہر چیز کا خالق بھی اسی کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ شرک میں بھی مبتلا تھے اس لیے فرمایا کہ فکرِ سلیم کے لیے سیدھی راہ تو یہ ہے کہ جب یہ سارا تصرف اللہ ہی کا ہے تو بندہ صرف اسی کی عبادت و اطاعت کرے لیکن تمہاری عقل کہاں اوندھی ہوئی جاتی ہے کہ ایک قدم صحیح اٹھا کر پھر دوسرے رخ پر مڑ جانے ہو اور پائی ہوئی حقیقت کو گم کر دیتے ہو۔

ایک اشارہ دلیل معاد کی سمت میں

یہ آیت اگرچہ واضح طور پر توبیانِ توحید ہی کے سیاق میں ہے لیکن اس میں ایک لطیف اشارہ معاد کی طرف بھی ہو گیا۔ اس لیے کہ جب ہم ہر قدم پر مردہ سے زندہ کو ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں تو اس بات پر تعجب کی کیا وجہ ہے کہ مرجانے اور گل سڑ جانے کے بعد خدا ہمیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا؟ گٹھلی اور دانہ زمین میں سڑ گل کر اگر ازسرِنو زندہ ہو سکتے ہیں تو ہم زمین میں دفن ہو جانے کے بعد آخر اللہ کے حکم سے دوبارہ کیوں نہیں زندہ ہو سکتے؟

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۹۶)

زمین کے بعد ایک نظر آسمان کی طرف

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا یعنی وہی خدا جس کی شانیں زمین کے اندر دفن ہونے والے دانہ اور گٹھلی کے اندر یوں نمایاں ہوتی ہیں ذرا نگاہ اُٹھا کر اس کی شانیں آسمان میں بھی دیکھو۔ وہ جس طرح گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے درخت پیدا کر دیتا ہے اسی طرح پردۂ شب کو چاک کر کے اس کے اندر سے صبح نمودار کر دیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اس نے شب کو تمہارے لیے سکون بخشنے والی اور تمہاری کلفت کو دور کرنے والی بنایا، تم اس میں دن کی ماندگی دور کرتے ہو اور تمہارے قویٰ اور اعصاب اس میں از سرِ نو میدانِ عمل میں اترنے کے لیے تازہ دم ہوتے ہیں۔ اس سے یہ اشارہ خود بخود نکل آیا کہ وہ رات کے بعد صبح اس لیے پیدا کرتا ہے کہ تم اس میں اپنی طلب و جستجو کی سرگرمیوں میں مصروف ہو سکو اور اپنی معاش کے لیے جد و جہد کر سکو۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں بیان فرمایا وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا ہ وَجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ہ وَّجَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا ہ (سورہ نبا ۹ - ۱۱) (اور ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے لیے دافع کلفت بنایا، شب کو تمہارے لیے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصولِ معاش کی سرگرمیوں کے لیے بنایا) مطلب یہ ہے کہ صبح اور شام، دن اور رات کی اس نوعیت پر غور کرو، تمہاری عقل یہ بات باور کرتی ہے کہ صبح کا لانے والا کوئی اور ہے، شام کا لانے والا کوئی اور، دن کا پیدا کرنے والا کوئی اور ہے، رات کا پیدا کرنے والا کوئی اور، یا یہ بات قبول کرتی ہے کہ صبح اور شام، رات اور دن سب اللہ ہی کے حکم سے آتے جاتے ہیں۔ اگر دن کا خالق کوئی اور، رات کا خالق کوئی اور ہوتا تو ان دونوں میں یہ موافقت و سازگاری کون پیدا کرتا کہ رات تمہارے لیے راحت کا بستر بچھاتی اور میٹھی نیند کے لیے سکون فراہم کرتی ہے اور دن تمہارے لیے سرگرمیوں کے میدان گرم کرتا اور معاش و معیشت کی راہیں کھولتا ہے۔

ایک بے مثال منصوبہ بندی

'وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا' دن اور رات کے بعد اب یہ رات اور دن کے اندر ظاہر ہونے والی دو بڑی نشانیوں سورج اور چاند کو لیا۔ فرمایا کہ ان کو دیکھو، ان کے لیے قدرت کا ٹھہرایا ہوا ایک ضابطہ اور ایک نظام الاوقات ہے، مجال نہیں ہے کہ سرِ مو اس سے تجاوز کر سکیں۔ انہی سے دن، مہینے، سال معین ہوتے ہیں، انہی سے موسموں کا تغیر وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ ہیں تو آسمان میں لیکن پوری وفاداری اور پابندی کے ساتھ، بلا کسی تمنائے ستائش اور پروائے صلہ کے، رات دن خدمت میں سرگرم ہیں زمین والوں کی۔

کائنات میں خدا کی شانیں

'ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ' اوپر کی بیان کردہ نشانیوں سے جو حقیقت سامنے آتی ہے، یہ اسی کا بیان ہے اور انداز بیان ایسا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر اس شخص کے دل کی آواز ہے جو اس نظامِ کائنات پر عقلِ سلیم اور قلبِ سلیم سے غور کرتا ہے۔ جس کی عقل سلیم ہے وہ جب اس نظام اور اس کی بے پایاں برکات پر غور کرتا ہے تو بے تحاشا اس کی زبان سے یہ گواہی نکلتی ہے کہ یہ ساری منصوبہ بندی خدائے عزیز و علیم ہی کی ہے۔

کائنات میں توحید کے شواہد

اس چھوٹے سے فقرے کے اندر کئی حقیقتیں مضمر ہیں۔

ایک یہ کہ یہ سورج اور چاند خدائی میں کوئی دخل نہیں رکھتے بلکہ اس کارخانۂ کائنات میں ان کی حیثیت صرف کل پرزوں کی ہے جن کو ایک عزیز و علیم نے ان کے مقام میں فٹ کیا ہے اور یہ اپنی مفوضہ خدمت پوری پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

دوسری یہ کہ یہ کارخانہ متضاد قوتوں اور مختلف دیوتاؤں کی کوئی رزمگاہ نہیں ہے بلکہ اس کے اضداد کے اندر حیرت انگیز سازگاری ہے اور ان کی یہ باہمی سازگاری اس بات کی شاہد ہے کہ ایک ہی خدائے قاہر و قیوم اور ایک ہی رب عزیز و علیم کا ارادہ اور اس کی مشیت اس پر کارفرما ہے اور اس کی ہر حرکت اور اس کا ہر سکون اسی کی مشیت کے تابع ہے۔

تیسری یہ کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ اس کے ہر گوشے سے اس کے صانع کی قدرت، حکمت اور اس کے علم کی شہادت مل رہی ہے جو اس بات کا ثبوت فراہم کر رہی ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت و مقصد ہے جس کا ظہور میں آنا لابدی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد ایک روز جزا و سزا آئے جس میں اس کی حکمت واضح ہو۔

چوتھی یہ کہ یہ دنیا کسی کباڑیے کی دکان یا کوئی مال گودام نہیں ہے جس میں کسی چیز کا بھی کوئی قرینہ نہ ہو بلکہ اس میں نہایت حیرت انگیز پلاننگ ہے، ہر چیز کے لیے اس کی متعین جگہ ہے، ہر حرکت اور گردش کے لیے معین محور و مدار ہیں، ہر عمل کے ظہور کے لیے لگے بندھے ضابطے قاعدے ہیں، ہر آزادی اور ہر پابندی کے لیے معلوم و معروف حدود و قیود ہیں۔ اس سے صاف یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس جہان کے خالق کی مرضی انسانوں کے لیے بھی یہی ہے کہ وہ شتر بے مہار کی زندگی نہ گزاریں بلکہ اس کی ہدایات اور اس کے احکام کے تحت زندگی بسر کریں تاکہ ان کی زندگی اس پورے کارخانہ سے ہم آہنگ ہو۔ یہی راہ فلاح و سعادت کی راہ ہے۔ سورۂ رحمان میں ہم آیت وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ کے تحت اس نکتہ کی مزید وضاحت کریں گے۔ وہاں قرآن نے اسی آفاقی شہادت سے رسالت کی ضرورت پر استشہاد کیا ہے۔

لفظ 'تقدیر' کا مفہوم

اس آیت میں 'تقدیر' کا لفظ وہی مفہوم رکھتا ہے جو پلاننگ (PLANNING) کا مفہوم ہے۔ 'عزیز' کی صفت خدا کی بے نہایت قدرت اور سب پر اس کی بالاتری کو اور 'علیم' کی صفت اس کے محیط کل علم کے ساتھ ساتھ اس کی بے نہایت حکمت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لیے کہ علم، حکمت کو بھی مقتضی ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ خدا اس نظام کائنات کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بالاتر ہے۔ اس کی قدرت، اس کا علم اور اس کی حکمت سب کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ

یَعۡلَمُوۡنَ (۹۷)

ستاروں کی خدمت گزاری

سورج اور چاند کے بعد ستاروں کی طرف توجہ کیا کہ دیکھ لو، یہ خود اپنی خدمت گزاری سے شہادت دے رہے ہیں کہ خالق نے ان کو تمہاری خدمت پر مقرر کیا ہے۔ جب تم خشکی اور تری کا سفر کرتے ہو تو سمندروں اور بیابانوں میں یہ روشنی کے میناروں اور برجیوں کی طرح تمہاری کشتیوں اور تمہارے قافلوں کو سمتیں اور راستے بتاتے ہیں۔ اب یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے کہ وہ خود تو اپنے عمل سے بتا رہے ہیں کہ تمہارے خالق نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے اور تم ان کو خدا کی خدائی میں شریک مان کر ان کے بت کھڑے کر کے ان کی پرستش شروع کر دو۔ پھر یہ دیکھو کہ یہ ہیں تو آسمان میں لیکن شمع برداری کی خدمت وہ تم زمین والوں کی انجام دے رہے ہیں۔ سوچو کہ زمین کا خدا الگ ہوتا اور آسمانوں کے دیوتا الگ ہوتے تو آسمان کے ستاروں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کو رستہ بتانے کے لیے ساری رات دیدبانوں میں کھڑے اپنی نیندیں خراب کرتے؟ یہ صورت حال تو صاف شہادت دے رہی ہے کہ زمین و آسمان سب پر ایک ہی خدا کی خدائی ہے اور اسی نے ان ستاروں کو تمہاری خدمت کے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم اپنے رب کے شکر گزار بنو اور اسی کی عبادت کرو۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ عرب شعرا اپنے بیابانی سفروں کی جو داستان بیان کرتے ہیں اس میں ستاروں کا ذکر ان کی رہنمائی کے پہلو سے بھی کرتے ہیں اور رات کے مختلف حصوں کے اوقات بتانے کے لیے بھی انہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ گویا وہ ان سے گھڑیوں کا کام بھی لیتے تھے اور رہنما برجیوں کا بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بعض ستاروں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ 'شعریٰ' کا حوالہ تو قرآن میں بھی آیا ہے جو موسم بہار میں طلوع ہوتا تھا۔ اسی طرح دوسرے ستارے بھی، جو نکھتروں سے تعلق رکھتے تھے، ان کے معبود تھے۔ بعض سعد سمجھے جاتے تھے، بعض نحس۔

حقیقت کے طالبوں کے لیے ہر قدم پر نشانیاں موجود ہیں

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۔ لفظ آیت کے مختلف معانی پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں یہ نشانی کے معنی میں ہے اور چونکہ ہر نشانی اس چیز کی دلیل ہوتی ہے جس کی وہ نشانی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے معنی دلائل کے ہوں گے اور چونکہ یہاں زیر بحث خدا اور اس کی توحید اور ضمناً معاد و رسالت ہے اس وجہ سے یہاں مراد انہی کے دلائل ہوں گے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتی ہے اس وجہ سے یہ تو بتا دیا ہے کہ ہم نے نشانیوں کی تفصیل کر دی ہے لیکن یہ نہیں واضح فرمایا کہ کس چیز کی نشانیاں واضح فرمائی ہیں۔ یہ چیز مخاطب کے فہم پر چھوڑ دی ہے کہ اس کے اندر علم کی طلب و جستجو ہو گی تو وہ ان میں اپنی ہر جستجو کا جواب پا جائے گا۔

یہاں لفظ 'آیات' کے استعمال میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے۔ منکرین قریش کے متعلق اوپر بھی بیان ہو چکا ہے اور اس مجموعۂ آیات کے خاتمہ پر بھی ذکر آئے گا کہ وہ قرآن پر ایمان لانے کے لیے یہ شرط

ٹھہراتے کہ پیغمبر کوئی نشانی دکھائیں تو وہ ایمان لائیں گے۔ نشانی سے مراد وہ کوئی محسوس معجزہ لیتے تھے۔ ان کی اسی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر فرمایا کہ اگر نشانیوں کی طلب ہے تو عقل و دل کو مطمئن کرنے والی نشانیاں یہ ہم نے بیان کر دی ہیں لیکن یہ کارآمد ان کے لیے ہیں جو علم کے طالب ہیں جن کے اندر علم کی طلب نہیں ہے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔

فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں

'لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ' ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ فعل ارادۂ فعل کے لیے بھی آتا ہے اس وجہ سے 'لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ' کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کے لیے جو جاننا چاہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ ہم اپنی زبان میں بھی جب بولتے ہیں 'ان کے لیے جو مانیں'، 'ان کے لیے جو سمجھیں'، 'ان کے لیے جو غور کریں'، تو فعل ارادۂ فعل ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ (۹۸)

توحید کی دلیل خود انسان کی خلقت میں

خارجی عالم کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب یہ انسان کی خود اس کی خلقت اور اس کے ارد گرد جو سامان معاش و معیشت فراہم فرمایا ہے، اس کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا اور نسلِ انسانی کا ایک وسیع گھرانا آباد کر دیا۔ یہاں 'انشاء' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف پیدا کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس کے اندر نشوونما بخشنے، پروان چڑھانے اور فروغ دینے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ 'ایک ہی جان' سے مراد آدم ہیں جن کو تمام آسمانی مذاہب میں نسلِ انسانی کی اصل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اہلِ عرب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے۔ فرمایا کہ یہ خدا ہی ہے جس نے تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا، اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، پھر مردوں اور عورتوں کی ایک دنیا پیدا کر دی۔ ان میں شکلوں، صورتوں، زبانوں، لہجوں کا اگرچہ اختلاف ہے، لیکن جبلی تقاضوں اور فطری داعیات کے لحاظ سے اتفاق ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ سب کا خالق اور پروردگار ایک ہی ہے جس نے ایک ہی درخت سے یہ سارے برگ و بار پیدا کیے ہیں۔ عورت اور مرد میں بظاہر تضاد و اختلاف ہے لیکن ان دونوں کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ سازگاری کے جو ظاہری و باطنی محرکات و اسباب جمع ہیں وہ زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ دونوں کا خالق و مربی ایک ہی ہے جس نے ایک مشترک مقصد کے لیے ان کو وجود بخشا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غور کرو کہ یہ ایک ہی خدا کا پیدا کیا ہوا اور ایک ہی آدم و حوا کا گھرانا ہے یا مختلف خداؤں کی پیدا کی ہوئی منتشر بھیڑ جس کے ہر گروہ کے خدا بھی الگ الگ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا باوا آدم بھی جدا گانہ ہے۔

قرآن نے اسی وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدمؑ کے عقیدے پر انسانی معاشرے کی بنیاد رکھی ہے اور ان لوگوں کو فساد فی الارض کا مجرم قرار دیا ہے جو معاشرے کی اس بنیاد کو ڈھانے کی کوشش کریں۔ اہل

مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ نساء کی تفسیر میں بحث کر آئے ہیں۔ اس کی پہلی آیت اس عقیدے کو دلیل پیش کرتی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ	اے لوگو، تم اپنے اس خداوند سے ڈرو جس نے تم کو
خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ	ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی کی جنس سے پیدا کیا
مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا	اس کے جوڑے کو اور پھر ان دونوں سے پھیلا دیے
کَثِیْرًا وَّنِسَآءً ج وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ	بے شمار مرد اور بے شمار عورتیں، اور اس اللہ سے ڈرو
تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ ط اِنَّ اللّٰہَ	جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے
کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا (۱- نساء)	ہو اور رحمی رشتوں کا احترام کرو بے شک اللہ تم پر نگران ہے

'مستقر' اور 'مستودع' کا مفہوم

'فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ'، 'مُسْتَقَرٌّ' کے معنی قرار و سکونت کی جگہ کے ہیں اور 'مُسْتَوْدَعٌ' اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز بطور ودیعت و امانت حفاظت سے رکھی جائے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں 'مستقر' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پیدا ہونے کے بعد انسان رہتا بستا ہے۔ 'وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ' (۳۶- بقرہ) (اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت خاص تک رہنے بسنے کی جگہ اور کھانا برتنا ہے) 'مستودع' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد وہ دفن کیا جاتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد انسان یہ دونوں ہی چیزیں پاتا ہے۔ جتنی زندگی اس کے لیے مقدر ہوتی ہے اتنے دن وہ گزارتا ہے اور جو رزق اس کے لیے مقدر ہوتا ہے اس سے متمتع ہوتا ہے اور اس کا یہ جینا اور خدا کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نگرانی اور اس کے علم میں ہے۔ پھر جب اس دنیا میں اس کی مدت حیات ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کرتا ہے اور جہاں کہیں بھی دفن ہوتا ہے خدا ہی کی زمین میں دفن ہوتا ہے اور جب خدا کا حکم ہوگا زمین اس امانت کو خدا کے حوالے کر دے گی۔ جس طرح ہر شخص کا 'مستقر' خدا کے علم میں ہوتا ہے، اسی طرح اس کا 'مستودع' بھی اس کے علم میں ہوتا ہے۔ خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون دوسرے مقامات میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے مثلاً 'وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقَرَّھَا وَمُسْتَوْدَعَھَا کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ' ۶- ہود (اور نہیں ہے زمین میں کوئی جاندار مگر اللہ ہی اس کو روزی دیتا ہے، اور خدا دنیا میں اس کے مستقر کو بھی جانتا ہے اور مر گئے پر اس کے سپرد کیے جانے کی جگہ کو بھی، ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے) مطلب یہ ہے کہ پیدا ہونے کے بعد زندگی، رزق اور اسباب و وسائل سب کچھ اسی سے حاصل ہوتا ہے تو کسی غیر کو انسان اپنی ابد کا مرجع کیوں بنائے؟ پھر مدفن کے لیے 'مستودع' کا لفظ استعمال کر کے ایک لطیف اشارہ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کی طرف بھی فرما دیا کہ انسان جب مرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ ختم ہو گیا، بلکہ وہ زمین کی تحویل میں

دے دیا جاتا ہے جہاں سے وہ پھر اٹھایا جائے گا تاکہ وہ اپنی شکر گزاری کا انعام پائے اگر خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کا اس نے حق پہچانا ہے اور اپنی ناشکری کی سزا بھگتے اگر اس نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے۔ یہ خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کے علم و حکمت کا لازمی تقاضا ہے۔

دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

'قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ' اس میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ مخاطب نہایت ضدی ہیں جو بات تو سمجھنا نہیں چاہتے لیکن بہانہ یہ تراش رہے ہیں کہ ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا جا رہا ہے۔ 'علم' اور 'تفقہ' میں فرق یہ ہے کہ علم عقل و شعور کا فعل ہے اور تفقہ دل کا، چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ ارشاد ہوا ہے 'لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا' (ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں) یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان پر خدا کی نشانیاں اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب وہ اپنی عقل اور دل کو استعمال کرتا ہے، جب تک وہ محسوسات کا غلام بنا رہتا ہے، اس وقت تک اس کی مثال گدھے کی ہے جو ڈنڈے کی زبان کے سوا دوسری کوئی زبان بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عقل اور دل بھی مشاہدۂ کائنات سے خدا تک اسی صورت میں پہنچتے ہیں جب ان کے اندر محسوسات سے آگے بڑھنے کی ہمت اور حوصلہ ہو۔ اگر وہ صرف محسوسات ہی پر قانع ہو جائیں اور ان کی ساری تگ و دو انہی چیزوں کے لیے رہ جائے جو اس حیات چند روزہ میں کام آنے والی ہیں تو بسا اوقات تل تو ان کو نظر آجاتا ہے لیکن تل کی اوٹ کا پہاڑ ان سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ یہ حبِ عاجلہ کی بیماری ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دیکھنے کو تو سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۹۹)

قدم قدم پر توحید اور معاد کے آثار و دلائل

اب یہ خدا کی رحمت، ربوبیت، قدرت، حکمت، توحید اور معاد کے ان آثار و دلائل کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جو ہر انسان کو قدم قدم پر نظر آسکتے ہیں بشرطیکہ وہ ماننا چاہے۔

'وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ' لفظ 'سماء' پر ہم دوسری جگہ لکھ چکے ہیں کہ یہ بادلوں کے لیے بھی آتا ہے اور اس فضائے نیلگوں کے لیے بھی جس کو ہم آسمان کہتے ہیں۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جو آسمان سے بارش برساتا ہے اور اس سے ہر چیز کو روئیدگی بخشتا ہے۔ کلام کا آغاز غائب کے صیغہ سے فرمایا پھر اس کو 'فَاَخْرَجْنَا بِهٖ' متکلم کے صیغہ میں بدل دیا۔ اس میں رافت و عنایت اور ربوبیت کا اظہار بھی ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کہ آسمان و زمین اور ابر و ہوا سب پر ہماری ہی حکومت ہے، اگر آسمان پر کسی اور کی حکومت ہوتی، زمین پر کسی اور کی تو یہ توافق کہاں سے

ظہور میں آتا کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اپنے خزانے اُگل دیتی۔ پھر اس میں ایک لطیف تلمیح آخرت کی بھی ہے۔ قرآن میں اسی بارش اور اس کے اثر سے مردہ زمین کے از سر نو لہلہا اٹھنے کو متعدد مقامات میں معاد کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ جب تم ہمیشہ دیکھتے ہو کہ زمین پر ایک تنکا بھی نہیں ہوتا لیکن بارش ہوتی ہے تو اس کے اندر کی دبی ہوئی ہر چیز جاگ پڑتی ہے اور گوشہ گوشہ سبزے سے معمور ہو جاتا ہے تو مرجانے کے بعد جی اٹھنے کو کیوں بعید سمجھتے ہو؟

ربوبیت عامہ کے بعد بعض اشارات ربوبیت خاصہ کی طرف

فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا، یہ ربوبیت عامہ کے بعد ربوبیت خاصہ کا بیان ہے جس کا تعلق انسانوں سے ہے۔ پہلے غلہ کا ذکر فرمایا جو عام ضرورت کی چیز بھی ہے اور اپنی پائیداری کے اعتبار سے ذخیرہ کیے جانے کے لائق بھی۔ فرمایا کہ انھی نباتات میں سے جن کے اندر ہم نے غلہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، سرسبز خوشے اور بالیاں نکالتے ہیں اور اپنی قدرت و حکمت سے ان پر تہ بہ تہ دانے جما دیتے ہیں اور اس طرح تمھارے بوئے ہوئے ایک دانے پر سینکڑوں دانوں کا اضافہ کر کے ہم تمھیں لوٹا دیتے ہیں۔ غور کرو کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے، کسی اندھی بہری قوت کا ظہور ہے، یا کسی حکیم و قدیر اور دانا و بصیر پروردگار کی پروردگاری ہے؛ اتنے اجزائے مختلفہ کو اتنی تدبیر، اتنی ندرت اور اتنی حکمت سے استعمال کرنا اور ان کے حاصل کو تمھاری زندگی کے بقا کا ذریعہ بنا دینا ایک رب کریم و کارساز کے سوا اور کس کا کام ہو سکتا ہے؟

وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ، ان دونوں ٹکڑوں میں فعل محذوف ہے۔ پہلے میں مجہول، دوسرے میں معروف۔ غلہ کے بعد اب یہ پھلوں کا ذکر فرمایا اور پہلے کھجور کو لیا جس کو اہل عرب کے ہاں عام پھل کی حیثیت حاصل تھی۔ کھجور کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ اس کے درخت، اس درخت کے اندر گابھے کا پیدا ہونا اور پھر اس سے لٹکتے ہوئے بوجھل خوشوں کا ظہور میں آنا، ہر چیز کی طرف توجہ دلا دی ہے تاکہ اس کاری گری پر انسان کی نظر پڑے جو اس کے ابتدائے ظہور سے لے کر اس کی تکمیل اور پختگی تک قدرت اس پر صرف کرتی ہے۔ اسی کاری گری اور صنعت پر غور کرنے سے انسان کو صانع کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کا کچھ اندازہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کا منشا ان قدرتوں اور حکمتوں کے اظہار سے یہی ہے کہ انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو ورنہ جہاں تک کھجور کی ضرورت مجرد غذا کے لیے ہے اس کی فراہمی کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی گٹھلی سے درجہ بدرجہ ایک تناور درخت بنے، پھر ایک خاص مرحلہ میں پہنچ کر اس کے اندر گابھے اور خوشے پیدا ہوں، پھر ان کے اندر ننھی ننھی کیریاں بیٹھیں، پھر وہ درجہ بدرجہ پھل بنیں پھر پک کر اور بوجھل ہو کر ان کے خوشے زمین کی طرف لٹک آئیں اور انسان کو زبانِ حال سے دعوت شوق دیں۔ یہ سارا اہتمام دل گواہی دیتا ہے کہ اسی لیے ہے کہ انسان پر خدا کی قدرت، اس کی

ربوبیت اور اس کی حکمت کے اسرار ظاہر ہوں لیکن یہ سائنس کا عجیب اندھا پن ہے کہ اس کو حکمت تو نظر آتی ہے لیکن حکیم نظر نہیں آتا، ربوبیت تو اس کو دکھائی دیتی ہے لیکن رب کا سراغ اس کو کہیں نہیں ملتا۔ اور اس سے زیادہ عجیب معاملہ ان لوگوں کا ہے جو دیکھتے ہیں کہ کھجور کے درخت کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے پھولنے، پھلنے اور پکنے تک تمام عناصر کائنات نے اس کی دیکھ بھال اور غور و پرداخت میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا تب کہیں کھجور کا ایک خوشہ تیار ہوا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سفاہت میں مبتلا ہیں کہ یہ کائنات مختلف ارادوں اور بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزمگاہ ہے اور ان سے بھی زیادہ عجیب معاملہ ان سادہ لوحوں کا ہے جو ربوبیت اور پروردگاری کے یہ سارے سروسامان دیکھ رہے ہیں، ان سے متمتع اور محظوظ بھی ہو رہے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے کھانے پینے، عیش کرنے کے لیے ہے۔ یہ سوال ان کے ذہن میں کبھی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ سب کچھ مہیا کرنے والے کی طرف سے ان پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ ان نعمتوں کے باب میں کوئی پرسش کا دن بھی آنے والا ہے یا نہیں؟ گویا دینے والے نے حق تو ان کو سارے بخش دیے لیکن ذمہ داری ان کے اوپر کوئی بھی نہیں ڈالی۔

اشیاء میں تنوع کی حکمت

'وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِھًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِہٍ' کھجور کے بعد انگور، زیتون اور انار کا ذکر فرمایا۔ مقصود ان کے ذکر سے صرف انہی متعین پھلوں کا ذکر نہیں ہے، ان کا ذکر صرف اس پہلو سے ہوا کہ یہ اہل عرب کے معروف پھل تھے جو ان کو خود اپنے علاقے میں میسر تھے، اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا نے تمہاری ربوبیت کا جو سامان کیا ہے تو اس میں صرف روٹی ہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے فواکہ اور میوہ جات بھی ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ فواکہ بھی جو دیے تو اس میں بھی اپنی ربوبیت، اپنی رحمت، اپنی فیاضی اور اپنی قدرت و حکمت کی یہ شان دکھائی کہ ایک ایک چیز کی گوناگون اقسام و انواع، ایک دوسری سے ملتی جلتی بھی اور باہمدگر شکل، رنگ، قامت، ذائقہ میں مختلف بھی، تمہارے سامنے چن دیں۔ اب سوچو کہ جس نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ رحیم، قدیر، علیم، حکیم اور کریم پروردگار ہے یا نہیں۔ آخر تمہاری زندگی مجرد اپنے بقا کے لیے تو ان پھلوں اور ان تمام تنوعات کی محتاج نہ تھی، تم جینے کو تو خشک روٹی اور پانی بھی جی سکتے تھے، پھر اس نے ایسا کیوں کیا کہ تمہارے آگے اتنے گوناگون پھلوں کے انبار لگا دیے جن کی خوشبو، ذائقہ، شکل ہر چیز دل کو لبھانے والی، آنکھوں کو فریفتہ کرنے والی اور دماغ کو مست کرنے والی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر انسان اپنے خالق کی صفات کا جلوہ دیکھے اور پھر انھی صفات کے آئینہ میں اپنے ظاہر اور اپنے باطن کو سنوارے اور ان میں سے ہر نعمت اس کے اندر اس جذبۂ شکر و سپاس کو ابھارے جو خدا نے ہر انسان کے اندر ودیعت فرمایا ہے اور جو تمام دین و شریعت کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، بنیاد ہے۔

'اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِہٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِہٖ'، 'اِلٰی ثَمَرِہٖ' میں ضمیر کا مرجع ہیں تو وہ ساری ہی چیزیں جن

جمع کے لیے ضمیر واحد اور اس کا فائدہ

کا اوپر ذکر گزرا لیکن ضمیر واحد اس وجہ سے ہے کہ متکلم چاہتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لے کر ان کے پیدا ہونے سے لے کر ان کے پکنے تک کے تمام مراحل پر غور کیا جائے۔ غور و فکر کا عمل فطری طور پر یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی چیز پر نگاہ جمائی جائے تاکہ قوتِ فکر منتشر نہ ہو گویا یہاں قرآن نے صرف غور و فکر کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ اس کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا۔ یہ واضح رہے کہ اس اسلوب کی مثالیں قرآن میں بھی ہیں اور کلام عرب میں بھی۔

'وَیَنْعِہٖ' کے بعد 'اِذَا اَیْنَعَ' ہمارے نزدیک حذف ہے۔ ہم دوسرے مقام میں عربی زبان کا یہ اسلوب واضح کر چکے ہیں کہ بعض اوقات ایسے مقابل الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں جن کی مذکور الفاظ کے بعد کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہاں چونکہ 'اِلٰی ثَمَرِہٖ' کے بعد 'اِذَا اَثْمَرَ' موجود تھا اس وجہ سے 'وَیَنْعِہٖ' کے بعد 'اِذَا اَیْنَعَ' کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا۔

ہر ورق معرفت کردگار کا دفتر ہے

فرمایا کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو لے کر اس کے پھلنے سے لے کر اس کے پکنے کے مراحل تک ہر مرحلے کو دیکھو اور اس پر غور کرو تو خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، صناعی، کاریگری، باریک بینی، فیض بخشی اور اس کے حسن و جمال کی اتنی نشانیاں اور اتنی شہادتیں تمہارے سامنے آئیں گی کہ تم ان کو شمار نہیں کر سکو گے تم ایک نشانی اور ایک معجزہ مانگتے ہو، آنکھیں ہوں تو ہر شاخ معجزہ، ہر پھول معجزہ، ہر پھل معجزہ۔ کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر قدرت کے اعجاز کے ہزاروں شاہکار جلوہ نما نہ ہوں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام عجائب کی نمائش کی محتاج نہ تھی۔ یہ بالکل سادہ اور بے رنگ حالت میں بھی وجود میں آسکتی اور باقی رہ سکتی تھی لیکن خالق کائنات نے یہ پسند فرمایا کہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی سے اس کی عظیم قدرت و حکمت اور اس کی بے نہایت رحمت و ربوبیت ظاہر ہو تاکہ انسان اس کی معرفت حاصل کرے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی ذہانت کے مظاہرے کا اتنا شوقین ہے کہ اگر ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے مدفون کھنڈروں سے کوئی ٹوٹا ہوا مٹی کا مرتبان بھی اس کو ہاتھ آجائے تو اس پر کھنچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں سے وہ اس عہد کے آرٹ، اس عہد کے کلچر، اس عہد کی تہذیب، اس دور کے مذہب، اس دور کی سیاست، غرض ہر چیز پر ایک مزعومہ فلسفہ اور ایک فرضی تاریخ تیار کر دے گا، دوسری طرف اس کی بلادت اور بد ذوقی کا یہ عالم ہے کہ خالق کائنات نے ایک ایک پتی پر اپنی حکمت کے جو دفاتر رقم فرمائے ہیں نہ ان کا کوئی حرف اس کی سمجھ میں آتا ہے نہ ان سے اسے کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ' فرمایا کہ جو لوگ ایمان لانا چاہیں ان کے لیے ان چیزوں کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ کسی حقیقت کے تسلیم کیے جانے کے لیے تنہا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ واضح اور ثابت ہے بلکہ اس کے لیے اوّل شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر اس کو قبول کرنے کا

ارادہ پایا جاتا ہو۔ دنیا کو گمراہی علم کے مخفی ہونے کے سبب سے زیادہ پیش نہیں آئی ہے بلکہ زیادہ تر عمل کا سچا اور مضبوط ارادہ مفقود ہونے سے پیش آئی ہے۔

آیت ۹۹ کے اندر بیان کردہ نشانیاں

اب آئیے ان نشانیوں پر غور کیجیے جن کی طرف آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

پہلی چیز تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ آتنی حکمتوں سے یہ معمور دنیا نہ آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، نہ یہ کسی اندھی بہری قوت کا کرشمہ ہے بلکہ اس کے ذرّے ذرّے کے اندر بے پایاں قدرت اور بے نہایت حکمت کی جو نشانیاں ہیں وہ زبان حال سے شہادت دے رہی ہیں کہ یہ ایک قادر و قیوم اور ایک علیم و حکیم کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔

دوسری چیز یہ نمایاں ہوتی ہے کہ آسمان و زمین، ابر و ہوا، سورج اور چاند، نور اور ظلمت، سردی اور گرمی، بہار اور خزاں ہر چیز پر تنہا اسی قادر و قیوم کی حکمرانی ہے اس لیے کہ ہر چیز اپنے وجود، اپنے نشو و نما اور اپنے بلوغ و کمال میں تمام عناصر کائنات کی ایک خاص تناسب کے ساتھ خدمات حاصل کرتی ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ایک ہی بالاتر ارادہ تمام کائنات پر حاوی ہو اور وہ اپنے محیط کل علم و حکمت کے تحت ان تمام عناصر مختلفہ کے اندر ربط و ہم آہنگی پیدا کرے اور ان کو کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے استعمال کرے۔

تیسری چیز یہ سمجھ میں آتی ہے کہ قدرت، علم اور حکمت سے یہ معمور کائنات اپنے ہر گوشے سے پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے جو محض اس نے اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو، جس کے اندر نیکی اور بدی، خیر اور شر، عدل اور ظلم کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ اس قدرت، اس علم اور اس حکمت کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس کے خالق و مالک کا کامل عدل اور اس کی کامل رحمت ظاہر ہو۔

چوتھی چیز یہ سامنے آتی ہے کہ اس کے اندر رب کریم و رحیم نے ہمارے لیے بغیر ہمارے کسی استحقاق کے، محض اپنے فضل و رحمت سے جو نعمتیں اور لذتیں مہیا فرمائی ہیں اور جن سے ہم متمتع ہو رہے ہیں، یہ ہم پر ہمارے رب کی شکر گزاری اور اسی کی عبادت و اطاعت کا حق واجب کرتی ہیں۔ جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس حق کی بابت ہم سے پرسش ہو۔ جس نے یہ حق ادا کیا ہو وہ انعام پائے اور جس نے ناشکری کی ہو وہ اس کی سزا بھگتے۔

پانچویں حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جس پروردگار کی پروردگاری کا یہ عالم ہے کہ اس نے ہمارے اندر جو طلب اور جو داعیہ بھی ودیعت فرمایا اس کا ہمارے گرد و پیش میں بہتر سے بہتر جواب مہیا فرمایا، بھوک دی تو غذا مہیا فرمائی، پیاس دی تو پانی کے دریا بہا دیے، ذائقہ بخشا تو ذوق کی ضیافت کے نت نئے سامان کیے، ذوق نظر بخشا تو کائنات کے گوشے گوشے کو اپنی قدرت کی نیرنگیوں کی جلوہ گاہ بنا دیا۔ یہ

کس طرح ممکن ہے کہ ایسی فیض بخش اور بابرکت ذات جو ہماری مادی ضرورتوں کا اس سیر چشمی اور فیاضی سے اہتمام کرے، ہماری اس جستجو کا کوئی جواب نہ پیدا کرے جو اس نے ہماری روح اور ہمارے دل کے اندر اپنی ہدایت کے لیے ودیعت فرمائی ہے؟ یہ چیز لازم ٹھہراتی ہے کہ جس طرح اس نے ہماری جسمانی بھوک اور پیاس کے لیے غذا اور پانی کا انتظام فرمایا ہے اسی طرح ہماری اس روحانی تشنگی کے بجھانے کا بھی اہتمام فرمائے۔ یہ چیز رسالت کے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ضرورت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۱۰۰-۱۰۳)

جنات کو خدائی میں شریک بنانے کا عقیدہ

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ، یعنی کائنات کی ایک ایک چیز تو خدا اور اس کی صفات سے متعلق وہ شہادتیں فراہم کر رہی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں لیکن ان لوگوں کی خرد باختگی اور سفاہت کا یہ عالم ہے کہ یہ جنات کو بھی خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں۔ اہل عرب جن چیزوں کو خدا کا شریک مانتے تھے ان میں ملائکہ، جنات، کواکب سب ہی شامل تھے۔ لیکن یہاں سب سے پہلے جنات کا ذکر کر کے قرآن نے شرک کے انتہائی گھنونے پن کو واضح کیا ہے کہ کہاں خدا کی وہ شانیں جو بیان ہوئیں اور کہاں ان لوالفضولوں کی یہ لوالفضولی کہ پیپل تلے کی بھتنی اور شیطان کو بھی خدا کا شریک بنا دیا گیا ہے۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ اہل عرب جنات کی پرستش اسی قسم کے تصورات کے تحت کرتے تھے جس قسم کے تصورات کے تحت عام طور پر حال کی مشرک قومیں بھوت پریت کی پرستش کرتی ہیں۔ فلاں وادی کا جن، فلاں درخت کی بھتنی، فلاں ٹیلے کا بھوت، اس قسم کے توہمات ان کے اندر پھیلے ہوئے تھے اور عام طور پر ان کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے ان کو چڑھاوے، نذریں، قربانیاں پیش کی جاتیں اور ان کی جے پکاری جاتی۔ بعض جن تو اتنے خطرناک سمجھے جاتے کہ ان کو راضی رکھنے کے لیے، جیسا کہ آگے آیت ۱۳۷ کے تحت ذکر آئے گا، اولاد تک کی قربانی کی جاتی۔ غالباً یہ ظالمانہ حرکت وہ لوگ کرتے رہے ہوں گے جو اس وہم میں مبتلا ہوتے ہوں گے کہ اگر فلاں جن کو خوش کرنے کے لیے اپنے کسی بیٹے کی قربانی نہ دی تو وہ ان کی ساری اولاد کو تباہ کر دے گا۔ اس قسم کا وہم دنیا کی وحشی قوموں میں عام رہا ہے۔

شرک کی کوئی دلیل نہیں

وَخَلَقَهُمْ میں 'و' حالیہ ہے اور اس کی حیثیت کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ کی ہے۔ یہ بات اتنی گھنونی تھی کہ بلا تاخیر اس کی تردید فرما دی کہ یہ لوگ جنوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی کوئی چیز آخر اس کی خدائی میں شریک کیسے بن سکتی ہے؟ یہ واضح رہے کہ اہل عرب ساری کائنات کا خالق خدا ہی کو مانتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا یہ عقیدہ اصل عقیدے سے

صرف تضاد ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ تضاد نہایت بھونڈے قسم کا تھا۔ آخر خدا اپنی دنیا پیدا کر کے اس کو اپنے ہی پیدا کیے ہوئے جنوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

وَخَرَقُوا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ 'خَرَقَ الْكَذِبَ' کے معنی جھوٹ گھڑنے اور جھوٹ تراشنے کے ہیں۔ اہلِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کا درجہ دیتے تھے اور اس وہم کی بنا پر ان کی مورتیں بنا کر دیویوں کی حیثیت سے ان کی پوجا کرتے تھے۔ اگرچہ یہاں اصلاً زیرِ بحث مشرکینِ عرب ہی کے توہمات ہیں لیکن بیٹیوں کے ساتھ بیٹوں کا ذکر کر کے قرآن نے کلام میں وسعت پیدا کر دی ہے اور اس طرح ان قوموں کے عقائد کی بھی تردید ہو گئی ہے جو خدا کے لیے بیٹے مانتی تھیں جن کی ایک مثال عیسائی ہیں۔ 'بِغَيْرِ عِلْمٍ' کا مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں وہ بغیر کسی دلیل عقلی و نقلی کے مانتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے 'بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ'۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا بدیہی تقاضا ہے۔ خدا کو مانے بغیر نہ اس کائنات کا معمہ حل ہوتا نہ عقل و فطرت کو اطمینان حاصل ہوتا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے اور یہ موحد و مشرک دونوں کے ہاں مسلم ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کائنات میں کسی اور کی بھی حصہ داری ہے تو یہ چیز دلیل کی محتاج ہے اور یہ دلیل فراہم کرنا اس فریق کی ذمہ داری ہے جو اس کا مدعی ہے۔ یہ دلیل دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ یا تو خود خدا کی طرف سے کوئی قابلِ اطمینان شہادت موجود ہو کہ اس نے فلاں اور فلاں کے لیے اپنی اس کائنات میں حصہ داری تسلیم کی ہے یا ان کو وہ اپنے بیٹے یا بیٹیاں مانتا ہے یا عقل و فطرت کے اندر ان کے حق میں کوئی دلیل موجود ہو۔ اگر ان دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز بھی موجود نہ ہو تو آخر کیا شامت آئی ہوئی ہے کہ مفت میں کسی کو خدا یا شریکِ خدا مان کر اس کی غلامی کا پٹا بھی اپنی گردن میں ڈال لیجیے۔ خدا کوئی تفریح کی چیز نہیں ہے۔ اس کو تو اس لیے مانا جاتا ہے کہ اس کے مانے بغیر چارہ نہیں۔ آخر دوسروں کے ماننے کے لیے کیا مجبوری ہے کہ ان کو مانیے۔ بلا دلیل تو آدمی اپنی گز بھر زمین میں کسی کی حصہ داری تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تو آخر خدا کی خدائی اور اس کے اختیار و اقتدار میں کسی کو کس طرح حصہ دار مان لے۔

خلاف شان صفات کی نفی

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ 'سُبْحٰنَهٗ' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہ تنزیہہ کا کلمہ ہے، یعنی خدا ان باتوں سے پاک، بری اور بالا ہے جو یہ مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ بظاہر تو صرف ایک تنزیہی کلمہ ہے لیکن غور کیجیے تو اس کے اندر توحید کی بہت بڑی دلیل بھی ہے۔ عقل و فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ کسی چیز کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہ کی جائے جو اس کی ثابت، مسلم اور بدیہی صفات کے ضد یا منافی ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی مانی ہوئی ایک حقیقت اپنے ہی دوسرے مفروضہ سے باطل ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص بادشاہ ہے تو اس کی طرف غلامی کی صفات منسوب نہیں ہو سکتیں۔ فرشتہ ہے تو اس کو شیطان کی صفات سے ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جو ذات خالق، مالک، قدیر، علیم اور کریم و رحیم ہے اس کو ان صفات سے متصف کرنا جو مخلوق کی صفات ہیں اس کی

ان تمام صفات کی نفی کے ہم معنی ہے جن کا ماننا ازروئے عقل و فطرت واجب ہے اور جن کی نفی سے انسان ان تمام تاریکیوں میں پھر گھر جاتا ہے جن سے ان صفات کے علم کی روشنی ہی نے اس کو نکالا تھا۔ اگر خدا کو خدا ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اس کا شریک قرار دے دیا گیا اور اس کو بیٹوں بیٹیوں کا باپ بنا دیا گیا تو پھر وہ خدا کہاں رہا؟ پھر تو اس کے کفو و ہمسر بھی پیدا ہو گئے، اس کی ذات برادری کے شریک بھی نکل آئے اور اس کے مدمقابل اور حریف بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

'بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ'، 'بدیع' کے معنی ہیں عدم سے وجود میں لانے والا۔ یعنی خدا آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تب خدا تھا۔ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے تو کسی مخلوق کو بیٹوں بیٹیوں کا درجہ کس طرح حاصل ہوا؟ اور وہ خدا کی خدائی میں شریک کس راہ سے ہوئے؟

مشرکین کی حماقت در حماقت

'اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ' یعنی خدا کے لیے اولاد ماننا ایک اس سے بھی بڑی حماقت کے لیے راہ کھولتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے لیے (نعوذ باللہ) بیوی بھی مانی جائے۔ یہ خیریت تھی کہ مشرکین عرب اپنی تمام مشرکانہ خرافات کے باوجود خدا کے لیے کوئی بیوی نہیں مانتے تھے۔ قرآن نے اسی پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ جب خدا کے کوئی بیوی نہیں اور تم بھی اس کے لیے کسی بیوی کے قائل نہیں تو پھر یہ اس کے بیٹے بیٹیاں تم نے کہاں سے کھڑے کر دیے؟ پھر تو جو بھی ہوگا، فرشتے ہوں یا جنات یا انسان، سب خدا کی مخلوق ہوئے اور جب مخلوق ہوئے تو سب کو مخلوق ہی کے درجے میں رکھو، ان میں سے کسی کو بیٹے بیٹیاں قرار دے کر خدا کی ذات اور اس کی خدائی میں کیوں شریک بنائے دے رہے ہو۔

محیط کل علم شرک کے منافی ہے

'وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ۚ وَہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ' یہ شرک اور شرکا، کی کُھلی نفی کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا ہی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے تو آخر وہ ضرورت کیا ہے جس کے لیے ان شرکاء کا سہارا ڈھونڈھا گیا ہے؟ یہ تصور کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا نے پیدا کرنے کو تو کر دیا لیکن اس کو ہر چیز اور ہر شخص کی خبر نہیں ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ لازماً ہر چیز کو جانتا بھی ہے۔ اسی بات کو دوسری جگہ فرمایا ہے 'اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ'، ملک ۱۴ (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا) یہاں یہ بات یاد رہے کہ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کی جو پوجا کرتے تھے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کو خالق مانتے تھے بلکہ صرف اس لیے کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں اور یہ اپنے پرستاروں کی ضروریات، ان کے مسائل اور ان کی آرزوؤں سے خدا کو باخبر کرتے اور اس سے منواتے ہیں۔ فرمایا کہ اس نے پیدا کیا ہے تو وہ اپنی مخلوق کی ہر چیز سے واقف بھی ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی اور کے دروازے پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔

'ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الایۃ' فرمایا کہ وہی خدا جس نے تمھیں پیدا کیا ہے وہی تمھارا رب بھی ہے

پھر اس کا کیا تک ہے کہ خالق تو اس کو مانو اور رب دوسروں کو بناؤ۔ وہی خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے تو امید ہو یا بیم دونوں کا مرجع اسی کو بناؤ۔

خدا کے لیے پیکر محسوس تراشنے کی ممانعت

'لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ' یعنی اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ خدا نظر تو نہیں آتا تو یہ چیز مایوس ہونے کی نہیں۔ تمھاری نگاہیں تو بے شک اس کو پکڑنے سے قاصر ہیں لیکن وہ تمھاری نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ جو اسے دیکھنا چاہتا ہے وہ تو اگرچہ اس کو نہیں دیکھ پاتا لیکن وہ ڈھونڈنے والے کو دیکھ لیتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ واعبد ربك كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك (اپنے رب کی بندگی اس طرح کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ بہرحال تمھیں دیکھ رہا ہے)

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شرک و بت پرستی کے محرکات میں سے ایک اہم محرک ابتدا سے یہ بھی رہا ہے کہ نادانوں نے خدا کو کسی پیکر محسوس میں دیکھنا چاہا ہے۔ اسی چیز نے انسان اور خدا کے درمیان واسطوں اور وسیلوں کو جنم دیا۔ جب خدا کہیں آنکھوں سے نظر نہیں آیا تو ناسمجھ لوگوں نے ان چیزوں کے پیکر تراش کران کی پرستش شروع کر دی جن کو وہ خدا کی ذات یا صفات کا مظہر یا اس کا اوتار سمجھے۔ چنانچہ زمانۂ حال کے ہندو فلسفی بت پرستی کے جواز کی نئی توجیہ اب یہی پیش کرتے ہیں اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں جن صوفیوں نے تصور شیخ کی بدعت اختیار کی ہے وہ بھی اپنی اس بدعت کی تائید میں یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ انسان چونکہ پیکر محسوس کا خوگر ہے اس وجہ سے تصور شیخ، تصور الٰہی کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے یہاں یہی غلط فہمی رفع فرمائی ہے کہ خدا دیکھنے اور چھونے کی چیز نہیں ہے۔ اس سے قرب و بعد دل کے واسطہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان اس کو یاد رکھے تو وہ خدا سے قریب ہوتا ہے، اگر بھول جائے تو دور ہو جاتا ہے۔ اگر آدمی کی نگاہ اس کو نہیں دیکھتی تو اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس کی نگاہیں آدمی کو ہر جگہ اور ہر وقت دیکھتی ہیں اور انسان کے اعتماد کے لیے یہ بس ہے۔

'وَهُوَ اللَّطِيفُ الۡخَبِيرُ' یہ اوپر کی بات کی دلیل صفات الٰہی سے بیان فرمائی کہ وہ بڑا باریک بین اور بڑی خبر رکھنے والا ہے۔ کوئی چیز کتنے ہی پردوں میں ہو اس کی نگاہیں اس تک پہنچ جاتی ہیں اور کوئی چیز کتنی ہی مخفی ہو وہ اس سے ہر آن و ہر لحہ باخبر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کے لیے ان مزعومہ وسائط و وسائل کی ضرورت نہیں۔ تم اس کے طالب بنو وہ خود تمھیں پا لے گا۔ تمھاری نگاہیں بے شک اس کو پانے سے قاصر ہیں لیکن اس کی نگاہیں تمھاری نگاہوں کو پا لینے سے قاصر نہیں ہیں۔ وہ ہر جگہ سے ان کو پا لیتی ہیں۔

قَدۡ جَآءَكُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۚ فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ عَمِيَ فَعَلَيۡهَا ؕ وَمَاۤ اَنَا عَلَيۡكُمۡ بِحَفِيۡظٍ ۝ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ وَلِيَقُوۡلُوۡا دَرَسۡتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ (۱۰۴-۱۰۵)

'قَدۡ جَآءَكُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ'، لفظ 'بَصِيۡرَة' قرآن میں سوجھ بوجھ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے

اور سوجھ بوجھ پیدا کرنے والے دلائل و براہین کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں ہے اور مراد اس سے قرآن حکیم اور اس کی آیات ہیں جو آنکھوں کے پردے ہٹا دینے والی ہیں بشرطیکہ کوئی آنکھیں کھولنا چاہے۔

'فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ' یعنی ان سے فائدہ اٹھا کر جو اپنی بصیرت کی آنکھیں کھولے گا تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو بدستور اندھا بنا رہے گا تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتے گا، اس کی کوئی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

آیت کے آخری الفاظ 'وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ' اس بات پر دلیل ہیں کہ اس آیت کی وحی براہِ راست لسانِ نبوت پر ہے۔ یوں ارشاد نہیں ہوا کہ ان لوگوں سے کہہ دو بلکہ کہنے کی بات پیغمبر نے خود براہ راست فرما دی۔ وحی کی یہ قسم روحِ نبوت کے غایت قرب و اتصال کی دلیل ہوتی ہے گویا منبع فیض کا فیضان خود زبان رسالت سے چھلک پڑتا ہے۔ 'گفتۂ او گفتۂ اللہ بود' شاید اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔ وحی کی اقسام و انواع پر ان شاء اللہ ہم کسی دوسرے مقام پر بحث کریں گے۔ مولانا فراہیؒ نے اس پر اپنے مقدمۂ تفسیر میں ایک نہایت لطیف بحث فرمائی ہے۔

'وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ' 'تصریفِ آیات' کی وضاحت مختلف مقامات میں ہو چکی ہے یعنی اللہ کی نشانیوں کو مختلف پہلوؤں اور گوناگون اسلوبوں سے واضح کرنا۔ یہاں 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ توحید، معاد اور رسالت کے انھی دلائل کی طرف ہے جو اوپر تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

لفظ 'درس' کی تحقیق

'وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ' 'دَرَسَ' کے اصل معنی تو گھسنے اور مٹانے کے ہیں۔ 'دَرَسَ الرَّسْمُ' کے معنی ہوں گے مٹا، نشان کو مٹا دیا۔ آدمی جب کسی چیز کو کثرت سے بار بار پڑھتا ہے، بالخصوص جب اس پر انگلی رکھ کے ایک ایک حرف کو متعین کرتے ہوئے پڑھتا ہے، جیسا کہ مذہبی صحیفوں کی تلاوت کے لیے رواج ہے تو بالعموم وہ نسخے گھس جاتے ہیں۔ اس وجہ سے لفظ درس کسی کتاب کو اچھی طرح بار بار قراءت و مرات پڑھنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ لغت میں اس بات کو یوں تعبیر کرتے ہیں 'دَرَسَ الْكِتٰبَ' ، اقبل علیہ بحفظہ،

کسی کتاب کو پڑھنا خود اپنے لیے بھی ہو سکتا ہے اور دوسروں کو سنانے کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں قراءت اور تلاوت کے الفاظ بھی ان دونوں ہی مفہوموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ 'وَلِیَقُوْلُوْا' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنی آیتیں مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ سمجھنا چاہیں تو سمجھیں اور اگر اپنی روش پر اڑے رہنا چاہیں تو کم از کم اس بات کے تو وہ قائل ہو جائیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کے سنا دیا۔ نیز اس لیے ہم ان کی اچھی طرح وضاحت کر رہے ہیں کہ جو علم کے طالب ہیں وہ ان سے علم حاصل

کریں۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنا کوئی رسول بھیجتا ہے تو اس کے ذریعے سے وہ مخاطب قوم پر اپنی حجت تمام کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دل پکار اٹھتے ہیں کہ رسول نے احقاقِ حق کا حق ادا کر دیا، زبان سے وہ اس کا اقرار کریں یا نہ کریں۔ یہاں 'دَلِیَقُوْلُوْا' سے یہی دل کا اقرار مراد ہے۔ دل کے اقرار کے باوجود زبان و عمل سے جو قوم رسول کی تکذیب پر اڑی رہتی ہے، سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ قوم ہلاک کر دی جاتی ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۚ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ (۱۰۶-۱۰۷)

پیغمبر کی طرف التفات

یہ پیغمبر کی طرف التفات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم وحی الٰہی پر جمے اور اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور ان مشرکین کی مخالفت کی کوئی پروا نہ کرو۔ ان سے اعراض کرو اور یہ بات یاد رکھو کہ اگر اللہ اپنے دین کے معاملہ میں جبر کو پسند کرتا ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی شرک پر قائم نہ رہ سکتا۔ وہ سب کو توحید و اسلام کی صراطِ مستقیم پر چلا دیتا لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ لوگوں کو اس معاملے میں اختیار دے کر آزمائے کہ کون توحید کی راہ اختیار کرتا ہے، کون شرک کی؟ تو جب حکمتِ الٰہی نے یہ چاہا ہے تو تم ان کے معاملے میں کیوں پریشان ہو؟ تمھاری ذمہ داری حق کو واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے اور یہ فرض تم انجام دے رہے ہو۔ تم ان کے ایمان کے ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو کہ یہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش تم سے ہو اور نہ تم ان کے ایمان کے ضامن بنے ہو کہ کل کو ان کے باب میں خدا کے ہاں جواب دہی کرنی ہے۔ تم اپنا فرض انجام دو۔ جو ان کی ذمہ داری ہے وہ ان پر چھوڑ دو، اگر وہ اپنی ذمہ داری ادا نہ کریں گے تو اس کا خمیازہ خود بھگتیں گے۔

لفظ 'وکیل' کے مختلف معانی پر ہم دوسرے مقام پر گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں یہ ضامن کے مفہوم میں ہے۔ یعنی نہ خدا نے تم کو ان پر داروغہ مقرر کیا، نہ تم ان کے ضامن بنے تو تم کیوں پریشان ہو؟

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ ۚ كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۰۸)

مسلمانوں کو مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت

'وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ' یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی ایک برمحل ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت سورۂ نساء کی آیت ۸۶ اور ۱۴۸ میں گزر چکی ہے جس طرح مذکورہ آیات سے اوپر منافقین کے رویہ پر شدت کے ساتھ تنقید ہوئی تو ساتھ ہی مسلمانوں کو ان سے سلام کلام قطع کرنے اور تعیین اشخاص کے ساتھ ان کو برا بھلا کہنے کی ممانعت کر دی گئی کہ مبادا یہ بات اصول کے حدود سے نکل کر ذاتیات کے دائرے میں داخل ہو جائے، اسی طرح یہاں اوپر شرک اور مشرکین پر جو سخت تنقید ہوئی ہے اس کا تقاضا یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ہدایت کر دی جائے کہ شرک کی تردید یہ رنگ نہ اختیار کرنے پائے

کہ زیادہ پرجوش مسلمان ان چیزوں کو سخت سست کہنا شروع کر دیں جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں۔ یہ ہدایت اس وجہ سے ضروری تھی کہ یہ دور، جیسا کہ آیات سے واضح ہے، بحث کی گرماگرمی کا تھا اور بحث کی گرماگرمی میں حدود کا احترام بالعموم ملحوظ نہیں رہتا درآنحالیکہ مسلمانوں پر، جیسا کہ سورۂ مائدہ آیت ۸ سے واضح ہے، واجب ہے کہ وہ دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرنے میں سرمو حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اس ہدایت کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ دعوت کے نقطۂ نظر سے بابرکت اور نتیجہ خیز طریقہ یہی ہے کہ بات اصول و عقائد ہی تک محدود رہے تاکہ مخاطب کے اندر کسی بیجا عصبیت کا جذبۂ جاہلی ابھرنے نہ پائے۔ اگر توحید کا تقاضائے عقل و فطرت ہونا اور شرک کا بالکل بے ثبات و بے بنیاد ہونا ثابت ہو جائے تو ان مزعومہ معبودوں کی خدائی آپ سے آپ ختم ہو جاتی ہے، ان کو سب و شتم کا ہدف بنانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ برعکس اس کے اگر بحث کے جوش میں ان چیزوں کو لوگ برا بھلا کہنا شروع کر دیتے، جن کی عقیدت پشتہا پشت سے مشرکین کے دلوں میں رچی بسی ہوئی تھی تو اس کا نفسیاتی اثر ان پر یہی پڑ سکتا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر نعوذ باللہ خدا کو گالیاں دینے لگتے اور پھر کوئی بات بھی سننے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ، میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہرچند مشرکین، خدا کو خدا مانتے ہیں لیکن اشتعال میں حدود کا ہوش کسے رہتا ہے؟ وہ اندھے ہو کر سارے حدود توڑ کے رکھ دیں گے بالخصوص جب کہ انھیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق کا کوئی علم بھی نہیں ہے۔

یوں بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کا کوئی تک نہیں ہے۔ اگر وہ محض خیالی اور وہمی چیزیں ہیں تو سایہ سے لڑنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر وہ فرشتوں، نبیوں اور بزرگوں کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہیں تو ان کو برا بھلا کہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ الغرض یہ چیز دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی غلط، عقل و انصاف کے پہلو سے بھی غلط اور سب سے زیادہ اس پہلو سے غلط ہے کہ مشرکین کے جھوٹے خداؤں کو گالیاں دینے والے درحقیقت اپنے سچے خدا کو گالیاں دلوانے کی راہ کھولتے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن میں بتوں کی بے حقیقتی، ان کی ناطاقتی اور ان کی بےبسی کی تصویر جو قرآن میں کہیں کہیں کھینچی گئی ہے وہ اس کے تحت نہیں آتی۔ اول تو رد کا جس چیز سے گیا ہے وہ سب و شتم ہے نہ کہ تنقید و توضیح، دوسرے یہاں آیت میں پیش نظر وہ فرضی یا واقعی ہستیاں ہیں جن کو مشرکین معبود مان کر پکارتے تھے۔ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ، کے الفاظ سے یہ بات خود ہی نکل رہی ہے۔

كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ، مطلب یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنی روایات، اپنے رسوم اور اپنے معتقدات عزیز ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی علانیہ تحقیر و توہین سے وہ مشتعل ہوتی ہے۔ اس طرح کی کسی چیز پر تنقید کرتے ہوئے ناقد کو لازماً یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ معاملے کے وہی پہلو زیر بحث آئیں جو آنے چاہئیں اور اسی انداز میں آئیں جو شائستہ بحث و تنقید کے شایان شان ہے۔ وہ انداز نہیں ہونا چاہیے جو

جذبات کو مجروح کرنے والا اور دلوں کو دکھانے والا ہو۔

فطری تقاضوں کے جائز حدود کی رعایت

یہاں تَزْیِیْن کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قوم کے اندر اپنی مالوفات سے دل بستگی اور اپنی روایات ملی و اجتماعی کے لیے یہ عصبیت ایک حد تک فطری چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو قومی و ملی وحدت وجود ہی میں نہیں آسکتی۔ خاندانوں، قوموں، وطنوں کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوئی ہے۔ یہ معدوم ہو جائیں تو افراد ہوا میں اڑتے ہوئے پتوں کے مانند ہو جائیں۔ اس وجہ سے اس چیز کا ایک مقام ہے جو تقاضائے فطرت ہے اور اس کی رعایت ملحوظ ہونی چاہیے۔ اس سے تعرض اسی حد تک ہونا چاہیے جس حد تک یہ حق کے خلاف ہے اور اس انداز میں ہونا چاہیے جس سے خود اس کا واجبی حق مجروح نہ ہو۔ یاد ہوگا، ہم دوسرے مقام میں بحث کر آئے ہیں کہ قرآن نے باپ دادا کے طریقہ کی بھی اہمیت تسلیم کی ہے۔ بس یہ مطالبہ کیا ہے کہ اس کو ان چیزوں سے پاک کر کے اختیار کیا جائے جو اس میں عقل و فطرت اور تعلیم الٰہی کے خلاف گھس آئی ہوں۔ اسی طرح یہاں مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ قوم کے عقائد و اعمال کی تطہیر تو ضروری ہے لیکن یہ کام نہایت حکمت و دانش کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ہر قوم کو اپنی روایات سے گہری وابستگی ہوتی ہے اور یہ چیز اس فطرت کے تقاضوں میں سے ہے جو خود خدا نے انسان کے اندر ودیعت کی ہے اس وجہ سے یہ تو ضروری ہے کہ جو خلافِ فطرت چیز فطرت کے اندر گھس آئی ہے وہ اس سے دور کی جائے لیکن خود فطرت پر کوئی جارحانہ حملہ کرنے کی غلطی نہ کی جائے ورنہ اس سے کام بننے کے بجائے اور بگڑ جایا کرتا ہے۔

ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ الاٰیۃ' پوری آیت سامنے رکھ کر اس فقرے پر غور کیجیے تو مطلب یہ نکلے گا کہ مسلمانوں کو دعوت کے جوش میں اپنے حدود سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اگر لوگ حق واضح ہو جانے کے باوجود اپنی غلطیوں ہی پر مصر رہیں گے تو مجرم وہ ٹھہریں گے اور قیامت کے دن خدا کے آگے جوابدہی ان کو کرنی ہوگی، اہل ایمان پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، پھر وہ کیوں ضرورت سے زیادہ مضطرب اور اپنی ذمہ داری کے حدود سے متجاوز ہوں؟ یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی تسکین و تسلی ہے جس طرح کی تسکین و تسلی اوپر والی آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔

۱۷- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۰۹-۱۱۷

اوپر کے مجموعۂ آیات میں جیسا کہ واضح ہوا، تفصیل کے ساتھ توحید، معاد اور رسالت کے عقلی و فطری دلائل بیان ہوئے ہیں۔ اب آگے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان سارے دلائل کے بعد بھی ان کا مطالبہ یہی ہے کہ تم کوئی معجزہ دکھاؤ تو وہ ایمان لائیں گے۔ فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ یہ چیز میرے اختیار کی نہیں ہے، صرف خدا کے اختیار کی ہے۔ اس کے پاس معجزات کی کمی نہیں ہے۔ وہ ایک سے ایک بڑھ کر معجزے دکھا سکتا

ہے لیکن تم دنیا جہان کے معجزے دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاؤ گے اس لیے کہ ایمان نہ لانے کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ نشانیاں اور معجزات موجود نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ تمھارے دل اور تمھاری آنکھیں الٹ گئی ہیں۔ جس طرح اس کائنات کی بے شمار نشانیاں دیکھ کر تم اندھے ہی بنے رہے اسی طرح اگر اور بہت سے معجزے بھی تمھیں دکھا دیے گئے جب بھی تم اندھے ہی بنے رہو گے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس دنیا میں جاری ہے اور جس سے ہر نبی اور ہر داعیٔ حق کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ جب کسی نبی یا کسی داعیٔ حق کی دعوتِ حق بلند ہوتی ہے تو اس کی مخالفت کے لیے شیاطین انس و جن بھی لازماً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو اہل حق کی آزمائش اور ان کے کھرے کھوٹے میں تمیز ہوتی ہے، دوسری طرف اہل باطل کو ڈھیل ملتی ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور جو کمائی انھیں کرنی ہے کر لیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ میرے لیے تو اس قضیہ میں خدا کے سوا کسی اور کو حکم ماننے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس نے ایک کتاب اتار کر حق اور باطل کے درمیان واضح فیصلہ کر دیا ہے۔ جو اہل کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خدائی کتاب ہے۔ اب جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ شیطان کی پیروی کر رہے ہیں، اور ان کے باب میں خدا کی وہ بات پوری ہو کے رہے گی جو اس نے شیطان کے جواب میں فرمائی تھی کہ جو تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو جہنم میں جھونک دوں گا۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہنے کی تاکید اور معاملے کو خدا کے حوالے کرنے کی تلقین ہے — اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۹-۱۱۷

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ ۧ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِیْ

ع ۱۳ الجزء ۱۹

بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصْغٰۤی اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

ترجمۂ آیات ۱۰۹-۱۱۷

اور وہ اللہ کی پکی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور تمھیں کیا پتہ کہ جب وہ آجائے گی تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو اُلٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے، اور ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔ اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مُردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ان کے آگے گروہ در گروہ اکٹھی کر دی جاتیں جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا آنکہ اللہ چاہے لیکن ان کی اکثریت مبتلائے جہل ہے۔ ۱۰۸-۱۱۱

اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کے اشرار کو ہر نبی کا دشمن بنایا۔ وہ ایک دوسرے کو پُر فریب باتیں القا کرتے ہیں دھوکا دینے کے لیے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے۔ تو تم ان کو ان کی انھی افترا پردازیوں میں پڑے رہنے دو اور ایسا اس لیے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دِل جھکیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں اور تاکہ جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کر لیں۔ ۱۱۲-۱۱۳

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حکم ڈھونڈوں درآنحالیکہ وہی ہے جس نے تمھاری طرف کتاب اتاری مفصل۔ اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے حق کے ساتھ تو تم شک میں پڑنے والوں میں سے نہ ہوجیو۔ اور تمھارے رب کی بات پوری ہوئی ٹھیک ٹھیک اور عدل کے ساتھ اور کوئی نہیں جو اس کی باتوں کو بدل سکے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اس زمین والوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اگر تم نے ان کی بات مانی تو وہ تمھیں خدا کے راستہ سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے۔ یہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکل کے تیر تکّے چلاتے ہیں۔ بے شک تیرا رب خوب جانتا ہے ان کو جو اس کے رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں اور خوب جانتا ہے ان کو جو ہدایت یاب ہیں۔ ۱۱۴-۱۱۷

۱۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـــِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى

وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ٥

آنحضرتؐ کے خلاف کفار کا ایک پروپیگنڈا

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا، جهد کے معنی تا حد وسع کوشش، بھرپور جدوجہد کے ہیں۔ بذل جھدہ اس نے اپنی پوری کوشش صرف کردی۔ پورا زور لگا دیا۔ 'اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ' یعنی وہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر پیغمبر کو اور مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ ضرور مان لیں گے کہ یہ معجزہ خدا کی طرف سے، اس کا دکھانے والا خدا کا رسول اور اس کی پیش کی ہوئی کتاب خدا کی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زور شور کے ساتھ قسمیں کھا کھا کے یقین دلانے سے اصل مقصود ان کا وہ تو تھا نہیں جو وہ ظاہر کرتے تھے بلکہ یہ ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک پراپیگنڈا تھا۔ وہ اس سے ایک طرف تو اپنے ان ہم قوموں کو مطمئن کرنا چاہتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت سے متاثر ہو رہے تھے کہ ہم نے ایک شرط بدری ہے جو نہایت معقول ہے، اگر یہ شرط محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پوری کردیں تو ہم ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔ دوسری طرف وہ نیک دل مسلمانوں کے دل پر یہ اثر ڈالنا چاہتے تھے کہ جب یہ سچے رسول ہیں تو آخر اس شرط کے مان لینے میں کیا مانع ہے، کیوں نہیں اس کو مان کر میدان جیت لیتے۔

کفار کو جواب اور مسلمانوں کو تسلی سنت الٰہی کی روشنی میں

'قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ' یہ جواب ہے ان کی بدی ہوئی شرط کا اور دیکھ لیجیے کتنا نازک موقع ہے لیکن جواب وہی دیا گیا جو بالکل صحیح جواب ہے۔ ذرا بھی اس میں اس اندیشے کا دخل نہیں ہے کہ اس کو سن کر حریف تالی پیٹ دے گا کہ یہ لو فتح ہماری رہی۔ خود پیغمبر کی زبان مبارک سے اعلان کرایا کہ جس قسم کے معجزات کا تم مطالبہ کر رہے ہو، یہ معجزات تو خدا ہی کے پاس ہیں، وہ چاہے تو ظاہر فرمائے، نہ چاہے تو نہ ظاہر فرمائے۔ اس معاملے میں مجھے کوئی اختیار نہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک امر واقعی کا بیان ہے۔ پیغمبرؐ کا اصلی فریضہ انذار و تبشیر ہے۔ لوگوں کی طلب کے مطابق معجزے دکھانا نہ اس کے اختیار میں ہے، نہ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

'وَمَا يُشْعِرُكُمْ' میں ضمیر خطاب جمع کی ہے اور روئے سخن عام مسلمانوں کی طرف ہے۔ قدرتی طور پر بحث کی اس گرماگرمی کے دور میں ان کے اندر یہ شدید خواہش پیدا ہوئی ہوگی کہ جب بات اسی شرط پر آ کر ٹکی ہے کہ ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مان لیں گے تو ان کو کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں کیا معلوم کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب کیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو یہ مان لیں گے حالانکہ اس وقت بھی یہ نہیں مانیں گے بلکہ

نشانیوں سے ہدایت پانے کے بارے میں سنت الٰہی

بدستور اپنی ضد پر اڑے ہی رہیں گے اس لیے کہ ان کے ایمان نہ لانے کی جو اصل علت ہے وہ بدستور اس معجزے کے دیکھ لینے کے بعد بھی باقی رہے گی۔

'وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ' یہ اس سنت اللہ کا بیان ہے جس کے

تحت کسی کو ایمان نصیب ہوتا ہے اور کوئی اس سے محروم رہتا ہے۔ اس سنت اللہ کی وضاحت اس کتاب میں مختلف مقامات میں ہو چکی ہے۔ اس کائنات میں بھی اور انسان کے اپنے وجود کے اندر بھی خالق کائنات نے اپنی جو ان گنت نشانیاں پھیلا دی ہیں جو لوگ ان پر غور کرتے اور اس غور و فکر سے جو بدیہی نتائج ان کے سامنے آتے ہیں ان کو حرز جاں بناتے ہیں، ان کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ بہ تمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود اندھے بہرے بنے اور اپنی خود پرستیوں میں مگن رہتے ہیں، قرآن اور پیغمبر کی بار بار تذکیر کے بعد بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولتے، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو الٹ دیا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح فکر و نظر کی صلاحیت سے محروم ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر بڑی سے بڑی نشانی اور بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سیدھے دیکھنے کے بجائے اُلٹے دیکھتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے الٹی راہ چلتے ہیں ان کے دل اور ان کی فکر بھی کج کر دی جاتی ہے۔ پھر وہ احول کی طرح ہر چیز کو بس اپنے مخصوص زاویہ ہی سے دیکھتے ہیں۔ اسی سنت اللہ کی طرف فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہاں اسی معروف سنت اللہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ کیسے باور کرتے ہو کہ اگر ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مومن بن جائیں گے۔ آخر وہ تمام نشانیاں جو آفاق و انفس میں موجود ہیں، جن کی طرف قرآن نے انگلی اٹھا اٹھا کر اشارہ کیا اور ان کے مضمرات و دلائل واضح کیے جب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کے زاویے کو درست کرنے میں کارگر نہ ہو سکی تو آخر کوئی نئی نشانی کس طرح ان کی کایا کلپ کر دے گی؟ جو حجاب آج ہے وہ کل کس طرح دُور ہو جائے گا اور جو اندھاپن آج دیکھنے سے مانع ہے وہ اس نشانی کے ظہور کے وقت کہاں چلا جائے گا؟ جس طرح آج تک وہ ساری نشانیوں کو جھٹلاتے رہے ہیں اسی طرح اس نشانی کو بھی جھٹلا دیں گے اور جو قلب ماہیت ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کی آج دیکھتے ہو وہ قلب ماہیت اس وقت بھی اپنا عمل کرے گی۔ یہ قلب ماہیت چونکہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت کے نتیجہ کے طور پر ظہور میں آتی ہے اس وجہ سے جس طرح بعض مواقع میں فعل 'اضلال' کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اسی طرح یہاں تقلیب قلوب و ابصار کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ 'بِہٖ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔

'وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ' اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز جو ان کے ایمان نہ لانے کا سبب ہے وہ ان کا طغیان اور ان کی سرکشی ہے۔ وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنی قوت و قابلیت کا کرشمہ سمجھے بیٹھے ہیں اور پیغمبر کی دعوت ان کے غرور نفس اور ان کے پندار سیادت پر شاق گزر رہی ہے۔ ان کے اس غرور کی سزا ان کو یہ ملی ہے کہ ان کے دل اور ان کی آنکھیں خدا نے اُلٹ دی ہیں اور ان کو اسی غرور میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ ... قُبُل کی تحقیق

مصدر بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی کسی شے کو سامنے سے آتے دیکھنے کے ہیں اور قبیل کی جمع بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ قرآن میں ان دونوں معنوں کے لیے نظیر موجود ہے۔ پہلے معنی کے لیے نظیر سورہ کہف میں ہے۔ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۵۵۔ (ہدایت آچکنے کے بعد لوگوں کو ایمان لانے اور اپنے رب سے مغفرت چاہنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ ان کے بارے میں بھی خدا کی وہی سنت ظاہر ہو جائے جو اگلوں کے بارے میں ظاہر ہو چکی ہے یا یہ کہ ان پر عذاب سامنے سے دوڑتا ہوا آ جائے) دوسرے معنی کے لیے نظیر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۹۲ (یا تم لاؤ اللہ کو اور فرشتوں کو گروہ در گروہ) زیر بحث آیت میں اگرچہ بنتے دونوں معنی ہیں لیکن میں نے حَشَرْنَا اور كُلَّ شَيْءٍ کی رعایت سے ترجمے میں ترجیح دوسرے معنی کو دی ہے۔

ایمان کے لیے اصلی حجاب

یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید ہے۔ فرمایا کہ اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیتے، جیسا کہ یہ کہتے ہیں، یا قبروں سے مردے نکل کر ان سے باتیں کرنے لگتے، جیسا کہ یہ مطالبہ کرتے ہیں، یا پردۂ غیب کی ساری ہی چیزیں ان کے سامنے گروہ در گروہ لا کھڑی کرتے جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے اس لیے کہ وہ طغیان جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے جب بھی باقی رہتا۔

ایمان کے باب میں سنتِ الٰہی

اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ان کے ایمان لانے کی شکل صرف یہ ہے کہ اللہ یہ چاہے کہ ان کو ایمان و ہدایت بخشے اور اللہ کا کوئی چاہنا بھی اس کی ٹھہرائی ہوئی اور اس کی پسند کی ہوئی حکمت کے خلاف نہیں ہوتا۔ وہ ایمان و اسلام کسی کے دل میں زبردستی نہیں ٹھونستا۔ یہ نعمت وہ ان کو بخشتا ہے جو اس کے قدردان ہوتے ہیں اور اس کے لیے اپنی وہ صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں جو خدا نے ان کے اپنے اندر ودیعت فرمائی ہیں۔ جب وہ ان کو استعمال کرتے ہیں تو اللہ کی طرف سے ان کو مزید توفیق ارزانی ہوتی ہے۔ رہے یہ جو معجزے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں تو یہ اپنی خواہشات و جذبات کے غلبہ سے اندھے ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ راہ کیسے کھل سکتی ہے؟

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (۱۱۲-۱۱۳)

اللہ تعالیٰ کی سنّتِ ابتلاء

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ، كَذٰلِكَ کا اشارہ اس مخالفانہ شورش کی طرف ہے جو اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے قریش کے لیڈروں اور ان کے ہمنواؤں نے برپا کر رکھی تھی۔ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ اس صورتِ حال سے تنہا تمہی کو سابقہ پیش آیا ہے۔ تم سے پہلے جو انبیا گزرے ہیں ان کو بھی اپنے اپنے زمانوں کے شیاطین جن و انس کے ہاتھوں یہی دکھ جھیلنے پڑے ہیں

یہ اللہ کی سنت ابتلاہے جس سے اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کو گزرنا پڑا ہے۔ اسی سے راست بازوں کی راست بازی کا امتحان ہوتا ہے اور ان کے جوہر نکھرتے ہیں اور اسی سے اہل باطل کو وہ مہلت ملتی ہے جس میں ان کے اندر کا فساد ظہور میں آتا ہے اور وہ اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو آگے اسی سورہ میں یوں ادا فرمایا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۱۲۳ (اور اسی طرح ہم نے ہر بستی کے اکابر مجرمین کو مہلت دی کہ وہ جو چالیں اس میں چلنا چاہتے ہیں چل لیں، اور وہ نہیں چلتے تھے کوئی چال مگر اپنے ہی ساتھ لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہوا) اہل ایمان کی یہ آزمائش اور اہلِ کفر کے لیے یہ ڈھیل چونکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ ابتلا کے تحت ظہور میں آتی ہے اور انسان کو اس نے اختیار و ارادہ کی جو آزادی بخشی ہے یہ اسی کا ایک لازمی حصہ ہے اس وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ نے منسوب اپنی طرف فرمایا ہے۔

بدعات کا فریب

يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۔ زخرف کے معنی ملمع کی ہوئی بات، جھوٹی اور باطل چیز جس پر حق کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ صفت ہے جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہوگئی ہے۔ اس سے مراد وہ مشرکانہ بدعات ہیں جو ہر دور کے شیاطین جن و انس نے باہمی گٹھ جوڑ سے ایجاد کیں، پھر ان کے اوپر شریعت الٰہی کا لیبل لگا کر ان کو رواج دیا اور جب انبیاء و مصلحین نے ان کی اصلاح کی دعوت دی تو ان کی مخالفت میں بحث و جدال کا بازار گرم کیا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی یہی ہوا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت دی اور ان کے بتوں اور مشرکانہ عقائد کے تحت ان کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کی بے حقیقتی واضح فرمائی تو شرک کے یہ ائمہ آستینیں چڑھا چڑھا کے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جس پر ان کا زور چلا اس کو اپنے دامِ فریب میں پھنسانے اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ہمارے باپ دادا کے دین اور ابراہیمؑ کی ملت سے ہٹا رہے ہیں۔

یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ شرک اور باطل کا جتنا نظام بھی ہے وہ تمام تر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، شیاطینِ جن و انس کے باہمی گٹھ جوڑ سے قائم ہے۔ یہ بات تفصیل سے اپنے مقام میں واضح ہو چکی ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ کد عقیدۂ توحید سے ہے اس وجہ سے وہ اس پر ضرب لگانے کے لیے برابر نت نئے حربے اور نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرتا رہتا ہے اور انسانوں میں سے جو اس کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں ان کے اندر غلط عقائد القا کر کے ان کے واسطے سے خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آگے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۱۲۱ (انعام) (اور شیاطین اپنے ایجنٹوں کو القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کی بات مانو گے تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے) اس گٹھ جوڑ کی مزید وضاحت آگے کی ایک اور آیت سے بھی ہو رہی ہے۔ فرمایا۔ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ

بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۱۲۸- انعام (اور جس دن خدا ان سب کو جمع کرے گا اور کہے گا اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو ہتھیا لیا اور جو انسانوں میں سے ان کے ساتھی بنے ہوں گے وہ بولیں گے کہ ہم میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے کو استعمال کیا یہاں تک کہ ہم پہنچ گئے اس مدت کو جو تو نے ہمارے لیے ٹھہرائی ہوئی تھی)

اللہ تعالیٰ کا قانون امتحان و آزمائش اور اس کی حکمت

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کی مشیت اور اس کے قانون امتحان و آزمائش کے تحت ہو رہا ہے۔ اس نے انسانوں اور جنوں کو نیکی اور بدی دونوں میں سے کسی کو اختیار کرنے کی آزادی بخشی ہے۔ اگر وہ سب کو نیکی ہی کی راہ پر چلانا چاہتا تو یہ بھی کر سکتا تھا لیکن اس کی حکمت نے یہی پسند فرمایا کہ وہ اس معاملے میں جبر کے بجائے لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی دے کر ان کا امتحان کرے اور دیکھے کہ کون خدا کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون شیطان کی۔ اس قانون کے تحت باطل کے علمبرداروں، شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو بھی، اس حیاتِ چند روزہ میں مہلت ملی ہوئی ہے کہ وہ اپنی اس انتخاب کی ہوئی راہ پر چلیں۔ تو تم اپنی راہ چلو اور لوگوں کو اسی راہ کی دعوت دو اور ان لوگوں کو جو تمھاری بات سننا نہیں چاہتے ان کی من گھڑت بدعات میں پڑے رہنے دو۔ یہ اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔ لفظ 'افترا' پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر کے واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں اس سے شرک اور مشرکانہ بدعات مراد ہوتی ہیں۔

وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ۔ اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو اوپر والے جملے سے نکلتا ہے۔ یعنی ہم نے شیاطین جن و انس کو انبیاء و صالحین کی مخالفت اور بدعات و خرافات کے القا کی یہ مہلت جو اس دنیا میں دی ہے یہ اس لیے دی ہے کہ اس سے ایک طرف حق پرستوں کی حق پرستی کا امتحان ہوتا ہے دوسری طرف باطل پرستوں کو ڈھیل ملتی ہے اور وہ ان شیاطین و اشرار کے ہاتھوں اپنا من بھاتا کھاجا پا کر اس کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس کو پسند کرتے ہیں اور اس دنیا میں جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کر لیتے ہیں۔ یہ ڈھیل اس اختیار کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کو بخشا گیا ہے اس وجہ سے یہ سنتِ الٰہی کے تحت ہے۔ ان لوگوں کی صفت یہاں اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ بتائی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیاطین و اشرار کی یہ دعوت انہی لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو آخرت کے اعتقاد سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کو مطلوب صرف یہ دنیا اور اس کا عیش ہوتا ہے اور اس کی سند ان شیاطین کے ہاتھوں ان کو مل جاتی ہے۔ 'اقتراف' کے معنی کمائی کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن میں یہ اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں بری کمائی کرنے کے معنی میں ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا

وَعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۱۱۴-۱۱۷)

اصل حَکَم اللہ اور اس کی کتاب ہے

'اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا' یہ مشرکین کے مجادلہ کا پیغمبر کی طرف سے جواب ہے کہ تم مجھ سے شرک و توحید اور حلال و حرام کے بارے میں جھگڑ رہے ہو سوال یہ ہے کہ اس جھگڑے میں کہ خدا کی خدائی میں کچھ اور بھی شریک ہیں یا وہی تنہا حکمران ہے، اس نے کیا چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں، کیا جائز رکھی ہیں، آخر حکم بننے کا حق کس کو حاصل ہے؟ خدا ہی کو یا کسی اور کو؟ اگر خدا ہی کو یہ حق حاصل ہے اور بلاریب اسی کو حاصل ہے تو میرے لیے یہ بات کس طرح جائز ہے کہ میں اس کے سوا کسی اور کو اس معاملے میں حکم مانوں جب کہ اس نے اس جھگڑے کے چکانے کے لیے ایک کتاب بھی تمھاری طرف اتاری ہے جس میں تفصیل کے ساتھ اس نے ہر چیز کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اب ایک طرف یہ مفصل خدائی کتاب ہے، دوسری طرف تمھاری بے سند بدعات ہیں، ان میں سے کس کی بات ماننے جانے کے لائق ہے۔

صالحین اہل کتاب کی شہادت

'وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ'، اس سے میرے نزدیک مراد، جیسا کہ بقرہ ۱۴۶ اور انعام ۲۰ کے تحت واضح کر چکا ہوں، صالحین اہل کتاب ہیں اور یہ بات بطور ایک شہادت حق کے نقل ہوئی ہے کہ یہ جہلا اگر اس کتاب کے مخالف ہیں تو ان کی پروا نہ کرو۔ جو سچے اہل علم اور حق پسند حامل کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے اتری ہے اور یہ حق کے ساتھ اتری ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ اس کے ذریعہ سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ 'فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ' میں خطاب باعتبار الفاظ اگرچہ آنحضرتؐ سے ہے لیکن ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ اس طرح کے مواقع میں روئے سخن دوسروں کی طرف ہوتا ہے۔ صالحین اہل کتاب کی اس شہادت کا ذکر سورۂ قصص میں بھی ہے۔ 'اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ' (۵۲-۵۳) (اور جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب عطا فرمائی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم پہلے سے مسلم ہیں) یہ نکتہ یہاں ملحوظ رہے کہ جب کوئی حقیقت اول اول بگڑی ہوئی خلق کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ سب لوگ احسنت و مرحبا کہتے ہوئے اس کے خیر مقدم کے لیے اٹھ کھڑے ہوں بلکہ اس کے برعکس اکثریت اس کی مخالفت کے درپے ہو جاتی ہے۔ سوسائٹی کے لیڈر اور قوم کے اشرار تو اس لیے اس کی مخالفت کرتے ہیں کہ اس سے ان کو اپنا مفاد خطرے میں نظر آتا ہے، رہے عوام تو وہ اپنے رسوم و رواج اور اپنے طریقۂ آبا کے بندے ہوتے ہیں اس وجہ سے ہر وہ بات ان کو بری لگتی ہے جو ان کی مالوفات کے خلاف ہو اگرچہ وہ کتنی ہی بڑی حقیقت ہو اور اپنی تائید و تصدیق

میں اپنی پشت پر کتنی ہی واضح حجتیں رکھتی ہو۔ اکثریت کا یہ ردیہ بسا اوقات ان لوگوں کو بھی اس حقیقت سے متعلق تذبذب میں ڈال دیتا ہے جو اگرچہ نیک نیت ہوتے ہیں لیکن ابھی ان کی فکر و نظر اتنی پختہ نہیں ہوئی ہوتی ہے کہ مخالفت کی آندھیوں اور اکثریت کے طوفانوں کا مقابلہ کر سکے۔ ایسے ہی لوگوں کی رہنمائی اور دلدہی کے لیے اس آیت میں اشارۃً اور آگے والی آیت میں تصریحاً یہ بات بتائی گئی ہے کہ کسی صداقت کی صداقت خود اس کی اپنی کسوٹی پر جانچی جاتی ہے اور اگر اس کے حق میں خارجی شہادت ہی مطلوب ہو تو یہ کافی ہے کہ سنجیدہ، ذی علم اور صاحب کردار لوگ اس کے حق میں شہادت دیں اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔ سقراط کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے بعض ناصحوں نے اس سے کہا کہ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ سارا ایتھنز تمھارے خیالات سے برہم ہے، تم کو ان کی کچھ پروا نہیں ہے؟ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ مجھے صرف اس ایک انسان کی پروا ہے جو دانش مند ہو۔ اکثریت و اقلیت کی یہ بحث آگے آ رہی ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔

ایک سنت الٰہی کا ظہور

وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آج یہ تمام شیاطین جن و انس کو جو اپنی اور اپنی دعوت کی مخالفت میں متحد پا رہے ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک وہی صورت حال ہے جو شیطان اور آدم کے ماجرے میں بیان ہو چکی ہے۔ شیطان نے اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کے لیے مہلت مانگی خدا نے اس کو مہلت دی، شیطان نے دھمکی دی کہ میں ذریتِ آدم کی اکثریت کو شرک و بت پرستی میں مبتلا کر کے چھوڑوں گا۔ خدا نے فرمایا کہ اگر تو ایسا کرے گا تو میں تجھ کو اور تیرے سارے پیرووں کو جہنم میں بھر دوں گا۔ بقرہ کی آیت ۱۶۸ کے تحت اس مضمون کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں اس کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ان لوگوں نے شیطان کے پھندے میں پھنس کر اپنے باب میں اس کی پیشین گوئی پوری کر دی ہے اور اللہ نے ایسے لوگوں کے باب میں شیطان کو اپنا جو فیصلہ سنایا تھا وہ پورا ہو گیا اور یہ فیصلہ سچائی اور عدل دونوں معیاروں پر پورا ہے۔ خدا نے جو بات فرمائی وہ سچی بھی ہے اور مبنی بر عدل بھی۔ اس لیے کہ خدا نے ان پر اپنی حجت پوری کر دی ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ ہدایت الٰہی کی جگہ القائے شیطانی ہی کی پیروی پر بضد ہیں تو یہ اسی انجام کے سزاوار ہیں جس کی خدا نے ان کو خبر دی ہے۔ خدا کے فیصلے اس کی مقررہ سنت کے تحت ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اللہ سمیع و علیم ہے، نہ اس کی کوئی بات بے خبری پر مبنی ہوتی، نہ اس میں کسی خطا یا ناانصافی کا امکان ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بات مشرکین کے لیے بطور تہدید و وعید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بطور تسلی ارشاد ہوئی ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ پر اسی انعام کی آیت ۳۴ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

اکثریت کا نوغا اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے

وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ۔ اوپر آیت ۱۱۵ میں جس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا تھا، یہ اس کی تصریح ہے اور خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد ہے لیکن معناً خطاب عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت جو غوغائے عام دعوتِ توحید کی مخالفت اور شرک و بدعات کی حمایت میں برپا ہے اس کی مطلق پروا

نہ کرو۔ یہ کسی دلیل و سند اور کسی علم و حجت پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر ظن و گمان کی پیروی پر مبنی ہے۔ یہ محض اٹکل کے تیر تکے چلائے جا رہے ہیں اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ یہ دعویٰ جو کیا جاتا ہے کہ یہ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں یہ خدا کا بتایا ہوا اور ابراہیم کی وراثت ہے محض ان کا افترا ہے۔ اللہ اور ملتِ ابراہیم سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مغالطہ بھی کسی کو نہیں ہونا چاہیے کہ اکثریت اس فتنہ کے ساتھ ہے۔ وہ اکثریت جو علم سے عاری ہو اور محض گمان کے پیچھے بھاگ رہی ہو اس کی بات جو لوگ مانیں گے وہ خدا کی راہ سے بھٹک کے رہیں گے۔ اکثریت کا غوغا اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ یہ خطاب بھی عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس بھیڑ کو دیکھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ یہ بات اللہ کو ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور کون ہدایت یاب ہیں۔ پس جن کو خدا راہ یاب بتا رہا ہے ان کی راہ اختیار کرو اور جن کو خدا گمراہ قرار دے رہا ہے ان کی روش سے بچو۔ یہ ہدایت یافتہ گروہ کے لیے بشارت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے لیے تہدید بھی ہے جو گمراہی کی راہ پر چل رہے ہیں اس لیے کہ جب اللہ ان دونوں گروہوں سے اچھی طرح باخبر ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔ ان لوگوں کے دعوے کچھ کام نہیں آئیں گے جو ہیں تو گمراہ لیکن علم بردار بنے ہوئے ہیں ہدایت کے۔

۱۹۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۱۸-۱۴۰

آگے ان مشرکانہ بدعات کی تردید آ رہی ہے جو مشرکین نے اختیار تو کی تھیں شیطان کے القا سے لیکن دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیم سے ان کو وراثت میں ملی ہیں۔ قرآن نے ان بدعات کو بے سند اور بے بنیاد قرار دے کر ان کے تحت حرام کردہ چیزیں جائز قرار دے دیں تو انھوں نے یہ ہنگامہ کھڑا کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ چیزیں بھی جائز کر دی ہیں جو ہمارے بزرگوں ــــ ابراہیم و اسمٰعیل کے زمانے سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ یہ پروپیگنڈا قدرتی طور پر کمزور طبائع پر اثر انداز ہوا۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں آیات ۱۶۸-۱۷۲ کے تحت تفصیل سے بیان کر آئے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں اول تو طبیعتیں یوں ہی بڑی حساس ہوتی ہیں اور اگر ان کا تعلق مشرکانہ مذہبی روایات سے ہو تو یہ حس تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہاں بڑی تفصیل کے ساتھ ان توہمات کی تردید بھی فرمائی اور اصل ملتِ ابراہیم کی وضاحت بھی فرمائی۔ یہ مضمون سورہ کے آخر تک چلا جائے گا۔ بیچ بیچ میں بعض باتیں بطور التفات یا کسی ذیلی شبہ کی تردید و توضیح کے طور پر بھی آئی ہیں لیکن سب بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی بحث سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ان کا موقع و محل سلسلہ بیان سے خود واضح ہو جائے گا ــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا

آیات ۱۱۸-۱۴۰

لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ
مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ
بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَذَرُوْا
ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ
بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ
اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ
لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ اَوَمَنْ (ع ۱۴ / ۱۱ / ۱)
كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى
النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ
زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِىْ كُلِّ
قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ
وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى
نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ (وقف منزل / وقف لازم)
رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ
شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ
يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ
ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ
الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَا اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا

۱۵ ع ۸ ۲

لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿١٣٦﴾ وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَآءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٧﴾ وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَن نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيهِم بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٨﴾ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِن يَكُن مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَآءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٣٩﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَآءً عَلَى اللَّهِ ۚ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٤٠﴾

ع ١٦ ١١ ٣

ترجمۂ آیات ۱۱۸-۱۴۰

پس تم کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو اور تم کیوں نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو جب کہ اس نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں وہ چیزیں جو تم پر حرام ٹھہرائی ہیں اس استثنا کے ساتھ جس کے لیے تم مجبور ہو جاؤ۔ اور بے شک بہتیرے ایسے ہی ہیں جو لوگوں کو کسی علم کے بغیر اپنی بدعات کے ذریعے سے گمراہ کر رہے ہیں۔ تیرا

رب خوب واقف ہے ان حد سے بڑھنے والوں سے۔ اور چھوڑو گناہ کے ظاہر کو بھی اور اس کے باطن کو بھی۔ بے شک جو لوگ گناہ کما رہے ہیں وہ عنقریب اپنی اس کمائی کا بدلہ پائیں گے۔ اور تم نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو۔ بے شک یہ حکم عدولی ہے اور شیاطین القا کر رہے ہیں اپنے ایجنٹوں کو تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہا مانو گے، تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ ۱۱۸-۱۲۱

کیا وہ جو مردہ تھا تو ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو ایک روشنی بخشی جس کو لے کر وہ لوگوں میں چلتا ہے اس کے مانند ہو گا جو تاریکیوں میں پڑا ہُوا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں ہے؟ اسی طرح کافروں کی نظر میں ان کے اعمال کھبا دیے گئے ہیں اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے سرغنوں کو ڈھیل دی کہ اس میں اپنی چالیں چل لیں۔ اور چال وہ اپنے ہی ساتھ چلتے تھے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں تھا۔ اور جب ان کے پاس آتی کوئی آیت تو کہتے ہم تو ماننے کے نہیں جب تک ہم کو بھی وہی کچھ نہ ملے جو اللہ کے رسولوں کو ملا۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنا منصبِ رسالت کس کو بخشے۔ جو لوگ شرارت کر رہے ہیں اللہ کے ہاں ان کو ان کی اس چالبازی کی پاداش میں ذلت اور عذاب شدید نصیب ہو گا۔ اللہ جس کسی کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے گویا اسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے۔ اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔ اور یہ تیرے رب کی راہ ہے سیدھی۔ ہم نے اپنی آیتیں تفصیل سے بیان

کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو یاد دہانی حاصل کریں۔ ان کے لیے ان کے رب کے
پاس سکھ کا گھر ہے اور وہ ان کا کارساز ہے ان کے اعمال کے صلہ میں۔ ۱۲۱-۱۲۷
اور اس دن کا دھیان کرو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ کہے گا اے
جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا اور انسانوں میں سے ان کے
ساتھی کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے ایک دوسرے کو استعمال کیا اور ہم پہنچ گئے
اپنی اس مدت کو جو تُو نے ہمارے لیے ٹھہرائی۔ فرمائے گا تمھارا ٹھکانا اب جہنم ہے
ہمیشہ کے لیے اس میں رہو مگر جو اللہ چاہے۔ بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے اور
اسی طرح ہم مسلط کر دیتے ہیں ظالموں کو ایک دوسرے پر بسبب ان کی کرتوتوں کے۔
اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمھارے پاس تمھیں میری آیتیں سناتے اور تمھارے
اس دن کی ملاقات سے تم کو ہوشیار کرتے ہوئے تم میں سے رسول نہیں آئے۔ وہ بولیں گے
ہم خود اپنے خلاف شاہد ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا اور وہ خود
اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ بے شک وہ کافر رہے۔ یہ اس وجہ سے کہ تیرا رب بستیوں
کو ان کے ظلم کی پاداش میں اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں ہے کہ ان کے باشندے
بے خبر ہوں۔ اور ہر ایک کے لیے درجے ہیں ان کے عمل کے اعتبار سے اور تیرا رب
اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو وہ کرتے رہے ہیں اور تیرا رب بے نیاز، رحمت والا ہے۔
اگر وہ چاہے تم کو فنا کر دے اور تمھارے بعد تمھاری جگہ جس کو چاہے لائے جس طرح اس
نے تم کو پیدا کیا دوسروں کی نسل سے۔ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ آ کر
رہے گی اور تم ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکتے۔ کہہ دو، اے میرے ہم قومو، تم اپنے

طریقے پر چلو، میں اپنے طریقے پر چلتا ہوں، تم جلد جان لوگے کہ انجام کار کی کامیابی کس کا حصہ ہے۔ یقیناً ظالم فلاح پانے والے نہیں ہو سکتے۔ ۱۲۸ - ۱۳۵

اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے اس میں انھوں نے اللہ کا ایک حصہ مقرر کیا ہے۔ پس کہتے ہیں یہ حصہ تو اللہ کا ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور یہ حصہ ہمارے شرکاء کا ہے۔ تو جو حصہ ان کے شرکاء کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچ سکتا اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکاء کو پہنچ سکتا ہے۔ کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کی نظر میں ان کے شرکاء نے ان کی اولاد کے قتل کو ایک مستحسن فعل بنا دیا ہے تاکہ ان کو تباہ کریں اور تاکہ ان کے دین کو ان کے لیے بالکل گھپلا کر دیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے تو ان کو چھوڑو اپنے اسی افترا میں پڑے رہیں۔ اور کہتے ہیں فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں کھیتی ممنوع ہے، ان کو نہیں کھا سکتے مگر وہی جن کو ہم چاہیں، اپنے گمان کے مطابق۔ اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پیٹھیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں اور کچھ چوپائے ہیں جن پر خدا کا نام نہیں لیتے، محض اللہ پر افترا کے طور پر۔ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں فلاں قسم کے چوپایوں کے پیٹ میں جو ہے وہ بس ہمارے مردوں کے لیے خاص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔ عنقریب اللہ ان کو ان کی اس تخصیص کی سزا دے گا۔ بے شک وہ حکیم و علیم ہے۔ وہ لوگ نامراد ہوئے جنھوں نے محض بے وقوفی سے، بغیر کسی علم کے اپنی اولاد کو قتل کیا اور اللہ نے ان کو جو روزی بخشی اس کو اللہ پر افترا کر کے حرام ٹھہرایا۔ یہ گمراہ ہوئے اور ہدایت پانے والے نہ بنے۔ ۱۳۶ - ۱۴۰

۲۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ (۱۱۸ - ۱۲۰)

مشرکانہ توہمات کے تحت حرام سمجھے جانے والے چوپایوں کو کھانے کا حکم

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جب اسلام نے وہ تمام چوپائے حلال و طیب قرار دے دیے جن کو مشرکین نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت حرام قرار دے رکھا تھا تو اس کے خلاف انھوں نے بڑا ہنگامہ اٹھایا کہ یہ دیکھو، اس شخص نے اپنے پیروؤں کے لیے وہ چیزیں بھی جائز کر دی ہیں جو ہمارے بزرگوں — ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ — کے زمانے سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ اس طرح کے معاملات میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، عام ذہن بڑا حساس اور ضعیف الاعتقاد ہوتا ہے اس وجہ سے مخالفانہ پروپیگنڈے کا اثر آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ قرآن نے یہاں اسی اثر کو دور کرنے کے لیے فرمایا کہ حرام وہی چیزیں ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کر دی ہیں تو ان مشرکین کی تحریم و تحلیل کی کوئی پروا نہ کرو۔ جو چیزیں شریعت الٰہی میں حلال ہیں ان کے باب میں اس کے سوا کوئی قید نہیں ہے کہ بوقت ذبح ان پر خدا کا نام لیا جائے۔ اگر خدا کا نام لیا گیا ہے تو ان کو بے تکلف کھاؤ اور ان مشرکین کے پروپیگنڈے کو کوئی اہمیت نہ دو۔

اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ۔ (اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو) تاکید اور تنبیہ بلکہ ایک قسم کی تہدید بھی ہے۔ یعنی اللہ کی آیات پر ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ خدا کے احکام کے مقابل میں مشرکوں کے بے بنیاد پروپیگنڈے کی کوئی پروا نہ کرو۔ تحریم و تحلیل کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اگر کسی اور کے لیے بھی یہ حق تسلیم کر لیا جائے تو یہ خدا کے حقوق میں دوسرے کو حصہ دار بنانا ہے اور یہ شرک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ صرف ایک چیز کے کھانے اور نہ کھانے کا نہیں ہے بلکہ جن چیزوں کو مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھہرایا گیا ہے اللہ کی طرف سے ان کی حلت کے اعلان کے باوجود ان سے اجتناب کرنا گویا بالواسطہ شرک کو تسلیم کرنا ہوا اس وجہ سے یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ توحید کا تقاضا، جیسا کہ آگے بیان آ رہا ہے، یہ ہے کہ آدمی شرک ظاہر اور شرک باطن دونوں سے اپنے آپ کو پاک رکھے۔

جائز چیزوں سے توہمات کی بنا پر احتراز فتنہ ہے

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ

مطلب یہ ہے کہ جب خدا کی طرف سے وضاحت ہو چکی کہ حرام کیا کیا چیزیں ہیں تو اب خدا پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں کے لیے اس معاملے میں تذبذب کی کہاں گنجائش رہ گئی؟ 'تفصیل' سے یہاں اشارہ اس تفصیل کی طرف بھی ہے جو اس سے پہلے کی سورتوں میں گزر چکی ہے، مثلاً سورۂ نحل کی آیات ۱۱۴-۱۱۶ میں اور

اس تفصیل کی طرف بھی ہے جو خود اس سورہ میں بیان ہوئی ہے۔ ہر چند یہاں زیر بحث مشرکانہ توہمات و عقائد کے تحت کسی چیز کو حرام سمجھنا ہے، نہ کہ مجرد ذوقی بنیاد پر کسی چیز سے احتراز ـــــ لیکن اس تاکید کے ساتھ جو جائز چیزوں کے کھانے پر زور دیا جا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک و توحید کا معاملہ دین میں اتنا اہم ہے کہ اس باب میں شریعت کسی ادنیٰ التباس کی بھی روادار نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی اس میں مسامحت برتی جاتی تو یہ بہتوں کے اندر نفاق کی پرورش کے لیے ایک پردہ فراہم کر دیتی۔ یہ تاکید گویا ایک مخلص و منافق کے درمیان امتیاز کی ایک کسوٹی کے طور پر تھی۔ جو لوگ اس تاکید کے بعد بھی ان چیزوں کے کھانے سے محترز رہتے جن سے اب تک محترز رہے تھے تو ان کا یہ احتراز ان کے اندر شرک و جاہلیت کے جراثیم کی موجودگی کی شہادت دیتا۔ انبیاء و مصلحین کے طریقۂ کار میں اس فرق و امتیاز کی بنیادی اہمیت ہے اور عقل و فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

'اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْہِ' میں اس استثنا کا بیان ہے جو حرام چیزوں کی ممانعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ حرام چیزیں بھی اس حالت میں انسان کے لیے جائز ہو جاتی ہیں جب اس کو حالتِ اضطرار پیش آ جائے۔ اس حالتِ اضطرار کے حدود و شرائط پر دوسرے مقام میں تفصیل سے ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ مشرکین اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزیں تو بے دھڑک بغیر کسی اضطرار کے بھی کھاتے تھے لیکن اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت جو چیزیں انھوں نے حرام قرار دے لی تھیں ان کو کسی حالت میں بھی ہاتھ نہیں لگاتے تھے، خواہ ان کی جان ہی پر کیوں نہ آ بنی ہو۔

'وَاِنَّ کَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَھْوَآئِہِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ'، 'ھوا' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ یوں تو اس کے معنی خواہشات کے ہیں لیکن جس سیاق میں یہ یہاں ہے اس سیاق میں اس سے مراد بدعتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ بدعتوں کی بنیاد تمام تر ظن و گمان اور خواہشوں پر ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کی تحریم یہ منسوب تو خدا کی طرف کرتے ہیں لیکن یہ تمام تر ان کی اپنی بدعات ہیں۔ خدا سے اس چیز کو کوئی تعلق نہیں۔ اس باب میں ان کے پاس خدا کی طرف سے کوئی ثبوت یا سند نہیں ہے، جس کو وہ پیش کر سکیں۔ 'کَثِیْرًا' کے لفظ میں جو پہلو ملحوظ ہے اس کی طرف اوپر آیت ۱۱۶ میں اشارہ گزر چکا ہے۔ قرآن نے یہاں ان کے اس عمل کو 'بِغَیْرِ عِلْمٍ' جو قرار دیا ہے تو یہ ایک چیلنج بھی ہے کہ اگر ان کے پاس کوئی سند یا ثبوت ہے تو اس کو پیش کریں۔ دوسری طرف یہ ان سادہ لوحوں کی غلط فہمی کا ازالہ بھی ہے جو ہمیشہ اپنے بڑوں کی غلط سے غلط بات بھی اس حسن ظن پر مانتے رہتے ہیں کہ ان کے پاس ضرور اس بات کی کوئی نہایت مضبوط دلیل ہوگی، اگرچہ ہم اس سے واقف نہیں ہیں۔

کسی چیز کو بے سند شریعت قرار دینا بدعت ہے

'اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ' اوپر آیت ۱۱۷ میں فرمایا 'ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ'، یہ ٹکڑا بالکل اس کے مقابل میں ہے۔ وہ تسلی کے لیے وارد ہوا ہے، یہ تہدید کے لیے۔

'وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ' یہ اوپر والی بات ہی کی تاکید ایک اور لطیف و دقیق پہلو سے ہے۔

شرکا اور مظاہرِ شرک دونوں کو چھوڑنے کا حکم

ہر برائی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کا باطنی پہلو، دوسرا اس کا ظاہری پہلو۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو اس کی حقیقت ہوتی ہے جس کا مسکن انسان کا نفس اور اس کا دِل ہوتا ہے، دوسرے اس کے وہ مظاہر و اشکال ہوتے ہیں جن میں انسانی زندگی کے اندر وہ نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً شرک کی ایک تو حقیقت ہے جو یہ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں کسی کو شریک ماننا، دوسرے اس کے مظاہر و اشکال ہیں مثلاً اصنام، انصاب، ازلام، بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام اور اس نوع کی دوسری چیزیں جو کسی شرکیہ عقیدے یا تصوّر کا عملی مظہر اور نشان ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے سہارے سے پروان چڑھتی اور غذا و قوت حاصل کرتی ہیں۔ اس وجہ سے اگر کسی برائی کا استیصال مقصود ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ اس بُرائی کی حقیقت اور اس کے مظاہر و اشکال دونوں کا استیصال کیا جائے۔ اس کے بغیر اس کا استیصال ناممکن ہے۔ اگر یہ خیال کر کے اشکال و مظاہر سے چشم پوشی برتی جائے کہ جب اصل بُرائی پر ضرب لگا دی گئی تو اشکال و مظاہر میں کیا رکھا ہوا ہے تو وہ برائی انہی اشکال میں پھر اپنا نشیمن بنا کر اس میں اپنے انڈوں بچوں کی پرورش شروع کر دیتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا پورا کنبہ ازسرِنو آباد ہو جاتا ہے۔

یہاں زیرِ بحث آیت میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح شرک کو چھوڑنا ضروری ہے اسی طرح شرکیہ عقائد و تصورات کی بنا پر جن چیزوں کو مقدس مان کر حرام ٹھہرایا گیا ہے ان کے تقدس اور ان کی حرمت کو بھی ختم کرو اور عام جانوروں کی طرح ان کو بھی خدا کے نام پر ذبح کرو اور بے تکلف ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر ان کے باب میں کوئی جھجک طبیعت میں باقی رہتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی شرک کی جڑ دل کے اندر باقی ہے۔ اگر جڑ باقی نہیں ہے تو آخر یہ اس کی شاخوں کو غذا کہاں سے مل رہی ہے؟ اس حقیقت کی طرف آگے بھی اسی سورہ میں یوں توجہ دلائی ہے وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۱۵۱-انعام (اور بے حیائی کی باتوں کے قریب نہ پھٹکو، خواہ ظاہری ہوں یا باطنی) اسی اصول کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکّہ کے بعد شرک کے تمام آثار و مظاہر کا یک قلم خاتمہ کر دیا۔ زیرِ بحث آیت میں لفظ 'اثم' اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مراد شرک ہی ہے۔

خیر اور مظاہرِ خیر دونوں کی نگہداشت

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جو حال برائیوں کا مذکور ہوا بعینہٖ وہی حال بھلائیوں کا بھی ہے۔ ان میں سے بھی ہر ایک کی ایک تو حقیقت ہوتی ہے اور کچھ اس کے اشکال و مظاہر ہوتے ہیں، اور جس طرح برائی کے استیصال کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ شر کے ساتھ ساتھ بچہ شر کا بھی خاتمہ کیا جائے ورنہ وہ بُرائی ختم نہیں ہوتی اسی طرح کسی بھلائی کے فروغ دینے کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی حقیقت کے ساتھ اس کے مظاہر و اشکال کو بھی فروغ دیا جائے۔ اگر مظاہر و اشکال کو فروغ نہ دیا جائے تو وہ بھلائی بھی دب دبا کر رہ جاتی ہے۔ اس کو نشو و نما نہیں حاصل ہوتی۔ اس مسئلے پر انشاء اللہ ہم اس کے محل میں گفتگو کریں گے۔ آگے اعراف

کی آیت ۱۴۲ کے تحت بھی یہ بحث آئے گی۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ۔ یہ ان لوگوں کو دھمکی ہے جو ان بے اصل بدعات کی حمایت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے بحث و مجادلہ کر رہے تھے۔ فرمایا کہ تم ان تمام بدعات کے ظاہر و باطن دونوں سے اپنے کو پاک کرو۔ رہے یہ لوگ جو اس لبس بھری فصل کی کاشت کر رہے ہیں وہ بہت جلد اس کا حاصل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ (۱۲۱)

ان مباح چیزوں کی تحریم جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو

اوپر والی آیت میں شرکیہ عقائد کے تحت حرام کی ہوئی چیزوں کو کھانے کا حکم دیا ہے جب کہ ان پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اس آیت میں اہلِ عرب کے عقیدے کی رد سے ان مباح چیزوں کو بھی کھانے کی ممانعت فرما دی جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ مشرکین نے اوپر والی حلت کی طرح اس حرمت پر بھی ہنگامہ اٹھایا اس لیے کہ ان کے ہاں کسی ذبیحہ کی حلت و طہارت کے لیے یہ چیز ضروری نہیں تھی کہ لازماً اس پر اللہ کا نام بھی لیا جائے۔ جس چیز کو وہ حلال و طیب سمجھتے تھے اور ان کے باپ دادا بھی جس کو حلال سمجھتے تھے مسلمانوں کی طرف سے اس کی حرمت کے اعلان سے ان کے مذہبی پندار کو بڑی چوٹ لگی ہوگی اور انھوں نے اپنے عوام کے جذبات مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے یہ پروپیگنڈا شروع کیا ہوگا کہ یہ لو، یہ نئے دین والے تو ہم کو اور ہمارے باپ دادا سب کو حرام خور قرار دیتے ہیں اس لیے کہ ان کے ہاں وہ جانور جائز ہی نہیں جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ سے ہمارے نزدیک ان کے اسی غوغا کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن قرآن نے ان کے اوپر والے غوغا کی طرح ان کے اس غوغا کی بھی کوئی پروا نہیں کی بلکہ صاف فرمایا کہ إِنَّهُ لَفِسْقٌ، کہ جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو کھانا فسق ہے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ اگر تم نے ان کے غوغا سے متاثر ہو کر ان کی بات مانی تو تم بھی مشرک ہو کر رہ جاؤ گے۔

ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے کی ضرورت

یہاں یہ سوال قابلِ غور ہے کہ کسی جانور کے ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لینا اس قدر ضروری کیوں قرار دیا گیا کہ اس کے بغیر اس کا کھانا ہی حرام ہو جائے؟ اس کے بعض وجوہ بالکل واضح ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اوّل یہ کہ اللہ کے نام اور اس کی تکبیر کے بغیر جو کام بھی کیا جاتا ہے وہ، جیسا کہ ہم آیت بسم اللہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، برکت سے خالی ہوتا ہے۔ خدا کی ہر نعمت سے، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، فائدہ اٹھاتے وقت ضروری ہے کہ اس پر اس کا نام لیا جائے تاکہ بندوں کی طرف سے اس کے انعام و احسان کا اعتراف و اقرار ہو۔ اس اعتراف و اقرار کے بغیر کوئی شخص کسی چیز پر تصرف کرتا ہے تو اس کا یہ تصرف

غاصبانہ ہے اور غصب سے کوئی حق قائم نہیں ہوتا بلکہ یہ جسارت اور ڈھٹائی ہے جو خدا کے ہاں مستوجب سزا ہے۔

دوم یہ کہ احترام جان کا یہ تقاضا ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرتے وقت اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ جان کسی کی بھی ہو ایک محترم شے ہے۔ اگر خدا نے ہم کو اجازت نہ دی ہوتی تو ہمارے لیے کسی جانور کی بھی جان لینا جائز نہ ہوتا۔ یہ حق ہم کو صرف خدا کے اذن سے حاصل ہوا ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ جس وقت ہم ان میں سے کسی کی جان لیں صرف خدا کے نام پر لیں۔ اگر ان پر خدا کا نام نہ لیں، یا خدا کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لے لیں یا کسی غیر اللہ کے نام پر ان کو ذبح کر دیں تو یہ ان کی جان کی بھی بے حرمتی ہے اور ساتھ ہی جان کے خالق کی بھی۔

سوم یہ کہ اس سے شرک کا ایک بہت وسیع دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ادیان کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جانوروں کی قربانی، ان کی نذر اور ان کے چڑھاوے کو ابتدائے تاریخ سے عبادات میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس اہمیت کے سبب سے مشرکانہ مذاہب میں بھی اس کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جو قوم بھی کسی غیر اللہ کی عقیدت و نیازمندی میں مبتلا ہوئی اس نے مختلف شکلوں سے اس غیر اللہ کو راضی کرنے کے لیے جانوروں کی بھینٹ چڑھائی۔ قرآن میں شیطان کی جو دھمکی انسانوں کو گمراہ کرنے کے باب میں مذکور ہوئی ہے اس میں بھی، جیسا کہ ہم اس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس ذریعۂ ضلالت کا شیطان نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسلام نے شرک کے ان تمام راستوں کو بند کر دینے کے لیے جانوروں کی جانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام کا قفل لگا دیا جس کو خدا کے نام کی کنجی کے سوا کسی اور کنجی سے کھولنا حرام قرار دے دیا گیا۔ اگر اس کنجی کے بغیر کسی اور کنجی سے اس کو کھولنے یا اس کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو یہ کام بھی ناجائز اور جس جانور پر یہ ناجائز تصرف ہوا وہ جانور بھی حرام۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں صرف یہی چیز ناجائز نہیں ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا بلکہ یہ بھی ناجائز ہے کہ کسی جانور کو اللہ کا نام لیے بغیر ہی ذبح کر دیا جائے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ صورت ہو سکتی ہے جس میں بھول چوک کو دخل ہو۔ اور یہ بھول چوک بھی معاف صرف اہل ایمان کے لیے ہے اس لیے کہ ان کے دل اور ارادے میں اللہ کا ایمان اور اس کا نام موجود ہوتا ہے۔ صرف کسی وقتی غفلت سے اس کے اظہار میں سہو ہو جاتا ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۱۲۲-۱۲۳)

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا الاٰيَة۔ یہاں 'موت' سے مراد کفر کی زندگی اور 'حیات' سے مراد ایمان کی

زندگی ہے۔ نور سے مراد وہ کتاب ہے جس کا ذکر آیت ۱۱۴۔ ۱۱۹ میں گزرا جو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے درمیان امتیاز اور حرام و حلال کی تفصیل کے لیے اتاری 'ظلمات' سے مراد وہ ظنون و اوہام اور وہ خواہشات و بدعات ہیں جن کی طرف آیات ۱۱۶ و ۱۱۹ میں اشارہ فرمایا ہے۔

اہل ایمان اور اہل کفر کی تمثیل

یہ اہل ایمان اور ان مشرکین کی تمثیل بیان ہوئی ہے کہ اہل ایمان کو اللہ نے کفر کی موت کے بعد ایمان کی زندگی بخشی ہے اور ان کو اپنی کتاب کی شکل میں ایک نور مبین عطا فرمایا ہے جس سے وہ خود بھی روشنی حاصل کر رہے ہیں، دوسروں کو بھی راہ دکھا رہے ہیں۔ کیا یہ لوگ ان لوگوں کے مانند ہو جائیں گے جن کی تمثیل یہ ہے کہ یہ اپنے سابق اوہام اور اپنی بدعات کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور ان سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ اس تمثیل کے پیش کرنے سے مقصود مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ اب تم ان شیاطین جن و انس کی غوغا آرائیوں کی پروا نہ کرو۔ تم کو خدا نے زندگی بخشی ہے تو زندگی کا پیام لے کر آگے بڑھو، تمھیں روشنی عطا ہوئی ہے تو اس روشنی میں خود بھی چلو اور دوسروں کو بھی روشنی دکھاؤ۔ اب تمھارے لیے یہ زیبا نہیں کہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے والوں کی خرافات پر کان دھرو۔

روشنی کا حق

'یَمۡشِیۡ بِہٖ فِی النَّاسِ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو روشنی ملے تو اس کا حق یہ ہے کہ اس سے خود بھی رہنمائی حاصل کرے اور لوگوں میں بھی اس کو لے کر نکلے تاکہ جن کے اندر صلاحیت ہو وہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ روشنی چھپا کر رکھنے کی چیز نہیں ہوتی بلکہ اونچی جگہ سرِ راہ رکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے اسی حکمت کو یوں سمجھایا ہے کہ جن کے پاس چراغ ہوتا ہے وہ پیمانہ کے نیچے ڈھانپ کے نہیں رکھتا بلکہ اونچی جگہ رکھتا ہے تاکہ اس کا اپنا گھر بھی روشن ہو اور دوسرے بھی اس سے راستہ پائیں۔

اہل کفر پر کفر کے مسلط ہونے کے بارے میں سنتِ الٰہی

'کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ' یعنی یہ اس تاریکی ہی میں پڑے رہنے پر جو بضد ہیں اور تمھاری دکھائی ہوئی روشنی سے وحشت زدہ ہو رہے ہیں اس سے تم دل برداشتہ نہ ہو، قانونِ قدرت یہی ہے کہ جو لوگ جس چیز کو پسند کرتے ہیں ان پر وہی چیز مسلط کر دی جاتی ہے۔ اس مضمون کو آگے آیت ۱۲۵ میں یوں واضح فرمایا ہے کَذٰلِکَ یَجۡعَلُ اللّٰہُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے) اس قانونِ الٰہی پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم ختمِ قلوب کی بحث میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

اس سنتِ الٰہی کی مزید وضاحت

'وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنَا فِیۡ کُلِّ قَرۡیَۃٍ اَکٰبِرَ مُجۡرِمِیۡہَا لِیَمۡکُرُوۡا فِیۡہَا' 'جَعَلۡنَا' یہاں 'اَمۡہَلۡنَا' کے مفہوم میں ہے اور 'کَذٰلِکَ' کا اشارہ اس صورت حال کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۱۲۱ میں فرمایا ہے۔ یہ اسی سنت اللہ کا بیان کسی قدر مختلف انداز میں ہوا ہے جو اوپر آیت ۱۱۲ میں بیان ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شیاطین جن و انس اس دعوت کی مخالفت میں جو ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے

ہیں یہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ کسی بستی میں جب دعوتِ حق بلند ہوتی ہے تو وہاں جو باطل کے علمبردار ہوتے ہیں اور جن کا اس باطل سے مفاد وابستہ ہوتا ہے اسی طرح اپنی تمام چالوں کے ساتھ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ان کو بھی ایک خاص وقت تک ڈھیل دیتا ہے تاکہ جو کمائی وہ کرنا چاہتے ہیں کر لیں۔

'وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ'، یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ یعنی وہ تو چالیں حق کے خلاف چلتے تھے لیکن یہ چالیں انھیں کے خلاف پڑیں۔ حق کی مخالفت کرنے والے حق کو نہیں بلکہ خود اپنے کو تباہ کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے سامنے ان کا انجام نہیں ہوتا اسی وجہ سے ان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی حال قریش کے اکابر مجرمین کا ہے۔ یہ بھی انھی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور بالآخر انھی کے انجام کو پہنچیں گے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ (۱۲۴)

قریش کی ایک چال اور منصبِ نبوت کا استحقاق

یہ اس چال کی ایک مثال ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب ان کے پاس اللہ کی کوئی آیت، عام اس سے کہ وہ کوئی نشانی ہو یا کوئی ہدایت و تنبیہ، آتی تو وہ یہ کہتے کہ ہم تو اس وقت تک ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک ہمیں بھی وہ رسالت نہ ملے جس کے مدعی یہ رسول لوگ ہیں، آخر ان کو کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے کہ انھیں خدا نے اپنا رسول بنایا اور ہمیں نظر انداز کر دیا، درآنحالیکہ پشتہا پشت سے قیادت و سیادت اور دولت و امارت ہمارا حصّہ ہے؟ ٹھیک یہی بات، جیسا کہ قرآن میں تفصیل سے بیان ہوئی، قریش کے اکابر کہتے تھے۔ ان کو بھی وہی گھمنڈ تھا جو ان کے پیشرو متکبرین اور مکذبینِ انبیاء کو تھا کہ اگر خدا کسی کو رسالت ہی دینے والا تھا تو کیا اس تاج کے لیے اس کو انہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا سر موزوں نظر آیا، آخر مکّہ یا طائف کے کسی سردار پر اس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ ظاہر ہے کہ یہ بات جو وہ کہتے تھے تو محض چالبازی کے طور پر کہتے تھے، اس سے مقصود ان کا محض اپنی انانیت اور خود فریبی کے لیے ایک پردہ فراہم کرنا اور اپنے عوام کو بے وقوف بنانا ہوتا تھا۔ سادہ لوح عوام دنیوی اسباب و وسائل کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ جن کو دنیا میں بڑا دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی یہی بڑے ہوں گے۔ اس ذہن کے لوگ آسانی سے اس قسم کے چکموں میں آجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس بات کو مکر سے تعبیر کیا ہے یعنی یہ ایک سیاسی اشتغلا تھا۔

قریش کو منہ توڑ جواب

'اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ' یہ ان متکبرین کو جواب ہے اور گو لفظاً سخت نہیں ہے لیکن معناً بہت سخت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ منصبِ رسالت ایسی چیز نہیں ہے جس کا اہل ہر کس و ناکس بن جائے

یہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ تاج وہ کس کے سر پر رکھے۔ یہ مخمل اور زربفت کی جھول نہیں ہے جو بسا اوقات گدھوں پر بھی نظر آ جاتی ہے بلکہ یہ خلعتِ الٰہی اور تشریف آسمانی ہے جو انھیں کو نصیب ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرمائے۔

منصبِ نبوت اور نبی کا مقام

اس ٹکڑے سے جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ نبوت و رسالت ایک موہبت ربانی اور ایک عطیۂ الٰہی ہے جو صرف اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے لیے انتخاب فرمائے وہیں یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے انتخاب انھی کو فرماتا ہے جو اپنی اکتسابی صلاحیتوں اور خوبیوں کے اعتبار سے نوعِ انسانی کے گل سرسبد نخل فطرت کے بہترین ثمر اور کمال انسانیت کے مظہر اتم ہوتے ہیں۔

'سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِیۡدٌۢ بِمَا كَانُوۡا یَمۡكُرُوۡنَ'، 'اَجۡرَمُوۡا' میں اگرچہ ان کے وہ تمام جرائم اور ان کی وہ ساری چال بازیاں شامل ہیں جن کے وہ مرتکب ہوئے لیکن یہاں اس سے ان کے اس استکبار کی طرف خاص اشارہ ہو رہا ہے جس کا اظہار انھوں نے لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰی نُؤۡتٰی مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ میں کیا۔ اسی استکبار کے تعلق سے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت بھی ہے اور عذاب شدید بھی۔

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ یَّهۡدِیَهٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَمَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّهٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ یَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسۡتَقِیۡمًا ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّذَّكَّرُوۡنَ ۝ لَهُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَهُوَ وَلِیُّهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۱۲۵ - ۱۲۷)

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰهُ الاٰیۃ۔ 'حَرَجٌ' جھاڑیوں سے بھری ہوئی تنگ جگہ کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ 'ضَیِّقٌ' کے بعد اس کی تاکید مزید کے طور پر آیا ہے۔ 'تَصَعُّدٌ' تکلف اور بہ مشقت کسی بلندی پر چڑھنے کے لیے معروف ہے۔ لفظ 'سماء' جس طرح آسمان اور بادلوں کے لیے آتا ہے اسی طرح فضا اور اس کی بلندی کے لیے بھی آتا ہے مثلاً كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ ۲۴- ابراہیم (کلمہ طیبہ کی مثال ایک بار آور درخت کی ہے جس کی جڑ زمین میں گہری اتری ہوئی ہو اور اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں)

ایمان سے گریز کی اصل علت

اب یہ اصل علت بیان ہو رہی ہے ان کے ایمان نہ لانے کی۔ وہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی توفیق ہدایت سے محروم ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری سخن سازیاں اور تمام چالبازیاں تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اصل چیز جو ان کے لیے قبول اسلام میں مانع ہے کفر و شرک کی وہ نجاست ہے جس کے ردے پہ ردے ان کے دلوں پر جم گئے ہیں، جس کے سبب سے ان کو اسلام کا راستہ ایک کٹھن چڑھائی معلوم ہوتا ہے، جس کے تصور سے ان کا سینہ بھنچتا اور دم الجھتا ہے گویا ان کو ایک بلند چڑھائی چڑھنی پڑ رہی ہے۔ جن کے دلوں پر یہ نجاست جم جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے سینے اسلام کے لیے تنگ کر دیتا ہے، جیسا کہ اوپر كَذٰلِكَ زُیِّنَ لِلۡكٰفِرِیۡنَ مَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۱۲۲ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا۔ اسلام کے لیے سینے کھلتے ان کے ہیں جن کے سینے اس قسم کے جھاڑ جھنکاڑ سے صاف ہوتے ہیں۔

یہ چیز چونکہ بالکل سنت الٰہی کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوب اپنی طرف فرمایا ہے۔ اس کو اس روشنی میں سمجھنا چاہیے جس روشنی میں اس کی وضاحت ہم اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔

هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ط الاٰیۃ۔ چونکہ اشارہ کے اندر فعل کے معنی پائے جاتے ہیں اس وجہ سے 'مُسْتَقِيمًا' یہاں 'صراط' سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اسلام ہے تو خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ، فطرت کی صراط مستقیم، نہ اس میں پیچ وخم ہیں، نہ چڑھائیاں اور گھاٹیاں لیکن جنھوں نے اپنے اوپر اتنی غیر فطری نجاستیں لاد رکھی ہوں ان کو یہ راہ دشوار گزار معلوم ہو رہی ہے۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ یعنی اس کے دین فطرت اور ملت ابراہیمؑ ہونے کے سارے دلائل تفصیل سے ہم نے بیان کر دیے ہیں لیکن دلائل کارآمد ان کے لیے ہوتے ہیں جن کے اندر یاددہانی حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کا ارادہ پایا جاتا ہے۔

'لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' یہ صلہ بیان ہوا ہے ان لوگوں کا جن کے سینے اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے کھولتا ہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے اس اسلام کے صلہ میں دارالسلام، سکھ اور چین کا گھر ہوگا اور اللہ ان کا ساتھی ہوگا جب کہ اسلام کے معاندین کے لیے ذلت اور عذاب کا گھر ہوگا اور ان کے ساتھی وہ شیاطین جن وانس ہوں گے جن کے القائے شیطانی کو قبول کر کے یہ گمراہ ہوئے۔ یہ ٹکڑا اوپر والے ٹکڑے 'سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا' کے بالکل بالمقابل ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ج يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ج وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ط قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ہ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ہ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ط قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ہ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ط وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (۱۲۸-۱۳۲)

ذریت ابلیس کی عیاری اور ذریت آدم کی سادہ لوحی

'وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا'، 'هُمْ' سے مراد وہی اکابر مجرمین ہیں جن کا ذکر آیات ۱۲۳-۱۲۴ میں گزرا اور 'جَمِيْعًا' کی تاکید اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ شیاطین انس کے ساتھ ساتھ وہ شیاطین الجن بھی جمع کیے جائیں گے جن کے القاء والہام کی انھوں نے پیروی کی، جیسا کہ اوپر آیت ۱۱۲ سے ان کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ ان سب کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جمع کر کے شیاطین الجن کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ 'يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ' (اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا) ظاہر ہے کہ یہاں جنوں کے گروہ' سے مراد جنوں کی پوری امت نہیں ہے بلکہ ان کے اندر کا وہی گروہ مخاطب ہے جس نے اپنے مرشد و پیشوا ابلیس

کی پیروی کی جو خود بھی، جیسا کہ قرآن سے ثابت ہے، جنوں ہی میں سے تھا اور جس نے آدم کو دھوکا دیا اور سجدے کے حکم کی تعمیل سے انکار کرتے ہوئے بڑے فخر سے دعویٰ کیا تھا کہ اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا۔ ۶۲ بنی اسرائیل (بھلا یہ ہے وہ جس کو تونے میرے اوپر فضیلت بخشی ہے، اگر تونے مجھے قیامت تک کے لیے مہلت دی تو میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا صرف تھوڑے ہی مجھ سے بچ رہیں گے) دوسرے مقام میں ہے لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ۔ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ۱۶-۱۷ اعراف (میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے دہنے سے ان کے بائیں سے ان کی راہ ماروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا) یہاں اصحاب ذوق آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ 'اسْتَكْثَرْتُمْ' کے لفظ میں نہایت لطیف تلمیح ہے ابلیس کے قول وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ اور لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا کی طرف۔ یعنی اللہ تعالیٰ ابلیس کے ان فرزندان معنوی کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ تم نے تو اپنے پیشوا ابلیس کا منشا بڑی کامیابی سے پورا کیا کہ ذریت آدم میں سے بہتوں کو اپنے فتراک ضلالت کا نخچیر بنا لیا اور بڑی معاونت مند نکلی یہ آولاد آدم کہ اس سادہ لوحی کے ساتھ تمھارے دام فریب میں پھنس گئی۔

شیطان کے پیروؤں کا اعتراف آخرت میں

قَالَ اَوْلِیٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَاۤ اَجَلَنَا الَّذِیْۤ اَجَّلْتَ لَنَا، انسانوں میں سے جو لوگ ان شیاطین جن کے ساتھی بنے ہوں گے وہ اس پر بولیں گے کہ اے ہمارے پروردگار، ہم نے ایک دوسرے کی معیت و رفاقت سے دنیا میں خوب حظ اٹھایا یہاں تک کہ اس یوم الحساب کو پہنچ گئے جو تونے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔ 'حظ اٹھانے' سے مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے آلۂ کار رہے، ہم نے ان کی پوجا کی، ان کے تھانوں پر نذریں اور قربانیاں پیش کیں اور ان کے کہنے پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنایا، اسی طرح ہمارے کاہنوں، ساحروں اور سیانوں نے ان کو اپنے مقاصد مزعومہ کے لیے طرح طرح سے استعمال کیا، یہاں تک کہ یہ دن آگیا اور ہمیں اپنے اس عمل کے انجام پر غور کرنے کی توفیق نہ ملی۔ یہ واضح رہے کہ عرب جاہلیت میں جنوں کو عربوں کی مذہبی اور سماجی زندگی میں بڑا دخل ہو گیا تھا، کہانت اور ساحری کی ساری گرم بازاری تو ان کے دم قدم سے تھی ہی، شاعری تک کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ یہ جنات الہام کرتے ہیں اور ہر بڑے شاعر کے ساتھ کوئی نہ کوئی جن ضرور ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہ کہتے تھے کہ ان کے ساتھ کوئی جن ہے۔ ہر وادی کے الگ الگ جن مانے جاتے تھے اور سفر، حضر، جنگ، صلح اور فتح کے معاملات میں ان کے تصرفات کا بڑا دخل سمجھا جاتا تھا۔

بلاغت کا ایک نکتہ

یہاں بلاغت کلام کا ایک نکتہ قابل لحاظ ہے۔ شیاطین انس یہ بات بطور اعتراف جرم اور بقصد اظہار ندامت کہیں گے اور یہ تمہید باندھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرنا چاہیں گے لیکن اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بات تمہید پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دے گا اور

ان کو معذرت اور درخواست معافی کا موقع دیے بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دے گا کہ اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ، بس اب تمہارا ٹھکانا یہی دوزخ ہے جس میں تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، اب باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو، عذر، معافی، توبہ اور اصلاح سب کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔

آخرت کا خلود مقید بمشیت الٰہی ہوگا

یہاں ایک اور چیز بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ کے بعد اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کے الفاظ بھی ہیں جس سے بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلود مقید بمشیت الٰہی ہے۔ اسی طرح کا اسلوب سورۂ ہود میں بھی ہے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ، ہود (وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں، مگر جو تیرا رب چاہے) اس استثنا کے باب میں ہمارے ارباب تاویل کو تردد پیش آیا ہے اس لیے کہ اس سے بظاہر یہ بات نکلتی ہے کہ یہ خلود اس معنی میں خلود نہیں ہے جس معنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی کوئی نہایت ہی نہیں ہے بلکہ وہ طول مدت کے مفہوم میں ہے، اگرچہ یہ مدت کتنی ہی طویل ہو۔ بعض لوگوں نے اس سے بچنے کے خیال سے 'ما' کو 'من' کے معنی میں لیا ہے لیکن اوّل تو یہ عربیت کے خلاف ہے، ثانیاً اس سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ یہ استثنا بہرحال انہی مستحقین خلود ہی میں سے ہوگا جن کا ذکر ہے تو پھر فرق کیا ہوا، خلود تو پھر بھی غیر منتہی خلود کے معنی میں نہیں رہا، اگرچہ انہی کے حد تک سہی جن کو مشیت الٰہی اس سے مستثنیٰ قرار دے؟ میرے نزدیک 'مَا شَآءَ اللّٰهُ' اور 'مَا شَآءَ رَبُّكَ' کی قید یہاں اس خلود کے منتہی ہونے کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ ان مجرمین کے لیے اس عذاب نار میں گرفتار ہو جانے کے بعد امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے، کسی کی سعی، کسی کی سفارش، کسی کا زور، کسی کی فریاد کچھ کارگر نہ ہوگی، اختیار و ارادے کی ساری حدیں ختم ہو جائیں گی، توبہ اور اصلاح اور حسرت و ندامت کی مہلتیں گزر جائیں گی۔ واحد چیز جو کارفرما ہوگی وہ خدا کی مشیت ہے اور اپنی مشیت کے بھید وں کو وہی جانتا ہے۔ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ اور حکیم و علیم ہے۔ قرآن سے جو بات نکلتی ہے وہ تو اسی حد تک ہے۔ جن لوگوں نے اس حد سے آگے بڑھ کر اس سے کچھ اور نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے ان کے نتائج کو ان کے دلائل کی کسوٹی پر جانچیے۔ قرآن پر ان کی ذمہ داری ڈالنا صحیح نہیں ہے۔ ویسے یہ امر یاد رہے کہ خلود اور ابدیت کے مسائل ایسے نہیں ہیں جن کا احاطہ انسان کا محدود علم کر سکے۔ اگر انسان ان چیزوں کے چکر میں پڑے تو بات متشابہات کے حدود میں نکل جاتی ہے جن میں پڑنے سے ہم کو روکا گیا ہے۔ اس وجہ سے سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ جتنی بات خدا نے بتا دی ہے اس کو مانیے اور اس کے آگے کے مراحل کو خدا کے علم کے حوالہ کیجیے۔

شیاطین کے تسلط کی علت

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا الاية یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف جو اوپر يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ کے ٹکڑے میں مذکور ہوئی اور وَلّٰی، تولية فلانا الامر، کے معنی ہیں فلاں کو اس پر حاکم، والی اور قابض بنا دیا اور اس پر مسلط کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو شیاطین جن نے بے شمار انسانوں پر اپنا تسلط جما لیا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان شیاطین کو انسانوں پر اختیار ملا ہوا تھا بلکہ اس کا سبب خود

ان کے اعمال ہوئے ہیں۔ انھوں نے خدا کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہشات و بدعات کی پیروی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شیطان کے پیرو بن گئے اور اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو لوگ شیاطین کے پیرو بن جاتے ہیں ان پر وہ شیاطین کو مسلط کر دیتا ہے۔ ظالمین سے مراد یہاں کفر و شرک کی راہ اختیار کرنے والے ہیں۔ یہ مضمون پوری تفصیل سے پیچھے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی مختلف شکلوں میں بیان ہو گا۔

سوال بطور قطع عذر

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا۔ یہ سوال ان سے بطور قطع عذر کے ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ شامت زدو، کیا تمھارے پاس تمھی میں سے میری آیتیں سناتے اور اس دن کی آمد سے ہوشیار کرتے ہوئے رسول نہیں آئے؟ پھر تم نے آخر اپنی یہ شامت کیوں بلائی؟ رسول نہ آئے ہوتے تو تم کوئی عذر پیش کر سکتے تھے، اب کیا عذر پیش کر سکتے ہو؟ تم نے تو سب کچھ سن اور سمجھ کے اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند رکھے۔

جنوں کے رسول انھی کے اندر سے ہوتے ہیں

'رُسُلٌ مِّنْكُمْ' سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر انسانوں ہی میں سے رسول بھیجے اسی طرح جنوں کے اندر جنوں میں سے رسول بھیجے۔ انبیا و رسل کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اور جو تفصیل سے قرآن میں بیان ہوئی ہے اس کا لازمی اقتضا بھی یہی ہے کہ جنوں کے اندر انھی کے اندر سے رسول آئیں جو ان کی بولی بولیں، ان کی ضروریات و حالات کے مطابق ان پر اللہ کی حجت تمام کریں۔ اتمام حجت انبیاء و رسل کی بعثت کا اصل مقصد ہوتا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ہر گروہ کے اندر ان کی فطرت کے مطابق رسول آئیں۔ انسان اور جن دو مختلف نوعیں ہیں۔ دونوں کے مسائل اگر کل نہیں تو بیشتر الگ الگ ہیں۔ اشتراک ہو سکتا ہے تو عقائد اور اخلاق کے بعض اصولوں میں ہو سکتا ہے، شریعت، قانون، معاشرت کے مسائل تو لازماً الگ الگ ہوں گے۔ پھر رسول جو اسوہ اور نمونہ بن کر آتے ہیں اگر ان کے اندر سے نہ ہوئے تو وہ ان کے لیے اسوہ اور نمونہ کیسے بن سکتے ہیں؟ جب ہم انسانوں کے لیے جنات میں سے کوئی رسول اسوہ نہیں بن سکتا تو انسانوں میں سے کوئی رسول جنوں کے لیے کیسے اسوہ بن سکتا ہے؟ ہر قوم کا رسول ان کے اندر سے ہونے کا خاص پہلو، اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے یہی ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ گویا اس قوم پر خود اس کی زبان، خود اس کے ضمیر، خود اس کے ایک بھائی اور خود اسی کے ایک فرد کامل کے ذریعے سے اس پر حجت قائم کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جنات قیامت کے روز اس سوال کے جواب میں یہ عذر کر سکتے تھے کہ اے رب ہم جنات کے لیے کسی غیر جن کا قول و عمل کس طرح حجت ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جس طرح جنوں کے اشرار (شیاطین) اور انسانوں کے اشرار (شیاطین) میں حق کی مخالفت کے لیے سنگھٹن ہو جایا کرتا ہے، جیسا کہ اوپر کی آیات میں بیان ہوا، اسی طرح بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ جنوں کے اندر جو ابرار و صالحین ہیں ان کی طرف سے اس حق کی بھی تائید ہوتی ہے جو انسانوں کے انبیاء و صالحین کے ذریعے سے ظاہر ہوا ہے اس لیے کہ حق، اصولی حیثیت سے نہ صرف انسانوں اور جنوں کے درمیان ایک متاع مشترک

کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ تمام کائنات کی متاع مشترک ہے۔ اس مسئلے پر انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ جن میں بحث کریں گے۔ یہاں اس اشارے پر کفایت کیجیے۔

'یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ' میں ممکن ہے کسی کو 'یَقُصُّ' کا لفظ آیات سنانے کے لیے کھٹکے اس لیے کہ اس لفظ کا معروف استعمال سرگزشتیں سنانے ہی کے لیے ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں یہ لفظ اس وجہ سے استعمال ہوا ہے کہ آیات سے یہاں مراد آیات انذار ہیں جن کا غالب حصہ مکذبین و منکرین کے انجام اور ان کی سرگزشتوں کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں موقع و محل اسی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے جو سوال فرمائے گا اس کا مطلب یہی ہوگا کہ کیا تمھیں میرے رسولوں نے جھٹلانے والوں کے انجام اور اس دن کی آمد سے خبردار نہیں کیا تھا کہ تم نے اپنے آپ کو اس ابدی ہلاکت میں ڈالا۔

اپنی گواہی خود اپنے خلاف

قَالُوْا شَہِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْہُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَشَہِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ اَنَّہُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ۔ بعینہٖ یہی بات سورۂ ملک میں یوں بیان ہوئی ہے۔ کُلَّمَآ اُلْقِیَ فِیْہَا فَوْجٌ سَاَلَہُمْ خَزَنَتُہَآ اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَذِیْرٌ o قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ فَکَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ o وَقَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ o فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِہِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۹-۱۱ ملک (جب جب اس میں جھونکی جائے گی کوئی پارٹی، دوزخ کے داروغے اس سے سوال کریں گے، کیا تمھارے پاس کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے، ہاں، بے شک ہمارے پاس آگاہ کر دینے والا آیا تھا لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہا کہ خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے، تم لوگ تو ایک بڑی گمراہی میں مبتلا ہو۔ اور وہ کہیں گے اگر ہم سننے اور سمجھنے والے لوگ ہوتے تو دوزخ میں پڑنے والے نہ بنتے۔ پس وہ اپنے جرم کا اعتراف کرلیں گے، پس دفع ہوں یہ دوزخ والے) آیت کے بیچ میں 'غَرَّتْہُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا' کے الفاظ بطور جملہ معترضہ کے اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ جس بات کا آج اس جسارت سے انکار کر رہے ہیں، کل اس بے بسی کے ساتھ اس کا اعتراف کریں گے اور اپنے خلاف خود گواہ بنیں گے کیونکہ آج ان کے انکار کی بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس دنیا کی ظاہر فریبی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اس دنیا کا کارخانہ چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں چل رہا ہے بلکہ ابتلا کے اصول پر چل رہا ہے، جس میں حق کے ساتھ باطل کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے اس وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جزا و سزا ہے ہی نہیں اور نبی جو کچھ کہتے ہیں یہ محض ہوائی باتیں ہیں۔

عذاب سے پہلے اتمام حجت

ذٰلِکَ اَنْ لَّمْ یَکُنْ رَّبُّکَ مُہْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَہْلُہَا غٰفِلُوْنَ۔ یہ وجہ بیان فرمائی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ اہتمام کیا گیا کہ ہر قوم کے اندر، خواہ انسان ہوں یا جن، انھی کے اندر سے رسول آئیں۔ فرمایا کہ ایسا اس لیے ہوا کہ تیرے رب کی رحمت سے یہ بات بعید تھی کہ وہ کسی قوم کو اس کے کفر و شرک پر، اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیے بغیر، ان پر عذاب بھیج دے۔ وہ کسی کو سزا

دیتا ہے تو اس سے پہلے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیتا ہے تاکہ وہ توبہ و اصلاح کرنا چاہیں تو توبہ و اصلاح کرلیں اور اگر نہ کرنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر اس کے نتائج بھگتیں۔

دوزخ میں جرائم کے اعتبار سے درجہ بندی

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ لفظ 'کل' پر ہم مختلف مقامات میں لکھ چکے ہیں کہ جب یہ اس طرح آتا ہے تو اس سے مراد وہی اشخاص یا پارٹیاں ہوتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد جنوں اور انسانوں کے وہی گروہ ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا۔ فرمایا کہ انھوں نے جو کچھ کیا، جان بوجھ کر، خدا کی طرف سے اتمام حجت کے بعد کیا، اس وجہ سے حق ہے کہ وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں اور جن کے جس درجہ کے جرائم ہیں اسی اعتبار سے وہ دوزخ میں اپنا مقام پائیں۔ چونکہ اللہ ان کے اعمال سے جو یہ کرتے رہے ہیں یا کرتے ہیں اچھی طرح باخبر ہے اس وجہ سے اس کو ان کی درجہ بندی میں کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سزاوار ہوگا۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۝ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۳۳-۱۳۵)

قریش کو براہ راست دھمکی

اوپر جو باتیں بیان ہوئی تھیں اگرچہ واضح طور پر ان کا رخ قریش ہی کی طرف تھا لیکن ان کی نوعیت اصولی باتوں کی تھی۔ اب یہ صاف صاف قریش کو مخاطب کر کے دھمکی دی کہ جہاں تک اتمام حجت کا تعلق ہے اس کا سامان خدا نے تمھارے لیے بھی کر دیا ہے۔ اب تمھاری قسمت بھی میزان میں ہے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو خدا کی پکڑ میں آجاؤ گے اور جب اس کی پکڑ میں آجاؤ گے تو پھر اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے۔

اتمام حجت کا اہتمام خدا کی رحمت کا تقاضا ہے

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ فرمایا کہ تمھارا خداوند غنی اور بے نیاز بھی ہے اور رحمت والا بھی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ صفات جب اس طرح حرف عطف کے بغیر بیان ہوتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ صفتیں موصوف میں بیک وقت موجود ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں غنی بھی ہے اور رحمت والا بھی۔ اپنی صفت غنا کی وجہ سے اس کو کسی کی پروا نہیں۔ وہ سب سے بے نیاز، سب سے مستغنی اور سب سے بے پروا ہے۔ سب اس کا انکار کر دیں تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ سب اس کی حمد کے ترانے گائیں تو اس کا کچھ نہیں بنتا۔ وہ اگر اپنے رسول بھیجتا ہے، کتاب اتارتا ہے، ایمان و اسلام کی دعوت دیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ لوگوں کے ایمان و اسلام کے بغیر اس کا کوئی کام اٹکا ہوا ہے بلکہ یہ سب کچھ اس لیے کرتا ہے کہ بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رحمت والا بھی ہے۔ اس کی اس رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ لوگوں پر اپنی حجت تمام کیے بغیر ان کو نہیں پکڑتا بلکہ ان پر حجت تمام کرنے کے لیے سارے جتن کرتا ہے اور اس وقت

تک وہ لوگوں کو مہلت دیتا ہے جب تک وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر نہ لیں۔ یہ تمہید ہے اس بات کی جو آگے آ رہی ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری ان تمام سرکشیوں کے باوجود جو تمھاری پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ خدا پکڑ نہیں سکتا یا تمھارے فنا ہو جانے سے اس کی دنیا اجڑ جائے گی اور پھر اس کے آباد کرنے والے نہیں ملیں گے بلکہ اس کا واحد سبب اس کی رحمت ہے۔ ورنہ اگر وہ تم کو فنا کرنا چاہے تو جب چاہے فنا کر دے اور تمھاری جگہ جس چیز کو چاہے دے دے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تمھارے قیاس سے بالاتر ہو۔ آخر تم بھی تو اس زمین پر روزِ ازل سے نہیں ہو۔ تم سے پہلے اسی ملک میں دوسری قومیں آباد تھیں جن کی تاریخ تمھیں سنائی جا چکی ہے اور جن کے آثار اس ملک میں موجود ہیں۔ تمھاری ہی طرح خدا نے ان کی طرف بھی رسول بھیجے لیکن انھوں نے سرکشی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فنا کر دیے گئے اور بالآخر تم ان کے وارث ہوئے تو جس خدا نے ان کو مٹا کر تمھیں ان کا وارث بنایا، اگر وہ تمھیں مٹا کر دوسروں کو تمھارا وارث بنا دے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے گا۔ تمھاری تو اپنی ہی تاریخ تمھارے اوپر حجت ہے۔

زبان کا ایک نکتہ

اس آیت میں زبان کا ایک نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ فرمایا کہ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ حالانکہ بظاہر مَنْ يَّشَآءُ ہونا تھا اس لیے کہ 'ما' کا غالب استعمال بے جان چیزوں ہی کے لیے ہے۔ میرے نزدیک 'من' کی جگہ 'ما' کا استعمال اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت کے اظہار اور قریش کے غرور پر ضرب لگانے کے لیے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قوت و سطوت پر کیا اترا رہے ہو، خدا کی قدرت تو وہ ہے کہ وہ تمھارے اس صحرا کی جس چیز کو چاہے تمھاری جگہ لینے کے لیے اٹھا کھڑی کرے۔ سیدنا مسیحؑ نے بھی ایک جگہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم اس بات پر گھمنڈ نہ کرو کہ تم ابراہیم کی اولاد ہو، میرا خداوند چاہے تو ریگستان کے ذروں سے ابراہیم کے لیے اولاد کھڑی کر دے۔ بعینہٖ یہی زور قرآن کے اس اسلوب میں مضمر ہے بلکہ قرآن کا اسلوب اپنی تعمیم کے پہلو سے زیادہ زوردار ہے۔

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ۔ 'تُوْعَدُوْنَ' میں وہ عذاب بھی داخل ہے جس کی، رسول کی تکذیب کی صورت میں، ان کو دھمکی سنا دی گئی تھی اور وہ یوم الحساب بھی جو اس کائنات کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ فرمایا کہ یہ دونوں باتیں شدنی ہیں اور جب ان کا ظہور ہوگا تو تم خدا کے قابو سے کسی طرح باہر نہ نکل سکو گے۔ 'اعجزه الشیء، فاته ولم یقدر علیه' 'اعجزه الشیء' کے معنی ہوں گے کہ فلاں چیز اس کے قبضہ سے نکل گئی، وہ اس پر قابو نہ پا سکا۔ اس دھمکی میں یہ بات مضمر ہے کہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو یہ چیز تو آ کے رہے گی۔

پیغمبر کی طرف سے اعلانِ براءت اور دھمکی

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ۔ اس میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق ایک مقابل محذوف ہے۔ یعنی اِنِّىْ عَامِلٌ عَلٰى مَكَانَتِىْ۔ 'مَكَانَة' کے معنی جگہ، منزلت اور مقام کے ہیں۔ قرآن میں یہ جگہ جی

کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ ۶۷۔ یٰس (اگر ہم چاہتے ان کی جگہ ہی پر ان کو مسخ کر دیتے) طریقہ کا مفہوم اس لفظ کے لوازم میں سے ہے۔ جب ہم کہیں گے تم اپنی جگہ کام کرو، میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں تو طریقہ کا مفہوم اس کے اندر آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنے مقام کفر اور موقف مخالفتِ حق سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہو تو کر دکھو کرنا چاہتے ہو، میں بھی اپنے موقف سے انچ برابر ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اعملوا کے مقابل میں اِنِّیْ عَامِلٌ میں زیادہ زور دیا ہے اس لیے کہ صفت اور فاعل کے صیغے فعل کے بالمقابل دوام، استمرار، استقلال اور عزم و جزم کو ظاہر کرتے ہیں۔ الفاظ کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ یہ پیغمبر کی طرف سے صاف صاف برأت کا اعلان اور نہایت واضح الفاظ میں دھمکی ہے۔

اصل دھمکی — 'فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ' یہ اصل دھمکی ہے۔ یعنی تم بہت جلد دیکھ لوگے کہ انجام کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ 'عاقبۃ' کا لفظ یوں تو انجام کے معنی میں معروف ہے ہی خواہ نیک انجام ہو یا بد لیکن بعض اوقات یہ مخصوص طور پر انجام خیر و فلاح ہی کے معنی میں آتا ہے۔ یہ گویا لفظ کا استعمال اس کے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے ہوتا ہے اس لیے کہ قابلِ ذکر انجام تو وہی ہے جو اس فلاح و سعادت پر منتہی ہو جو اصل غایت ہے اس کائنات کی تخلیق کی نہ کہ نامرادی و خسران کا انجام جو اس غایت سے انحراف کا لازمہ ہے۔ چنانچہ یہ لفظ فلاح و سعادت کے مفہوم میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۴۹ (پس ثابت قدم رہو، عاقبت کار کی کامیابی اہل تقویٰ ہی کے لیے ہے) وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۱۳۲ طٰہٰ (اور انجام کار کامیابی تقویٰ کے لیے ہے) الدار سے مراد، دار آخرت ہے۔ اس لیے کہ اصل نتائج کے ظہور کی جگہ وہی ہے۔ اہل ایمان دنیا میں جو جد و جہد کرتے ہیں وہ اسی کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ اہل ایمان کو دنیا میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہے اگرچہ کامیابی وہ بھی ہے لیکن وہ فیصلہ کن نہیں ہے، اس لیے کہ اصل گول یہ دنیا نہیں ہے، اصل گول آخرت ہے۔ جب تک وہ گول نہ جیتا جائے اس وقت تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس کی جیت رہی اور کون ہارا۔ اس میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ اس دنیا میں مخالفین حق کو جو دندنانے کا موقع دیا جاتا ہے یہ اترانے کی چیز نہیں ہے، یہ عارضی ڈھیل ہے۔ کل انھیں پتہ چلے گا کہ اصل کامیابی کس کو حاصل ہوتی۔

انجام کار کی کامیابی صرف اہل ایمان کا حصہ ہے — 'اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ'، اوپر والے ٹکڑے میں جو بات مبہم رہ گئی تھی وہ اس ٹکڑے میں صاف کر دی گئی۔ اوپر یہ فرمایا تھا کہ تم دیکھ لوگے کہ عاقبت کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ اب یہ بتا دیا کہ انجام کار کی کامیابی میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو کافر و مشرک اور حق تلف و ناسپاس ہوں گے۔ یہ بات جس حقیقت پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے وجود سے شہادت دیتی ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیم و علیم اور عادل و رحیم کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ انجام کار کی کامیابی ان لوگوں کو بخشے جو ظلم و شرک کے مرتکب ہوئے۔

بات بالکل اصول کے رنگ میں

یہاں یہ پہلو خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ بات بالکل اصول کے رنگ میں فرمائی، من و تو کے انداز میں نہیں فرمائی۔ یہ نہیں فرمایا کہ انجام کار کی کامیابی ہمارا حصہ ہے یا آخرت میں فلاح ہم پائیں گے بلکہ صرف یہ فرمایا کہ آخرت کی فلاح میں ظالموں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ اسلوبِ بیان حکمت و دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مؤثر ہے اور یہ اس خشیت و توکل پر بھی دلیل ہے جو انبیاء و صالحین کے اندر ہوتی ہے۔ جو چیز پردۂ غیب میں ہے، جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے، جس کی راہ میں ابھی معلوم نہیں کتنی دشوار گزار گھاٹیاں پار کرنی اور کتنی پرخطر وادیاں قطع کرنی ہیں اس کے باب میں جو بات کہی جا سکتی ہے وہ اسی حد تک کہی جا سکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کوئی دعویٰ کرنا بندگی اور خشیتِ الٰہی کے خلاف ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ○ وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۗ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۗ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (۱۳۶-۱۴۰)

مشرکین کی بدعات کی تفصیل

اس سلسلہ بحث کا آغاز، جیسا کہ آیات ۱۱۸-۱۲۱ سے معلوم ہوا، مشرکین مکہ کی ان بدعات کی تردید سے ہوا تھا جو اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت انھوں نے تحریم و تحلیل کی نوعیت کی ایجاد کی تھیں۔ اس تردید کے جواب میں انھوں نے جو ہنگامۂ بحث و جدال کھڑا کیا اس کے تقاضے سے بیچ میں بعض مناسبِ حالات ہدایات مسلمانوں کو دی گئیں اور بعض ضروری تنبیہات مشرکین کو سنائی گئیں۔ اب یہ ان بدعات کی تفصیل آ رہی ہے تاکہ مسلمان اپنے آپ کو ان نجاستوں سے محفوظ رکھیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا، یعنی باغ، کھیتی، چوپائے سب پیدا تو کیے خدا نے لیکن ان ظالموں نے ان میں سے خدا کا جو حصہ نکالا تو اس طرح کہ دوسرے شریکوں کے ساتھ ایک حصہ خدا کے لیے بھی الگ کر دیا۔ 'هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا' یہ اسی تقسیم کی تفصیل ہے کہ اس میں سے اتنا حصہ تو اللہ کا ہے اور اتنا حصہ ہمارے شریکوں اور معبودوں کا ہے۔ اس تقسیم کے متعلق فرمایا کہ 'بِزَعْمِهِمْ' یہ تمام تر ان کے وہم و گمان پر مبنی ہے لیکن دعویٰ یہ ہے کہ یہ شریعت ابراہیمی کا حکم ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ مشرکینِ عرب نہ صرف خدا کو مانتے تھے بلکہ ہر چیز کا خالق بھی خدا ہی کو تسلیم کرتے تھے اور اس کے نام کا ایک حصہ اپنی زمینی پیداوار میں سے بھی اور اپنے گلوں میں سے بھی نکا

اور نذر و نیاز کے لیے الگ کرتے تھے۔ یہ چیز ان کے ہاں حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق خود قرآن میں ہے وَکَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ ۵۵ مریم (اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا)۔ بعد میں جب ان کے اندر مشرکانہ بدعات پھیلیں تو جس طرح خدا کے دوسرے حقوق میں ان کے فرضی معبود شریک بن بیٹھے اسی طرح اس کے نام کی زکوٰۃ بھی انھوں نے اس کے فرضی شریکوں میں تقسیم کر دی کہ اس میں سے اتنا حصہ فلاں کا، اتنا فلاں کا۔

حماقت در حماقت

'فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ' یہ ان کے ستم بالائے ستم یا ان کی حماقت در حماقت کا بیان ہے کہ اگر کوئی مجبوری یا مشکل پیش آ جائے تو خدا کا حصہ تو ان کے بتوں کی طرف منتقل ہو سکتا تھا لیکن مجال نہیں تھی کہ بتوں کا حصہ کسی حال میں خدا کی طرف منتقل ہو سکے۔ گویا حق مرجّح بتوں اور شریکوں ہی کا تھا۔ قرآن نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں اور شریکوں سے خدا کے بالمقابل زیادہ محبت کرتے ہیں۔ یہ چیز کچھ مشرکین مکہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تمام مشرک قوموں کی مشترک خصوصیت بلکہ خود شرک کی فطرت ہے۔ مشرکین جن چیزوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں ظاہر ہے کہ اس خیال سے بناتے ہیں کہ ان کی تمام لقدضروریات انہی سے وابستہ ہیں اور اگر خدا سے کوئی ضرورت وابستہ ہے بھی تو بہر حال وہ بھی انہی کی وساطت سے پوری ہوتی ہے یہاں تک کہ اگر خدا نہ بھی پوری کرنی چاہے جب بھی اگر یہ چاہیں تو پوری کرا ہی لیتے ہیں۔ اس خیال کے ہونے سے ظاہر ہے کہ خدا کی اہمیت کچھ باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ ان مشرکین کے نزدیک بھی خدا کی حیثیت نعوذ باللہ گھر کے ایک بڑے بوڑھے ناکارہ وجود سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ وہ اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ بھی کرتے تھے۔ اس کے نام پر روایت کے تحت کچھ نکال تو دیتے لیکن اگر اتفاق سے کسی بت کے نام کی بکری مر گئی یا چوری ہو گئی یا اس کے نام کا غلہ چوہے کھا گئے تو اس کی تلافی لازماً خدا کے حصے میں سے کر دی جاتی اور اگر اسی قسم کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکالے ہوئے حصہ پر آ جاتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس کی تلافی معبودوں کے حصے کے مال سے کرنے کی جرأت کریں۔ فرمایا کہ کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں! اول تو سب کچھ بخشا ہوا خدا کا اور اس کے حصہ میں یہ من مانا بٹوارہ! پھر فرضی معبودوں کی یہ نازبرداری اور معبود حقیقی سے یہ بے پروائی اور اس کی یہ ناقدری۔

غیبیہ تال

'كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ' یعنی ان کے یہ شرکا صرف مالوں ہی میں حصہ دار نہیں ہیں بلکہ خدا کی بخشی ہوئی جانوں میں بھی حصہ دار بنا دیے گئے ہیں۔ بہت سے مشرکین ان کی خوشنودی کے لیے اپنی اولاد بھی ان کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ہم آیت . . اکے تحت بیان کر آئے ہیں کہ یہ سنگین جرم بعض مزعومہ سرکش جن بھوتوں کو راضی رکھنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ غالباً سخت قسم کے جاہل مشرکین اس وہم کے تحت کہ فلاں وادی یا فلاں درخت کے جن کو انھوں نے اپنی کسی اولاد کی نذر دے کر راضی نہ رکھا تو وہ ان کی ساری اولاد یا ان کے سارے خاندان پر آفت لائے گا، یہ حرکت کرتے تھے۔

بھوتوں کی خوشنودی کے لیے قتل اولاد

اس قسم کے اوہام تمام مشرک اور وہم پرست قوموں کے اندر پہلے بھی موجود رہے ہیں اور زمانہ کی ترقی کے باوجود اب بھی بعض قوموں کے نچلے طبقات میں پائے جاتے ہیں۔ ان اوہام کے پختہ کرنے میں شیاطین جن کے ان ایجنٹوں کو بڑا دخل ہوتا ہے جو انسانوں میں سے ان کے مرید بن جاتے ہیں۔ عرب جاہلیت میں جہاں جہاں بھوتوں کے تھان اور استھان تھے ان کے پروہت، کاہن اور مجاور اپنی طرف رجوع کرنے والے سادہ لوحوں کو ورغلاتے کہ فلاں جن تم پر بڑا غضب ناک ہے، اگر تم نے اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کی قربانی دے کر اس کو راضی نہ کیا تو وہ تمہارے سارے خاندان کو چٹ کر جائے گا۔ بے وقوف لوگ ان کے چکمے میں آکر یہ بیدردانہ اور سنگدلانہ جرم کر بیٹھتے اور اس طرح اپنے دین اور اپنی دنیا دونوں برباد کرتے۔

دین اور دنیا دونوں کی بربادی

لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ، دِيْنَهُمْ (ان کے دین) سے مراد وہ دین ہے جو ان کو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ سے وراثت میں ملا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ شیاطین جن و انس نے سادہ لوحوں اور کم عقلوں کو اس جال میں پھنساکر ان کو مادی و روحانی دونوں قسم کی ہلاکتوں میں مبتلا کیا۔ ایک طرف ان کو اولاد جیسی نعمت سے محروم کیا، دوسری طرف ابراہیمؑ کا سکھایا ہوا سیدھا سادا فطری دین ان کے لیے ایک گورکھ دھندا بن کے رہ گیا۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اگر یہ اپنی ان حماقتوں اور سنگ دلانہ حرکتوں کی حمایت میں تم سے لڑتے جھگڑتے ہیں، تمہاری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے من گھڑت فتنوں میں پڑے رہنے دو۔ تمہارا کام کسی کو باندھ کر راہ پر لگانا نہیں ہے۔ اللہ نے اس دنیا میں باطل کو بھی مہلت دی ہے جو باطل پر جمے رہنا چاہتے ہیں خدا ان کو ان کے باطل ہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ اگر وہ اپنی مشیت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر لانا چاہتا تو یہ سب ہدایت پر ہوتے، کوئی بھی اس گمراہی پر جما نہ رہ سکتا۔ جب یہ سنت الٰہی ہے تو تم ان کی اس ہٹ دھرمی سے کیوں پریشان ہو۔

پروہتوں کی من گھڑت شریعت

وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ، حِجْرٌ کے معنی ممنوع کے ہیں لیکن یہ لفظ عرب جاہلیت کی ایک دینی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو کسی دینی رسم کے تحت ممنوع (TABOO) ہو۔ اسلامی اصطلاح اس کے لیے حرام کی ہے۔ یہ ان کے تھانوں اور استھانوں کے پروہتوں اور مجاوروں کے من گھڑت فتوے نقل ہو رہے ہیں۔ ان کے ہاں زمینی پیداوار اور چوپایوں کے جو چڑھاوے پیش ہوتے ان کے کھانے کے باب میں چڑھاوے کی نوعیت کے اعتبار سے بڑی بڑی قیدیں اور پابندیاں تھیں۔ مثلاً مرد کھا سکتے ہیں، عورتیں نہیں کھا سکتیں، یا بیوہ کھا سکتی ہے سہاگن یا کنواری نہیں ہاتھ لگا سکتی یا اس کے برعکس۔ اس قسم کی حماقتیں ہمارے ہاں بھی بدعتی گھرانوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ فتوے چونکہ تمام تر ان پروہتوں کی خود ساختہ شریعت پر مبنی تھے اور وہی اس کے عالم بھی تھے اس وجہ سے نہ کوئی دوسرا اس میں اپنا کوئی اقول لگا سکتا تھا نہ سرمو اس

سے انحراف اختیار کر سکتا تھا۔ ان کے اسی تحکم کو اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ، بعض قسم کے جانوروں پر سواری کرنا ناجائز تھا۔ اس کی بعض مثالیں مائدہ آیت ۱۰۳ کے تحت گزر چکی ہیں۔ بعض قسم کی نذروں اور چڑھاووں پر ان کے ذبح کے وقت خدا کا نام نہیں لیتے تھے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اہل عرب ملت ابراہیمؑ کی روایات کے زیر اثر ذبح کے صحیح طریقے سے آشنا تھے اور ذبح کے وقت وہ خدا کا نام بھی لیتے تھے لیکن مشرکانہ رسوم و عقائد کے غلبہ نے ان کو اس طریقہ سے ہٹا کر ایک بالکل غلط راہ پر ڈال دیا۔ ازاں جملہ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بعض قسم کے چوپایوں پر وہ خدا کا نام لینا اپنی مشرکانہ شریعت کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کی یہ ساری خرافات مبنی تو تھیں ان کے مشرکانہ اوہام پر لیکن جس طرح وہ اپنی ساری ہی حماقتوں کو اللہ کی تعلیم کی طرف منسوب کرتے اسی طرح ان حماقتوں کو بھی اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے اس وجہ سے قرآن نے اس کو افترا سے تعبیر فرمایا اور دھمکی دی کہ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کی سزا دے گا۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ، یہ بھی انہی خانہ ساز فتووں کے قسم کی ایک بات ہے۔ بعض چوپایوں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچوں کے متعلق مشرکانہ توہمات کے تحت ان کا فتویٰ یہ تھا کہ مردوں کے لیے ان کا کھانا جائز ہے، عورتوں کے لیے ناجائز۔ ہاں اگر بچہ مردہ پیدا ہو تو اس کے کھانے میں مرد عورت دونوں شریک ہو سکتے ہیں۔ فرمایا کہ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ، یہ جو من مانے فتوے دیے جا رہے ہیں اللہ ان کو عنقریب اس کا بدلہ دے گا۔ اس کے علم و حکمت کے یہ بات منافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا نہ دے جو اس جسارت کے ساتھ اس کے نام پر شریعت سازی کے کارخانے کھول لیں۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ ان لوگوں سے نمٹنے میں جو دیر ہو رہی ہے یہ اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ خدا کے ہاں دیر ہے لیکن اندھیر نہیں۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ، یہ ان تمام حماقتوں پر جو اوپر مذکور ہوئیں اور ان کے مرتکبین کی بدانجامی پر اظہار افسوس ہے کہ بغیر کسی خدائی سند کے محض حماقت سے، اللہ پر افترا کر کے انھوں نے اپنی اولادوں کو قتل کیا اور اللہ کے بخشے ہوئے رزق کو اپنے اوپر حرام کیا۔ ان کی بدبختی و نامرادی میں کیا شبہ کی گنجائش ہے۔ یہ لوگ راہ حق سے بھٹکے اور اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے ان کو اپنی راہ دکھائی تو اپنی بدبختی کے سبب سے اس کو اختیار کرنے والے نہ بنے۔ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔

۲۱۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۴۱-۱۶۵

آگے ان بدعات کی تردید فرمائی ہے جو اُوپر مذکور ہوئیں۔ اس تردید کے کئی پہلو ہیں۔

اوّل یہ کہ زمین کی پیداوار ہو یا مال مویشی، سب خدا ہی نے پیدا کیے ہیں اور اسی کی عنایت سے تمھیں ملے ہیں۔ تو ان سے فائدہ اٹھاؤ، خدا کا شکر ادا کرو، ان میں سے خدا کا حق ادا کرو اور شیطان کی پیروی میں اپنے جی سے، مشرکانہ توہمات کے تحت، حلال و حرام نہ ٹھہراؤ، شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

دوسرا یہ کہ تمام چوپایوں میں سے نر و مادہ دونوں کو لے کر ایک ایک سے متعلق سوال کیا ہے کہ بتاؤ ان میں سے نر حرام ہے یا مادہ اور مطالبہ کیا کہ کسی سند سے یہ ثابت کرو کہ ان چوپایوں میں سے کوئی ایک بھی ملتِ ابراہیمؑ میں حرام تھا۔ جب ان میں سے کسی کی حرمت تم کسی دلیل سے ثابت نہیں کر سکتے تو انھی کی نسل سے پیدا شدہ جانوروں میں سے کوئی حرام اور کوئی حلال کس طرح بن جائے گا؟ آخر ایک ہی درخت کے کچھ پھل جائز اور کچھ ناجائز ہونے کے کیا معنی؟

تیسرا یہ کہ ملتِ ابراہیمؑ کے حلال و حرام سے متعلق جو وحی مجھ پر آئی ہے اس میں تو فلاں فلاں چیزوں کے سوا اور کسی چیز کی حرمت کا ذکر نہیں ہے۔ یہود پر جو چیزیں حرام ہوئیں وہ بھی وہی ہیں جو ملتِ ابراہیمؑ میں حرام تھیں بجز ان چیزوں کے جو ان کی سرکشی کے نتیجے میں ان پر حرام کی گئیں۔

اس کے بعد ملتِ ابراہیمؑ کی بنیادی تعلیمات کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ اسی صراطِ مستقیم کی تمھیں دعوت دی جارہی ہے تو اس سے منحرف ہو کر گمراہی کی وادیوں میں نہ بھٹکو۔ اس کے ساتھ حضرت موسٰیؑ کو جو شریعت عطا ہوئی اس کا حوالہ دیا کہ وہ بھی ان کے لیے، جنھوں نے اس کو صحیح طریقہ پر قبول کیا، اسی راہ کی طرف رہنمائی کرنے والی تھی۔

اس کے بعد اس احسانِ عظیم کا ذکر فرمایا جو اس قرآن کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب پر کیا اور یہ تنبیہ فرمائی کہ یہ کتاب اتار کر اللہ نے تم پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب تمھارے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے۔ اگر اس کو ماننے کے بجائے عذاب کے منتظر ہو تو یاد رکھو کہ عذاب آجانے پر جو ایمان لایا جاتا ہے وہ نافع نہیں ہوا کرتا۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا کہ خدا نے مجھے تو ملتِ ابراہیمؑ کی ہدایت بخش دی۔ میری نماز، قربانی، زندگی اور موت سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ تم میں سے جو یہ راہ اختیار کرنی چاہے، اختیار کرے ورنہ خدا کے حضور جواب دہی کے لیے تیار رہے۔ وہاں ہر ایک کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہے۔ کوئی دوسرا اس کے بوجھ کو اٹھانے والا نہ ہوگا۔ ساتھ ہی قریش کو تنبیہ فرمائی کہ تم پہلی قوم نہیں ہو جو دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوئی ہو۔ تم سے پہلے بھی قومیں آچکی ہیں اور اپنی سرکشیوں کے نتیجہ میں کیفرِ کردار کو پہنچ چکی ہیں۔ اگر ان کے جانشین ہو کر تم نے بھی وہی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمھارے معاملے میں سنتِ الٰہی بدل جائے۔ تم بھی اسی انجام کو پہنچو گے جس کو وہ پہنچیں ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۴۱-۱۶۵

وَهُوَ الَّذِیٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ
وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ
غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ
حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ وَمِنَ
الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۴۲﴾ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ ۚ
مِنَ الضَّاْنِ اثْنَیْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَیْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ حَرَّمَ
اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِیْ
بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ
اثْنَیْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ
اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ
عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۴﴾ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ
اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ
دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ
لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ
رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَعَلَى الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ
وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ

ع ۱۷

أَوِ الْحَوَايَآ أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿١٤٦﴾
فَإِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهٗ عَنِ
الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٤٧﴾ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ
أَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ
فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿١٤٨﴾
قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿١٤٩﴾
قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ أَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ
فَإِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿١٥٠﴾ ع ٥
قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا
وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا أَوْلَادَكُمْ مِّنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ
نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ
بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿١٥١﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ إِلَّا بِالَّتِيْ
هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهٗ ۚ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ
لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ أَوْفُوْا ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ

تذکرون ﴿١٥٢﴾ وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه ۚ ولا تتبعوا
السبل فتفرق بکم عن سبیله ۚ ذلکم وصکم به لعلکم
تتقون ﴿١٥٣﴾ ثم اتینا موسی الکتب تماما علی الذی احسن
وتفصیلا لکل شیء وهدی ورحمة لعلهم بلقاء ربهم
یؤمنون ﴿١٥٤﴾ وهذا کتب انزلنه مبرک فاتبعوه واتقوا لعلکم
ترحمون ﴿١٥٥﴾ ان تقولوا انما انزل الکتب علی طائفتین من
قبلنا ۖ وان کنا عن دراستهم لغفلین ﴿١٥٦﴾ او تقولوا لو انا انزل
علینا الکتب لکنا اهدی منهم ۚ فقد جاءکم بینة من
ربکم وهدی ورحمة ۚ فمن اظلم ممن کذب بایت الله
وصدف عنها ۗ سنجزی الذین یصدفون عن ایتنا سوء
العذاب بما کانوا یصدفون ﴿١٥٧﴾ هل ینظرون الا ان
تاتیهم الملئکة او یاتی ربک او یاتی بعض ایت ربک ۗ یوم
یاتی بعض ایت ربک لا ینفع نفسا ایمانها لم تکن امنت
من قبل او کسبت فی ایمانها خیرا ۗ قل انتظروا انا
منتظرون ﴿١٥٨﴾ ان الذین فرقوا دینهم وکانوا شیعا لست
منهم فی شیء ۚ انما امرهم الی الله ثم ینبئهم بما کانوا
یفعلون ﴿١٥٩﴾ من جاء بالحسنة فله عشر امثالها ۚ ومن جاء
بالسیئة فلا یجزی الا مثلها وهم لا یظلمون ﴿١٦٠﴾ قل اننی

١٩ ع ٦

هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۭ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾ ع ۲۰ / ۱۱

ترجمۂ آیات ۱۴۱-۱۶۵

اور وہی خدا ہے جس نے باغ پیدا کیے۔ کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں کچھ نہیں چڑھائے جاتے۔ اور کھجور اور کھیتی پیدا کی مختلف النوع پیداوار کی۔ اور زیتون اور انار باہمدگر ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ان کے پھلوں سے فائدہ اٹھاؤ جب وہ پھلیں اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق ادا کرو اور اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور اس نے چوپایوں میں بڑے قد کے بھی پیدا کیے اور چھوٹے قد کے بھی تو اللہ نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے ان سے فائدہ اٹھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۱۴۱-۱۴۲

چوپایوں کی آٹھوں قسموں کو لو، بھیڑوں میں سے نر و مادہ دو اور بکریوں میں سے نر و مادہ دو، پھر ان سے پوچھو کہ ان دونوں کے نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادینوں

کو یا اس بچے کو جو ان مادینوں کے رحم میں ہے؟ اگر تم سچے ہو تو کسی سند کے ساتھ مجھے بتاؤ۔ اسی طرح لو اونٹوں میں سے نر و مادہ دو اور گائے بیل میں سے نر و مادہ دو، پھر پوچھو کہ ان دونوں کے نروں کو حرام ٹھہرایا ہے یا ان کی ماداؤں کو یا اس بچے کو جو ماداؤں کے پیٹ میں ہے؟ کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ نے تمھیں اس کی ہدایت فرمائی؟ تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بغیر کسی علم کے۔ بے شک اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۱۴۳-۱۴۴

کہہ دو، میں تو اس وحی میں جو مجھ پر آئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی چیز جس کو وہ کھائے حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ یہ چیزیں بے شک ناپاک ہیں یا فسق کر کے اس کو غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا ہو۔ اس پر بھی جو مجبور ہو جائے، نہ چاہنے والا بنے اور نہ حد سے بڑھنے والا تو تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ۱۴۵

اور جو یہودی ہوئے ان پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کیے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی اور ہم بالکل سچے ہیں۔ پس اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمھارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرموں سے ٹالا نہ جا سکے گا۔ ۱۴۶-۱۴۷

جنھوں نے شرک کیا وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے۔ اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزرے یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھا۔ پوچھو تمھارے پاس ہے اس کی کوئی

سند کہ تم اس کو ظاہر کر سکو۔ تم محض گمان کی پیروی کر رہے ہو اور محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہو۔ کہہ دو کہ اللہ کے لیے تو بس حجت ہے پہنچ جانے والی اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ کہو، لاؤ اپنے ان گواہوں کو جو شاہد ہیں کہ اللہ نے فلاں چیز حرام ٹھہرائی ہے۔ پس اگر وہ شہادت دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دیجیو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ ۱۴۸-۱۵۰

کہو، آؤ میں سناؤں جو چیزیں تم پر تمھارے رب نے حرام کی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ تم کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی، اور بے حیائی کے کاموں کے پاس نہ پھٹکو، خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اس کو قتل نہ کرو مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمھیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم سمجھو اور یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو بجز اس طریقے کے جو اس کے لیے بہتر ہو یہاں تک کہ وہ سن رشد کو پہنچ جائے اور ناپ، تول انصاف کے ساتھ پوری رکھو۔ ہم کسی جان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور جب تم بولو تو عدل کی بات بولو، خواہ کوئی تمھارا قرابت دار ہی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کی اس نے تمھیں ہدایت فرمائی تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو اور یہ کہ یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور دوسری پگڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کی راہ سے الگ کر دیں۔ یہ باتیں ہیں جن کی تمھیں ہدایت فرمائی تاکہ اُس کے غضب سے بچو۔ ۱۵۱-۱۵۳

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اپنی نعمت پوری کرنے کے لیے اس پر جو خوب کار تھا اور ہر بات کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں۔ ۱۵۴

اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے سراپا خیر و برکت، تو اس کی پیروی کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ مبادا تم کہو کہ کتاب بس ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر رہے یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ سو تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت آگئی تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں اور ان سے دوسروں کو پھیریں۔ جو لوگ ہماری آیات سے اعراض اختیار کر رہے ہیں ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب نہایت بُرا عذاب دیں گے۔ وہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو۔ جس دن تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہوگی تو کسی ایسے کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان میں نیکی نہ کمائی ہو۔ کہہ دو تم انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہیں۔ ۱۵۵-۱۵۸

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ بن گئے تمھارا ان سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ بس اللہ کے حوالہ ہے۔ وہی ان کو جمع کرے گا پھر انھیں بتائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ جو نیکی لے کر آئے گا تو اس کو اس کا دس گنا بدلہ ملے گا اور جو برائی لے کر آئے گا تو اس کو بس اسی کے مثل بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔ ۱۵۹-۱۶۰

کہہ دو، میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھے رستے کی طرف فرما دی ہے۔ دینِ قیّم

ابراہیم کی ملت کی طرف جو یکسو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ کہہ دو میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں پہلا مسلم ہوں۔ پوچھو، کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بناؤں جب کہ وہی ہر چیز کا رب ہے اور ہر جان جو کمائی کرتی ہے وہ اسی کے کھاتے میں پڑتی ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ پھر تمھارے رب ہی کی طرف تمھارا لوٹنا ہوگا پس وہ تمھیں بتائے گا وہ چیز جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے تاکہ جو کچھ اس نے تمھیں بخشا ہے اس میں تم کو آزمائے، بے شک تیرا رب جلد پاداش عمل دینے والا بھی ہے اور وہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ ۱۶۱-۱۶۵

۲۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۚ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۖ وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝ وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةً وَفَرْشًا ۚ كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ (۱۴۱-۱۴۲)

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ یعنی کھیتی اور باغ سب پیدا کیے ہوئے تو خدا کے ہیں تو ان میں تم نے دوسرے دیوتاؤں، دیویوں کو کس حق کی بنا پر شریک بنا ڈالا؟ مَعْرُوشَاتٍ سے مراد انگور وغیرہ ہیں جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں، غَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ سے وہ چیزیں مراد ہیں جو ٹٹیوں کی محتاج نہیں ہوتیں۔ انگور کی بیلوں کی مناسبت سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ غَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وہ بیلیں ہیں جو زمین ہی پر پھیلتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ مثلاً خربوزے، تربوز، ککڑیاں، کھیرے وغیرہ۔ سورہ عبس میں عِنَب اور قَضْب دو چیزوں کو جمع کیا ہے، عِنَب انگور کو کہتے ہیں اور قَضْب ان سبزیوں کے لیے معروف ہے جو تازہ حالت میں کھائی جاتی ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں باغوں اور کھیتیوں کی گوناگونی و بوقلمونی، ان کی پیداوار کے تنوع اور ان کے انواع و اقسام کے اختلاف و تعدد کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے جس سے مقصود بعض حقائق کی طرف توجہ دلانا ہے۔

اشیائے کائنات کی شہادت زبانِ حال سے

ایک یہ کہ جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے وہ بڑا ہی جواد و کریم، فیاض و مہربان، سخی اور بندہ نواز ہے۔ اس نے بندوں میں رزق کی احتیاج رکھی تو یہ نہیں کیا کہ جیسا تیسا پیٹ بھرنے کا سامان پیدا کر دیا ہو بلکہ الوانِ نعمت کے انبار لگا دیے۔ باغ اگائے تو گوناگون قسم کے، کھجور اور غلے پیدا کیے تو بے شمار اقسام کے، زیتون، انار اور دوسرے پھل پھول عنایت کیے تو نت نئے انواع کے۔ آخر مجرد زندگی باقی رکھنے کے لیے تو یہ تنوعات، یہ بوقلمونیاں، شکلوں، رنگوں، ذائقوں اور مزوں کی یہ رنگ آرائیاں و رعنائیاں ناگزیر نہیں تھیں لیکن اس دنیا کے خالق نے بغیر اس کے کہ اس کی کوئی ضرورت ہم سے وابستہ ہو ہمارے لیے اتنا وسیع دسترخوان بچھایا کہ ہم اس کے لذائذ کے انواع و اقسام گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے۔ سوچنے والوں کے لیے سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان یہ جانے کہ اس کا رب منعم و کریم اور فیاض و مہربان ہے جس نے بلا کسی استحقاق کے اس کے لیے یہ سارے سامان مہیا فرمائے ہیں اور پھر اس کا فطری اثر اس کے دل پر یہ طاری ہو کہ وہ اس کا شکر گزار بندہ بنے اور اس کا حق پہچانے یہی شکر گزاری کا جذبہ اور حق شناسی کا احساس ہے جو تمام دین و شریعت کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، بنیاد ہے۔

دوسری یہ کہ پروردگاری اور ربوبیت کا یہ سارا ساز و سامان، جس سے ہم بلا استحقاق فائدہ اٹھا رہے ہیں، ہمارے اوپر ایک بہت بھاری ذمہ داری عاید کرتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم ان سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جس نے یہ سب کچھ ہمارے لیے بنایا ہے ضرور ہے کہ وہ ایک دن ایسا بھی لائے جس میں ہم سے ایک ایک نعمت کے متعلق سوال کرے کہ جس کے خوانِ نعمت سے ہم نے یہ فائدے اٹھائے اس کی وفاداری کا حق ادا کیا یا نہیں اور پھر اسی کے لحاظ سے وہ ہم کو جزا یا سزا دے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ ہر حق اور ہر تمتع کے ساتھ ذمہ داری اور ہر (PRIVILEDGE) کے ساتھ (RESPONSIBILITY) لازمی ہے۔ ان دونوں کا لازم و ملزوم ہونا انسانی فطرت کے بدیہیات میں سے ہے۔ ہر حساس انسان اس کو تسلیم کرتا ہے۔ صرف لئیم، کمینہ اور بلید لوگ ہی ہو سکتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھائیں لیکن ان کے جواب میں کوئی ذمہ داری محسوس نہ کریں۔

تیسری یہ کہ اس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت، گوناگونی کے اندر ہم آہنگی، اختلاف کے اندر سازگاری، ہر گوشے میں نمایاں ہے، مٹی، پانی، ہوا ایک ہی لیکن اشیا گوناگون قسم کی، رنگ مختلف قسم کے، مزے، خوشبو، قد و قامت الگ الگ۔ پھر یہ سب انسان کے لیے نعمت و برکت، غذا اور لذت ہیں۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس خالق نے ہمارے جسم کے اندر گلوکوز اور فولاد کا تقاضا ودیعت کیا اُسی نے انار
اور انگور کے دانوں کے اندر رس بھرے۔ جس نے ہماری زبان کے اندر مختلف ذائقے ودیعت کیے
اُسی نے ان اشیا کے اندر مختلف مزے پیدا کیے۔ جس نے ہماری نگاہوں کو حسن وجمال کا ذوق بخشا اُسی
نے ہر چیز کو حسن ورعنائی، دلکشی ودلربائی کا پیکر بنا دیا۔ قرآن نے یہاں اشیا کے ظاہری تضاد و اختلاف کے
اندر اسی وحدتِ مقصد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہ چیز اس کائنات کے خالق اور اس کے متصرف کی
توحید کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ پیچھے آیات ۹۹-۱۰۱ کے تحت بھی بعض اشارے گزر چکے ہیں۔ مزید
تفصیل کے طالب ہماری کتابیں 'حقیقتِ شرک' اور 'حقیقتِ توحید' پڑھیں۔ ان میں ہم نے ان مسائل پر سیر حاصل
بحث کی ہے۔

كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ، یہ تعلیم تمام نعمتیں اپنی زبانِ حال سے بھی دے رہی ہیں
اور یہی تعلیم خدا اور اُس کے نبیوں اور رسولوں نے بھی دی ہے اور یہی ان نعمتوں کا وہ حق بھی ہے جس کی
شہادت خود ہماری فطرت دیتی ہے بشرطیکہ وہ مسخ نہ ہو گئی ہو۔ یعنی اللہ کی بخشی ہوئی ان کھیتوں اور ان
باغوں سے خود فائدہ اُٹھاؤ اور جب فصلوں کے کاٹنے اور پھلوں کے توڑنے کا وقت آئے تو ان کا حق
ادا کرو۔ 'حَقَّهُ' میں ضمیر کا مرجع خدا بھی ہو سکتا ہے اور ثمر بھی لیکن دونوں صورتوں میں باعتبار مفہوم کچھ زیادہ
فرق نہ ہوگا۔ ہر نعمت جو اللہ تعالیٰ عنایت فرماتا ہے اس کا ایک حق واجب یہ ہے کہ جس کو یہ نعمت ملی
وہ اس میں ان لوگوں کو بھی شریک کرے جو اس سے محروم ہیں۔ یہ اس نعمت کی شکر گزاری کا حق ہے۔
یہی حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا حق کہا جاتا ہے۔ اس حق کا شعور انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے
جب سے انسان پایا جاتا ہے، تمام بھلے انسانوں کے اندر اس حق کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ حضرت
آدم کا بیٹا ہابیل اپنی بھیڑوں بکریوں کا جو نذرانہ خداوند کے لیے لایا تھا وہ اسی حق کی ادائیگی کے لیے لایا
تھا۔ یہی حق ہے جس کی ادائیگی کے لیے اسرائیلی شریعت میں بھی اور پھر اسلام میں بھی زکوٰۃ کا ایک باقاعدہ
نظام قائم ہوا۔

حق زکوٰۃ پیداوار پر ہے۔

'یَوْمَ حَصَادِهِ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس حق کی ادائیگی فصل کے دِرَو کے وقت اس کے حاصل
سے ہونی چاہیے۔ اس کی علت یہ ہے کہ یہ حق درحقیقت اس نعمت الٰہی کا شکرانہ ہے جو کسان کو حاصل ہوتی۔
اسی وجہ سے اسلام نے زکوٰۃ کا حق پیداوار پر رکھا ہے۔ یہی بات عقل وفطرت کے مطابق ہے۔ اس زمانے
میں دوسری قوموں کی نقالی میں مسلمانوں نے بھی ایک بالکل غیر اسلامی مالیاتی نظام اختیار کر لیا ہے اس وجہ
سے مسلمان حکومتیں زکوٰۃ کے بجائے ٹیکس وصول کرتی ہیں۔ یہ چیز اس برکت اور اس عدل سے بالکل خالی ہے
جو اسلام کے نظامِ زکوٰۃ میں ہے۔

'مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ' میں ضمیر ہر چند واحد ہے لیکن مراد وہ ساری ہی چیزیں ہیں جو مذکور ہوئیں۔ اس طرح

متعدد چیزیں ذکر کرنے کے بعد جب ضمیر یا فعل واحد لاتے ہیں تو مقصود ان میں سے ایک ایک چیز کا حکم فرداً فرداً بیان کرنا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ہر پیداوار پر خدا کا حق ہے، خواہ کوئی شے بھی ہو اس سے استثنا کسی شے کا نہیں بلکہ ایک خاص مقدار کا ہے۔ شریعت نے ایک خاص حد تک کی پیداوار، پیدا کرنے والے کی ضروریات کا لحاظ کر کے اس حق سے مستثنیٰ کر دی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مقدار کیا ہے تو اس کا تعلق نقد سے ہے اور یہ بات تفصیل طلب ہے جس کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے[1]۔

زکوٰۃ سے کوئی پیداوار مستثنیٰ نہیں

'اِذَآ اَثْمَرَ' کا تعلق صرف 'کُلُوْا' سے نہیں ہے بلکہ 'کُلُوْا' اور 'اٰتُوْا حَقَّهٗ' دونوں سے ہے۔ یعنی جس طرح پیداوار سے استمتاع منحصر ہے پیداوار حاصل ہونے پر اسی طرح اس کے حق شرعی کی ادائیگی واجب ہے اُس کے پیدا ہونے اور کھیت سے کھلیان تک پہنچنے پر۔ اس سے یہ حقیقت مزید مؤکد ہو گئی کہ اس حق کا اصل تعلق پیداوار سے ہے نہ کہ زمین سے۔ چنانچہ اسی اصول پر اسلام کا نظام زکوٰۃ ہے۔

'وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ' یہ ادائے حق کے ساتھ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت سورۂ بنی اسرائیل میں بعینہٖ اسی سیاق میں وارد ہوئی ہے۔ فرمایا ہے 'وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ٥ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا' (۲۶-۲۷ بنی اسرائیل) (اور قرابت مند، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے) اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ حقوق کی ادائیگی کا انحصار اس امر پر ہے کہ آدمی اپنی ضروریات و خواہشات کے معاملے میں معتدل، کفایت شعار اور میانہ رو ہو۔ جو شخص مسرف اور فضول خرچ ہو اس کے اپنے ہی شوق پورے نہیں ہو پاتے، وہ دوسروں کے حقوق کیا ادا کرے گا۔ شیطان ارباب مال پر سب سے زیادہ حملہ اسی راہ سے کرتا ہے۔ وہ ان کو طرح طرح کی آرزوؤں اور خواہشوں میں پھنساتا ہے اور وہ ان خواہشات و تعیشات کے ایسے غلام ہو جاتے ہیں کہ ان کے نزدیک ان کا درجہ ضروریات سے بھی کچھ بڑھ کر ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بھلا کس طرح سوچ سکتے ہیں کہ جس مال میں ان کے یہ اللے تللے ہیں اس میں خدا کے دوسرے بندوں کے بھی حقوق ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے کتے، باز، شکرے تو آسودہ رہتے ہیں لیکن ان کے پڑوسی بھوکے سوتے ہیں۔

ادائے حقوق کے لیے اسراف کی ممانعت

'وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا' 'حَمُوْلَة' رکوبہ، اور حلوبہ کے وزن پر ہے اور اس سے مراد وہ چوپائے ہیں جو سواری اور بار برداری کے لیے موزوں ہیں۔ مثلاً اونٹ، گھوڑے، خچر وغیرہ۔ الابل التی تحمل وکل: ما احتمل علیہ القوم من امیر وحمار و نحوہ۔

حمولۃ اور 'فرش' کی تحقیق

---

[1] فقہا بعض چیزوں کو اموال زکوٰۃ میں شمار نہیں کرتے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر وہ شے نہایت محدود مقدار میں محض گھریلو استعمال کی حد تک پیدا کی جاتی ہو تب تو بے شک وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہونی چاہیے لیکن اگر انہی چیزوں میں سے کوئی چیز کوئی زمیندار بڑے پیمانہ پر کاشت کرے یا وہی چیز کسی علاقہ یا ملک کی تمام پیداوار کی حیثیت کھیتی ہو یا حاصل کرنے تو آخر وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کیوں رہے گی؟

'الفرش' اس زمین کو بھی کہتے ہیں جہاں نباتات کی کثرت ہو۔ اس کھیتی کو بھی کہتے ہیں جو ابھی اپنے ڈنٹھلوں پر کھڑی نہ ہوئی ہو اور حیوانات کے تعلق سے یہ لفظ آئے تو اس سے مراد وہ چھوٹے جانور ہوتے ہیں جو سواری یا بار برداری کے لیے موزوں نہیں ہیں، صرف ذبح یا دوسری ضروریات ہی کے لیے موزوں ہیں مثلاً بکریاں، بھیڑیں وغیرہ۔ قرینہ دلیل ہو تو اس میں چھوٹے اونٹ اور گائے بیل بھی شامل ہو جاتے ہیں، لیکن یہاں یہ لفظ 'حمولۃ' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے لازماً یہاں چھوٹے چوپائے ہی مراد ہوں گے۔

اوپر والی آیت میں 'جنت معروشت' و 'غیر معروشت' کا ذکر فرمایا ہے۔ اب یہ اس کے مقابل میں چوپایوں کا ذکر فرمایا تو ان کو بھی دو بڑی قسموں ــــ 'حمولۃ' اور 'فرش' ــــ میں تقسیم فرما دیا۔ زبان کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں نہایت حسین قسم کا تقابل ہے۔ 'حمولۃ'، 'معروشت' کا مقابل ہے، 'فرش'، 'غیر معروشت' کا۔ گویا جس طرح نباتاتی کھیتیوں اور باغوں میں قدرت نے ایسی بیلیں بھی پیدا کی ہیں جو ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں اور ایسی بھی جو زمین ہی پر پھیلتی ہیں، اسی طرح چوپایوں میں 'حمولۃ' بھی ہیں جن کو قدرت نے اونچے ڈھانچوں پر کھڑا کیا ہے اور 'فرش' بھی ہیں جو زمین سے لگے ہی ہوئے چرتے چگتے پروان چڑھتے ہیں اور انسان کو اپنے گوشت، کھال، اون، دودھ ہر چیز سے فائدہ پہنچاتے ہیں۔

اس لفظی تجانس کے ساتھ ساتھ اس معنوی تجانس پر بھی نگاہ رکھیے جو دونوں آیتوں میں یکساں موجود ہے اور ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو نعمتیں پیدا کی ہیں ان کا ایک خاص پہلو ان کی گوناگونی اور بوقلمونی بھی ہے جس سے خدا کی ربوبیت، عنایت اور رحمت کی شہادت ملتی ہے اور یہ شہادت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، توحید اور جزا و سزا کی نہایت اہم آفاقی و انفسی دلیل ہے۔ اسی دلیل کی طرف یہاں بھی چوپایوں کے تنوع کا حوالہ دے کر اشارہ فرما دیا ہے اور یہ اشارہ فکر انسانی کے لیے ایک مہمیز ہے بشرطیکہ انسان غور کرنا چاہے۔

شیطان کے دو کا میاب حربے

'کُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ' جس طرح اوپر والی آیت میں نعمتوں کے ذکر کے بعد ان کا حق یہ بیان فرمایا کہ 'کُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ' اسی طرح ان چوپایوں کی نعمت کا حق یہ بیان فرمایا کہ 'کُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ' کہ اللہ نے یہ نعمتیں جو تمھیں بخشی ہیں جن جن پہلوؤں سے تمھارے لیے نافع ہیں ان کو برتو، اپنے منعم کا شکر ادا کرو اور ان کے اندر جو خدا کا حق ہے وہ ادا کرو۔ یہ باتیں چونکہ سیاق کلام سے ظاہر ہیں، نیز اوپر ان کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے ان کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ شیطان کے فتنوں سے آگاہ فرما دیا کہ اس کے نقش قدم کی پیروی نہ کیجیو اس لیے کہ وہ کھلم کھلا پہلے ہی الٹی میٹم دے چکا ہے کہ وہ تم کو فتنوں میں ڈالے گا تو تم اس کے کہے پر اپنے جی سے حرام و حلال ٹھہراؤ گے اور خدا کے بخشے ہوئے چوپایوں کو بتوں کے نام پر نیاز اور قربانی کے طور پر پیش کرو گے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ 'وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِکَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا وَّلَاُضِلَّنَّھُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّھُمْ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ ۱۱۹۔ نساء' اور شیطان نے کہا

میں تیرے بندوں میں سے ایک متعین حصہ ہتھیا کے رہوں گا، اور میں ان کو گمراہ کروں گا، ان کو آرزوؤں کے سبز باغ دکھاؤں گا اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے) اوپر والی نعمتوں کے سلسلے میں شیطان کی رہزنی اسراف و تبذیر کے پہلو سے بیان ہوئی۔ یہاں اس کی مشرکانہ وسوسہ اندازیوں کا ذکر ہوا اور شیطان کے یہ دونوں ہی حربے اولادِ آدم پر بڑے کارگر ثابت ہوئے ہیں۔

اس آیت میں 'اکل' یا 'رزق' کے الفاظ ان محدود معنوں میں نہیں استعمال ہوئے ہیں جن معنوں میں عام طور پر ہم لیتے ہیں۔ 'کل' برتنے اور فائدہ اٹھانے کے مفہوم میں ہے اور 'رزق' ایک جامع تعبیر ہے بخشش الٰہی کی۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۙ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۴۳-۱۴۴)

'ثَمٰنِيَةَ' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ عام طور پر لوگوں نے فعل ماضی محذوف مانا ہے لیکن ہمارے نزدیک قرینہ یہاں فعل امر کے محذوف ماننے کا ہے۔ جملہ کی وضاحت سے اس قرینے کی وضاحت ہو جائے گی۔

'زوج' کا لفظ جس طرح جوڑے کے لیے آتا ہے اسی طرح جوڑے کے ایک فرد کے لیے بھی آتا ہے۔ عربی ادب اور قرآن دونوں میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔

لفظ انعام کا اطلاق کن چوپایوں پر ہوتا ہے

پالتو چوپایوں میں سے جو گوشت یا دودھ وغیرہ کے لیے عرب میں پائے جاتے تھے چار معروف تھے۔ چھوٹے چوپایوں میں بھیڑ بکری، بڑے چوپایوں میں اونٹ گائے[1]۔ انعام کا لفظ انہی کے لیے بولا جاتا ہے۔ جب اس کی طرف لفظ 'بَهِيْمَة' کی نسبت ہو جاتی ہے تو اس میں جیسا کہ سورۂ مائدہ کے شروع میں ہم اشارہ کر چکے ہیں، وہ وحشی چوپائے بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اگرچہ پالتو نہیں لیکن شامل انعام ہی کی جنس میں ہیں۔ مثلاً ہرن، جنگلی بکرے، پاڑے، نیل گائے، گورخر وغیرہ۔

چونکہ یہاں زیر بحث پالتو چوپایوں ہی کی حلت و حرمت ہے اس لیے کہ اہل عرب نے انہی کے اندر سے، جیسا کہ اوپر گزرا، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت بعض کو حلال، بعض کو حرام ٹھہرا رکھا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ ان میں سے ایک ایک کو فرداً فرداً لے کر ان سے پوچھو کہ ان میں سے کس کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے اور ان سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے سوال کا جواب کسی علمی یا عقلی دلیل سے دیں، محض اٹکل کے تیر تکے نہ چلائیں۔

---

[1] بھینس چونکہ گرم اور مرطوب ملکوں کا چوپایہ ہے اس وجہ سے یہ عرب میں زیادہ معروف نہیں رہی ہے۔

یہ معروف چوپائے، جیساکہ ہم نے اشارہ کیا، چار تھے - بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے - ان کے جوڑے کے افراد نر اور مادہ دونوں کو الگ الگ گنیے تو یہ سب آٹھ ہو جائیں گے - فرمایا کہ ان آٹھوں کو لو اور ان میں سے ہر ایک کے نر و مادہ کو لے کر ان لال بجھکڑوں سے پوچھو کہ بتائیں، ان میں سے نر کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے یا مادہ کو یا مادہ کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو؟ مطلب یہ ہے کہ جب اصلاً یہ جانور، ان کے نر و مادہ دونوں، پیٹ کے بچہ سمیت، حلال ہیں، ان میں سے کسی کی حرمت کا دعویٰ یہ نہیں کر سکتے تو پھر انہی کے بعض اجزا پر یہ حرمت کہاں سے طاری ہو جاتی ہے کہ بعض کا کھانا ناجائز ہو جاتا ہے، بعض پر سواری حرام ہو جاتی ہے، بعض کو صرف مرد ہی کھا سکتے ہیں اور بعض کو مخصوص حالات پیدا ہو جانے کے بعد دونوں کھا سکتے ہیں۔ عقل و فطرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر درخت مباح ہے تو اس کا پھل بھی مباح ہو۔ یہ کیا بے تکی بات ہے کہ درخت تو مباح ہے لیکن اس کی ایک شاخ کا پھل حرام ہے یا مردوں کے لیے تو یہ حلال ہے لیکن عورتوں کے لیے حرام ہے یا اتنے پھل دینے تک تو وہ حلال ہے لیکن اتنے پھل دے چکنے کے بعد اس پر حرمت طاری ہو جاتی ہے۔

بدعات پر قریش سے دلیل کا مطالبہ

'نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ' مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ان میں سے بعض چیزیں دین ابراہیمی میں حرام تھیں تو اس پر کوئی علمی دلیل پیش کرو۔ علمی دلیل دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ دین ابراہیمؑ کی کوئی قابلِ اعتماد سند ہو جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ فلاں فلاں چیزیں دین ابراہیمیؑ میں حرام تھیں یا کوئی عقلی و فطری دلیل یا قرینہ ہو جس سے ان کے دعوے کی صحت پر اعتماد کیا جا سکے۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو مجرد واہمہ پر اچھے بھلے جانوروں کو حرام کر دینے کے کیا معنی؟ یہ واضح رہے کہ اہل عرب اپنے جن مشرکانہ توہمات و رسوم کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے تھے ان کے حق میں دلیل وہ صرف یہ پیش کرتے تھے کہ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ ۱۴۸ (اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کر سکتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے) ظاہر ہے کہ یہ کوئی دلیل عقلی ہے نہ نقلی۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو ہر احمق اپنی ہر حماقت کو اس دلیل سے ثواب ثابت کر سکتا ہے۔ باپ دادا کا کسی رسم کو اختیار کر لینا بھی اس کی صحت یا حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس کی نسبت کی کوئی دلیل نہیں۔ آخر یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ ان کے باپ دادا نے جو رسوم اختیار کیے کسی سند کی بنا پر اختیار کیے جب کہ خود اہل عرب کی روایات شاہد ہیں کہ جس طرح دین مسیح کو پال نے بگاڑا اسی طرح عربوں میں شرک و بت پرستی کا رواج ایک شخص عمرو بن لحی نامی کے ذریعے سے ہوا۔ قرآن نے عربوں کے ان توہمات کی تردید کے لیے عقلی و نقلی دونوں قسم کے دلائل دیے۔ ایک طرف تو اس نے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا وہ سارا تحریری ریکارڈ پیش کیا جو تورات کے صحیفوں میں موجود تھا، جس کا ایک ایک حرف شاہد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو نہ صرف یہ کہ شرک اور مشرکانہ رسوم سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ انھوں نے اپنے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل سے شرک کے ایک ایک جرثومہ

کا قلع قمع کیا ہے۔ دوسری طرف توحید خالص کے حق میں وہ عقلی و فطری دلیلیں دیں جو ناقابلِ تردید بھی ہیں اور جو حضرت ابراہیمؑ ہی کی، جیسا کہ اسی سورہ کے پچھلے مباحث سے واضح ہے، پیش کردہ ہیں۔ غور کیجیے کہ کہاں قرآن کے یہ سورج کی طرح روشن دلائل اور کہاں اہلِ عرب کی یہ بات کہ ہم نے اسی طریقہ پر اپنے باپ دادا کو پایا اس وجہ سے یہی اللہ کی شریعت اور یہی ابراہیمؑ کی ملت ہے۔

اتمام حجت کا آخری قدم

'اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا' یہ اتمام حجت کا آخری قدم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک عقل و نقل کے دلائل کا تعلق ہے ان میں سے تو کوئی چیز تمھارے ساتھ ہے نہیں پھر آخر کس بنیاد پر تم اللہ پر یہ بہتان باندھ رہے ہو کہ خدا نے فلاں فلاں چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں، کیا جب اللہ نے ان چیزوں کی ہدایت فرمائی تم اس وقت موجود تھے؟ پھر بتاؤ کہ ان سے بڑھ کر محروم النعمت، بدبخت اور ظالم کون ہو سکتا ہے جو بغیر کسی سندِ علمی و دلیلِ عقلی کے محض جھوٹے بہتان کو لوگوں کے گمراہ کرنے کا ذریعہ بنائیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' 'ظالمین' سے مراد وہی لوگ ہیں جن کی طرف اوپر 'فَمَنْ اَظْلَمُ' میں اشارہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے ظالم ہیں کہ محض من گھڑت بہتان کو نہ صرف اپنی گمراہی کا بہانہ بنائے بیٹھے ہیں بلکہ اس کو دوسروں کو گمراہ کرنے کا بھی ذریعہ بنا رہے ہیں اللہ ایسے لوگوں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ 'راہ یاب نہیں کرے گا' میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کی ہدایت سے بہرہ یاب نہیں ہوں گے (واضح رہے کہ یہاں جو لوگ زیر بحث ہیں یہ قریش کے وہ سادات ہیں جو ان کی مذہبی پیشوائی کر رہے تھے) دوسرا یہ کہ خلق خدا کو گمراہ کرنے کی جو مہم یہ چلا رہے ہیں محض بے بنیاد افترا اور جھوٹ پر مبنی ہے اس وجہ سے یہ منہ کی کھائیں گے۔ اس میں ان کو کامیابی نہیں حاصل ہوگی۔ یہ گویا نہایت لطیف انداز میں بشارت ہے دعوتِ اسلامی کی کامیابی کی۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۡ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۴۵-۱۴۷)

ملتِ ابراہیمؑ میں چوپایوں میں سے کیا چیزیں حرام تھیں

'قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ' الآیۃ۔ اب یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ ملتِ ابراہیمؑ میں انعام میں سے کیا چیزیں حرام تھیں۔ اوپر کے مباحث سے یہ بات واضح ہے کہ یہاں مشرکین عرب کے ساتھ جو بحث چل رہی ہے وہ ملتِ ابراہیمؑ ہی سے متعلق ہے اور یہ بحث بھی خاص کر چوپایوں سے متعلق ہے اس لیے کہ انہی میں سے بعض کو انھوں نے جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہے، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت حرام ٹھہرا رکھا تھا۔ موقع و محل کی یہ خصوصیت مقتضی ہے کہ اس اعلان کو اس مخصوص زاویہ ہی سے دیکھا جائے یعنی

لوگوں نے اس نص کو اس کے موقع و محل سے ہٹا کر اس کو اسلام کے عام ضابطۂ حلت و حرمت کی حیثیت دے دی ہے وہ یہی اس غلط فہمی کے سبب سے خود بھی الجھن میں پڑے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھن میں ڈالنے کا سبب بنے ہیں اس لیے کہ اسلام میں صرف وہی چیزیں حرام نہیں ہیں جو آیت میں مذکور ہیں بلکہ ان کے علاوہ چیزیں بھی حرام ہیں۔ مثلاً درندے اور شکاری پرندے وغیرہ۔ اور اسلام ہی میں نہیں بلکہ خود ملتِ ابراہیمؑ میں بھی ان کے علاوہ چیزیں حرام تھیں لیکن یہاں چونکہ زیرِ بحث مسئلہ، جیسا کہ سیاق و سباق سے واضح ہے، اَنعام ہی کا تھا اس وجہ سے ان کے باب میں یہ وضاحت فرما دی کہ مشرکین نے جو چیزیں حرام ٹھہرا رکھی ہیں یہ محض من گھڑت ہیں۔ ملتِ ابراہیمؑ میں چوپایوں کی حلت و حرمت سے متعلق جو وحی مجھ پر آئی ہے اس میں ان من گھڑت حرمتوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔

عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗ (کسی کھانے والے پر جو اس کو کھائے) کے اسلوب میں جو تعمیم ہے اس سے مشرکین کے ان توہمات کی تردید ہو رہی ہے جو بعض مخصوص قربانیوں اور جانوروں سے متعلق وہ رکھتے تھے کہ ان کو خاص خاص لوگ ہی کھا سکتے تھے۔ ہر شخص ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ بعض جانوروں کے گوشت مرد ہی کھا سکتے تھے، عورتوں کے لیے ان کا کھانا حرام تھا (ملاحظہ ہوں آیات ۱۳۸-۱۳۹) قرآن کے ان الفاظ نے یہ واضح فرما دیا کہ جس طرح ان کی یہ مشرکانہ قربانیاں بے اصل و بے سند ہیں اسی طرح ان کے کھانے کے بارے میں ان کی یہ تفریق و تقسیم بھی محض ان کے واہمہ کی خلاقی ہے، ملتِ ابراہیمؑ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

ملتِ ابراہیم میں اشیاء کی حلت و حرمت کی بنیاد

اس آیت میں چار چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے۔ مردار، بہایا ہوا خون، سور کا گوشت اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ ان میں سے سابق الذکر تین چیزوں کی حرمت ان کی ظاہری نجاست کی بنا پر ہے۔ ان کے ذکر کے بعد فرمایا ہے فَاِنَّہٗ رِجْسٌ، ہمارے نزدیک اس کا تعلق مذکورہ تینوں ہی چیزوں سے ہے۔ ضمیر جب اس طرح واحد آتی ہے تو بعض اوقات جیسا کہ ہم آیت ۱۴۱ کے تحت ذکر کر چکے ہیں، وہ سابق الذکر ساری ہی چیزوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ گویا وہ ایک ایک چیز کی طرف فرداً فرداً لوٹتی ہے۔ آخری چیز کی حرمت باطنی نجاست کی بنا پر ہے۔ غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا شرک ہے اور شرک عقائدی نجاست ہے۔ اس وجہ سے جس چیز کو شرک کی چھوت لگ جاتی ہے وہ بھی نجس ہو جاتی ہے۔ اس عقائدی نجاست کو یہاں 'فسق' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملتِ ابراہیم میں اشیاء کی حلت و حرمت محض حکمی نہیں بلکہ فطری و عقلی بھی ہے۔ مذکورہ حرمتوں پر بھی اور اس کے ساتھ صورتِ اضطرار میں جو استثنا ہے اس پر بھی ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر چکے ہیں اس وجہ سے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

یہاں حلت و حرمت سے متعلق یہ بنیادی اصول ذہن میں رہے کہ ملتِ ابراہیم میں تمام طیبات حلال تھیں، حرام صرف خبائث تھیں، عام اس سے کہ یہ خباثت ظاہری ہو یا باطنی۔ یہی بنیادی اصول اسلام میں بھی ملحوظ ہے اس لیے کہ اسلام، جیسا کہ پچھلی سورتوں میں واضح ہو چکا ہے، یہودیت و نصرانیت کے برعکس ملتِ ابراہیمؑ پر مبنی ہے۔ آگے ہم اسلام کے اصول حلت و حرمت کی وضاحت کریں گے۔

یہود پر بعض طیبات حرام ہونے کی وجہ

'وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ الاية' ملتِ ابراہیمؑ کے بعد اب یہ ملت یہود کا ذکر فرمایا کہ ان کے اوپر بے شک بعض طیبات حرام کر دی گئی تھیں۔ مثلاً تمام ناخون والے جانور اور گائے بکری وغیرہ کی چربی لیکن یہ حرام کرنا اس لیے نہیں تھا کہ فی نفسہٖ یہ چیزیں قابلِ حرمت تھیں بلکہ یہ ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر ان پر حرام کی گئی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب ملتِ اسلام میں یہ حرمتیں باقی نہیں رہیں بلکہ تمام طیب چیزیں اس میں مباح کر دی گئیں اور یہود پر جو قیدیں اور پابندیاں (اصر و اغلال) عاید کی گئی تھیں وہ، جیسا کہ ان سے وعدہ کیا گیا تھا، خاتم الانبیاء کی بعثت کے بعد اٹھا لی گئیں۔

یہود پر 'ناخون والے جانور' اور چربی کی حرمت کا یہاں جو ذکر ہے اس کی وضاحت کے لیے ہم تورات کے بعض حوالے پیش کرتے ہیں۔ پہلے چربی کی حرمت کے مسئلہ کو لیجیے۔

> اور خداوند نے موسیٰ سے کہا بنی اسرائیل سے کہہ تم لوگ نہ تو بیل کی، نہ بھیڑ کی اور نہ بکری کی کچھ چربی کھانا۔ جو جانور خود بخود مر گیا ہو اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ پر تم کسی حال میں نہ کھانا کیونکہ جو کوئی ایسے چوپائے کی چربی کھائے جسے لوگ آتشیں قربانی کے طور پر خداوند کے حضور چڑھاتے ہیں وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے۔
>
> احبار باب ۲۲-۲۵

دوسرے مقام میں چربی کی ان تمام قسموں کی تفصیل بھی ہے جو اُن کے لیے حرام ٹھہرائی گئیں۔

> جس چربی سے انتڑیاں ڈھکی رہتی ہیں اور وہ سب چربی جو انتڑیوں پر لپٹی رہتی ہے اور دونوں گردے اور ان کے اوپر کی چربی جو کمر کے پاس رہتی ہے اور جگر پر کی جھلی گردوں سمیت ان سبھوں کو وہ الگ کرے اور کاہن ان کو مذبح پر جلائے۔ یہ اس آتشیں قربانی کی غذا ہے جو راحت انگیز خوشبو کے لیے ہوتی ہے۔ ساری چربی خداوند کی ہے۔ یہ تمہاری سب سکونت گاہوں میں نسل در نسل ایک دائمی قانون رہے گا کہ تم چربی یا خون مطلق نہ کھاؤ۔ احبار باب ۳ ۱۵-۱۷

قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چربی گوشت کے جزو کی حیثیت رکھتی ہو، کمر یا آنتوں یا ہڈیوں میں اس طرح شامل ہو کہ اس کو بآسانی الگ نہ کیا جا سکے اس کے سوا تمام چربی بنی اسرائیل پر حرام تھی۔ یہی بات عقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے لیکن تورات کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چربی مطلق حرام تھی۔ ہمارے نزدیک یہ تشدد یہود کے کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے اس تشدد پر ایک مزید اضافہ ہے

جو ان کی شریعت میں پہلے بھی کچھ کم نہ تھا، چربی تو درکنار، خون بھی آخر کچھ نہ کچھ تو گوشت کے جزو کی حیثیت سے رہ ہی جاتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اوپر خون کی جو حرمت بیان ہوئی ہے اس کے ساتھ 'مسفوح' کی قید لگی ہوئی ہے کہ پابندی اسی حد تک رہے جس حد تک دائرہ فطرت کے اندر ہے اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

'کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ' سے کیا مراد ہے؟ ظفر، یوں تو ناخون کو کہتے ہیں۔ لسان میں ہے 'الظفر یکون للانسان' ظفر انسان کے ناخون کو کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ 'الظفر لما لا یصیید والمخلب لما یصیید' جو جانور شکار نہیں کرتے ان کے ناخون کو ظفر کہتے ہیں، جو شکار کرتے ہیں ان کے پنجے کو 'مخلب' کہتے ہیں۔

تورات کے مطالعہ سے حرام و حلال کی جو تفصیل سامنے آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ہاں چوپایوں میں سے صرف وہ چوپائے حلال تھے جن کے پاؤں چرے ہوئے ہیں اور وہ جگالی بھی کرتے ہیں۔ جن کے اندر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو وہ اُن کے ہاں حرام ہے۔ چنانچہ اونٹ، سافان اور خرگوش اور وہ تمام جانور جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں یہود کے ہاں حرام ہیں۔ اس روشنی میں 'ذِیْ ظُفُرٍ' کا مفہوم متعین کیا جائے تو اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ سُم کی شکل میں وہ بند اور ان کے سامنے کے حصہ پر ناخون ہیں۔ یہود پر اس طرح کے تمام جانور، جیسا کہ 'کُلّ' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے علی الاطلاق حرام تھے اس وجہ سے ان پر بعض وہ جانور بھی حرام ہو گئے جو ملت ابراہیمؑ میں جائز تھے مثلاً اونٹ خرگوش وغیرہ۔

'ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ' یعنی ناخون والے جانوروں اور چربی کی علی الاطلاق حرمت بنی اسرائیل پر اس وجہ سے نہیں تھی کہ فی نفسہٖ ان چیزوں کے اندر حرمت کی کوئی علت موجود ہے بلکہ ان کی حرمت میں اصل دخل بنی اسرائیل کے فساد مزاج کو تھا جس طرح ایک طبیب بسا اوقات کسی مریض کو ایک جائز و طیب چیز کے استعمال سے بھی روک دیتا ہے کہ اس سے اس کی صحت جسمانی کو ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اخلاقی فساد کے سبب سے، سزا کے طور پر، بہت سی جائز چیزیں بھی ان پر حرام ٹھہرا دیں۔ اس اخلاقی فساد کو قرآن نے 'بغی' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ بنی اسرائیل کی اس سرکشی کا ذکر تورات اور انبیا کے صحیفوں میں اس کثرت سے آیا ہے کہ آدمی پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس کو انھوں نے بخوشی قبول کیا ہو۔ جو حکم بھی ان کو دیا گیا اوّل تو انھوں نے اپنے سوال در سوال کی کثرت ہی سے اس کو نہایت بوجھل بنا لیا، جس کی ایک مثال سورہ بقرہ میں گائے کے قصے میں گزر چکی ہے۔ پھر اس کو مانا بھی تو اس سے گریز و فرار کی اتنی راہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے نکال لیں کہ عملاً وہ حکم اُن کے لیے بالکل بے اثر ہو کے رہ گیا۔ ان کے اس فرار پسندانہ اور باغیانہ مزاج کا اثر قدرتی طور پر ان کی شریعت پر بھی پڑا۔ جس طرح کسی سرکش جانور کا مالک اس کو سخت بندھنوں کے اندر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے یا سرکش رعایا کا حکمران سخت قوانین نافذ کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کو نہایت

سخت قوانین ہیں باندھا جن کو قرآن میں 'اصر و اغلال' یعنی بندھن اور طوق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ تورات میں اسرائیلی شریعت کے احکام پڑھیے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دوسری چیزوں سے قطع نظر صرف طہارت ہی کے احکام پڑھیے اور دیکھیے کہ حیض، نفاس، جنابت اور بعض بیماریاں مثلاً جریان اور برص وغیرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں ان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے تھے تو آدمی کا رواں رواں اس رب کا شکر گزار ہوتا ہے جس نے ہمیں ملتِ اسلام کی ہدایت بخشی جو ان تمام غیر فطری بندشوں اور پابندیوں سے پاک ہے۔ کھانے پینے کے باب میں بھی صرف وہی بندشیں نہیں تھیں جو بیان ہوئیں۔ یہ بندشیں تو صرف چوپایوں کی حلت و حرمت کے متعلق بیان ہوئی ہیں، اس سے زیادہ پابندی ان پر دریائی جانوروں کے معاملے میں تھی۔ احبار باب ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جانوروں میں سے جن کے پر اور چھلکے ہیں وہ ان کے ہاں جائز تھے باقی سب حرام تھے۔ اسی طرح پرندوں میں سے صرف شکاری پرندے ہی حرام نہیں تھے بلکہ قاز، لط اور بگلے وغیرہ بھی حرام تھے۔

ان چیزوں کے حرام کیے جانے کی علت، جیسا کہ واضح ہوا، یہود کی سرکشی اور گردن کشی تھی اور اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں بیان ہو چکا ہے، یہود کو یہ احکام دیتے وقت ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ جب آخری نبی آئیں گے تو اگر تم ان پر ایمان لائے تو وہ یہ پابندیاں تم پر سے اٹھا دیں گے اس لیے کہ ان کی بعثت دینِ فطرت، ملت ابراہیم پر ہوگی جس میں اس قسم کی کوئی ناروا پابندی نہیں ہوگی۔

'وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ' کے الفاظ یہاں بہت بلیغ ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے ہونے پر جو آتنا زور دیا ہے تو مقصود صرف اپنے سچے ہونے کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس میں حریف کے جھوٹے ہونے کا اعلان بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ملت ابراہیمؑ اور شریعت بنی اسرائیل سے متعلق یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے ہم اس میں بالکل سچے ہیں اور جو اس کے خلاف یہ قریش اور یہود کے مفسدین دعویٰ کر رہے ہیں یہ بالکل جھوٹے ہیں۔

'فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ' یہ قریش اور بنی اسرائیل دونوں کو دھمکی ہے۔ پیغمبر کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس ساری وضاحت کے بعد بھی اگر یہ تم پر ایمان نہ لائیں، بدستور تمہارے جھٹلانے ہی پر اڑے رہیں تو ان کو سنا دو کہ اللہ چونکہ بڑی وسیع رحمت والا ہے، وہ سرکشوں اور ہٹ دھرموں کو بڑی دور اور بڑی دیر تک ڈھیل دیتا ہے تاکہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، اس وجہ سے وہ تمہیں ڈھیل پر ڈھیل دے رہا ہے۔ اس ڈھیل سے مغرور نہ ہو جاؤ۔ ڈھیل بہرحال ڈھیل ہے۔ اس سے اللہ کی پکڑ کچھ پیچھے تو بے شک ہو جاتی ہے لیکن اس سے اس کی وہ سنت باطل نہیں ہو جاتی جو مجرموں کی پکڑ کے لیے اس نے ٹھہرا رکھی ہے۔ جب اس کی اس سنت کے ظہور کا وقت آ جائے گا تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکے گی۔

اوپر ملت ابراہیمؑ اور شریعت بنی اسرائیل کی جو حرمتیں بیان ہوئی ہیں اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ مشرکین نے بلا سند بہت سی چیزیں جو حرام ٹھہرا رکھی تھیں ان کی حرمت کو ملت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح یہود بہت سی چیزوں کی حرمت کے جو مدعی تھے تو ان کی حرمت اصلاً نہیں بلکہ ان کے فسادِ مزاج

کے سبب سے مصلحتاً تھی اور وعدۂ الٰہی کے مطابق ان پابندیوں کو آخری بعثت کے ذریعے سے دُور ہونا تھا، چنانچہ وہ، جیساکہ سورۂ مائدہ میں بیان ہوا، خاتم الانبیار صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دُور کر دی گئیں۔ اب اس ملت میں حرام وہی چیزیں ہیں جو عقل و فطرت کی رُو سے حرام ہونی چاہئیں، مشرکین کی بدعات اور یہود کے تشددات سے اس ملت کا ضابطۂ حلت و حرمت پاک ہے۔

اسلام کا ضابطۂ حلت و حرمت

ہم اختصار کے ساتھ یہاں اسلام کا وہ ضابطۂ حلت و حرمت بھی پیش کیے دیتے ہیں جو قرآن نے بیان فرمایا ہے۔

قرآن نے حلت و حرمت کی فطری بنیاد یہ بتائی ہے کہ جو طیبات ہیں وہ حلال ہیں، جو خبائث ہیں وہ حرام ہیں۔ چنانچہ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعریف بیان ہوئی ہے۔

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ، ۵ اعراف

وہ ان کو حکم دیتا ہے معروف کا اور روکتا ہے منکر سے اور ان کے لیے جائز کرتا ہے پاکیزہ چیزیں اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزیں اور ان سے دُور کرتا ہے وہ بوجھ اور وہ پابندیاں جو ان پر اب تک تھیں۔

'طیبات' سے مراد، ظاہر ہے کہ وہ چیزیں ہیں جو اپنے مزاج، اپنی سرشت اور انسان کے اوپر اپنے اثرات کے اعتبار سے پاکیزہ، معتدل، صحت بخش اور نافع ہیں۔

'خبیثات' سے مراد اس کے برعکس وہ چیزیں ہیں جو اپنے مزاج، اپنی جبلت اور انسان کے مزاج و طبیعت پر اپنے اثرات کے لحاظ سے مضر، انحراف انگیز اور مفسد ہیں۔

ان دونوں چیزوں کے اندر مذکورہ صفات کے اعتبار سے تفاوتِ درجات اور فرق مراتب ہوتا ہے، کوئی چیز زیادہ طیب ہوتی ہے، کوئی چیز کم، اسی طرح کوئی چیز زیادہ خبیث ہوتی ہے کوئی کم۔ اس فرق مراتب کا اثر لازماً اس سے متعلق حکم پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً ایک چیز حرام کر دی جاتی ہے، دوسری چیز کراہت کے درجے ہی میں رہتی ہے۔

اسی طرح بعض حالات میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز کے اندر بجائے خود تو کوئی خرابی نہیں ہوتی لیکن کسی خارجی سبب سے اس کو کوئی خرابی لاحق ہو جاتی ہے اور وہ خبیث بن جاتی ہے۔ مثلاً غیر اللہ یا کسی تھان اور استھان کا ذبیحہ، جوئے کے ذریعہ سے حاصل کیا ہوا گوشت یا حالت احرام میں کیا ہوا شکار۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اشیا کے درمیان خبیث و طیب کا فرق محض ایک امر اضافی ہے۔ اس کی کوئی فطری یا عقلی و اخلاقی بنیاد نہیں ہے۔ ایک ہی چیز ایک قوم کے نزدیک حلال و طیب ہوتی ہے، وہی چیز دوسری قوم کے نزدیک خبیث و حرام قرار پاتی ہے۔ ایسا سمجھنا صریح سوفسطائیت ہے۔ یہ کہنا درحقیقت دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ حق و باطل، عدل و ظلم اور خیر و شر بھی محض اضافی امور ہیں۔ ان کی کوئی عقلی و فطری بنیاد

نہیں ہے۔ اس مغالطے پر انشاء اللہ ہم کسی موزوں مقام پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

اسی طیب و خبیث کو معیار بنا کر اسلام نے چوپایوں میں سے وہ تمام چوپائے حلال ٹھہرائے جو انعام میں سے ہیں یا وحشی جانوروں میں سے انعام کے حکم میں داخل ہیں۔ مائدہ کے شروع میں اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ کے الفاظ آئے ہیں اور وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ انعام کا لفظ اونٹ، گائے، بھیڑ بکری کے لیے معروف تھا۔ اس کی طرف بَهِيمَة کی اضافت نے اس میں وسعت پیدا کر دی اور وہ سارے جانور بھی اس میں شامل ہو گئے جو انعام کی جنس سے تعلق رکھنے والے ہیں عام اس سے کہ وہ پالتو ہیں یا وحشی، مثلاً بھینس، چھترے، دنبے، نیل گاؤ، ہرن، چیتل، بارہ سنگھے وغیرہ۔ البتہ وہ جانور اس سے نکل جائیں گے جو درندوں کے حکم میں داخل ہیں اس لیے کہ وہ 'بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ' کے تحت نہیں آتے مثلاً شیر، ریچھ، بھیڑیے، کتے وغیرہ۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درندہ جانوروں کو حرام قرار دیا۔ اسی طرح مردار، خنزیر، بہایا ہوا خون اور غیر اللہ کے نام یا تھان اور استھان کا ذبیحہ بھی حرام ہے۔ اس لیے کہ ان میں نجاست و خباثت ہے۔ بعض کے اندر ظاہری نجاست ہے بعض کے اندر عقلی۔

یہی ضابطہ پرندوں پر بھی لاگو ہوگا۔ ان میں سے بھی جو درندوں کی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً چیل، باز، عقاب، شکرے وغیرہ یا ان کے اندر کوئی اس نوع کی خباثت پائی جاتی ہے جو اوپر مذکور ہوئی وہ حرام ہیں باقی جائز۔

یہی ضابطہ دریائی جانوروں اور ہوام و حشرات پر بھی نافذ ہوگا۔ ان میں سے بھی خبیث و طیب کے اسی اصول کو سامنے رکھ کر فرق کیا جائے گا جو اوپر مذکور ہوا۔

اسی ضابطہ پر وہ چیزیں بھی پرکھی جائیں گی جو نباتات میں سے ہیں یا نباتات کی ترکیب و تحلیل سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً شراب خواہ کسی چیز سے تیار کی جائے حرام ہے اس لیے کہ اس میں عقلی و اخلاقی خباثت ہے۔

اسلام میں حلت و حرمت کا اصل ضابطہ یہی ہے۔ اس ضابطہ کی روشنی میں حلال بین اور حرام بین کا متعین کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے لیکن نہ دنیا میں چوپایوں کی کوئی حد ہے، نہ پرندوں کی اور نہ دریائی جانوروں کی، اس وجہ سے بہت سی چیزوں کے بارے میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے فقہا نے مختلف چیزوں کے بارے میں اختلاف کیا بھی ہے۔ یہ اختلاف فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے۔ بعض لوگ بعض چیزوں کو درندوں میں داخل کرتے ہیں، بعض نہیں داخل کرتے، اسی طرح بعض چیزوں کو بعض فقہا خبیث قرار دیتے ہیں بعض ان کو خبیث نہیں قرار دیتے۔ ہمارے نزدیک اس باب میں حنفیہ کا مسلک قرآن کے بیان کردہ اصول حلت و حرمت سے زیادہ اوفق ہے لیکن اس طرح کے مسائل میں، جن کے اندر اختلاف کی گنجائش ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی ان کو متشابہات کے درجہ میں رکھے۔ یعنی ان سے احتراز کرے، اگر اس کے نزدیک احتراز کا پہلو راجح ہے، لیکن دوسرے کو مرتکب حرام قرار نہ دے۔ حدیثوں میں گوہ کے باب میں حضورؐ کا جو ارشاد نقل ہے وہ اس طرح کے مسائل میں بہترین رہنمائی دیتا ہے۔

البتہ ایک تنبیہ یہاں ضروری ہے۔ بعض صحابہؓ کے متعلق بعض کتابوں میں یہ جو نقل ہوا ہے کہ وہ اسلام میں صرف وہی چار چیزیں حرام مانتے تھے جو اوپر 'قُلْ لَآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ' والی آیت میں مذکور ہیں، یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے نقل میں راویوں سے تسامح ہوا ہے۔ صحابہؓ میں سے کسی کی طرف اس بات کی نسبت بعید از عقل ہے۔ ان میں کسی نے اگر کہی ہوگی تو یہ بات کہی ہوگی کہ ملت ابراہیم میں بس یہی چار چیزیں چوپایوں میں سے حرام تھیں۔ یہ بات کہنے کا ایک محل ہے جس کی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسی بات کو غلط فہمی کی بنا پر راوی نے یہ شکل دے دی کہ وہ اسلام میں بس یہی چار چیزیں حرام مانتے تھے۔

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ ؕ کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ حَتّٰی ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ ھَلْ عِنْدَکُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْہُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَھَدٰىکُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ قُلْ ھَلُمَّ شُھَدَآءَکُمُ الَّذِیْنَ یَشْھَدُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ ھٰذَا ۚ فَاِنْ شَھِدُوْا فَلَا تَشْھَدْ مَعَھُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَھُمْ بِرَبِّھِمْ یَعْدِلُوْنَ (۱۴۸-۱۵۰)

مشرکین کا آخری معارضہ

'سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا الایۃ' اب یہ مشرکین کا آخری معارضہ نقل فرمایا ہے اور اس کا جواب دیا ہے۔ مشرکین جب ہر طرف سے بحث میں پسپا ہو جاتے تو آخری بات یہ کہتے کہ اگر ہم نے خدا کا شریک ٹھہرانے اور کسی چیز کو حرام قرار دینے کے معاملے میں خدا کی مرضی کی مخالفت کی ہے تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے اس نے اپنے اختیار سے ہم کو روک کیوں نہیں دیا؟ جب اس نے اپنے اختیار کے زور سے ہم کو نہیں روکا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہم نے کیا اور کر رہے ہیں یہی اس کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معارضہ ایک بالکل ہی احمقانہ معارضہ ہے۔ انسانوں کو کسی قول یا فعل کی آزادی ملنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ قول یا فعل عند اللہ بھی صحیح ہے۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو یہ دلیل ہر احمق اپنی حماقت کے جواز میں، ہر ظالم اپنے ظلم کی حمایت میں اور ہر بدمعاش اپنی بدمعاشیوں کے حق میں پیش کر سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے کیا اور کر رہا ہے خدا کے حکم سے کیا اور کر رہا ہے۔ فرمایا کہ یہ معارضہ محض ان کی شرارت کی ایجاد اور اپنی ضد پر اڑے رہنے کا بہانہ ہے۔ یہی روش ان کے پچھلے ہم مشربوں نے اختیار کی یہاں تک کہ وہ خدا کے عذاب سے دوچار ہوئے۔ یہی انجام ان کا ہونا ہے تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔

قریش سے کسی علمی دلیل کا مطالبہ

'قُلْ ھَلْ عِنْدَکُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْہُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ' مطلب یہ ہے کہ ان سے کہو کہ خدا کی پسند یا ناپسند معلوم کرنے کا ذریعہ تمہاری اپنی زندگی اور تمہارے اپنے اعمال نہیں ہیں کہ تم جو کچھ کر گزرو وہ عند اللہ ثواب بن جائے۔ اس کے لیے کسی علمی سند کی ضرورت ہے۔ یا تو خدا نے تم کو اس کا حکم دیا ہو جس کا کوئی ثبوت موجود ہو یا عقل و فطرت کے اندر اس کے حق میں کوئی شہادت ہو جس کو تم پیش کر سکو۔ اس قسم کی کوئی چیز

تو تمھارے پاس ہے نہیں، محض اٹکل کے تیر تکے چلاتے اور قیاس کے گھوڑے دوڑاتے ہو۔ حالانکہ وہم و گمان علم کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ اب یہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی جو اصل سنت ہے وہ واضح فرمائی کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی مشیت کے زور سے جس کو چاہے ہدایت پر کردے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اس کی اس مشیت کو کوئی روک تو نہیں سکتا تھا، وہ تم سب کو بلکہ ساری خلق کو ہدایت پر کر دیتا لیکن اس معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ دلیل و حجت کے ذریعہ سے وہ رہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کو اس نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس رہنمائی کو قبول کریں اور چاہیں تو رد کریں۔ پس اللہ نے اپنی یہ حجت بالغہ اپنے رسول کے ذریعے سے تم کو پہنچا دی۔ تمھارے پاس تو محض ظن و گمان ہے مگر اللہ کے پاس عقل و دل میں اتر جانے والی دلیلیں ہیں بشرطیکہ تم ان کے سننے اور سمجھنے کے لیے اپنے کانوں اور اپنے دلوں کو کھولو۔ ہدایت حاصل کرنے کی راہ یہی ہے۔ خدا اپنی مشیت کے زور سے کسی کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ یہ تو حجت و دلیل اور عقل و دل کا سودا ہے۔

گواہی کے لیے دو بنیادیں

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا مطلب یہ ہے کہ محض اٹکل کے تیر تکے نہ چلاؤ۔ ہاں اگر تمھارے پاس ایسے گواہ ہوں جو یہ گواہی دے سکیں کہ جو چیزیں تم نے حرام ٹھہرا رکھی ہیں خدا نے وہ حرام ٹھہرائی ہیں تو ان گواہوں کو سامنے لاؤ۔ یہ واضح رہے کہ معقول گواہی صرف دو بنیادوں پر ہوتی ہے؛ ایک تو ذاتی مشاہدہ اور شخصی علم و واقفیت پر، دوسری کسی عقلی یا فطری قرینہ پر جس کی مثال سورۂ یوسف کی آیت ۲۶-۲۸ میں موجود ہے۔ یہاں قرآن نے ان دونوں ہی قسم کے گواہوں اور گواہیوں کا مطالبہ کیا ہے کہ اس طرح کی کوئی گواہی بھی موجود ہو تو اس کو پیش کرو، ورنہ اس حجت بالغہ کو قبول کرو جو قرآن تمھارے آگے پیش کر رہا ہے۔

جن کے پاس دلیل نہیں وہ خواہشوں کے پیرو ہیں

فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا الاٰية یعنی اگر گواہی کی مذکورہ شرطوں کے بغیر ہی یہ گواہی دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو تمھیں ایسے لاٹیوں اور ہرزہ سراؤں کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی دعوت و شہادت پر جمے رہو۔ ان لوگوں کی خواہشات و بدعات کی پیروی نہ کرو۔ یہاں ان کی بدعات کو 'اَهْوَآء' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے کہ جس چیز کے حق میں نہ کوئی نقلی دلیل ہو نہ عقلی، ظاہر ہے کہ وہ اس کے اختیار کرنے والوں کی خواہش ہی پر مبنی ہو سکتی ہے اور جن کی رہنما ان کی خواہش ہو ان کا انجام معلوم۔ یہاں ان لوگوں کی تین صفات کا حوالہ دیا ہے۔ ایک یہ کہ یہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں، دوسری یہ کہ یہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، تیسری یہ کہ یہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ مقصود ان صفات کے حوالہ سے یہ ہے کہ جو لوگ اتنے نگ مٹ ہیں کہ خدا، آخرت اور آیاتِ الٰہی میں سے کوئی چیز بھی ان کے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں، ایسے عناں گسیختہ لوگوں کی خواہشیں ان کو کہاں لے جائیں گی، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے!

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۵۱-۱۵۳)

اصلِ ملتِ ابراہیم کی تفصیل

'قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا' یہ اصل ملت ابراہیمی کا تفصیلی بیان ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلایا کہ تم نے تو محض اپنے ظن و گمان سے ملتِ ابراہیم کی بعض طیب حلال چیزوں کو اپنے مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھہرا کر یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس کل ملتِ ابراہیم یہی ہے اور تم نے اس کا حق ادا کر دیا، حالانکہ ملت ابراہیم میں دوسری بہت سی باتیں، جو خدا اور بندوں کے حقوق و معاملات سے متعلق حرام ہیں، ان کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ تو آؤ، میں تمہیں سناتا ہوں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا کیا چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔ فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جو تم پر حرام کی گئی وہ شرک ہے لیکن شرک کو تم نے اپنا دین بنا رکھا ہے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

'وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا' خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ اب یہ اس کا ذکر فرمایا۔ یہ ہے تو اسی اوپر والی بات ہی کے تحت لیکن اس کو منفی کے بجائے مثبت پہلو سے ذکر فرمایا۔ زیرِ بحث آیات میں اسلوب کی یہ ندرت قابلِ لحاظ ہے کہ بعض باتیں منفی پہلو سے بیان ہوئی ہیں، بعض مثبت پہلو سے۔ مثلاً شرک، قتلِ اولاد، فحشا، قتلِ نفس اور اکلِ مالِ یتیم کا ذکر تو منفی پہلو سے ہے اور والدین کے ساتھ احسان، ایفائے کیل و میزان، قول و عمل میں اہتمام عدل اور ایفائے عہدِ الٰہی کا ذکر مثبت اسلوب سے ہے۔ بعینہٖ یہی اسلوب، بعینہٖ انہی امور کے بیان میں بنی اسرائیل کی آیات ۲۲-۳۸ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی کا استنباط ایک بدیہی چیز ہے۔ جب ایک شے کا اثباتی انداز میں حکم ہے تو اس کے لازمی معنی یہ ہیں کہ جو چیز اس کی ضد ہے اس کی لازماً ممانعت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک چیز کی ممانعت ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اس کا مقابل پہلو مطلوب ہے۔ یعنی اگر شرک کی نہی ہے تو توحید مطلوب ہے، علیٰ ہذا القیاس اگر والدین کے حقوق کی ادائیگی کا حکم ہے تو ان کے ساتھ بدسلوکی اور ان کی نافرمانی حرام ہے۔ اس اسلوب کی روشنی میں وہ تمام باتیں جو بیان تو ہوئی ہیں اثبات کے الفاظ میں لیکن ہیں ظاہری تالیفِ کلام کے اعتبار سے 'حَرَّمَ' ہی کے تحت ان سب کے ضد پہلو کو بھی مدِنظر رکھیے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ نہ والدین کو اُف کہو، نہ جھڑکو بلکہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اس

اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں جو پہلو زیادہ زور و قوت سے ظاہر کرنے کا ہے وہ تو الفاظ میں بیان ہو جاتا ہے اور اس کا ضد پہلو بغیر الفاظ کی مدد کے مجرد فحوائے کلام اور اقتضائے نظام سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ قرآن نے اس اسلوب کے مضمرات کہیں کہیں کھول بھی دیے ہیں۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے۔

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ	اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نہ عبادت کرو مگر
وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ	اسی کی اور والدین کے ساتھ احسان کرو جیسا کہ اس کا
عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ	حق ہے۔ اگر تمھارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں
کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ	بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان سے اظہار بیزاری ہو،
وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا	نہ ان کو جھڑکنا، ان سے سعادت مندانہ بات کرنا اور
کَرِیْمًا ہ وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ	ان کے لیے مہر و وفا کے بازو جھکائے رکھنا اور دعا
مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا	کرنا کہ اے رب تو ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے
رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ۲۳-۲۴ بنی اسرائیل	مجھے بچپن میں مہر کے ساتھ پالا۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاھُمْ' 'املاق' کے معنی فقر و تنگ دستی کے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں 'خشیۃ املاق' کے الفاظ ہیں۔ یعنی اس اندیشہ سے کہ اولاد کیا کھائے گی، کہاں سے اس کی پرورش ہوگی، اس کو قتل نہ کرو۔ اہل عرب میں قتل اولاد کی ایک قسم تو وہ تھی جس کا تعلق مشرکانہ توہمات سے تھا، جس کا ذکر اسی سورہ میں پیچھے گزرا ہے، دوسری صورت بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی تھی جس کا سبب غیرت کا ظالمانہ حد تک غلو تھا۔ تیسری یہ فقر و فاقے کے اندیشے کی صورت تھی۔ بعض غریب لوگ تنگ دستی سے گھبرا کر یہ سنگ دلانہ حرکت کر بیٹھتے۔ اس قسم کی لرزہ خیز خبریں اب بھی کبھی کبھی ان ملکوں سے آ جاتی ہیں جن میں غربت زیادہ ہے یا جہاں کسی ناگہانی آفت سے لوگ مصائب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس ظلم کا اصل باعث انسان کی یہ جہالت ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنا اور اپنی اولاد اور متعلقین کا روزی رساں سمجھ بیٹھتا ہے حالانکہ ہر شخص کو وجود اور رزق خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ انسان ان چیزوں میں واسطہ اور ذریعہ ہونے سے زیادہ دخل نہیں رکھتا۔ اگر کسی کو خدا نے اولاد بخشی ہے تو اولاً وہ اس کی تحویل میں خدا کی امانت ہے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ عقل و فطرت اور شریعت کی رُو سے اس امانت سے متعلق اس پر جو ذمہ داریاں اور جو فرائض عاید ہوتے ہیں وہ اپنے امکان کے حد تک ادا کرے۔ لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ خدا نے اس کو ان کا رزاق بنایا ہے اور جس رزق سے وہ پلتے ہیں یہ وہ ان کو فراہم کرتا ہے۔ ان کا رزق تو درکنار آدمی اپنا رزق بھی خدا ہی سے پاتا ہے۔ بچہ ماں کی چھاتی سے جو دودھ پیتا ہے یہ بھی ماں کا دیا ہوا نہیں بلکہ اپنے رب کا دیا ہوا پیتا ہے

قتل اولاد فقر و فاقہ کے اندیشہ سے

تو جب بچہ اپنے رب کا دیا ہوا کھاتا پیتا ہے تو کسی دوسرے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کو اس اندیشہ سے قتل کرے کہ ہیں اس کی پرورش کہاں سے کروں گا؟ قرآن نے اسی حقیقت کو یوں سمجھایا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی روزی دیتے ہیں)۔

خاندانی منصوبہ بندی

افراد کی طرح بعض اوقات حکومتیں بھی اپنے دائرۂ اختیار اور اپنے فطری و شرعی حدود کار سے متجاوز ہو کر ان حدود میں مداخلت کرنے لگتی ہیں جو قدرت کے حدود ہیں۔ اس تعدی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خلق کے لیے کوئی مفید کام کرنے کی جگہ وہ اپنی صلاحیتیں نظام قدرت سے زور آزمائی ہیں صرف کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک فرض شناس حکومت کے لیے یہ بات تو معقول ہے کہ وہ اپنے ملک کے وسائل معاش کو ترقی دینے کے لیے بر و بحر کے ایک ایک چپہ اور ایک ایک گوشے کو چھان ڈالے اور اس راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے۔ یہ بات بھی اس کے فطری بلکہ شرعی فرائض میں سے ہے کہ وہ ملک کے عوام کو زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ وہ پبلک ہو یا پرائیویٹ، اجتماعی ہو یا خاندانی، احتیاط، اعتدال، کفایت شعاری، صحت، صفائی اور محنت کی تربیت دے لیکن یہ امر بالکل اس کے دائرۂ اختیار اور حدود کار سے باہر ہے کہ وہ یہ منصوبہ بندی کرے کہ اتنی مدت میں ہم اتنا غلّہ پیدا کریں گے اور اسی حساب سے اتنے بچوں کو پیدا ہونے دیں گے اور اگر کسی مزید ناخواندہ مہمان نے ہماری پی روٹی اور گنی بوٹی میں حصہ دار بننے کی کوشش کی تو ہم اپنی سائنسی تدبیروں سے کام لے کر اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس معاملے میں جو غلط فہمی عرب جاہلیت کے سنگدلوں کو لاحق ہوئی تھی اسی غلط فہمی کا شکار اس زمانے کی متمدن حکومتیں ہو رہی ہیں۔ انھیں بھی خدا پر غصہ تھا کہ جب وہ بھرپور روٹی نہیں دے رہا ہے تو دمبدم اولاد میں کیوں اضافہ کیے جا رہا ہے؟ یہ غصہ وہ اولاد کو قتل کر کے نکالتے تھے۔ اس زمانے کے متمدن انسان کو بھی یہ برہمی ہے کہ ابھی جب اپنے ہی معیار زندگی کو ہم اپنے مطلوبہ معیار پر نہ پہنچا سکے تو دوسروں کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر کس طرح اٹھالیں؟ اس برہمی یا گھبراہٹ میں انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیم بنا ڈالی۔ شکلیں ذرا بدلی ہوئی ہیں، عرب اجڈ اور گنوار تھے اس وجہ سے انھوں نے ایک ناتراشیدہ اور بھونڈی سی شکل اختیار کی، موجودہ زمانے کا انسان مہذب اور تعلیم یافتہ ہے اس وجہ سے اس نے ایک خوب صورت سی شکل اختیار کی ہے اور نام بھی اس کا اس نے پیارا سا ڈھونڈھ نکالا ہے لیکن فلسفہ دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ انھوں نے بھی رزاق اپنے کو سمجھا اور یہ بھی رزاق اپنے کو سمجھے بیٹھے ہیں حالانکہ رزاق اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن نے عربوں پر تو ان کی غلطی واضح کر دی اور وہ یہ بات سمجھ بھی گئے، مان بھی گئے، لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے جنوں کو کون سمجھائے اور کون قائل کرے!!

زنا اور محرکاتِ زنا

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، 'فَوَاحِش' کے معنی کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کے ہیں،

جن میں اولین درجہ زنا کو حاصل ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو یوں ادا فرمایا ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا (۳۲) (اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو، یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی بری راہ ہے) 'لَا تَقْرَبُوا' کا لفظ ان برائیوں سے روکنے کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے جن کا پرچھاواں بھی انسان کے لیے مہلک ہے، جو خود ہی نہیں بلکہ جن کے دواعی و محرکات بھی نہایت خطرناک ہیں، جو بہت دور سے انسانوں پر اپنی کمند پھینکتی ہیں اور پھر اس طرح اس کو گرفتار کر لیتی ہیں کہ ان سے چھوٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی برائیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے میں آدمی کو کامیابی صرف اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنی نگاہ، اپنی زبان، اپنے دل کی پوری پوری حفاظت کرے اور ہر اس رخنہ کو پوری ہوشیاری سے بند رکھے جس سے کوئی ترغیب اس کے اندر راہ پا سکتی ہو اور ہر ایسے مقام سے پرے پرے رہے جہاں کوئی لغزش ہو سکتی ہے۔ اسی 'لَا تَقْرَبُوا' کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے قرآن نے مردوں اور عورتوں دونوں پر بہت سی پابندیاں عاید کی ہیں جن کی تفصیل احزاب اور نور میں بیان ہوئی ہے۔ وہاں ہم انشاء اللہ اس کے سارے پہلوؤں پر بحث لائیں گے۔

نیکیوں اور بدیوں دونوں سے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا اصل منبع انسان کا دل ہوتا ہے اس وجہ سے کوئی نیکی اس وقت تک فروغ نہیں پاتی جب تک دل کے اندر اس کی جڑ مضبوط نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی برائی اس وقت تک انسان کی جان نہیں چھوڑتی جب تک دل کے اندر سے اس کی جڑ اکھاڑ نہ دی جائے۔ اگر کوئی برائی دل کے اندر موجود رہے تو وہ کان، آنکھ، زبان، فکر اور خیال کی راہ سے برابر غذا حاصل کر کے موٹی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ روحانی سرطان کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور گو اس کو زندگی میں ایک دن بھی فعلاً بروئے کار آنے کا موقع نہ ملا ہو تاہم انسان کے قلب و دماغ پر اس کا اس طرح تسلط ہو جاتا ہے کہ پھر تزکیہ و اصلاح کا کوئی سخت سے سخت اپریشن بھی اس پر کارگر نہیں ہوتا سوہ بالآخر انسان کی اخلاقی و ایمانی موت ہی پر منتہی ہوتی ہے اس وجہ سے قرآن نے ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے فحشا سے دور رہنے کی تاکید فرمائی۔

قتل نفس

'وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ' ہر جان بجائے خود محترم ہے اس وجہ سے اس کی صفت 'الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ' (جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا) وارد ہوئی۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ جان ہے جو کسی حق شرعی یا بالفاظ دیگر قانون کے تحت مباح الدم قرار پا جائے۔ مثلاً کسی پر قصاص عاید ہو یا وہ اللہ و رسول کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہو یا زنا کی اس شکل کا مرتکب ہوا ہو جس پر رجم کی سزا ہے۔ اس قسم کے حق شرعی و قانونی کے بغیر کسی کو قتل کرنا جائز نہیں۔

'ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ' یہ باتیں ہیں جن کی اللہ نے ملت ابراہیمؑ میں ہدایت فرمائی تھی۔ تم یہ باتیں تو چھوڑ بیٹھے، البتہ اپنے جی سے چند اچھے بھلے جانوروں کو حرام کر کے ملت ابراہیمؑ کے دعویدار

بنے پھر رہے ہو۔ اب میں تمہیں از سرِ نو ملتِ ابراہیمؑ کے یہ احکام اس لیے سنا رہا ہوں کہ تم سوچو اور سمجھو کہ تم کہاں سے کہاں نکل گئے ہو اور دعویٰ یہ رکھتے ہو کہ تم ملت ابراہیم پر ہو۔ 'لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ' کا اصلی زور سمجھنے کے لیے کلام کی تمہید 'قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ' پیشِ نظر رکھیے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے یہ تفصیل اس لیے سنائی ہے کہ تم اپنے رویہ کا جائزہ لو اور حقیقتِ حال کو سمجھو۔

اکلِ مالِ یتیم

'وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ' اس کی پوری وضاحت سورۂ نساء کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ یتیم کا مال دوزخ کی آگ ہے اس وجہ سے کسی بُری نیت سے کسی کو اس کے پاس بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔ جو بھی اس کے پاس جائے صرف اچھی ہی راہ سے جائے، یعنی اس کو سنبھالنے اور حتی الامکان ترقی دینے کے لیے، تا آنکہ یتیم بالغ ہو جائے۔ جب بالغ ہو جائے پوری احتیاط کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں اس کا مال اس کے حوالہ کرے۔

ناپ تول میں عدل کا اہتمام

'وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ' ناپ تول کو ٹھیک ٹھیک عدل کے ساتھ پورا کرو۔ یہ بات بھی مثبت پہلو سے ارشاد ہوئی ہے اس وجہ سے اس کے ضد پہلو کو بھی، جیسا کہ اوپر ہم نے 'وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا' کے تحت عرض کیا، پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ یعنی ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو کہ اپنے لیے اور پیمانہ ہو، دوسروں کے لیے اور، لینے کے لیے کوئی باٹ ہو، دینے کے لیے کوئی۔ 'وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ o الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ o وَاِذَا کَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ' ۱-۳ مطففین۔ (ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی تباہی ہے کہ لوگوں سے لیں تو پورا ناپ کر لیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں) یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نظامِ کائنات جیسا کہ سورۂ آلِ عمران میں واضح ہُوا، عدل و قسط پر قائم ہے اور اس کائنات کی ہر چیز شاہد ہے کہ اس کا خالق و مدبّر قائم بالقسط ہے اس وجہ سے اس دنیا کی صلاح و فلاح کے لیے بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان اپنے دائرۂ اختیار میں بھی کانٹے کی تول عدل و قسط کو قائم کرے۔ اگر اس میں ذرا رخنہ پیدا ہُوا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی اپنے مرکزِ ثقل سے منحرف ہو گئی اور اب سارے نظامِ تہذیب و تمدن میں فساد و اختلال رونما ہو کے رہے گا۔ عدل و قسط کی اس اہمیت کی وجہ سے یہ حکم ہُوا کہ ناپ تول کو ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ سورہ بنی اسرائیل میں اس کی برکات کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے 'وَاَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ، ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا' ۳۵ (اور ناپ کو پورا کرو جب ناپو، اور جب تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، یہی نتیجہ اور مآل کار کے اعتبار سے بابرکت اور بہتر ہے) 'ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا' کے الفاظ دنیا اور آخرت دونوں کے نتائج و برکات کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ آخرت میں اس کی برکات تو واضح ہیں ہی، دنیا میں بھی باعتبارِ مآل، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی رویہ معاش و معیشت، کاروبار اور تجارت اور عادلانہ تمدن کے فروغ کے نقطۂ نظر سے بابرکت ہے۔ کوئی ڈنڈی مارنے والی قوم دنیا میں نہ فروغ پائی ہے، نہ پائے گی۔ یہ برائی کوئی منفرد برائی نہیں ہے بلکہ یہ بہت سی برائیوں کے پائے جانے کی ایک علامت

ہے۔ جس قوم کے اندر یہ برائی پائی جاتی ہے، خبر دیتی ہے کہ یہ قوم عدل و قسط کے تصور سے خالی ہے اس وجہ سے یہ کسی صالح تمدن کے قیام کی صلاحیتوں سے نہ صرف محروم ہے بلکہ یہ خدا کی زمین میں فساد کے بیج بونے والی ہے۔ چنانچہ سنتِ الٰہی کے مطابق ایسی قوم کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ اس مسئلہ پر انشاء اللہ ہم سورۂ اعراف میں، قوم شعیب کے بیان میں، تفصیل سے بحث کریں گے۔

تمام اعمال کے لیے معیار

'لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا' یہ وہ معیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اعمال کے لیے مقرر فرمایا ہے کہ وہ لوگوں پر ان کی برداشت اور ان کے امکان سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام جو دیے ہیں انسان کی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کو تول کر دیے ہیں، ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے تحمل سے باہر ہو۔ دوسری یہ کہ مطلوب جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص پوری دیانت و صداقت کے ساتھ ان احکام کی تعمیل ظاہراً و باطناً کرے اگر بلا ارادہ اس کے کسی پہلو میں کوئی بھول چوک یا کوتاہی ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ معیار مطلوب کی اس وضاحت سے احتیاط میں شدت و غلو کی نفی بھی مقصود ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اپنے جی سے اس سے آگے بڑھ کر گول باندھنے کی کوشش نہ کریں جو خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ البتہ اس ٹکڑے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یہ ہماری صواب دید پر منحصر ہے کہ ہم اپنی طاقت و استطاعت کی حد خود مقرر کریں اور پھر اس مزعومہ طاقت و استطاعت کے پیمانہ سے ناپ کر اپنے لیے خدا کے احکام و شرائع میں سے انتخاب کریں کہ اتنا ہم سے ہو سکتا ہے، یہ ہم کریں گے، باقی ہماری استطاعت سے باہر ہے اس وجہ سے ہم اس کے مکلف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کے باب میں یہ اختیار کسی کو نہیں بخشا ہے۔

حق و عدل کا اہتمام

'وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى' یہ یوں تو زبان سے نکلنے والی ہر بات کے لیے ایک عام اصول ہے کہ جو بات بھی منہ سے نکلے وہ حق و عدل کی کسوٹی پر پوری اترنے والی ہو چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۳۶ (اور اس بات کے درپے نہ ہو جس کے باب میں تمھیں کوئی علم نہیں۔ کان، آنکھ، دل ان میں سے ہر ایک سے متعلق پرسش ہونی ہے) لیکن یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ تمھاری کوئی شہادت اور تمھارا کوئی فیصلہ حق و عدل سے ہٹا ہوا نہ ہو بلکہ جب بھی دو آدمیوں کے درمیان کوئی شہادت دو یا کوئی فیصلہ کرو تو وہ حق و عدل کے مطابق ہو، اور اس معاملے میں اپنے کسی عزیز و قریب کے ساتھ بھی کوئی رو رعایت نہ ہو۔

ایفائے عہد

'وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا' اب یہ آخر میں ایک جامع بات فرما دی کہ اللہ کے ہر عہد کو پورا کرو۔ اس میں وہ تمام عہد بھی آگئے جو اللہ نے بندوں سے لیے ہیں اور وہ عہد بھی آگئے جو ہم آپس میں کسی مقصد صالح کے لیے کرتے ہیں۔ ہر عہد کی عند اللہ ذمہ داری ہے اس وجہ سے ہر عہد عہد اللہ ہے اگر وہ خدا کے حدود کے اندر ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اس کو عام ہی رکھا ہے وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۳۴ (اور عہد کو

پورا کرو، ہر عہد کی بابت پرسش ہونی ہے)۔

تعقل، تذکر اور تقویٰ میں معنوی ربط

'ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' اس ٹکڑے کو اس شرح کی روشنی میں سمجھیے جو اوپر ہم نے ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کی کی ہے۔ البتہ یہ بات یہاں قابلِ توجہ ہے کہ اوپر تَعْقِلُوْنَ فرمایا ہے اور یہاں 'تَذَكَّرُوْنَ' اور آگے والی آیت میں، بالکل اسی سیاق میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ہے۔ 'تعقل'، 'تذکر' اور 'تقویٰ' میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے۔ انسان جب اندھی تقلید کی بیڑیوں سے آزاد ہو کر سنجیدگی سے ایک بات پر غور کرنے کا عزم کرتا ہے تو یہ 'تعقل' ہے۔ اس 'تعقل' سے وہ حقائق آشکارا ہوتے ہیں جو فطرتِ انسانی کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان کی غفلت کی وجہ سے ان پر دھول کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے۔ ان حقائق کا آشکارا ہونا 'تذکر' ہے۔ یہ تذکر انسان کی رہنمائی 'تقویٰ' کی منزل کی طرف کرتا ہے جو خلاصہ ہے تمام تعلیم و تزکیہ اور تمام قانونِ شریعت کا۔ ہم آگے کسی مناسب مقام میں واضح کریں گے کہ تمام شریعت کی بنیاد انسان کی فطرت پر ہے۔ اس وجہ سے جہاں تک دین کے مبادی اور اصول کا تعلق ہے وہ خارج سے نہیں آتے بلکہ انسان کی فطرت ہی سے برآمد ہوتے ہیں بشرطیکہ انسان خدا کی 'تذکیر' سے بیدار ہو کر 'تذکر' کرے۔ شریعت درحقیقت ہمارے ہی معدنِ فطرت کا برآمد شدہ خزانہ ہے جو ہماری گود میں ڈال دیا جاتا ہے بشرطیکہ ہم اس کی قدر کریں۔

حضرت ابراہیم کی اصل راہ

'وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ'۔ 'مُسْتَقِيْمًا' یہاں 'صِرَاطٌ' سے حال پڑا ہوا ہے۔ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ اسمِ اشارہ کے اندر فعل کے معنی پائے جاتے ہیں اس وجہ سے وہ فعل کا عمل بھی کرتا ہے۔ اب یہ سلسلۂ بیان کی آخری بات ارشاد ہوئی ہے کہ یہ سیدھی راہ جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں بس اس کی پیروی کرو۔ خدا کی بتائی ہوئی راہ یہی ہے اور یہی ابراہیم کی بتائی ہوئی راہ ہے جس پر چلنے کی انھوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی۔ اس راہ سے ہٹ کر جو کج پیچ کی راہیں نکال لی گئی ہیں ان سے بچو۔ وہ ساری راہیں اس صراطِ مستقیم سے دور اور ملتِ ابراہیم سے گمراہ کرنے والی ہیں۔ اسی راہ پر قائم رہنے کی، ابراہیم کے واسطے سے خدا نے تم کو ہدایت فرمائی تھی اور اب میرے واسطے سے خدا نے یہ از سرِ نو تمہارے لیے بازکی ہے تاکہ تم ہلاکت کی وادیوں میں بھٹکنے اور خدا کی پکڑ میں آنے سے بچو۔

ملتِ ابراہیم و ملتِ اسلام میں امر و نہی کی اساسات

یہاں یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جس طرح کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کے درمیان امتیاز کی فطری کسوٹی طیبات اور خبائث کو ٹھہرایا گیا ہے، اسی طرح حقوق و فرائض اور کردار و اخلاق کے باب میں فطری و عقلی اصول یہ ہے کہ جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے وہ تو سب عدل و احسان اور معروف کے منبع سے نکلی ہیں اور جن باتوں سے روکا گیا ہے وہ سب بغی، فحشا اور منکر کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ملتِ ابراہیم اور ملتِ اسلام میں امر و نہی کی اساسات اللہ تعالیٰ نے انہی چیزوں کو بنایا ہے۔ اس مسئلہ پر ان شاء اللہ سورۂ نحل کی آیت ۹۰ کے تحت ہم تفصیل سے بحث کریں گے۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ

وَّبِهِمْ یُؤْمِنُوْنَ (۱۵۴)

ملتِ موسوی اور ملتِ ابراہیمی میں اشتراک

'ثُمَّ' یہاں ترتیب کو ظاہر کرتا ہے۔ اوپر، جیسا کہ واضح ہوا، ملتِ ابراہیمؑ کا بیان تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد صاحب شریعت اور صاحب کتاب رسول سیدنا موسیٰؑ ہی ہیں۔ فرمایا کہ ابراہیمؑ کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تاکہ اپنے خوب کار بندے پر اپنی شریعت کی نعمت تمام کریں، اس میں ہر ضروری بات کی تفصیل کر دیں اور اس کو ہدایت و رحمت بنائیں تاکہ لوگ آخرت میں اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جو کتاب دی گئی اس میں بھی بنیادی احکام وہی ہیں جو ملت ابراہیمؑ کے باب میں بیان ہوئے ہیں۔ آپ کو سب سے پہلے جو احکام الواح میں لکھ کر دیے گئے' احکام عشرہ کے نام سے مشہور ہیں۔ تورات میں دیکھ لیجیے، الفاظ میں فرق ہو تو ہو لیکن باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ تعداد میں بھی فرق نہیں ہے۔ اوپر ملت ابراہیمؑ کے جو احکام گنائے گئے ہیں وہ امر و نہی سب ملا کر دس بنتے ہیں۔ یہی دس احکام شریعت موسوی کی بھی بنیاد ہیں۔ ان پر اضافہ ہوا ہے تو تفصیلات کا اضافہ ہوا ہے جیسا کہ قرآن نے اشارہ کیا ہے اور بعینہٖ یہی احکام ابتدائی طور پر، جیسا کہ ہم سورۂ نحل اور سورۂ بنی اسرائیل میں واضح کریں گے، اس امت کو دیے گئے۔ گویا اصل دین بنیادی طور پر ایک ہی ہے، فرق ہے تو اجمال و تفصیل اور آغاز و تکمیل کا ہے۔ اس ملت میں دین کو اس کی اصل اساس یعنی ملتِ ابراہیمی پر لوٹا کر کامل اور ان قیود اور پابندیوں سے آزاد کر دیا گیا جو یہود پر، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، ان کی سرکشی کے سبب سے عاید ہوئی تھیں۔

یہود پر ایک تعریض

'تَمَامًا عَلَى الَّذِیْٓ اَحْسَنَ' سے مراد لوگوں نے جماعت بھی لی ہے لیکن میرے نزدیک اس سے مراد حضرت موسیٰؑ ہی ہیں۔ 'الَّذِیْ' کا معروف استعمال معرفہ ہی کے لیے ہے اور جب واحد ہو تو اس سے کوئی خاص ذات ہی مراد لی جا سکتی ہے۔ قرآنی تمثیلات میں کہیں کہیں اس کا مصداق جماعت بھی ہے لیکن اس کے خاص قرائن اور خاص وجوہ ہیں جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔ حضرت موسیٰؑ کے لیے یہ صفت اسی طرح استعمال ہوئی ہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے لیے سورۂ نجم میں 'اَلَّذِیْ وَفّٰٓی' استعمال ہوئی ہے۔ مقصود اس صفت کے اظہار سے حضرت موسیٰؑ کا اس اتمام نعمت کا سزاوار ہونا ظاہر کرنا ہے کہ اللہ نے ان کو اس نعمت کا سزاوار اس لیے گردانا کہ وہ خوب کار تھے۔ اللہ نے ان کے ظاہر و باطن میں جو کچھ ان کو بخشا اس کا حق انھوں نے پہچانا اور ہر حق نہایت خوبی سے ادا کیا۔ ایسے ہی بندے اللہ کی نعمتوں کے سزاوار بنتے ہیں اور جب وہ کسی کو اپنے منصب نبوت کے لیے انتخاب فرمانا چاہتا ہے تو کسی ایسے ہی خوب کار کو چنتا ہے اور اس پر اپنی نعمت تمام کرتا ہے۔ یہ صفت یہود کو نہایت لطیف انداز میں یاد دہانی کر رہی ہے کہ وہ ذرا اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ جس سے انھوں نے دین کی وراثت حاصل کی وہ کیا تھا اور یہ کیا ہیں؟ اس کو اللہ نے اس لیے اس نعمت سے نوازا تھا کہ اس نے ہر نعمت کا حق پہچانا اور اس کو نہایت خوبی سے

ادا کیا۔ ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری کی، ہر ہدایت سے اعراض کیا، ہر حکم کا حلیہ بگاڑا لیکن مدعی ہیں کہ دنیا و آخرت کی تمام سعادتیں انہی کا حصہ ہیں۔

ہدایت اور رحمت

'تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ' میں 'کل شیء' سے مراد وہ مسائل ہیں جو دین کے دائرے میں آتے ہیں۔ دین کے اصول اور بنیادی مسائل تو وہی ہیں جو اوپر ملتِ ابراہیمؑ سے متعلق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بیان ہوئے لیکن ان ہی سے ہر چیز کے تحت تفصیلات و جزئیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو جو کتاب عطا فرمائی اس میں یہ تمام تفصیلات و جزئیات بھی بیان فرمائیں۔ اس طرح یہ کتاب ہدایت اور رحمت کا مجموعہ بن گئی۔

'ہدایت' اور 'رحمت' کے الفاظ نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ اس مقصد کو ظاہر کرتے ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنی کتاب اتارتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کتاب اس لیے اتارتا ہے کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ بتائے جو آخرت میں بندوں کو اس کی رحمت کا سزاوار بنائے۔ اس پہلو سے کتاب اپنے مقصد کے اعتبار سے ہدایت اور اپنے ثمرہ اور انجام کے لحاظ سے رحمت ہوتی ہے۔ پھر زندگی کی اصل غایت تو آخرت ہے، اس دنیا کی زندگی تو فانی اور عارضی ہے۔ اس وجہ سے کتابِ الٰہی کا اصل مقصد یہ ہوا کہ وہ اس دنیا کی زندگی کو وہ جلوہ دے کہ لوگ اللہ کی ملاقات پر ایمان لائیں اور اسی کو نصب العین بنا کر زندگی کا سفر طے کریں۔ اسی حقیقت کی طرف 'لَعَلَّهُم بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۙ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ (۱۵۵-۱۵۷)

'وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ الاٰیۃ'۔ تورات کے بعد اب یہ قرآن کے اتارے جانے کا ذکر فرمایا اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام خلق پر عموماً اور اہل عرب پر خصوصاً جو فضل فرمایا ہے پہلے اس کا حوالہ دیا پھر عربوں کو دھمکی سنائی کہ اس کتاب کے ذریعہ سے تم پر حجت پوری ہو چکی ہے۔ اب خدا کے سامنے تمھارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا اس وجہ سے اگر اس کو جھٹلاتے ہو تو اس جھٹلانے کے انجام کو سوچ لو۔

قرآن کی عظیم برکت

لفظ 'مُبٰرَك' اس بارش کے لیے قرآن میں بار بار استعمال ہوا ہے جو زمین کی سیرابی، روئیدگی اور سرسبزی کا ذریعہ بنتی، اس کے خزانوں اور اس کی برکتوں کو ابھارتی اور اس کے مردہ اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد اس کو از سرِ نو حیاتِ تازہ بخشتی ہے۔ قرآن کے لیے اس لفظ کے استعمال میں یہ استعارہ

ہے کہ یہ بھی دنیا کو اس کی روحانی موت کے بعد از سر نو حیات تازہ بخشنے اور شریعت و ہدایت کے خزاں رسیدہ چمن کو پھر سے بہار کی رونقوں سے معمور کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس کی ناقدری نہ کرو بلکہ قبول کرو اور اس کی پیروی کرو، جس نے تم پر یہ رحمت نازل فرمائی ہے اس کے غضب سے بچو تاکہ اس کی رحمت کے سزاوار ٹھہرو۔

تلعع عذر

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ۔ اَنْ تَقُوْلُوْٓا یعنی 'كراهة ان تقولوا' یہ اسلوب اور یہ مضمون مائدہ آیت ۱۹ میں بھی گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تم پر یہ رحمت اس لیے نازل فرمائی ہے کہ مبادا کل کو تم خدا کے سامنے یہ عذر کرو کہ جس طرح یہود و نصاریٰ کو کتاب عطا ہوئی آخر ہم کو اسی طرح کتاب کیوں نہیں عطا ہوئی، ان کا علم و مطالعہ ہمارے کیا کام آسکتا تھا، ہم تو ان کے علم و مطالعہ اور ان کے درس و تعلیم سے بے خبر ہی رہے۔

قرآن ایک حجت قاطع ہے

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ یا یہ عذر کرو کہ اگر ہم پر کتاب اترتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے بنتے، پھر ہم اس نعمت سے کیوں محروم رکھے گئے!

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ یعنی تمہارے یہ تمام عذرات ختم کر دینے کے لیے خدا نے تم پر ایک حجت قاطع اور ہدایت و رحمت اتار دی ہے، اب تم اس قسم کا کوئی عذر پیش نہیں کر سکتے۔ قرآن کے لیے یہاں 'بینۃ' اور 'ہدایت و رحمت' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'ہدایت و رحمت' کے الفاظ پر اوپر بحث گزر چکی ہے۔ 'بینہ' کے معنی روشن دلیل اور حجت قاطع کے ہیں۔ قرآن کے لیے یہ لفظ دو پہلوؤں سے استعمال ہوا ہے۔ ایک یہ کہ اس نے عربوں کے ان تمام عذرات کا خاتمہ کر دیا جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، دوسرے یہ کہ قرآن بجائے خود حجت و برہان ہے۔ اس کا کتاب الٰہی ہونا کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے، یہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کے چیلنج کا، جیسا کہ قرآن کے متعدد مقامات سے واضح ہے، اہل عرب کوئی جواب نہ دے سکے۔ علاوہ ازیں یہ تورات کی طرح صرف احکام و ہدایات کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ہر دعوے اور ہر تعلیم کے دلائل و براہین بھی اپنے ساتھ لے کر نازل ہوا ہے اور وہ ایسے مضبوط و مستحکم اور ایسے عقلی و فطری ہیں کہ ان کے مقابل میں کٹ حجتی تو کی جا سکتی ہے لیکن ان کی تردید ممکن نہیں ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا الاية 'صدف'، لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ یعنی کسی چیز سے اعراض کرنے اور منہ پھیرنے کے معنی میں بھی اور کسی کو اس سے پھیرنے اور موڑنے کے معنی میں بھی۔ جن لوگوں نے اس کو متعدی کے مفہوم میں لیا ہے ان کی بات قوی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے 'كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ' ہے، جس کے اندر اعراض اور کٹ حجتی کا مضمون خود آ گیا۔ اس کے بعد موزوں بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کو متعدی کے معنی میں لیا جائے۔ یعنی جنھوں نے آیات الٰہی کی تکذیب کی

اور دوسروں کو ان کے سننے سمجھنے سے روکا۔

فَمَنۡ اَظۡلَمُ یعنی ان سے بڑھ کر محروم القسمت اور بدبخت کون ہو سکتا ہے جن کے پاس ایسی کتاب آئے جو ان کے تمام عذرات کا خاتمہ کر دے، جو ان کے لیے حجت و برہان ہو، جو ابرِ رحمت بن کر برسے، جو رہنمائی کے لیے روشنی کا مینار اور آخرت میں رحمتِ الٰہی کی ضامن ہو، لیکن وہ اس کو خود بھی جھٹلائیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکیں۔

هَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأۡتِيَهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ أَوۡ يَأۡتِيَ رَبُّكَ أَوۡ يَأۡتِيَ بَعۡضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَۗ يَوۡمَ يَأۡتِي بَعۡضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفۡسًا إِيمَٰنُهَا لَمۡ تَكُنۡ ءَامَنَتۡ مِن قَبۡلُ أَوۡ كَسَبَتۡ فِيٓ إِيمَٰنِهَا خَيۡرًاۗ قُلِ ٱنتَظِرُوٓاْ إِنَّا مُنتَظِرُونَ (۱۵۸)

یعنی ان کے تمام عذرات ختم ہو گئے اور ہر پہلو سے ان پر حجت تمام کر دی گئی لیکن یہ دلیلوں اور حجتوں سے قائل ہونے والے اسامی نہیں، یہ تو منتظر ہیں کہ ان پر فرشتے اتریں، یا خدا خود ان کے لیے نمودار ہو۔ یہ نہیں تو عذابِ الٰہی کی نشانیوں میں سے کوئی فیصلہ کن نشانی ظاہر ہو۔ بقرہ ۲۱۰ اور انعام ۱۱۱ میں کفار کے مطالبات کا ذکر گزر چکا ہے۔ آگے کی سورتوں میں بھی اس کا ذکر آئے گا۔ مثلاً هَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأۡتِيَهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ أَوۡ يَأۡتِيَ أَمۡرُ رَبِّكَ ۳۳ نحل (یہ نہیں منتظر ہیں مگر اس بات کے کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرے رب کا فیصلہ ظاہر ہو جائے) وَقَالَ ٱلَّذِينَ لَا يَرۡجُونَ لِقَآءَنَا لَوۡلَآ أُنزِلَ عَلَيۡنَا ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ أَوۡ نَرَىٰ رَبَّنَاۗ لَقَدِ ٱسۡتَكۡبَرُواْ فِيٓ أَنفُسِهِمۡ وَعَتَوۡ عُتُوّٗا كَبِيرٗا ۲۱ الفرقان (اور جو لوگ ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں کہتے ہیں آخر ہمارے اوپر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھتے؟ انھوں نے اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھا اور بڑی اکڑ دکھائی)

يَوۡمَ يَأۡتِي بَعۡضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ یعنی خدا اور فرشتوں کا اترنا تو الگ رہا جس فیصلہ عذاب کے یہ منتظر ہیں وہ بھی اگر ظاہر ہو جائے تو اس کو دیکھ کر کسی کا ایمان لانا کچھ سود مند نہیں۔ ایمان معتبر صرف وہ ہے جو آنکھ، کان، دل، دماغ اور عقل کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے لایا جائے نہ کہ عذابِ الٰہی کا ڈنڈا دیکھ کر۔ عذابِ الٰہی کے ظہور کے بعد کسی کا ایمان کچھ سود مند نہیں ہو گا، سود مند ایمان وہی ہو گا جو اس سے پہلے لایا جائے اور اس میں کچھ عمل صالح کی کمائی کر لی جائے۔

فیصلہ کا انتظار

قُلِ ٱنتَظِرُوٓاْ إِنَّا مُنتَظِرُونَ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے نشانیٔ عذاب کے منتظر ہو تو انتظار کرو، اب ہم بھی تمھارے لیے اسی کے منتظر ہیں اس لیے کہ وہ ساری علامتیں جو کسی قوم کو مستحق عذاب بناتی ہیں تم میں نمایاں ہو چکی ہیں۔ سنتِ الٰہی کے مطابق اب ایک ہی چیز باقی رہ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ باطل نابود ہو اور حق کا بول بالا ہو۔ یہ امر بیان ملحوظ رہے کہ نبی اور اس کے ساتھی جب اپنا حق ادا کر چکتے ہیں لیکن ضدی اور سرکش لوگ کسی طرح ان باتوں پر کان نہیں دھرتے تو انھیں بھی فیصلۂ الٰہی کا انتظار ہوتا ہے کیونکہ اسی فیصلہ کے ظہور کے ساتھ حق کا غلبہ وابستہ ہوتا ہے۔ اس انتظار میں اصلاً مخالفوں کی تباہی کی خواہش مضمر نہیں ہوتی بلکہ حق کی فتحمندی

کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں تزکیہ و اصلاح کے مشن پر آتے ہیں۔ وہ اس کام میں اپنی پوری قوت نچوڑ دیتے ہیں۔ جن کے اندر خیر کی ادنیٰ رمق بھی ہوتی ہے وہ اصلاح قبول کر لیتے ہیں، جو بالکل اندھے بہرے بن جاتے ہیں وہ مردوں کے حکم میں داخل ہیں جو زمین پر پڑے رہیں تو عفونت اور فساد کے سوا کچھ نہیں پھیلا سکتے اس وجہ سے ان کے فنا ہو جانے میں ہی خلق کی بہبود ہوتی ہے۔ یہاں اس اشارے پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ سورۂ نوح میں ان شاء اللہ یہ مسئلہ تفصیل سے زیر بحث آئے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۱۵۹-۱۶۴)

پیغمبر کو آخری ہدایت

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ۔ اوپر آیت ۱۵۳ میں فرمایا تھا کہ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور مختلف پگ ڈنڈیوں میں نہ بھٹکو کہ خدا کی راہ سے دور جا پڑو، یہ ہے جس کی تمھیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم خدا کے غضب سے بچو) ہم نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ اصل ملت ابراہیمؑ کا بیان ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت کی دونوں شاخوں ـــــ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل ـــــ کو ودیعت ہوئی لیکن ان دونوں ہی شاخوں نے اس میں بدعتیں پیدا کر کے مختلف پگ ڈنڈیاں نکال لیں۔ عربوں نے شرک و بت پرستی کی راہ اختیار کر لی، یہود و نصاریٰ نے یہودیت و نصرانیت کے شاخسانے کھڑے کر لیے۔ اس طرح اصل شاہراہ گم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے یہ صراط مستقیم دنیا کے لیے پھر کھولی، اور جیسا کہ اس سورہ کے پچھلے مباحث سے واضح ہوا، اس کے دلائل تفصیل سے بیان فرمائے لیکن مذکورہ تمام گروہوں نے اس واضح حقیقت کی مخالفت اور اپنی اپنی ایجاد کردہ ضلالتوں ہی پر جمے رہنے کے لیے ضد کی۔ اب یہ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ جن لوگوں نے اس دین میں، جو اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا، تفرقہ پیدا کیا اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے تم کو ان سے کچھ سروکار نہیں، تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اب وہی ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کرتوتیں انجام دے کے آئے ہیں۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ اب پیغمبر کے لیے ان سے

اعلان برأت کا وقت بہت قریب آ رہا ہے۔ چنانچہ سورۂ برأت میں، جو اس گروپ کی آخری سورہ ہے یہ اعلان جیسا کہ واضح ہو گا، آ گیا۔

'مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا الایۃ'، یہ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ کی وضاحت ہے۔ ان کے اعمال کی خبر دینے سے مقصود ظاہر ہے کہ مجرد ان کو رپورٹ سنانا نہیں ہے بلکہ اس کا لازم یعنی جزا اور سزا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں واضح فرما دیا کہ جو نیکی لے کر آئے گا وہ اس کا دس گنا صلہ پائے گا اور جو کوئی برائی لے کر آئے گا وہ ٹھیک ٹھیک اپنی برائی کے بقدر سزا پائے گا۔ نہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ کوئی کمی کی جائے گی، نہ برائی کرنے والوں کے ساتھ کوئی زیادتی۔ یہ ملحوظ رہے کہ آیت میں 'اَمْثَالِهَا' اور 'مِثْلَهَا' کے جو الفاظ ہیں ان سے مراد ان کا وہ مثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ٹھہرا رکھا ہے۔ وہ مثل مراد نہیں ہے جو دنیا میں سمجھا جاتا یا سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز یہاں نیکی کے صلہ کی جو مقدار بیان ہوئی ہے وہ کم سے کم ہے۔ اس سے اس فضل کی نفی نہیں ہوتی جو دوسرے مقامات میں مذکور ہے۔

پیغمبرؐ کی زبان سے فیصلہ کن اعلان

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ'۔ 'دِیْنًا قِیَمًا' 'صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ' سے بدل ہے اور لحاظ اس کے موقع و محل کا ہے۔ قَیِّمٌ اور قِیَمٌ دونوں ہم معنی ہیں یعنی سیدھا اور فطری دین جس میں کوئی کجی اور انحراف نہیں ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ملت ابراہیمؑ اور ملت اسلام کے لیے استعمال ہوا ہے اور مقصود اس سے اس ملت کے اس پہلو کو واضح کرنا ہوتا ہے کہ یہ اس زیغ و انحراف سے بالکل پاک ہے جو مشرکین، یہود اور نصاریٰ نے اپنے دین میں پیدا کر لیا۔

یہ وہی اوپر والی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مثبت انداز میں کہلائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھیں مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی پیدا کردہ بدعات و خرافات سے کوئی سروکار نہیں۔ تم واضح الفاظ میں ان سب کو یہ اعلان سنا دو کہ مجھے تو میرے پروردگار نے صراط مستقیم ـــــ دین قیم، ملت ابراہیم ـــــ کی ہدایت بخشی ہے جو اپنے رب کی طرف یکسو تھے، مشرکین میں سے نہ تھے۔ گویا وہ بحث جو اس سورہ میں شروع سے چلی تھی اپنے آخری نتیجہ تک پہنچ گئی، آخر میں آنحضرتؐ نے اعلان فرما دیا کہ اصل ملتِ ابراہیمؑ یہ ہے جس پر میں ہوں، جس کو پیروی کرنی ہو اس کی پیروی کرے، اس کے سوا سب کج پیچ کی راہیں ہیں جن سے مجھے کوئی تعلق نہیں، میں ان سے بری ہوں۔

'قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ الایۃ'، 'نُسُكٌ' کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں نسک کے معنی قربانی کے ہیں اور نماز کے ساتھ اس کا جوڑ اس مفہوم کے لیے قرینہ فراہم کرتا ہے۔ سورۂ کوثر میں ارشاد ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (پس اپنے رب ہی کی نماز پڑھ اور اسی کے لیے قربانی کر)
یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ملت ابراہیمؑ اور ملت اسلام کی اصل روح کی تعبیر کرائی گئی ہے

ملتِ ابراہیم وملتِ اسلام کی اصل روح

نماز اور قربانی، زندگی اور موت دونوں میں غور کیجیے نہایت حسین تقابل ہے۔ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ جو اس ملت پر ہے وہ جیتا ہے تو خدا کے لیے اور مرتا ہے تو خدا کے لیے۔ اس کی زندگی میں کوئی تقسیم نہیں ہے۔ یہ از ابتدا تا انتہا بالکل ہم رنگ اور ہم آہنگ ہے۔ خدا کا کوئی ساجھی نہیں، 'لَا شَرِیْکَ لَہٗ' اس وجہ سے بندے کی زندگی میں بھی کوئی ساجھی نہیں۔ یہ پوری کی پوری، بغیر کسی تقسیم و تجزیہ اور بغیر کسی تحفظ و استثنا کے صرف اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے لیے ہے۔ فرمایا کہ 'وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ' یہی میری فطرت ہے اور اسی کی مجھے اوپر سے ہدایت آئی ہے۔ اس وجہ سے میں تو سب سے آگے بڑھ کر اس قلادہ کو اپنی گردن میں ڈالا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو اس راہ پر چل پڑا ہوں اب جس میں ہمت ہو اس راہ میں میرا ساتھ دے۔ میں اپنا سفر دوسروں کے انتظار میں ملتوی نہیں کر سکتا۔

'قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ الاٰیۃ' یہ اس اسلام اور اس سرنگندگی و سپردگی کی دلیل بیان ہوئی ہے جس کا اظہار اوپر والی آیت میں ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا رب ہے تو میں آخر کس طرح اس کے سوا کسی اور کو رب بناؤں اور اپنی زندگی میں کسی اور کی شرکت تسلیم کروں؟ ہر جان جو کمائی کرے گی اس کی ذمہ داری بہر حال اسی پر آنی ہے، کوئی دوسرا اس کے بوجھ کا اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ خدا ہی کی طرف سب کا پلٹنا ہوگا، اور وہ ان سارے اختلافات کا فیصلہ سنائے گا جن میں آج تم مبتلا ہو۔

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ ؕ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۫ۖ وَاِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۶۵)

قریش کو آخری تنبیہ

یہ قریش کو آخری تنبیہ ہے کہ اس دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہونے والی تم پہلی قوم نہیں ہو۔ تم سے پہلے کتنی قومیں اس اسٹیج پر نمودار ہوئیں، پھر غائب ہو گئیں۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کی جگہ تم کو دی۔ یہ خلافت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس دنیا کے مالک نے جس باٹ اور ترازو سے ان کو تولا اسی باٹ، اسی ترازو سے وہ تم کو بھی تولے گا اور اس کی میزان میں اگر تم پورے نہ اترے تو جس طرح اس نے دوسروں کو پھینک دیا اسی طرح تم کو بھی اٹھا پھینکے گا، خدا کی جو سنت دوسروں کے معاملہ میں رہی ہے، کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے معاملہ میں بدل جائے۔ یہاں یہ بات اختصار کے ساتھ فرمائی ہے۔ اس کی پوری تفصیل آگے والی سورہ — اعراف میں آ رہی ہے جو اس کی توام سورہ ہے۔

'وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ' یہ اس مغالطے کو رفع فرمایا ہے جو نادانوں کو بالعموم لاحق ہوتا ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی دنیا کی زندگی میں کامیاب ہیں اور دنیوی اسباب و وسائل ان کو ان لوگوں کی نسبت زیادہ ہی حاصل ہیں جو انھیں آخرت کے ڈراوے سنا رہے ہیں تو وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں

کہ ان کو ڈرانے سنانے والے بے ذوق ہیں، اگر ان کی زندگی غلط ہوتی تو ان کو یہ کامیابیاں کہاں سے حاصل ہوتیں، اس طرح وہ اپنی سرکشی میں اور زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اس مغالطے میں پڑ کر اپنے کو تباہ نہ کرو۔ یہ جو کچھ تمہیں ملا ہے، تمہاری خوبیوں اور قابلیتوں کا ثمرہ نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے تمہارا امتحان ہے کہ تم شکر گزار بنتے ہو یا ناشکرے۔ نیکیوں اور بدیوں کی جزا اور سزا کا دن آگے آنے والا ہے اور یہ نہ سمجھو کہ وہ بہت دور ہے۔ وہ جلد آنے والا ہے اور اس دن ہر شخص اپنی نیکی اور بدی دیکھ لے گا۔ جنھوں نے اپنے رب کی ناشکری کی ہو گی وہ اس ناشکری کی سزا بھگتیں گے، جنھوں نے اس کا حق پہچانا ہو گا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت اور رحمت سے نوازے گا۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس بے مایہ اور گنہگار کے قلم سے اس سورہ کی تفسیر میں رقم ہوئیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

لاہور
۱۱- صفر ۱۳۸۸ھ
۱۰- مئی ۱۹۶۸ء

تدبّرِ قرآن

۷

الاعراف

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سورۂ انعام میں، جیساکہ تفصیل سے واضح ہُوا، قریش کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ دعوت اس بنیاد پر دی گئی ہے کہ یہی اصل ملّت ابراہیمؑ ہے جس کی ابراہیمؑ نے اپنی ذرّیت کو تلقین کی نہ کہ وہ مجموعۂ بدعات واوہام جو تم لیے بیٹھے ہو۔ اللہ نے تم پر بڑا فضل فرمایا ہے کہ اس نے تمھی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جس نے اللہ کی حجت تم پر پوری کر دی ہے۔ اب تمھارے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد بھی اگر تم اپنی ضد پر اڑے رہ گئے تو یاد رکھو کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو خدا نے ہمیشہ تباہ کر دیا ہے۔ یہ تاریخ کی ایک معروف حقیقت ہے جس کی دلیل ڈھونڈنے کے لیے تمھیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس ملک میں تم آج برسرِ اقتدار ہو خود اسی کی تاریخ میں تمھارے لیے کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ تم اس سرزمین پر پہلے آنے والے نہیں ہو بلکہ تم سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں جو اسی طرح اقتدار کی مالک ہوئیں جس طرح تم۔ بلکہ بعض اپنے اقتدار و سطوت کے اعتبار سے تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ انہی کے وارث تم ہُوئے ہو۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ قدرت کا قانون تمھارے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کرے جو اس نے ان کے ساتھ کیا۔ ان کے جن جرائم کی بنا پر خدا نے ان کو ہلاک کر کے ان کی جگہ تم کو بخشی، انہی جرائم کے مرتکب تم ہُوئے تو خدا تم کو دندناتے پھرنے کے لیے کیوں چھوڑے رکھے گا، خدا کا قانون تو سب کے لیے ایک ہی ہے۔

انعام کے بعد اعراف، انعام کی مثنیٰ سورہ ہے۔ اس میں دعوت کے بجائے انذار کا پہلو غالب ہے۔ اس میں صاف صاف قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو بس سمجھ لو کہ اب تم خدا کے عذاب کی زد میں ہو۔ اس میں پہلے ان کی فردِ قرارداد جرم کی طرف اجمالاً اشارہ کیا، اس کے بعد تفصیل کے ساتھ ان تمام پچھلی قوموں کی تاریخ سنائی جو اس ملک میں اقتدار پر آئیں اور پھر یکے بعد دیگرے اسی جرم میں کیفرِ کردار کو پہنچیں جس کے مرتکب قریش ہُوئے۔ یہ تفصیل گویا انعام کی آخری آیت کے اجمال کی تفصیل ہے۔ اسی کے ساتھ یہود کو بھی لے لیا ہے اور ان کو بھی بالکل آخری تنبیہ فرمائی ہے۔ آخر میں عہدِ فطرت کو، جو تمام ذرّیتِ آدم سے لیا گیا ہے، بنیاد قرار دے کر انذار کے مضمون کو اس کے آخری نتائج تک پہنچا دیا ہے جس کے بعد برأت، ہجرت اور اعلانِ جنگ یا نزولِ عذاب کے مراحل

سامنے آجاتے ہیں۔

اب ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ پوری سورہ بیک نظر نگاہ کے سامنے آجائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ اس کتاب الٰہی سے متعلق تمھاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کردو تاکہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہوجائے۔ تم پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو قبول بھی کرلیں۔ اس سے فائدہ صرف اہلِ ایمان ہی اٹھائیں گے۔ قریش کو تنبیہ کہ اس کتاب کو قبول کرو ورنہ یاد رکھو کہ تم سے پہلے کتنی قومیں رسولوں کی تکذیب کے جرم میں ہلاک ہوچکی ہیں اور جب خدا کا عذاب ان پر آیا تو اس کے مقابل میں وہ کوئی بند نہ باندھ سکیں بلکہ انھوں نے خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور عذاب الٰہی کی پکڑ میں آگئیں۔ پھر تم پر ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس میں تم سے تمھاری ذمہ داریوں کے بابت پرسش ہونی ہے اور رسول سے اس کی ذمہ داری کے بابت۔ اس دن سارا کچا چٹھا ہم سب کے سامنے رکھ دیں گے۔ اس دن جو میزانِ عدل نصب ہوگی وہ ہر ایک کے اعمال تول کر بتا دے گی کہ کس کے پاس کتنا حق ہے، کتنا باطل۔ اس دن فلاح صرف وہی پائیں گے جن کے پلڑے بھاری ہوں گے۔ باقی سب نامراد ہوں گے۔

(۱۰-۲۵) قریش کو تنبیہ کہ اس ملک میں تمھیں جو اقتدار حاصل ہوا، خدا ہی کا بخشا ہوا ہے۔ اسی نے تمھارے لیے معاش و معیشت کی راہیں فراخ کیں لیکن شیطان نے تم پر حاوی ہو کر تم کو ناشکری کی راہ پر ڈال دیا۔ آدمؑ اور ابلیس کے ماجرے کا حوالہ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیطان نے ذریت آدم کو جو دھمکی دی تھی کہ وہ ان کو اپنی چالوں سے گمراہ کرکے چھوڑے گا، ان کی اکثریت خدا کی نافرمان و ناشکری بن جائے گی، اس نے اپنی وہ دھمکی تمھارے اوپر سچ کر دکھائی۔ جس طرح اس نے آدم و حوا کو دھوکا دے کر جنت سے نکلوایا اسی طرح اس نے اپنا فریب تم پر چلایا ہے تو تم شیطان کے چکموں میں آکر اس کی امیدیں برآنے کے سامان نہ کرو۔

(۲۶-۳۰) یہ تذکیر کہ تم نے آدمؑ کی اولاد ہو کر شیطان کی اس دشمنی کو یاد نہ رکھا جو اس نے تمھارے باپ کے ساتھ کی۔ اس نے انھیں فتنہ میں ڈالا اور حلۂ جنت سے محروم کرکے جنت سے نکلوایا۔ وہی کھیل وہ تمھارے ساتھ کھیلا ہے۔ خدا نے تم کو ظاہر و باطن کے جس لباس سے مزین کرنا چاہا شیطان کی اطاعت میں تم نے وہ دونوں جامے اتار پھینکے۔ تقویٰ کا لباس بھی جو باطن کی زینت ہے، اتار کر پھینک دیا اور ظاہر کا لباس بھی اتار دیا چنانچہ عین حرم الٰہی میں۔ اس نے تمھیں عریاں طواف پر ورغلایا اور تم اس بے حیائی کو نہ صرف باپ دادا کی وراثت سمجھتے ہو بلکہ یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اس کا حکم تمھیں خدا نے دیا ہے۔ سوچو کہ خدا ایسی بے حیائی کا حکم کس طرح دے سکتا ہے؟ خدا نے تو ہر باب میں صرف حق و عدل کا حکم دیا ہے، صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے، توحید کا حکم دیا ہے۔ تم نے شیطان کی پیروی میں اپنے آپ کو فتنوں میں مبتلا کیا اور دعویٰ کرتے ہو

کہ یہی راہ ہدایت کی راہ ہے۔ صرف تھوڑے سے لوگ اس فتنہ سے محفوظ رہ سکے۔

(۳۱-۳۴) قریش کو تنبیہ کہ اپنے جی سے تم نے یہ جو حرام و حلال بنا رکھا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ خدا نے نہ تو زینت حرام کی ہے اور نہ کھانے پینے کی چیزیں حرام کی ہیں۔ یہ دنیا میں بھی اہل ایمان کے لیے مباح ہیں اور آخرت میں تو وہ ان کے بلا شرکت غیرے حق دار ہوں گے ہی۔ خدا نے حرام بے حیائی کو ٹھہرایا ہے خواہ ظاہری ہو یا باطنی، حق تلفی اور سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے جن کا کوئی جواز نہیں، شرک کو ٹھہرایا ہے جس کے حق میں کوئی دلیل نہیں اور اللہ کے اوپر افترا کو حرام ٹھہرایا ہے۔ لیکن تم ان ساری ہی باتوں کے مرتکب ہو رہے ہو۔ اگر اس کے باوجود تمہیں مہلت مل رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں ہر امت کی تباہی کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔

(۳۵-۴۳) اس امر کی یاددہانی کہ ذریت آدمؑ کو ابتدا ہی میں یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام سے آگاہ کرنے کے لیے اپنے رسول بھیجے گا تو جو لوگ ان رسولوں کی پیروی کریں گے وہ جنت حاصل کریں گے، جو ان کو جھٹلائیں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے۔ یہ دوزخ میں پڑنے والے سب ایک دوسرے کے اوپر لعنت بھیجیں گے اور ان کو کسی طرح دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ بس دوزخ کی آگ ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنے گی۔ البتہ جو اہل ایمان ہوں گے وہ جنت حاصل کریں گے اور وہ باہمگر ایک دوسرے کی ملاقات سے مسرور اور اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں پر شکرگزار ہوں گے۔ وہ اعتراف کریں گے کہ یہ ہمیں جو کچھ خدا نے بخشا اپنے رسولوں کی پیروی کے طفیل بخشا۔ رسولوں نے جو کچھ فرمایا سب حرف حرف سچ ثابت ہوا۔

(۴۴-۵۳) اہل جنت کا اہل دوزخ سے خطاب کہ ہم سے تو ہمارے رب نے جو وعدے فرمائے تھے وہ سب حرف بحرف پورے ہوئے، تم بتاؤ کہ تم نے بھی وہ سب کچھ دیکھ لیا یا نہیں جس سے تمھیں آگاہ کیا گیا تھا؟ اہل دوزخ پر خدا کی طرف سے لعنت کا اعلان۔ اس امر کا بیان کہ مقام اعراف سے اہل ایمان کے ایک گروہ کو دوزخ اور جنت دونوں کا مشاہدہ کرایا جائے گا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ خدا نے رسولوں کے ذریعے سے جن باتوں کی خبر دی تھی وہ سب پوری ہوئیں۔ اصحاب اعراف کی طرف سے اہل جنت کو مبارک باد اور اہل دوزخ کو ملامت۔ اہل دوزخ کی اہل جنت سے فریاد کہ وہ ان پر کچھ کرم کریں۔ اہل جنت کی طرف سے جواب کہ جنت کی نعمتیں کفار پر حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان کہ جنھوں نے دنیا میں خدا کی باتوں کو نظر انداز کیا آج خدا نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ کفار کی طرف سے اپنی محرومی و بدبختی پر اظہار حسرت۔

(۵۴-۵۸) کفار قریش کو تنبیہ کہ خلق و امر سب خدا ہی کے اختیار میں ہے تو امید و بیم ہر حالت میں اسی کو پکارو۔ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو۔ قیامت شدنی ہے۔ موت کے بعد زندگی کا مشاہدہ تم اس کائنات میں برابر کر رہے ہو۔ خدا نے ہر پہلو سے اپنی آیات واضح فرما دی ہیں۔

(۵۹-۹۳) قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ، قوم شعیبؑ کی سرگزشتیں، جو اس بات کا تاریخی ثبوت ہیں کہ جو قومیں فساد فی الارض کی مرتکب ہوتی اور اپنے رسول کی دعوت اصلاح کی تکذیب کر دیتی ہیں اللہ تعالیٰ ان

کو صفحہ ارض سے مٹا دیتا ہے۔

(۹۴ - ۱۰۲) مذکورہ بالا سرگزشتوں پر ایک اجمالی تبصرہ۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو معاملہ کرتا ہے اس کے بعض بنیادی اصول اور بعض حکمتیں اور عبرتیں۔ قریش کو یہ تنبیہ کہ انھی کے خلف تم ہو، تو اگر تم دیدۂ عبرت سے دیکھتے تو تمھارے اپنے ملک کی تاریخ میں تمھارے لیے کافی سامان بصیرت موجود ہے لیکن جس طرح ان قوموں کے دلوں پر اللہ کی مہر لگ گئی تھی اسی طرح تمھارے دلوں پر بھی اللہ کی مہر لگ چکی ہے۔

(۱۰۳ - ۱۳۶) حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت جس سے واضح ہوتا ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو شکست دینے کے لیے تمام ہتھکنڈے، جو اس کے امکان میں تھے، استعمال کیے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بامراد کیا اور فرعون کو، تمام اسباب و وسائل کے علی الرغم شکست دی۔ مفسدین کا بیڑا غرق ہوا اور جو جماعت مظلوم و مقہور تھی خدا نے اس کو، اس کی استقامت کی بدولت، زمین میں اقتدار بخشا۔

(۱۳۷ - ۱۷۱) بنی اسرائیل کی تاریخ کے تمام ادوار پر ایک جامع تبصرہ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ بڑے بڑے کرم فرمائے لیکن انھوں نے شروع سے لے کر اب تک ہمیشہ خدا کے انعامات کی ناقدری کی اور کسی تذکیر و تنبیہ سے بھی کوئی پائدار فائدہ نہیں اٹھایا اور اب بھی ان کی روش وہی ہے چنانچہ جس حق کی علمبرداری کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی وہ اس کی مخالفت میں پیش پیش ہیں حالانکہ یہ موقع ان کے لیے آخری موقع ہے جس کو ضائع کر دینے کے بعد ان کے لیے دائمی ذلت کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں رہ جائے گی۔

(۱۷۲ - ۲۰۶) خاتمۂ سورہ جس میں قریش کو عہد فطرت کی یاد دہانی کی گئی ہے اور بنی اسرائیل کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر ان کو عذاب الٰہی کی دھمکی دی گئی ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ جب اللہ کی پکڑ میں آ جاؤ گے تو تمھارے یہ اولیا و اصنام جو تم نے گھڑ رکھے ہیں کچھ کام نہیں آئیں گے۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر، اعراض اور ہر آن یاد الٰہی کے ساتھ وابستہ رہنے کی ہدایت۔

سُورَةُ الاعراف (۷)

مَكِّيَّةٌ ———— آياتها ۲۰۶

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۹

الٓمّٓصٓ ﴿١﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢﴾ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٣﴾ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ﴿٤﴾ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٥﴾ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٦﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ﴿٧﴾ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِۨ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٨﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ﴿٩﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۹

یہ الٓمّٓصٓ ہے۔ یہ کتاب ہے جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے تو اس کے باعث تمھارے دل میں کوئی پریشانی نہ ہو تاکہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کر دو اور یہ اہل ایمان کے لیے یاد دہانی ہے۔ لوگو، جو چیز تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب

سے اتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے ماسوا سرپرستوں کی پیروی نہ کرو، بہت کم ہی تم لوگ یاد دہانی حاصل کرتے ہو! اور کتنی ہی بستیاں ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کردیا تو آیا ان پر ہمارا عذاب رات میں اچانک یا دن دہاڑے جب وہ دوپہر کے آرام میں تھے۔ تو جب ہمارا عذاب ان پر آیا اس کے سوا وہ کچھ نہ کہہ سکے کہ بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے۔ سو، یاد رکھو، ہم ان لوگوں سے پرسش کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی ہم استفسار کریں گے۔ پھر ہم ان کے سامنے سب بیان کریں گے پورے علم کے ساتھ اور ہم کہیں غائب نہیں رہے ہیں۔ اس دن وزن دار صرف حق ہوگا تو جن کے پلڑے بھاری ٹھہریں گے وہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوئے وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا بوجہ اس کے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار اور اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ ۱-۹

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓصٓ ۝ کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْكَ فَلَا یَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ (۱-۲)

'الٓمّٓصٓ' حروف مقطعات پر تفصیلی بحث بقرہ میں الٓمّٓ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں الف، لام، میم پر حرف ص کا اضافہ ہے۔ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ جن سورتوں کے نام کچھ مشترک سے ہیں ان کے مطالب میں بھی فی الجملہ اشتراک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سورہ کو غور سے پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بہت سی باتیں بقرہ سے ملتی جلتی ہیں اگرچہ دونوں میں مکی و مدنی کا فرق بھی ہے اور دونوں کے مخاطب بھی الگ الگ ہیں۔

یہاں تالیف کلام کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ الٓمّٓصٓ کو بحذف مبتدا مستقل جملہ بھی قرار دے سکتے ہیں اور اس کو آگے سے ملانا چاہیں تو اس کو مبتدا اور کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْكَ کو اس کی خبر بھی مان سکتے ہیں۔ ہم نے پہلی شکل اختیار کی ہے اور کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْكَ میں بھی مبتدا کو محذوف مانا ہے۔ ویسے دونوں شکلوں میں باعتبار مفہوم کوئی فرق نہیں ہے۔

قریش کی مخالفت کے دورِ شباب میں آنحضرت صلعم کو تسلی اور آپ کی ذمہ داری کی حد

'کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْهُ' 'حرج' کے معنی تنگی، ضیق اور پریشانی کے ہیں۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ یہ دور، جیسا کہ سورہ کے مطالب کی فہرست سے واضح ہے، قریش کی مخالفت کے شباب کا دور تھا۔ وہ ہر قسم کے اچھے سے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے تھے۔ آپ کو زچ کرنے کے لیے روز نت نئے مطالبے وہ پیش کرتے۔ ایک طرف مخالفت کی یہ شدت تھی دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فرضِ دعوت کا احساس اتنا شدید تھا کہ سارے جتن کرنے کے باوجود آپ کو یہ فکر دامن گیر رہتی کہ مبادا میری ہی کوئی کوتاہی ہو جس کے سبب سے یہ لوگ اتنی صاف اور واضح حقیقت کے قائل نہ ہو رہے ہوں۔ یہ دونوں چیزیں مل کر آپ کے دل پر ایک بھاری بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ قرآن نے یہاں یہ دونوں بوجھ ہلکے کیے ہیں۔ قریش کی مخالفت سے بے پروا ہونے کی یوں تلقین فرمائی کہ یہ کتاب نہ تمہاری اپنی پیش کردہ ہے نہ خدا سے درخواست کر کے تم نے اپنے اوپر اتروائی ہے بلکہ یہ تمہاری طلب و تمنا کے بغیر خدا کی طرف سے تم پر اتاری گئی ہے تو تم اس کے مخالفوں کی مخالفت سے اپنے آپ کو ضیق و پریشانی میں کیوں مبتلا کرو؟ جس خدا نے یہ اتاری ہے وہی اس کی تائید و نصرت کے لیے کمک اور بدرقہ بھی فراہم کرے گا۔ نہ وہ کوئی کمزور ہستی ہے نہ حالات سے بے تعلق یا بے خبر ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جو ذمہ داری اس نے تم پر ڈالی ہے اس کو کماحقہٗ ادا کرنے کے لیے تم کن چیزوں کے محتاج ہو اور راہ کے پتھروں کو ہٹانے کے لیے تمھیں کتنی قوت درکار ہے۔ وہ یہ ساری چیزیں فراہم کرے گا تو تم خاطر جمع رکھو اپنے آپ کو پریشانی میں مبتلا نہ کرو۔

'لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ' یہ اس کتاب سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد بتا دی گئی ہے کہ آپ کا فرض صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو تکذیبِ رسول کے نتائج اور قیامت کے احوال سے اچھی طرح ہوشیار کر دیں۔ یہ مانتے ہیں یا نہیں، یہ سوال آپ سے متعلق نہیں ہے۔ آپ پر ذمہ داری صرف انذار و بلاغ کی ہے۔ 'وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ' کا ٹکڑا معناً عطف تو 'لِتُنْذِرَ' ہی پر ہے لیکن یہ فعل کے بجائے اسم کی شکل میں ہے۔ اس کے اسم کی شکل میں لانے سے ایک امرِ واقعہ کا اظہار مقصود ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک انذار کا تعلق ہے وہ تو تم ان کفار کو کر دو لیکن اس سے یاددہانی کا فائدہ صرف اہلِ ایمان ہی اٹھائیں گے۔ یہ مضمون جگہ جگہ، قرآن میں مختلف سورتوں میں، بیان ہوا ہے۔ ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ 'طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰى تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى' طٰہٰ ۱-۴ (یہ سورہ طٰہٰ ہے، ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ تمہاری زندگی تمہارے لیے اجیرن ہو کے رہ جائے، یہ تو بس یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ڈریں، یہ تو نہایت اہتمام سے اتارا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے زمین اور ان بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۳)

کفارِ قریش کو عذاب کی دھمکی

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کا مخاطب مسلمانوں کو مانا ہے لیکن سیاق و سباق اور آیت کے الفاظ دلیل ہیں کہ خطاب کفارِ قریش سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اوپر والی آیت میں تسلی دینے کے بعد اب یہ قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ یہ چیز جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو اور خدا کے ماسوا دوسرے معبودوں اور شریکوں کی پیروی نہ کرو، یہ خیالی اولیاء و اصنام تمہارے کچھ کام آنے والے نہیں ہیں۔ اس کے بعد بانداز حسرت و افسوس فرمایا کہ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ کہ تم ایسے شامت زدہ لوگ ہو کہ مشکل ہی سے یاددہانی حاصل کرتے ہو۔

وَکَمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا فَجَآءَہَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا اَوۡ ہُمۡ قَآئِلُوۡنَ ۔ فَمَا کَانَ دَعۡوٰىہُمۡ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ (۴ - ۵)

'قریہ' کا مفہوم

'قَرۡیَۃ' کا لفظ قریہ اور اہل قریہ دونوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے ضمیریں، اشارات اور فعل وغیرہ استعمال کرنے میں، کبھی لفظ کا اعتبار کرتے ہیں، کبھی مفہوم کا۔ یہ اسلوب ہر زبان میں عام ہے۔

'قَآئِلُوۡنَ' قیلولہ سے ہے۔ قیلولہ کے معنی دوپہر منانے کے ہیں، سونا اس کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ عرب کا ملک، گرم ملک ہے اس وجہ سے وہاں دوپہر میں لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے مکانوں، ڈیروں، خیموں اور باغوں میں آرام کریں۔

اہل تاویل کی ایک غلط فہمی

بعض اہل تاویل کو فَجَآءَہَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا اَوۡ ہُمۡ قَآئِلُوۡنَ کے الفاظ سے یہ خیال ہوا ہے کہ اللہ کا عذاب اس وقت آتا ہے جب لوگ رات میں یا دن میں سوئے ہوئے ہوتے ہیں لیکن یہ بات تاریخ کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بیان کے بھی۔ سورہ انعام میں ہے۔ قُلۡ اَرَءَیۡتَکُمۡ اِنۡ اَتٰىکُمۡ عَذَابُ اللّٰہِ بَغۡتَۃً اَوۡ جَہۡرَۃً ہَلۡ یُہۡلَکُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الظّٰلِمُوۡنَ۔ ۴۷ (کہو، بتاؤ اگر تم پر اللہ کا عذاب اچانک چپکے سے یا کھلم کھلا آ دھمکے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہوگا!) اسی سورہ اعراف میں معذب قوموں کی سرگزشتیں سنانے کے بعد ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے۔ اَفَاَمِنَ اَہۡلُ الۡقُرٰۤی اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ بَاۡسُنَا بَیَاتًا وَّہُمۡ نَآئِمُوۡنَ ۔ اَوَ اَمِنَ اَہۡلُ الۡقُرٰۤی اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ بَاۡسُنَا ضُحًی وَّہُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ۔ ۹۷ - ۹۸ (کیا یہ بستیوں والے مامون ہوئے اس بات سے کہ ہمارا عذاب ان پر رات میں آ دھمکے جب وہ سوتے ہوئے ہوں! کیا یہ بستیوں والے مامون رہے کہ ہمارا عذاب ان پر چاشت کے وقت آ دھمکے جب کہ وہ لہو و لعب میں مشغول ہوں) ہمارے نزدیک فَجَآءَہَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا اَوۡ ہُمۡ قَآئِلُوۡنَ سے یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے کہ خدا کا عذاب اس وقت آیا کرتا ہے جب لوگ سوئے ہوتے ہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خدا کا عذاب شب کی تاریکیوں میں چپ چپاتے بھی آیا اور ڈنکے کی چوٹ دن دہاڑے بھی۔ جس وقت بھی آیا آ گیا، نہ کوئی اس کو روک سکا اور نہ کوئی اس سے اپنے کو بچا سکا۔ صرف وہ لوگ اس سے بچ سکے جن کو اللہ کی امان حاصل ہوئی۔

اصل انذار

یہ وہ انذار ہے جس کا لِتُنۡذِرَ بِہٖ میں اشارہ ہے۔ قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ کتنی قومیں اور بستیاں ہیں

جن پر رات میں یا دن میں جب خدا نے چاہا اپنا عذاب بھیج دیا اور وہ تباہ کر دی گئیں، ان میں سے کوئی بھی خدا کے مقابل میں کھڑی نہ ہو سکی بلکہ ہر قوم نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے اپنے آپ کو عذاب الٰہی کے حوالہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے بھی اس چیز کی پیروی نہ کی جو خدا نے تم پر اتاری ہے تو یہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے۔ آج اکڑتے ہو لیکن اس وقت سارے کس بل نکل جائیں گے اور تم خود اپنے منہ سے اپنے جرم کا اقرار کرو گے لیکن اس وقت یہ اقرار تمہارے لیے کچھ نافع نہیں ہوگا۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِیْنَ ۝ وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ ﹰالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَظْلِمُوْنَ (۶ - ۹)

انذار کی تفصیل

'فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ' ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ کے رسول دو چیزوں سے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔ ایک اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کرنے والی قوم پر لازماً آتا ہے۔ دوسرے اس جزا و سزا سے جس سے آخرت میں ہر شخص کو لازماً دوچار ہونا ہے۔ اوپر والی آیت میں پہلی چیز سے ڈرایا ہے۔ اب آگے اس دوسری چیز سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے جب ہم ان اُمتوں سے بھی پرسش کریں گے جن کی طرف ہم نے اپنے رسول بھیجے اور خود رسولوں سے بھی سوال کریں گے۔

اُمتوں سے جو پرسش ہونی ہے اس کی تفصیل قرآن میں یوں بیان ہوئی ہے۔

كُلَّمَآ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ	جب جب ان کی کوئی بھیڑ دوزخ میں جھونکی جائے گی
خَزَنَتُهَآ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ۝	اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے، کیا تمہارے پاس
قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ فَكَذَّبْنَا	کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے، ہاں
وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۚ	ہمارے پاس ایک ہوشیار کرنے والا آیا تو تھا پر ہم نے اس
اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ۝	کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز بھی نہیں اتاری
وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ	ہے، تم لوگ ایک بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ وہ
مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝	اعتراف کریں گے کہ اگر ہم سنتے سمجھتے ہوتے تو جہنم میں پڑنے
فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ	والے نہ بنتے۔ پس وہ اپنے جرم کا اقرار کریں گے تو لعنت ہو
السَّعِیْرِ۔ ملک ۸ - ۱۱	ان دوزخیوں پر۔

رسولوں سے جو سوال ہوگا اس کا حوالہ سورہ مائدہ میں یوں دیا گیا ہے۔

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ	جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا تمہیں
مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۔ ۱۰۹ - مائدہ	کیا جواب ملا؟

'فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِیْنَ' مطلب یہ ہے کہ اس دن ہم رسولوں اور اُن کی قوموں کو ساری

گزری ہوئی روداد، پورے علم و خبر کے ساتھ سنا دیں گے کہ ہمارے رسولوں نے کس طرح حق بلاغ ادا کیا اور ان کی تکذیب کرنے والوں نے کس طرح جان بوجھ کر ان کی تکذیب کی۔ فرمایا کہ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی ان حالات و واقعات سے بے تعلق یا بے خبر نہیں رہے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے ہمارے سامنے ہوا ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ سنانا قطع عذر کے لیے ہوگا تاکہ کسی کے لیے بھی لب کشائی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔

میزانِ قیامت میں وزن دار صرف حق ہوگا

'وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ' مطلب یہ ہے کہ اس دن وزن رکھنے والی شے صرف حق ہوگا۔ باطل بالکل بے وزن ہوگا، اس کا کوئی وزن ہی نہیں ہوگا۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ جو ترازو نصب فرمائے گا وہ ہر ایک کے اعمال تول کر بتا دے گی کہ اس میں حق کا حصہ کتنا ہے۔ پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے، یعنی حق کی مقدار ان کے ساتھ زیادہ ہوگی، وہ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ خائب و خاسر ہوں گے۔ اعمال کے باوزن اور بے وزن ہونے کے باب میں قرآن نے یہ اصول بھی بیان فرمایا ہے۔ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۔ کہف ۱۰۳-۱۰۵ (کہو ہم تمہیں بتائیں گے کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون ہوں گے؟ وہ جن کی ساری سرگرمیاں طلبِ دنیا میں برباد ہوئیں اور وہ اس خوش گمانی میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں، وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور ملاقات کا انکار کیا تو ان کے اعمال ڈھے گئے، تو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن نہیں قائم کریں گے) اس سے معلوم ہوا کہ میزانِ قیامت میں وزن دار اعمال وہی ہوں گے جو خدا کی رضا اور آخرت کے لیے انجام دیے جائیں۔ جو اعمال اس وصف سے خالی ہوں گے نہ وہ اعمالِ حق ہیں، نہ میزانِ الٰہی میں ان کا کوئی وزن ہوگا۔

زبان کا ایک اسلوب

'وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ..... بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ' ہم ایک سے زیادہ مقامات میں زبان کے اس اسلوب کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ جب صلہ اور فعل میں مناسبت نہ ہو تو وہاں تضمین ہوتی ہے یعنی کوئی ایسا فعل وہاں محذوف مانیں گے جو موجود خلا کو بھر سکے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لفظ کم استعمال ہوتے ہیں، لیکن معنی میں بہت وسعت ہو جاتی ہے۔ یہاں تضمین کھول دی جائے تو پوری بات یوں ہوگی 'بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَيَظْلِمُوْنَ اَنْفُسَهُمْ' بوجہ اس کے وہ ہماری آیات کا انکار کرتے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰-۲۵

پہلے قریش کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا احسان جتا کر ان کو ملامت کی کہ کس طرح اللہ نے تم کو اس سرزمینِ محترم میں قوت و شوکت دی، تم کو خوف سے بے خطر کیا اور تمہارے لیے معاش و معیشت کی راہیں

کھولیں لیکن تم خدا کے شکر گزار و فرمانبردار ہونے کے بجائے ناشکرے اور اس کے نافرمان ہو گئے۔

اس کے بعد آدمؑ و ابلیس کا وہ ماجرا جو بقرہ میں یہود کو سنایا گیا ہے بعض تفصیلات کے اضافہ کے ساتھ قریش کو سنایا کہ شیطان نے آدمؑ اور ان کی ذریت کی ابدی دشمنی کی جو قسم کھائی تھی وہ قسم جس طرح آدمؑ و حوا کو دھوکا دے کر اور جنت سے نکلوا کر اس نے ان پر پوری کی، اسی طرح اس نے اپنی وہ قسم تم پر بھی پوری کر لی ہے اور تم پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکے ہو اور اس کا جو نتیجہ تمہارے حق میں نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰-۲۵

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا

مَا وٗرِیَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾

ع ۲ ۵ ۹

ترجمۂ آیات ۱۰ - ۲۵

اور ہم نے تمھیں اس ملک میں اقتدار بخشا اور تمھارے لیے معاش کی راہیں کھولیں، پر تم بہت ہی کم شکر گزار رہوتے ہو۔ ۱۰

اور ہم نے تمھارا خاکہ بنایا، پھر تمھاری صورت گری کی، پھر فرشتوں کو فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا، پھر تو یہاں سے اتر، تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں گھمنڈ کرے، تو نکل، یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے۔ بولا، اس دن تک کے لیے تو مجھے مہلت دے دے جس

دن لوگ اٹھائے جائیں گے، فرمایا، تو مہلت دے دیا گیا۔ بولا، چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے داہنے اور ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا، تو یہاں سے نکل خوار اور راندہ۔ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ ۱۱-۱۸

اور اے آدم، تم اور تمھاری بیوی رہو جنت میں اور کھاؤ پیو جہاں سے چاہو۔ بس اس درخت کے پاس نہ پھٹکیو کہ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں میں سے بن جاؤ۔ پس شیطان نے ان کے اندر وسوسہ اندازی کی کہ عریاں کر دے ان کی وہ شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اس نے ان سے کہا کہ تمھارے خداوند نے تو تمھیں اس درخت سے صرف اس وجہ سے روکا کہ تم کہیں فرشتے یا ہمیشہ زندہ رہنے والے بن جاؤ۔ اور ان سے قسمیں کھائیں کہ میں تمھارے خیر خواہوں میں ہوں۔ اس طرح اس نے فریب سے ان کو شیشے میں اتار لیا۔ پس جب انھوں نے درخت کا پھل چکھ لیا اور ان کی شرم کی جگہیں ان کے سامنے بے پردہ ہو گئیں اور وہ اپنے کو باغ کے پتوں سے ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو آواز دی کہ کیا میں نے تمھیں اس درخت سے روکا نہیں تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے؟ وہ بولے اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم نامرادوں میں سے ہو جائیں گے۔ فرمایا، اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت خاص تک ٹھہرنا اور کھانا پینا ہے۔ فرمایا، اسی میں تم جیو گے، اسی

میں مروگے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔ ۱۹ - ۲۵

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۱۰)

ارض سے مراد سرزمین حرم ہے

تمکین فی الارض، سے مراد زمین میں اختیار و اقتدار بخشنا ہے۔ مثلاً وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۲۱- یوسف (اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک مصر میں اختیار و اقتدار بخشا) ارض اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن خطاب چونکہ قریش سے ہے اس وجہ سے اس سے مراد یہاں سرزمین حرم ہے جس میں قریش کو اختیار و اقتدار حاصل تھا۔ معایش، سے اشارہ ان معاشی سہولتوں اور برکتوں کی طرف ہے جو ایک وادی غیر ذی زرع میں

قریش کا اختیار و اقتدار سرزمین حرم میں

حضرت ابراہیم کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے اہل عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً حاصل ہوئیں۔ قرآن میں ان برکتوں اور نعمتوں کا جگہ جگہ ذکر ہوا ہے اور ہم تفصیل کے ساتھ بقرہ میں ان کا حوالہ دے چکے ہیں۔ سورہ قصص میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىْءٍ ۵۷۔ قصص (کیا ہم نے ان کو ایک پرامن حرم میں اقتدار نہیں بخشا جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں) قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ، یہ وہ اصل بات ارشاد ہوئی ہے جس کے کہنے ہی کے لیے اوپر والی باتیں بطور تمہید بیان ہوئیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کی دعاؤں اور بیت اللہ کے طفیل تمہیں اللہ تعالیٰ نے اس ملک میں اختیار و اقتدار کی نعمت بھی بخشی اور معاش و معیشت کی نہایت فراخ راہیں بھی کھولیں لیکن تم سخت ناشکرے نکلے کہ تم نے اپنے پروردگار کے بجائے شیطان کی، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، پیروی کی اور اس نے جن جن فتنوں میں تم کو مبتلا کرنا چاہا ہے تم ان سب میں مبتلا ہو گئے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ اَنْظِرْنِىْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۱ - ۱۸)

آدم و ابلیس کا ماجرا اور اس کے مضمرات

اب یہ آدم اور ابلیس کا وہ ماجرا سنایا جا رہا ہے جس سے آدم اور ان کی ذریت کے ساتھ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کی دشمنی کی تاریخ بھی سامنے آتی ہے، اس کا اصل سبب بھی واضح ہوتا ہے اور قیامت

تک کے لیے اس کو باقی رکھنے اور اولادِ آدمؑ سے انتقام لینے کا شیطان نے جو عہد کر رکھا ہے، اس کا بھی اظہار ہونا ہے۔ اس قصے کو پڑھتے ہوئے وہ مقصدِ نگاہ سے اوجھل نہ ہو جس کے لیے یہ سنایا گیا ہے۔

شیطان کو آدمؑ اور ان کی ذریت سے دشمنی اس حسد کی بنا پر ہے جو آدمؑ کی تکریم کے حکم سے اس کو لاحق ہوا۔ اس حکم کی تعمیل سے اس نے نہایت تکبر کے ساتھ انکار کیا جس کے نتیجہ میں وہ نہایت ذلت کے ساتھ جنت سے نکالا گیا۔ بالآخر اس نے اس غصہ میں اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ اسے اٹھائے جانے کے دن تک کے لیے یہ مہلت دی جائے کہ وہ آدمؑ اور اولادِ آدمؑ پر اپنے جوہر آزمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ درخواست منظور کرلی۔ یہ درخواست منظور ہو جانے کے بعد شیطان نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا کہ میں ان کو توحید کی راہ سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر ڈالوں گا اور ان کو اپنی تدبیروں، چالوں اور اپنے پروپیگنڈوں سے اس طرح بدحواس کر دوں گا کہ ان کی اکثریت تیری توحید کی راہ سے ہٹ جائے گی اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ، جس کو تو نے میرے اوپر فضیلت بخشی، ہرگز کسی فضیلت کا سزاوار نہیں ہے۔

اس کے بین السطور پر غور کیجیے تو چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آئیں گی۔

ایک یہ کہ شیطان کو اصلی کد انسان سے یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس پر ترجیح کیوں دی؟ اس نے اسی ترجیح کو غلط ثابت کرنے کے لیے خدا سے مہلت مانگی ہے۔ اب یہ انسان کی کیسی بدبختی ہے کہ وہ اس معرکے میں، جو خود اسی کے خلاف شیطان نے برپا کیا ہے، شیطان کا دست و بازو بن جائے اور خود اپنے عمل سے شیطان کے حق میں گواہ بن کر یہ ثابت کرا دے کہ خدا نے اس کو جس عزت کا اہل سمجھا درحقیقت وہ اس کا اہل نہیں تھا بلکہ اس کے باب میں شیطان ہی کا گمان صحیح تھا۔

دوسری یہ کہ انسان اس دنیا میں ایک کارزارِ امتحان میں ہے جہاں شیطان سے ہر قدم پر اس کا مقابلہ ہے۔ شیطان اپنے سارے داؤں، سارے فریب، سارے حربے انسان پر استعمال کرنے کے لیے خدا سے مہلت لے چکا ہے۔ خدا نے اس کو، جہاں تک ورغلانے کا تعلق ہے، مہلت دے دی ہے اور یہ مہلت اس کو قیامت کے دن تک کے لیے حاصل ہے۔ قیامت کے دن یہ فیصلہ ہوگا کہ کون جیتا اور کون ہارا؟

تیسری یہ کہ شیطان کی اس ساری سعیِ اغوا و اضلال میں اصل ہدف عقیدۂ توحید ہے۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر گھات لگانے اور شبخون مارنے کا اس نے الٹی میٹم دیا ہے کہ میں اس راہ سے انسان کو ہٹا کر چھوڑوں گا اور انسانوں کی اکثریت اس سے منحرف ہو کر خدا کی ناشکری کرنے والی بن جائے گی۔ اوپر قرآن نے قَلِیۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ کے الفاظ سے اسی امرِ واقعی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ شیطان نے انسان کے بارے میں جو گمان ظاہر کیا تھا تم نے اس کو اپنی نالائقی سے حرف حرف سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ اس وجہ سے تم خود اسی انجامِ بد کے مستوجب بن چکے ہو جس کی خبر شیطان کے الٹی میٹم کے جواب میں خدا نے سنا دی تھی کہ میں تجھ کو

اور تیری پیروی کرنے والوں کو جہنم میں بھر دوں گا؟

نظم کلام کے واضح ہو جانے کے بعد الفاظ و اجزائے کلام کی وضاحت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ ان میں سے اکثر چیزیں سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری وضاحت سے زیر بحث آ چکی ہیں۔ ان کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔ البتہ جو چیزیں وہاں زیر بحث نہیں آئی ہیں ان کی وضاحت ہم یہاں کیے دیتے ہیں۔

لفظ 'خلق' کا مفہوم

'وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ الآیۃ'۔ 'خلق' کا صحیح لغوی مفہوم، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، کسی چیز کا خاکہ (DESIGN) بنانا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں تنہا بھی استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ اپنے دوسرے لوازم و متعلقات مثلاً 'برء'، 'تسویہ'، 'ترکیب' اور 'تصویر' کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے۔ جہاں یہ تنہا استعمال ہوا ہے وہاں یہ اپنے تمام لوازم و متعلقات پر مشتمل ہے۔ لیکن جہاں اپنے دوسرے متعلقات کے ساتھ آیا ہے جیسے یہاں 'خَلَقْنٰکُمْ' کے بعد 'صَوَّرْنٰکُمْ' بھی ہے تو ایسے مواقع میں یہ اپنے اصل لغوی مفہوم ہی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں 'خلق' اور 'تصویر' کے دو لفظوں نے تخلیق کی ابتدائی اور انتہائی دونوں حدیں واضح کر دیں۔ ہر مخلوق کا مرحلۂ ابتدائی تو یہ ہے کہ اس کا خاکہ بنا اور اس کا آخری و تکمیلی مرحلہ یہ ہے کہ اس کی صورت گری ہوئی اور اس کے ناک نقشے اور نوک پلک درست ہوئے۔

یہاں مخاطب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قریش ہیں، اور بیان ان کے سامنے نوعِ انسانی کی تخلیق اور ان آزمائشوں کا ہو رہا ہے جو انسان کے لیے مقدر کی گئی ہیں۔ حضرت آدمؑ تمام نسلِ انسانی کے باپ ہیں اس وجہ سے ان کی سرگزشت تنہا انہی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ پوری نسلِ انسانی کی سرگزشت ہے۔

شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے

'ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ' سجدہ کے مفہوم، اس حکم کی مصلحت، جنات کے اس حکم میں شامل ہونے کی وجہ اور اس ذیل کے دوسرے اہم مسائل پر ہم بقرہ کی تفسیر میں گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ 'ابلیس' اس جن کا لقب ہے جس نے بابا آدمؑ کو دھوکا دیا۔ یہ جنات میں سے تھا اور خدا کی نافرمانی کر کے سرکش بن گیا۔ جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ اس کے پیرو بن جاتے ہیں وہ سب اس کی معنوی ذریت ہیں۔ ایسے ہی جنوں اور انسانوں کے لیے قرآن میں شیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ شیطان، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا، کوئی مستقل بالذات مخلوق نہیں ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

'قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ' قرآن میں، دوسرے مقام میں، یہی بات یوں فرمائی گئی ہے قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ (۔۔۔ فرمایا، اے ابلیس تجھے اس چیز کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا) دونوں آیتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک جگہ 'مَا مَنَعَكَ' کے بعد 'لا' ہے دوسری جگہ نہیں ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ 'مَا مَنَعَكَ' میں چونکہ خود 'لا' کا مضمون موجود ہے اس وجہ سے اس کے بعد اس کا لانا ضروری نہیں ہے لیکن لائیں تو اس سے شدتِ نکیر کا مضمون پیدا ہوگا۔ چنانچہ اس فقرے میں شیطان کے عدمِ سجدہ کی شناعت پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ اسلوب ہماری اپنی زبان

میں بھی ہے۔

آدم بجائے خود سزاوارِ سجدہ نہیں تھے

'اِذْ اَمَرْتُكَ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدم بجائے خود سزاوار سجدہ نہیں تھے بلکہ خدا کے حکم کی بنا پر اس کے سزاوار ہوئے تھے اور ان کو سجدہ اصلاً و حقیقتہً ان کو سجدہ نہیں تھا، بلکہ خود خدا کو سجدہ تھا اس لیے کہ یہ سجدہ اسی کے امتثالِ امر میں تھا۔

نسل و نسب کو بنائے شرف سمجھنا ابلیس کی وراثت ہے

'قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ'۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کی سرکشی کی بنیاد اس گھمنڈ پر تھی کہ شرف و عزت کا تعلق نسل و نسب سے ہے اور اس اعتبار سے وہ انسان سے اشرف ہے۔ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے، آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن نے یہاں یہ رہنمائی دی کہ شرف و عزت کو نسل و نسب سے متعلق سمجھنے کا فلسفہ ابلیس کی ایجادات میں سے ہے اور جہاں کہیں بھی یہ موجود ہے اسی کی وراثت کی حیثیت سے موجود ہے۔ اللہ کے ہاں جو چیز سبب عزت و سرخروئی ہے وہ صرف اللہ کے حکم کی اطاعت ہے اس کے سوا کوئی چیز بھی خدا کے ہاں عزت پانے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

تکبر شرک ہے

'قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا الاية'۔ جانتے بوجھتے خدا کے حکم سے سرکشی تکبر ہے۔ جو اس تکبر میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خدا سے بڑا یا اس کا ہمسر ٹھہراتا ہے جو صریحاً شرک ہے۔ کبریائی صرف خدا کے لیے زیبا ہے۔ جو اس میں حصہ بٹانے کے مدعی بنتے ہیں ان پر خدا کی طرف سے ذلت کی مار پڑتی ہے۔ متکبر کے لیے خدا کی بہشت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ بہشت صرف خاشعین و عابدین کی جگہ ہے اس وجہ سے ابلیس کو وہاں سے نکلنے کا حکم ہوا اور اس کے تکبر کے جرم میں اس کو دائمی ذلت کی سزا دی گئی۔ آگے اسی طرح کے متکبرین کے بارے میں فرمایا ہے کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح متکبرین خدا کی بہشت میں نہیں جا سکتے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۴۰ (بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے اعراض کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے) بعینہٖ یہی بات سیدنا مسیحؑ نے فرمائی ہے کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح دولت مند خدا کی بہشت میں نہیں جا سکتا۔ دونوں تعبیروں میں صرف یہ فرق ہے کہ قرآن نے اصل جرم 'استکبار' کا حوالہ دیا ہے اور سیدنا مسیحؑ نے علّت جرم یعنی دولت کا، جو بالعموم استکبار کا سبب بن جاتی ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شیطان کا اصل جرم استکبار تھا جس کے سبب سے وہ جنت سے نکالا گیا۔ اس وجہ سے جو لوگ اس جرم میں اس کے ساتھی بنیں گے ان کے لیے خدا کی بہشت میں کوئی مقام نہیں ہے۔

انسان کے لیے اصل مرکزِ امتحان

'قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ' ابلیس کو چونکہ ذلت کے ساتھ جنت سے

نکل جانے کا حکم ہوا اس وجہ سے اس کو گمان ہوا کہ اب اس کے لیے سعی و عمل کی کوئی مہلت باقی نہیں رہی ہے۔ اس پر اس نے خدا سے درخواست کی کہ اسے مہلت عطا کی جائے کہ وہ ثابت کر سکے کہ انسان فی الواقع اس شرف کا سزاوار نہیں ہے جو اسے بخشا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مہلت دے دی۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے انسان کی زندگی کا رزار امتحان میں داخل ہوتی ہے۔ شیطان نے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اپنا پورا زور اس بات کے لیے لگانے کا منصوبہ بنایا کہ وہ انسان کو نا اہل و نالائق ثابت کر دے اور انسان کی سعادت و کامرانی اس بات میں ٹھہری کہ وہ یہ ثابت کرے کہ فی الواقع وہ اس کا اہل ہے۔

کامیابی و ناکامی کا فیصلہ قیامت پر

یہ مہلت سعی و عمل چونکہ انسان کو موت ہی تک حاصل ہے اس وجہ سے شیطان کو بھی ورغلانے اور بہکانے کا موقع صرف انسان کی موت ہی تک ہے۔ مر جانے کے بعد جس طرح انسان پر سعی و عمل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اسی طرح شیطان کے لیے اس پر زور آزمائی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہے لیکن یہ فیصلہ کہ کون جیتا کون ہارا، قیامت کے دن ہی ہوتا ہے اس وجہ سے ابلیس نے مہلت 'اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ' مانگی جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اپنی یہ درخواست منظور کرا کے انسان کے شرف و مزیت کے معاملہ کا فیصلہ قیامت پر ملتوی کرا دیا۔ اب وہیں یہ فیصلہ ہوگا کہ انسان اس تاج زریں کا سزاوار ہے یا نہیں ؟ اگر وہ سزاوار ٹھہرا تو اس کے لیے جنت کی ابدی نعمتیں ہیں ورنہ جس طرح شیطان دوزخ میں ہوگا اسی طرح انسان بھی دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنائے گا۔

ابلیس کا چیلنج اللہ تعالیٰ کو

'قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ' اپنی درخواست منظور کرا لینے کے بعد یہ چیلنج ابلیس نے اللہ تعالیٰ کو دیا۔ اس نے اپنا اصل حریف اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھا اس وجہ سے چیلنج بھی اللہ تعالیٰ ہی کو دیا۔ گویا اس کارزار میں شیطان کے نقطۂ نظر سے، اصل مقابلہ شیطان اور انسان کے درمیان نہیں بلکہ خدا اور شیطان کے درمیان ہے۔ 'فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ' (بوجہ اس کے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے سجدہ نہ کرنے کے معاملہ میں اپنے رویہ کو بالکل صحیح سمجھا۔ اس کے نزدیک اس کی گمراہی خود کردہ نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) خدا کردہ ہے۔ گویا خدا نے اسے ڈالا ہی تھا ایسے امتحان میں جس سے وہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا اس وجہ سے وہ گمراہ ہوا تو اس گمراہی پر نعوذ باللہ خدا ہی نے اس کو مجبور کیا۔

شیطان کی اصل گھات

'صِرَاطِ مُسْتَقِیْم' سے مراد توحید کی راہ ہے۔ انسان کی فطرت اور خدا میں براہ راست ربط ہے۔ فطرت کی راہ میں غیر فطری کج پیچ نہ پیدا کر دیے جائیں تو انسان توحید کے سوا کوئی اور راہ نہیں اختیار کر سکتا۔ اس وجہ سے توحید کو قرآن میں بھی اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی 'صِرَاطِ مُسْتَقِیْم' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جب تک انسان اس راہ پر قائم رہتا ہے اس وقت تک، وہ سُست رَو اور آبلہ پا ہو کر بھی رو بمنزل رہتا ہے اس وجہ سے دیر سویر منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ برعکس اس کے، اگر وہ شرک کے کسی موڑ کی طرف مڑ جائے تو اصل منزل سے روگرداں ہو جاتا ہے اور پھر جتنے قدم بھی وہ آگے بڑھتا ہے

اس کا سفر کسی ضَلٰلِ بَعِیْد ہی کی راہ میں ہوتا ہے۔ یہ رمز ہے جس کے سبب سے شیطان کو انسان پر پوری فتح حاصل کرنے کا اس وقت تک موقع نہیں ملتا جب تک وہ اس کو توحید کی شاہراہ سے ہٹا کر شرک کی کسی پگڈنڈی پر نہ ڈال دے۔ چنانچہ اس نے اپنے چیلنج میں آشکارا الفاظ میں بتا دیا کہ وہ انسان کی گھات میں توحید کی راہ پر بیٹھے گا اور اس راہ سے اس کو بے راہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

شیطان کے ہمہ جہت حملے کا بیان

ثُمَّ لَاٰتِیَنَّھُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ وَمِنْ خَلْفِھِمْ یہ بیان ہے شیطان کے حملہ کی قوت، وسعت اور ہمہ گیری کا خود اس کی زبان سے۔ وہ ہر جہت، ہر سمت، ہر پہلو سے انسان پر حملہ کرے گا۔ وہ اس کے میلانات، احساسات، جذبات، خواہشات ہر منفذ سے اس کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس کے فکر، فلسفہ، علم، ادراک ہر چیز کو مسموم کرے گا۔ وہ اس کی تحقیق، تنقید، تصنیف، تالیف، ادب، آرٹ، لٹریچر ہر چیز میں اپنا زہر گھولے گا، وہ اس کے مذہب، تمدن، معیشت، معاشرت، فیشن، کلچر، سیاست اور مذہب ہر چیز کے اندر فساد برپا کرے گا۔ شیطان کا یہی چیلنج سورۂ بنی اسرائیل میں بدیں الفاظ نقل ہوا ہے۔ قَالَ اَرَءَیْتَکَ ھٰذَا الَّذِیْ کَرَّمْتَ عَلَیَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗٓ اِلَّا قَلِیْلًا ۔ قَالَ اذْھَبْ فَمَنْ تَبِعَکَ مِنْھُمْ فَاِنَّ جَھَنَّمَ جَزَآؤُکُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۔ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْھُمْ بِصَوْتِکَ وَاَجْلِبْ عَلَیْھِمْ بِخَیْلِکَ وَرَجِلِکَ وَشَارِکْھُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْھُمْ ۭ وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ ۭ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا ۶۲-۶۵ (ذرا دیکھ تو، یہی ہے وہ جس کو تو نے مجھ پر فضیلت بخشی ہے! اگر تو نے قیامت تک کے لیے مجھے مہلت بخشی تو تھوڑے قلیل کے سوا میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔ خدا نے فرمایا، چل دور ہو، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے تو تمھارا بھرپور بدلہ جہنم ہے۔ تو ان میں سے جن کو اپنے شور و شغب سے اکھاڑ سکے اکھاڑ لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے اور ان کے مال و اولاد میں ساجھی بن جا اور ان کو اپنے پر فریب وعدوں کے سبز باغ دکھا۔ شیطان کے سارے وعدے ان سے محض دھوکے کی ٹٹی ہیں —— بے شک تجھ کو میرے خاص بندوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا اور تیرا رب اعتماد کے لیے کافی ہے)
اس آیت سے شیطان کے پروپیگنڈے کے زور اور اس کی وسعت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وہ اپنے منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے سیاسی ہتھکنڈے بھی استعمال کرے گا۔ البتہ ایک پہلو اس میں تسلی کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان پر یہ اختیار نہیں بخشا کہ وہ اس کے ارادے اور اختیار کو سلب کر سکے۔ انسان کا ارادہ و اختیار بہر حال باقی رہے گا۔ اس وجہ سے اللہ کے جو بندے صراط مستقیم پر قائم رہنے کا عزم کر لیں گے وہ شیطان کی تمام غوغا آرائیوں کے علی الرغم اس پر قائم رہیں گے، اگرچہ اس کے لیے انھیں جان کی بازی کھیلنی پڑے۔

توحید کی اصل روح

وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَھُمْ شٰکِرِیْنَ، کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ تو ان کی اکثریت کو اپنا موحد نہیں پائے گا۔

اس لیے کہ توحید کی اصل حقیقت یہی ہے کہ بندہ اپنی ہر نعمت کو اللہ ہی کا عطیہ، اسی کا فضل جانے اور اسی کا شکر گزار رہے۔ اگر وہ اس کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دے تو یہ شرک ہے۔ اس مسئلہ پر پیچھے بھی بحثیں گزر چکی ہیں اور آگے بھی اسی سورہ میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو سامنے آئیں گے۔ اوپر آیت ۱۰ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

خدا کا دوٹوک فیصلہ

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ۖ لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ الآیۃ۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو وہ مہلت تو دے دی جو اس نے مانگی لیکن ساتھ ہی اس نے اس کو ذلیل و خوار کر کے جنت سے نکال بھی دیا اس لیے کہ جنت میں متمردین و متکبرین کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ان لوگوں کا انجام بھی واضح فرما دیا جو انسانوں اور جنوں میں سے اس کی پیروی کریں گے۔ فرمایا کہ میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔ الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جس طنطنہ اور زور کے ساتھ شیطان نے انسان کو گمراہ کرنے اور ان کی اکثریت کو جیت لینے کے عزم کا اظہار کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی پوری شان بے نیازی اور جبروت کے ساتھ دیا ہے جس سے واضح ہے کہ خدا کا یہ فیصلہ دوٹوک ہے، اس میں کسی رو رعایت کی گنجائش نہیں ہے۔

يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِن سَوْآتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ۝ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ۝ فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۝ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ (۱۹ - ۲۵)

سرگزشت آدمؑ و ابلیس کے چند مضمرات

یہ اسی سرگزشت کا آگے کا حصہ بیان ہو رہا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ شیطان کو جنت سے نکالنے کے بعد آدمؑ و حوا کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی کہ تم چین سے جنت میں رہو، اس کی تمام نعمتوں سے آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھاؤ، بس اتنا خیال رکھنا کہ فلاں درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ تم خود اپنی جان پر ظلم ڈھاؤ گے اور اس جنت سے محروم ہو جاؤ گے۔ شیطان نے یہیں سے آدمؑ پر حملہ کرنے کی راہ نکال لی۔ اس نے آدمؑ و حوا کو یہ پٹی پڑھائی کہ اس باغ میں کوئی درخت فائدہ اٹھانے کا ہے تو وہی ہے جس سے تمھیں تمھارے رب نے روک رکھا ہے۔ اس سے تمھیں محض اس وجہ سے روکا گیا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمھاری زندگی ابدی نہ ہو جائے۔ شیطان نے قسمیں کھا کھا کے آدمؑ و حوا کو اپنی خیرخواہی کا یقین دلا دیا، بالآخر انھیں اس درخت کا پھل کھا لینے پر آمادہ کر لیا۔ اس کا پھل چکھتے ہی وہ حلۂ جنت سے محروم ہو گئے اور اپنے آپ کو ڈھانکنے کے لیے انھوں نے اپنے اوپر پتے سینے شروع کر دیے۔ اس وقت خدا نے ان کو آواز دی

کہ میں نے تو تمھیں آگاہ کر دیا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ اپنی دشمنی کا کھلے بندوں اعلان کر چکا ہے۔ اس پر آدمؑ و حوّا کو تنبیہ ہُوا۔ انھوں نے فوراً توبہ و استغفار کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرمائی لیکن ساتھ ہی آدمؑ و حوّا اور ابلیس سب کو وہاں سے نکلنے کی ہدایت ہُوئی کہ اب تمھارا مستقر زمین ہے، اس میں تم ایک دُوسرے سے آزمائے جاؤ گے، پھر جو اس جنت کا اپنے آپ کو حق دار ثابت کرے گا وہ جنت پائے گا اور جو دوزخ کا سزاوار ٹھہرے گا وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

اس سرگزشت کے سنانے سے جن حقائق کا سراغ مقصود ہے ان پر تفصیل سے سورہ بقرہ کی تفسیر میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ البتہ جو باتیں وہاں زیرِ بحث نہیں آئی ہیں ان کی وضاحت ہم یہاں کریں گے۔

یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ الایۃ، 'شجرہ' پر بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے۔ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ سے یہ بات نکلتی ہے کہ پوری جنت کی ہر چیز سے آدمؑ و حوّا کو فائدہ اٹھانے کی آزادی حاصل تھی، صرف ایک درخت سے ان کو روکا گیا تھا لیکن وہی درخت ان کے لیے آزمائش بن گیا۔ شیطان نے اسی شجرِ ممنوعہ کے فوائد و برکات پر ایسی دلفریب تقریر کی کہ آدمؑ اللہ کے عہد پر قائم نہ رہ سکے۔ شیطان کی یہی تکنیک اولادِ آدمؑ کے ساتھ اس دنیا میں بھی ہے۔ اس دُنیا کی ہر چیز انسان کے لیے مباح ہے صرف گنتی کی چند چیزیں ہیں جو ممنوع ہیں۔ شیطان بس انھی چیزوں کو لے کر اپنی اور اپنے کارندوں کی وسوسہ اندازیوں سے لوگوں کو باور کراتا ہے کہ تمھاری ساری کامیابی و ترقی کا راز بس انھی چیزوں کے اندر مضمر ہے جن سے روک دیا گیا ہے۔

ابلیس کو جنت سے نکلنے کے بعد بھی آدمؑ تک رسائی حاصل تھی

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا الایۃ، ہر چند شیطان مردود قرار پاکر جنت سے نکالا جا چکا تھا لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ اس نے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو ورغلانے اور بہکانے کے لیے مہلت حاصل کر لی تھی۔ اس مہلت کے سبب سے معلوم ہوتا ہے، اس کو آدمؑ و حوّا تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی چنانچہ اس سے اس نے فائدہ اٹھایا اور وسوسہ اندازی کے لیے آدمؑ کے پاس پہنچ گیا۔

لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا میں لَ، عاقبت کا ہے۔ شیطان کی کوشش تو، جیسا کہ اس نے اپنے چیلنج میں ظاہر کیا ہے آدمؑ کو کفرانِ نعمت اور خدا کی نافرمانی میں مبتلا کرنے کی تھی لیکن اس کا انجام چونکہ اس شکل میں ظاہر ہُوا کہ آدمؑ و حوّا حلّہ جنت سے محروم ہو گئے، اس وجہ سے اس کو اس طرح فرمایا گیا ہے گویا شیطان کی کوشش تھی ہی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر۔ حلّہ جنت سے یہ محرومی اشارہ تھی اس بات کی طرف کہ اب آدمؑ کو اپنی ساری ضروریات اپنی سعی و محنت سے فراہم کرنی ہیں۔ اب تک ان کے لیے ہر چیز کا جو خدا ساز انتظام تھا وہ اس نافرمانی کے بعد ختم ہو گیا۔

آدمؑ کا تصور فرشتوں اور زندگی سے متعلق

مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ ابلیس نے آدمؑ کو لالچ دیا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے یا تو وہ فرشتوں کے مرتبے میں آجائیں گے یا انھیں ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے سجدہ سے مشرف ہونے کے باوجود آدمؑ فرشتوں کے مرتبہ کو اپنے سے اونچا سمجھتے تھے

بنزدہ یہ جانتے تھے کہ یہ زندگی جو ان کو حاصل ہوئی ہے ابدی زندگی نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شیطان ان کو ان دونوں چیزوں کے نام پر ورغلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوتا۔

مقاسمت مبالغہ کے مفہوم کے لیے

وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ، 'مقاسمۃ'، باب مفاعلت سے ہے جو عام طور پر تو مشارکت کے مفہوم کے لیے آتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ صرف تکثیر اور مبالغہ کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں 'اقسم' کے بجائے 'قاسم' کا لفظ جو استعمال ہوا ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ شیطان کو اپنا اعتماد جمانے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ بار بار قسمیں کھا کھا کے اسے یہ یقین دلانا پڑا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، محض بربنائے خیر خواہی کہہ رہا ہے اس میں کسی بدنیتی کو دخل نہیں ہے۔

'فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ'، 'یادلاء الدلو' سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ 'دلّی فلانا بغرور' کے معنی 'اوقعہ فیما اراد من تغریرہ' اس نے اس کو جس فریب میں مبتلا کرنا چاہا اس میں مبتلا کر دیا، اس کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا، اس کو شیشہ میں اتار لیا۔

ستر پوشی انسان کی فطرت ہے

'فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ'۔ درخت چکھنے کے معنی درخت کا پھل چکھنے کے ہیں۔ عربی میں مضاف کے حذف کر دینے کا اسلوب بہت معروف ہے۔ 'خصف' کے معنی گانٹھنے، گوتھنے، جوڑنے کے ہیں۔ یہ درخت، جیسا کہ اوپر گزرا آدم پر حرام ٹھہرایا گیا تھا اس وجہ سے اس کا پھل کھا لینے کی سزا ان کو یہ ملی کہ وہ حلۂ جنت سے محروم ہو گئے۔ لباس کا بنیادی مقصد چونکہ ستر ہے اور اس سے اچانک محرومی کا اولین اثر انسان پر بے پردگی کے احساس کی شکل میں بطور ایک حادثہ کے پڑتا ہے۔ اس وجہ سے صورت واقعہ کی پوری تصویر سامنے لانے کے لیے اس کو 'بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ 'وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ' کے اسلوب بیان سے اس گھبراہٹ اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا ہے جو اس اچانک حادثہ سے آدم و حوا پر طاری ہوئی۔ جوں ہی انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ننگے ہو کر رہ گئے ہیں فوراً انھیں اپنی ستر کی فکر ہوئی اور جس چیز پر ہاتھ پڑ گیا اسی سے ڈھانکنے کی کوشش کی، چنانچہ کوئی چیز نہیں ملی تو باغ کے پتے ہی اپنے اوپر گانٹھنے گوتھنے لگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر کا احساس انسان کے اندر بالکل فطری ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں محض عادت کی پیداوار ہیں ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ جس طرح توحید فطرت ہے، شرک انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے، اسی طرح حیا فطرت ہے، بے حیائی انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اپنے محل میں آئے گی۔

'وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا الآية' یہ اشارے ہیں ان تنبیہات کی طرف جو اوپر آیات ۱۷-۱۹ میں گزر چکی ہیں۔ آدم پر شیطان کی دشمنی کی نوعیت بھی اچھی طرح واضح کر دی گئی تھی، اس کا اور اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بھی واضح کر دیا گیا تھا اور خاص اس درخت کی نشان دہی بھی تعین کے ساتھ کر دی گئی تھی جس سے ان کو خطرہ پیش آ سکتا تھا۔

'قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا' یہ آدمؑ و حوا کی وہ توبہ ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تنبیہ کے بعد کی۔ اس توبہ کا ذکر سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ اس توبہ سے آدم نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی۔ ابلیس کے متعلق تو اوپر گزر چکا ہے کہ وہ خدا کی نافرمانی کر کے تنبیہ کے باوجود، اکڑ گیا لیکن آدمؑ و حوا نے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کیا، خدا سے معافی مانگی اور بقرہ میں تصریح گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور ان پر رحم فرمایا اور اس طرح آدمؑ نے اپنے عمل سے اپنی ذریت کے لیے مثال قائم کی کہ اگر شیطان کے ورغلانے سے انسان کوئی ٹھوکر کھا جائے تو اس کے نتائج سے بچنے کی راہ توبہ ہے۔

توبہ سے آدمؑ نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی

'قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ الاٰیۃ' اس آیت کے تمام پہلوؤں پر بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے آدمؑ و حوا نے اگرچہ توبہ کر لی تھی اور ان کی توبہ اللہ تعالیٰ نے منظور بھی فرمالی تاہم حکمت الٰہی کا تقاضا یہی ہوا کہ آدمؑ و حوا جنت سے نکلیں اور اس دنیا میں رہ کر وہ اور ان کی ذریت شیطان اور اس کی ذریت سے مقابلہ کریں، پھر اس میدان میں جو شیطان سے بازی لے جائیں وہ جنت کے وارث ٹھہریں۔ گویا مقابلہ تو وہی رہا جس کا ابلیس نے چیلنج دیا تھا لیکن میدان مقابلہ جنت کے بجائے یہ دنیا بنا دی گئی اور جنت کو انعام قرار دے دیا گیا۔ اولادِ آدم میں سے ان خوش بختوں کے لیے جو شیطان کے مقابل میں سرخ رُو ٹھہریں۔

'بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ' کے ٹکڑے پر تفصیل سے تفسیر بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اسلوب کلام دلیل ہے کہ اس میدان میں آدمؑ و ابلیس کو اتارا ہی دو محارب فریقوں کی حیثیت سے گیا ہے۔ شیطان کو یہ مہلت دی گئی ہے کہ وہ اولادِ آدم میں سے جن کو جیت سکتا ہے جیت لے اور اولادِ آدمؑ کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ جو جنت کی میراث حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ شیطان کو پچھاڑیں اور جنت جیت لیں۔

آدمؑ اور ابلیس دو محارب فریق

یہاں اس مغالطہ سے متنبہ رہنا ضروری ہے جو نصاریٰ کو پیش آیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان بھی اس دنیا میں شیطان کی طرح لعنتی ہو کر اترا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کفارہ کا ایک خانہ ساز عقیدہ گھڑا ہے۔ قرآن نے بقرہ میں بھی اور یہاں بھی نہایت واضح رہنمائی دی ہے کہ آدمؑ توبہ کے بعد اپنی پچھلی غلطی کے خمیازہ سے بالکل پاک ہو کر اس دنیا میں آئے ہیں اور اس دنیا میں ان کا بھیجا جانا اس لیے ہوا کہ وہ اور ان کی ذریت شیطان کے مقابل میں اپنے عزم و ایمان سے اپنے آپ کو اس عزت کا حق دار ثابت کر دیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشی اور جو شیطان کے حسد کا باعث ہوئی۔

نصاریٰ کا مغالطہ

'قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ الاٰیۃ' یہ ان مراحل کا بیان ہے جن سے اس دنیا میں آدمؑ و اولادِ آدم کو گزرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان تمام مراحل سے گزر کر تم ہمارے پاس لوٹو گے اور اس وقت ہم تمھیں بتائیں گے کہ تم نے کیا کھویا ہے، کیا پایا ہے اور اس میدانِ مقابلہ سے تم سرخرو ہو کر لوٹے ہو یا نامراد ہو کر۔

آدمؑ و اولاد آدم کے لیے امتحان کے مراحل

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۶-۴۳

آگے کی آیات میں پہلے ان باتوں کی یاد دہانی کی گئی ہے جن سے، شیطان کی دشمنی کے پیش نظر، اولادِ آدم کو شروع ہی میں آگاہ کر دیا گیا تھا اور جن کا اہتمام پیش آنے والے امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے ہر ابن آدم کا فرض تھا تاکہ وہ اس افتاد سے محفوظ رہیں جو ان کے دشمن ازلی کے ہاتھوں ان کے باپ کو پیش آئی۔

اس کے بعد قریش کی طرف جو اس سورہ میں مخاطب ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے ان ہدایات کو نظر انداز کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان نے ان کو بھی ورغلا کر اسی طرح ان کے کپڑے اتروا لیے ہیں جس طرح ان کے ماں باپ ـــ آدمؑ و حوّا ـــ کے اتروا لیے تھے لیکن یہ اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بے حیائی انھوں نے شیطان کی پیروی میں نہیں بلکہ خدا کے حکم کی تعمیل میں اختیار کی ہے اور دلیل اس کی ان کے پاس صرف یہ ہے کہ یہ طریقہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے وراثت میں پایا ہے۔

اس کے بعد اس روح اور اصل الاصول کا حوالہ دیا جو تمام خدائی احکام میں لازماً ملحوظ ہے اور جو خدائی احکام اور شیطانی بدعات میں امتیاز کے لیے عقلی و فطری کسوٹی ہے۔ پھر اس کسوٹی پر پرکھ کر بتایا کہ آج جن ابلیسی بدعات کو قریش خدا کا دین بتا رہے ہیں ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ باتیں انھوں نے شیطان کی رہنمائی میں خود ایجاد کی ہیں اور منسوب ان کو خدا کی طرف کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ان کو دھمکی دی کہ انھوں نے یہ روش نہ بدلی تو یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جن سے ان کی ہم مشرب قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کا حوالہ دیا جو آدمؑ کو اس رزم گاہ امتحان میں اتارتے وقت ان کی ذریت میں انبیا و رسل کا سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کرنے کے لیے فرمایا تھا اور یہ آگاہی دی تھی کہ جو ان انبیا کی پیروی کریں گے وہ شیطان کے فتنوں سے امان میں رہیں گے اور جو ان کو جھٹلائیں گے وہ اپنی مہلت حیات پوری کر کے دوزخ میں پڑیں گے۔

اس کے بعد مکذبین انبیا اور متبعین انبیا دونوں گروہوں کے احوال آخرت کی نہایت موثر تصویر کھینچی ہے۔ پہلے گروہ کے متعلق بتایا ہے کہ جب دوزخ میں سب اگلے پچھلے اکٹھے ہوں گے تو آپس میں جوتیوں میں دال بٹے گی اور ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجیں گے۔ اخلاف جن بڑوں کی پیروی پر آج نازاں ہیں، کل ان کو گالیاں دیں گے کہ انھوں نے ہماری راہ ماری، یہ نہ گمراہ کرتے تو ہم ہدایت پر ہوتے۔ اکابر اخلاف کو گالیاں دیں گے کہ یہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے ہدایت کی راہ اختیار نہ کی، اس میں ہمارا کیا قصور۔ دوسرے گروہ کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ جنت میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے خوش خوش

بیٹھے ہوں گے، کسی نفرت و ملامت کا کہیں نام و نشان بھی نہ ہوگا، مبارک سلامت کے تحائف کے مبادلے ہو رہے ہوں گے اور ہر گوشے میں خدا کے ترانۂ حمد اور انبیاء کے احسانات کے اعتراف سے محفل گونج رہی ہوگی ۔۔۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۶-۴۳

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڛ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

ع ۳ ۱۰

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا
وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا
لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ
يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ
نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ
قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا
وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا
فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا
دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ
قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا
ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ
اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِىْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۫ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِىْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِىَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

الثلثة

ترجمۂ آیات ۲۶-۴۳

اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمھارے لیے ستر پوش بھی ہے اور زینت بھی۔ مزید برآں تقویٰ کا لباس ہے جو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ اللہ کی آیات میں سے ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ اے بنی آدم! شیطان تمھیں فتنہ میں نہ ڈالنے پائے، جس طرح اس نے تمھارے باپ ماں کو جنت سے نکلوا چھوڑا اُن کے لباس اتروا کر کہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کر دے، وہ اور اس کا جتھہ تم کو وہاں سے تاڑتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑتے۔ ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے جو ایمان سے محروم ہیں۔ ۲۶-۲۷

اور جب یہ لوگ کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں، کہتے ہیں، ہم نے تو اسی طریق پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو، اللہ کبھی

بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم لوگ اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں۔ کہہ دو، کہ اللہ نے تو ہر معاملے میں قسط کا حکم دیا ہے۔ اور یہ کہ ہر مسجد کے پاس اپنا رُخ اسی کی طرف کرو اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے جس طرح اس نے تمہارا آغاز کیا اسی طرح تم لوٹو گے۔ ایک گروہ کو اس نے ہدایت بخشی اور ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہو گئی۔ انھوں نے اللہ کے ماسوا شیاطین کو اپنا رفیق بنایا اور گمان یہ رکھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اے بنی آدم! ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو اور کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو۔ خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پوچھو کس نے حرام ٹھہرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو؟ کہہ دو کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کر رہے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ کہہ دو، خدا نے حرام تو بس بے حیائیوں کو ٹھہرایا ہے، خواہ کھلی ہوں خواہ پوشیدہ۔ اور حق تلفی، ناحق زیادتی اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اللہ کا کسی چیز کو ساجھی ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر کسی ایسی بات کا بہتان لگاؤ جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ اور ہر امت کے لیے ایک مقررہ مدت ہے تو جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے، نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ۲۸-۳۴

اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں تم کو میری آیات سناتے تو جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور جو میری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گے وہی دوزخ والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھیں یا اس کی آیات کو جھٹلائیں۔ ان لوگوں کو ان کے نوشتہ کا حصہ پہنچے گا۔ یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے ان کو قبض کرنے آئیں گے تو اُن سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے کہاں ہیں؟ وہ جواب دیں گے وہ تو سب ہم سے کھوئے گئے اور بہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ لاریب وہ کفر میں رہے۔ حکم ہو گا، جاؤ، پڑو دوزخ میں ان امتوں کے ساتھ جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے گزریں۔ جب جب کوئی امت داخل ہو گی اپنی ساتھی امت پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب سب اس میں اکٹھے ہو لیں گے، ان کے پچھلے اگلوں کے بارے میں کہیں گے، اے ہمارے رب! یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا تو ان کو دہرا عذاب نار دیجیو۔ ارشاد ہو گا تم سب کے لیے دہرا ہے، پر تم جانتے نہیں۔ اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے، تم کو بھی تو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی تو تم بھی اپنے کیے کی پاداش میں عذاب چکھو۔ ۳۵ - ۳۹

بے شک جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے منہ موڑا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں نہیں داخل ہوں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ سما جائے۔ اور ہم مجرموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ ان کے لیے دوزخ ہی کا بچھونا اور اوپر سے اسی کا اوڑھنا ہو گا اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے ۔۔۔ ہم کسی جان

پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے ـــــ وہی جنت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان کے سینے کی ہر خلش ہم کھینچ لیں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور وہ کہیں گے شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس نے اس چیز کی ہم کو ہدایت بخشی، اگر اللہ نے ہمیں ہدایت نہ بخشی ہوتی تو ہم تو ہدایت پانے والے نہ بنتے۔ ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے۔ اور ان کو پیغام دیا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث ٹھہرائے گئے ہو۔ ۴۰-۴۳

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۶-۲۷)

لباس سے سترپوشی اور زینت دونوں چیزیں مقصود ہیں

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ 'ریش' کا لفظ چڑیوں کے پروں کے لیے بھی آتا ہے اور اس سے زیب و زینت کا لباس بھی مراد ہوتا ہے۔ لباس کا اولین مقصد تو سترپوشی ہے لیکن زیب و زینت بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے۔ قدرت نے جو چیز بھی بنائی ہے اس میں مختلف پہلو ملحوظ رکھے ہیں اور یہ سارے ہی پہلو ہماری فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ سترپوشی کے لیے تو بھگوا یا لنگوٹی بھی کافی تھی لیکن قدرت نے اتمامِ نعمت کے طور پر ہمارے لیے ایسے لباس کا انتظام فرمایا جو سترپوش بھی ہو، سردی اور گرمی سے بھی ہماری حفاظت کرے اور اس سے ہماری شخصیت، ہمارے وقار، ہمارے حُسن اور ہماری شان میں بھی اضافہ ہو۔ ان میں سے کوئی مقصد بھی بجائے خود معیوب نہیں ہے البتہ افراط یا تفریط سے جس طرح ہر چیز میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اس میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن نے زینت کو مقاصدِ لباس میں داخل کر کے اس جوگیانہ تصور کی نفی کر دی جو لباس کو ایک لائش اور عریانی یا نیم عریانی کو مذہبی تقدس کا درجہ دیتا ہے۔

باطنی لباس تقویٰ ہے

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ یعنی ظاہری لباس کے ساتھ ساتھ ایک باطنی لباس بھی انسان کو عطا

ہوا ہے اور وہ تقویٰ کا لباس ہے جو اس ظاہری لباس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ درحقیقت یہ تقویٰ کا لباس ہی ہے جو ظاہری لباس کی بھی حقیقی افادیت کو نمایاں کرتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو آدمی اس ظاہری لباس کو اختیار کرتا ہی ہے اپنے اسی باطنی لباس کی تحریک سے۔ اگر یہ نہ ہو تو آدمی کپڑے پہن کر بھی ننگا ہی رہتا ہے اور اس کے لباس سے اس کے وقار میں اضافہ ہونے کے بجائے یا تو اس کی رعونت میں اضافہ ہوتا ہے یا اس کی بدقواری گی ہیں۔ یہ لباس تقویٰ، حیا، خشیتِ الٰہی، اور احساس عبدیت سے بنتا ہے اور جس کے قامت پر اللہ اپنی عنایت کی یہ ردا ڈال دیتا ہے دیکھنے کے قابل وقار و جمال اسی کا ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کے لباس میں مقدس فرشتہ ہوتا ہے، جو بھی اس کو دیکھتا ہے بے تحاشا مَا ھٰذَا بَشَرًا اِنْ ھٰذَآ اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ پکار اٹھتا ہے۔

ان باتوں کی یاد دہانی جن کی ہدایت ابتدا ہی میں آدم کو کی گئی تھی

'ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ' یہ اوپر والی بات جس کی یاد دہانی کی گئی ہے ان باتوں میں سے ہے جن کی ہدایت اولادِ آدم کو اسی وقت کر دی گئی تھی جب آدم کو اس دنیا میں بھیجا گیا تھا اور مقصود اس کے حوالہ سے یہ ہے کہ قریش متنبہ ہوں کہ شیطان نے جس فتنے میں آدم کو مبتلا کیا اسی طرح کے فتنے میں اس نے انھیں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آدم کو اس دنیا میں بساتے وقت آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو جو ہدایات اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھیں ان میں سے بعض کا حوالہ قرآن نے دیا ہے۔ مثلاً بقرہ میں ہے 'قُلْنَا اھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۳۸' (ہم نے کہا یہاں سے سب اترو تو اگر آئے تمھارے پاس میری کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم) بعینہٖ یہی مضمون آگے اسی سورہ میں آیت ۳۵ میں آ رہا ہے 'یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ' (اے بنی آدم اگر تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں تمھیں میری آیات سناتے ہوئے تو جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کی، اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ ان کو غم لاحق ہوگا) ہمارے نزدیک یہاں بھی انہی باتوں کا حوالہ ہے جن کی ہدایت ابتدا ہی میں اولادِ آدم کو کی گئی تھی تاکہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنے آپ کو شیطان کے اس قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھ سکیں جس قسم کے فتنے میں اس نے آدمؑ و حوا کو ڈال دیا۔ یہ انہی باتوں کی یاد دہانی اب قریش کو کی جا رہی ہے تاکہ انھیں خبردار کیا جائے کہ وہ بھی شیطان کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں اور اس نے وہی داؤں ان پر بھی چلایا ہے جو آدم پر چلایا تھا۔

'یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ' کے خطاب کی بلاغت

'یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ' کے خطاب کی بلاغت پر بھی یہاں نظر رہے۔ باپ کی زندگی کے حوادث و تجربات اولاد کے لیے سب سے زیادہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ اس کی سرگزشت کسی دوسرے کی کہانی نہیں بلکہ اپنی ہی حکایت ہوتی ہے۔ باپ کے دوستوں سے دوستی، اس کے دشمنوں سے دشمنی باوفا اولاد خاندان کی ناقابلِ فراموش روایت کی طرح محفوظ رکھتی ہے۔ اخلاف اس کو یاد رکھتے ہیں اور اپنے بعد والوں کی طرف اس کو منتقل کرتے اور برابر

منتقل کرتے رہنے کی وصیت کرتے ہیں، اہل عرب میں تو یہ روایت اتنی محبوب رہی ہے کہ اس میں حق و باطل کا امتیاز بھی باقی نہیں رہا تھا۔ باپ دادا کا دشمن بہرحال پشتہا پشت دشمن ہی سمجھا جاتا اگرچہ اس کی دشمنی برحق ہی کیوں نہ رہی ہو۔ پھر کس قدر حیف کی بات ہے کہ آدم کی اولاد اپنے باپ کے ساتھ شیطان اور اس کی ذریت کی اس دشمنی کو بھول جائے جو سراسر کینہ اور حسد پر مبنی تھی، جو مخفی نہیں بلکہ بالکل علانیہ تھی اور جو صرف مخصوص آدم و حوا کے ساتھ ہی نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ان کی تمام ذریت کے ساتھ تھی۔ پھر معاملہ صرف بھول جانے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اولاد کی ناخلفی، ناہنجاری اور نابکاری اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ کتنے ہیں جو اس دشمن اور اس کے ساتھیوں ہی کو اپنا دوست، خیر خواہ اور معتمد بنائے بیٹھے ہیں اور اس کے کہے پر ٹھیک ٹھیک اپنے لیے انہی تباہیوں کے گڑھے کھود رہے ہیں جن میں اس نے آدم کو گرانا چاہا تھا اور وہ اس میں گر چکے تھے، اگر اللہ کی رحمت نے ان کو بچایا نہ ہوتا ــــ قرآن کی بلاغت بیان کے قربان جائیے کہ صرف 'یا بنی آدم' کے خطاب کے دو لفظوں کے اندر اس نے یہ سارے مضمرات محفوظ کر دیے ہیں، آدم کا جو غیور و باوفا بیٹا اس خطاب کے ساتھ قرآن کی ان یاددہانیوں کو سنتا ہے اس کی رگ رگ شیطان کے خلاف جوشِ حمیت و غیرت سے پھڑک اٹھتی ہے۔ صرف بے غیرت اور ناخلف ہی ہیں جو اس خطاب کے بعد بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

تمدن میں فساد پیدا کرنے کے لیے شیطان کی ایک خاص چال

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّۃِ یَنْزِعُ عَنْھُمَا لِبَاسَھُمَا لِیُرِیَھُمَا سَوْاٰتِھِمَا یہ بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، انہی یاددہانیوں میں سے ہے جو ابتدا ہی میں اولادِ آدم کو کی گئی تھیں۔ اور اس کے اسلوب بیان سے شیطان کی اس چال کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو وہ بنی آدم کے تمدن کو برباد کرنے اور بالآخر ان کو خدا کی نعمت سے محروم کر کے ہلاکت کے گڑھے میں گرانے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے پہلے لوگوں کو اس لباس تقویٰ و خشیت سے محروم کرتا ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لیے اس ظاہری لباس کے ساتھ ایک تشریف باطنی کی حیثیت سے اتارا ہے اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ جب یہ باطنی جامہ اتر جاتا ہے تو وہ حیا ختم ہو جاتی ہے جو اس ظاہری لباس کی اصل محرک ہے۔ پھر یہ ظاہری لباس ایک بوجھ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بے حیائی صنفی اعضا میں، جن کا چھپانا تقاضائے فطرت ہے، عریاں ہونے کے لیے تڑپ پیدا کرتی ہے، پھر فیشن اس کو سہارا دیتا ہے اور وہ لباس کی تراش خراش میں نت نئی اختراعات سے ایسے ایسے اسلوب پیدا کرتا ہے کہ آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کپڑے پہن کر بھی، لباس کے بنیادی مقصد یعنی ستر پوشی کے اعتبار سے، گویا ننگے ہی رہتے ہیں۔ پھر لباس میں صرف زینت اور آرائش کا پہلو باقی رہ جاتا ہے اور اس میں بھی اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ بے حیائی زیادہ سے زیادہ دلکش زاویہ سے نمایاں ہو۔ پھر آہستہ آہستہ عقل اس طرح ماؤف ہو جاتی ہے کہ عریانی تہذیب کا نام پاتی ہے اور ساتر لباس وحشت و دقیانوسیت کا۔ پھر پڑھے لکھے شیاطین اٹھتے ہیں اور تاریخ کی روشنی میں یہ فلسفہ پیدا

کرتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو عریانی ہی ہے۔ لباس تو اس نے رسوم و رواج کی پابندیوں کے تحت اختیار کیا ہے۔ یہ مرحلہ ہے جب دیدوں کا پانی مر جاتا ہے اور پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بے حیا معاشرہ سزاوار ہوتا ہے کہ قدرت اس کے وجود سے زمین کو پاک کر کے ان کی جگہ دوسروں کو لائے اور دیکھے کہ وہ کیسا عمل کرتے ہیں۔

شیطان کے بھیس ان گنت اور اس کے چرتر بے شمار ہیں

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ یہ شیطان اور اس کے جتھے کی چالاکی، کیادی اور فتنہ سامانی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے حملے کے راستے اور ان کے ظہور کے بھیس اتنے بے شمار ہیں کہ تم ان سارے راستوں پر نہ پہرا بٹھا سکتے، نہ ہر بھیس میں ان کو پہچان ہی سکتے۔ اس کے لشکر میں جن بھی ہیں اور انسان بھی، وہ وہاں سے گھات لگائیں گے جہاں سے تم دیکھ نہیں سکو گے اور تمہارے لیے وہ وہ بہروپ بھریں گے کہ تم پہچان نہ سکو گے۔ تم انھیں دوست، ناصح، خیر سگال، مرشد، لیڈر اور نہ جانے کیا کیا سمجھو گے اور وہ تمہارے دین و ایمان کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ تم گمان کرو گے کہ وہ تمہارے لیے تہذیب و ترقی کی راہیں کھول رہے ہیں لیکن وہ تم کو وہاں لے جا کر ماریں گے جہاں پانی بھی نہ پاؤ گے۔ ان کو تمہارے باطن کی ساری کمزور رگیں معلوم ہوں گی اور وہ اپنی اندرونی وسوسہ اندازیوں سے بھی تم کو شکار کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنی ظاہری عشوہ گریوں سے بھی تم پر اپنے جال پھینکیں گے ـــــ مطلب یہ ہے کہ اس دشمن کو معمولی دشمن نہ سمجھنا، ہر وقت اس سے چوکنے رہنا۔

شیطان کے فتنوں سے واحد امان

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ شیطان اور اس کے جتھے کے حملوں سے محفوظ رہنے کی تدبیر بتائی ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ ایمان پر مضبوطی سے جمے رہنا۔ ایمان سے مراد اللہ اور اس کی اتاری ہوئی ہدایت پر ایمان ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اس دنیا میں اتارتے وقت شیطان کے حملوں سے محفوظ رہنے کی واحد تدبیر یہ بتائی تھی کہ جو میری بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸۔ بقرہ (ہم نے کہا کہ یہاں سے سب اترو تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ ان کے لیے کوئی خوف ہو گا، نہ کوئی غم) زیر بحث ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیاطین کو مسلط ہونے کا موقع انہی پر دیتا ہے جو خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے دل خالی گھر کے مانند ہوتے ہیں اس وجہ سے شیطان ان میں ڈیرے جما لیتے ہیں، خانۂ خالی را دیو مے گیرد۔ اس کے برعکس جن کے دل خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے آباد ہوتے ہیں ان کے اندر شیاطین کو گھسنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہی بات دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہوئی ہے وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۳۶۔ زخرف (اور جو خدائے رحمان کی یاد سے بے پروا ہو جاتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پھر وہی اس کا

ساتھی بن جاتا ہے)

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿﴾ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿﴾ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۗ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ (۲۸-۳۰)

قریش پر شیطان کا جال

ان یاد دہانیوں کو سنانے کے بعد جو اولاد آدم کو کی گئی تھیں اب یہ قریش اور عربوں کا حال سنایا جا رہا ہے کہ کس طرح شیطان نے ان کو جھکمہ دے کر اپنے جال میں پھنسا لیا ہے اور وہ اس کو اپنا دوست بنائے بیٹھے ہیں حالانکہ اس نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کیا ہے جس طرح کا معاملہ ان کے باپ ماں — آدمؑ و حواؑ کے ساتھ کیا تھا۔ آدم و حوا کے کپڑے اس نے جنت میں اتروا لیے تھے، آدم کے ان بیٹوں اور حوا کی ان بیٹیوں کے کپڑے اس نے حرم الٰہی میں اتروا لیے ہیں اور ستم یہ ہے کہ یہ اس کو اپنے باپ دادا کی روایت اور خدا کی ہدایت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خدا کی ہدایت نہیں بلکہ شیطان کا فتنہ ہے اور اس طرح اس نے یہ چاہا ہے کہ جس طرح اس نے آدم کو جنت سے نکلوایا اسی طرح ان کو ننگا کر کے اس حرم پاک سے بے دخل کرائے[1]۔

طواف عریاں کا فلسفہ اور اس کے مہلک اثرات

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا، فاحشۃ اس کھلی ہوئی بے حیائی کو کہتے ہیں جس کو اندھوں اور احمقوں کے سوا سب بے حیائی قرار دیں۔ ہمارے مفسرین نے یہاں اس سے وہ بدعت مراد لی ہے جو خانہ کعبہ کا ننگے ہو کر طواف کرنے کی عرب جاہلیت میں رواج پا گئی تھی۔ مفسرین کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ عرب جاہلیت کی بے حیائیوں میں سے یہی بے حیائی ہے جس کو وہ، جیسا کہ وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا کے الفاظ سے واضح ہے، حکم شریعت کا درجہ دیتے تھے۔ اگرچہ قریش خود تو اپنے آپ کو اس سے بالاتر رکھے ہوئے تھے لیکن دوسروں کے لیے، مرد ہوں یا عورتیں، انھوں نے اس عریانی کو عبادت قرار دے رکھا تھا۔ ان کا فتویٰ یہ تھا کہ قریش سے باہر کے عرب اپنے کپڑوں میں خانہ کعبہ کا طواف نہ کریں۔ یا تو وہ قریش میں سے کسی سے اس کام کے لیے کپڑے مستعار لیں ورنہ ننگے طواف کریں۔ گویا دوسروں کے کپڑے آلائش دنیا اور زینت دنیا میں داخل ہیں جس سے اس عبادت کی حرمت کو بٹہ لگ جاتا ہے۔ یہ اسی طرح کی عیاشی اور نفس پروری کی ایک مکروہ شکل تھی جس کی بے شمار مثالیں مندروں اور کلیساؤں کی تاریخ میں ملتی ہیں اور جو تمام تر ان کے پروہتوں اور پجاریوں کی شیطنت سے وجود میں آئیں لیکن ان کو مذہبی تقدس کا درجہ دے دیا گیا۔ مزارات کے مجاوروں نے بھی اس معاملے میں شیطان کا بہت ہاتھ بٹایا ہے۔ اس بدعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ طواف جیسی مقدس عبادت فساق و فجار

---

[1] یہ حقیقت یہاں پیش نظر ہے کہ بیت اللہ، جیسا کہ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب تفسیر سورۂ کوثر میں تفصیل سے ثابت کیا ہے، اس دنیا میں حوض کوثر کا مجاز ہے۔

کی نظر بازیوں اور شرارتوں کی جولاں گاہ بن گئی اور حرم کی نظر بازیوں کی لذیذ و رنگین داستانیں ان کی فاسقانہ شاعری میں بھی نمایاں ہوئیں جن کو پڑھیے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ شیطان نے حرم میں گھسنے کے لیے کیسا مقدس مذہبی لبادہ اختیار کیا، کس کامیابی کے ساتھ اس نے اللہ کی سب سے بڑی عبادت کو اپنی عبادت میں تبدیل کر دیا لیکن کسی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ ہے اس حقیقت کا ایک پہلو جو اوپر اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ میں بیان ہوئی ہے۔

خدا کے احکام کی شناخت کے لیے کسوٹی

'قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' یہ تردید ہے اوپر والی بات کی کہ تم اس بے حیائی اور بے شرمی کو خدا کا حکم قرار دیتے ہو، خدا کبھی بے حیائی و بے شرمی کا حکم نہیں دیتا۔ خدا کے احکام، اس کی صفات اور انسان کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ جب اس کی صفات میں کوئی صفت بھی ایسی نہیں جو اس بے حیائی کو گوارا کر سکے تو وہ اس کا حکم کس طرح دے سکتا ہے؟ پھر جب اُس نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ بدوِ شعور سے لے کر مرتے دم تک وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کے سامنے عریاں ہو تو وہ اسی انسان کو یہ حکم کس طرح دے سکتا ہے کہ وہ عین اس کے حرم میں ساری خدائی کے سامنے ننگا ہو جائے اور ننگے ہو کر اس کے آگے پھیرے لگائے! آخر خدا اور اس کی پاکیزہ صفات، انسان اور اس کی سلیم فطرت کے ساتھ اس بیہودہ حرکت کا کیا جوڑ ہے؟ خدا پر ایسی بے ہودہ تہمت کیوں لگاتے ہو؟ 'مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' یعنی ایسی بات جو بالکل بے سند اور بے دلیل ہے۔

'قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ' لفظ 'قسط' پر پوری تفصیل کے ساتھ، ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں بحث کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ہے اس وجہ سے بندوں کو اس نے جو حکم بھی دیا ہے سراسر قسط پر مبنی ہے۔ 'قِسط' ایک جامع حقیقت ہے جو تمام شریعت الٰہی کی روح ہے۔ یعنی ہر چیز میں ٹھیک ٹھیک نقطۂ عدل و اعتدال کا اہتمام۔ اس کا تعلق زندگی کے کسی ایک ہی پہلو سے نہیں ہے بلکہ ہر پہلو سے ہے، عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، اخلاق میں، معیشت میں، معاشرت میں، قانون میں، سیاست میں، غرض ہر شعبۂ زندگی میں یہی وہ اصل الاصول ہے جس پر شریعتِ الٰہی مبنی ہے۔ موقع و محل کی تبدیلی سے اس کی تعبیریں بدل بدل جائیں گی لیکن اصل حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ مثلاً دیکھیے اسی قسط پر یہاں 'اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ' کو مبنی کیا اس لیے کہ جب خالق و مالک خدا ہے تو یہ قسط کے خلاف ہے کہ عبادت کی پیشانی کسی اور کے سجدہ سے آلودہ ہو، اسی پر 'كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ' کو مبنی کیا اس لیے کہ یہ قسط کا تقاضا ہے کہ جب اس نے پیدا کیا، پرورش کے اسباب و وسائل فراہم کیے، خیر و شر کا امتیاز بخشا تو وہ حساب و کتاب بھی کرے اور جزا و سزا بھی دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ قسط نہیں بلکہ ظلم وجود ہو گا۔ پھر دیکھیے آگے چل کر اسی پر 'خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ' اور 'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا' کو مبنی کیا۔ یعنی یہ بات قسط کے خلاف ہے کہ خدا کی عبادت کے لیے آدمی لباس کو ترک کر دے یا کھانے پینے کی لذات سے دستبردار ہو جائے۔

قسط یہ ہے کہ آدمی پہنے بھی، کھائے پیے بھی، البتہ کسی چیز میں اسراف نہ کرے، اسراف قسط کے خلاف ہے۔ الغرض یہ قسط ایک ایسی کسوٹی ہے کہ جو شخص حکمتِ دین سے آشنا ہو وہ اس پر پرکھ کے جان سکتا ہے کہ کون سی بات خدا کی ہے اور کون سی بات خدا کی نہیں ہے۔

مسجد اپنی فطرت ہی سے خدا کے لیے خاص ہوتی ہے

'وَاَقِیۡمُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ' 'قسط' ایک حقیقتِ جامعہ ہے، جیسا کہ اوپر گزرا، اور اس کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے حقوق میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ عبادت صرف خدا کا حق ہے، کوئی اور عبادت کا سزاوار نہیں ہے اس وجہ سے نہ کسی غیر اللہ کے لیے مسجد بن سکتی ہے نہ کسی مسجد میں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رخ کرنے کی نیت کی جا سکتی ہے۔ سجدہ خدا ہی کے لیے زیبا ہے اس وجہ سے مسجد اپنی فطرت کے اعتبار سے خدا ہی کے لیے خاص ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا ہے 'وَاَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا' ۱۸ جن (اور یہ کہ مسجدیں صرف اللہ ہی کے لیے ہیں تو تم ان میں اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پکارو) بعینہٖ یہی بات آیت زیر بحث میں فرمائی کہ ہر مسجد صرف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے، اس وجہ سے اپنے رخ اسی کی طرف کرو۔ 'اَقِيۡمُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ' کے بعد 'اِلَى اللّٰهِ وَحۡدَهٗ' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں اس لیے کہ بعد کے الفاظ 'وَادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ' کے الفاظ اس محذوف کا حق بھی ادا کر رہے ہیں اور اس حقیقت کا بھی اظہار کر رہے ہیں کہ خدا کی عبادت صرف عبادت ہی کے اخلاص کی متقضی نہیں ہے بلکہ وہ اطاعت کے اخلاص کو بھی مقتضی ہے۔

دریا بکوزہ

'كَمَا بَدَاَكُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ' یہ توحید کے مضمون کی تاکید و توثیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی کی عبادت اور خدا ہی کی اطاعت اس لیے کرو کہ جس خدا نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر اسی کی طرف لوٹنا ہے اور جس طرح اس دنیا میں تنہا آئے ہو اسی طرح تنہا ہی اس کی طرف لوٹو گے بھی، تمہارے مزعومہ شریکوں اور سفارشیوں میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔ قرآن کی اس بلاغت کے قربان جائیے کہ کل دو لفظ ہیں اور دو لفظوں میں اس نے آخرت اور توحید دونوں کا تعلق بھی واضح کر دیا اور آخرت کی ایک نہایت واضح دلیل بھی بیان فرما دی۔

'فَرِيۡقًا هَدٰى وَفَرِيۡقًا حَقَّ عَلَيۡهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ' الآیۃ مطلب یہ ہے کہ اصل حقیقت تو وہ ہے جو اوپر بیان ہوئی اور اللہ نے ایک گروہ کو اس حقیقت پر ایمان لانے کی توفیق بھی دی ہے لیکن ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہو گئی۔ اس نے شیاطین کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور یہ شیاطین ان کو انہی گمراہیوں میں پھنسائے ہوئے ہیں جن میں ابلیس نے ان کو پھنسانے کی دھمکی دی تھی لیکن اپنی شامتِ اعمال سے گمان یہ کیے بیٹھے ہیں کہ وہ راہ ہدایت پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی اس جہالت سے باز نہ آئے تو لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو ایسے شامت زدوں کے لیے مقدر ہے۔

يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا وَلَا تُسۡرِفُوۡا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

الْمُسْرِفِيْنَ ۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۔ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۳۱ - ۳۴)

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ الاٰیۃ'۔ 'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ' کا خطاب قریش اور عربوں ہی سے ہے۔ اس میں آدمؑ کی طرف نسبت میں بلاغت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ اس سے آدمؑ و شیطان کی اس سرگزشت کی یاددہانی ہوتی ہے جو تمام نسلِ آدمؑ کی مشترک سرگزشت ہے اور جو ہر ابن آدم کو یہ سبق دیتی ہے کہ شیطان ان کا ابدی دشمن ہے جس کو دوست بنانا اور جس کے کہے پر چلنا اپنے اور اپنے باپ کے دشمن کو دوست بنانا ہے۔

اس جوگ کی نفی جو عریانی کو تقویٰ ٹھہرائے

'خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ' میں زینت سے مراد لباس فاخرہ نہیں بلکہ مجرد لباس ہے۔ لباس کو زینت کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہاں یہ ہے کہ طواف میں عریانی اختیار کرنے کا فلسفہ یہی تراشا گیا تھا کہ لباس زیب و زینت میں داخل ہے اور زیب و زینت اس عبادت کے شایانِ شان نہیں ہے۔ حج اور احرام میں فی الجملہ زہد و درویشی تو حضرت ابراہیمؑ کے عہد ہی سے چلی آرہی ہے اور یہ حج کی خصوصیات میں سے ہے لیکن عربوں نے دورِ جاہلیت میں جہاں اور بہت سی بدعات ایجاد کیں وہیں یہ بدعت بھی ایجاد کر ڈالی کہ احرام کی سادگی اور درویشی کو عورتوں اور مردوں سب کے لیے عریانی کے حد تک پہنچا دیا۔ قرآن نے یہ اسی بدعت کی اصلاح کی۔ فرمایا کہ یہ عریانی بے حیائی ہے۔ اپنے لباس ہر مسجد کی حاضری کے وقت پہنو۔ جس طرح کوئی مسجد غیر اللہ کے لیے نہیں ہو سکتی اسی طرح کوئی مسجد ایسی نہیں ہو سکتی جس کی حاضری کے لیے یہ شرط ٹھہرا لی جائے کہ آدمی وہاں کپڑے اتار کر حاضر ہو۔ 'كُلِّ مَسْجِدٍ' فرما کر اس حکم کو عام کر دیا کہ حرم اور غیر حرم کی تخصیص نہ رہ جائے۔ یہ اس جوگ اور رہبانیت کی کلی نفی ہے جو عریانی کو تقربِ الٰہی اور وصول الی اللہ کا ذریعہ ٹھہراتی ہے۔

افراط اور تفریط دونوں تقویٰ کے خلاف ہیں

'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ' جس طرح لباس تقویٰ اور دینداری کے خلاف نہیں ہے اسی طرح کھانا پینا اور اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا بھی دینداری کے خلاف نہیں ہے۔ دینداری اور تقویٰ کے خلاف جو چیز ہے وہ اسراف ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز اس 'قسط' کے خلاف ہے جو تمام شریعت اور تمام احکامِ الٰہی کی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، روح ہے۔ اللہ تعالیٰ 'قَاۗىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ' ہے اس وجہ سے وہ 'مُقْسِطِیْن' یعنی عدل و اعتدال پر قائم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے، 'مُسْرِفِیْن' یعنی عدل و اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بے اعتدالی افراط کی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے، تفریط کی نوعیت کی بھی، اور یہ دونوں ہی باتیں خدا کی پسند کے خلاف ہیں۔ نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ آدمی کھانے پینے پہننے ہی

کو مقصود بنا لے اور رات دن اسی کی سرگرمیوں میں مشغول رہے اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ ان چیزوں کو لات مار کر آدمی راہبوں اور جوگیوں کی طرح تیاگ دے۔ تبذیر اور تفریط دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں، خدا زندگی کے ہر پہلو میں عدل و اعتدال کو پسند فرماتا ہے۔

اصل نقطۂ اعتدال

یہ سوال کہ ان چیزوں میں نقطۂ عدل و اعتدال کیا ہے اور حد اسراف کیا ہے انسان کی عقل سلیم اور فطرت سلیم پر چھوڑا گیا ہے اس لیے کہ اس کی کوئی قانونی حد بندی ممکن نہیں ہے۔ اشخاص اور حالات کے اعتبار سے اس میں فرق بھی ہو سکتا ہے۔ ایک غنی اور ایک فقیر دونوں کے لیے کوئی ایک معیار مقرر نہیں ہو سکتا ہے۔ تاہم ہر غنی سے اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے اس میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں اس وجہ سے اس کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا تو مباح ہے لیکن اسراف و تبذیر جائز نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مسرفین کو دوست نہیں رکھتا۔ 'دوست نہیں رکھتا' کے الفاظ معمولی نہیں ہیں اس لیے کہ خدا جن کو دوست نہیں رکھتا لازماً وہ اس کے نزدیک مبغوض ہیں۔

خدا کی نعمتوں پر کوئی پابندی خدا ہی عائد کر سکتا ہے۔

'قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ'۔ یہ سوال تردید اور انکار کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے عطا کیے ہوئے لباس اور پاکیزہ رزق کو تم نے کس کے کہنے سے حرام ٹھہرایا ہے؟ ان چیزوں کا عطا کرنے والا تو خدا ہے تو ان کو حرام ٹھہرانے کا حق کسی دوسرے کو کہاں سے حاصل ہوا؟ 'اَلَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ' یہاں بطور دلیل وارد ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو خود زبانِ حال سے شہادت دے رہی ہیں کہ عطا کرنے والے نے یہ بندوں کے برتنے کے لیے عطا فرمائی ہیں تو ان پر کوئی ناروا پابندی عاید کرنے کے کیا معنی؟ ان پر کوئی پابندی تو ان کا عطا کرنے والا ہی عاید کر سکتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تمھارے پاس کوئی سند یا دلیل ہو۔

اللہ کی نعمتوں کے جائز حقدار اہل ایمان ہی ہیں۔

'قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ' الآیہ اس ٹکڑے میں حذف کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس کی ہم ایک سے زیادہ مقامات میں وضاحت کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ متقابل الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں اس لیے کہ مذکور خود محذوف پر دلیل ہو جاتا ہے۔ یہاں 'لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' اور 'خَالِصَةً' کے مقابل الفاظ حذف ہیں۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں اس دنیا میں بھی اصلاً اہلِ ایمان ہی کا حق ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں کافروں کو بھی شریک کر دیا ہے، رہا آخرت کا معاملہ تو وہاں یہ سو فی صدی اہلِ ایمان ہی کا حصہ ہوں گی، کافروں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، البتہ دنیا میں انھوں نے ان سے جو فائدہ اٹھایا اس کی جواب دہی انھیں کرنی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا ایمان اور دینداری کے منافی نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کو مایا کا جال سمجھتے ہیں اور ان سے دستبرداری کو تقرب الٰہی کی شرط ٹھہراتے ہیں، ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، اللہ کے شکر گزار رہو، اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو اور اللہ اور

اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتے رہو۔

'کذٰلک نفصل الآیٰت' بطور امتنان اور 'لقوم یعلمون' میں فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔

'قل انما حرم ربی الفواحش الاٰیۃ' اب یہ بتایا کہ خدا نے حرام کیا چیزیں قرار دی ہیں اور ان کے بتانے کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ جو چیزیں خدا نے حرام ٹھہرائی ہیں وہ تو تم نے نہ صرف جائز بلکہ دین بنا رکھی ہیں اور اچھی بھلی جائز و طیب چیزوں کو حرام کر کے دینداری کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہو۔

ان حرام چیزوں میں 'فواحش' ہیں، عام اس سے کہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی۔ ظاہری اور باطنی کی وضاحت انعام آیت ۱۵۱ کے تحت ہو چکی ہے۔

اس کے بعد اثم و بغی ہے۔ ان دونوں لفظوں کی تحقیق بھی پیچھے گزر چکی ہے۔ 'بغی' کے معنی تعدی اور سرکشی کے ہیں یعنی خدا کے حدود و احکام سے تعدی و سرکشی۔ اس کے ساتھ 'بغیر الحق' کی قید کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی 'بغی' حق بھی ہوتی ہے بلکہ یہ 'بغی' کے گھنونے پن کو ظاہر کرتی ہے کہ ہر 'بغی' بجائے خود ناحق ہوتی ہے۔ یہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ خدا سے اکڑے اور اس کے حدود پر حملہ آور ہو۔ جس طرح قتل انبیا کے جرم کے ساتھ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں بھی استعمال ہوا ہے۔

'وان تشرکوا باللہ ما لم ینزل بہ سلطٰنا' یعنی جہاں تک خدا کو ماننے کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے اور مشرک بھی خدا کو مانتا ہے، رہی یہ بات کہ خدا کا کوئی شریک بھی ہے تو اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور دلیل بھی ایسی جو 'برہان' یعنی ایک حجت قاطع کی حیثیت رکھتی ہو اس لیے کہ خدا کی خدائی میں یوں ہی کسی کو جوڑ دینا سارے نظام عقل و فطرت اور پورے نظام عدل و قسط کو درہم برہم کر دینا ہے۔ اتنی بڑی بات بغیر اس کے مان لینے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ خدا نے اس کی کوئی نقلی یا عقلی یا فطری دلیل اتاری ہو۔

'وان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون' 'قول علی اللہ' سے مراد 'افترا علی اللہ' ہے یعنی اپنے جی سے حلال و حرام ٹھہرانا، اپنی خواہشوں کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کرنا، من مانے طور پر شریعت تصنیف کرنا اور ان ساری چیزوں کو خدا کی طرف منسوب کرنا کہ خدا نے ان کا حکم دیا ہے۔ اس ٹکڑے سے نبوت و رسالت کی ضرورت کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ جب خدا کی طرف کوئی بات بے سند منسوب کرنا ناجائز ہے تو لازم ہے کہ اس کی طرف سے رسول آئیں اور ان کی پیروی کی جائے۔

فرد قرارداد جرم کے بعد انذار

'ولکل امۃ اجل الاٰیۃ' ہم سورہ کے تمہیدی مباحث میں عرض کر چکے ہیں کہ اصلاً یہ سورہ انذار کی سورہ ہے۔ یہ باتیں جو اوپر بیان ہوئیں محض فرد جرم یا اتمام حجت کی نوعیت کی ہیں۔ اس وجہ سے کلام بار بار اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہے۔ اوپر آیت ۲۹ میں 'کما بدأکم تعودون' میں جس طرح آخرت کی یاددہانی

کی اسی طرح یہ آیت قریش کو اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو یاد دلا رہی ہے کہ تمھاری ان تمام شرارتوں کے باوجود اگر تمھاری پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو یہ نہ سمجھو کہ پکڑ ہوگی ہی نہیں۔ یہ سنت اللہ جس طرح تمام سرکش و باغی قوموں کے باب میں، جیسا کہ آیت ۹۴ میں بیان ہوئی، پوری ہوئی تم پر بھی لازماً پوری ہوگی۔ یہ مہلت جو تمھیں ملی ہے اس وجہ سے ملی ہے کہ اللہ نے ہر امت کی تباہی کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ جب وہ پوری ہو جائے گی تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہوگی نہ آگے بڑھے گی۔

افراد اور اقوام کے لیے اجل کے الگ الگ پیمانے

یہاں اس مقررہ مدت کے لیے 'اَجَل' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ افراد اور اقوام کے معاملے میں خدا نے 'اَجَل' کے پیمانے الگ الگ رکھے ہیں۔ افراد کے پیمانے تو سالوں، مہینوں، دنوں اور گھنٹوں منٹوں کے حساب سے پورے ہوتے ہیں، جب وہ پورے ہو جاتے ہیں، فرد ختم ہو جاتا ہے۔ قوموں اور امتوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کا حساب ان کے ایمانی و اخلاقی زوال سے ہوتا ہے۔ اخلاقی زوال و فساد کی ایک خاص حد ہے جو کسی قوم کے پیمانہ کے بھر جانے کی نشانی ہے۔ جب قوم گرتے گرتے اس حد کو پہنچ جاتی ہے، اس کا سفینہ غرق ہو جاتا ہے۔ جس طرح افراد کی موت کا وقت اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم، اسی طرح قوموں اور ملتوں کے فنا ہونے کے صحیح وقت کا علم بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کب کوئی قوم اپنے زوال اخلاقی کے اعتبار سے اس آخری حد پر پہنچ گئی کہ اب اس کا صفحۂ ارض پر باقی رہنا حکمت الٰہی کے خلاف ہے۔ یہاں وہ سنت الٰہی یاد رکھنی چاہیے جس کی وضاحت ہم متعدد مقامات میں کر چکے ہیں کہ کسی قوم میں رسول کی بعثت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کی آخری شکل ہوتی ہے اس وجہ سے قوم جب اپنے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو لازماً فنا کر دیتا ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ یونس کی تفسیر میں آئے گی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (۳۵-۳۷)

شیطان کے فتنوں سے امان رسول کی پیروی میں ہے

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ' یہ اس وعدے کی یاددہانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور ان کی ذریت کے لیے اس وقت فرمایا تھا جب آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کا واقعہ پیش آیا ہے۔ سورہ بقرہ میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸-بقرہ (ہم نے کہا، یہاں سے اترو تم سب تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ کوئی اندیشہ طاری ہوگا، نہ ان کو کسی بات کا غم ہوگا)

آدمؑ اور اولادِ آدم سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ ان کو شیطان اور اس کی ذریات کی فتنہ انگیزیوں سے بچا لے
کے لیے فرمایا تھا کہ اگر شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہنا ہے تو میرے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کرنا۔
آدمؑ و ابلیس کی جو سرگزشت اس سورہ میں اوپر بیان ہوئی ہے اس پر غور کیجیے تو اس کے اندر اس انتظام کی عقلی و
فطری ضرورت موجود ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذریتِ آدم کے باب میں فرشتوں
کے گمان کی تردید بھی اولادِ آدم میں پیدا ہونے والے انبیاء و مصلحین کے ناموں کے حوالہ ہی سے فرمائی تھی۔ یہی
وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نسلِ آدم میں انبیاء و رسل کا سلسلہ جاری کر کے پورا فرمایا۔ اسی کی یاددہانی یہاں قریش
کو کی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھیں شیطان نے بالکل اپنے نرغے میں لے لیا ہے۔ اس کے فتنوں سے امان کی شکل
وہی ہے جو شروع ہی میں بتا دی گئی تھی کہ جو رسولوں کی پیروی کریں گے وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہیں گے
تو تم اگر شیطان کے فتنوں سے امان چاہتے ہو تو اس رسول کی پیروی کرو جو تمھیں اللہ کی آیات سناتا ہوا
آگیا ہے۔

کفار کے انجام کا بیان

'وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَآ' استکبار کے بعد حرف 'عن' اس بات پر دلیل ہے کہ
لفظ استکبار یہاں اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول آیاتِ الٰہی سناتے
آئیں گے تو جو لوگ ان کو جھٹلائیں گے اور متکبرانہ ان سے منہ موڑیں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے۔

'فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ الایۃ' اوپر کی آیات میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا،
یاددہانی ہے۔ اب یہ براہِ راست قریش کی نسبت ارشاد ہو رہا ہے کہ ان سے بڑھ کر ظالم اور بدقسمت کون
ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھیں یا اس کی آیات کی تکذیب کریں 'اُولٰٓئِکَ یَنَالُهُمْ نَصِیْبُهُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ' اس
دنیا میں زندگی کے جو دن نوشتۂ تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں وہ یہ پورے کریں گے یہاں تک کہ ہمارے فرشتے
ان کو موت دیں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے رہے ہو وہ کہاں گئے، اب ان
کو پکارو۔ یہ اس 'اِفْتِرَاءٌ عَلَی اللّٰهِ' کی وضاحت ہو گئی جس کا ذکر اوپر گزرا۔ شرک کو 'اِفْتِرَاءٌ عَلَی اللّٰهِ' کہنے کی وجہ
ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں۔ فرشتوں کے لیے 'رُسُل' کا لفظ قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات
میں آیا ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ 'رسول' اور 'ملک' کے لغوی مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہاں 'رُسُل'
کا لفظ جمع لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لفظ ملک الموت اور ان کے تمام عملہ پر حاوی ہے۔ 'قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا'
یہ ان کے اعتراف کی تعبیر ہے اور وہ اپنے اس اعتراف سے اپنے کفر کی شہادت خود اپنی زبان سے دے
دیں گے۔ کسی اور کی گواہی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِکُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ ؕ کُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ
اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓی اِذَا ادَّارَکُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ
عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِکُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا کَانَ

لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ (۳۸-۴۱)

'قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ' یہ وہ انجام بیان ہو رہا ہے جو ان لوگوں کے سامنے آنے گا۔ 'قَالَ' کا فاعل جب اس طرح کے مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے تو یہ بے اعتنائی اور بے رخی پر دلیل ہوتا ہے۔

یہاں دو ظرف مذکور ہوئے ہیں 'فِي أُمَمٍ' اور 'فِي النَّارِ'۔ پہلے سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ تمہارے ساتھی کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا، جاؤ، ان لوگوں کے شریک حال بنو جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے شیطان کی پیروی کر کے گمراہ ہوئے، دوسرے سے مستقر و مقام کا پتا دیا ہے کہ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ گویا ساتھی بھی بدترین، جگہ بھی بدترین!

'كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا الآية'۔ 'ادَّارَكُوا' اصل میں 'تدارکوا' ہے۔ عربی میں الفاظ کی ہیئت میں بعض اوقات اس طرح کی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ 'تدارك القوم'، 'تلاحقوا اى لحق أُخْرَاهُمْ أُولَاهُمْ' ('تدارك القوم' کے معنی ہیں قوم کے پچھلے اگلوں سے جا ملے) 'قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ' میں 'ل'، 'فى' کے معنی میں ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ یعنی پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں کہیں گے۔

'ضِعْفٌ' کے معنی دو گنے کے بھی ہیں اور قرینہ موجود ہو تو اس سے زیادہ کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

اہل دوزخ کی باہمی جوتی بیزار کی تصویر

یہ تصویر ہے اس جوتی بیزار کی جو ان لوگوں کے اندر دوزخ کے باڑے میں اکٹھے ہو جانے کے بعد ہوگی۔ دنیا میں تو یہ ایک دوسرے کے تابع اور متبوع، لیڈر اور پیرو، ساتھی اور مددگار بنے رہے، ایک دوسرے کے گن گاتے اور جھنڈے اٹھائے پھرتے رہے، سلامیاں اور ایڈریس پیش کرتے رہے۔ لیکن وہاں دوزخ میں آمنے سامنے ہوتے ہی ہر گروہ دوسرے پر لعنت کے دوگڑے برسائے گا۔ تابعین متبوعین سے کہیں گے تم پر پھٹکار ہو، تمہیں نے ہمارا بیڑا غرق کیا! متبوعین کہیں گے تم خود شامت زدہ تھے کہ تم ہماری راہ چلے، اس میں ہمارا کیا قصور!

یہ صورت حال تو اس وقت کی بیان ہوئی ہے جب بالکل اول اول آمنے سامنے ہوں گے۔ اس کے بعد جب سب اکٹھے ہو لیں گے تو پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں خدا سے استغاثہ کریں گے کہ خداوندا ہم انہی کے ہاتھوں گمراہ ہوئے اس وجہ سے تو ان کو دونا عذاب دے۔ ارشاد ہوگا 'لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِنْ لَا تَعْلَمُونَ' تم میں سے ہر ایک کے لیے یعنی اگلوں اور پچھلوں دونوں ہی کے لیے دونا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نیکی ہو یا بدی دونوں ہی اپنی فطرت کے اعتبار سے متعدی چیزیں ہیں۔ یہ اپنے

کرنے والوں ہی کی ذات تک محدود نہیں رہتی ہیں بلکہ ان کے اثرات دوسروں تک بھی منتقل ہوتے ہیں یہاں تک کہ وراثت در وراثت ہو کر نیکی کا ایک ذرہ احد پہاڑ کے برابر ہو سکتا ہے اور بدی کا ایک تخم فساد ایک لق و دق جنگل کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ یہی اصول اس حدیث میں بیان ہوا ہے جس میں حضورؐ نے کوئی اچھی یا بُری مثال قائم کرنے والوں کے نتائج اعمال کی وسعت و زیادت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ دنیا میں جو قتل بھی ہوتا ہے اس کے وبال کا ایک حصہ آدم کے بیٹے قابیل کے کھاتے میں جمع ہو رہا ہے جس نے ہابیل کو قتل کر کے قتل ناحق کی طرح ڈالی۔ یہاں زیر بحث ٹکڑے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تم میں سے اگلے اور پچھلے دونوں ہی کے لیے اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ ان کے گناہوں میں سے بھی حصہ ملنے والا ہے جن کے لیے تم نے ان گناہوں کی مثال قائم کی۔ تم فریاد کر رہے ہو کہ تمہارے اگلوں نے تمہارے لیے بری مثال قائم کی اس وجہ سے ان کو زیادہ عذاب ہو۔ ان کو بے شک زیادہ عذاب ملے گا لیکن آخر تم نے جو بری مثال قائم کی یا اپنے بعد والوں کے لیے چھوڑی اس کے نتائج سے کس طرح بچ جاؤ گے؟ جو پیمانہ ان کے لیے ہے وہی پیمانہ تمہارے لیے ہے۔ اگر ان کی روش بد کے ساتھ ساتھ تم اپنی روش بد کے اثرات کا بھی علم اور اندازہ رکھتے تو تم جانتے کہ تم اور وہ دونوں یکساں مجرم ہو لیکن تمہیں اپنے بوئے ہوئے تخم فساد کی بس بھری فصل کی ہولناکیوں کا صحیح تخمینہ معلوم نہیں ہے۔ اب وہ تمہارے سامنے آئے گا۔

جیسے ہم ویسے تم

'وَقَالَتْ اُولٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ الاية' یہ اگلوں کی طرف سے پچھلوں کی مذکورہ بالا بات کا جواب ہو گا کہ اگر ہم نے تمہارے لیے بُری مثال قائم کی تو تم نے دوسروں کے لیے کون سی اچھی مثال قائم کی۔ بات تو جب تھی کہ تم نے کوئی اچھی مثال قائم کی ہوتی۔ اس صورت میں بے شک تم ہمارے مقابل میں ترجیح اور فضیلت کے سزاوار تھے لیکن جب تم بھی وہی کچھ کر کے آئے ہو جو ہم کر کے آئے ہیں تو ہم میں اور تم میں فرق کیا؟ جس طرح ہم اپنے کیے کا مزا چکھیں گے تم بھی اپنے کیے کا مزا چکھو۔

'اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا الاية' لفظ استکبار کے ساتھ 'عَنْ' کے صلہ کا فائدہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ... الآية کے دو مفہوم

'لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ' کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے لیے سما و جنت کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، دوسرا یہ کہ اہل ایمان کی طرح آسمان میں ان کا خیر مقدم نہیں ہو گا بلکہ وہ نہایت ذلت و فضیحت کے ساتھ اپنا انجام بد دیکھنے کے لیے مجرموں اور بدمعاشوں کی طرح ہنکاتے ہوئے لے جائے جائیں گے۔ قاعدہ ہے کہ جن کا اعزاز و اکرام مقصود ہوتا ہے ان کے لیے نہایت اہتمام سے پھاٹک کھولے جاتے ہیں، پھاٹک پر ان کے خیر مقدم کے لیے ان کے خیر مقدم کرنے والے دو رویہ کھڑے ہوتے ہیں، وہ اہلاً و سہلاً، احسنت اور مرحبا، سلام اور تحیت کے نعروں سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن کی تذلیل مد نظر ہوتی ہے وہ قیدیوں کی طرح جیل کے پھاٹک کی کھڑکی سے اس کے اندر ٹھونس دیے جاتے ہیں۔ گویا 'لَا تُفَتَّحُ'

سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں بلکہ اس کے لازم کی نفی ہے جس کی مثالیں کلام عرب میں بہت ملتی ہیں۔

متکبر جنت میں نہیں داخل ہو سکتا

'لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ' یہ اس قسم کا اسلوب بیان ہے جس کو تعلیق بالمحال کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اسی طرح ان متکبرین کا جنت میں داخل ہونا محال ہے۔ تعبیر کا یہ اسلوب قدیم صحیفوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ انجیل میں ہے "اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو" متی ۱۹: ۲۳-۲۴۔ قرآن اور انجیل کی تعبیر میں بس یہ فرق ہے کہ سیدنا مسیح نے سبب استکبار یعنی دولت کا حوالہ دیا ہے اور قرآن نے اصل جرم یعنی استکبار کا۔ اوپر ہم آدم و ابلیس کے قصے میں استکبار کی حقیقت بھی واضح کر چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ابلیس کے جنت سے نکالے جانے کا اصل سبب استکبار ہوا اس وجہ سے جن کے اندر استکبار کا کوئی شائبہ ہوگا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھیں گے۔ سیدنا مسیح کا ارشاد ہے "مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے"۔

'لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ' مہاد کے معنی بچھونے کے ہیں اور 'غواش'، 'غاشیۃ' کی جمع ہے جس کے معنی ڈھانک لینے والی کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اوڑھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے اوپر اور نیچے سے جہنم ہی اوڑھنا بچھونا ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۲-۴۳)

اہل ایمان کا حال جنت میں

'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الاية' اب یہ تقابل کے اصول پر اہل ایمان کا حال بیان ہو رہا ہے کہ وہ جنت میں کس طرح خوش و خرم، ایک دوسرے سے راضی و مطمئن اور اللہ کی توفیق ہدایت اور رسولوں کی رہنمائی پر کس طرح سراپا شکر و سپاس ہوں گے۔ آیت میں 'لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا' کا ٹکڑا بطور جملہ معترضہ ہے جس سے یہ اطمینان دلا دیا کہ یہ ذمہ داری اللہ نے اپنے بندوں پر ان کی حد وسع سے زیادہ نہیں ڈالی ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ایسا بوجھ ہے جو اٹھایا نہیں جا سکتا۔ یہ ذمہ داری بس اسی حد تک ہے جس حد تک بندوں کے امکان میں ہے۔

زبان کا ایک خاص اسلوب

'وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ' اس ٹکڑے میں زبان کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس کی ایک سے زیادہ مقامات میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ بسا اوقات ایک لفظ استعمال ہوتا ہے اور مقصود اس سے اس کا لازم ہوتا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے 'فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا' (پس آج ہم ان کو بھلا

دیں گے جس طرح انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا) ظاہر ہے کہ یہاں بھلا دینے سے اس کا لازم یعنی عدم التفات مراد ہے، ورنہ اللہ کے کسی چیز کو بھلا دینے کے کیا معنی! وہ تو کوئی چیز بھی کبھی نہیں بھلاتا۔ اسی طرح فرمایا۔ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا) میں تمھیں یاد رکھوں گا، یعنی میری نظر عنایت تم پر برابر رہے گی، ہر قدم پر تمھاری مدد کروں گا، اپنا ایک ایک وعدہ جو میں نے تم سے کیا ہے پورا کروں گا اور مزید برآں اپنے فضل ابدی سے نوازوں گا۔

اسی اسلوب پر یہاں 'وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ' سے مراد اس کا لازم ہے یعنی اہل ایمان جنت میں ایک دوسرے سے تپاک اور محبت سے ملیں گے، ایک دوسرے کا خیر مقدم کریں گے، آمنے سامنے بیٹھ کر آپس میں تبادلۂ مہر و محبت کریں گے، ان کے درمیان کسی رنجش و کدورت کا شائبہ نہ ہوگا۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں 'عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ' کے الفاظ سے ادا ہوا ہے۔ یعنی وہ آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے اس لیے کہ ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل صاف ہوں گے۔ ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھنا باہمی رنجش کی دلیل ہے اور آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بیٹھنا باہمی اعتماد و محبت کی۔ قرآن نے یہاں 'نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ' سے اہل جنت کی اسی حالت کا اظہار فرمایا ہے اور یہ بات ٹھیک ٹھیک اہل دوزخ کی اس حالت کے مقابل میں بیان ہوئی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ وہاں تو آپس میں لعنتوں کا تبادلہ ہوگا، جوتیوں میں دال بٹے گی اور یہاں مجلس مہر و محبت کی عطر بیزیوں سے معمور ہوگی۔

'وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا' یہ وہ شکر ہے جو کسی طویل اور پر صعوبت سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچنے والا مسافر ادا کرتا ہے 'هَدٰىنَا لِهٰذَا' میں اللہ تعالیٰ کی اس توفیق بخشی کی طرف بھی اشارہ ہے جو طالبین حق کو ہر قدم پر حاصل ہوتی ہے اور اس رہنمائی کی طرف بھی جو اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مہیا فرماتا ہے۔ 'وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ' میں اس سفر کے پر صعوبت ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس بات کی طرف بھی کہ اہل جنت کو جو کامیابی حاصل ہوگی وہ ان کی توقعات اور امیدوں، ان کے قیاسات اور اندازوں سے اتنی زیادہ ہوگی کہ وہ اس کو خدا کا فضل ہی فضل سمجھیں گے، اس میں اپنی سعی و تدبیر کے کسی دخل کا ان کو گمان بھی نہ ہوگا۔

منزل پر پہنچنے کے بعد اہل جنت کا جذبۂ شکر و سپاس

'لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ' اللہ تعالیٰ کے شکر کے بعد یہ انبیا و رسل کی عظیم خدمات اور ان کی کہی ہوئی ہر بات کی صداقت کا اعتراف ہے۔ یعنی اہل جنت رسولوں کی دی ہوئی ہر خبر کو واقعہ کی شکل میں دیکھ کر پکار اٹھیں گے کہ انھوں نے جو کچھ کہا حرف حرف حقیقت ثابت ہوا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جن کی تکذیب اور جن کے استکبار کا اوپر ذکر ہوا۔

'وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل جنت کے لیے منادی عام ہوگی کہ اس جنت کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے۔ اہل جنت کا خود اپنا احساس

تکمیل نعمت کی معراج

تو اوپر یہ نقل ہوا ہے کہ وہ اس جنت کو اپنی سعی و عمل کے بجائے صرف خدا کے فضل و احسان کا ثمرہ سمجھیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو ان کے سعی و عمل کا ثمرہ قرار دے گا۔ یہ تکمیل نعمت کی معراج ہے۔ بندوں کے اعمال کا درجہ اس آیت نے اتنا اونچا کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ اونچے درجے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں ہم جو کچھ پاتے ہیں خدا کے فضل ہی سے پاتے ہیں۔ آخرت میں بھی خدا کے فضل ہی سے پائیں گے لیکن ربِ کریم اس کو ہمارا حق اور ہماری محنت کا ثمرہ قرار دے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس ابدی بادشاہی کا جس کے متعلق ہر شخص کا شعور یہ ہو گا کہ یہ اس نے اپنی کوششوں سے بنائی ہے اور یہ لازوال ہے! انسان صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس کو نعمتیں حاصل ہوں بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں اس کی اپنی ہوں، اس احساس کے بغیر وہ کسی نعمت کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی فطرت کا یہ تقاضا بھی پورا کر دے گا۔

ایک لطیف تلمیح

اس آیت میں وراثت کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس میں ایک لطیف تلمیح ہے اُس ماجرے کی طرف جو اوپر آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کا مذکور ہوا ہے۔ وہاں یہ ارشاد موجود ہے کہ اولادِ آدمؑ میں سے وہی لوگ اپنے باپ کی اس جنت کے وارث ٹھہریں گے جو شیطان کی تمام فتنہ آرائیوں کے علی الرغم ایمان و عمل صالح کی صراطِ مستقیم پر قائم رہیں گے۔ یہاں اُوْرِثْتُمُوْهَا کا لفظ استعمال کر کے گویا شاباش دے دی کہ بے شک تُم نے بازی جیت لی اور اب تم حقدار ہو کہ تم اس جنت کے وارث بنائے جاؤ۔

۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۴-۵۳

آگے وہ سوال و جواب مذکور ہوا ہے جس کا تبادلہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان ہو گا۔ اہلِ جنت دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ ہم سے تو ہمارے رب نے جو وعدے کیے تھے وہ ایک ایک کر کے سب پورے ہوئے، تم بتاؤ، تم نے بھی وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا یا نہیں جس کی تمھیں خبر دی گئی تھی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں، سب دیکھ لیا۔ اس کے بعد ایک منادی ان پر اللہ کی لعنت کا اعلان کرے گا۔

پھر یہ بیان ہوا کہ اعراف کی بُرجیوں سے رجالِ امت کے ایک گروہ کو جنت و دوزخ کے احوال کا مشاہدہ کرایا جائے گا کہ وہ دیکھ لیں کہ اللہ کے جن وعدوں کے لیے وہ جیے اور مرے وہ کس طرح پورے ہوئے۔ یہ اصحاب الاعراف اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ دونوں کو ان کی علاماتِ امتیاز سے پہچانتے ہوں گے وہ اہلِ جنت کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دیں گے اور اہلِ دوزخ کے قائدین کو پھٹکاریں گے کہ بتاؤ تمھاری ساری جمعیت اور تمھارا سارا غرہ کیا کام آیا، تم قسمیں کھا کھا کے جن کے باب میں یہ کہتے تھے کہ یہ کبھی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے، وہ کہاں ہیں اور تم کہاں بھاڑ جھونک رہے ہو؟

اس کے بعد یہ بیان ہوا ہے کہ اہلِ دوزخ پانی کے لیے تراہ تراہ کر رہے ہوں گے اور اہلِ جنت

سے فریاد کریں گے کہ کچھ ادھر بھی نظرِ کرم کرو لیکن وہ جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ دوزخ کے لیے ان چیزوں کی مناہی کر رکھی ہے۔

آخر میں یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ جنت و دوزخ کا جو احوال سنایا جا رہا ہے، یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں۔ یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کو آگاہ کرنے کے لیے ایک کتاب اتاری جس میں اپنے علمِ قطعی کی روشنی میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کی تفصیل سنا دی ہے تاکہ جو ایمان لانا چاہیں وہ اس ہدایت کو اختیار کر کے اپنے آپ کو رحمت کا سزاوار بنا لیں لیکن یہ اپنی رعونت کے سبب سے منتظر ہیں کہ جب یہ ساری باتیں واقعات کی شکل میں ان کے سامنے آئیں گی تب ان کو مانیں گے لیکن وہ وقت ماننے کا نہیں ہوگا بلکہ سر پیٹنے کا ہوگا ـــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۴۴-۵۳

وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ لَّعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَیَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ۚ وَہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ کٰفِرُوۡنَ ﴿۴۵﴾ وَبَیۡنَہُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَی الۡاَعۡرَافِ رِجَالٌ یَّعۡرِفُوۡنَ کُلًّۢا بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ وَنَادَوۡا اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ اَنۡ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ ۟ لَمۡ یَدۡخُلُوۡہَا وَہُمۡ یَطۡمَعُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُہُمۡ تِلۡقَآءَ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوۡا رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۷﴾ وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا یَّعۡرِفُوۡنَہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡکُمۡ جَمۡعُکُمۡ وَمَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ اَہٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا یَنَالُہُمُ اللّٰہُ بِرَحۡمَۃٍ ؕ اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمۡ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۴۹﴾ وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ اَنۡ اَفِیۡضُوۡا عَلَیۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ ؕ قَالُوۡۤا

وقف لازم

ع ۵ / ۱۲

إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِينَ ﴿٥٠﴾ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿٥١﴾ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ ۚ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوا لَنَآ أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ قَدْ خَسِرُوٓا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٥٢﴾

ع ۶ ۱۴

ترجمۂ آیات ۴۴-۵۳

اور جنت والے دوزخ والوں کو پکار کر پوچھیں گے کہ ہم سے تو جو کچھ ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا ہم نے اس کو بالکل سچا پایا، کیا تم نے بھی جو کچھ تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا اس کو سچا پایا؟ وہ جواب دیں گے، ہاں! پھر ایک منادی کرنے والا ان کے بیچ میں پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر ـــ ان پر جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔ ۴۴-۴۵

اور ان کے درمیان پردے کی دیوار ہو گی اور دیوار کی برجیوں پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ اہل جنت کو پکار کر کہیں گے کہ آپ پر اللہ کی رحمت و سلامتی ہو ـــ وہ اس میں ابھی داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن متوقع ہوں گے۔ اور جب ان کو اہل دوزخ کی طرف توجہ دلائی جائے گی، وہ پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہمیں ان ظالموں کا ساتھی نہ بنائیو! اور برجیوں والے

کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے آواز دیں گے۔ کہیں گے، کیا کام آئی تمھارے تمھاری جمعیت اور تمھارا وہ سارا گھمنڈ جو تم کرتے تھے! کیا یہی ہیں وہ لوگ جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ یہ کبھی اللہ کی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے! داخل ہو جنت میں، اب نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تمھیں کوئی غم لاحق ہوگا۔ ۴۶-۴۹

اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ پانی یا ان چیزوں میں سے، جو اللہ نے تمھیں بخش رکھی ہیں، کچھ ہم پر بھی کرم فرماؤ۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں کے لیے حرام کر رکھی ہیں ـــــ ان کے لیے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنایا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا، پس آج ہم ان کو نظرانداز کریں گے جس طرح انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے ـــــ اور ہم نے ان کو ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جس کی تفصیل ہم نے علمِ قطعی کی بنیاد پر کی ہے، ہدایت و رحمت بنا کر ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ یہ لوگ بس اس کی حقیقت کے مشاہدے کے منتظر ہیں۔ جس روز اس کی حقیقت سامنے آئے گی، وہ لوگ جنھوں نے اس کو پہلے نظرانداز کیے رکھا، بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے، تو ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہماری سفارش کریں یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں!! انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ وہ گھڑتے رہے تھے سب ہوا ہو گئے! ۵۰-۵۳

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَنَادٰٓی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ لَّعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ (۴۴)

جنت میں انسانی قوتوں کا عروج

یہ آیت ایک نہایت ہلکا سا تصور دیتی ہے اس انقلابِ حال کا جو جنت میں پہنچ کر انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کے اندر برپا ہوگا۔ اس دنیا میں تو ہمارے سمع و بصر اور ادراک و ابلاغ کی قوتیں نہایت محدود ہیں۔ معمولی معمولی چیزیں ہماری ان قوتوں کی راہ میں روک بنی ہوئی ہیں لیکن عالم آخرت میں یہ رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ جنت کے عالم سے جب چاہیں گے اہلِ جنت دوزخ والوں کو مخاطب کر کے ان سے سوال و جواب کر لیں گے۔

اس سائنسی دور کے انسان کے لیے یہ بات ذرا بھی حیران کرنے والی نہیں ہونی چاہیے۔ جب آج انسان نے قدرت کے محض چند ضمنی قوانین کا راز دریافت کر کے اپنے لیے ایسی دوربینیں ایجاد کر لی ہیں جن کی مدد سے ہزاروں میل کی مسافت پر جلنے والی شمع کی لَو کو دیکھ سکتا ہے، ایسے فون بنا لیے ہیں جن کی وساطت سے جب چاہے پاکستان کا پریسیڈنٹ امریکہ کے پریسیڈنٹ سے بات کر سکتا ہے، ایسے ٹیلی ویژن بنا لیے ہیں جن پر ایک ملک کے لوگ کسی دور دراز ملک کے کسی خطیب کو اپنے ملک کے کسی مجمع کے سامنے تقریر کرتے، مجمع کو تالیاں پیٹتے اور نعرے لگاتے دیکھ اور سن سکتے ہیں، ایسے آلات بنا لیے ہیں جو اس کو لاکھوں میل کی مسافت سے نبض کی حرکت اور دل کی دھڑکن سے آگاہ کر سکتے ہیں تو آخر اس عالم کی باتوں پر حیران ہونے کی کیا وجہ ہے جہاں یہ سارے نوامیس طبیعی، جو آج ہمیں جکڑے ہوئے ہیں بدل جائیں گے اور اس زمین و آسمان کی جگہ نئے آسمان و زمین پیدا ہو جائیں گے۔

اہلِ دوزخ کی تفضیح

اہلِ جنت کا یہ سوال اہلِ دوزخ سے جو یہاں نقل ہوا ہے، تبلیغ و تذکیر کے مقصد سے تو ظاہر ہے کہ ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ اس کا وقت تو گزر چکا ہوگا، اس کا مقصد محض اہلِ دوزخ کی تفضیح ہوگا۔ اس کے جواب میں اہلِ دوزخ کا اعتراف گویا مجرم کا وہ آخری اعتراف ہوگا جس کے بعد اس کے اور اس کی سزا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں رہ جائے گی۔ چنانچہ ایک منادی ان ظالموں پر اللہ کی لعنت کا اعلان کرے گا اور یہ اعلان ہم معنی ہوگا اس کے کہ اب سزا اور عذاب کا باب شروع ہو گیا۔

ایک لطیف تضمین

'اَلَّذِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَیَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ۚ وَہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ کٰفِرُوۡنَ' ۴۵۔ عام طور پر لوگوں نے اس ٹکڑے کو منادی کے اعلان ہی کا ایک حصہ سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک منادی کا اعلان لفظ 'ظٰلِمِیۡنَ' ہی پر تمام ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ٹکڑا بطور تضمین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت کے طور پر اس کے ساتھ

لگایا ہے تاکہ کلام محض مستقبل کی ایک حکایت بن کے نہ رہ جائے بلکہ حال پر بھی پوری طرح منطبق ہو جائے۔ اس تضمین سے گویا یہ وضاحت ہوگئی کہ ظالمین سے مراد کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا کہ وہی لوگ جو آج اللہ کی راہ سے لوگوں کو روک رہے ہیں، جو اس میں کجی پیدا کرنے کے لیے ساعی ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔ اس وضاحت کے بعد آخرت میں ہونے والی منادی وقت کے قریش پر ٹھیک ٹھیک اس طرح چسپاں ہوگئی، گویا

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

اس قسم کی تضمینات قرآن مجید میں بہت ہیں پیچھے بھی اس کی مثالیں گزر چکی ہیں، آگے بھی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس کی ایک مثال آیت ۵۱ میں بھی آ رہی ہے۔ انہی تضمینات سے بالعموم اصولی باتیں یا مستقبل کے ماجرے یا ماضی کی سرگزشتیں حاضر اور حال کا جامہ پہنتی ہیں۔ اس وجہ سے ان پر خاص طور پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے ورنہ نظم کلام درہم برہم ہو جاتا ہے اور تاویل میں ایسے تکلف سے کام لینا پڑتا ہے جس سے نہ صرف ذوق ابا کرتا ہے بلکہ زبان کے آداب و قواعد بھی اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہاں بھی جن لوگوں نے اس کو تضمین نہیں مانا انھیں وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ کے ٹکڑے کی تاویل میں تکلف کرنا پڑا۔ انھوں نے اس کو وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ کے معنی میں لیا حالانکہ یہ قرآن میں ایک قسم کا اضافہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ میں 'صد' کا لفظ لازم اور متعدی یعنی رکنے اور روکنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ ایسے الفاظ کے ترجمے میں مشکل پیش آتی ہے۔ میرے نزدیک ایسے الفاظ کے باب میں محتاط طریقہ یہ ہے کہ اگر قرینہ واضح ہو تب تو قرینہ کے تقاضے کے مطابق ترجمہ کرنا چاہیے ورنہ متعدی مفہوم کے اعتبار سے ترجمہ اولیٰ ہے اس لیے کہ متعدی کے اندر لازم کا مفہوم خود مضمر ہوتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا میں عوج سے مراد تو اگرچہ وہ ساری کج راہیاں اور کج عملیاں ہو سکتی ہیں جو خدا کی راہ سے ہٹ کر انسان اختیار کرتا ہے لیکن نظائر قرآن کی روشنی میں میرے نزدیک اس کا مفہوم خدا کی صراط مستقیم یعنی توحید کی راہ میں کجی پیدا کر کے شرک کی پگڈنڈیاں نکالنا ہے۔ ان نظائر کی وضاحت کسی مناسب محل میں انشاء اللہ تفصیل سے آئے گی۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۟ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۴٦ - ۴۹)

حجاب سے مراد جنت اور دوزخ کے درمیان کی دیوار ہے

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰىهُمْ۔ حجاب سے مراد جیسا کہ خود قرآن کے دوسرے مقام سے واضح ہے، وہ دیوار ہے جو دوزخ اور جنت کے درمیان کھڑی کر دی جائے گی۔ سورہ حدید

میں ہے۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ ۱۳۔ حدید (یس ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی) ایک ایسی دیوار کے طول و عرض کا اندازہ کون کر سکتا ہے جو پورے عالم جنت اور سارے عالم دوزخ کے درمیان حدفاصل کا کام دے گا جب کہ صرف جنت کی وسعتوں کی تمثیل قرآن نے آسمانوں اور زمین کی وسعتوں سے دی ہے۔

'اعراف' کا مفہوم

'اَعْرَاف'، 'عُرْف' کی جمع ہے۔ 'عرف' گھوڑے کی پیشانی کی چوٹی اور مرغ کی کلغی کو کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ کسی مینارہ یا برجی یا دیدبان کے لیے استعمال ہوا جو کسی اونچی دیوار یا پہاڑی پر بنا دیا جائے، جہاں سے تمام اطراف و جوانب کا بیک نظر مشاہدہ ہو سکے۔ قرآن کے اسلوب بیان سے واضح ہے کہ جنت و دوزخ کے درمیان جو دیوار کھڑی کی جائے گی یہ اعراف یعنی مینارے اور برجیاں اسی دیوار پر ہوں گے جہاں سے جنت و دوزخ کے تمام مناظر کا مشاہدہ ہو سکے گا۔

'رجال' سے مراد

'رِجَال' کا لفظ یوں تو اپنے عام مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے بالعموم نمایاں اور ممتاز اشخاص مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۳۷۔ نور (ایسے رجال جن کو تجارت اور خرید و فروخت یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتی) مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۲۳۔ احزاب (اور اہل ایمان میں ایسے رجال ہیں جنھوں نے اس عہد کو سچ کر دکھایا جو خدا سے انھوں نے باندھا) یہیں آیت ۴۸ میں بھی یہ لفظ ائمہ کفر کے لیے استعمال ہوا ہے۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ (اور اعراف والے کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے پکاریں گے، کہیں گے بتاؤ کیا کام آئی تمھاری جمعیت اور کیا کام آیا تمھارا گھمنڈ)

'کُلًّا'۔ لفظ 'کل'، ہم دوسرے مقام میں بتا چکے ہیں کہ جب یہ جماعتوں یا اشخاص کے ذکر کے بعد اس طرح آئے جس طرح یہاں آیا ہے تو یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے معرفہ بن جاتا ہے۔ یعنی اس سے مراد وہی گروہ یا اشخاص ہوں گے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ یہاں اوپر اہل جنت اور اہل دوزخ کا ذکر ہوا ہے چنانچہ اس سے مراد وہی دونوں گروہ بحیثیت گروہ ہیں۔

اہل جنت اور اہل دوزخ اپنی نمایاں علامتوں سے ممتاز ہوں گے

'سِيْمَا' کے معنی علامت اور نشان کے ہیں مثلاً سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ، قرآن مجید اور احادیث دونوں میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ قیامت میں اہل ایمان اور اہل کفر دونوں اپنے اپنے اعمال کے اثرات سے ممتاز و ممیز ہوں گے۔ مسلم شریف میں ایک حدیث ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کی امت میں سے جو لوگ آپ کے بعد آئیں گے آپ ان کو کیسے پہچانیں گے، آپ نے فرمایا، اگر ایک شخص کے پنج کلیان گھوڑے دوسرے گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں تو کیا وہ ان کو پہچان نہ لے گا؟ لوگوں نے کہا، یہ بات تو ٹھیک ہے یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا اسی طرح میری امت کے لوگ قیامت کے دن اپنے وضو کے آثار سے اس طرح نمایاں ہوں گے کہ ان کی پیشانیاں اور ان کے ہاتھ

پاؤں چمکتے ہوں گے۔ ابولہب کی بیوی کے متعلق خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن اس کے گلے میں اس طرح کی رسی پڑی ہوئی ہوگی جس طرح کی رسی ایندھن جمع کرنے والی لونڈیاں اپنے گلے میں ڈال کر لکڑیاں چننے کے لیے نکلا کرتی ہیں۔ اس نوع کے بعض اشارات معراج سے متعلق احادیث میں بھی موجود ہیں۔ غرض یہ بات واضح ہے کہ اہل ایمان ہوں یا اہل کفر دونوں گروہ اپنے اپنے محل میں اپنی نمایاں نشانیوں اور علامات کے ذریعے سے ممتاز ہوں گے اور اہل اعراف ان علامات کے واسطہ سے اہل جنت کے صدیقین، شہدا اور صالحین وابرار کو بھی پہچان لیں گے اور اہل دوزخ کے لیڈروں اور اشرار و مفسدین کو بھی۔

اصحاب الاعراف کون لوگ ہوں گے

اجزائے کلام کی تشریح کے بعد قابل غور سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اصحاب الاعراف کون لوگ ہوں گے؟ ابن جریرؒ نے اس سوال کے جواب میں چار قول نقل کیے ہیں۔

ایک یہ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں دونوں تول میں برابر برابر اتری ہوں گی، اس وجہ سے ان کا فیصلہ ابھی معلق ہوگا کہ دوزخ میں بھیجے جائیں یا جنت میں۔

دوسرا یہ کہ یہ علما اور فقہا کا گروہ ہوگا۔

تیسرا یہ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں حصہ لیا ہوگا۔

چوتھا یہ کہ یہ ملائکہ ہوں گے۔

ان میں سے موخرالذکر دونوں قول تو بالکل ہی بے جان ہیں۔ ان کی تائید میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن میں موجود نہیں ہے اس وجہ سے ان پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلا قول اگرچہ بہت مشہور ہے یہاں تک کہ مصرعہ "از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است"، ہمارے لٹریچر میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل کر گیا ہے لیکن کئی پہلوؤں سے یہ قول بھی ضعیف معلوم ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ یہاں ان کے لیے 'رجال' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جب اس طرح آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو اس سے مراد نمایاں اشخاص و رجال ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا حال یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی نیکیاں اتنی بھی نہ ہوں گی کہ ان کی بدیوں پر بھاری ہو سکیں آخر ان کا ایسا نمایاں وصف کیا ہے جس کے سبب سے ان کا ذکر اس لفظ سے کیا گیا؟

دوسرا یہ کہ جن کی نیکیاں اور بدیاں دونوں برابر برابر ہوں گی ضروری نہیں کہ وہ سب مرد ہی ہوں، ان میں عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر ان کے لیے رجال کا لفظ کیوں استعمال ہوا، کوئی ایسا لفظ کیوں نہ استعمال ہوا جو جامع نوعیت کا ہوتا مثلاً طائفہ یا امت یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ؟

تیسرا یہ کہ یہاں کسی ایک لفظ سے بھی نہ تو یہ بات نکلتی کہ یہ ایک ایسے گروہ کا ماجرا بیان ہو رہا ہے جس کا معاملہ ابھی معلق ہے اور نہ یہ بات نکلتی کہ ان کو اعراف کی یہ سیر کرانے سے مقصود کیا ہے حالانکہ موقع ایسا ہے کہ یہ بات واضح ہونی چاہیے تھی۔

چوتھا یہ کہ یہ لوگ اہل جنت اور اہل دوزخ کو جس انداز میں مخاطب کریں گے، ان کو مخاطب کرکے جو جو باتیں فرمائیں گے اور ان کے ساتھ جس اعزاز و اکرام کا معاملہ مذکور ہوا ہے وہ سب اس امر کے خلاف ہے کہ یہ ایک ایسے گروہ کا ذکر ہو جس کی اپنی نجات کا معاملہ ابھی معلق اور جس کی اپنی کارگزاری کی نوعیت یہ ہو کہ نیکی اور بدی دونوں برابر برابر ہو کر رہ گئی ہوں۔ قرآن کے بیان سے واضح ہے کہ یہ لوگ اہلِ جنت کو مبارکباد دیں گے، اہلِ دوزخ کے لیڈروں کو سرزنش اور ملامت کریں گے کہ تم دنیا میں بہت اتراتے اور اکڑتے رہے ہو، بتاؤ تمہاری جمعیت اور تمہارا سارا سرمایۂ غرور کہاں گیا؟ ان کو بتائیں گے کہ تم خدا کی ساری نعمتوں کا اجارہ دار تنہا اپنے آپ کو سمجھتے تھے، غریب مسلمانوں کو کسی فضل کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے، اب دیکھو تم کہاں ہو اور وہ کہاں ہیں؟ آخر میں اہل جنت کو تمکن اور دوام و استمرار کی بشارت دیں گے۔ —— غور کیجیے کہ یہ ساری باتیں ایسے لوگوں کی زبان سے کس طرح نکل سکتی ہیں جنھیں خود اپنی نجات کی فکر پڑی ہو کہ معلوم نہیں مشیت غیب کیا فیصلہ کرتی ہے؟ نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہ یہ ممکن ہے کہ اس طرح کی باتیں کسی مذبذب و متردد گروہ کے منہ سے نکل سکیں اور نہ اخلاقی پہلو سے یہ ایسے لوگوں کی زبان سے زیب ہی دیتی ہیں جن کے اپنے کارنامے کچھ زیادہ وقیع نہ ہوں۔

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک یہ قول اپنی شہرت کے باوجود کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ صحیح قول ہمارے نزدیک دوسرا ہے۔ ابنِ جریر نے یہ قول مجاہدؒ کی طرف منسوب کیا ہے جن کا مرتبہ تفسیر میں معلوم و معروف ہے۔ مجاہدؒ نے علماء اور صلحاء سے مراد ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو لیا ہے جو دنیا میں حق و باطل کی کشمکش میں حق کے علم بردار، خیر کے داعی اور منکر سے روکنے والے رہے ہیں۔ جنھوں نے حق کی حمایت میں اہلِ باطل کے جور کے سہے ہیں اور جو مظلوموں کی مدافعت میں سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوئے۔ ایسے علماء و فقہاء یا بالفاظ دیگر رجالِ امت بلاشبہ قیامت کے دن اس اعزاز کے سزاوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعراف کی بلندیوں سے جنت اور دوزخ دونوں کا مشاہدہ کرائے تاکہ وہ حق و باطل دونوں کا آخری انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اپنی زبانوں سے رفقائے حق کو مبارکباد دیں اور دشمنانِ حق کو سرزنش کریں۔

وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَهُمْ یَطْمَعُوْنَ، یہ لوگ اعراف کی بلندیوں سے سب سے پہلے اہلِ جنت کو سلامتی و مبارکی کا پیغام دیں گے۔ 'لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَهُمْ یَطْمَعُوْنَ' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کو جنت میں بھیجنے سے پہلے ہی یہ مشاہدہ کرایا جائے گا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کی سچائی ہر پہلو سے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جنت میں داخل ہوں۔ 'وَهُمْ یَطْمَعُوْنَ' کے الفاظ سے ان کی تواضع جھلکتی ہے۔ باوجودیکہ یہ سارا اعزاز و اکرام صاف شہادت دے رہا ہوگا کہ اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ و مقام کیا ہے لیکن وہ اپنی تواضع و فروتنی کے سبب سے اپنے آپ کو امیدوارِ رحمت ہی کے درجے میں سمجھیں گے چنانچہ یہاں الفاظ ٹھیک ٹھیک ان کی ذہنی کیفیت کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ

ملحوظ رہے کہ جو لوگ اللہ کی شانیں جانتے ہیں وہ اپنے آپ کو امید اور طمع کے درجے سے اونچا کبھی نہیں لے جاتے، یہ تنگ ظرفوں کا شیوہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے میں بہک جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر فرماتے ہیں وَالَّذِیٓ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ۸۲۔ شعراء (اور وہ کہ جس سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ جزا و سزا کے دن میری غلطی معاف فرمائے گا) ہمارے حضورؐ نے ایک مرتبہ فرمایا، کوئی اپنے عمل سے جنت میں نہیں جائے گا، لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ آپ بھی؟ ارشاد ہوا' ہاں میں بھی، 'اِلَّا اَنۡ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحۡمَتِہٖ' میں بھی اسی وقت جنت میں جاؤں گا جب اللہ کی رحمت مجھے ڈھانک لے۔

'وَاِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُهُمۡ تِلۡقَآءَ اَصۡحٰبِ النَّارِ الاٰیۃ' یہ اسلوب بیان اکرام و اعزاز پر دلیل ہے۔ پہلے وہ اہل جنت کی کامرانیوں کا مشاہدہ کریں گے اور اس کے مشاہدے میں بالکل محو ہو جائیں گے اس لیے کہ وہاں حال یہ ہوگا کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ من نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

پھر اہل دوزخ کی طرف ان کو توجہ دلائی جائے گی کہ ذرا ایک نظر دشمنانِ حق کے انجام پر بھی ڈال لیجیے۔ ان پر نظر پڑتے ہی ان کی زبان سے بے تحاشا تعوذ کی دعا نکلے گی 'رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ' (اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے ساتھ شامل نہ کیجیو) جس طرح اوپر 'وَهُمۡ یَطۡمَعُوۡنَ' کے الفاظ سے ان کی تواضع و فروتنی پر عکس پڑتا ہے اسی طرح یہ دعا ان کے کمال خشیت کی بھی دلیل ہے اور جہنم کے منظر کی ہولناکی کی بھی۔

اصحاب الاعراف کا خطاب کفار کے لیڈروں سے

'وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا یَّعۡرِفُوۡنَهُمۡ بِسِیۡمٰهُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡكُمۡ جَمۡعُكُمۡ وَمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ' اصحاب اعراف کا یہ خطاب الفاظ سے واضح ہے کہ اہل دوزخ کے لیڈروں سے ہوگا اس لیے کہ اپنی جمعیت پر ناز اور اپنے مال و جاہ پر غرہ انہی کو تھا۔ دوزخ میں یہ لوگ اپنے نمایاں نشان سے ممتاز ہوں گے اس وجہ سے اہل اعراف پہچان جائیں گے کہ یہ ابولہب ہے، یہ ابوجہل، یہ فلاں اور یہ فلاں۔ ان کو مخاطب کر کے اہل اعراف ان سے یہ سوال بطور تفضیح کریں گے۔ ہر دور کے ائمہ کفر کا اپنے مال و اسباب اور اپنی تعداد و جمعیت پر غرہ قرآن میں تفصیل سے مذکور ہے۔ ہم نے یہاں 'ما' کو سوالیہ مفہوم میں لیا ہے۔ اس میں زور بھی زیادہ ہے اور قرآن کے نظائر سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ پھر بعد کا جملہ، جو اس سے متعلق ہے، واضح طور پر سوالیہ ہے بھی۔ اگر اس کو بعد والے جملہ سے الگ مفہوم میں لیں گے تو کلام میں ہم آہنگی باقی نہیں رہے گی۔

'اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحۡمَةٍ' یہ سوال ان ائمہ کفر سے، اہل اعراف ساکنین جنت کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کریں گے کہ بتاؤ کیا یہی وہ لوگ نہیں ہیں جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ یہ کبھی خدا کے کسی فضل کے سزاوار نہیں ہو سکتے؟ قرآن میں مذکور ہے کہ سادات قریش اسلام کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل یہی لاتے تھے کہ اگر اس میں کوئی خیر کا پہلو ہوتا تو کیا اس کے پیرو یہی فقیر فاقہ کش اور غلام و نادار بنتے؟ خدا کی ساری نعمتوں کے سزاوار تو ہم بنائے گئے، پھر اس کے لیے ان کا انتخاب کیوں ہوا؟ اہل اعراف ان کے اسی غرور کو سامنے رکھ کر سوال کریں گے کہ فرماؤ، جن کو تم کسی فضل و رحمت کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے وہ کہاں ہیں اور تم کہاں ہو؟

اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمۡ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ - اوپر والا سوال تو اہل اعراف ائمہ کفر کو مخاطب کر کے کریں گے اور یہ بات وہ اہل جنت کو مخاطب کر کے ان سے بطور تہنیت و تبریک کہیں گے جس سے برسر موقع ان کی توہین کرنے والوں کی تفضیح بھی ہو جائے گی۔

فعل تمکن و استمرار کے مفہوم میں

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اہل جنت تو بالفعل جنت میں براجمان ہوں گے ہی پھر ان کو مخاطب کر کے 'اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ' (جنت میں داخل ہو) کہنے کے کیا معنی؟ غالباً اسی سوال سے بچنے کے لیے ارباب تاویل نے اس جملہ کے مخاطب اور اس کے قائل کے تعین میں بڑے تکلف سے کام لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سارا تکلف انھیں اس وجہ سے کرنا پڑا کہ انھوں نے عربیت کے اس اسلوب کو ملحوظ نہیں رکھا کہ عربی زبان میں فعل ہر جگہ اپنے ابتدائی معنی ہی پر دلیل نہیں ہوا کرتا، بعض مواقع میں وہ تمکن و استمرار پر دلیل ہوتا ہے۔ مثلاً دیکھ لیجیے یہی 'اُدۡخُلُوا' سورۂ یوسف میں استعمال ہوا ہے جو اپنے ابتدائی مفہوم میں نہیں بلکہ تبریک و تہنیت اور تمکن و استمرار کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰی یُوۡسُفَ اٰوٰۤی اِلَیۡہِ	پس جب وہ یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے اس
اَبَوَیۡہِ وَقَالَ ادۡخُلُوۡا مِصۡرَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ	نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر
اٰمِنِیۡنَ (۹۹ - یوسف)	میں داخل ہو انشاء اللہ امن کے ساتھ۔

یہ اس موقع کا ذکر ہے جب حضرت یوسفؑ کے سارے بھائی، ان کی ہدایت کے بموجب، اپنے والدین کو ساتھ لے کر، حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور حضرت یوسفؑ نے اپنے دربار میں ان کی پذیرائی فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ان لوگوں کے مصر میں داخل ہونے کا سوال نہیں تھا۔ وہ مصر میں نہ صرف داخل ہو چکے تھے بلکہ ان کے والدین حضرت یوسفؑ کے پہلو میں فروکش اور یہ تمام بھائی حضرت یوسفؑ کے دربار میں موجود تھے۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کا یہ فرمانا کہ 'اُدۡخُلُوۡا مِصۡرَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ' صریحاً تبریک و تہنیت اور بشارتِ تمکن کے مفہوم ہی میں ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ٹھیک اسی مفہوم میں اصحاب اعراف کا اہل جنت کو مخاطب کر کے 'اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمۡ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ' فرمانا بھی ہے۔ یعنی مال و جاہ کے غرور کے متوالے تو تمھیں نہایت حقیر و ذلیل سمجھتے رہے ہیں لیکن اللہ نے ان کے علی الرغم تمھیں جنت کی سرفرازی بخشی

تم اس میں سرفراز رہو، اب نہ تمھارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم۔

'وَنَادَىٰٓ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ أَصْحَٰبَ ٱلْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا۟ عَلَيْنَا مِنَ ٱلْمَآءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ ٱللَّهُ ۚ قَالُوٓا۟ إِنَّ ٱللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ' (۵۰)

لفظ تحریم کا ایک خاص مفہوم

'حَرَّمَهُمَا' میں جس تحریم کا ذکر ہے یہ شرعی حرمت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس معنی میں ہے جس معنی میں 'فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۲۶ - مائدہ ۵' (پس یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام کردی گئی) میں ہے۔ یعنی چالیس سال کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو حتمی طور پر اس سرزمین سے محروم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو کسی چیز سے حتمی طور پر محروم کر دے تو نہ وہ چیز کسی طرح اس کو پہنچ سکتی اور نہ وہ اس کو کسی طرح پا سکتا۔ اہل جنت کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سوال کے پورے کرنے میں تو کوئی عذر نہیں ہے، ان کے پاس ہر نعمت کی فراوانی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں سے اہل دوزخ کو محروم کر دیا ہے اس وجہ سے نہ یہ ان کو پہنچ سکتی ہیں نہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

'ٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُوا۟ دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا وَغَرَّتْهُمُ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا ۚ فَٱلْيَوْمَ نَنسَىٰهُمْ كَمَا نَسُوا۟ لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هَٰذَا وَمَا كَانُوا۟ بِـَٔايَٰتِنَا يَجْحَدُونَ' (۵۱)

ایک برمحل تضمین

یہ آیت بطور تضمین ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے جواب 'حَرَّمَهُمَا عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ' کی وضاحت اپنی طرف سے فرما دی کہ 'کافرین' سے کون لوگ مراد ہیں۔ اس تضمین سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا، گویا قریش پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صرف دوسروں کی حکایت ہے بلکہ یہ ان کی بھی حکایت ہے۔ اس قسم کی تضمین کی مثال اوپر آیت ۴۵ میں بھی گزر چکی ہے۔

'ٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُوا۟ دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا' یعنی اللہ نے جو چیز ان پر دین کی حیثیت سے اتاری اس کو انھوں نے ہنسی مسخری میں اڑایا۔ ہر چیز کا ایک محل و مقام ہوتا ہے۔ دین اس لیے آتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں صحیح نقطۂ نظر متعین کرے تاکہ لوگ ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے بجائے فلاح و سعادت کی راہ اختیار کریں۔ لیکن جن لوگوں نے زندگی کو بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے وہ اپنی خواہشات کے پیچھے ایسے اندھے ہو جاتے ہیں کہ وہ خواہشات کے خلاف سنجیدہ سے سنجیدہ حقیقت کو بھی مذاق تصور کرتے اور مذاق ہی میں اس کو اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بازی بازی با ریش بابا ہم بازی!!

منکرین آخرت کا اصل دھوکا

'غَرَّتْهُمُ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا' یہ اس لاابالیانہ طرز عمل کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ وہ کیوں زندگی کی نہایت سنجیدہ حقیقتوں سے اندھے بنے رہے۔ فرمایا کہ دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں، دندنا رہے ہیں اور کوئی بازپرس ان سے نہیں ہو رہی ہے اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ بس دنیا اسی لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر کسی اللہ کے بندے نے ان کو توجہ دلائی کہ اس کے بعد ایک روز حساب کتاب بھی آنے والا ہے تو اس کے لتے لے ڈالے کہ یہ دیوانہ اور خبطی ہے۔ ہماری آزادی اور ہمارے عیش کو مکدر کر رہا ہے۔

'فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا' یہاں 'نَنْسٰهُمْ' نظر انداز کر دینے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور یہ فعل کا استعمال اس اسلوب پر ہے جس کو دوسری جگہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ استعمال بظاہر فعل ہوتا ہے لیکن مقصود اس سے اس کا لازم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بھولتا نہیں۔ یہ بھولنا نظر انداز کرنے کی تعبیر ہے۔

'لِقَآءَ' قرآن کے نظائر سے واضح ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوا ہے، کہیں اپنے ظرف کی طرف لیکن مدعا دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ یعنی رب سے ملاقات آخرت میں۔ انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا، یعنی اس دن میں اپنے رب کی ملاقات کو بھلائے رکھا۔

'وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ' یہ جملہ چونکہ اوپر والے جملے ہی پر عطف ہے اس وجہ سے یہ دراصل 'كَمَا كَانُوْا' کے مفہوم میں ہے۔ 'کما' کے اندر تشبیہ و تمثیل کے ساتھ ساتھ سببیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ 'اور بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے'، تو یہ ترجمہ بالکل صحیح ہوگا۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ه هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۵۲-۵۳)

'وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ' 'هُمْ' کا مرجع قریش ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر اپنے اس احسانِ عظیم کا اظہار فرمایا ہے جو قرآن کی صورت میں ان پر فرمایا۔ اس کتاب کی صفت یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ اس میں ہم نے اپنے علمِ قطعی کی روشنی میں ان تمام امور کی تفصیل بیان کر دی ہے جن سے آگاہ ہونا دنیا و آخرت کی سعادت کے لیے ضروری ہے۔ اس تفصیل سے ان تفصیلات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اوپر اہل جنت، اہل دوزخ اور اصحاب الاعراف سے متعلق بیان ہوئی ہیں۔ جو ہیں اگرچہ عالمِ آخرت سے متعلق لیکن کوئی ان کو محض ہوائی اور خیالی باتیں (FICTION) نہ سمجھے بلکہ یہ پیش آنے والے حقائق ہیں جو تمام تر 'عَلٰى عِلْمٍ' بیان ہوئے ہیں۔ یہاں لفظ 'علم' کی تنکیر موقع کلام دلیل ہے کہ تفخیم شان کے لیے ہے۔ یعنی یہ خدا کے عظیم و وسیع، محیط کل علم پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر بات قطعی اور اٹل ہے۔ خدا قیامت کے روز کی باتیں بھی اسی طرح جانتا ہے جس طرح کل اور آج کی باتیں جانتا ہے۔ اس وجہ سے اگر کسی نے ان کو خیالی باتیں قرار دے کر ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو وہ سوچ لے کہ وہ دن دور نہیں جب وہ ایک ایک بات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور پکار اٹھے گا کہ اللہ کے رسول نے جن جن باتوں کی خبر دی تھی سب سچی ثابت ہوئیں۔

'هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'، ہدایت و رحمت کے دو لفظوں نے آغاز و انجام اور دنیا و آخرت دونوں

کو سمیٹ لیا ہے۔ یعنی یہ کتاب لوگوں کے لیے دنیا میں ہدایت ہے اور اس ہدایت کو اختیار کرنے کا ثمرہ آخرت میں رحمت ہے۔ 'یُؤْمِنُوْنَ' فعل، جیسا کہ ہم دوسرے محل میں واضح کر چکے ہیں، ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔ اس کا ترجمہ یوں کیجیے۔ 'ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں'۔

'هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ' 'تاویل' کے لفظ پر ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں، جو قرآن سنا رہا ہے، ہیں تو اٹل حقیقتیں لیکن چونکہ ابھی یہ واقعات کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئی ہیں بلکہ مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں اس وجہ سے منکرین ان کو خالی خولی دھمکی سمجھتے ہیں اور منتظر ہیں کہ یہ واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں تو ان کو دیکھ کر یقین کریں گے۔

'يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ' مطلب یہ ہے کہ جب یہ باتیں واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں گی تو آج جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ پکار اٹھیں گے کہ ہمارے رب کے رسولوں نے جن باتوں سے ہمیں آگاہ کیا تھا وہ سب حقیقت ثابت ہوئیں۔ اس وقت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ ہے کوئی سفارشی جو ہماری سفارش کرے یا ہے کوئی صورت کہ ہم دنیا میں پھر جائیں اور کچھ نیکی کمائیں! لیکن ان کی یہ حسرت حسرت ہی رہے گی اس لیے کہ نیکی کی کمائی کا وقت نکل چکا ہوگا۔ جو وقت ان کو نیکی کمانے کے لیے ملا اس میں انھوں نے بدی کمائی اور جھوٹے سفارشیوں پر تکیہ کیے رہے۔ 'قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ' زندگی کی اصلی قیمت، جیسا کہ سورۂ العصر میں واضح فرمایا ہے، یہی ہے کہ اس میں نیکی کمائی جائے۔ جس نے نیکی نہ کمائی اس کی زندگی وبال بنی اور اس نے بڑے قیمتی سرمایہ سے اپنے لیے تباہی کا سودا کیا۔ 'ضَلَّ عَنْهُمْ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے فرضی معبود سب خواب و خیال ثابت ہوں گے اس لیے کہ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ تھی ہی نہیں کہ انھوں نے اپنے جی سے گھڑ کے ان کو خدا کی طرف منسوب کر رکھا تھا کہ خدا نے ان کو اپنا شریک و شفیع بنایا ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۴-۵۸

اوپر بات شرک کی بے حقیقتی و بدانجامی پر ختم ہوئی تھی۔ آگے کی آیات میں توحید کے مضمون کی وضاحت فرما کر اس کی تکمیل کر دی کہ آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور وہ اس کائنات کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اپنے عرش حکومت پر متمکن ہو کر تمام کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ دن اور رات، سورج، چاند، ستارے اور سیارے سب اسی کے احکام کی تعمیل میں شب و روز گردش میں ہیں، جس نے خلق کیا ہے اسی کا امر و حکم تمام کائنات پر جاری ہے اور خالق کائنات کے سوا دوسرا کوئی حق دار کس طرح ہو سکتا ہے کہ خدا کی خلق کی ہوئی کائنات میں اس کا حکم چلے؟ پھر یہ کائنات اپنے وجود سے شاہد ہے

کہ اس کو خلق کرنے والی ہستی بڑی ہی بافیض اور نہایت ہی بابرکت و رحمت ہستی ہے تو سراً و علانیۃً اسی کو پکارو اور امید و بیم ہر حال میں اسی سے لو لگاؤ۔ خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک گردانا خدا سے بغاوت اور اس کی سرزمین میں فساد برپا کرنا ہے اور خدا ان لوگوں کو کبھی پسند نہیں کرتا جو اس سے سرتابی کریں اور اس کی زمین میں فساد مچائیں۔

اس کے بعد بارش کی ایک تمثیل پیش کی ہے جس سے بیک وقت تین حقیقتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ خدا کی رحمت اس کے نیکوکار بندوں سے بہت قریب ہے اس وجہ سے امید و بیم ہر حال میں خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، خدا اور اس کی رحمت کو دور سمجھ کر دوسروں کا سہارا نہیں پکڑنا چاہیے۔ یہ خدا ہی ہے جو زمین کے خشک ہو جانے اور تمھارے مایوس ہو جانے کے بعد اپنی رحمت کی گھٹائیں اٹھاتا اور تمام زمین کو جل تھل کر دیتا ہے۔

دوسری یہ کہ جس طرح تم زمین کو دیکھتے ہو کہ بالکل بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی اس کے ہر گوشے میں زندگی نمودار ہو جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا تمھارے مرکھپ جانے کے بعد تمھیں از سرِ نو زندہ اٹھا کھڑا کرے گا۔

تیسری یہ کہ جس طرح بارش کا اثر مختلف صلاحیت کی زمینوں پر مختلف شکل میں نمایاں ہوتا ہے، زرخیز زمین لہلہا اٹھتی ہے، بنجر زمین صرف خار و خس اگاتی ہے اسی طرح قرآن کی شکل میں ہدایت و رحمت کی جو بارش اس زمین پر نازل ہوئی ہے اس سے بھی مختلف صلاحیت کی طبیعتیں مختلف اثر لیں گی۔ جنھوں نے اپنی فطرت کو مسخ ہونے سے بچایا ہے وہ اس سے فیض پائیں گے اور ان کے دل نورِ ایمان سے جگمگا اٹھیں گے۔ لیکن جن کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے ان کے اندر صرف کفر و عناد کی جھاڑیاں اگیں گی۔

آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۴-۵۸

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٤﴾ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥٥﴾ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

ع ۷ ۱۴

ترجمۂ آیات ۵۴-۵۸

بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ ڈھانکتا ہے رات کو دن پر جو اس کا پوری سرگرمی سے تعاقب کرتی ہے اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کیے جو اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، عالم کا رب! اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، بے شک وہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ملک میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو اور اسی کو پکارو بیم و رجا دونوں حالتوں میں۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے۔ ۵۴-۵۶

اور وہی ہے جو اپنے ابر رحمت سے پہلے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادل کو اٹھا لیتی ہیں ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب وگیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں اور پھر ہم اس سے پیدا کرتے ہیں ہر قسم کے پھل۔ اسی طرح ہم مردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ اور زرخیز

زمین کی پیداوار تو خوب اپجتی ہے اس کے رب کے حکم سے پر جو زمین ناقص ہوتی ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی آیات مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکر گزار بننا چاہیں۔ ۵۴-۵۸

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۵۴)

جو خالق ہے وہی رب ہے

'اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اہل عرب آسمان و زمین اور تمام دوسری چیزوں کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا رکھے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا خلق کر کے اس کے انتظام و انصرام کے مختلف شعبے اپنے دوسرے کارندوں میں تقسیم کر دیے ہیں اور اب ان شعبوں کے اصلی کرتا دھرتا وہی ہیں اس وجہ سے ان کی عبادت ضروری ہے۔ وہی خدا کے قرب کا واسطہ ہیں اور رزق و فضل اور مال و اولاد کے خزانوں پر عملاً انہی کا تصرف ہے۔ اگر ان کو نہ راضی رکھا جائے تو اکیلے اللہ تعالیٰ سے کام نہیں چل سکتا۔ انہی کارندوں کو وہ ارباب، شرکاء اور شفعاء کا درجہ دیتے تھے اور گو نظری طور پر ان کی میتھالوجی میں خدا کو خالق کائنات اور رب الارباب کی حیثیت حاصل تھی لیکن عملاً ان کی ساری وابستگی رب الارباب سے نہیں بلکہ ان فرضی ارباب ہی سے رہ گئی تھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی گمراہی پر ٹوکا ہے کہ جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، وہی رب بھی ہے، جب خالق وہ ہے اور اس سے تمھیں انکار نہیں تو دوسروں کو رب کس منطق سے بنائے بیٹھے ہو۔

تخلیق کائنات میں تدریج و ارتقا کی حکمتیں

'فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ' میں ایام سے مراد یہ ہمارے چوبیس گھنٹے والے دن نہیں ہیں بلکہ اس سے خدائی دن مراد ہیں۔ خدا کی اسکیمیں اس کے اپنے دنوں کے حساب سے بروئے کار آتی ہیں جو ہمارے حساب سے، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اور پچاس ہزار سال کے برابر بھی۔ اس وجہ سے چھ دنوں سے مراد چھ ادوار ہیں۔ دنیا کا چھ ادوار میں پیدا ہونا تورات میں بھی مذکور ہے اور قرآن میں بھی۔ بلکہ جہاں تک اس کے تدریجی ارتقا کا تعلق ہے فلسفۂ جدید بھی بڑے شد و مد سے اس کا مدعی ہے۔ اس وجہ سے بجائے خود اس کائنات کا ارتقا قدیم و جدید میں متنازع فیہ نہیں ہے البتہ نظریۂ ارتقاء کی تقریر اس

کے عَلَم برداروں کی طرف سے جس انداز میں کی جاتی ہے اس میں بہت سے منطقی خلا ہیں جو اس وقت تک نہیں بھر سکتے جب تک ان عقلی و فطری اصولوں کو تسلیم نہ کیا جائے جو قرآن نے اس ارتقا کے بیان فرمائے ہیں۔ ہم انشاء اللہ اس کے محل میں اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے۔

دلائلِ توحید

اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کو چھ دنوں، یا چھ ادوار میں پیدا کرنے کے بجائے اپنے ایک کلمۂ 'کُن' سے آن کے آن میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔ یہ بات اس کی قدرت سے بعید نہیں تھی۔ لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ یہ چھ ادوار میں پیدا ہو۔ خدا نے اپنے خلق و تدبیر کے ہر شعبے میں جس طرح اپنی قدرت نمایاں فرمائی ہے اسی طرح اپنی حکمت، ربوبیت اور رحمت کی شانیں بھی نمایاں فرمائی ہیں اور اس کی ان شانوں کا نمایاں ہونا بھی انسان کے کمالِ عقلی و روحانی کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدا کے کمالِ قدرت کا نمایاں ہونا ضروری ہے۔ ہم نے سورۂ انعام کی تفسیر میں واضح کیا ہے کہ خدا کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں تھی کہ ہماری غذا کے لیے براہ راست آسمان سے روٹی برستی پھر یہ کیوں ضروری ہوا کہ ہوائیں چلیں، بادل اٹھیں، مینہ برسے، کھیتوں میں ہل چلیں، گندم بوئی جائے، انکھوے نکلیں، ڈنٹھل پیدا ہوں، اس میں برگ و بار نمایاں ہوں، فصل اپجے، خوشے نمودار ہوں، پھر ان میں دانے بیٹھیں، پھر گرم و خشک ہوائیں چلیں جو ان دانوں کو پکائیں اور اس طرح کہیں چھ مہینے کے گرم و سرد مراحل سے گزر کر گندم کا دانہ کھیت سے کسان کے کھتے تک پہنچے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اس طرح اس کائنات کی ایک ایک چیز خدا کی آیات خلق و تدبیر اور اس کے عجائبِ قدرت و حکمت کا ایک دفتر بن گئی ہے۔ انسان اس کے جس گوشے پر بھی نظر ڈالتا ہے اگر آنکھیں کھلی ہوئی اور عقل بیدار ہو تو معرفتِ الٰہی کا ایک دلبستان کھل جاتا ہے۔ ایک ایک شے نہ جانے کتنے بھیس بدلتی اور کتنے جامے تبدیل کرتی ہے تاکہ وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرے اور ہم ان کے اندر خدا کی نشانیوں کو دیکھیں اور ان سے سبق حاصل کریں۔ جو حال اس دنیا کے ذرے ذرے کا ہے وہی حال بحیثیت مجموعی اس دنیا کا ہے۔ یہ بھی ایک حادثہ کے طور پر یک بیک بن کر نہیں کھڑی ہوگئی ہے بلکہ اس کی تعمیر کرنے والے نے بڑی تدریج و حکمت اور بڑے اہتمام کے ساتھ مختلف مراحل میں اس کو تکمیل تک پہنچایا ہے یہاں تک کہ وہ انسان کے فروکش ہونے کے لیے تمام ضروری لوازم سے آراستہ ہوگئی۔ یہ اہتمام و تدریج شاہد ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ یا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ ایک باغایت و بامقصد کارخانہ ہے اور ضرور ہے کہ ایک دن وہ غایت و مقصد ظہور میں آئے۔ اس نکتہ پر مفصل بحث ہم سورۂ ہود کی آیت ۷ کے تحت کریں گے جہاں اسی اہتمام کے پہلو سے جزا و سزا پر استدلال کیا ہے۔

تخلیقِ کائنات میں جو اہتمام ہے اس کا بدیہی نتیجہ

'ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ' یہ اس شان و اہتمام کے ساتھ آسمان و زمین کو پیدا کرنے کا ایک بدیہی نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جس نے یہ سارا کارخانہ اس تدریج و اہتمام کے ساتھ بنایا سنوارا کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس کو پیدا کر کے اس کی تدبیر و انتظام سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں جا بیٹھے۔ اس خلق کا بدیہی تقاضا یہ

ہے کہ وہ اس کو پیدا کرنے کے بعد اس کے تحت حکومت پر متمکن ہو کر اس کے تمام امور و معاملات کا انتظام بھی فرمائے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بعض جگہ 'استوٰی علی العرش' کے ساتھ 'یُدَبِّرُ الْاَمْرَ' بھی آیا ہے۔ خدا خلق تو کرے لیکن پھر اس کا انتظام نہ کرے یہ خدا پر نہایت ہی سفیہانہ تہمت ہے۔ ایک بادشاہ اگر بڑے اہتمام سے ملک حاصل کرے لیکن ملک حاصل کر کے کسی گوشے میں جا بیٹھے، اس میں امن و عدل کا اہتمام نہ کرے، مفسدین اس میں دھاندلی مچاتے پھریں تو ساری خلق اس کو نالائق بادشاہ کہے گی، پھر ایک معمولی بادشاہ کے لیے جو بات عیب میں داخل ہے آسمان و زمین کے خالق و مالک کے لیے وہ بات کس طرح باور کی جا سکتی ہے؟ یہ مشرکین کے اس مزعومہ کی تردید ہے کہ خدا خالق تو ہے لیکن آسمان و زمین کو خلق کر کے اس نے عالم کا انتظام و انصرام اپنے دوسرے شرکاء کے حوالے کر دیا ہے اور خود الگ تھلگ جا بیٹھا ہے۔ ساتھ ہی یہ ان کم سواد فلسفیوں کی بھی تردید ہے جو خدا کو صرف ایک گوشہ نشین علت العلل کا درجہ دیتے ہیں جس نے محرک اول کی حیثیت سے ایک حرکت تو پیدا کر دی لیکن پھر اس کو اس سے کچھ بحث نہیں رہی کہ اس کی اس حرکت کے کیا نتائج نکلتے ہیں اور اس کو کنٹرول کرنا کس کی ذمہ داری ہے؛ فرمایا کہ خدا کائنات کو پیدا کر کے عرش پر متمکن ہے اور کائنات کا انتظام فرما رہا ہے۔ عرش اقتدار کی تعبیر ہے اور 'استوٰی' کے بعد جب 'علیٰ' آتا ہے تو اس کے معنی تمکن کے ہو جاتے ہیں۔

'یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا'۔ 'حثیث' اور 'حثوث' کے معنی تیز اور سرگرم کے ہیں۔ یہ اس تدبیر و انتظام کی وضاحت ہو رہی ہے جو 'اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ' کے اندر مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نظام کائنات میں جو حرکت بھی ہو رہی ہے سب اس کے خالق ہی کی تدبیر و انتظام سے ہو رہی ہے۔ وہی ہے جو رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور اسی کے حکم سے اس سرگرمی سے وہ اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ 'وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ' وہی ہے جس نے سورج اور چاند اور دوسرے تمام نجوم و کواکب پیدا کیے۔ 'مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ' یعنی وہ اپنے اپنے معینہ فرائض اور اپنے اپنے معینہ حدود و قیود کے خدا کے حکم سے پابند ہیں اور پوری سرگرمی کے ساتھ شب و روز اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ ایک پل کے لیے بھی غافل ہوں یا بال برابر بھی اپنے حدود سے متجاوز۔

جو خالق ہے اسی کو حکومت کا حق ہے

'اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ' بیان واقعہ بھی ہے اور اظہار حق بھی۔ یعنی جس نے یہ کائنات خلق کی ہے اسی کا امر و حکم اس کے گوشہ گوشہ میں جاری ہے، ذرہ ذرہ شب و روز اسی کے احکام کی تعمیل میں پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم کار ہے اور یہی حق بھی ہے کہ اسی کا امر و حکم اس کے ہر گوشے میں چلے اس لیے کہ جس نے خلق کیا ہے اس کے سوا کسی اور کا حکم اس میں چل کس استحقاق کی بنا پر سکتا ہے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ 'حَثِیْثًا' کے لفظ سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ ہر چیز پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دے رہی ہے، کسی چیز سے بھی نیم دلی یا سرد مہری کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ

اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان کے لیے بھی خدا کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے یہی رویہ زیبا ہے کہ وہ اس کی بندگی اور اطاعت میں اسی طرح سرگرم ہو۔ دوسری بات یہ قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں رات کی سرگرمی کا ذکر تو فرمایا لیکن دن کی سرگرمی کا ذکر نہیں فرمایا دراں حالیکہ دوسرے مقام میں رات کے ساتھ دن کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۶۲۔ الفرقان' اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں رات کے ذکر کے بعد سورج کا ذکر آگیا ہے جس سے متقابل پہلو خود بخود واضح ہو گیا۔

خدا اپنے جلال اور رحمت دونوں میں یکتا ہے

تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ، 'تفاعل' میں غایت درجہ مبالغہ کا مضمون پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے 'تَبٰرَكَ اللّٰهُ' کے معنی ہوں گے، بڑی ہی برکت و رحمت والی ہستی ہے اللہ۔ اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنے خلق و تدبیر کی جو شانیں واضح فرمائی ہیں ان سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جس طرح خدا کی قدرت و عظمت کا اظہار ہو رہا ہے اسی طرح اس کی رحمت و ربوبیت، اس کے جود و نوال اور اس کی کرم نوازی و فیض بخشی کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ یہ خدا کے باب میں اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جس میں مشرک قومیں بالعموم مبتلا ہوئیں کہ انھوں نے خدا کی عظمت و جبروت کا تصور اس قدر بڑھایا کہ اس کی صفات رحمت و برکت کا تصور اس کے نیچے بالکل دب کر رہ گیا۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بندوں کے لیے خدا سے براہِ راست تعلق و توسل ناممکن سمجھ لیا گیا اور پھر ایسے وسائل و وسایط کی تلاش ہوئی جو خدا سے مقصد برآری کا ذریعہ بن سکیں۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ صفاتِ الٰہی کے باب میں یہ گمراہی شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ مشرکین نے بہت سے فرضی معبودوں کی پرستش، بالخصوص ملائکہ کی پرستش، اسی وجہ سے کرنی شروع کی کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، یہ ہم سے راضی رہیں تو یہ اپنے باپ کو ہم سے راضی رکھیں گی اور پھر سارا جہان ہم پر مہربان ہو جائے گا۔ قرآن نے یہاں 'تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ' کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کائنات جس طرح اپنے خالق کی بے پایاں عظمت و جبروت پر شاہد ہے اسی طرح اس کی بے پایاں برکت و رحمت پر بھی گواہ ہے تو اس سے مانگنے کے لیے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں۔ خوف اور طمع، امید اور بیم ہر حال میں اسی کو پکارو اور اسی سے مانگو، جس طرح وہ اپنے جلال میں یکتا ہے اسی طرح اپنی رحمت میں بھی یکتا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۚ﴿۵۵﴾ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۵۵-۵۶)

خدا سے دعا کے آداب

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً۔ 'تَضَرُّع'، 'ضَرَاعَت' سے ہے۔ اس کے معنی عاجزی، خوشامد، لجاجت، تملق کے اظہار کے ہیں۔ یہ اظہار حرکات اور اداؤں سے بھی ہوتا ہے اور الفاظ و عبارات سے بھی۔ اس کی سب سے زیادہ موثر شکل وہ ہوتی ہے جب یہ الفاظ و حرکات دونوں میں کامل ہم آہنگی کے ساتھ نمایاں ہو جس کی بہترین شکل اسلام میں نماز ہے۔ باوضو ہو کر مودب کھڑا ہونا، ہاتھ باندھ لینا، سر نہیوڑا

دینا، گھٹنے ٹیک دینا، ناک اور پیشانی خاک پر رکھ دینا، یہ تضرع کی حرکات اور ادائیں ہیں اور ان مختلف حرکات اور اداؤں کے ساتھ جو دعائیں اور تسبیحات پڑھی جاتی ہیں یہ سب اسی تضرع کی معنوی تعبیریں ہیں۔

'خُفْیَۃً' کے معنی 'چپکے' کے ہیں۔ یہ تضرع کے آداب میں سے ہے جو تضرع کے اخلاص کا بھی ضامن ہے اور اس کے وقار کا بھی۔ جو کام چپکے چپکے کیا جاتا ہے وہ ریا کے فتنہ سے محفوظ ہوتا ہے اور خدا چونکہ ہر چیز سنتا اور جانتا ہے اس وجہ سے اس کو سنانے اور اس سے فریاد کرنے کے لیے چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'خفیۃ' کا لفظ صرف ریا اور سوءِ ادب کے سدباب کے لیے ہے۔ اس سے اس جہر کی نفی نہیں ہوتی جو جماعتی دعاؤں یا بعض اوقات بندہ اپنی انفرادی مناجاتوں میں اختیار کرتا ہے۔ یہ جہر کی نفی نہیں بلکہ صرف اعتدال کی تاکید ہے۔ اس مضمون کی وضاحت انشاء اللہ بنی اسرائیل کی آیت 'وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا ۱۱۰' کے تحت آئے گی۔

انسان کو نظامِ کائنات کا درس

الفاظ کی وضاحت کے بعد اب آیت کے موقع و محل اور اس کے مفہوم پر غور فرمائیے۔ اوپر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا ہی آسمان و زمین کا خالق ہے، اسی کے حکم سے ستارے اور سیارے گردش کر رہے ہیں، خلق اور امر سب اسی کے اختیار میں ہے اور وہ بڑی ہی بافیض و بابرکت ہستی ہے۔ اب یہ 'اُدْعُوْا رَبَّكُمْ' سے وہ حق اور فرض بیان ہو رہا ہے جو اس رب عظیم و کریم کا بندوں پر عاید ہوتا ہے۔ وہ حق و فرض یہ ہے کہ اپنے اسی رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یعنی یہ استکبار اور یہ رعونت جس کا اظہار تمہاری طرف سے ہو رہا ہے یہ روش تمہارے لیے زیبا نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز خدا کے آگے سرِافگندہ و سرنگوں اور اس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم تگاپو ہے تو تمہاری کیا ہستی ہے کہ خدا کے آگے اکڑو اور سر اٹھاؤ۔ 'اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ'۔ خدا ان لوگوں کو کبھی پسند نہیں کرتا جو اس کے حدود سے تجاوز کریں۔ یہ نظامِ کائنات شاہد ہے کہ وہ کسی چیز کو اس کے حدود سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا اور اس دنیا کی تاریخ بھی شاہد ہے کہ اس نے کبھی اکڑنے والوں اور حدود سے تجاوز کرنے والوں کو ایک حد خاص سے زیادہ مہلت نہیں دی۔

تکوینی توحید کی طرح تشریعی توحید بھی لازمی ہے

'وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا' یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید و توثیق منفی پہلو سے ہے۔ یعنی اپنے رب سے انحراف اختیار کر کے اس زمین میں فساد برپا نہ کرو۔ قرآن میں مختلف پہلوؤں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کچھ اور الٰہ ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے، یہ تو قائم ہی اس بنا پر ہیں کہ ان کے اندر اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور ارادے کی کارفرمائی نہیں ہے۔ اس تکوینی توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے اپنے دائرہ اختیار میں بھی صرف اسی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت و اطاعت کریں، کسی اور کو اس عبادت و اطاعت میں شریک نہ بنائیں ورنہ اس زمین کا سارا نظام عدل و شریعت درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کائنات کے قیام و بقا کے لیے جس طرح تکوینی توحید ناگزیر ہے اسی طرح اس

زمین کے امن و عدل کے لیے خدا کی تشریعی توحید بھی لازمی ہے۔ خدا کے ملک میں کسی اور کو الٰہ و معبود بنانا اس کے ملک میں فساد و بغاوت برپا کرنا ہے جس سے بڑا کوئی اور جرم نہیں۔

'لَا تُفْسِدُوا' کے ساتھ 'بَعْدَ اِصْلَاحِهَا' کی قید اس فعل کی شناعت کے اظہار کے لیے ہے۔ یعنی ملک میں فساد پیدا کرنا بجائے خود سب سے بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم سنگین سے سنگین تر ہو جاتا ہے جب یہ اصلاح کے بعد واقع ہو اس لیے کہ یہ بگڑی ہوئی چیز کو بگاڑنا نہیں بلکہ بنی ہوئی چیز کو بگاڑنا ہوا۔

کائنات کے صلاح و فساد کی بنیاد

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خالقِ کائنات نے جب اس دنیا کو بنایا تو اس کو بنا کر یوں ہی انتشار اور بدامنی کے حال میں چھوڑ نہیں دیا بلکہ آدم اور ان کی ذریت کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی ان سے توحید یعنی اپنی ہی عبادت اور اپنی ہی اطاعت کا اقرار لیا۔ اس کا ذکر اسی سورہ کی آیات ۱۷۲، ۱۷۳ میں آگے آ رہا ہے۔ پھر ذریت آدم سے، جیسا کہ آیت ۳۵-۳۶ میں گزرا، یہ وعدہ فرمایا کہ تمھاری ہدایت کے لیے میں اپنے رسول بھیجوں گا، تم ان کی پیروی کرنا، جو ان کی پیروی کریں گے وہ فلاح پائیں گے، جو تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گے وہ ہلاک ہوں گے۔ پھر اپنے اس وعدے کے بموجب اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے رسول بھیجے جن کی تفصیل آگے آیت ۵۹ سے آیت ۹۲ تک آ رہی ہے۔ ان رسولوں کی سرگزشت ہیں، جیسا کہ آیات ۶۹، ۷۴، ۸۵، ۱۰۰، ۱۰۲ سے واضح ہو گا، یہ دکھایا ہے کہ اولادِ آدم کے مختلف گروہوں نے جب جب اللہ کی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر اس دنیا میں فساد برپا کیا ہے خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان کو انذار کیا ہے اور جب انھوں نے اس انذار کی پروا نہیں کی ہے تو خدا نے ان کی جڑ کاٹ دی ہے اور ان کی خلافت دوسروں کو سونپی ہے کہ دیکھے وہ اس خلافت کا حق کس طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ دنیا بار بار شیطان اور اس کی ذریات کی کوششوں سے بگڑی ہے اور بار بار انبیا و مصلحین کے ذریعہ سے اس کی اصلاح ہوئی ہے۔ اس پہلو سے معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس دنیا میں جس قوم کو بھی اپنے پچھلوں کی خلافت ملی ہے ایک فساد کو مٹا کر اس کی اصلاح کی شکل میں ملی ہے اور اگر خلافت پانے والی قوم نے خلافت پا کر اس میں فساد برپا کیا ہے تو یہ اس نے ایک بگڑی ہوئی چیز کو نہیں بگاڑا ہے بلکہ ایک بنی ہوئی چیز کو بگاڑا ہے اور یہ چیز اس کے جرم کو سنگین سے سنگین تر بنا دیتی ہے۔

اجتماعی مصلحین کا ایک مغالطہ

جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے ان کے اور ان کی امتوں کے باب میں مذکورہ بالا اصول بالکل اٹل ہے ان کے ذریعہ سے حق سورج کی طرح چمکتا ہوا نمایاں ہوتا ہے اس وجہ سے ان کے ہاتھوں جو نظام مٹتا ہے وہ باطل ہوتا ہے، جو قائم ہوتا ہے وہ حق ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آج قوموں کے عروج و زوال کے معاملے میں قدرت کا قانون بدل گیا۔ آج بھی اگر کوئی قوم مٹتی ہے تو اتفاق سے نہیں مٹتی اور اگر کوئی قوم عروج پر آتی ہے تو اتفاق سے نہیں آ جاتی بلکہ ایک کے زوال اور دوسرے کے عروج میں اصلاً اخلاقی عوامل ہی کام کرتے ہیں لیکن کسی قوم کا چند زندگی بخش عوامل

اخلاقی کے سہارے عروج پر آجانا ایک اور چیز ہے اور کسی نظام کا حق ہونا ایک دوسری چیز۔ کسی قوم کا عروج اس بات کی دلیل تو ضرور ہے کہ اس کے اندر مغلوب و مفتوح قوم کے مقابل میں زندگی بخش عوامل اخلاقی زیادہ ہیں لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ یہ قوم اور اس کا نظام سو فی صد حق ہے۔ ہمارے بہت سے اجتماعی مصلحین کو یہ اصول سمجھنے میں سخت مغالطہ پیش آیا ہے جس کے سبب سے وہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ جو لوگ قومی تعصب میں مبتلا رہے انھوں نے ہمیشہ غالب قوم کے غلبہ کو اس کی چیرہ دستی اور کیادی پر محمول کیا، وہ اپنے تعصب کے سبب سے نہ تو اس اخلاقی برتری کو دیکھ سکے جو غالب قوم کے اندر موجود تھی اور نہ اس اخلاقی ضعف پر ان کی نظر پڑی جو ان کے اپنے اندر پایا جاتا تھا۔ اسی طرح جو لوگ مرعوب ذہن کے تھے انھوں نے ہر غالب کے غلبہ کو اس کے برحق ہونے کی دلیل سمجھا اور اس کے ہاتھوں جو فساد و باطل بھی دنیا میں برپا ہو گیا اسی کو نظامِ حق سمجھ کر اس کے گن گانے لگے۔ اس افراط و تفریط کا اثر قوموں کی تاریخ پر یہ پڑا کہ وہ بالکل غلط طریقہ پر مرتب ہو گئی جس سے صحیح نتائج نکالنا اور ان سے اجتماعی اصلاح میں فائدہ اٹھانا ناممکن ہو گیا۔ یہاں ہم اس اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔ انشاء اللہ سورۂ روم کی تفسیر میں ہم اس پر شرح و بسط سے بحث کریں گے۔

امید اور بیم دونوں میں مرجع خدا ہی ہے

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ یہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً کا متقابل جملہ ہے۔ اس میں خدا کو پکارنے کی ہیئت بتائی تھی جو استکبار کی ضد ہے۔ اب یہ خدا کے پکارنے کے محرک کی وضاحت فرمائی جس سے شرک کے ہر جرثومہ کی جڑ کٹ گئی ہے۔ استکبار خدا سے بے پروا کرتا ہے۔ اگر اس کا سر کچل جائے تو انسان کے اندر فقر پیدا ہوتا ہے اور یہ فقر بندے کو خدا سے جوڑتا ہے۔ اس فقر کے دو پہلو ہیں۔ ایک خوف، دوسرا طمع، اپنے لفظوں میں ان کو امید و بیم سے تعبیر کر لیجیے۔ انسان کے اندرونی داعیات بھی انہی دو قسموں میں منقسم ہیں اور اس کے خارجی عوامل و محرکات کا بھی تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی یا تو بیم کے تحت آتے ہیں یا امید کے تحت۔ ہم بہت سی چیزیں، مادی اور معنوی دونوں قسم کی، چاہتے ہیں، ان کے ارمان رکھتے ہیں، ان کے آرزومند ہیں، اسی طرح بہت سی چیزیں ہیں، مادی اور معنوی دونوں قسم کی، جن سے گریز کرنا چاہتے ہیں، جن سے اندیشہ رکھتے ہیں، جن کو دفع کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن ان دونوں ہی حالتوں کے لیے توحید کا تقاضا یہ بتاتا ہے کہ انسان صرف اللہ ہی کو اپنا مرجع و مولیٰ بنائے۔ جو کچھ چاہے اس کے لیے بھی خدا ہی سے رجوع کرے، جن سے اندیشہ محسوس کرے اس سے بچنے کے لیے بھی خدا ہی کی پناہ ڈھونڈے، اس لیے کہ دینے والا بھی وہی ہے، روکنے والا بھی وہی ہے، اس کے سوا نہ کوئی کسی خیر سے بہرہ مند کر سکتا، نہ کسی شر سے بچا سکتا۔ نیز خیر و شر کی معرفت کا حقیقی معیار بھی وہی ہے، امید و بیم دونوں میں اگر خدا ہی مرجع ہو اور اسی کی مرضی مطلوب ہو تو انسان کو یہ معین کرنے میں دشواری پیش نہیں آسکتی کہ کیا چیز چاہنے کی ہے اور اسے کس طرح چاہنا چاہیے اور کیا چیز بچنے کی ہے اور اس سے

کس طرح بچنا چاہیے ۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ خوف اور طمع یہ دونوں ہی گھاٹیاں بڑی خطرناک ہیں ۔ شیطان ان دونوں ہی سے انسان پر شب خون مارتا ہے اور کسی نہ کسی شرک جلی یا خفی میں لوگوں کو مبتلا کر کے رہتا ہے۔

حقیقی خوب کار

'اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ' کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ اپنی امید و بیم دونوں کا مرجع اپنے رب کو بنا لیں وہ درحقیقت محسن یعنی خوب کار ہیں اور اللہ کی رحمت ایسے خوب کاروں سے بہت قریب ہے ۔ معلوم ہوا کہ مقام احسان پر فائز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بیم و رجا دونوں حالتوں میں اپنے رب کی طرف یکسو ہو۔ اگر یہ یکسوئی حاصل نہ ہو تو وہ مقام احسان سے دور ہے اور جو مقام احسان سے دور ہے وہ خدا کی رحمت سے بھی دور ہے ۔ خدا کی رحمت قریب محسنین سے ہے ۔ وہ جب کسی امید یا بیم میں اس کو پکارتے ہیں وہ اپنی رحمت سے ان کو بہرہ مند فرماتا ہے ۔ یہاں زبان کا یہ قاعدہ ملحوظ رہے کہ لفظ رحمت کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے اس وجہ سے خبر کو مؤنث لانا ضروری نہیں ہوا ۔ نیز فعیل کا وزن بعض حالات میں مذکر و مونث دونوں کے لیے یکساں آتا ہے ۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ (۵۷-۵۸)

امید و بیم دونوں میں خدا ہی کو مرجع بنانے کی تمثیل بارش سے

'وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ' 'رَحْمَت' سے مراد یہاں بارش ہے ۔ قرآن میں بارش کے لیے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال ہوا ہے ۔ یہ تمثیل ہے اس بات کی کہ خوف و طمع دونوں ہی حالتوں میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے اس لیے کہ رحمت ہمیشہ اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتی ہے ۔ بارش، جس پر تمام دنیا کی زندگی کا انحصار ہے، ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایک قطرہ اس کا اس زمین پر ٹپکا دے ، یہ خدا ہی ہے جو پہلے مانسون لانے والی ہوائیں چلاتا ہے جو بوجھل بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیتی ہیں، پھر خدا ان کو بے آب و گیاہ علاقوں کی طرف ہانک دیتا ہے اور وہاں ان سے پانی برسا دیتا ہے جس سے ہر قسم کے پھل اور ہر قسم کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں ۔ دوسری جگہ فرمایا ہے 'وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۲۸ - شوریٰ (اور وہی ہے جو بارش اتارتا ہے بعد اس کے کہ لوگ مایوس ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے) 'حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ' ۔ 'اقلال' کے معنی کسی چیز کو اس طرح اٹھا لینا ہے گویا اس میں کوئی وزن ہے ہی نہیں ۔ 'سَحَاب' 'سَحَابَة' کی جمع ہے لیکن صورۃً واحد ہے اسی وجہ سے لفظ کے لحاظ سے 'سُقْنٰهُ' میں ضمیر اس کے لیے واحد لائے، 'فَاَنْزَلْنَا بِهِ' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے ۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دیکھو کس طرح ہوائیں بوجھل بادلوں

کو اُٹھا لیتی ہیں گویا وہ روئی کے گالے ہیں اور پھر یہ ہم ہی ہیں کہ جدھر چاہتے ہیں ان کو ہانک کرلے جاتے ہیں اور جس جگہ چاہتے ہیں جل تھل کر دیتے ہیں، کسی کی طاقت نہیں کہ ان کو اپنے پسند کردہ رخ پر موڑ سکے۔ پس امید و بیم ہر حال میں اسی سے لو لگاؤ، اس کے سوا کوئی اور مصرف اس کائنات میں نہیں ہے۔

قیامت کی یاد دہانی بارش کی تمثیل سے

'کَذٰلِکَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ' یہ اسی بارش کی تمثیل سے ایک اور حقیقت کی طرف توجہ دلادی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش بھیج کر ایک بالکل مردہ اور بے آب و گیاہ زمین کو ہم از سر نو زندہ کر دیتے ہیں اسی طرح ایک دن ہم تمام مُردوں کو زندہ کر دیں گے۔ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں روز دیکھ رہے ہو، مُردوں کو زندہ کر دینا اس کی قدرت سے کیوں بعید سمجھتے ہو؟ ہم نے تو یہ نشانیاں اس زمین میں نمایاں کی ہی اس لیے ہیں کہ ان آثار سے تم آخرت کے لیے یاد دہانی حاصل کرو۔ 'لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ' میں غایت بیان ہوئی ہے اس توجہ دہانی کی جو 'کَذٰلِکَ' کے اشارے میں مضمر ہے۔

'وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'طیب' اور 'خبیث' کے الفاظ جس طرح معنوی و اخلاقی اعتبار سے خبیث و طیب کے لیے آتے ہیں اسی طرح مادی اعتبار سے خبیث و طیب کے لیے بھی آتے ہیں۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ 'بَلَدٌ طَیِّبٌ' سے مراد زرخیز اور ذی صلاحیت زمین اور 'وَالَّذِیْ خَبُثَ' سے بنجر اور شور زمین ہے۔ پھر اس میں تقابل کے اصول پر جملہ کے پہلے حصہ میں 'نَکِدًا' کا مقابل لفظ محذوف ہے۔ 'نَکِدًا' کے معنی ناقص اور قلیل کے ہیں اس وجہ سے جملہ کے پہلے حصہ میں طیب اور کثیر کا مضمون محذوف ہے۔

مذکورہ تمثیل سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ

اب دیکھیے اسی بارش کی تمثیل سے ایک تیسری حقیقت کی طرف توجہ دلادی کہ خدا کا ابر کرم تو خشک و تر ہر جگہ یکساں برستا ہے لیکن فیض بقدر استعداد پہنچتا ہے۔ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش ہوتی ہے تو زرخیز زمین لہلہا اٹھتی ہے لیکن بنجر اور شور زمین یا تو کچھ اگاتی ہی نہیں یا اگاتی ہے تو بس یوں ہی کچھ خار و خس۔ اسی طرح قرآن کی صورت میں جو رحمت آسمان سے برسی ہے اس کا فیض بھی ہر شخص کو یکساں نہیں پہنچے گا بلکہ استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے پہنچے گا۔ جن کی فطری صلاحیتیں زندہ ہیں وہ تو باغ و چمن کی طرح لہلہا اٹھیں گے لیکن جنھوں نے اپنی صلاحیتیں ضائع کر دی ہیں ان سے عناد و عداوت کے خار و خس کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ رکھو۔ یہی حقیقت ایک حدیث میں اس طرح واضح کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم و ہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی تمثیل یہ ہے کہ کسی خطۂ زمین پر بارش ہو تو جو ٹکڑا زرخیز ہوتا ہے وہ پانی کو قبول کر لیتا ہے اور خوب سبزہ اور نباتات اگاتا ہے۔ اسی طرح کوئی ٹکڑا ہوتا ہے جو پانی کو روک لیتا ہے تو اللہ اس سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، لوگ اس سے پیتے ہیں، کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں اور اپنی فصلیں بوتے ہیں۔ اسی طرح کوئی ٹکڑا ہوتا ہے جو محض چٹیل ہوتا ہے، نہ پانی کو روکتا نہ سبزہ اگاتا، یہ تمثیل ہے ان لوگوں کی جو دین کی سمجھ حاصل کریں اور

ان کو نفع پہنچے اس چیز سے جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے، پس وہ سیکھیں اور سکھائیں اور ان لوگوں کی جو اس کی طرف توجہ نہ کریں اور اس ہدایت کو قبول نہ کریں جس کو لے کر میں آیا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

دیکھا آپ نے، ایک ہی بارش کی تمثیل سے کتنے حقائق آشکارا ہو گئے! توحید کی دلیل بھی سامنے آ گئی، امکان معاد اور وقوع قیامت کی نظیر بھی مل گئی اور ہدایت و ضلالت کے باب میں جو سنت اللہ مقرر ہے وہ بھی نمایاں ہو گئی۔ گویا سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو مسائل زیر بحث آئے تھے اصولاً وہ سب ہی بے نقاب ہو گئے۔ ہم کہیں ذکر کر آئے ہیں کہ یہ کائنات پروردگار نے بنائی ہی ایسی شکل میں ہے کہ اگر انسان دیدۂ بینا رکھتا ہو تو پتا پتا، بوٹا بوٹا ان حقائق کی شہادت دے رہا ہے جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے لیکن دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان کہاں ہیں!!

'كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ'۔ 'تصریف' کے معنی گردش دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وہی لفظ یہاں قرآن نے آیات کے لیے استعمال فرمایا ہے۔ جس طرح ہواؤں کی گردش سے اس کائنات میں قدرت و حکمت اور رحمت و نقمت کے گوناگوں پہلو ظہور میں آتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے سے اپنی نشانیاں گوناگوں پہلوؤں سے نمایاں کرتا ہے تاکہ لوگ ان کو سمجھیں، پہچانیں اور ان کی قدر کریں۔ 'لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تصریف آیات، بہت بڑا احسان ہے بشرطیکہ اس کی قدر کرنے والے لوگ ہوں۔ لفظ 'شکر' کی اصل حقیقت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ قدر دانی ہے۔ اسی قدر دانی پر ہر نعمت کی افادیت کا انحصار ہے۔ اگر یہ قدر دانی موجود نہ ہو تو جس طرح بھینس کے آگے بین بجانا لاحاصل اسی طرح ایسے بیلوں کے آگے ایک پھول کے سو سو رنگ سے مضمون باندھنا لاحاصل!

۱۰- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۹-۹۳

اب آگے وہی انداز کا مضمون، جو اوپر سے چلا آ رہا ہے، تاریخی دلائل سے واضح کیا گیا ہے اور عرب کی پچھلی قوموں میں سے ایک ایک کو لے کر دکھایا ہے کہ کس طرح اللہ نے ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا لیکن انھوں نے اقتدار پا کر ناشکری کی روش اختیار کی، زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا کیا، عدل و قسط کو درہم برہم کیا، بالآخر اللہ نے ان کے اندر اپنا رسول بھیجا جس نے ان کو توحید اور عدل و قسط کے قیام کی دعوت دی لیکن انھوں نے اپنے غرور اور گھمنڈ کے سبب سے نہ صرف یہ کہ رسول کی بات مانی نہیں بلکہ اس کے درپئے آزار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اس قوم کو تباہ کر دیا۔ قریش کو یہ ساری تاریخ سنانے سے مقصود یہ ہے کہ اب ان کا معاملہ بھی اسی عدالت میں ہے جس میں ان تمام قوموں کے مقدمے پیش ہو کر فیصل ہوئے اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر انھوں نے

بھی وہی روش اختیار کی جو ان قوموں نے اختیار کی تو اس بے لاگ عدالت کا فیصلہ ان کے لیے کچھ مختلف ہو۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہے۔ خدا جب کسی قوم میں اپنا رسول بھیج دیتا ہے تو اس قوم کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں یا تو وہ اصلاح قبول کرے یا ہلاکت، اس کے سوا کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی۔

یہ واضح رہے کہ آگے جن قوموں کی سرگزشتیں آ رہی ہیں اہل عرب ان سے واقف تھے لیکن یہ واقفیت دھندلی دھندلی مبہم روایات کی شکل میں تھی، خاص کر ان کا اخلاقی پہلو تو بالکل ہی مبہم تھا۔ قرآن نے یہ ابہام کا پردہ اٹھا کر تاریخ کو از سر نو زندہ کیا اور ان کو دعوت دی کہ کان کھول کر ان سرگزشتوں کو سنیں اور ان سے عبرت حاصل کریں، یہ دوسروں ہی کی حکایت نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کی اپنی حکایت بھی ہے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۹-۹۳

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ ع ۱۵ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ
جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ
جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ
فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ
وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ
رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ۭ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَاۗءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ
وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ
مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ
قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَاِلٰى

۹ ع ۱۶

ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ

وقف لازم

اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ
اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ
بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ
الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾
قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ
اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا

بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ
وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾
فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى
عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ
لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ
مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ
شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ
جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ
يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ
الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا
فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾
وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ
وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ

ع ۱۰ ۱۲ ۱۷

مِنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿٨٧﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ﴿٨٨﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُم بَعْدَ إِذْ نَجَّانَا اللَّهُ مِنْهَا ۚ وَمَا يَكُونُ لَنَا أَن نَّعُودَ فِيهَا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا ۚ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ﴿٨٩﴾ وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ ﴿٩٠﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٩١﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَاسِرِينَ ﴿٩٢﴾ فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۖ فَكَيْفَ آسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿٩٣﴾

الجزء ۹ — مع — ۱۱ ع ۹ ۱

ترجمۂ آیات ۵۹-۹۳

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، اس نے ان کو دعوت دی اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں۔ میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کے تسلط سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے بڑوں نے جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ اس نے کہا۔ اے میرے ہم قومو، مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے بلکہ میں تمام عالم کے رب کا رسول ہوں، تمھیں اپنے

رب کے پیغام پہنچا رہا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کر رہا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تمھیں یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی یاد دہانی تمھیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے آئی تاکہ وہ تمھیں باخبر کرے اور تاکہ تم ڈرو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے! پس ان لوگوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ کشتی میں اس کے ساتھ تھے ان کو نجات دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔ بیشک یہ لوگ اندھے تھے۔ ۵۹-۶۴

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی اور معبود نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں ؟ اس کی قوم کے بڑوں نے، جنھوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم تم کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔ اس نے کہا اے میرے ہم قومو! مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں خداوند عالم کا رسول ہوں۔ تمھیں اپنے رب کے پیام پہنچا رہا ہوں اور تمھارا دیانت دار ناصح ہوں۔ کیا تمھیں یہ بات عجیب لگی کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی یاد دہانی تمھی میں سے ایک شخص کے واسطہ سے پہنچی تاکہ وہ تمھیں ہوشیار کرے۔ اور یاد کرو جب کہ اس نے تمھیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا اور جسمانی اعتبار سے تمھیں وسعت و کشادگی عطا فرمائی تو اللہ کی شانوں کو یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ بیٹھیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ؟ تو تم جس عذاب کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو اس کو لاؤ اگر تم سچے ہو۔

اس نے کہا تم پر تمھارے رب کی جانب سے ناپاکی اور قہر مسلط ہو چکے ہیں۔ کیا تم مجھ سے کچھ فرضی ناموں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ جن کی خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری! سو تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ پس ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے اپنے فضل سے نجات دی اور ان لوگوں کی ہم نے جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور یہ ایمان لانے والے لوگ نہیں تھے۔ ۶۵-۷۲

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے ایک واضح نشانی آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے کہ تمھارے لیے ایک نشانی ہو پس اس کو چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی زمین میں چرے پھرے اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچائیو ورنہ تمھیں ایک دردناک عذاب آ پکڑے گا۔ اور یاد کرو جب کہ خدا نے قوم عاد کے بعد تم کو ان کا جانشین بنایا اور ملک میں تم کو تمکن بخشا، تم اس کے میدانوں میں محل تعمیر کرتے اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو تو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور ملک میں اودھم مچاتے نہ پھرو۔ اس کی قوم کے ان بڑوں نے جنھوں نے گھمنڈ کیا، ان زیردستوں سے کہا جو ان میں سے ایمان لائے، کیا تم سمجھتے ہو کہ صالح اپنے رب کا فرستادہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو اس پیام پر جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں ایمان رکھتے ہیں۔ منکروں نے کہا کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور بولے کہ اے صالح، اگر تم خدا

کے فرستادہ ہو تو وہ عذاب ہم پر لاؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو۔ پس ان کو کپکپی نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ تو وہ ان کو چھوڑ کر یہ کہہ کر چل دیا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں نے تمھیں اپنے رب کا پیام پہنچا دیا اور تمھاری خیر خواہی کر دی لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔ ۷۳-۷۹

اور ہم نے لوط کو بھیجا۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو! تم سے پہلے دنیا کے کسی نے بھی اس کا ارتکاب نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ بڑی ہی اوندھی عقل کے بلکہ حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ اس پر اس کی قوم والوں نے جواب دیا تو یہ دیا کہ ان کو اپنی بستی سے نکالو، یہ بڑے پارسا بنتے ہیں۔ تو ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو، اس کی بیوی کے سوا جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی، نجات دی اور ان پر اچھی طرح پتھراؤ کر دیا تو دیکھو، مجرموں کا کیا انجام ہوا۔ ۸۰-۸۴

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی تمھارا معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح حجت آچکی ہے تو ناپ تول پوری کرو، لوگوں کی چیزوں میں کوئی کمی نہ کرو اور زمین میں، اس کی اصلاح کے بعد، فساد نہ برپا کرو۔ یہی تمھارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ اور ہر راہ میں دھمکیاں دیتے، اہل ایمان کو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس راہ کو کج کرتے نہ بیٹھو۔ یاد کرو جب کہ تم تھوڑے تھے تو تم کو خدا نے زیادہ کیا اور دیکھو فساد برپا کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا! اور جب کہ

تم میں سے ایک گروہ اس چیز پر ایمان لایا ہے جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا ہے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ فرما دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور اس کی قوم کے بڑوں نے، جنھوں نے تکبر کیا، کہا کہ اے شعیب، ہم تم کو اور جو تمھارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال کے رہیں گے یا تم ہماری ملت میں پھر آجاؤ۔ اُس نے کہا کیا جب کہ ہم اس سے نفرت کرنے ہوں تب بھی! ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنے والے ٹھہریں گے اگر ہم تمھاری ملت میں لوٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی۔ یہ ہم سے تو ہونے کا نہیں کہ ہم اس ملت میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارے رب ہی کی مشیت ہو تو اور بات ہے۔ ہمارے رب کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے اور ان بڑوں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے کفر کیا، کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو بڑے خسارے میں پڑو گے تو ان کو کپکپی نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ جنھوں نے شعیب کی تکذیب کی گویا کبھی اس بستی میں بسے ہی نہیں، جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی نامراد ہوئے۔ تو وہ ان کو یہ کہہ کر چھوڑ کر چل دیا کہ اے میرے ہم قومو، میں نے تمھیں اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے، تمھاری خیر خواہی کر دی تو اب میں کفر کرنے والوں کا غم کیوں کروں! ۸۵-۹۳

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حضرت نوحؑ اور ان کی دعوت

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ الاٰیۃ: اس سورہ میں چونکہ قریش کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس وجہ سے

پہلے انہی قوموں کو لیا ہے جو عرب کے شمال یا جنوب یا شمال مغرب میں نامور ہوئیں اور جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں کیفر کردار کو پہنچیں۔ ترتیبِ بیان بالکل تاریخی ہے اس وجہ سے قوم نوح کو سب سے پہلے لیا۔ ہر قوم کی سرگزشت میں سے صرف اتنا ہی حصہ نمایاں کیا ہے جتنا انذار کے مقصد کے لحاظ سے ضروری تھا۔

انبیاء کی دعوت کی شرک کی حقیقت

فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ تمام فساد فی الارض کی جڑ شرک ہے۔ کسی قوم کے شرک میں مبتلا ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ نظریات و عقائد اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اعمال و اخلاق ہر چیز میں فطرت کی صراطِ مستقیم سے منحرف ہوگئی اور اب زمین میں اس کا بڑھنا کسی خیر و صلاح کا بڑھنا نہیں بلکہ شر و فساد کا بڑھنا ہے اور جب تک یہ قوم باقی رہے گی اس کے ہاتھوں انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں فساد ہی کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس وجہ سے اللہ کے رسول اپنی اصلاح کی دعوت اسی اصل نقطہ سے شروع کرتے ہیں اور یہ چیز انبیاء و رسل کی دعوت کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی نبی کی دعوت بغیر اس خصوصیت کے پائی جائے۔

اللہ کے رسول دو عذابوں سے ڈراتے ہیں

اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ یہ وہ اصل انذار ہے جو حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو سنایا کہ اگر تم شرک سے تائب ہو کر خالص اللہ ہی کی عبادت و اطاعت کی راہ پر نہ آگئے تو بس سمجھ لو کہ تم پر ایک ہولناک دن کا عذاب نازل ہوا ہی چاہتا ہے۔ ہولناک دن سے مراد یہاں دنیوی عذاب کا ہولناک دن ہے۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ اللہ کے رسول اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈراتے ہیں۔ ایک اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کے لازمی نتیجہ کے طور پر دنیا میں آتا ہے اور دوسرے اس عذاب سے جس سے جزا و سزا کے فیصلہ کے دن آخرت میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ عذابِ دنیا کی طرف اشارہ ہے۔ اس کو ہولناک دن سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ رسول کی تکذیب کے نتیجے کے طور پر جو عذاب آتا ہے وہ تذکیر و تنبیہ کی نوعیت کا عذاب نہیں ہوتا بلکہ یہ عذاب اس قوم کی جڑ کاٹ دیا کرتا ہے جس کے بعد قومی حیثیت سے اس کا نشان ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جایا کرتا ہے۔ سورۂ شعراء میں حضرت ہودؑ کی زبان سے نقل ہوا ہے۔ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۱۳۵۔ شعراء۔ پھر ان کی قوم کا جواب اور اس جواب کی پاداش میں ان پر دنیا میں عذاب کا آنا یوں بیان ہوا ہے۔ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ۱۳۸-۱۳۹ (اور ہم پر ہرگز عذاب نہیں آئے گا، تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ پس ہم نے ان کو ہلاک کر چھوڑا اور بے شک اس میں بہت بڑی نشانی ہے)

حضرت نوحؑ پر ان کی قوم کا سوال جواب

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ الآیۃ۔ مَلَاٌ کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ یعنی تمہاری ان باتوں کی بنا پر ہم تم کو کھلی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ اول تو تم نے باپ دادا کے دین کی تحقیر کی کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ان کا تم انکار کر

رہے ہو، پھر ستم یہ ہے کہ ہمارے اوپر عذاب الٰہی نازل ہونے کی دھمکی بھی سنا رہے ہو درآنحالیکہ ہمارے حالات تم سے اور تمھارے نام لیواؤں کے حالات سے ہر اعتبار سے اچھے ہیں۔

'قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ الاية' حضرت نوحؑ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے کوئی سرپھرا اور بھٹکا ہوا آدمی نہ سمجھو، میں تمام عالم کے رب کی طرف سے تمھارے پاس پیغمبر کی حیثیت سے آیا ہوں اور جو کچھ تمھیں سنا رہا ہوں وہ بے کم و کاست خدا ہی کی طرف سے سنا رہا ہوں، کوئی بات اپنی طرف سے نہیں سنا رہا ہوں۔

'اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' یہ خدا کا پیغام بھی ہے اور میری طرف سے تمھارے حق میں انتہائی خیرخواہی بھی کہ تمھاری ضد اور ہٹ دھرمی، ناقدری و دل آزاری، دشمنی و بیزاری کے باوجود تمھارے پیچھے پڑا ہوا ہوں اور تمھارے ہاتھوں سب کچھ جھیل رہا ہوں۔ جذبۂ ہمدردی و خیرخواہی کے سوا کسی اور جذبے کا میری اس تمام تگ و دو میں کوئی شائبہ نہیں۔ بس یہ اندیشہ اور یہ غم ہے کہ تم کہیں خدا کی آخری پکڑ میں نہ آجاؤ۔ تم صرف ظاہر کو دیکھتے ہو اس وجہ سے تمھیں عذاب کا ڈراوا عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن میں خدا کی طرف سے وہ بات بھی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ تم اپنے ظاہر کی چمک دمک کے ساتھ اگر اپنے ان روگوں سے بھی باخبر ہوتے جو تم نے اپنے سفید کپڑوں کے نیچے چھپا رکھے ہیں تو تمھیں اندازہ ہوتا کہ میں کتنی سچی بات کہہ رہا ہوں۔

'اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ الاية' یعنی کیا میری بات ماننے میں یہ چیز تمھیں مانع ہو رہی ہے کہ اللہ نے تمھیں میں سے ایک شخص پر تمھارے لیے یاددہانی اتاری تاکہ وہ سامنے کے خطرے سے تمھیں آگاہ کر دے، تاکہ تم اللہ سے ڈرو اور اس کی رحمت کے سزاوار بنو!۔ یہاں سوال اٹھا کر بات چھوڑ دی ہے، جواب نہیں دیا ہے، اس لیے کہ انداز کلام اظہار حسرت و افسوس کا ہے۔ اس اسلوب بیان میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر تم سوچتے، غرور و انانیت کو راہ نہ دیتے، تو یہ چیز تمھارے لیے تعجب اور استکبار کے بجائے ممنونیت اور شکرگزاری کا باعث ہوتی کہ خدا نے تمھارے ہی اندر سے ایک شخص کو تمھیں نجات کی راہ دکھانے کے لیے اٹھایا۔ میں تمھارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں، میرا ماضی و حاضر اور میرا اخلاق و کردار سب تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میری زبان تمھاری زبان اور میرا دل تمھاری اپنی فطرت کا ترجمان ہے تو کیا یہ بہتر ہوتا کہ تم پر اتمام حجت کے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ اترتا یا یہ بہتر ہے کہ تمھاری اپنی ہی زبان اور تمھارا اپنا ہی درد آشنا دل تم پر گواہی دے؟ اسلوب کلام میں یہ ساری داستان مضمر ہے اور یہ اضمار ہی اس محل میں تقاضائے بلاغت ہے۔ آخر ان لوگوں کو غم دل سنانے سے کیا حاصل جو سننے سے پہلے ہی اعتراض و نکتہ چینی کے لیے پر تولے ہوئے ہوں۔

'لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ' سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کے انذار کا اصل مقصد لوگوں کے اندر خشیت و تقویٰ پیدا کرنا ہوتا ہے اور یہی خشیت و تقویٰ ہے جو دنیا اور آخرت میں لوگوں کو رحمت الٰہی

کا سزاوار بناتی ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ نشانی عذاب اور فرشتوں کے مشاہدے کے منتظر ہوتے ہیں وہ درحقیقت اپنے لیے عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔

'فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِى الْفُلْكِ الاٰیة' یعنی بالآخر وہ بات ہو کے رہی جس سے حضرت نوحؑ نے ڈرایا تھا۔ جب قوم نے تکذیب کر دی اور حضرت نوحؑ کی طویل جدوجہد کے بعد بھی اپنے رویے کی اصلاح پر آمادہ نہ ہوئی تو ان لوگوں کے سوا جنھوں نے حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں پناہ لی سب کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔ اس طوفان کی نوعیت پر ہم اس مقام میں بحث کریں گے جہاں قرآن نے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ یہاں صرف یہ بات یاد رکھیے کہ غرق صرف وہ لوگ کیے گئے جو پیغمبر اور آیات الٰہی کی تکذیب پر اڑے رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ پیغمبر کی تکذیب کے نتیجے میں جو عذاب آتا ہے وہ انھی لوگوں پر آتا ہے جن پر پیغمبر اپنی حجت پوری کر دیتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم دجلہ و فرات کے دوآبہ میں آباد تھی۔ اس علاقہ کے سوا اس زمانے میں کہیں اور انسانی آبادی تھی یا نہیں؟ یہ سوال تاریخ کے ایک ایسے دور سے متعلق ہے جس کا تعلق حقائق سے زیادہ قیاسات اور تخمینوں سے ہے۔ ہم یہاں اس سوال پر کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ یہ بات سنتِ الٰہی کی اٹل حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ عذاب صرف انھی لوگوں پر آیا جنھوں نے حضرت نوحؑ کی تکذیب کی۔

عذاب اور ابتلا میں فرق

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عذاب اور ابتلا میں فرق ہوتا ہے۔ ایک تو یہ شکل ہوتی ہے کہ کسی قوم پر کوئی مصیبت، قحط، وبا، زلزلہ، طوفان وغیرہ کے قسم کی اللہ تعالیٰ اس لیے بھیجتا ہے کہ اہل غفلت اپنی غفلت کی نیند سے بیدار ہوں۔ اس قسم کے ابتلائی مصائب جب نازل ہوتے ہیں تو ان میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان کی آفت صرف مجرموں ہی تک محدود رہے بلکہ اچھے برے سب ان کی لپیٹ میں آتے ہیں۔ دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر اس کے اعمال کی پاداش میں، اتمام حجت کے بعد، کوئی فیصلہ کن عذاب بھیجتا ہے۔ اس صورت میں عذاب کی زد سے وہ لوگ بچا لیے جاتے ہیں جو اصلاح کرنے والے یا اصلاح کرنے والوں کے پیرو ہوتے ہیں۔

عقل اور دل کے اندھوں کے ساتھ خدا کا معاملہ

'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ' 'عمون'، 'عمی' کی جمع ہے۔ یہ لفظ آنکھ کے اندھوں کے لیے بھی آتا ہے اور عقل و دل کے اندھوں کے لیے بھی۔ یہاں یہ عقل و دل کے اندھوں کے لیے آیا ہے۔ یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا بیڑا غرق کر دیا؟ فرمایا کہ اس وجہ سے کہ یہ عقل و دل کے اندھے تھے۔ اللہ کا رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اس ذریعہ کے بروئے کار آ جانے کے بعد قانونِ الٰہی میں کوئی اور چیز ایسی باقی نہیں رہ جاتی جس کا اتمام حجت کے لیے بروئے کار آنا ضروری ہو اس وجہ سے رسول کے انذار کے بعد بھی جو لوگ آنکھیں نہیں کھولتے وہ دنیا میں اپنے وجود کی خود نفی کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قدرت کیوں باقی رکھے جن کے دل کی آنکھیں چوپٹ ہو چکی ہیں۔

قوم عاد کی سرگزشت اور حضرت ہودؑ کی دعوت

'وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ..... اَفَلَا تَتَّقُوْنَ' 'عاد' عرب کی قدیم اقوام میں سے ہیں۔ ان کا تعلق سامی نسل سے ہے۔ ان کا مسکن جنوبی عرب میں احقاف کا علاقہ تھا۔ قرآن کے الفاظ 'جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ' سے مترشح ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد اس قوم کے پیشرووں میں سے کچھ لوگوں نے جنوبی عرب کی طرف ہجرت کی اور وہاں رفتہ رفتہ بڑی قوت و شوکت حاصل کرلی۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنے دبدبہ اور صولت کے لیے بھی۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے حضرت ہودؑ کو مبعوث فرمایا۔ 'اَخَاھُمْ' کے لفظ سے اللہ تعالیٰ نے اس احسان کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کی طرف دوسرے مقامات میں 'رَسُوْلًا مِّنْھُمْ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ 'رسول' کا اپنی قوم کے اندر سے ہونا اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ہے۔ اس کی طرف ہم نے اوپر بھی اشارہ کیا ہے اور سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اگرچہ ہر احسان کی طرح قوموں نے اس احسان کی بھی ہمیشہ ناقدری ہی کی ہے۔

'اَفَلَا تَتَّقُوْنَ' یعنی کیا تم خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ بالکل اسی محل میں حضرت نوحؑ نے 'اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ' فرمایا ہے۔

'قَالَ الْمَلَاُ ..... اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ سَفَاھَۃٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ' یعنی یہ جو تم ہم کو قہر و عذاب سے ڈراتے ہو یہ محض تمہاری خرد باختگی ہے۔ ہماری یہ ترقیاں ہمارے مستحق عذاب ہونے کی علامت ہیں، یا منظورِ نظر اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی؟ 'وَاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ' یعنی یہ جو تم دعویٰ کر رہے ہو کہ خدا کے فرستادہ ہو اور ہمارے پاس تم کو خدا نے پیغامبر بنا کر بھیجا ہے، یہ محض تمہاری دھونس ہے اور ہم تم کو بالکل جھوٹا آدمی سمجھتے ہیں۔

'اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ' ناصح کے ساتھ 'امین' کی صفت یہاں اسی طرح آئی ہے جس طرح سورۂ شعرا میں ہے۔ 'اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ' ۱۴۳۔ شعرا۔ امانت، خیانت کا ضد ہے۔ رسول کی ایک بڑی نمایاں صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ امین ہوتا ہے۔ یعنی جو پیغام اس کے حوالہ کیا جاتا ہے وہ پوری امانت داری کے ساتھ اس کو پہنچا تا ہے۔ اس میں سرمُو کمی بیشی نہیں کرتا۔

'وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ' قوم نوحؑ کے بعد عاد کو خلافت دیے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو بعینہٖ اسی علاقے میں اقتدار حاصل ہوا جس میں قوم نوح کو حاصل ہوا۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ قوم نوحؑ بالکل شمال میں تھی اور عاد کا علاقہ عرب کا جنوبی علاقہ تھا۔ اس خلافت کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح قوم نوحؑ کو اقتدار و تمکن حاصل ہوا اسی طرح ان کے بعد تم کو حاصل ہوا۔ اس یاددہانی میں حضرت ہودؑ نے قوم کو اللہ تعالیٰ کا احسان بھی یاد دلایا ہے اور ان کو تنبیہ بھی فرمائی ہے۔ احسان تو واضح ہے کہ جو تمکن و اقتدار قوم نوحؑ کو حاصل تھا وہ ان کو حاصل ہوا اور تنبیہ یہ ہے کہ جب تم قوم نوحؑ کے اقتدار کے وارث

ٹھہرائے گئے ہو تو ان کی سرگزشت اور ان کے انجام کو بھی یاد رکھو۔ اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس انجام سے وہ دوچار ہوئے تم اس انجام سے بچ جاؤ۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

'وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً' ۔ خَلق' کے معنی یہاں ساخت کے ہیں مثلاً وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۱۱۹۔ نساء (میں ان کو سجھاؤں گا بس وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو مسخ کریں گے۔ 'ساخت' سے مراد ظاہر ہے کہ باطنی اور ظاہری دونوں ہی ساخت ہے اس لیے کہ شیطان کے ایما سے مشرکوں نے اپنی فطرت کو بھی مسخ کیا اور اپنے بتوں کی خوشنودی کے لیے، جیسا کہ قرآن مجید میں اشارہ ہے، چوپایوں کے کان بھی کاٹے۔ 'بَسْطَةً' اور 'بَصطة' دونوں ایک ہی لفظ ہے۔ اس کے معنی کشادگی، وسعت اور پھیلاؤ کے ہیں۔ ظاہری اور باطنی دونوں ساختوں میں پھیلاؤ اور کشادگی زیادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو خدا نے جسمانی اور عقلی دونوں اعتبار سے تفوق و برتری عطا فرمائی۔ عرب کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد صحتِ جسمانی کے اعتبار سے بھی نمایاں تھی اور اپنے عقلی کارناموں کے اعتبار سے بھی اس کی بڑی دھاک تھی۔ بقرہ میں طالوت کے متعلق فرمایا ہے 'وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ' وہی بات یہاں 'زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً' سے تعبیر ہوئی۔

'فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ' ۔ 'اٰلَاۗء' جمع ہے اِلٰی، اِلَی، اَلی کی۔ اس کے معنی عام طور پر اہلِ لغت نے نعمت کے لیے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے معنی کرشمہ، شان، کارنامہ اور اعجوبہ کے ہیں۔ ہمارے استاد مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اس لفظ کی تحقیق بیان کی ہے۔ انھوں نے مشہور شعرائے جاہلیت کے دس شعر نقل کیے ہیں جن سے وہی معانی نکلتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔

حضرت ہودؑ کی یہ بات بھی اپنے اندر امتنان اور تنبیہ دونوں ہی کے پہلو رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمھیں جن جسمانی و عقلی قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے ان کی ندر کرو، ان کا شکر ادا کرو، ان کے سبب سے فتنے میں نہ پڑو۔ خدا کی شانوں، عظمتوں اور قدرتوں کو یاد رکھو۔ یہی راستہ فلاح کا راستہ ہے۔ اگر تم نے اکڑ دکھائی تو یاد رکھو، خدا کی پکڑ بھی بڑی ہی سخت ہے۔

'قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا' ۔ اس فقرے میں قوم کا غصہ اور طنز دونوں مضمر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم رسالت کے مدعی ہو کر اس لیے تشریف لائے ہو کہ ہم تمھاری دھونس میں آکر ان معبودوں کو چھوڑ بیٹھیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے؟ اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ تم سے توقع تو اس بات کی تھی کہ دینِ آبائی اور قوم کی عزت بڑھاؤ گے لیکن تم سب کے دشمن بن کر اُٹھے۔

'فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ' تو سن رکھو کہ تمھاری عذاب کی ان دھمکیوں سے ڈر کر ہم اپنے بزرگوں کے دین سے دستبردار ہونے والے نہیں ہیں۔ اگر اس جرم میں ہم پر عذاب آنے والا ہے تو وہ

عذاب لاؤ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

'قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ'۔ 'قَدْ وَقَعَ' اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جیسے 'اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ' ہے یعنی اب یہ چیز لازم ہوگئی، واجب ہوگئی، تم اس کے مستحق ہو گئے، بس صرف انتظار باقی رہ گیا ہے۔ 'رِجْسٌ' کے معنی گندگی اور ناپاکی کے ہیں اور اس سے مراد یہاں کفر و شرک اور اعمال و عقائد کی گندگی و ناپاکی ہے۔ 'رِجْسٌ' اور 'غَضَبٌ' میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اب اس میں دیر نہیں ہے، اس کو آیا ہی سمجھو، اس لیے کہ جس ناپاکی و گندگی سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے اس کی بہت بڑی کھیپ تم نے اپنے اوپر لاد لی ہے۔ 'رِجْس' کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب خدا کے صاعقۂ عذاب کو دور نہ سمجھو۔

'اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ' یہ قوم کی اس بات کا جواب ہے کہ بھلا ہم اپنے ان معبودوں کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں جن کو ہم باپ دادا کے زمانے سے پوجتے آئے ہیں؟ فرمایا کہ تمھاری یہ حجت بالکل بے بنیاد ہے۔ تم جن چیزوں کو پوجتے ہو ان کے نام تو بے شک تم نے کچھ رکھ چھوڑے ہیں لیکن ان ناموں کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی دلیل نہ عقل و فطرت کے اندر موجود ہے نہ خدا نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کہیں یہ خبر دی ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا۔ پھر وہ کیا چیز ہے جس کی بنا پر تم ان کو معبود بنائے بیٹھے ہو اور ان کی حمایت میں مجھ سے لڑ رہے ہو؟ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم مانتے ہی ہو، وہ نزاعی چیز نہیں ہے، اس کی دلیل تمھارے پاس بھی موجود ہے، رہے تمھارے یہ اصنام خیالی تو ان کے حق میں کیا دلیل ہے جو تم پیش کر سکتے ہو۔

'فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ' مطلب یہ ہے کہ اب اگر عذاب دیکھ کر ہی ماننا ہے تو عذاب کا انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ جہاں تک اس کے اسباب کا تعلق ہے وہ تو تم نے سب فراہم کر چھوڑے ہیں اس وجہ سے اس کا آنا تو امر قطعی ہے۔ لیکن عذاب لانا میرا کام نہیں ہے، خدا کا کام ہے۔ تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔

'فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ'۔ یہ اس سنت الٰہی کا بیان ہے جو رسول کے ذریعے سے قوم پر حجت تمام کر دینے کے بعد لازماً ظاہر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ رسول اور اس کے ساتھیوں کو اپنے فضل خاص سے، اپنی حفاظت میں لے کر علاقۂ عذاب سے نکال دیتا ہے اور رسول کے تمام جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے جو اس وقت نازل ہوتا ہے جب مخاطب قوم اپنی ہٹ اور ضد سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ اس کے اندر صلاحیت ایمان کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے۔ 'وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ' سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

قوم ثمود اور حضرت صالحؑ کی سرگزشت

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ثمود، عاد کے بقایا میں سے ہے۔ ان کو عاد ثانی کہتے بھی ہیں۔ ان کا مسکن عرب کے شمال مغرب میں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ قوم عاد کی تباہی کے وقت جو لوگ عذاب سے محفوظ رہے ہوں، انھوں نے جنوب سے شمال مغرب کی طرف ہجرت کی ہو اور پھر حجر میں سکونت اختیار کر لی ہو۔ عاد و ثمود کے اوصاف قرآن میں بھی اور عرب کی روایات میں بھی تقریباً ایک ہی سے بیان ہوئے ہیں۔ بعض شاعر تو ان دونوں قوموں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں، گویا ان کے درمیان کوئی فرق سرے سے ہے ہی نہیں۔ دونوں کے لیڈر — قیل اور رغدار — جن کے ہاتھوں ان قوموں پر تباہی آئی، عربی ادب میں ضرب المثل ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بالکل ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔

قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ یہ حضرت صالحؑ کی طرف سے قوم کے مطالبۂ عذاب کا جواب ہے۔ حضرت صالحؑ نے قوم کو بار بار خدا کے عذاب سے ڈرایا کہ یہ نہ سمجھو کہ آج جس عیش و آرام میں مگن ہو، جن باغوں اور چشموں میں عیش کر رہے ہو، جن کھیتوں اور فصلوں کی بہاریں لوٹ رہے ہو، جن تعمیرات اور زینتوں میں گم ہو، یہی لیل و نہار ہمیشہ رہیں گے۔ خدا کی پکڑ سے بچو، میری بات مانو اور اپنے بے لگام اور بگٹٹ لیڈروں کی پیروی میں، جو خدا کی زمین میں فساد برپا کر رہے ہیں، اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں نہ جھونکو۔ قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ تم تو ہمیں ایک سحر زدہ اور خبطی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ہم تمھاری یہ لن ترانیاں کس طرح مان لیں جب کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو۔ ہم تو تمھاری بات اس وقت باور کریں گے جب تم اس عذاب کی کوئی نشانی لاؤ جس کے تم ہمیں ڈراوے سنا رہے ہو۔ ان کے اس مطالبہ کے جواب میں حضرت صالحؑ نے ایک اونٹنی نامزد کر دی کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ یہ تمھارے لیے عذاب الٰہی کی نشانی ہے، اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو بس سمجھ لو کہ تم پر عذاب آدھمکے گا۔ اس کو عذاب کے بند کی دیوار سمجھو، اگر تم نے اس دیوار کو توڑا تو تم کو قہر الٰہی کے سیلاب سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی۔

اس اونٹنی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے سے مقصود اللہ کے لیے اس کی تخصیص کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ یہ خدا کی نذر اور اس کے لیے نامزد ہے۔ یہ تخصیص اور نامزدگی اسی نوعیت کی تھی جس طرح کی تخصیص اور نامزدگی ہمارے ہاں ہدی اور قلائد کے جانوروں کی ہوتی ہے۔ جس طرح اسلام میں ہدی و قلائد پر حملہ کرنا ایک عظیم جرم ہے اسی طرح حضرت صالحؑ نے اس اونٹنی کے بابت فرمایا کہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے، یہ امان کی دیوار ہے، اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو میں جس عذاب سے تم کو آگاہ کر رہا ہوں وہ تم پر ٹوٹ پڑے گا۔

اونٹنی کو نامزد کرنے کی مصلحت

اس اونٹنی کو حضرت صالحؑ نے ایک احساس پیما آلہ (FEELER) کی حیثیت سے نامزد کیا تھا کہ اس تاکید و تنبیہ کے باوجود اگر انھوں نے اس کو ہلاک کر دیا تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہو گا کہ اب یہ ظالم

لوگ ان کو بھی نعوذ باللہ جھوٹا سمجھ کر قتل کرنے کی جسارت کر گزریں گے۔ سنت الٰہی کے تحت کسی قوم کی جرأت و جسارت کا یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں رسول کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور قوم پر عذاب آتا ہے۔

قرآن کے الفاظ سے یہ بات کہیں نہیں نکلتی کہ یہ اونٹنی اپنی خلقت کی اعجوبگی کے پہلو سے کوئی نشانی تھی بلکہ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ سے صاف واضح ہے کہ وہ گزند پہنچائے جانے کے انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے نشانی تھی۔ جہاں تک علم ہے اس اونٹنی کا کسی پہاڑ یا پہاڑی سے پیدا ہونا کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان تفسیری روایات کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ یہ اونٹنی ایک پہاڑ سے پیدا ہوئی تھی۔ آیت کے معنی نشانی اور علامت کے ہیں۔ یہ اونٹنی قوم کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ایک نشانِ عذاب کی حیثیت سے نامزد کی گئی تھی چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ جب ثمود کے لیڈروں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو اس کے تیسرے دن عذاب الٰہی آ دھمکا۔ یہ واقعہ قرآن میں جستہ جستہ مختلف سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ ہم یہاں تقریب فہم کے لیے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صٰلِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هٰهُنَا آمِنِينَ ۝ فِي جَنّٰتٍ وَعُيُونٍ ۝ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ۝ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فٰرِهِينَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۝ مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ ۝ قَالَ هٰذِهِ نَاقَةٌ لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَعْلُومٍ ۝ وَلَا تَمَسُّوهَا

ثمود نے بھی رسولوں کی تکذیب کی، جب کہ ان کے بھائی صالح نے کہا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں، میں تمہاری طرف خدا کا ایک رسول ہوں امانت دار تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں اس پر تم سے کسی صلے کا طالب نہیں ہوں۔ میرا صلہ تو بس عالم کے رب ہی کے ذمہ ہے۔ کیا تم جس عیش و تنعم میں یہاں ہو اس میں چھوڑے رکھے جاؤ گے، باغوں اور چشموں میں، کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے گچھے بوجھ سے ٹوٹے پڑ رہے ہیں، اور تم پہاڑوں میں خوش خوش گھر تراشتے رہو گے، تو اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو، اور ان بے قیدوں اور مطلق العنانوں کے کہے میں نہ آؤ جو ملک میں فساد مچاتے ہیں اور کوئی اصلاح کرنے پر آمادہ نہیں۔ انھوں نے جواب دیا تم پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے، تم تو ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو تو اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی دکھاؤ۔ اس نے کہا یہ اونٹنی ہے ایک دن پانی کی باری اس کی اور ایک روز مقررہ کی باری

بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۵۶-۱۵۸ شعراء)

تمھاری اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچا بیو ورنہ ایک ہولناک دن کا عذاب تم کو آ پکڑے گا۔ تو انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں، پھر انھیں پچھتانا پڑا۔ ان کو عذاب نے آ پکڑا۔ بے شک اس کے اندر نشانی ہے اور ان کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں تھی۔

مطالبۂ عذاب کے جواب میں عذاب کے بجائے ایک نشانِ عذاب کی نامزدگی اللہ تعالیٰ کی رحمت و رافت کی دلیل تھی۔ وہ تھم میں دھیما اور رحمت میں جلدی کرنے والا ہے اس وجہ سے اس نے یہ پسند فرمایا کہ لوگوں کو مزید مہلت دے کہ اب بھی وہ متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں لیکن انھوں نے متنبہ ہونے کے بجائے جسارت کا آخری قدم اٹھا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اس کے بعد اگرچہ کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی تاہم قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ خطرے کی حدود لانگ جانے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو تین دن کی مہلت دی کہ اب بھی اگر وہ توبہ کرنا چاہیں تو کرلیں۔

اونٹنی سے متعلق حضرت صالحؑ نے یہ ہدایت جو فرمائی کہ یہ پورے علاقے میں چھوٹی پھرے، کوئی اس سے تعرض نہ کرے اور چشمے پر اس کے پانی پینے کا دن بالکل الگ ہو، اس دن دوسرے لوگ اپنے جانوروں کو گھاٹ پر نہ لے جائیں، یہ ہدایت قوم کی آزمائش کے لیے تھی کہ ان کے اندر جو کھوٹ اور عناد ہے ابھر کر سامنے آجائے۔ کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ رہ جائے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہ لوگ عاد کے بقایا میں سے تھے اور ان کا علاقہ عرب کے شمال مغرب میں حجر کا علاقہ تھا۔ ان لوگوں کو وہاں بڑا عروج و اقتدار حاصل ہوا۔ ان کی بہت سی تعمیری یادگاریں آج بھی موجود ہیں۔ قریش کے قافلے اپنے شام کے سفر میں ان کی بستیوں پر سے گزرتے تھے اس وجہ سے ان کی سرگزشت ان کے لیے شنیدہ بھی تھی اور دیدہ بھی۔ حضرت صالحؑ نے ان کو جو عاد کی خلافت یاد دلائی اس کا مقصد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ان کو متنبہ کرنا تھا کہ اپنے اقتدار کے نشہ میں خدا کے اقتدار کو نہ بھولو، اس نے جو معاملہ عاد کے ساتھ کیا، وہی تمھارے ساتھ کرے گا۔ وہ ایک ہی ترازو سے سب کے لیے تولتا ہے۔

تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا: سَهْل اور جَبَل، دونوں متقابل الفاظ ہیں سہل، پہاڑی علاقے کے مقابل میں میدانی علاقہ کو کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے تمدنی اور تعمیری اعتبار سے، اپنے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ میدانی علاقوں میں بھی انھوں نے عالیشان محل تعمیر کیے اور پہاڑی علاقوں میں بھی پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بنائے۔ ان کے دور کے بعض تعمیری آثار آج بھی موجود ہیں جو فن تعمیر میں ان کے کمال کی شہادت دیتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے ان کے ان تمام تعمیری ولولوں پر عین ان کے دورِ عروج

میں قائم کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عالیشان اور لق و دق عمارتیں بنانا قوم کے عروج کی نہیں بلکہ تمدن کے فساد اور قوم کے زوال کی نشانی ہے۔ یہی فلک بوس عمارتیں بالآخر اس کے عروج و کمال کے مقبرے اور مدفن بنتی ہیں اور ایک دن زاغ و زغن ان میں اپنے آشیانے بناتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے ان کو یاد دلایا کہ لوگو، خدا کی شانوں اور اس کی عظیم قدرتوں کو یاد کرو اور خدا کی زمین میں مفسد بن کر سر نہ اٹھاؤ۔ فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ۔ 'مُسْتَضْعَفْ' کے معنی ہیں زبردست، دبائے ہوئے، بے اثر، مظلوم۔ انبیاء کی دعوت قبول کرنے میں ہمیشہ غریبوں اور کمزوروں ہی نے سبقت کی ہے اس لیے کہ وہ استکبار کے حجاب سے پاک ہوتے ہیں اور استکبار ہی وہ چیز ہے جو قبولِ حق میں سب سے بڑا مانع ہے۔ ابلیس کی سرگزشت میں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

'اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ'۔ اہل ایمان سے متکبرین کا یہ سوال استنکار کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگ اس شخص کو خدا کا رسول سمجھ بیٹھے ہو تو بڑے ہی کم عقل اور بدھو ہو۔ اہل ایمان کا جواب کہ "ہم تو اس پیغام پر ایمان رکھتے ہیں جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں" سوال کے اصل جواب سے ایک قدم آگے ہے۔ انھوں نے حضرت صالحؑ کی صرف رسالت کے اقرار ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی اصل دعوت کی صحت و صداقت پر اپنے کامل ایمان اور اس ایمان پر اپنے پختہ عزم و جزم کا اظہار بھی کیا۔ ظاہر ہے کہ متکبرین کو اصل چڑ حضرت صالحؑ سے نہیں بلکہ ان کی دعوت اور ان کے پیغام ہی سے تھی۔ چنانچہ اہل ایمان نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر ان کے اندر کے چھپے ہوئے اس خناس ہی پر ضرب لگائی اور یہ گویا اینٹ کے جواب میں پتھر تھا جس نے ثابت کر دیا کہ اب تک جو لوگ دبے ہوئے یا دبائے ہوئے تھے اب وہ اس حق کے معاملے میں کسی سے دبنے والے نہیں۔

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ رسولوں پر ایمان لانے والے اگرچہ ابتداءً غریب اور کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں لیکن جو چیز ان کو اپیل کرتی ہے وہ نبی کی دعوت کی قوت و حجت ہوتی ہے نہ کہ معجزے اور کرشمے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنی بڑائی اور ذہانت و فطانت کے مدعی ہوتے ہیں وہ آخر تک نشانیوں اور معجزوں ہی کے چکر میں پھنسے رہ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب اللہ کا عذاب ان کی کمر توڑ دیتا ہے۔

'قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا الاية' یہ متکبرین کی طرف سے آخری جھنجھلاہٹ کا اظہار ہے کہ تم نے صالح کو مان لیا ہے تو مانو ہم تو اس شخص کو ہرگز ماننے والے نہیں ہیں، ہم اس کا صاف انکار کرتے ہیں۔

'فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ'

'عَقَر' کے معنی اونٹ یا اونٹنی کی کونچیں کاٹ دینے کے ہیں 'عتو' کا صلہ جب 'عن' کے ساتھ آئے تو یہ سرکشی

اور نافرمانی دونوں کے مفہوم پر متضمن ہوتا ہے۔ یہ قوم کے متمردین کی طرف سے تمرد کا آخری قدم تھا۔ انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور حضرت صالحؑ کو چیلنج کیا کہ لو ہم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، تم نے دھمکی دی تھی کہ ہم نے اس کو گزند پہنچایا تو ہم پر عذاب آ جائے گا تو اگر تم خدا کے فرستادہ ہو تو عذاب لاؤ۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ یہ قوم کی طرف سے حضرت صالحؑ کی تکذیب کا گویا آخری اور حتمی عملی اعلان تھا۔ اس کے بعد اگر ان کو مزید مہلت ملتی تو اب ان کا حملہ حضرت صالحؑ ہی پر ہوتا اس وجہ سے تیسرے دن ان پر عذاب آ گیا۔ اونٹنی کو ہلاک کرنے کا جرم اگرچہ، جیسا کہ سورۂ شمس میں تصریح ہے، ثمود کے سرکش لیڈر نے کیا تھا لیکن تمام متمردین اس کے اس فعل پر راضی رہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوب سب ہی کی طرف کیا۔

قومِ ثمود کے عذاب کی نوعیت

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِیۡنَ۔ 'رَجۡفَةٌ' کے معنی شدت کی حرکت، کپکپی، اور تھرتھراہٹ کے ہیں۔ یہ اس عذاب کی تعبیر ہے جو قوم ثمود پر آیا۔ قرآن نے اس عذاب کو دوسری جگہ 'صَیۡحَةٌ' سے بھی تعبیر کیا ہے جس کے معنی ڈانٹ کے ہیں، بعض جگہ 'صَاعِقَةٌ' سے بھی تعبیر کیا ہے (مثل صاعقة عاد وثمود) جس کے معنی کڑکے کے ہیں، سورۂ حاقہ میں 'طَاغِیَةٌ' سے تعبیر کیا ہے (وَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَاُهۡلِکُوۡا بِالطَّاغِیَةِ) جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی کے ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں عاد و ثمود دونوں قوموں کے عذاب کی نوعیت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ آخر میں خلاصۂ بحث ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

> "اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے سرمائی بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب بھیجا۔ چونکہ اصل تباہی زیادہ تر ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی اس وجہ سے اگر اثر سے موثر پر استدلال کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے سرما کے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہری کر دینے چیخ بھی چھپی ہوئی تھی جس طرح کہ قوم عاد پر رعد و برق والے بادل بھیجے۔"

بہرحال 'رَجۡفَة' کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ زلزلہ کا عذاب تھا۔ 'رجفہ' مجرد عذاب کی تعبیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے شمال کی باد تند، جس کو صرصر کہتے ہیں، چلی اور وہ اتنی سخت و شدید ہو گئی کہ اس نے ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیا۔ کڑکے کی شدت ایسی بے پناہ ہوئی کہ لوگ اوندھے منہ زمین پر پڑے رہے اور اسی حال میں ہلاک ہو گئے۔

'دَار' کا لفظ یہاں 'دیار' کے معنی میں ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود آیت ۶۵ میں لفظ 'دار' استعمال ہوا، پھر انہی ثمود کے ذکر میں آیت ۶۷ میں 'دیار' استعمال ہوا۔ یہ قرآن نے گویا خود لفظ کی تفسیر کر دی۔

'فَتَوَلّٰی عَنۡهُمۡ وَقَالَ یٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ رِسَالَةَ رَبِّیۡ وَنَصَحۡتُ لَکُمۡ وَلٰکِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِیۡنَ'

یہ قوم سے حضرت صالحؑ کا آخری خطاب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انھوں نے عذاب آنے سے پہلے اس وقت فرمایا ہے جب قوم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر عذاب کے بند کو گویا توڑ دیا ہے۔ یہی وداعی فقرہ کہہ کر

انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت فرمائی ہوگی۔ اس لیے کہ رسولوں کے باب میں سنت الٰہی یہ ہے کہ عذاب آنے سے پہلے، اللہ کے حکم سے، وہ علاقۂ عذاب سے ہجرت کر جاتے ہیں، قرآن میں دوسری جگہ تصریح ہے کہ اونٹنی کے قتل کے بعد صرف تین دن کی قوم کو مہلت ملی۔ اس تین دن کی مہلت میں جہاں بعض دوسری مصلحتیں تھیں وہاں یہ مصلحت بھی ہوگی کہ اس اثنا میں حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھی علاقہ سے اتنے دور نکل جائیں کہ عذاب کا کوئی جھونکا ان کو نہ چھو سکے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترتیب بیان میں اس بات کو عذاب کے ذکر کے بعد کیوں کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم و تاخیر تقاضائے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکاب جرم اور اس کے نتیجہ کے فوری ظہور کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں عذاب کو قتلِ ناقہ کے ساتھ متصل کر دیا اور حضرت صالحؑ کی ہجرت کے ذکر کو پیچھے کر دیا۔ گویا جوں ہی انھوں نے ناقہ کو گزند پہنچا کر خدا کو چیلنج کیا عذاب آ دھمکا۔ عذاب کی یہ سبقت و مبادرت اچھی طرح ظاہر نہ ہو سکتی اگر اس بیچ میں کوئی اور بات ذکر میں آ جاتی۔ قرآن میں اس اسلوب مبادرت کی مثالیں بہت ہیں۔ آگے قوم شعیبؑ کی سرگزشت میں بھی اس کی مثال ہے۔ سورۂ ہود میں، حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے سلسلہ میں آیات ۴۲-۴۵ ملاحظہ ہوں، نہایت واضح اور بلیغ مثال اس اسلوب کی موجود ہے۔

'یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ الایۃ' سے ایک حقیقت یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ ان انبیاء کے خطاب میں 'یاقوم یاقوم' کا لفظ جو بار بار آتا ہے یہ محض دلداری اور استمالت کی نوع کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ جس طرح ہر شخص پر اس کے اپنے وجود، اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان کا ایک حق ہوتا ہے اسی طرح اپنی قوم اور اپنے وطن کا بھی اس پر ایک حق ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ پورے اخلاص، پوری دل سوزی اور پوری جاں بازی کے ساتھ اس کی خیر خواہی کرے۔ اس کے بغیر کوئی شخص اپنی قوم کے حق سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ جو شخص یہ حق ادا کر چکتا ہے وہ اللہ کے نزدیک سرخ رو ہے، اس سے اس باب میں کوئی پرسش نہیں ہوگی کہ قوم تباہی کی راہ پر کیوں گئی، ہدایت کی راہ پر کیوں نہ چلی؛ لیکن جنھوں نے یہ حق ادا نہیں کیا ہے وہ اس حق کے باب میں عند اللہ لازماً مسئول ہوں گے۔

'وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ' محض اظہارِ حسرت کا کلمہ نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ قوم کے قومی مزاج کے بگاڑ کا ایک درجہ و مرحلہ وہ بھی ہوتا ہے جب تمام پیمانے اس طرح تلپٹ اور تمام اقدار اس درجہ متغیر ہو جاتے ہیں کہ خیر خواہی کا کلمہ کہنا جان جوکھوں کا کام بن جاتا ہے۔ جو لوگ عذاب الٰہی کے بند کو توڑتے ہیں وہ قوم کے لیڈر اور ہیرو بن جاتے ہیں اور جو اس عذاب سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں وہ بدخواہ، غدار اور قوم کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ قومی فساد مزاج کی یہی وہ حد ہے جہاں پہنچ کر لازماً قوم تباہی سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ جب کسی مریض کا یہ حال ہو جائے کہ اسے معالجوں اور طبیبوں سے دشمنی ہو جائے اور صرف انہی کے مشورے اسے پسند آئیں جو اس کے مرض میں اضافہ کے خواہشمند ہوں تو موت کے سوا

اب اس کے لیے اور کیا چیز باقی رہ گئی ہے۔

قوم لوط اور حضرت لوطؑ کی سرگزشت

'وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ'۔ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے ہیں۔ یہ جس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے وہ شام کے جنوبی علاقہ میں دریائے اردن کے اردگرد آباد تھی۔ ان کے ذکر میں اسلوبِ بیان اس سے ذرا مختلف ہے جو حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کے ذکر میں ہے۔ ان دونوں حضرات کو 'اَخَاھُمْ ھُوْدًا' اور 'اَخَاھُمْ صٰلِحًا' کے الفاظ سے ان کی قوموں کی طرف منسوب فرمایا لیکن حضرت لوطؑ کی قوم کو ان کی قوم تو کہا لیکن ان کو ان کے بھائی کی حیثیت سے ان کی طرف منسوب نہیں فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کے اعتبار سے تو یہ لوگ ان کی قوم تھے لیکن باعتبار نسب اور قبیلہ حضرت لوطؑ ان سے الگ تھے۔ قرآن نے اس معمولی فرق کو بھی اپنے اسلوبِ بیان سے واضح فرما دیا۔ رسولوں کے باب میں عام سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ اسی قوم کے اندر سے ہوتے ہیں جس کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ قوم ان کے ماضی و حاضر، ان کے اخلاق و کردار اور ان کی زبان سے اچھی طرح آشنا ہو تاکہ اجنبیت و غیریت موجب وحشت نہ بنے۔ یہ چیز جس طرح نسبی تعلق سے حاصل ہو سکتی ہے اسی طرح کسی قوم کے اندر طویل قیام سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ حضرت لوطؑ چونکہ اسی قوم کے اندر رہ بس گئے تھے بلکہ قرینہ شاہد ہے کہ انھوں نے انہی کے اندر شادی بھی کر لی تھی اس وجہ سے وہ قوم کے لیے بمنزلہ ایک فردِ قوم کے تھے۔ ان کی تربیت، جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے فرمائی تھی۔ ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ یہ بعینہٖ وہی صورتِ حال ہے جو حضرت موسیٰؑ کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں۔ باوجودیکہ حضرت موسیٰؑ قوم فرعون کے اندر سے نہیں تھے لیکن ایک طویل مدت تک ان کے اندر رہے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو قوم فرعون کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

'اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ'۔ 'اَلْفَاحِشَةَ' کھلی ہوئی بدکاری و بے حیائی کو کہتے ہیں اور استفہام یہاں اظہارِ نفرت و کراہت کے مفہوم میں ہے۔ اس 'فَاحِشَةَ' کا یہاں نام نہیں لیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بے حیائی وقت کی سوسائٹی میں اس درجہ عام تھی کہ نام لیے بغیر بھی ہر شخص سمجھتا تھا کہ اس سے مراد کیا ہے۔

'مَا سَبَقَكُمْ بِهَا' 'فَاحِشَةَ' کی صفت نہیں ہے۔ اگر یہ صفت ہوتا تو معروف قاعدہ زبان کے مطابق 'فَاحِشَةَ' کو نکرہ ہونا تھا۔ میرے نزدیک یہ الگ جملہ ہے۔ حضرت لوطؑ نے یہاں درحقیقت دو مختلف پہلوؤں سے اس برائی پر اظہارِ نفرت فرمایا ہے۔ پہلے تو فرمایا کہ ایسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو، جس کا بے حیائی ہونا ہر عقلِ سلیم پر واضح ہے! پھر فرمایا کہ یہ حرکت شنیع تو تم سے پہلے کسی قوم نے نہیں کی۔

'مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ' سے یہ بات لازم نہیں آتی ہے کہ قوم لوطؑ سے پہلے یہ حرکت شنیع کسی ایک فرد سے بھی صادر نہ ہوئی ہو۔ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'اَحَد' جمع کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ مثلاً

نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ، يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ۔ اس وجہ سے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم سے پہلے کوئی شامت زدہ سوسائٹی ایسی نہیں گزری جس نے اس غلاظت کو تمھاری طرح اوڑھنا بچھونا بنایا ہو۔

عمل قوم لوط کی سنگینی

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اوپر جن رسولوں کی دعوت کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ہر ایک کی دعوت کا آغاز توحید سے ہوا ہے لیکن حضرت لوطؑ نے توحید کی دعوت سے آغاز کرنے کے بجائے سب سے پہلے قوم کی اس بے حیائی کو موضوع بحث بنایا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کی قوم کے اندر شرک کی برائی موجود نہیں تھی؟ اگر موجود تھی تو حضرت لوطؑ نے اس کو کیوں نظر انداز فرمایا؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ برائی اور برائی میں فرق ہوتا ہے۔ ایک برائی تو وہ ہوتی ہے، جو خواہ کتنی ہی سنگین ہو، لیکن وہ انسانی عوارض میں سے ہے اور انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے، دوسری برائی وہ ہے جس کا گھنونا پن اس قدر واضح ہے کہ کسی انسان کے اندر عادت کی حیثیت سے اور کسی سوسائٹی کے اندر فیشن کی حیثیت سے اس کا پایا جانا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اس انسان یا اس سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہو گئی ہو۔ جہاں اس طرح کے لوگوں سے سابقہ ہو وہاں اصل قابل توجہ چیز وہی برائی ہوتی ہے، دوسری باتیں خواہ کتنی ہی اہمیت رکھنے والی ہوں، سب ثانوی درجے میں آجاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اس کی اصلاح کی غرض سے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا غلیظ کھا رہا ہے تو آپ اس کو ایمان و اسلام کی تلقین کریں گے یا سب سے پہلے اس کی یہ عبرت انگیز حالت آپ کو متوجہ کرے گی؟ حضرت لوطؑ کو اسی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ ان کی قوم کے اندر شرک و کفر کی برائی بھی موجود تھی، اور دوسری تمام برائیاں بھی، جو شرک و کفر کے لوازم میں سے ہیں، موجود تھیں لیکن جن کی فطرت اتنی اوندھی ہو گئی ہو کہ مرد مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بنائے ہوئے ہوں ان کو تو سب سے پہلے اس غلاظت کی دلدل سے نکالنے کی ضرورت تھی، ان سے کوئی دوسری بات کرنے کا مرحلہ تو بہر حال اس کے بعد ہی آسکتا تھا۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ قرآن کی نگاہ میں عمل قوم لوط کی سنگینی کا کیا حال ہے اور پھر ذرا یاد کیجیے اس واقعہ کو کہ برطانوی پارلیمنٹ نے پچھلے دنوں اپنے ایک قانون کے ذریعہ سے اپنی قوم کے لیے اس ملعون فعل کو بالکل مباح کر دیا ہے۔ اللہ کے حلم کی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ مہلت دیتا ہے تو بڑی طویل مہلت دیتا ہے لیکن برطانوی پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کر کے خدا کے عذاب کے لیے اپنے دروازے چوپٹ کھول دیے ہیں۔ اب دیکھیے یہ مدت مہلت کتنی دراز ہوتی ہے۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ یہ اظہار نفرت کا تیسرا پہلو ہے۔ یعنی تم نے تو فطرت کو بالکل ہی الٹ کر رکھ دیا ہے۔ جملہ میں جو تاکید ہے وہ نفرت اور تعجب کی شدت کو ظاہر کر رہی ہے۔ 'رِجَال' کا لفظ بھی یہاں معنی خیز ہے اس لیے کہ 'رِجَالٌ' پختہ سن و سال

کے مردوں کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے ایک تو اس فعل کے گھنونے پن کا اظہار ہو رہا ہے۔ دوسرا اس سے اس دیوثیت کا اظہار ہو رہا ہے جو کسی قوم میں اس مرض خبیث کے عام ہو جانے کی صورت میں لازماً پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے عام ہو جانے کی صورت میں سن و سال کی تمیز بالکل اٹھ جاتی ہے۔ پھر ہر عمر کے دیوث قوم میں پھیل جاتے ہیں اور ان کے لیے یہ لعنت عادت اور پیشہ بن جاتی ہے۔ 'مِنْ دُوْنِ النِّسَآءِ' کے الفاظ اس قلب ماہیت کو ظاہر کر رہے ہیں جو اس فساد طبیعت کا لازمی نتیجہ ہے کہ ساری تخلیقی قوت بالکل غلط ہدف پر برباد ہوتی ہے۔ بنجر سیراب ہوتے ہیں، کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں جس کا انجام حرث و نسل کی تباہی اور آخرت کی روسیاہی ہے۔ 'بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ' فطرت سے بغاوت کی تعبیر ہے اور فطرت سے بغاوت کا انجام ظاہر ہے۔

'وَمَا کَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ' اسلوبِ بیان سے واضح ہے کہ حضرت لوطؑ کا ایک ایک فقرہ آنکھیں کھول دینے والا اور فطرت کو جھنجھوڑ دینے والا تھا لیکن جن کی مت ماری گئی ہو اور جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہو ان پر یہ وعظ کیا کارگر ہو سکتا تھا؟ وہ یہ سب سن کر بولے تو یہ بولے کہ ان کو بستی سے نکالو، یہ بڑے پارسا بنتے ہیں! یہ کسی معاشرے کے بگاڑ کی آخری حد ہے۔ معاشرہ بگڑتے بگڑتے اس حد تک بگڑ جاتا ہے کہ ایک وقت آتا ہے جب سب اپنی ناک کٹوا بیٹھتے ہیں اور نکٹا ہونا ہی تہذیب اور فیشن کا تقاضا بن جاتا ہے۔ اس وقت چہرے پر ناک کا نہ ہونا عیب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کا ہونا ایک اعجوبہ گنا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو، اگر ظالموں کا بس چلتا ہے تو نکو بنا کر برادری سے باہر کر دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ 'يَتَطَهَّرُوْنَ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو گندگی میں آلودہ اور حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو پاکیزہ سمجھتے تھے لیکن ان کی یہ پاکیزگی پسندیدہ ہونے کے بجائے ان کے دل پر شاق تھی کہ آخر یہ کیوں بچے پھرتے ہیں، ہم جس چہ بچہ میں ڈبکیاں لگا رہے ہیں، یہ کیوں نہیں اس میں اترتے۔

'فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ' اوپر 'اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ' سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ کچھ لوگ تھے جو حضرت لوطؑ پر ایمان لائے تھے لیکن اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اہل و عیال کے سوا کوئی اور ان پر ایمان لانے والا نہ تھا۔ اگر کچھ لوگ ایمان لائے ہوتے تو نجات پانے والوں میں ان کا ذکر بھی ہوتا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ایک قلیل گروہ، جیسا کہ لفظ 'اُنَاسٌ' سے ظاہر ہوتا ہے، ان پر ایمان تو لایا لیکن یہ لوگ سب ان کے متعلقین ہی میں سے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کو لفظ 'اَهْل' ہی سے تعبیر فرمایا۔

اس 'اَهْل' میں سے بھی حضرت لوطؑ کی بیوی خارج ہو گئی۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ اس کی طبیعت کا فساد تھا۔ اس فساد طبیعت کو اس بات سے بھی تقویت ملی ہو گی کہ اس کا تعلق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا،

اسی ناہنجار قوم سے تھا۔ خاندان اور قوم کی عصبیت اکثر حق کی راہ میں رکاوٹ بنی ہے۔ اس زنجیر کو توڑنے میں صرف وہی لوگ کامیاب ہوئے ہیں جن کے اندر خدا کی لگن اتنی شدید ہوئی کہ وہ ہر مخالف جذبہ پر غالب آگئی۔ قرآن نے اس صورت کا ذکر خاص طور پر اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے فرمایا کہ نجات کی راہ صرف ان کے لیے کھلتی ہے جو خود اس کے طالب ہوں اور دوسری چاہتوں کو جو اس میں روک بنیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر یہ عشق حق اور اس کے لیے قربانی کا یہ جذبہ کسی میں نہ ہو تو ایک پیغمبر کی بیوی، ایک پیغمبر کا بیٹا، ایک پیغمبر کا باپ یا چچا ہونا بھی آدمی کے لیے ذرا نافع نہیں ہوتا۔ حضرت لوطؑ کی بیوی، حضرت نوحؑ کے بیٹے، حضرت ابراہیمؑ کے باپ اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا انجام اس حقیقت کی ناقابلِ تردید شہادت ہے۔

قوم لوط کا عذاب

[illegible] مَّطَرًا الآیۃ' یہاں بارش سے مراد پانی کی بارش نہیں ہے بلکہ کنکروں اور پتھروں [illegible] آیا تھا جو صحراؤں سے اٹھتی ہے اور قافلے کے قافلے اور بستیوں کی بستیاں [illegible] ی اٹھائی ہوئی ریت اور جس کے برسائے ہوئے کنکروں اور پتھروں کے نیچے دب کر دفن ہو جاتی ہیں۔ عربی میں اس کو 'حاصب' یعنی کنکر پتھر برسانے والی آندھی کہتے ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں اس عذاب کی نوعیت یہ بیان فرمائی ہے۔

"قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے ایک آندھی بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر 'حاصب' (کنکر پتھر برسانے والی آندھی) بن گئی۔ اس سے اول اول تو ان کے اوپر کنکروں اور پتھروں کی بارش ہوئی، پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ چنانچہ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے 'فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا' ۴۰ عنکبوت (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر پتھر برسانے والی آندھی بھیجی) نیز فرمایا ہے 'فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ' ۸۲ - حجر (پس ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گل کے پتھروں کی بارش کی) یعنی ایسی تند آندھی چلی کہ ان کے مکانات زمین کے برابر ہو گئے اور اوپر سے کنکر اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا۔ جیسا کہ فرمایا ہے 'وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى' ۵۳ نجم (اور الٹی ہوئی بستیاں جن کو الٹ دیا اور پھر ان کو ڈھانک دیا جس چیز سے ڈھانک دیا)"

آگے مولاناؒ نے تورات کے ترجموں پر تنقید کر کے یہ واضح فرمایا ہے کہ ترجمہ میں غلطی کر کے کس طرح انھوں نے صورت واقعہ کچھ سے کچھ بنا دی۔ پھر خلاصۂ بحث ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں۔

"اس سے معلوم ہوا کہ قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے سنگ ریزے برسانے والی آندھی کا عذاب بھیجا جس نے ان کو اور ان کے مکانوں کو ڈھانک لیا اور اگر اس کے ساتھ تورات کا بیان بھی ملا لیا جائے تو اس پر اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ ان پر بجلی اور کڑکے کا عذاب بھی آیا۔"

اہلِ مدین اور حضرت شعیبؑ کی سرگزشت

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا۔ قومِ مدین کا مسکن بحرِ احمر کے ساحل پر کوہِ طور کے جنوب و مشرق میں تھا۔ ان کے پیغمبر حضرت شعیبؑ ہوئے۔ یہ وہی حضرت شعیبؑ ہیں جنھوں نے اپنی ایک صاحب زادی کا نکاح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کیا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے ایک طویل عرصہ تک ان کے پاس قیام کیا اور ان کی بکریاں چرائیں۔ یہ پوری سرگزشت سورۂ قصص میں بیان ہوئی ہے اور اللہ کے پاکیزہ خصائل بندوں کی نہایت پاکیزہ اور موثر سرگزشت ہے۔

مدین کے لوگ چونکہ ایک اہم تجارتی گزرگاہ پر تھے اس وجہ سے انھوں نے تجارت میں بہت ترقی کی اور پھر ان کے اندر عقائدی خرابیوں کے ساتھ ساتھ وہ برائیاں بھی پیدا ہوگئیں جو تجارت پیشہ قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ آگے حضرت شعیبؑ کی دعوت میں ان لوگوں کی ان برائیوں کا ذکر ہے۔

قَالَ یٰقَوْمِ ... قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ، یہاں جس 'بَیِّنَۃ' کا ذکر ہے اس کی کوئی تفصیل قرآن یا تورات میں مذکور نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد کوئی حسی معجزہ ہو جو عام سنتِ الٰہی کے مطابق، دوسرے رسولوں کی طرح ان کو بھی عطا ہوا لیکن قرآن نے اس کی طرف صرف اشارہ کر دیا، اس کی نوعیت واضح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد خود ان کی اپنی ذات اور اپنی دعوت ہو اس لیے کہ رسول خود اپنی ذات میں ایک کامل بینہ اور کامل حجت ہوتا ہے۔ وہ ہر پہلو سے حق کو اس طرح واضح اور مبرہن کر دیتا ہے کہ ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کے سوا کسی کے لیے بھی اس سے اعراض کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ معجزہ نبوت کے شرائط میں سے نہیں بلکہ ضروریات اور لوازم میں سے ہے۔ کوئی قوم اگر مطالبہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اگر چاہتا ہے، اتمامِ حجت کے طور پر، نبی کے ذریعہ سے معجزہ بھی صادر کرا دیتا ہے۔ نبی کی اصل دعوت ان بینات پر مبنی ہوتی ہے جو عقل و فطرت کے اندر ودیعت ہیں اور اس کی زندگی ان بینات کا مظہرِ کامل ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوم کے اندر خدا کا ایک چلتا پھرتا نور ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر کلمہ، اس کا ہر اشارہ اور اس کا ہر عمل اس کی صداقت، اس کی حکمت اور اس کے سفیرِ الٰہی ہونے کی ایسی گواہی ہوتا ہے کہ اس کی تکذیب صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے دل کی گواہی کے خلاف اس کی تکذیب کرنا چاہتے ہیں۔

معاملات میں دیانت اور راست بازی

فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا۔ تجارتی کاروبار اور لین دین میں چونکہ اشیا عام طور پر ناپی یا تولی جاتی ہیں اس غالب پہلو کے سبب سے ناپ تول ہی کا ذکر ہوا۔ اصل مقصود معاملات میں دیانت اور راست بازی کی تعلیم ہے۔ ناپ تول میں کمی کرنا کوئی منفرد برائی نہیں ہے بلکہ یہ کسی قوم کے اندر بہت سی برائیوں کے جمع ہو جانے کی علامت ہے۔ یہ درحقیقت عدل و قسط کے تصور کے مختل ہو جانے اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کے عقیدے کے مردہ ہو جانے کی نشانی ہے جس کا فساد لازماً زندگی کے ہر پہلو میں سرایت کرتا ہے لیکن سرطانی پھوڑے کی طرح اس کا ظہور کسی کے اندر کسی پہلو سے ہوتا ہے، دوسرے کے اندر کسی اور پہلو سے۔ مدین کے لوگ چونکہ

تجارت پیشہ تھے اس وجہ سے ان کے اندر یہ ناپ تول کی خیانت کی شکل میں ظاہر ہوا لیکن تھا یہ ان کے پورے نظامِ تمدن و معاشرت میں سرایت کیے ہوئے اس وجہ سے قرآن نے ایفائے کیل و میزان کی تاکید کے ساتھ منفی پہلو سے بھی واضح فرما دیا کہ ملک میں فساد نہ مچاؤ یعنی یہ ناپ تول کی کمی ملک کے پورے نظام معاشرت و معیشت کے درہم برہم کر دینے کے ہم معنی ہے۔ اگر تمھاری یہ روش نہ بدلی تو بالآخر تمدن کی عمارت کی کوئی اینٹ بھی اپنے مقام پر قائم نہ رہ سکے گی اس لیے کہ خدا نے آسمان و زمین کو ایک میزان پر قائم کیا ہے۔ اگر یہ میزان ایک پل کے لیے بھی مختل ہو جائے تو آسمان و زمین درہم برہم ہو جائیں۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بندے اپنے دائرۂ اختیار میں بھی ملک کے نظام کو اسی وقت تک قائم رکھ سکیں گے جب تک وزن و قسط کو قائم رکھیں گے، اگر وزن و قسط کو انھوں نے درہم برہم کیا تو پھر پورے نظام کی ایک ایک چول ہل جائے گی۔ سورۂ رحمان میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے۔ 'وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ وَأَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ'۔ (اور اس نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں ایک میزان رکھی، کہ تم بھی میزان میں حدود سے نہ ہٹو اور وزن بالکل ٹھیک ٹھیک قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو)

تمدن کے فساد کا ایک سبب

'بَعْدَ اِصْلَاحِهَا' کی قید کے اندر جو زور ہے اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ یہاں اوپر کی ساری تقریر کے بعد اس کا مفہوم مزید واضح ہو گیا ہے۔ اوپر آپ نے دیکھا کہ قوموں نے اپنی سرکشی کے سبب سے بار بار نظامِ حق و عدل کو درہم برہم کیا ہے اور قدرت کے ہاتھوں نے ہر بار اس کو درست کیا ہے۔ حضرت نوحؑ کی سرگزشت سے لے کر حضرت شعیبؑ کی سرگزشت تک ہر قوم اور ہر رسول کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے۔ اہل مدین کو بھی جو اقتدار حاصل ہوا تھا ایک فاسد اقتدار کو مٹا کر حاصل ہوا تھا۔ یہ لوگ دین و شریعت سے ناآشنا لوگ نہ تھے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے نسبت رکھنے والے اور پچھلے نبیوں کی تعلیم کے حامل ہونے کے مدعی تھے لیکن دوسری قوموں کی طرح انھوں نے بھی اس تعلیم کو اپنی خواہشات نفس کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر حضرت شعیبؑ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ 'ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ' اگر تمھیں ایمان کا دعویٰ ہے تو اس دعوے کی صداقت کے لیے ضروری ہے کہ اس فساد کی روش کو چھوڑ کر اصلاح کی وہ روش اختیار کرو جس کی دعوت میں دے رہا ہوں۔ یہی روش اس ایمان کا مقتضیٰ ہے جس کے تم مدعی ہو۔

'وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا'۔ یہ قوم کے سرکشوں کی ان سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ حضرت شعیبؑ کے ساتھیوں کو ہراساں اور خوف زدہ کرنے اور ایمان کی راہ سے ہٹانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے جگہ جگہ ہر نکڑ پر گنڈے سرِ راہ بیٹھ جاتے اور جہاں کوئی مسلمان مل جاتا اس کے درپئے آزار ہو جاتے۔ اس کو ڈراتے دھمکاتے کہ وہ حضرت شعیبؑ

کا ساتھ اور ایمان کی راہ چھوڑ کر پھر ان کے طریقہ پر آ جائے۔ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کی وضاحت ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں۔ خدا تک پہنچنے کی راہ توحید ہے۔ اس راہ میں کجی کرنے کے معنی اس کو شرک کی پگڈنڈیوں کی طرف موڑنے اور لوگوں کو توحید سے ہٹا کر گمراہی کے راستوں پر ڈالنے کے ہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۔ پہلے جملے میں شکر کی دعوت اور دوسرے جملے میں کفرانِ نعمت کے انجام کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم چھوٹے سے خاندان کی شکل میں اس علاقے میں آ کر بسے تھے، پھر خدا نے تم کو ایک طاقتور قوم بنا دیا۔ تمھاری تعداد کی کثرت کے ساتھ ساتھ تمھارے اسباب معیشت و تمدن میں بھی اضافہ ہوا یہاں تک کہ اسباب و وسائل کے اعتبار سے تم اس درجے کو پہنچے جو آج تمھیں حاصل ہے۔ یہ سب اللہ کی دین ہے اور اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ خدا کے شکر گزار بنو اور زندگی کی وہ روش اختیار کرو جو خدا کو پسند ہے۔ لیکن تم نے اس کے برخلاف کفرانِ نعمت اور سرکشی کی راہ اختیار کی اور خدا کی زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مچا رہے ہو تو مفسدین کے انجام کو نہ بھولو۔ تمھارے دائیں بائیں ثمود اور قوم لوط کے آثار تباہی موجود ہیں۔ ان کے انجام سے سبق حاصل کرو۔

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ۔ اوپر مفسدین کے جس انجام سے ڈرایا ہے یہ اسی سے متعلق ایک شبہ کا ازالہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مفسدین کا یہ انجام تو قطعی اور یقینی ہے۔ تمھیں جو مہلت مل رہی ہے اس سے یہ نہ سمجھو کہ میری بات جھوٹی ہے۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ خدا نے اب تک جو تمھیں مہلت دے رکھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں سے ایک گروہ میری بات پر ایمان لایا ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم میں سے اور بھی جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے وہ چھٹ کر علیحدہ ہو جائیں۔ پس ان کی خاطر تمھیں یہ مہلت مل رہی ہے۔ اس مہلت تک انتظار کرو۔ اس کے بعد خدا ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ فرما دے گا اور وہ بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔

مفسدین کی مہلت کا قانون

یہ حضرت شعیبؑ نے ایک سنت الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ قوم کی غالب اکثریت رسول کی دعوت کا انکار کر دیتی ہے اور اس انکار پر اڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات جلد واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ قوم ایمان کی صلاحیت سے بالکل خالی ہے۔ پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس پر عذاب بھی جلد آ جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ قوم کے اندر سے ایک گروہ ایمان لاتا ہے، دوسرا گروہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ صورت اس بات کا قرینہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے اندر کچھ صلاحیت موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو مزید بلویا جائے تو اس کے اندر سے کچھ مزید مکھن نکلے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان اور فہر کرنے میں بہت دھیما ہے اس وجہ سے وہ ایسی صورت میں قوم کو مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ نبی اور صالحین اپنی پوری قوم کو اپنے چھاج میں اچھی طرح پھٹک لیتے ہیں۔ اس عمل کے پورے ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس قوم کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔ اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکلتا

ہے کہ قوم کو یہ مہلت ان صالحین کی برکت سے ملتی ہے جو اس کے اندر سے رسول کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ 'فَاصْبِرُوا' یہاں انتظار کے معنی میں ہے اور 'خَيْرُ الْحَاكِمِينَ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہر حال اس کا فیصلہ بالکل حق و عدل پر مبنی ہوگا اور ٹھیک اس وقت ہوگا جب کہ اس کو ہونا چاہیے۔

'قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ الآیہ' یہ قوم کے متکبرین کی طرف سے حضرت شعیبؑ اور ان کے ساتھیوں کو آخری دھمکی ہے کہ یا تو تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ ورنہ ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال چھوڑیں گے۔ اس پر حضرت شعیبؑ نے فرمایا 'أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ' یعنی کیا تم اپنی ملت میں لوٹنے پر ہماری خواہش اور ارادہ کے علی الرغم ہمیں مجبور کرو گے؟ حضرت شعیبؑ کے اس ارشاد سے یہ بات صاف نمایاں ہے کہ انھوں نے وطن سے نکالے جانے کی دھمکی کو تو یک قلم نظر انداز کر دیا لیکن ان کی دوسری دھمکی کا نوٹس لیا اور اس کا جواب بڑے واضح اور قطعی لفظوں میں دیا جس کی تفصیل آگے والی آیت میں ہے۔

'قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّانَا اللَّهُ مِنْهَا' یہ بڑا ہی فیصلہ کن جواب ہے۔ اس میں ایمان پر غیر متزلزل عزم کا اظہار بھی ہے اور ملتِ کفر سے انتہائی بیزاری کا اعلان بھی۔ حضرت شعیبؑ نے اول تو اس ملت کو افتراء علی اللہ قرار دیا گویا سراسر جھوٹ کا مجموعہ جس کو بالکل بے سند خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ دوسرے فرمایا کہ جب اللہ نے اپنے فضل و رحمت سے اس لعنت سے ہمیں نجات دی تو ہمارے لیے اس میں دوبارہ مبتلا ہونے کا کیا سوال ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ جواب حضرت شعیبؑ اپنے ان ساتھیوں کی طرف سے بھی دے رہے ہیں جو حضرت شعیبؑ پر ایمان لانے سے پہلے قوم کی عام گمراہی میں مبتلا رہ چکے تھے اس وجہ سے اُنھوں نے "بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی" کے الفاظ فرمائے ورنہ جہاں تک حضرات انبیاء کا تعلق ہے وہ بعثت سے پہلے بھی ہدایت فطرت پر ہوتے ہیں۔ ان کا دامن شرک سے کبھی آلودہ نہیں ہوتا۔

تفویض الی اللہ توحید کی حقیقت ہے

'وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا' اس فقرے کے پہلے ٹکڑے میں اپنے عزم کا اظہار اور دوسرے میں تفویض الی اللہ ہے۔ اور یہی عزم اور تفویض توحید کی حقیقت ہے۔ ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ صاف سن لو کہ اب تمہاری ملت میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن اللہ کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے۔ اس کی آزمائشوں میں کامیاب اترنا اسی کی بخشی ہوئی توفیق پر منحصر ہے۔ یہ صرف اسی کو علم ہے کہ کس کے لیے کیا مقدر ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے (وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا) بس ہمارا بھروسہ صرف اللہ ہی پر ہے۔ اسی نے ہماری اس راہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے اور اسی سے یہ اُمید ہے کہ وہ ہمیں ٹھکانے لگائے گا (عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا) پس ہماری اسی سے یہ دعا ہے کہ اے ہمارے رب، ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔ 'رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ'۔ بعینہٖ یہی بات سیدنا ابراہیمؑ نے فرمائی تھی جو سورۂ انعام میں گزر چکی ہے۔ 'قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا' ۸۰ (کیا تم اللہ کے بارے

ہیں مجھ سے جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ اس نے مجھے ہدایت بخشی، اور میں ان چیزوں سے نہیں ڈرتا جن کو تم خدا
کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ میرا رب ہی کوئی بات چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے)

'وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ'، حضرت شعیبؑ کے مذکورہ بالا
فیصلہ کن جواب کے بعد اب ان سے تو ان متمردین کے لیے کچھ کہنے سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن چلتے
چلاتے انھوں نے ایک آخری دھمکی ان غریب مسلمانوں کو اور سنا دی جو حضرت شعیبؑ پر ایمان لائے تھے کہ اگر
تم لوگوں نے اس شخص کا ساتھ نہ چھوڑا تو یاد رکھو کہ بڑے ہی خسارے میں رہو گے۔ اس خسارے کی انھوں
نے کوئی وضاحت نہیں کی اس لیے کہ اس کے ابہام میں ہی سب کچھ چھپا ہوا ہے اور اس لفظ کے استعمال میں
ہمدردی کی نمائش بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو نیک و بد تمھیں سمجھا دیا ہے لیکن اپنی بہبود کی یہ بات تمھاری
سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو اس کے نتائج خود بھگتو گے۔

قومِ شعیب کا عذاب

'فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ'۔ بعینہٖ یہی آیت اوپر قوم صالح کی سرگزشت میں بھی
گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ مجرد عذاب کی تعبیر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس عذاب کی نوعیت کیا
تھی تو اس سوال کی وضاحت اس لفظ سے نہیں ہوتی۔ اس عذاب کی تعبیر سورۂ ہود آیت ۹۴ میں لفظ
'صَیْحَة' سے کی گئی ہے جس کے معنی ڈانٹ اور کڑک کے ہیں۔ پھر اسی کی تعبیر سورۂ شعراء آیت ۱۸۹ میں
'عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّة' سے کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب دور سے دیکھنے میں غبار یا دھوئیں
کے ایک ستون یا پہاڑ کی شکل میں نظر آیا۔ یہ قرینہ، جیسا کہ ہم قوم لوط کی سرگزشت میں بیان کر چکے ہیں، 'حَاصِب'
کے عذاب کا ہے۔ 'حَاصِب' کے عذاب میں 'رجفه' 'صیحه' اور ظلہ، سب جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کی
تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ قرآن کے ایک اور مقام سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان پر قوم لوط ہی والا عذاب
نازل ہوا تھا۔ سورۂ ہود میں حضرت شعیبؑ کی زبان سے قوم کو مخاطب کر کے یہ دھمکی نقل ہوئی ہے۔ 'یٰقَوْمِ
لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِیْۤ اَنْ یُّصِیْبَكُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِیْدٍ' ۸۹۔ ھود
(اے میرے ہم قومو، میری مخالفت تمھارے لیے کہیں اس بات کا باعث نہ بن جائے کہ تم پر بھی اسی طرح کا
عذاب آدھمکے جس طرح کا عذاب قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر آیا اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور بھی نہیں)
اس آیت کے آخری فقرے پر غور کیجیے تو اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ یہ بھی اسی حاصب کی زد میں آئے جس
کی زد میں ان کی پیشرو پڑوسی قوم لوط کے لوگ آئے تھے۔

'اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ۚۛ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ'۔ یہ اس عذاب کا نتیجہ بیان ہوا
ہے اور اس کے دونوں فقروں میں ان دونوں دھمکیوں کی طرف تلمیح ہے جو قوم شعیبؑ کے کفار نے حضرت
شعیبؑ اور ان کے ساتھیوں کو دی تھیں۔ انھوں نے دھمکی دی تھی کہ ہم تم کو اپنی بستی سے نکال کر چھوڑیں گے،
اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ خود اس دیار سے اس طرح مٹے ع گویا کہ ان تلوں میں کبھی تیل ہی نہ تھا۔

انھوں نے حضرت شعیبؑ کے ساتھیوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم اس شخص کی پیروی سے دست کش نہ ہوئے تو بڑے خسارے میں پڑو گے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خسارے میں پڑے۔

'فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ'۔ یہی آیت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ اوپر قوم صالحؑ کی سرگزشت میں گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۷۹۔ وہاں ہم نے اس کے موقع و محل کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ حضرت شعیبؑ نے یہ بات درحقیقت اس وقت فرمائی ہے جب انھوں نے خدا کی طرف سے حکم ہجرت مل جانے کے بعد اعلان برأت کر کے ہجرت فرمائی ہے لیکن عذاب کی بادرت دکھانے کے لیے اس کا ذکر عذاب کے ذکر کے بعد ہوا۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن میں ایک سے ایک بڑھ کر لطیف موجود ہیں جو پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

'فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ'۔ یہ مجرد افسوس کی نفی نہیں بلکہ ہمدردانہ افسوس کی نفی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمھیں خدا کا پیغام پہنچا دیا اور تمھاری خیر خواہی میں اپنے دن رات ایک کر دیے۔ اس سب کے باوجود بھی اگر تم اپنا بیڑا غرق کرنے پر تلے بیٹھے ہو تو اب میرے لیے تمھارے اس انجام پر ترس کھانے کا کیا موقع باقی رہا!!

۱۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۹۴-۱۰۲

اوپر کی تمام سرگزشتیں سنانے سے مقصود قریش کو آگاہ کرنا تھا کہ جس کسوٹی پر یہ قومیں پرکھی گئیں وہی کسوٹی اب تمھارے سامنے ہے اور تم بھی، اگر تم نے اپنے رسول کی تکذیب کر دی، وہی انجام دیکھو گے جو انھوں نے دیکھا۔ اس وجہ سے آگے کی آیات میں وہ اصول و ضوابط بھی نگاہوں کے سامنے کر دیے ہیں جو مذکورہ بالا تاریخ سے سامنے آتے ہیں تاکہ قریش جو قدم بھی اٹھائیں نتائج سے اچھی طرح آگاہ ہو کر اٹھائیں۔

آیات ۹۴-۱۰۲

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِىٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾ أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿٩٧﴾ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿٩٨﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ أَهْلِهَا أَن لَّوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾ تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِن قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿١٠١﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِم مِّنْ عَهْدٍ ۖ وَإِن وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿١٠٢﴾

ع

ترجمۂ آیات ۹۴-۱۰۲

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی رسول بھیجا، اس کے باشندوں کو مالی اور جسمانی مصائب سے آزمایا کہ وہ رجوع کریں۔ پھر ہم نے دکھ کو سکھ سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ دکھ اور سکھ تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچے ہیں۔ پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا کوئی گمان نہیں رکھتے تھے۔ اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔ ۹۴-۹۶

تو کیا بستیوں والے نچنت رہ سکے اس بات سے کہ آدھمکے ان پر ہمارا عذاب راتوں رات اور وہ سوئے پڑے ہوں۔ اور کیا بستیوں والے نچنت رہ سکے اس

بات سے کہ ان پر آدھمکے ہمارا عذاب دن دہاڑے اور وہ کھیل کود میں ہوں۔ تو کیا وہ اللہ کی تدبیر سے بچ سکے۔ تو یاد رکھو کہ خدا کی تدبیر سے وہی لوگ نچنت ہوتے ہیں جو نامراد ہونے والے ہوں۔ کیا سبق نہیں ملا ان کو جو ملک کے وارث بنے ہیں اس کے اگلے باشندوں کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ابھی آ پکڑیں اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیں تو وہ سننے سمجھنے سے رہ جائیں! یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتوں کا کچھ حصہ ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ ان کے پاس ہمارے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ ایمان لانے والے نہ بنے بوجہ اس کے کہ وہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے۔ اسی طرح اللہ ٹھپہ لگا دیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔ اور ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد کی استواری نہیں پائی۔ ان میں سے اکثر بدعہد ہی نکلے۔ ۹۷-۱۰۲

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ۝ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۹۴-۹۵)

'باساء' اور 'ضراء' کا مفہوم

'باساء' اور 'ضراء' کی تحقیق ۴۲ انعام کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ یہ دونوں لفظ، جب ایک دوسرے کے بالمقابل استعمال ہوتے ہیں تو پہلے سے مالی آفتیں مراد ہوتی ہیں۔ مثلاً قحط، گرانی، کساد بازاری وغیرہ اور دوسرے سے جسمانی آفتیں مثلاً بیماریاں اور وبائیں وغیرہ۔ لیکن جب 'ضرا' کا لفظ 'سراء' کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو یہ دونوں الفاظ ہر قسم کی بدحالی و خوش حالی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔

'عفا الشئ'، 'کثر وطال'۔ فلاں چیز خوب بڑھی، خوب اُگی۔ 'عفت الارض'، 'غطھا النبات'، زمین سبزہ اور نباتات سے ڈھک گئی۔

نبی کی منادی توبہ کی بازگشت آفاق ہیں

یہ اس سنت الٰہی کا بیان ہے جو انبیاء کی بعثت کے ساتھ لازماً ظاہر ہوتی ہے اور ان تمام انبیا کے زمانوں میں ظاہر ہوئی جن کی سرگزشتیں اوپر بیان ہوئیں۔ وہ سنت یہ ہے کہ جب نبی توبہ و استغفار اور جزا و سزا

کی منادی شروع کرتا ہے تو اس کے محرکات و مویدات اس کائنات میں بھی ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ ایک طرف پیغمبر لوگوں کو غفلت و خدا فراموشی کے انجام، فساد فی الارض کے نتائج اور دنیا اور آخرت میں خدا کی پکڑ سے ڈراتا ہے، دوسری طرف اللہ تعالیٰ لوگوں کو سیلاب، قحط، وبا، طوفان کی آزمائشوں میں بھی مبتلا کرتا ہے تاکہ لوگ آنکھوں سے بھی، اگر ان کے پاس دیدۂ عبرت نگاہ ہو، دیکھیں کہ اس طرح اللہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے اور پھر خدا کے سوا کوئی ان کو بچانے والا نہیں بن سکتا۔ اس طرح گویا دعوت کے ساتھ واقعات کی تائید اور عقل و فطرت کی شہادت کے ساتھ مشاہدہ کی اثر انگیزی بھی جمع ہو جاتی ہے۔ نبی جو کچھ کہتا ہے، آسمان و زمین دونوں مل کر اپنے اسٹیج پر گویا اس کے مناظر دکھا بھی دیتے ہیں تاکہ جن کے اندر اثر پذیری کی کچھ بھی رمق ہو وہ خدا کے آگے جھکیں اور توبہ و اصلاح کریں۔

آزمائش کی ایک اور کروٹ

جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں اور اثر قبول کرنے والے دل ہوتے ہیں وہ ان آزمائشوں سے فائدہ اٹھاتے اور خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ان کو گویا نبی کی دعوت کی بازگشت تمام عناصر کائنات سے سنائی دیتی ہے اور وہ صرف کانوں سے سنتے ہی نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھتے بھی ہیں لیکن جن کے دل پتھر اور کان بہرے ہو چکے ہیں ان کے لیے یہ سنتِ الٰہی ایک دوسری شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ یہ کہ پھر اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دے دیتا ہے۔ بدحالی کی جگہ خوش حالی آ جاتی ہے، دنیوی اسباب و وسائل کے ہر گوشے میں ترقی و فراخی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، آزمائشوں اور تکلیفوں کے دن ذہنوں سے نکل جاتے ہیں۔ پھر سرکش لوگ چہکنا اور نبی اور اس کے ساتھیوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ عقل کے کوتاہ لوگ، پچھلے قحط یا گزشتہ سیلاب یا فلاں آفت کو ہمارے اعمال و عقاید کی خرابی پر خدا کی تنبیہ سمجھتے تھے اور اپنے وعظوں میں طرح طرح سے ہم کو ڈراتے اور پست ہمت کرتے رہے۔ حالانکہ ان باتوں کو ایمان و اخلاق سے کیا تعلق؟ اس قسم کی گردشیں قوموں کی زندگی میں آیا ہی کرتی ہیں۔ ایسے دن کچھ ہمارے ہی اوپر تو نہیں گزرے ہیں۔ ہمارے باپ دادوں پر بھی گزرے ہیں جو بڑے اچھے اور نیک نہاد لوگ تھے۔ یہ تو زمانے کے اتفاقات ہیں۔ کبھی تنگی ہے کبھی فراخی، کبھی فصل اچھی ہوئی، کبھی ماری گئی، کبھی سیلاب آ گیا، کبھی قحط پڑ گیا، ان چیزوں کو اعمال و اخلاق سے باندھ دینا محض خرد باختگی اور وہمی پن ہے۔

جس طرح آفات و مصائب کے ظہور کا مقصد لوگوں کو جھنجھوڑنا اور بیدار کرنا بتایا گیا ہے (لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ) اسی طرح اس امہال اور ڈھیل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان تنبیہات سے نہیں جاگے ہیں وہ بدمست ہو کر گہری نیند سو جائیں تاکہ خدا کا عذاب ان کو ایسی حالت میں دبوچے کہ ان کو خبر نہ ہو کہ کب آیا اور کہاں سے آیا۔ فَأَخَذْنَاهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ۔[1]

---

[1] اس سنت الٰہی کی وضاحت ہم انعام کی آیات ۴۲-۴۶ کے تحت بھی کر چکے ہیں۔ نیز اعراف کی آیت ۱۳۰ کے تحت بھی اس کے بعض پہلو واضح ہوں گے۔

نیک و بد کے لیے مشترک تنبیہی آفتیں

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ جو آزمائشیں اور آفتیں لوگوں کے اندر رجوع الی اللہ یا قرآن کے الفاظ میں تضرع پیدا کرنے کے لیے آتی ہیں وہ عام اور مشترک ہوتی ہیں۔ ان میں نیک و بد دونوں ہی تپائے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال نادانوں اور سرکشوں کے لیے ایک وجہ فتنہ و مغالطہ بن جاتی ہے۔ وہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جب اس قحط یا وبا نے عقیدہ اور عقیدہ، کردار اور کردار میں کوئی فرق نہیں کیا، اس کا نشانہ جس طرح ہم بنے اسی طرح ہمارے ملامت گر اور ناصح بھی بنے تو یہ کس طرح تسلیم کیا جائے کہ اس کا کوئی رشتہ کفر و ایمان اور عقائد و اعمال سے ہے، یہ بات تو اس صورت میں صحیح ہوتی جب نبی اور اس کے ساتھی اس قحط یا آفت سے اس طرح بچا لیے گئے ہوتے کہ ان کے لیے تو آسمان سے من و سلوی اترتا ہوتا اور ہم سوکھے چمڑے چباتے ہوتے جب یوں نہیں ہوا بلکہ ہم اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ گرفتار مصائب رہے تو یہ کس طرح مانا جائے کہ ان مصائب کا کوئی علاقہ لوگوں کی نیکی و بدی سے ہے۔ درحقیقت یہی مغالطہ ہے جو انبیا کے مخالفین کی طرح آج کے بدمستوں کو بھی اندھا بنائے ہوئے ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ سائیکلون اٹھا وہ بلا امتیاز نیک و بد سب کو بہا لے گیا۔ زلزلہ آیا اس نے مندر، مسجد، کلیسا سب ڈھا دیے، قحط آیا اور اس کی زد میں نمازی اور غیر نمازی، فاسق اور مومن سب آئے۔ یہ چیز ان کے لیے فتنہ بن جاتی ہے۔ اول تو وہ ان چیزوں سے کوئی صحیح اثر لیتے ہی نہیں اور اگر وقتی طور پر دلوں میں کچھ گداز پیدا ہوتا بھی ہے تو اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ بہت جلد خواہشیں ان کو اسی غفلت و سرمستی میں مبتلا کر دیتی ہیں جس میں وہ اب تک مبتلا رہے تھے اور ان کا مرشد شیطان ان کو وہی جاہلی فلسفہ از سر نو پڑھا دیتا ہے جس کا ذکر اوپر گزرا کہ قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ اس قسم کے سرد و گرم دن تو قوموں پر آتے ہی رہتے ہیں۔ اس ابلیسی مغالطہ سے محفوظ رہنے کے لیے اس حقیقت کو ہمیشہ مستحضر رکھنا چاہیے کہ تنبیہی مصائب میں اگرچہ ظاہر کے اعتبار سے نیک و بد میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا اس لیے کہ ان کا مقصود سزا دینا نہیں۔ بلکہ لوگوں میں تضرع پیدا کرنا ہوتا ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے بڑا فرق ہوتا ہے۔ اہل ایمان اگر ان مصائب میں کوئی حصہ پاتے ہیں تو اس سے ان کے تضرع میں مزید اضافہ ہوتا ہے جس سے ان کی کوتاہیوں کی تلافی اور ان کے مراتب و مدارج میں ترقی ہوتی ہے۔ برعکس اس کے جن لوگوں کے اندر ان سے تضرع پیدا نہیں ہوتا ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور اس کے بعد جب ان پر فیصلہ کن عذاب آتا ہے تو وہ ان کا استیصال کر دیتا ہے۔ پھر اس کی زد سے ان کے اندر کے وہی لوگ بچتے ہیں جو اصلاح منکر کا فرض ادا کرنے والے ہوتے ہیں۔

دو اہم حقیقتیں

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا الاٰیۃ۔ اَهْلَ الْقُرٰٓی سے مراد وہی قومیں ہیں جن کی تکذیب کی داستان اوپر بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہ معاملہ نہ کرتا کہ ایک مہلت دینے کے بعد ان کو عذاب میں پکڑ لیتا بلکہ ان کے لیے آسمان و زمین دونوں طرف سے اپنی بے پایاں برکتوں کے دروازے کھول دیتا۔ یہاں دو حقیقتیں واضح

ہوتیں۔ ایک تو یہ کہ کسی قوم کو ڈھیل کے طور پر اسباب و مال کی جو فراخی حاصل ہوتی ہے وہ خدا کی رحمت و برکت نہیں ہوتی بلکہ اس کی نوعیت مریض کے آخری سنبھالے کی ہوتی ہے جس کے بعد ایک آخری ہچکی کی کسر باقی رہ جاتی ہے جو مریض کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ جس طرح شمع بجھنے سے پہلے ایک مرتبہ بھڑکتی ہے پھر بجھ جاتی ہے اسی طرح یہ قوم آخری بار بھڑک کر بجھ جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ ایمان و تقویٰ کی زندگی جس طرح آخرت میں خدا کی رحمتوں کی ضامن ہے اسی طرح دُنیا میں بھی اگر کوئی قوم اس کو اختیار کرے تو یہ آسمان و زمین کی تمام برکتوں اور فیروز مندیوں کی کلید ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ دُنیا کی کامیابیوں کی راہ میں خدا پرستی اور خدا ترسی کوئی رکاوٹ ہے۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ؕ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ؕ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (۹۷-۹۹)

خدا کی پکڑ بے امان ہوتی ہے

'اَهْلُ الْقُرٰى' سے اشارہ انہی قوموں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قریش کو توجہ دلائی کہ بتاؤ وہ خدا کے عذاب کے مقابل میں اپنے بچاؤ کے لیے کوئی بند باندھ سکے؟ ہمارا عذاب ان پر رات کی تاریکیوں میں دبے پاؤں بھی آیا جب کہ وہ سو رہے تھے اور دن دہاڑے ڈنکے کی چوٹ بھی آیا جب کہ وہ اپنی دلچسپیوں اور سرگرمیوں میں مصروف تھے لیکن نہ رات میں وہ اس سے اپنے آپ کو بچا سکے نہ دن میں۔ خدا کی تدبیر بے امان ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ اس سے اپنے کو بچا سکے۔ اس وجہ سے کسی کے لیے جائز نہیں کہ اس سے بےخوف اور بے خوف رہے۔ اس سے بےخوف اور بے خوف صرف وہی رہتے ہیں جن کی شامت آئی ہوئی ہو اور وہ نامراد ہونے والے ہوں۔ مکر جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں، خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں۔ خفیہ تدبیر کا مطلب یہ ہے کہ خدا وہاں سے پکڑتا ہے جہاں سے کسی کو پکڑے جانے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اوپر تنبیہ کے بعد ڈھیل کی جو سنت بیان ہوئی وہ اس خفیہ تدبیر الٰہی کی ایک مثال ہے۔ قوم تو سمجھتی ہے کہ اب اُس نے پالا مار لیا لیکن درحقیقت وہیں اس کی ہلاکت کا کھڈ ہوتا ہے۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۱۰۰)

'اَلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ' سے مراد یہاں قریش ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ انھیں قوموں کے بعد جن کا ذکر اوپر گزرا اس ملک میں حکومت و اقتدار کے وارث ہوئے ہیں آخر وہ اپنے مورثوں کی تاریخ سے سبق کیوں نہیں لیتے، خدا نے جس ترازو اور جس باٹ سے ان کو تولا وہ اسی باٹ اور ترازو سے ان کو کیوں نہیں تولے گا! فرمایا کہ آخر وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس طرح ہم نے ان کو ان کے جرموں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اسی طرح، جب چاہیں، ان کو بھی ہلاک کر دیں۔

دلوں پر مہر کر دینا تنبیہ ہے

'وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ' بالکل اسی محل میں ہے جس محل میں سورۂ انعام میں فرمایا ہے قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ - ۴۶ (ان سے پوچھو

اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں سلب کرلے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تمہیں یہ چیزیں واپس دے سکے) یہ امر ملحوظ رہے کہ دلوں پر مہر عذابِ الٰہی کا مقدمہ ہے۔ کسی قوم پر عذابِ الٰہی نازل ہونے سے پہلے اس کے دلوں پر مہر لگتی ہے۔ اس باب میں خدا کا جو قانون ہے اس کی وضاحت ہم متعدد مقامات میں کر چکے ہیں۔ اسی کی دھمکی یہاں قریش کو دی ہے کہ ابھی تو ہم نے ان کے دلوں پر مہر نہیں کی ہے لیکن یہ ضد اور ہٹ دھرمی کی جس روش پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں وہ وقت دور نہیں کہ ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیں اور یہ سننے سمجھنے سے بالکل ہی رہ جائیں۔ یہ ہمارے عذاب کا مقدمہ ہوگا جس کے بعد لازماً ہمارا فیصلہ کن عذاب نازل ہو جائے گا۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰۱)

دلوں پر مہر کب لگتی ہے؟

دلوں پر مہر کب لگتی ہے، کس طرح کے لوگوں کے دلوں پر لگتی ہے اور بالآخر اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اس آیت میں ان سوالوں کا جواب ہے۔ فرمایا کہ ہم نے قوموں کی جو سرگزشت تمہیں سنائی ہے لوگوں کو چاہیے کہ اس سے سبق لیں۔ فرمایا کہ ان کے پاس خدا کے رسول نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ ان پر ایمان لانے والے نہ بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے خدا کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلاتے رہے تھے۔ آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی عام آیات سے روگردانی کا عادی ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کا دل ایسا پتھر ہو جاتا ہے کہ رسولوں کے ذریعہ سے خاص نشانیاں بھی ظاہر ہوتی ہیں تو وہ بھی اس پر کارگر نہیں ہوتیں۔ فرمایا کہ یہ طریقہ ہے ہمارے ہاں دلوں پر مہر لگانے کا۔ دل کا کام عبرت پذیری، تفکر اور تعقل ہے۔ اگر کوئی گروہ اس طرح اپنی خواہشوں کا اندھا بہرا مرید بن جاتا ہے کہ تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی وہ دل کی آنکھیں نہیں کھولتا تو ایسے لوگوں کے دل بالآخر بالکل چپاٹ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'بِمَا كَذَّبُوْا' یہاں 'يُؤْمِنُوْا' کا مفعول نہیں ہے بلکہ 'ب' بیان سبب کے لیے ہے۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ (۱۰۲)

یہ دلوں پر مہر لگنے کا نتیجہ اور اثر بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی گروہ کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے تو ان کی مت اس طرح ماری جاتی ہے کہ کوئی نشانی بھی ان کو دکھاؤ وہ اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام نہیں لیتے۔ بار بار قسمیں کھا کھا کے عہد کریں گے کہ اگر فلاں معجزہ دکھا دو تو ہم مان لیں گے لیکن وہ معجزہ بھی دکھا دیا جائے تو پھر کسی نئے معجزے کا مطالبہ شروع کر دیں گے اور اپنے پہلے عہد سے پھر جائیں گے۔ لفظ 'فاسق' یہاں عہد شکن کے مفہوم میں ہے۔ یہی مضمون زیادہ وضاحت سے سورہ انعام میں یوں بیان ہوا ہے۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۱۰۹-۱۱۰

اور وہ بڑی پکی پکی قسمیں کھا کے یقین دلاتے ہیں کہ اگر کوئی معجزہ ان کو دکھایا جائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے۔ کہہ دو کہ معجزے تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور تمھیں کیا پتہ کہ اگر معجزہ بھی آجائے گا جب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں اور ہم ان کے دلوں اور ان کی بصیرتوں کو اسی طرح اُلٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے اور ان کی سرکشی میں ان کو بھٹکتا چھوڑ دیں گے) آگے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت میں بھی یہی حقیقت ان الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۱۳۴-۱۳۵ (اور جب ان پر کوئی آفت آتی وہ کہتے، اے موسیٰ، ہمارے واسطے اپنے رب سے، اس وعدے کی بنا پر جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، دعا کرو۔ اگر تم نے یہ بلا ہمارے سر سے ٹال دی تو ہم تمھاری بات ضرور مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دیں گے۔ پھر جب ہم اس آفت کو کچھ دیر کے لیے، جس تک لازماً ان کو پہنچنا ہوتا، ٹال دیتے تو وہ دفعتہً اپنا عہد توڑ دیتے)

۱۴۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۱۰۳-۱۷۱

آگے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کے دینی و سیاسی عروج و زوال کی پوری تاریخ، اجمال مگر نہایت جامعیت کے ساتھ، سامنے رکھ دی گئی ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ ان سرگزشتوں کا تکملہ اور تتمہ ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ اوپر کی سرگزشتیں حضرت شعیبؑ کی سرگزشت پر تمام ہوئی تھیں۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کی بعثت کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے جو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ایک طرف تو فرعون اور اس کی قوم پر اللہ کی حجت تمام ہوئی اور ان کی تکذیب کے نتیجے میں فرعون اور اس کی قوم کا وہی انجام ہوا جو اوپر قوم نوحؑ سے لے کر قوم شعیبؑ تک کا بیان ہوا۔ دوسری طرف بنی اسرائیل ایک قوم کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور پھر بتدریج اللہ تعالیٰ نے ان کو مذہبی پیشوائی کا منصب بھی بخشا اور سیاسی دبدبہ اور اقتدار بھی عطا فرمایا لیکن انھوں نے اس منصب اور اقتدار کی قدر نہیں کی بلکہ آہستہ آہستہ ان برائیوں سے بھی زیادہ سنگین برائیوں میں مبتلا ہوئے جن میں پچھلی قومیں مبتلا ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جس طرح قریش کی قسمت خدا کی میزانِ عدل میں آگئی، اسی طرح بنی اسرائیل کی قسمت بھی کسوٹی پر رکھ دی گئی۔ اب ان کے فیصلہ کا وقت آگیا تھا کہ اگر اللہ سے باندھے ہوئے عہد کے مطابق اس نبی امیؐ پر یہ ایمان نہیں لاتے جس پر تورات اور تمام پچھلے صحیفوں اور انبیاء کے ذریعہ سے ان سے اقرار لیا گیا تھا تو وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں جس سے پچھلی قومیں دوچار ہوئیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۳-۱۷۱

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا

بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى
يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ
اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ
مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ
اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ
الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ
مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ
فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ
السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾
قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ
تُلْقِىَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا
سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا
يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا
هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلْقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ

۱۳ ع ۹ ۳

لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٢٣﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ
اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٢٤﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى
رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا
جَآءَتْنَا ۚ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿١٢٦﴾ وَقَالَ
الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى
الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ
نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿١٢٧﴾ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ
اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٢٨﴾ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ
اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ
عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٩﴾
وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿١٣٠﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ
وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ اَلَآ اِنَّمَا
طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣١﴾ وَقَالُوْا
مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ
بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٢﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَ
الضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا

ع ۱۴ / ۴

ع ۱۵ / ۵

مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ
وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ
اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ
فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا
غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ
الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ
يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَجٰوَزْنَا
بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ
لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ
اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ
مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ
فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ
يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ
نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى
ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ
وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ

الربع

ع ۱۶ ۱۲ ۶

سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ
قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ
فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ
جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ
اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ
عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ
الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ
تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا
بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ
الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا
يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ
وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ
الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع
وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ
خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ (وقف لازم)
وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ
ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ

الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ
بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ
وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ
اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا
تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا
فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا

ع ۱۸ ۸

الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ
وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا
مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَ
لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا
هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَاخْتَارَ مُوْسٰى
قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ
رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا
فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ
تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ
الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ
اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ
وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۭ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓئٰتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ

ع ۱۹ / ۹

قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا
كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ ع ۲۰ ۵ ۱۰
الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ وقف لازم
شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا معانقة
يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ النصف
مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى
رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا
الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ
بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ
قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ
عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ
مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ
السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا
الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ
وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ
الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ
الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ

يُمَسِّكُونَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

۲۱ ع ۹ ۱۱

ترجمۂ آیات ۱۷۱-۱۰۳

پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول بنا کر بھیجا تو اُنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم اور نشانیوں کا انکار کیا۔ تو دیکھو ان مفسدوں کا کیا انجام ہُوا! اور موسیٰ نے کہا، اے فرعون، میں خداوندِ عالم کا فرستادہ ہوں۔ سزاوار اور حریص ہوں کہ اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی اور بات منسوب نہ کروں۔ میں تمھارے پاس تمھارے خداوند کی جانب سے کھلی ہوئی نشانی لے کر آیا ہوں تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو۔ اس نے جواب دیا کہ اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اس کو پیش کرو، اگر تم سچے ہو۔ تو اس نے اپنی لٹھیا ڈال دی وہ یکایک ایک سچ مچ کا اژدہا بن گئی۔ اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تو وہ دفعتہً دیکھنے والوں کے لیے چمکتا ہُوا نکلا۔ قومِ فرعون کے اعیان نے کہا۔ یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے تو تم کیا رائے دیتے ہو؟ بولے ابھی اس کو اور اس کے بھائی کو ٹالو اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیجو جو تمام ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے تمھارے پاس لائیں۔ جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہُوئے۔ بولے بڑا صلہ ملے گا ہمیں، اگر ہم ہی غالب رہے! فرعون نے کہا، ہاں بے شک، اور تم ہمارے مقربین میں بھی داخل ہو گے۔

۱۱۴-۱۰۲

بولے اے موسیٰ، یا تو پہلے تم پیش کرو یا ہمیں پیش کرنے والے بنتے ہیں۔ اس نے کہا تمھی پیش کرو۔ تو جب انھوں نے پیش کیا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان

پر دہشت طاری کر دی اور بہت بڑا کرتب دکھایا۔ اور ہم نے موسٰی کو وحی کی کہ تم اپنی لٹھیا ڈال دو، تو وہ دفعتہً نگلنے لگی اس کو جو وہ گھڑتے تھے تو حق ظاہر ہوگیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے وہ سب نابود ہوا۔ تو اس وقت وہ مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے۔ اور ساحر سجدے میں گر پڑے۔ بولے ہم عالم کے خداوند موسیٰؑ اور ہارون کے خداوند ـــــــ پر ایمان لائے!! ۱۱۵ - ۱۲۲

فرعون نے کہا تم لوگ میری اجازت کے بغیر اس پر ایمان لائے۔ یہ ایک سازش ہے جو تم نے شہر میں اس غرض سے کی ہے کہ اس کے باشندوں کو یہاں سے نکالو۔ تو تم عنقریب جان لو گے۔ میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ وہ بولے، ہم اپنے رب ہی کی طرف تو لوٹیں گے! تم ہمارے درپے آزار صرف اس غصہ میں ہو رہے ہو کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے۔ اے ہمارے رب، ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں وفات اسلام پر دے۔ ۱۲۳-۱۲۶

اور قوم فرعون کے اعیان نے فرعون سے کہا کیا تو اسی طرح موسٰی اور اس کی قوم کو چھوڑے رکھے گا کہ وہ ملک میں بدامنی پھیلائیں اور تجھ کو اور تیری مورتوں کو ٹھکرائیں؟ اس نے کہا کہ ہم ان کے ذکور کو قتل کریں گے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان پہ پوری طرح حاوی ہیں۔ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ جس کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اس کو اس کا وارث بناتا ہے اور انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ وہ بولے ہم تو تمہارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمہارے آنے کے بعد بھی۔ اس نے

کیا توقع ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو پامال کرے گا اور تم کو ملک کا وارث بنائے گا۔
کہ دیکھے تم کیا روش اختیار کرتے ہو! ۱۲۷-۱۲۹

اور ہم نے آلِ فرعون کو قحط سالی اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ ان کو تنبیہ ہو۔ تو جب خوش حالی آتی، کہتے، یہ تو ہے ہی ہمارا حصہ اور اگر ان پر کوئی آفت آتی تو اس کو موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔ سُن رکھو کہ ان کی قسمت اللہ ہی کے پاس ہے لیکن ان میں کے اکثر نہیں جانتے۔ اور کہتے ہیں کہ خواہ تم کیسی ہی نشانی ہمیں مسحور کرنے کے لیے لاؤ ہم تو تمھاری بات باور کرنے کے نہیں۔ تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون، تفصیل کی ہوئی نشانیاں، تو انھوں نے تکبر کیا اور یہ مجرم لوگ تھے۔ اور جب آتی ان پر کوئی آفت تو درخواست کرتے کہ اے موسیٰؑ تم اپنے رب سے، اس عہد کے واسطہ سے جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔ اگر تم نے ہم سے یہ آفت دور کر دی تو ہم تمھاری بات ضرور مان لیں گے اور تمھارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے۔ تو جب ہم ان سے دور کر دیتے آفت کو کچھ مدت کے لیے جس تک وہ پہنچنے والے ہوتے تو وہ دفعتہً عہد توڑ دیتے۔ تو ہم نے ان کو کیفر کردار کو پہنچا دیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا بوجہ اس کے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروا بنے رہے۔ اور جو لوگ دبا کے رکھے گئے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث ٹھہرایا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کی ساری تعمیرات اور ان کے سارے باغ و چمن ملیامیٹ

کر دیے۔ ۱۲۰-۱۲۷

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا تو ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں کی پرستش میں لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا، اے موسیٰ جس طرح ان کے دیوتا ہیں اسی طرح کا ایک دیوتا تم ہمارے لیے بھی بنا دو۔ اس نے کہا تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔ ان لوگوں کا یہ سب کچھ جس میں یہ لگے ہوئے ہیں برباد اور جو کچھ کر رہے ہیں نابود ہونے والا ہے! اس نے کہا۔ کیا میں تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی اور معبود ڈھونڈوں درآنحالیکہ وہی ہے جس نے تم کو اہلِ عالم پر فضیلت بخشی؟ اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو آلِ فرعون سے نجات دی جو تمھیں نہایت برے عذاب چکھاتے تھے، وہ تمھارے بیٹوں کو بے دردی سے قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑی ہی آزمائش تھی۔ اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی۔ اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا، میری قوم میں میری جانشینی کرنا، اصلاح کرتے رہنا اور مفسدوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔ اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے رب مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ سکے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے، بولے تو پاک ہے، میں نے تیری طرف رجوع کیا

اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔ فرمایا، اے موسیٰ میں نے تم کو لوگوں پر اپنے پیغام اور اپنے کلام سے سرفراز کیا تو میں نے جو کچھ تم کو دیا اس کو لو اور شکر گزاروں میں سے بنو اور ہم نے اس کے لیے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔ پس اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو ہدایت کرو کہ اس کے بہتر طریقہ کو اپنائیں۔ میں تم کو عنقریب نافرمانوں کا ٹھکانا دکھاؤں گا۔ میں ان لوگوں کو جو زمین میں ناحق گھمنڈ کرتے ہیں اپنی نشانیوں سے برگشتہ کروں گا اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں بھی دیکھ لیں گے تو بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے۔ اگر ہدایت کی راہ دیکھیں گے تو اُسے تو نہ اپنائیں گے اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں گے تو اسے اپنائیں گے۔ یہ اس وجہ سے کہ اُنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروا بنے رہے۔ اور جنھوں نے ہماری نشانیوں اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال ڈھے گئے اور وہ بدلے میں وہی پائیں گے جو وہ کرتے رہے۔ ۱۴۳-۱۴۷

اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا لیا۔ ایک دھڑ جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ نہ وہ ان سے بات کر سکتا ہے اور نہ ان کو کوئی راہ دکھا سکتا ہے! اس کو وہ بنا بیٹھے اور وہ اپنے اوپر بڑے ظلم ڈھانے والے تھے! اور جب ان کو تنبہ ہُوا اور انھوں نے دیکھا کہ وہ تو گمراہ ہو گئے تو بولے کہ اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارا قصور معاف نہ کیا تو ہم نامرادوں میں سے ہو جائیں گے۔ اور جب موسیٰ رنج اور غصہ سے بھرے ہوئے اپنی قوم کی طرف لوٹے، بولے تم نے میرے پیچھے میری بہت بُری جانشینی کی۔ کیا تم نے

خدا کے حکم سے پہلے ہی جلد بازی کر دی ؟ اور اس نے تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اس کو اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ وہ بولا اے میرے ماں جائے ! قوم کے لوگوں نے مجھے دبا لیا، قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے تو میرے اوپر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دے اور میرا شمار ظالموں کے ساتھ نہ کر۔ موسیٰ نے دعا کی، اے میرے پروردگار، مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر، ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو ارحم الراحمین ہے۔ ۱۵۱-۱۴۸

بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ان کو ان کے رب کی طرف سے غضب لاحق ہوگا اور ذلت، دنیا کی زندگی میں اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم بہتان باندھنے والوں کو۔ پر جنھوں نے بُرے کام کیے، پھر اس کے بعد انھوں نے توبہ کر لی اور ایمان لائے تو اس کے بعد تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ۱۵۳-۱۵۲

اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہُوا اس نے تختیاں اٹھائیں اور اس کے نوشتہ میں ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہوں۔ اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی چنے ہمارے وقت مقرر کے لیے تو جب ان کو زلزلہ نے آ پکڑا تو موسیٰ نے کہا اے رب اگر تو چاہتا ان کو ہلاک کر چھوڑتا پہلے ہی اور مجھ کو بھی۔ کیا تو ہمیں ایک ایسے جرم کی پاداش میں ہلاک کر دے گا جس کا ارتکاب ہمارے اندر کے بے وقوفوں نے کیا۔ یہ تو بس تیری ایک آزمائش تھی۔ تو اس سے جس کو چاہے گمراہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے ہدایت دے۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین بخشنے والا ہے۔ اور تو ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی۔ ہم نے تو تیری طرف رجوع کیا۔ فرمایا، میں اپنے عذاب میں تو اسی کو مبتلا کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور

میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔ سو میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے ـــــ جو پیروی کریں گے اس نبی امّی رسول کی جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہُوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، بُرائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے اور خبیث چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اتارتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں۔ تو جو اس پر ایمان لائے، جنھوں نے اس کی عزت کی، اس کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۱۵۶ - ۱۵۷

کہہ دو، اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس اللہ کا جس کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے نبی امی رسول پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ یاب ہو۔ ۱۵۸

اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہوا جو حق کے مطابق رہنمائی کرتے اور اسی کے مطابق انصاف کرتے اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں میں الگ الگ امتیں بنا دیا اور ہم نے موسیٰ کی طرف، جب اس کی قوم نے پانی طلب کیا، وحی کی کہ اپنی لٹھیا پتھر پر مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ معین کر لیا اور ہم نے ان پر بدلیوں کا سایہ کیا اور ان پر من اور سلویٰ اتارا۔ کھاؤ ہماری بخشی ہوئی پاکیزہ چیزوں میں سے۔ اور انھوں نے کچھ ہمارا نہیں بگاڑا بلکہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔ (۱۵۹-۱۶۰)

اور یاد کرو، جب ان سے کہا گیا، اس بستی میں رہو بسو، اس میں جہاں سے چاہو کھاؤ پیو اور توبہ استغفار کرتے رہو اور دروازے میں سرفگندہ داخل ہو تو ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ خوب کاروں کو ہم مزید نوازیں گے۔ تو ان میں سے ان لوگوں نے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اس کو بدل دیا کہی ہوئی بات سے مختلف بات سے، تو ہم نے ان پر ایک آفت سماوی بھیجی بوجہ اس کے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ ۱۶۱-۱۶۲

اور ان سے اس بستی کا حال دریافت کرو جو دریا کے کنارے تھی جب کہ وہ سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی سے تجاوز کرتے تھے۔ جب سبت کا دن ہوتا تو ان کی مچھلیاں منہ اٹھائے ہوئے ان کے سامنے نمایاں ہوتیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو وہ ظاہر نہ ہوتیں۔ اسی طرح ہم ان کو آزماتے تھے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ اور یاد کرو جب کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کیے جا رہے ہو جنھیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انھیں ایک سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہ بولے کہ یہ اس لیے کہ یہ تمھارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے اور تاکہ یہ خدا کے غضب سے بچیں۔ تو جب انھوں نے بھلا دی وہ چیز جس سے ان کو یاددہانی کی گئی تو ہم نے ان لوگوں کو تو نجات دی جو برائی سے روکنے والے تھے اور ان لوگوں کو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے رہتے تھے۔ تو جب وہ سرکشی کر کے اس چیز سے باز نہ آئے جس سے روکے گئے تو ہم نے ان سے کہا جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ۔ ۱۶۳-۱۶۶

اور یاد کرو جب تیرے رب نے فیصلہ کیا کہ وہ روزِ قیامت تک ان پر ایسے لوگوں

کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت برے عذاب چکھاتے رہیں گے۔ بے شک تیرا رب جلد پاداش دینے والا اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ہم نے ان کو زمین میں منتشر کر دیا گروہ گروہ کر کے۔ ان میں کچھ نیک بھی ہیں اور کچھ اس سے مختلف بھی۔ اور ہم نے ان کو خوشحالیوں اور بدحالیوں سے آزمایا تاکہ وہ رجوع کریں تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین وارث کتاب ہوئے جو اس دنیا کی متاع اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے لیے سب معاف کر دیا جائے گا اور اگر اسی طرح کی کوئی اور متاع ان کو مل جائے تو اسے بھی ہتھیا لیں گے۔ کیا ان سے در باب کتاب یہ میثاق نہیں لیا گیا کہ وہ اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ جوڑیں اور انھوں نے جو کچھ اس میں ہے اس کو اچھی طرح پڑھا بھی۔ اور دار آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں، تو کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور جو لوگ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز قائم کرتے ہیں تو ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ اور یاد کرو جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو معلق کر دیا گویا وہ سائبان ہے اور انھوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر گرا ہی چاہتا ہے، پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم خدا کے غضب سے محفوظ رہو۔ ۱۶۷-۱۷۱

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ج فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۰۳)

'مِنْ بَعْدِهِمْ' میں ضمیر کا مرجع وہ رسول اور ان کی قومیں ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۵۹ سے آیت ۹۲ تک گزرا۔

حضرت موسیٰ کی دعوت، دوسرے انبیاء کی دعوت کے ہم رنگ تھی۔

'بِاٰیٰتِنَا'۔ 'آیات' سے مراد وہ معجزات بھی ہیں جو حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو دکھائے اور توحید قیامت اور رسالت کے وہ فطری اور عقلی دلائل بھی جو حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ نے نہایت فصاحت کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کیے۔ یہ دلائل قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئے ہیں۔ ہم انشاء اللہ سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں ان پر روشنی ڈالیں گے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت اصلاً عقل و فطرت کے بینات پر مبنی ہوتی ہے۔ حسی معجزات نبوت کے لوازم میں سے نہیں بلکہ اس کے عوارض میں سے ہیں۔ ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو حسی معجزات بھی عطا فرماتا ہے۔ آگے ہم مناسب موقع پر واضح کریں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے ان کی ذمہ داری صرف اسی قدر نہیں تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے آزاد کرالیں بلکہ یہ ذمہ داری بھی ان پر تھی کہ اس کو ایمان و اسلام کی دعوت دیں۔ چنانچہ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے یہ فریضۂ رسالت انجام دیا اگرچہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ ایمان نہ لائے۔ صرف تھوڑے لوگ ایمان لائے اور انھوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ ہجرت بھی کی۔ یہاں اس اجمالی اشارہ پر قناعت کیجیے تفصیلات آگے کی سورتوں میں آئیں گی۔ تورات میں، اس کے مرتبوں کی مخصوص ذہنیتوں کی وجہ سے، حضرت موسیٰ کی سرگزشت ایک قوم پرست لیڈر کی سرگزشت بن گئی ہے حالانکہ حضرت موسیٰؑ ایک جلیل القدر نبی اور رسول تھے۔ ان کی دعوت دوسرے انبیا کی دعوت اور ان کا طریقۂ کار دوسرے رسولوں کے طریقۂ کار سے بالکل مختلف کس طرح ہو سکتا ہے؟

'فَظَلَمُوْا بِهَا'۔ 'ظَلَمُوْا' کے ساتھ قرآن میں جہاں جہاں 'ب' کا صلہ آیا ہے وہاں یہ لفظ 'كَفَرُوْا' اور 'جَحَدُوْا' وغیرہ کے معنی پر متضمن ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم اور اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں گزر چکی ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس اسلوب کے مضمر مضمون کو کھول دیا ہے۔

سرگزشت موسیٰ اور فرعون کی تفصیل کی حکمت

اوپر اقوام عرب کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں اب ان کی تکمیل یہ حضرت موسیٰ، قوم فرعون اور بنی اسرائیل کی سرگزشت سے کی جا رہی ہے۔ یہ سرگزشت، جیسا کہ آپ نے دیکھا، نسبتہً تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ یہ سرگزشت ماضی کی کوئی بھولی بسری داستان نہیں تھی بلکہ اس کا تاریخی ریکارڈ (تحریف و تغیر کے ساتھ سہی) تورات میں موجود تھا اور بنی اسرائیل جو اس کے حامل ہونے کے مدعی تھے وہ بھی سامنے موجود تھے۔ دوسری یہ کہ یہ بنی اسرائیل ہی تھے جن سے خدا نے اپنے دین و شریعت کی امانت واپس لی اور یہ امانت اس امت کے حوالہ کی اس وجہ سے اس سرگزشت کا ہر حصہ اپنے اندر درسِ موعظت رکھتا ہے۔ اس امت کے لیے بھی اور بنی اسرائیل کے لیے بھی۔

'فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ'۔ اس سرگزشت کے سنانے کی جو اصل غایت ہے، یہ اس

کی طرف اشارہ ہے تاکہ قاری کی توجہ اصل ہدف سے ہٹنے نہ پائے۔ اس سورہ کے عمود کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس میں قریش کو، تاریخ کی روشنی میں، یہ آگاہی دی جا رہی ہے کہ تمہارے اندر ایک رسولؐ کی بعثت نے اب تمہیں خدا کی میزانِ عدل میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگر تم نے اس رسول کی تکذیب کر دی تو تم خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے والے ٹھہرو گے اور تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے دوسرے مفسدین کا ہو چکا ہے۔ یہ بات یہاں واضح رہنی چاہیے کہ صلاح و فلاح کا تمام منبع نبی کی دعوت ہوتی ہے۔ رسول جو نظامِ زندگی پیش کرتا ہے وہی نظام سب کی اصلاح کا ضامن ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی تکذیب اور مخالفت خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے کے ہم معنی ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ (۱۰۴-۱۰۵)

'حقیق علیٰ' کا مفہوم

'حَقِيْقٌ'، 'حَقَّ' اور 'حُقَّ' سے فعیل کا وزن ہے اور معنی میں مفعول کے آتا ہے۔ اس کے معنی لائق، اہل اور سزاوار کے ہیں۔ مثلاً کہیں گے 'هُوَ حَقِيْقٌ بِهٖ' وہ اس کا اہل اور سزاوار ہے 'هُوَ حقیق ان يفعل كذا' وہ اہل ہے کہ فلاں کام سرانجام دے۔ اگر اس کے ساتھ 'علیٰ' آئے، جیسا کہ یہاں ہے تو، جیسا کہ صاحب اقرب الموارد نے تصریح کی ہے، اس کے معنی 'حریص' کے ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک اس کے ساتھ 'علیٰ' سے اس کے اصل مفہوم کے اندر یہ ایک اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ اضافہ اسی قاعدۂ تضمین کے تحت ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر 'ظَلَمُوْا بِهَا' میں گزرا۔ اس وضاحت کی روشنی میں 'حقيق على ان لا ...الایۃ' کا ترجمہ میرے نزدیک یہ ہوگا کہ میں اہل اور حریص ہوں اس بات کا کہ خدا پر نہ لگاؤں مگر وہی بات جو حق ہے، ظاہر ہے کہ جو خدا کا رسول اور سفیر ہو وہی سب سے زیادہ اہل اس بات کا ہو سکتا ہے کہ خدا کی صحیح صحیح ترجمانی کرے، اس پر کوئی من گھڑت بات نہ لگائے اس لیے کہ اس کا علم ظن و قیاس پر نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی وحی اور خطاب پر مبنی ہوتا ہے اور اپنے منصب کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے وہ اس بات کا نہایت حریص بھی ہوتا ہے کہ اس کی زبان سے کوئی کلمہ حق کے خلاف نہ نکلے اس لیے کہ جس پرسش کا خوف اسے ہوتا یا ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔

معجزات کے باب میں حضرت موسیٰ کے ساتھ خاص معاملہ

قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ 'بینۃ' سے مراد یہاں 'عصا' اور 'ید بیضا' کا وہ معجزہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مسلح کر کے فرعون کے پاس بھیجا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ چونکہ فرعون کی سرکشی اور اس کے تمرد سے اچھی طرح باخبر تھے۔ اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا تو وہ اس بارِ گراں سے بہت مضطرب ہوئے۔ انھوں نے عرض کی کہ فرعون اور اس کے درباری میری بات سننے والے نہیں ہیں، وہ میری بات تب سنیں گے جب مجھے کوئی ایسی کھلی ہوئی نشانی عطا ہو جو ان کو مرعوب کر سکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس خاص حالت کے سبب سے شروع ہی میں حضرت موسیٰ کو یہ

معجزے عطا فرمائے اور چونکہ حضرت موسیٰ فرعون اور اس کے درباریوں کی ذہنیت سے آگاہ تھے اس وجہ سے انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے ان معجزات کا مظاہرہ بھی کر دیا تاکہ فرعونیوں کے کبر پر کچھ ضرب لگے اور وہ ان کی بات سننے پر آمادہ ہوں۔

بنی اسرائیل کو لے جانے کے مطالبہ کی نوعیت

'فَاَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ'، (میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے) یہاں دو سوال ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے کوئی دعوت نہیں پیش کی، بس بلا تمہید یہ مطالبہ ہی ان کے سامنے رکھ دیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے؟ دوسرا یہ کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں انبیا اور اقوام کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں وہ مختلف سورتوں میں سورتوں کے عمود و مضمون کے اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان ہوئی ہیں۔ ہر سورہ میں سرگزشت کا اتنا ہی حصہ زیر بحث آیا ہے جتنے کے لیے سورہ کا مزاج مقتضی ہوا ہے۔ یہ سورہ، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، صرف انبیاء کے مکذبین کے انجام کو ظاہر کر رہی ہے اس وجہ سے اس میں حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت کا صرف وہی حصہ نمایاں ہوا ہے جو سورہ کے موضوع کو اجاگر کرنے والا ہے، اس کے بقیہ اجزا دوسری سورتوں میں اپنے اپنے مواقع کی مناسبت سے آئے ہیں۔ چنانچہ دوسری سورتوں میں خشیت اور تذکر کی اس دعوت کا بھی ذکر ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کی عام سنت کے مطابق حضرت موسیٰ نے فرعون کو دی اور توحید و معاد سے متعلق اس مناظرے کا بھی ذکر ہے جو فرعون اور حضرت موسیٰ کے درمیان ہوا۔ انشاء اللہ سورۂ طٰہٰ یا کسی اور مناسب محل میں یہ چیزیں زیر بحث آئیں گی۔

دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ قرآن میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ تورات کی کتاب خروج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے ابتداءً یہ مطالبہ فرعون کے سامنے اس شکل میں رکھا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ عبادت کے لیے جانے دے۔ فرعون نے اس مطالبہ کو ماننے سے صاف انکار کر دیا بلکہ غصہ میں آکر بنی اسرائیل کی بیگار اور مشقت میں اس نے مزید اضافہ کرنے کے احکام جاری کر دیے کہ یہ کاہل اور کام چور ہو گئے ہیں اسی وجہ سے عبادت وغیرہ کے بہانے تلاش کر رہے ہیں۔ پھر حضرت موسیٰ کے معجزوں سے زچ ہو کر جب وہ ذرا نرم پڑا تو اس نے دریافت کیا کہ تم کہاں عبادت کے لیے جانا چاہتے ہو، یہ عبادت اسی شہر میں کیوں نہیں کر لیتے؟ حضرت موسیٰ نے جواب میں فرمایا کہ ہم اس عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جائیں گے، یہاں ہم یہ عبادت اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہم جس چیز کی قربانی کرنا چاہتے ہیں اس کی قربانی اگر ہم نے یہاں کی تو یہ مصری ہمیں سنگسار کر دیں گے۔ یہ جھگڑا عرصہ تک حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان چلتا رہا۔ بالآخر ان آفتوں سے تنگ آکر جو حضرت موسیٰ کے معجزوں سے ظاہر ہوئیں، درباریوں نے فرعون کو مجبور کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو جہاں جانا چاہتے ہیں جانے دے ورنہ

موسیٰ کے ہاتھوں مصر تباہ ہو جائے گا۔ فرعون نے مجبور ہو کر اجازت تو دے دی لیکن جب حضرت موسیٰ اپنی پوری قوم کو زن و فرزند، مال مویشی اور جملہ اسباب و سامان کے ساتھ لے کر نکلے تو اس کو احساس ہوا کہ یہ اجازت دینے میں اس نے غلطی کی۔ چنانچہ اس نے اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا کہ مجبور کر کے ان کو واپس لائے لیکن یہ تعاقب اس نتیجہ پر منتہی ہوا کہ فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے اپنی پوری اسکیم واضح نہیں فرمائی تھی۔ صرف اتنا ظاہر کیا کہ وہ تین دن کی راہ بیابان میں جا کر خدا کی عبادت اور قربانی کرنا چاہتے ہیں اور قربانی بھی خاص طور پر گائے کی کرنا چاہتے ہیں جس سے قبطیوں نے بنی اسرائیل کو اسی طرح محروم کر رکھا تھا جس طرح بھارت میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو محروم کر رکھا ہے۔ حضرت موسیٰ نے چاہا کہ مصر کے غلامانہ ماحول سے الگ لے جا کر بنی اسرائیل کو منظم اور ان کے اندر ان تمام دینی روایات کو از سر نو زندہ کریں جو مصر کی محکومانہ زندگی میں بالکل مردہ ہو چکی تھیں۔ ہمارا قیاس ہے کہ اس مقصد کے لیے وہ سینا کے اسی علاقے میں جانا چاہتے ہوں گے جہاں انھوں نے مدین سے واپسی کے موقع پر خدا کی تجلی دیکھی تھی اور پھر جہاں ان کو اس ہجرت کے سفر میں احکام عشرہ کی الواح عطا ہوئیں۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مطالبہ کے منوانے میں حضرت موسیٰ کے کئی سال صرف ہو گئے۔ اس مدت میں انھوں نے اپنے گوناگوں معجزات اور اپنے داعیانہ دلائل سے ایک طرف تو فرعون اور مصریوں پر اللہ کی حجت تمام کر دی، دوسری طرف بنی اسرائیل کو آزمائش کی مختلف بھٹیوں سے گزار کر اس قابل کیا کہ وہ از سر نو شریعت الٰہی کی امانت کے حامل بن سکیں۔ اس طرح بالآخر رسولوں کی معروف سنت کے مطابق ان کے لیے وقت آ گیا کہ وہ ہجرت فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے ہجرت فرمائی اور اس ہجرت سے ان کے اور ان کے باایمان ساتھیوں کے لیے نجات و فلاح کی راہ کھلی اور ان کے دشمن عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ ہجرت کے باب میں، جیسا کہ ہم مختلف مقامات میں واضح کر چکے ہیں، سنت الٰہی یہی ہے اور یہ سنت جس طرح تمام رسولوں کے معاملے میں ظاہر ہوئی اسی طرح حضرت موسیٰ کے معاملے میں بھی ظاہر ہوئی۔

یہاں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ جو لوگ مزید تفصیل کے طالب ہوں وہ ہمارے مجموعۂ مضامین میں وہ مضمون پڑھیں جو ہم نے خاص اسی موضوع پر لکھا ہے[1]۔ اس میں ہم نے دکھایا ہے کہ حضرت موسیٰ کی جدوجہد ہر پہلو سے ٹھیک ٹھیک انبیا و رسل کے معروف طریقہ کے مطابق تھی۔ جن لوگوں نے ان کو نعوذ باللہ ایک قوم پرست لیڈر کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے 'اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ' کا مطلب غلط سمجھا ہے۔

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (۱۰۶-۱۰۸)

---

[1] ملاحظہ ہو ہماری کتاب 'تنقیدات'۔

معجزات کے باب میں سنت الٰہی

فرعون کے لیے یہ بات نہایت عجیب تھی کہ ایک شخص، وہ بھی اس کی رعیت میں سے، اس کے پاس خدا کا رسول ہو کر آئے۔ وہ خود، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں تصریح کر چکے ہیں، اپنے آپ کو سب سے بڑے دیوتا یعنی سورج کا اوتار اور لوگوں کا رب اعلیٰ بنائے بیٹھا تھا اس وجہ سے اس نے سنتے ہی کہا، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ تم خدا کے رسول ہو کر آئے ہو تو اپنے رسول ہونے کی کوئی نشانی دکھاؤ۔ حضرت موسیٰؑ نے اس کے مطالبے پر 'عصا' اور 'ید بیضا' کے معجزے دکھائے۔ معجزات کے باب میں سنت الٰہی یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے مذاق اور رجحانات کی رعایت سے دیے جاتے ہیں تاکہ ان پر حجت ہو سکیں۔ مصر میں، تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں سحر و شعبدہ کا بڑا زور اور سوسائٹی میں ساحروں کو بڑا مقام حاصل تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ایسے معجزے دیے جن سے ساحروں کے طلسم کو باطل کیا جا سکے۔ عربوں میں اس کے برعکس، سب سے زیادہ قدر و عظمت فصاحت و بلاغت کو حاصل تھی اور سوسائٹی پر دھاک خطیبوں اور شاعروں کی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے ہمارے حضورؐ کو قرآن کا معجزہ عطا ہوا جس کی فصاحت و بلاغت نے سارے فصیحوں بلیغوں کو عاجز و درماندہ کر دیا۔ یہاں 'ثُعْبَانٌ' کے ساتھ 'مُبِیْنٌ' کی صفت آئی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ لٹھیا سچ مچ کا اژدہا بن گئی، ایسا کھلا اژدہا کہ کسی کے لیے ذرا شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ بات نہیں تھی کہ ایک چیز محض رینگنے لگ گئی ہو یا اس کے اندر سر اور دم نمایاں ہو گئی ہو بلکہ عین مین اژدہا اپنی تمام خصوصیات و صفات کے ساتھ۔ اسی طرح 'بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ' میں ناظرین کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہاتھ میں جو چمک ظاہر ہوتی تھی وہ محض فریب نظر کی نوعیت کی نہیں تھی بلکہ غور و تامل سے دیکھنے والوں کو اس کی تابانی بالکل اصلی و حقیقی معلوم ہوتی۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'نظر' کا لفظ اصلاً عربی میں غور و تامل سے دیکھنے کے لیے آتا ہے۔

معجزہ اور سحر میں امتیاز

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ معجزہ اور سحر و شعبدہ میں امتیاز منطقی تعریف کے ذریعہ سے نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان کا اصلی فرق دو چیزوں سے نمایاں ہوتا ہے۔ اول تو باہمی تقابل سے جس طرح مس خام اور کندن کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو دونوں کا فرق صاف نمایاں ہو جائے گا اسی طرح جب ایک شخص معجزہ اور سحر کو ایک دوسرے کے مقابل میں دیکھتا ہے تو معجزے کی سطوت و جلالت، اس کے ظہور کا انداز، باطل پر اس کا غلبہ اور اس کی قہرمانیت پکار کر شہادت دیتی ہے کہ یہ کمہاروں کی مٹی سے بنا ہوا کھلونا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق کہیں اور ہی سے ہے۔

جوہر جام جم از کانِ جہان دگر است

دوسری چیز پیش کرنے والے کی شخصیت اور کردار ہوتی ہے۔ سحر و شعبدے دکھانے والے ہمیشہ سوسائٹی کے اراذل و انفار ہوئے ہیں، جن کی ذلت و نکبت، جن کے اخلاق کی پستی اور طبیعت کی دنائت و رذالت ہمیشہ ضرب المثل رہی ہے۔ برعکس اس کے معجزے ان لوگوں کے ہاتھوں ظاہر ہوئے ہیں جو انسانیت کے گل سر سبد

مانے گئے ہیں، جن سے دنیا نے علم و عمل اور حکمت و معرفت کے سبق سیکھے ہیں، جن کی زندگی کا ہر دور اور جن کا ہر قول و فعل اسوہ اور نمونہ قرار پایا ہے، جو زندگی کی سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی ہمیشہ سو فی صدی کھرے پائے گئے ہیں۔ یہاں ان اشارات پر کفایت کیجیے، آگے مناسب مواقع سے ان کی تفصیل آئے گی۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۱۰۹ - ۱۱۲ -

'قَالَ الْمَلَاُ الاٰیۃ' یہ وہ مشورت ہے جو فرعون کے درباریوں نے حضرت موسٰی کے معجزے دیکھ کر پہلے آپس میں کی، پھر اپنی طے شدہ رائے فرعون کی خدمت میں پیش کی۔ انھوں نے رائے یہ قائم کی کہ یہ شخص کچھ ایسا ویسا جادوگر نہیں ہے بلکہ بڑا ماہر جادوگر ہے اور اس کے پیش نظر صرف وہی نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہا ہے بلکہ یہ بنی اسرائیل کو منظم کر کے یہ چاہتا ہے کہ ہم کو ہمارے ملک سے بے دخل کر دے۔

فرعون اور اس کے درباریوں کا سیاسی سٹنٹ

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ فی الواقع ان کے دل میں بھی وہی بات رہی ہو جو زبان پر آئی۔ وہ حضرت موسٰیؑ اور ہارونؑ سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے ماضی و حاضر اور ان کے اخلاق و کردار کو سامنے رکھ کر وہ آسانی سے فیصلہ کر سکتے تھے کہ حضرت موسٰی نہ تو کوئی جادوگر ہو سکتے اور نہ اصلاح کے سوا ان کے سامنے کوئی اور مقصد ہو سکتا لیکن ارباب اقتدار کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ جب ان کے مقابل میں کوئی اصلاحی دعوت اٹھتی ہے تو انھوں نے اپنے عوام کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اس کے اندر کوئی نہ کوئی خطرناک سیاسی معنی و مفہوم پیدا کرنے کی ضرور کوشش کی ہے۔ یہی حرکت فرعون کے درباریوں نے کی۔ انھوں نے حضرت موسٰی کی اس خالص اصلاحی دعوت اور جد و جہد کو متہم کرنے کے لیے یہ اشغلا چھوڑا کہ یہ درحقیقت ارسٹوکریسی کو اس ملک سے بے دخل کرنے کی ایک سازش ہے۔

فرعون کے درباریوں کا یہ اسٹنٹ وقت کے حالات کے لحاظ سے ایک موثر اور کارگر اسٹنٹ تھا۔ یہ مصر کے جس دور کی سرگزشت بیان ہو رہی ہے اس دور کی تاریخ تورات میں پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں فرعون اور اس کے اعیان اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ بنی اسرائیل کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ طاقت پکڑ جائیں اور ایک دن ہمیں اس ملک سے نکال چھوڑیں۔ تورات کی کتاب خروج سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اور اسرائیل کی اولاد برومند اور کثیر التعداد اور فراواں اور نہایت زورآور ہو گئی۔ اور وہ ملک ان سے بھر گیا۔

تب مصر میں ایک نیا بادشاہ پیدا ہوا جو یوسف کو نہیں جانتا تھا اور اس نے اپنی قوم کے لوگوں کو کہا دیکھو اسرائیلی ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں سو آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے

نکل جائیں۔ اس لیے انھوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے لے کر ان کو ستائیں
.... پر انھوں نے جتنا ان کو ستایا وہ اتنا ہی زیادہ بڑھتے اور پھیلتے گئے اس لیے وہ لوگ بنی اسرائیل کی طرف
سے فکرمند ہو گئے ...... تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائیوں سے کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے تم بچہ جناؤ
.... تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا اور اگر بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے ..... اور فرعون نے اپنی قوم کے
سب لوگوں کو تاکیداً کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دینا اور جو بیٹی ہو اسے جیتی چھوڑنا۔

(خروج باب ۱، ۷ — ۲۲)

یہ طویل اقتباس ہم نے محض اس لیے پیش کیا ہے کہ اندازہ ہو سکے کہ مصر کی ارسٹوکریسی بنی اسرائیل کی تعداد اور ان کی قوت سے اس زمانے میں کس درجہ تشویش میں مبتلا تھی ساسی زمانے میں حضرت موسیٰ کی دعوت بلند ہوتی ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ وہ تمام بنی اسرائیل کو تین دن کی راہ بیابان میں عید قربان منانے کے لیے لے جانے کا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں فرعون کے اعیان کے پاس اپنی قوم کو حضرت موسیٰؑ اور ان کی دعوت سے وحشت زدہ کرنے کے لیے اس سے زیادہ کارگر حربہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ یہ شگوفہ چھوڑیں کہ اب وہ خطرہ سامنے آگیا ہے جس کا ڈر لگا ہوا تھا یعنی یہ شخص بنی اسرائیل کو منظم کر کے اب تمھیں اس ملک سے بے دخل کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے تو تم اپنا تحفظ چاہتے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے کمر یں کس لو۔

'قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ' یہ وہ مشورہ ہے جو پورے اتفاق رائے کے ساتھ درباریوں کی طرف سے فرعون کو پیش کیا گیا۔ وہ یہ کہ موسیٰ اور ہارون کے معاملے میں کوئی عاجلانہ کارروائی مناسب نہیں ہوگی۔ تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ ابھی ان کو ٹالیے اور مملکت کے تمام حصوں میں ہرکارے بھیج کر ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو جمع کیجیے تاکہ وہ کسی پبلک اجتماع میں اپنے فن سے موسیٰ اور ہارونؑ کو ایسی شکست دیں کہ ان کی ہوا اکھڑ جائے۔ اگر عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرایا گیا تو اندیشہ ہے کہ وہ اس مقابلہ میں شکست کھا جائیں گے اور الٹے ہماری ہوا خیزی ہوگی۔

'اَرْجِهْ' اصل میں 'اَرْجِئْهُ' ہے۔ 'اِرْجَاء' کے معنی ٹالنے، کسی معاملے کو کسی دوسرے وقت پر محول کرنے، کسی کو منتظر بنانے کے ہیں۔ قرآن میں اس کے مختلف صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں یہ ہمزہ کے حذف اور 'ہ' کے سکون کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ تلفظ کا یہ اسلوب اہل عرب کے قاعدے کے مطابق ہے۔ بعض مرتبہ وہ لفظ کو ہلکا کرنے کے لیے اس طرح کا تصرف کر دیتے ہیں۔ صاحب لسان نے اس کی بعض واضح مثالیں نقل کی ہیں۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۱۱۳ - ۱۱۴)

یہاں قرآن نے اپنے معروف طریقہ کے مطابق سرگزشت کا غیر ضروری حصہ نظر انداز کر دیا ہے۔ یعنی درباریوں کی اس صلاح کے بموجب فرعون نے مملکت کے تمام شہروں کو ہرکارے دوڑائے جو ہر جگہ سے ماہر فن جادوگروں کو جمع کر کے لائے اور ان کو فرعون کے دربار میں حاضر کیا۔ چونکہ یہ بات موقع کلام سے خود واضح تھی اس وجہ سے اس کو

نظر انداز کر کے آگے کی بات لے لی کہ ساحروں نے سامنے آتے ہی پیشہ وروں کے عام طریقہ کے مطابق خوشامدانہ انداز میں اپنے اس ارمان اور توقع کا اظہار کیا کہ اگر ہم نے بازی جیتی تو سرکار سے بڑا انعام ملے گا۔ فرعون نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، انعام تو جو ملنا ہے ملے گا ہی، تم پر مزید نوازش یہ ہوگی کہ تم خاص مقربین میں شامل کیے جاؤ گے۔

ساحروں کی اخلاقی پستی ایمان لانے سے پہلے

قرآن نے ساحروں کی اس حرص و طمع کا اظہار خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ واضح ہو جائے کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی اخلاقی پستی اور دناءت کا کیا حال ہوتا ہے۔ پھر آگے چل کر انہی ساحروں کا وہ انقلاب حال نمایاں کیا ہے جو ایمان کی دولت نصیب ہوتے ہی ان کے اندر پیدا ہوا کہ مال و زر کی طمع تو در کنار ان کو اپنی جان کی بھی کوئی پروا نہیں رہی اور فرعون کی دھمکی کے جواب میں انھوں نے صاف سنا دیا کہ جو کرنا ہے کر گزرو، ہمیں کوئی پروا نہیں ہے۔ 'اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ'۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ۝ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ (۱۱۵-۱۱۶)

حضرت موسیٰ کا اعتماد اللہ پر

ساحروں نے اپنے پیشہ ورانہ اخلاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگرچہ پیش کش تو حضرت موسیٰ کو کی کہ وہ چاہیں تو پہلے اپنا فن دکھائیں لیکن دبی زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا کہ وہ پہل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ حضرت موسیٰ نے پہلے انہی کو موقع دیا کہ وہ اپنا ہنر دکھائیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ کو پورا اعتماد تھا کہ انھیں خدا کی تائید حاصل ہے اس وجہ سے یہ ساحر کتنا ہی بڑا جادو دکھائیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سحر کو باطل کر کے رہے گا۔

'سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ جادو خواہ کتنا ہی بڑا ہو لیکن اس سے کسی شے کی حقیقت و ماہیت نہیں بدلتی۔ بس دیکھنے والوں کی آنکھوں اور ان کی قوت متخیلہ پر اس کا اثر پڑتا ہے جس سے آدمی ایک شے کو اس شکل میں دیکھنے لگتا ہے جس شکل میں ساحر اس کو دکھانا چاہتا ہے۔

'اِلْقَآء' کا لفظ یہاں پیش کرنے اور دکھانے کے مفہوم میں ہے۔ جس طرح پانسے اور جوئے کے تیر پھینکے جاتے ہیں اسی طرح ساحر بھی کوئی چیز ناظرین کے سامنے پھینکتے ہیں اور اس پر اپنا جادو دکھاتے ہیں۔ اس مناسبت سے اس کے لیے لفظ 'اِلْقَآء' کا استعمال موزوں ہوا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۝ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۝ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (۱۱۷-۱۲۲)

سحر اور معجزہ میں ایک فرق

'لقف' کے معنی کسی چیز کو جلدی جلدی نگلنے اور 'افک یافک' کے معنی جھوٹی اور خلاف واقعہ بات کہنے یا کرنے کے ہیں۔ اوپر گزرا کہ سحر سے کسی شے کی حقیقت یا ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کا تمام تر تعلق

دیکھنے والوں کی نگاہ اور ان کی قوت متخیلہ کے تاثر سے ہوتا ہے اس وجہ سے سحر سے جو کرشمہ ظاہر ہوتا ہے وہ یکسر باطل، جھوٹ اور فریب نظر و تخیل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس معجزہ یکسر حقیقت ہوتا ہے۔ فرمایا کہ جب ساحروں نے اپنا سحر دکھایا اور اس کے اثر سے ان کی رسیاں سانپوں کی طرح رینگتی نظر آئیں تو ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ تم اپنا عصا پھینکو وہ اژدہا بن کر ان کے تمام نمائشی سانپوں سپنولیوں کو ہڑپ کر جائے گا۔

مرِ شب اور خورشید جہاں تاب

'فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ' یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ مرِ شب کے مقابلہ میں خورشید جہاں تاب نکل آئے۔ ظاہر ہے کہ ہزاروں مصنوعی چاند سورج ہوں جب بھی حقیقی سورج کے نکلتے ہی ان کی چمک دمک ملمع کی طرح غائب ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ کے معجزہ کے ظاہر ہونے ہی ساحروں کا سارا طلسم غائب ہو گیا۔ اوپر ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ معجزہ اور سحر کا حقیقی فرق میدانِ مقابلہ میں نمایاں ہوتا ہے جب دونوں کا تصادم ہوتا ہے تو حق لازماً غالب ہوتا ہے اور باطل لازماً شکست کھاتا ہے۔

'فَغُلِبُوا هُنَالِكَ' یہ بات صرف ساحروں سے متعلق نہیں بلکہ فرعون اور اس کے تمام اعیان و انصار سے متعلق ارشاد ہوئی ہے کہ وہ میدان مقابلہ سے ذلیل و خوار ہو کر لوٹے۔ قرآن میں دوسری جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہ مقابلہ ایک خاص میلہ کے دن، کھلے میدان میں ہوا تھا اور فرعون کی طرف سے اس امر کا خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ اپنے آدمی زیادہ سے زیادہ تعداد میں اکٹھے ہوں تاکہ اپنی فتح کا ڈنکا پوری دھوم سے بجایا جائے لیکن ایسی رسوائی ہوئی کہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

'وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ' ساحر حضرت موسیٰ کے معجزے کی قہرمانیت سے اتنے متاثر و مرعوب ہوئے کہ بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ مجہول کا صیغہ ان کے جذبۂ تعظیم و اکرام سے مغلوبیت کی تعبیر کے لیے ہے۔ تعظیم و اکرام کے لیے سجدہ کا رواج مصریوں، عربوں، اسرائیلیوں سب میں رہا ہے اگرچہ اکثر حالات میں اس کی حد وہی ہوتی تھی جو ہمارے ہاں نماز میں رکوع کی ہوتی ہے۔

ساحر سحر اور معجزے کے فرق کو سب سے زیادہ جانتا ہے

اس سے واضح ہوا کہ سحر اور معجزے میں امتیاز کی سب سے زیادہ صلاحیت خود ساحر کے اندر ہوتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر اعتراف حق کے لیے اخلاقی جرأت ہو۔ ساحر اپنے علم کی حقیقت اور اپنے مبلغ سے اچھی طرح آشنا ہوتا ہے اس وجہ سے جب اس کو معجزہ سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ دیکھتے ہی تاڑ جاتا ہے کہ یہ چیز اس کے فن سے ماوراء ہے۔ چنانچہ فرعون کے ان ساحروں نے بھی دیکھتے ہی اپنی بے بسی اور حضرت موسیٰ کی فاتحیت کا اعتراف کر لیا اور ان کی تعظیم میں سر جھکا دیے۔

ساحروں کے اندر حق پسندی کی رمق موجود تھی

'قَالُوا آمَنَّا الآية' ساحروں نے حضرت موسیٰ کی تعظیم ہی پر بس نہیں کیا بلکہ صاف صاف اپنے ایمان کا اعلان بھی کر دیا اور وہ بھی اس تصریح کے ساتھ کہ ہم عالم کے رب، موسیٰ اور ہارونؑ کے رب پر ایمان لائے۔ جس کے صاف معنی یہ بھی تھے کہ انھیں فرعون کی خدائی سے انکار ہے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس اعلان کا سارے مجمع پر کیا اثر پڑا ہو گا اور فرعون اور اس کے درباریوں کی کیسی رسوائی ہوئی ہو گی! یہاں یہ بات

رکھنی چاہیے کہ ہر چند یہ لوگ جادوگر تھے اور ان کے اندر اس پیشہ کی بعض خصوصیات بھی، جیساکہ اوپر معلوم ہوا، پیدا ہو گئی تھیں تاہم حق پسندی کی کچھ رمق ان کے اندر موجود تھی۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقابلہ کے لیے وہ خوش دلی سے نہیں آئے تھے بلکہ مجبور کر کے لائے گئے تھے۔ خود ان کا قول نقل ہوا ہے کہ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ (طٰہٰ ۷۳) (ہم اپنے رب پر ایمان لائے کہ وہ ہماری خطاؤں اور اس سحر کو معاف کرے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا) ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے اندازہ رکھتے ہوں کہ حضرت موسیٰ کوئی ساحر نہیں ہیں اور نہ انھوں نے جو چیز پیش کی ہے وہ سحر ہے۔ اس وجہ سے وہ ان کے مقابلہ سے گریز کرنا چاہتے رہے ہوں لیکن فرعون اور اس کے کارندوں کے ڈر سے انھیں مجبوراً یہ کام کرنا پڑا ہو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اندر حق پسندی کی ایک روشنی دبی دبائی موجود تھی جو حضرت موسیٰ کے اس معجزے کی جلالت سے بھڑک اٹھی۔ سعادت کا کوئی شمہ بھی انسان کے اندر موجود ہو تو بتوفیقِ الٰہی وہ اپنا اثر دکھا ہی جاتا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۲۳-۱۲۴)

فرعون ایک کائیاں سیاسی تھا

یہ بڑا ہی نازک موقع تھا۔ فرعون اور اس کے درباریوں بلکہ اس کی پوری قوم کی ہوا بالکل اکھڑ چکی تھی لیکن یہ فرعون بھی بڑا ہی کائیاں سیاسی تھا۔ اس نے بگڑتے ہوئے حالات سنبھالنے کے لیے فوراً یہ اشتغلا چھوڑا کہ یہ ان ساحروں اور موسیٰ کی ملی بھگت ہے۔ یہ ساحر ہم کو یہاں سے بے دخل کرنے کی سازش میں موسیٰ کے ساتھ شریک ہیں۔ انھوں نے پہلے سے آپس میں یہ مشورت کر رکھی تھی کہ ہم عین موقع پر اپنی شکست مان کر اپنے ایمان کا اعلان کر دیں گے جس سے موسیٰ کی دھاک سب پر بیٹھ جائے گی اور اس طرح ہم موجودہ برسرِ اقتدار گروہ کا اقتدار ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس نے ان پر سازش اور بغاوت کا الزام رکھ کر ان کے لیے اس سزا کا بھی اعلان کر دیا جو ریاست کے باغیوں کے لیے ملک کے قانون میں موجود تھی۔ یعنی پہلے ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں پھر برسرِ عام سولی دی جائے۔

فرعون کے قول اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس کی حکومت میں مذہبی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور ہو بھی کیسے سکتی تھی جب کہ بادشاہ خود اپنے آپ کو لوگوں کا ربِ اعلیٰ بنائے بیٹھا تھا۔ اس صورت میں تو جو بھی اس کے سوا کسی اور کو رب مانتا وہ لازماً فرعون کا باغی قرار پاتا۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۚ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ (۱۲۵-۱۲۶)

ایمان باللہ کا کرشمہ

ایمان باللہ کا کرشمہ دیکھیے۔ یہ وہی جادوگر ہیں جن کی دناءت اور پست ہمتی کا ابھی چند منٹ پہلے یہ حال تھا کہ اپنے کرتب دکھانے کے لیے فرعون کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو بھانڈوں، نقالوں اور مسخروں کی طرح

اپنے فن کے مظاہرہ پر بھرپور انعام کی التجا پیش کرتے ہیں یا ایمان کی روشنی دل میں داخل ہوتے ہی ان کے باطن کا ہر گوشہ اس طرح جگمگا اٹھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تاریکی کی کوئی پرچھائیں ان کے دلوں پر کبھی پڑی ہی نہیں تھی۔ اور یہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان نہیں بلکہ یہ عزیمت و استقامت کے پہاڑ اور پاکیزگی و قدوسیت کے ملائک صفت پیکر ہیں۔ غور کیجیے، فرعون نے کتنی بڑی دھمکی ان کو دی! لیکن انھوں نے اس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا کہ کچھ غم نہیں، اگر تم نے ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی دے دی تو ہم کہیں اور نہیں جائیں گے اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور جب تیرا سارا غضب ہمارے اوپر اس جرم میں ہے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر، جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے تو جو کچھ تو کر سکتا ہے وہ کر گزر، اگر اس جرم کی یہ سزا ہے تو ہم اس سزا کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ایمان باللہ کے نتیجہ میں انقلابِ حال

اس انقلابِ حال کے سبب پر غور کیجیے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ اگر انسان ایمان سے خالی ہے تو اس سے زیادہ حقیر کوئی شے نہیں اور اگر وہ ایمان سے بہرہ مند ہے تو اس سے زیادہ بلند کوئی شے نہیں۔

'رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ' یہ آگے پیش آنے والے حالات میں صبر و استقامت کی توفیق بخشے جانے کی دعا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا ہے اور فرعون نے اپنی سزاؤں کا۔ اب ہمارا سارا بھروسا اے رب، تیرے اوپر ہے۔ تو ہمارے اوپر صبر کے ڈونگڑے برسا اور تمام آزمائشوں کے علی الرغم موت ایمان و اسلام پر عطا فرمایا۔

وَقَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اَتَذَرُ مُوۡسٰى وَقَوۡمَهٗ لِيُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ‌ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَنَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَهُمۡ‌ ۚ وَاِنَّا فَوۡقَهُمۡ قٰهِرُوۡنَ (۱۲۷)

فرعون کے درباریوں کی بوکھلاہٹ

اس کھلے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ کی کامیابی نے فرعون اور اس کے درباریوں کو بالکل بوکھلا دیا۔ درباریوں نے فرعون سے باصرار یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب موسیٰؑ اور ان کی قوم کو مزید ڈھیل دینے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اگر ان کو مزید موقع دیا گیا تو یہ آپ کو اور آپ کے بتوں کو چھوڑ بیٹھیں گے اور ملک میں بغاوت کرا دیں گے فرعون نے ان کو اطمینان دلایا کہ گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمارا اقتدار پوری طرح ان کے اوپر مستحکم ہے۔ ہم ان کے ذکور کو قتل کرتے رہیں گے، ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ہمارے قابو میں ہیں اگر ہم ان کو زور پکڑنے دینا نہ چاہیں تو یہ کیا کر سکتے ہیں۔

لڑکوں کے قتل کی سکیم

اوپر لڑکوں کے قتل اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کی ظالمانہ اسکیم کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہ اسکیم اسی لیے اختیار کی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کی تعداد ملک میں اتنی زیادہ نہ ہو جائے کہ وہ ارسٹوکریسی کے لیے خطرہ بن جائیں۔ اول اول تو یہ اسکیم دائیوں کے عدم تعاون کی وجہ سے ناکام ہو گئی لیکن فرعون اس ناکامی سے مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے عام لوگوں کو یہ حکم دے دیا کہ وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو دریا میں پھینک دیا کریں۔ یہاں فرعون نے اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم بہر حال ان کو اپنے لیے خطرہ نہیں بننے دیں گے۔ اگر ضرورت

محسوس ہوئی تو ہم اسی اسکیم کو مزید قوت و شدت کے ساتھ چلائیں گے۔

دو طرفہ خطرہ

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگرچہ فرعونی اسرائیلیوں سے اس درجہ خائف تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے کہ وہ مصر سے یک قلم نکل جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر کی تمام رفاہیت و خوش حالی انہی غلاموں کی رہین احسان تھی۔ اوپلے تھاپنے، اینٹیں بنانے سے لے کر زراعت اور تعمیرات کے سارے کام انہی کی مشقت سے انجام پاتے تھے۔ فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں کا کام صرف عیش کرنا اور ان اسرائیلیوں پر حکومت کرنا اور ان سے بیگار لینا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں نہ تو فرعونیوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اسرائیلیوں کو بڑھنے اور پنپنے کا موقع دیں، نہ یہ ممکن تھا کہ ان کو یک قلم مصر سے نکل جانے دیں۔ اس دو طرفہ خطرے سے بچنے کے لیے فرعون اور اس کے لال بجھکڑوں نے یہ پالیسی بنائی کہ ان کی نرینہ اولاد کو قتل کر کے ان کی تعداد کو قابو میں رکھا جائے۔ آدمی جب اپنے حدود سے تجاوز کر کے خدائی حدود میں مداخلت شروع کر دیتا ہے تو اس کی عقل اسی طرح ماری جاتی ہے۔

فرعون کے دعوائے الوہیت کی نوعیت

'وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ' کی تاویل میں ہمارے علما اور مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اس میں اشکال یہ ہے کہ 'اٰلِهَتَكَ' کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے دیوی دیوتا بھی مصر میں تھے جن کی پرستش خود فرعون بھی کرتا تھا۔ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے رب اعلیٰ ہونے کے دعوے کی توجیہ کیا ہوگی؟ جو خود رب اعلیٰ ہونے کا مدعی ہو وہ کسی دوسرے دیوی دیوتا کو ماننے والا یا ان کی پرستش کرنے والا کیسے ہو سکتا ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فرعون اپنے زعم کے مطابق اپنے آپ کو مصریوں کے سب سے بڑے دیوتا — سورج — کا اوتار سمجھتا تھا۔ اس طرح اس کی حیثیت اوتار بادشاہ (GOD KING) کی تھی۔ گویا وہ بیک وقت مصریوں کا بادشاہ بھی تھا اور ان کے سب سے بڑے دیوتا کا مظہر اور اوتار ہونے کے سبب سے ان کا رب اعلیٰ بھی۔ اس نے اپنے بے شمار اسٹیچو اور بت بنوا کر اپنی مملکت میں جگہ جگہ نصب کرا دیے تھے اور اس کی رعایا ان کے درشن اور ان کے آگے ڈنڈوت کرتی تھی۔ اس طرح بادشاہ کو بیک وقت رعایا پر خدائی اور شاہی دونوں سے اختیارات حاصل تھے۔ یہاں 'اٰلِهَتَكَ' کے لفظ سے اس کے انہی اسٹیچوؤں اور بتوں کی طرف اشارہ ہے جو اس کی ذات کی نمائندگی کرتے تھے۔ مصر کے قدیم مندروں کے جو آثار ملے ہیں ان سے بھی اسی بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۗ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۲۸ - ۱۲۹)

حقیقت

تفسیر سورہ بقرہ کی فصل ۳۲ میں ہم اقامت دین کی جدوجہد میں صبر اور نماز کی اہمیت پر بحث کر چکے ہیں۔ درحقیقت

اس جہاد میں یہی دو چیزیں وسیلۂ ظفر ہیں۔ قرآن میں مشکلات راہ کے مقابلہ کے لیے ہر جگہ انھی دو ہتھیاروں سے مدد حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں اگرچہ بظاہر لفظ اللہ وارد ہوا ہے لیکن اس سے مراد نماز ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا ذریعہ نماز ہی ہے۔ فرعون نے اس شکست سے گھبرا کر بنی اسرائیل کو دبانے اور ان کی نسل کو تباہ کرنے کا جو عزم ظاہر کیا اس سے قدرتی طور پر بنی اسرائیل کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ ان کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے ان کو نماز اور صبر کی تلقین کی۔ فتنوں اور آزمائشوں میں استقامت بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ کام اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (اور تمھیں صبر نہیں حاصل ہو سکتا مگر اللہ ہی کی مدد سے) اللہ کی یہ مدد حاصل کرنے کا واسطہ نماز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس نماز سے مراد صرف عام نماز نہیں ہے بلکہ وہ خاص نماز بھی ہے جس کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مکی زندگی کے ابتدائی پرمحن دور میں کی گئی تھی۔ اسی چیز کی تاکید حضرت موسیٰ اور ہارون کو بھی کی گئی۔ سورہ یونس کی آیت ۸۷ کے تحت انشاء اللہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد میں وسیلۂ ظفر صبر اور نماز

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ الایۃ یہ فرعون کے اس غرور کی جو اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے، تردید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے منہ سے اپنے متعلق جو چاہے قاہر و مقتدر ہونے کا دعویٰ کرتا رہے لیکن زمین کا اصل مالک اللہ ہے، وہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور عاقبت کی کامیابی بہر حال خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ رسولوں سے متعلق اس سنت الٰہی کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو لازماً ان کے دشمنوں پر غلبہ عطا فرماتا ہے۔ عام اس سے کہ یہ غلبہ ان کی زندگی ہی میں حاصل ہو یا ان کی زندگی کے بعد ان کے پیرووں کو حاصل ہو اور قطع نظر اس سے کہ وہ اسی سرزمین پر قابض ہوں جس میں انھوں نے اپنی دعوت بلند کی یا اللہ تعالیٰ ان کو اس علاقے سے ہجرت کا حکم دے اور ان کی برومندی کے لیے زمین کے کسی اور خطے کا انتخاب فرمائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دشمن پر غلبہ تو ان کی زندگی ہی میں بلکہ مذکورہ بالا واقعات کے پیش آنے کے بہت تھوڑے عرصے کے بعد ہی حاصل ہو گیا لیکن ان کی امت کو حکومت عطا ہوئی فلسطین کی سرزمین کی اور یہ کام تکمیل کو پہنچا ان کی وفات کے بعد۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مصر میں بھی اس عذاب کے بعد، جو فرعون اور اس کی قوم پر آیا، وہ ارسٹوکریسی بالکل تباہ ہو گئی جو مصر پر قابض تھی اور ان کی جگہ دوسرے لوگ قابض ہو گئے جو خاندان اور روایات میں بالکل مختلف تھے اور ان کے ساتھ سابق حکمرانوں کی سیاسی رقابتیں بھی تھیں اور ان کی طرف سے یہ اندیشہ بھی فرعونیوں کو تھا کہ یہ بنی اسرائیل کے ساتھ ساز باز کر کے کہیں ملک کے حکمران نہ بن بیٹھیں۔ یہ مسئلہ چونکہ تاریخ کا ہے اور براہ راست ہم سے متعلق نہیں ہے اس وجہ سے ہم صرف اشارے پر کفایت کرتے ہیں، تفصیل کے طالب اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔

رسول کے لیے غلبہ لازمی ہے

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا الایۃ بنی اسرائیل پر، ان کی بے یقینی اور ضعیف الاعتقادی کے سبب سے

بنی اسرائیل کی بے اعتقادی

حضرت موسیٰ کی یہ تلقین بے اثر ہی رہی۔ وہ بولے کہ ہمارے دن تو سخت سے سخت ہی ہوتے جا رہے ہیں۔ تمھارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور اب تمھارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب حالات وواقعات یہ ہیں جو پیش آئے یا پیش آ رہے ہیں تو تمھارے ان وعدوں اور تمھاری ان طفل تسلیوں پر کون جی سکتا ہے تم تو رحمت کے بجائے ہمارے لیے زحمت ہی زحمت بنتے جا رہے ہو! اوپر تورات کے حوالے سے ہم بیان کر آئے کہ مصر پر قابض ارسٹوکریسی بنی اسرائیل کی روز افزوں تعداد سے بہت گھبراتی ہوئی تھی اور اس کی روک تھام کے لیے اس نے ان کی نسل کشی کی مہم چلا رکھی تھی۔ بعد میں جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی تنظیم و اصلاح کی دعوت لے کر اٹھے تو ارباب اقتدار کی یہ گھبراہٹ اور زیادہ بڑھ گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کو ایک طاقتور لیڈر مل گیا ہے اور اب جلد وہ ایک منظم قوت بن کر ہمارے اقتدار کو چیلنج کر دیں گے۔ اس گھبراہٹ میں فرعون نے ایک طرف تو ان کی نسل کشی کی مہم کو مزید قوت و شدت کے ساتھ چلانے کے احکام جاری کر دیے، دوسری طرف اپنے کارندوں، تحصیل داروں اور عمال کو یہ ہدایت کی کہ بنی اسرائیل سے جو بیگار لی جا رہی ہے وہ سخت سے سخت تر کر دی جائے۔ اینٹیں بنانے کے لیے جو بھس ان کو دیا جاتا رہا ہے وہ بند کر دیا جائے اور ان کو حکم دیا جائے کہ بھس بھی وہی بٹوریں اور اینٹیں بھی لازماً ہر شخص سے روزانہ اتنی ہی بنوائی جائیں جتنی اب تک وہ بناتے رہے ہیں۔ اس طرح عذاب کا وہ شکنجہ جو پہلے بھی کچھ کم سخت نہ تھا حضرت موسیٰ کے بعد اور بھی سخت ہو گیا۔ بنی اسرائیل نے یہ سب کچھ حضرت موسیٰ کے کھاتے میں ڈال دیا کہ یہ سب تمھاری برکتیں ہیں!

حضرت موسیٰ کی طرف سے تسلی

'قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ الایۃ' بنی اسرائیل کی مایوسی و بددلی دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے پھر ان کو تسلی دی کہ مایوس اور ہراساں نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمھارے دشمنوں کو ہلاک کرے گا اور زمین میں تمھیں خلافت عطا فرمائے گا۔ یہاں زمین سے مراد مصر کی سرزمین نہیں ہے بلکہ جیسا کہ آگے آیت ۱۳۷ میں اس کی وضاحت ہوتی ہے اس سے مراد فلسطین کا علاقہ ہے۔ فرمایا وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَھَا الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا (اور جو قوم دبا کے رکھی گئی تھی ہم نے اس کو اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے بڑی برکتیں رکھی تھیں، اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بسبب اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے) ظاہر ہے کہ 'بٰرَکْنَا فِیْھَا' سے جس علاقہ کی طرف اشارہ ہے وہ فلسطین ہی کا علاقہ ہے اور اس آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ اسی علاقہ کی حکومت دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وہ وعدہ پورا کیا جو آیت زیر بحث میں حضرت موسیٰ کی زبانی مذکور ہے۔

استخلاف کا اصل مقصد

'فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ' یہ استخلاف فی الارض کے اصل مقصد کی یاددہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو مٹاتا اور دوسری کو عروج و اقبال بخشتا ہے تو صرف یہ دیکھنے کے لیے کرتا ہے کہ اقتدار کی وراثت پا کر یہ قوم کیا رویہ اختیار کرتی ہے، یہ بھی پچھلی قوم کی طرح بدمست ہو کر زمین میں فساد مچاتی ہے یا اس خلافت و وراثت کا حق

پہچانتی اور اس کو ادا کرتی ہے۔ اگر یہ بھی اسی روش پر چل نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی ایک خاص مدت تک مہلت دے کر فنا کر دیتا ہے اور ان کی جگہ دوسروں کو دے کر ان کو آزماتا ہے۔ امتحان کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے، برابر جاری رہے گا۔ اس وجہ سے کسی قوم کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ جب وہ ایک مرتبہ خدا کی محبوب بن گئی تو ہمیشہ محبوب ہی بنی رہے گی، خواہ اس کے اعمال و عقائد میں کتنی ہی خرابیاں پیدا ہو جائیں۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۱۳۰)

'سِنِیْنَ'، سنۃ کی جمع ہے۔ اس کے عام معنی تو سال کے ہیں لیکن یہ قحط اور مصیبت کے سال کے لیے بھی معروف ہے اور اسی مفہوم میں یہاں یہ استعمال ہوا ہے۔

سنتِ الٰہی کا ظہور

اوپر آیت ۹۴-۹۵ کے تحت ہم اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جب وہ اپنا کوئی رسول بھیجتا ہے تو اس کی دعوت کے مویدات، مختلف قسم کی آزمائشوں کی شکل میں، وہ آفاق و انفس میں بھی ظاہر فرماتا ہے تاکہ لوگوں کے کان رسول کی دعوت کے لیے کھلیں، وہ عبرت پکڑیں اور اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ اسی سنتِ الٰہی کی طرف یہاں اشارہ فرمایا کہ ایک طرف موسیٰ نے اپنی دعوت بلند کی اور اپنے معجزات سے فرعونیوں کو جھنجھوڑا، دوسری طرف ہم نے قوم فرعون کو قحط اور پیداوار کی کمی کی آزمائشوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے اندر خدا کا خوف اور اس کی یاد بیدار ہو۔

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۳۱-۱۳۲)

'طیر' کا مفہوم

'تطیر' طیر سے ہے۔ 'طیر' چڑیوں اور پرندوں کو کہتے ہیں۔ چونکہ توہم پرستوں میں چڑیوں کے اڑنے سے فال لینے کا عام رواج ہے اس وجہ سے 'تطیر' کا لفظ فال لینے کے معنی میں استعمال ہوا۔ پھر اس کا غالب استعمال فالِ نحس کے معنی میں ہو گیا۔ اسی مادے سے 'طائر' کا لفظ بھی ہے جو اس چیز کے لیے استعمال ہوا جس سے کوئی نیک یا بد فال لی جائے اور پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے حظ، قسمت اور نصیبہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

آفات پر فرعونیوں کا ردِ عمل

اب یہ بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو آزمائشیں فرعونیوں کو جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے بھیجیں کہ وہ حضرت موسیٰ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوں انھوں نے ان کو حضرت موسیٰ کی نحوست کا نتیجہ قرار دیا۔ جب حالات سازگار ہوتے تو اس کو اپنی خوش بختی، بلند اقبالی اور اپنے استحقاق کی برکت قرار دیتے لیکن جب کسی ارضی و سماوی آفت سے دوچار ہوتے تو کہتے کہ یہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست ہے۔ یہ جو بے دینی و بے عقیدگی پھیلا رہے ہیں اس سے ارضی و سماوی دیوتا ناخوش ہو گئے ہیں جس کا نتیجہ ان آفتوں کی شکل میں سامنے

آرہا ہے۔ فرمایا کہ ان کا طائر قسمت و نحوست ہے تو خدا کے پاس اور یہ پیدا ہوا ہے ان کی اپنی ہی بداعمالیوں سے لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت سے ناواقف ہے اس وجہ سے وہ اپنی نحوست دوسروں کے طالع میں ڈھونڈھ رہے ہیں۔

'وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا' یہ ان کا حتمی جواب نقل ہوا ہے کہ خواہ ہم پر جادو چلانے کے لیے تم کتنی ہی نشانیاں دکھاؤ ان چیزوں سے مرعوب ہو کر ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۱۳۳-۱۳۵)

حضرت موسیٰ کے معجزات

اوپر آیت ۱۳۰ میں جن آزمائشوں کا ذکر ہوا ہے، یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس عام سنت الٰہی کے تحت ظہور میں آئیں جو ہر رسول کی دعوت کی تائید و تقویت اور لوگوں کے اندر تضرع اور تذکر پیدا کرنے کے لیے رحمت الٰہی کا مقتضیٰ ہیں لیکن جب فرعونی ان سے اثر پذیر نہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ہاتھوں نہایت اہم معجزات دکھائے جن میں سے چند کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔ ہم تورات کی روشنی میں اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

'طوفان'

'طُوْفَان'۔ تورات میں اس طوفان کی تفصیل اس طرح آئی ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا تاکہ سب ملک مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملک مصر میں ہے اولے گریں اور موسیٰ نے اپنی لاٹھی آسمان کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اور اولے بھیجے اور آگ زمین تک آنے لگی اور خداوند نے ملک مصر پہ اولے برسائے پس اولے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے اور اولوں نے سارے ملک مصر میں ان کو جو میدان میں تھے، کیا انسان کیا حیوان، سب کو مارا اور کھیتوں کی ساری سبزی کو بھی اولے مار گئے اور میدان کے سب درختوں کو توڑ ڈالا۔" خروج باب ۹ ۲۲-۲۵

اس سے معلوم ہوا کہ یہ طوفان رعد، گرج، کڑک اور اولوں کا طوفان تھا۔ بارش اور ہوائے تند بھی اکثر اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس میں آگ کا جو ذکر ہے یہ تورات کے مترجموں کی غلطی ہے۔ اس سے مراد ہماری عام آگ نہیں ہے بلکہ یہ وہ بجلی ہے جو اس طرح کے طوفان کے لوازم میں سے ہے۔

ٹڈیاں

'جراد' جراد ٹڈی کو کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل تورات میں یوں آئی ہے۔

"تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ملک مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ ٹڈیاں ملک مصر پر آئیں اور ہر قسم کی

سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے چٹ کر جائیں۔ پس موسیٰ نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی اور خداوند نے اس سارے دن اور ساری رات پروا آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک مصر پر چھا گئیں اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور ان کا دل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو ان سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں اور نہ ان کے بعد پھر آئیں گی کیونکہ انھوں نے تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا، ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انھوں نے اس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے چٹ کر لیا اور ملک مصر میں نہ تو کسی درخت کی نہ کھیت کی کسی سبزی کی ہریالی باقی رہی۔" خروج باب ۱۲ - ۱۵

جوئیں

'قمل' کے معنی ہیں جوئیں۔ یہ آفت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

"تب خداوند نے موسیٰ سے کہا، ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مار تا کہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کی گرد کو مارا اور انسان اور حیوان پر جوئیں ہو گئیں اور تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔" خروج ب ۱۶ - ۱۷

مینڈک

'الضَّفَادِعُ'، 'ضفادع'، ضفدع کی جمع ہے۔ 'ضفدع' مینڈک کو کہتے ہیں۔ اس عذاب کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ فرعون کے پاس جا اور اس سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے کہ میری عبادت کریں۔ اور اگر تو ان کو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے ماروں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں سے بھر جائے گا اور وہ آ کر تیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور تیرے آٹا گوندھنے کے لگنوں میں گھستے پھریں گے اور تجھ پر اور تیری رعیت اور تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے اور خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر بڑھا اور مینڈکوں کو ملک مصر پر چڑھا لا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا اس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا۔" خروج ب ۱ - ۶

خون

'دم' کے معنی خون کے ہیں۔ اس کے ظہور کی شکل اس طرح مذکور ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے اور مصر میں جتنا پانی ہے یعنی دریاؤں، اور نہروں اور جھیلوں اور تالابوں پر اپنا ہاتھ بڑھا تا کہ وہ خون بن جائیں اور سارے ملک مصر میں پتھر اور لکڑی کے برتنوں میں بھی خون ہی خون ہوگا اور موسیٰ اور ہارون نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا۔ اس نے لاٹھی اٹھا کر اسے فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے دریا کے پانی پر مارا اور دریا کا

پانی سب خون ہو گیا اور دریا کی مچھلیاں مرگئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی نہ
پی سکے اور تمام ملک مصر میں خون ہی خون ہو گیا۔" خروج ب۷ ۱۹-۲۱

'اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ' یعنی یہ تمام نشانیاں تفصیل سے مذکور ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ 'مُفَصَّلٰتٍ' کا ظرف یہاں محذوف ہے یعنی ان کی تفصیل تورات میں موجود ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اسی ذیل کے چند اور معجزات بھی تمام جزئیات کی تفصیلات کے ساتھ تورات میں بیان ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان کی طرف چونکہ صرف اشارہ کیا ہے اس وجہ سے ان کی تفصیلات کے لیے حوالہ تورات کا دے دیا ہے۔

'فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ' یعنی بجائے اس کے کہ ان سے ان کے اندر تضرع اور تذکر پیدا ہوتا ان کے غرور اور تکبر میں اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مجرم لوگ تھے اور اللہ تعالیٰ مجرموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ان کے لیے نشانیاں ہدایت کے بجائے صرف اتمام حجت اور قساوت قلب کا باعث بنتی ہیں۔

بار بار عہد اور بار بار عہد شکنی

'لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ الاٰية' - 'لَمَّا'، 'كُلَّمَا' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ خاص طور پر ان مواقع میں جہاں مدنظر تصویر حال ہو۔ آگے آیت ۱۸۹ میں اس کی نظیر موجود ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب جب وہ عذاب کی گرفت میں آتے حضرت موسیٰ کی منت سماجت کرنے لگتے کہ اس قرب و تعلق کی بنا پر جو تمہیں اپنے رب سے ہے، ہمارے لیے دعا اور سفارش کرو کہ یہ عذاب ہمارے سر سے ٹل جائے، اگر تم نے اس کو ٹال دیا تو ہم ضرور تمہاری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ جانے دیں گے لیکن جب عذاب ٹل جاتا تو اپنے وعدے سے پھر مکر جاتے۔ تورات میں اس کا ذکر یوں ہے۔

"تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلا کر کہا کہ خداوند سے شفاعت کرو کہ مینڈکوں کو مجھ سے اور
میری رعیت سے دفع کر دے اور میں ان لوگوں کو جانے دوں گا تاکہ وہ خداوند کے لیے قربانی کریں۔"

(خروج ب۸ : ۸)

"فرعون نے کہا میں تم کو جانے دوں گا تاکہ تم خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی کرو لیکن تم
دور مت جانا اور میرے لیے شفاعت کرنا .... پر فرعون نے اس بار بھی اپنا دل سخت کر لیا اور
ان لوگوں کو جانے نہ دیا۔" (خروج ب۸ ۲۸-۳۲)

'رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ' کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ چونکہ خدا تمہاری بات سنتا اور تمہاری دعا کی حرمت قائم رکھتا ہے اس وجہ سے ہمارے لیے دعا کرو۔

'إِلٰى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ' سے مقصود ان کی بے ضمیری اور ان کے سفلہ پن کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ ان کے فریب اور جھوٹ پر زیادہ دیر تک پردہ نہ پڑا رہ سکے گا وہ محض اس خیال سے جھوٹا عہد کر بیٹھتے کہ اس سے جتنی دیر کے لیے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اٹھا لیا جائے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ○ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۱۳۶-۱۳۷)

'فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ الآیۃ'۔ اس انتقام سے مراد ان جرائم کا انتقام ہے جن پر پورے پورے اتمام حجت کے باوجود وہ جمے رہے۔ اللہ کی آیات سے اول تو وہ بے پروا اور غافل رہے اور جب وہ کھلے ہوئے چیلنج کے ساتھ ان کے سامنے ظاہر ہوئیں تو انھوں نے ان کی تکذیب کر دی کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ سحر و شعبدہ کا کرشمہ ہیں۔ اس کی پاداش میں وہ سمندر میں غرق کر دیے گئے۔ اس واقعۂ غرق کی تفصیلات کے لیے موزوں مقام ہماری اس کتاب میں آگے آئیں گے۔

بنی اسرائیل کو ان کے صبر کا صلہ

'وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ الآیۃ'۔ 'يُسْتَضْعَفُوْنَ' سے اشارہ ان مظالم و شدائد کی طرف ہے جو بنی اسرائیل کو دبائے رکھنے کے لیے فرعونیوں کے ہاتھوں ان پر ڈھائے گئے اور جن میں سے بعض چیزوں کی طرف اوپر اشارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ وہی قوم جو غلامی و محکومی کے نہایت سخت شکنجوں میں کسی ہوئی تھی اللہ نے اس کو رفعت بخشی اور اس کو سرزمین فلسطین کی حکومت عطا فرمائی۔ اس حکومت بخشنے کے لیے یہاں 'ایراث' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس میں یہ مضمون مضمر ہے کہ ان کے سابق حکمرانوں کو اللہ نے وہاں سے ہٹایا اور ان کو ان کی وراثت دلائی۔ اس سرزمین کی تعریف میں 'الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِيْهَا' کے جو الفاظ وارد ہیں اول تو وہ یہ متعین کرتے ہیں کہ اس سے مراد فلسطین ہی کی سرزمین ہے اس لیے کہ قرآن میں اس صفت کے ساتھ اسی سرزمین کا ذکر ہوا ہے۔ دوسرے یہ الفاظ اس سرزمین کی روحانی اور مادی دونوں قسم کی برکتوں کو ظاہر کر رہے ہیں اس لیے کہ عربی میں 'مبارک' کا لفظ ان دونوں ہی مفہوموں کا حامل ہے۔

'مَشَارِق' اور 'مَغَارِب' کے الفاظ سے اس حکومت کے وسیع الاطراف ہونے کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ عربی میں بعض مرتبہ کسی لفظ کی جمع اس کے اطراف کی وسعت کے لحاظ سے بھی آتی ہے۔ پیچھے لفظ 'اعراف' پر بحث کرتے ہوئے ہم اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

'وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ' سے اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر آیات ۱۲۸ - ۱۲۹ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے آبا و اجداد سے کیا تھا اور جس کی تجدید بالآخر موسیٰ سے فرمائی وہ وعدہ بالآخر پورا ہوا۔

'بِمَا صَبَرُوْا' سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہوتے ہیں وہ بہرحال اوصاف و کردار پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ مجرد خاندان و نسب کسی کو خدا کا چہیتا بنا دے۔

قوم فرعون کی تباہی

'وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ'، یعنی فرعون اور اس کی قوم کی تمام شاندار تعمیرات بھی ہم نے برباد کر دیں اور ان کے سرسبز و شاداب باغات بھی اجاڑ دیے۔ یہاں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں 'مَا كَانَ يَصْنَعُ' اور 'مَا

کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ، میرے نزدیک پہلے سے تعمیرات کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے سے باغات کی طرف۔ جس فرعون کا یہاں ذکر ہے اس کو تعمیرات سے خاص ذوق رہا ہے اور بنی اسرائیل زیادہ تر انہی تعمیرات کی خاطر دن رات بیگار میں جتے رہتے تھے۔ 'مَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ' سے اصلاً تو انگور کے باغ مراد ہیں اس لیے کہ انہی کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں، جیسا کہ قرآن میں 'جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ' کی ترکیب موجود ہے، لیکن بسا اوقات کسی چیز کی تعبیر اس کے جزو غالب سے کی جاتی ہے جو باعتبار لفظ تو خاص ہوتی ہے لیکن مراد اس سے عام ہوتی ہے۔ مصر کو، کم از کم اس دور میں انگور کی پیداوار میں امتیاز حاصل رہا ہے۔ سورۂ یوسف کے بعض مقامات سے بھی اس کا اشارہ نکلتا ہے۔

اس ٹکڑے سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ قوم فرعون پر غرق کے علاوہ بھی تباہی آئی جس سے ان کے شہر اور باغ سب اجڑ گئے۔ ان کے باغ تو، جیسا کہ اوپر گزرا، پہلے ہی اولوں اور ٹڈیوں سے تباہ ہو چکے تھے، معلوم ہوتا ہے کوئی زلزلہ بھی اسی دوران میں آیا جس سے ان کی عمارتیں بھی منہدم ہو گئیں اور جو کچھ پچھلی آفتوں سے بچ رہا تھا وہ بھی برباد ہو گیا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۱۳۸ - ۱۴۰)

'وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ' الآیۃ، اس اسلوب میں جو بلاغت ہے اور بنی اسرائیل کے لیے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہتمام و عنایت کی جو شان ہے اس کی طرف ہم بقرہ آیت ۵۰ کی تفسیر میں اشارہ کر چکے ہیں۔

بنی اسرائیل کی سرگزشت مصر سے نکلنے کے بعد

یہاں تک بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہوا جو مصر اور فرعون سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی جو شانیں ظاہر ہوئی ہیں اور اس نے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی جس طرح مدد فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو جس طرح ہلاک کیا وہ سب سامنے آ گیا اور اس پہلو سے یہ سرگزشت ان سرگزشتوں کا تکملہ اور تتمہ بن گئی جو اس سورہ میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اب آگے بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہو رہا ہے جو مصر سے نکلنے اور دریا پار کر لینے کے بعد کا ہے۔ اس حصہ سے یہ حقیقت نمایاں ہو گی کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر بنی اسرائیل کی مدد کی اور ان کی رہنمائی فرمائی لیکن بنی اسرائیل نے ہر قدم پر ناشکری کی اور ٹھوکر کھائی۔

'فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ' یہاں لفظ 'قَوْمٍ' سے ان قوموں میں سے کوئی قوم مراد ہے جن سے بنی اسرائیل کو دریا سے نکلنے کے بعد سابقہ پیش آیا ہے۔ ان میں سے ہر قوم بت پرست تھی 'یَعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ' کا اسلوب بیان فی الجملہ ان کی تحقیر کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ یعنی وہ ایسے ناسمجھ اور احمق تھے کہ خدائے رحمان و رحیم کو چھوڑ کر اپنے ہی ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں سے چمٹے ہوئے اور ان کی بندگی اور پوجا میں سرگرم تھے۔ لفظ 'عکوف' جب 'علیٰ' کے ساتھ آئے تو اس کے معنی کسی شے پر جم جانے اور اس سے اپنے آپ کو وابستہ

کر لینے کے آتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی پہلی ٹھوکر

قَالُوۡا یٰمُوۡسَی اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰـهًا، لیکن ان سے زیادہ احمق بنی اسرائیل نکلے کہ یہ تماشا دیکھتے ہی اس پر ریجھ گئے اور حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ شروع کر دیا کہ جیسے دیوتا ان کے پاس ہیں ویسا ہی ایک دیوتا ہمارے لیے بھی بنا دے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کی طویل غلامی نے بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی سطح اتنی پست کر دی تھی کہ خدا کے جمال و جلال کی اتنی شانیں دیکھنے کے بعد بھی وہ گویا ابھی مصر کی ظلمات ہی میں تھے۔ قدیم مالوفات سے وابستگی آسانی سے نہیں جاتی۔ شاید یہی نکتہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد تمام آثار شرک یک قلم مٹا دینے کے احکام جاری فرما دیے کہ خام اور کمزور لوگوں کے لیے یہ چیزیں فتنہ نہ بن سکیں۔

قَالَ اِنَّكُمۡ قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ، حضرت موسیٰؑ نے مطالبہ کے جواب میں فرمایا کہ تم لوگ بڑے ہی بے عقل، وہمی اور جذباتی ہو۔ اِنَّ هٰۤـؤُلَاۤءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمۡ فِیۡهِ، یہ تو جو کچھ یہ کر رہے ہیں سب خدا کے ہاں بالکل برباد و پامال کر دیا جائے گا اس لیے کہ یہ یکسر باطل ہے۔ سوچو کہ اپنی ہدایت و شریعت کے لیے تمھارا انتخاب کر کے تمھیں ساری دنیا پر فضیلت و سرفرازی تو اللہ نے بخشی تو کیا اب میں اس کو چھوڑ کر تمھارے لیے کوئی اور معبود ڈھونڈنے نکلوں۔ اس سے بڑی ناشکری و ناسپاسی اور کیا ہو گی۔!!

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ!

وَاِذۡ اَنۡجَیۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ؕ وَفِیۡ ذٰلِكُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِیۡمٌ، اس آیت کی تفسیر بقرہ میں بھی گزر چکی ہے اور اس سورہ میں بھی۔ یہاں جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت سے لے کر آگے آیت ۱۴۷ تک اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اہتمام کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو اپنی ہدایت و شریعت سے مشرف فرمانے کے لیے کیا لیکن اس سارے اہتمام کی بنی اسرائیل نے یہ قدر کی کہ ادھر حضرت موسیٰؑ طور پر اللہ کی شریعت لینے گئے ادھر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی تمام نصیحتوں اور ان کے خلیفہ حضرت ہارونؑ کی تمام کوششوں کے علی الرغم وہی بت ڈھال کر تیار کر دیا جس کے لیے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰؑ نے ان کو وہ تنبیہ و ملامت فرمائی تھی جس کا ذکر اوپر گزرا۔ مقصود اس ساری تفصیل سے یہ دکھانا ہے کہ جو قوم آج اپنے شرف و تقدس پر اتنی نازاں ہے عین اپنے نبی کی موجودگی میں، اور اس کے عظیم معجزات کو دیکھتے ہوئے، کیا حرکتیں کر چکی ہے۔

وَوٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَةً وَّاَتۡمَمۡنٰهَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِیۡقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَةً ۚ وَقَالَ مُوۡسٰی لِاَخِیۡهِ هٰرُوۡنَ اخۡلُفۡنِیۡ فِیۡ قَوۡمِیۡ وَاَصۡلِحۡ وَلَا تَتَّبِعۡ سَبِیۡلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ (۱۴۲)

انبیاءؑ کی لغزش کی نوعیت

اس آیت کی وضاحت بقرہ کے تحت ہو چکی ہے۔ یہ اس اہتمام کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی شریعت دینے کے لیے فرمایا۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ وہ ۳۰ دن کے لیے کوہ طور کے ایک مخصوص مقام پر حاضر ہوں۔ حضرت موسیٰؑ، جیسا کہ آیت ۱۴۸ کے تحت بحث آئے گی، وقت مقررہ سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ ہر چند حضرت موسیٰؑ کی یہ سبقت رضائے الٰہی کی طلب کی راہ میں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس

عجلت و سبقت پر گرفت فرمائی اور اس کی حکمت تربیت مقتضی ہوئی کہ ۳۰ دن کی مقررہ مدت بڑھا کر ۴۰ دن کر دی جائے۔ ہم آگے کسی مناسب موقع پر یہ واضح کریں گے کہ انبیاء علیہم السلام اتباعِ ہوا سے مغلوب ہو کر کبھی غلطی نہیں کرتے لیکن اتباعِ رضائے الٰہی کے جوش میں اگر کبھی کوئی قدم ان کا حدود سے ذرا متجاوز اٹھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی ان کو روک دیتا ہے اس لیے کہ وہ حق کی میزان ہوتے ہیں اور میزان کا ہر پہلو سے ٹھیک ہونا اور سو فی صدی ٹھیک ہونا ضروری ہے۔

حضرت موسیٰ کی ہدایت حضرت ہارونؑ کو

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِیْهِ یہ اس اہتمام کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ نے اپنی وقتی غیبت کے دوران بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے فرمایا۔ انھوں نے اپنی غیر حاضری کے زمانے کے لیے حضرت ہارونؑ کو اپنا خلیفہ بنایا اور ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ تم قوم کے اندر کوئی خرابی، کوئی بگاڑ اور کوئی بدعت و ضلالت نہ پیدا ہونے دینا۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز رونما ہو تو اس کی اصلاح کرتے رہنا اور ہرگز ہرگز بگاڑ پیدا کرنے والوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ کے الفاظ سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ قوم کے اندر جو عناصر فسادی تھے حضرت موسیٰؑ ان سے آگاہ تھے اور ان کی طرف سے ان کی پچھلی کارستانیوں کے سبب سے ان کو اندیشہ بھی تھا اس وجہ سے انھوں نے حضرت ہارونؑ کو خاص تاکید کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اگر یہ عناصر کوئی فتنہ اٹھانے کی کوشش کریں تو اس کو چلنے نہ دینا ــــ یہ ملحوظ رہے کہ یہ سارا اہتمام اس لیے بیان ہو رہا ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ بنی اسرائیل نے اسی دوران میں گوسالہ پرستی کی جو لعنت اختیار کی تو اس سارے اہتمام کے علی الرغم اختیار کی۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِیْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۴۳)

'مِیْقَات' کے معنی وقت مقررہ کے ہیں۔ یہاں 'مِیْقَات' سے مراد وہ وقت خاص ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے خطاب و کلام سے مشرف کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔

انسان ناسوتی آنکھوں سے خدا کو نہیں دیکھ سکتا

قَالَ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ۔ کلام سے مشرف ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو شوق ہوا کہ جس کا کلام سامعہ نواز ہوا ہے اس کا دیدار بھی باصرہ نواز ہو۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ادب سے یہ درخواست کی کہ اے رب تو مجھے اپنے آپ کو دکھا کہ میں تجھے دیکھ لوں، یہ شوق ایک فطری شوق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اس پر ملامت نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ انسان ان ناسوتی آنکھوں سے خدا کی ذات کو نہیں دیکھ سکتا، صرف اس کی صفات کے مظاہر ہی کو دیکھ سکتا ہے۔

وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ۔ یہ مشاہدہ حضرت موسیٰؑ کی اطمینان دہانی کے لیے کرایا گیا کہ خدا کی تجلیٔ ذات کی تاب تو کوہ و جبل بھی نہیں لا سکتے جو جامد اور ٹھوس ہونے کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہیں تو تم انسان ضعیف البنیان ہو کر کس طرح لا سکو گے۔ انسان کی قوتِ برداشت

محدود ہے۔ اس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں لیکن یہ روشنی ایک حدِ خاص سے متجاوز ہو جائے تو آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات بینائی ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اس کے کان آواز کو سنتے ہیں لیکن ان کے سننے کی تاب بھی بس ایک مقررہ حد ہی تک ہے، بجلی کا کڑکا ہی ذرا حد سے متجاوز ہو جائے تو سرے سے کان کے پردے ہی بے کار ہو جائیں۔ آفتاب اس کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے مگر اس کی روشنی اور حرارت اسی وقت تک اس کے لیے حیات بخش ہے جب تک وہ نہایت ہی طویل فاصلے سے، نہ جانے کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں سے گزار کر اپنی روشنی اور حرارت اس کو پہنچا رہا ہے۔ اگر کسی دن ذرا کرۂ ارض سے قریب آکر اس پر ایک نظر ڈال دے تو سارے جاندار جل بھن کر خاک اور راکھ ہو جائیں تو جب اس کائنات کی مخلوق کے مقابل میں انسان کی قوت برداشت اتنی ناتوان ہے تو وہ خدا کی ذات بحت کی تاب کس طرح لا سکتی ہے جو نورِ مطلق اور تمام چون و چگوں سے ماورا اور بالا تر ہے۔ فرمایا کہ تم میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے، البتہ تم سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو، میں اس پر اپنی تجلی ڈالتا ہوں۔ اگر وہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ جائے تو تم سمجھنا کہ تم مجھے دیکھ سکتے ہو، اگر نہ ٹکا رہ سکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز تمہاری برداشت سے بدرجہا اولیٰ بالا تر ہے۔

'فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا'، دك الحائط، هدمه حتى سواه بالارض، 'دك الارض' سوّى صعودها و هبوطها۔ 'دك الحائط' 'دك الارض' کے معنی ہوں گے دیوار کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا یا زمین کے تمام نشیب و فراز برابر کر دیے۔

'جبل' سے مراد یہاں پورا پہاڑ اور پورا سلسلۂ کوہ نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی خاص حصہ یا حضرت موسیٰ کے سامنے کی کوئی مخصوص چوٹی ہے۔ کُل بول کر جزو مراد لیا ہے۔ جیسا کہ ہر زبان میں معروف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جب پہاڑ کے مخصوص حصے پر اپنی تجلی ڈالی تو پہاڑ پاش پاش ہو کر منہدم ہو گیا۔ واضح رہے کہ یہ تجلی ذات کا محض ایک پرتو اور ایک شمہ ہی رہا ہوگا لیکن پہاڑ جیسی جامد چیز بھی اس کی تاب نہ لا سکی اور حضرت موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

'فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ' جب حضرت موسیٰ ہوش میں آئے تو بولے کہ 'سُبْحٰنَكَ' تو اس سے ارفع و منزہ ہے کہ تجھے ناسوتی آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ 'تُبْتُ اِلَيْكَ' میں نے یہ جسارت کی کہ تجھے دیکھنے کی خواہش کی۔ میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں 'وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ' اور میں سب سے پہلا اس بات پر ایمان لانے والا بنتا ہوں کہ تیری ذات ہماری آنکھوں کے مشاہدے سے بالاتر ہے۔

بنی اسرائیل کی محسوس پرستی کا علاج

اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر حضرت موسیٰ کو یہ سب کچھ بنی اسرائیل کی ایک شدید عقلی بیماری کو دور کرنے کے لیے دکھایا۔ تورات میں متعدد مواقع پر یہ مذکور ہے کہ بنی اسرائیل نے بار بار حضرت موسیٰ سے خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کیا۔ وہ کہتے کہ خدا جب تم سے بات کرتا ہے تو ہم سے بھی رو در رو ہو کر بات کرے اور ہم اس کو دیکھیں

اللہ تعالیٰ کی وہ تمام شانیں جو انھوں نے اب تک دیکھی تھیں وہ ان کے دلوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہوئیں۔ ایک ان دیکھے خدا پر کسی طرح ان کا دل جمتا ہی نہ تھا۔ اوپر اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ، کا جو مطالبہ ان کی طرف سے مذکور ہے وہ بھی ان کی اسی خواہش کا مظہر ہے کہ وہ خدا کو ایک پیکرِ محسوس میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی اس محسوس پرستی کی بیماری کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت موسیٰ کو واضح طور پر بتا اور دکھا دیا کہ خدا آنکھوں سے دیکھنے اور ہاتھوں سے چھونے کی چیز نہیں ہے، صرف عقل سے سمجھنے اور دل سے ماننے کی چیز ہے۔ آنکھیں صرف اس کی صفات کے جلوے دیکھ سکتی ہیں، اس سے آگے ان کی رسائی نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ نے یہ ساری باتیں بنی اسرائیل کو سمجھائیں لیکن یہ کھٹک ان کے دلوں سے گئی نہیں چنانچہ اس کی وجہ سے وہ خدا کے عتاب میں بھی آئے جس کا ذکر بقرہ میں بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا۔

اس مقام سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جن جوگیوں اور صوفیوں نے مشاہدہ ذاتِ الٰہی کو معرفت کا درجۂ کمال قرار دیا ہے اور اس کو اپنا نصب العین بنایا ہے انھوں نے اپنا گول اپنی رسائی کے حد سے بہت آگے بڑھ کر باندھا ہے اور اس کا حاصل خیرگی اور تحیر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ مگس شہباز کے شکار کے لیے نکلے۔ ہم سورۂ نجم کی تفسیر میں انشاء اللہ بتائیں گے کہ اوروں کا کیا ذکر سب سے زیادہ عالی مقام اور صاحب قرب حضرت جبرئیل ہیں لیکن ان کی رسائی کی بھی ایک حد مقرر ہے، وہیں سے وہ انوار و تجلیات سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، اگر ذرا اس سے آگے قدم بڑھائیں تو

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۴)

جو بخشا گیا اس پر قناعت کرو

مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے پیغام اور اپنے کلام سے تم کو لوگوں پر جو برگزیدگی بخشی ہے تمھارے شرف کے لیے یہی بس ہے، میں نے جو تعلیم و ہدایت تمھیں عطا فرمائی ہے اس کو مضبوطی سے پکڑو اور برابر میرے شکر گزار رہو۔ یعنی اس کا حق ادا کرو، خود بھی دل و جان سے اس کی قدر کرو، دوسروں کو بھی یہ بتاؤ اور سکھاؤ۔ اندازِ کلام سے یہ بات بھی نہایت لطیف طریقہ سے نکلتی ہے کہ جو عطا ہوا ہے تمھارے لیے یہی بہت ہے اس پر قناعت کرو۔ میرے دیدار کی خواہش نہ کرو۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۚ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ (۱۴۵)

الواح سے متعلق تورات کی دو مختلف روایتیں

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ، تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھا یا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت موسیٰ علیہ السلام نے لکھا؟ تورات سے دونوں باتیں نکلتی ہیں۔

"اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی سب باتیں اور احکام ان کو بتا دیے اور سب لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں ہم ان سب کو مانیں گے اور موسیٰؑ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لیں۔" (خروج ۲۴: ۳-۴)

دوسرے مقام میں اس طرح ہے۔

"اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں ادھر سے اور ادھر سے دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا تھا وہ بھی خدا ہی کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا" خروج ۳۲: ۱۵-۱۶

قرآن کے الفاظ دونوں معنوں کو متحمل ہیں اور اصلاً دونوں میں کوئی فرق ہے بھی نہیں۔ جب حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت لکھا تو یہ اللہ تعالیٰ ہی نے لکھا۔ ایک پل کی تعمیر ایک انجینیر کرتا ہے لیکن بادشاہ یا حکومت کے حکم اور اس کے منصوبہ اور نقشہ کے تحت کرتا ہے۔ اس لیے کہا یہ جاتا ہے کہ بادشاہ یا حکومت نے پل بنایا۔ قرآن کی حفاظت کا تمام اہتمام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے ہاتھوں عمل میں آیا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت عمل میں آیا اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اور ہم ہی ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

بنی اسرائیل کے لیے تعلیم بالقلم کا اہتمام

یہ الفاظ اس اہتمام و عنایت خاص کو ظاہر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت دینے کے معاملے میں فرمائی۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے انھوں نے اپنی اپنی امتوں کو زبانی تعلیم دی لیکن بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا۔ ان کے پیغمبر نے صرف قول و عمل ہی سے ان کو نہیں بتایا اور سکھایا بلکہ ان کے لیے سب کچھ قلم بند بھی کر دیا کہ اللہ کی شریعت ان کو سب سے زیادہ محفوظ و مامون شکل میں ملے لیکن اس اہتمام کی جو قدر انھوں نے کی اس کی تفصیلات بقرہ میں بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آرہی ہیں۔

الواح میں مندرج تفصیلات کی نوعیت

'مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ' یعنی ان الواح میں ہر قسم کی ضروری ہدایات بھی تھیں اور تمام ضروری تفصیلات بھی۔ 'مِنْ كُلِّ شَيْءٍ' اور 'لِكُلِّ شَيْءٍ' اس طرح کے سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو اس کا تعلق پیش نظر مقصد و موضوع ہی سے ہوتا ہے۔ یعنی اس مرحلہ میں دین و شریعت کی جو باتیں بتانی مدنظر تھیں وہ ساری باتیں بھی بتائی گئیں اور جماعتی تنظیم و تشکیل سے متعلق جو تفصیلات درکار تھیں وہ بھی درج الواح ہوئیں۔ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ الواح میں صرف مشہور احکام عشرہ ہی درج ہوئے لیکن یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوپر ہم نے کتاب خروج سے جو حوالے نقل کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تختیاں دو تھیں اور دونوں اپنے دونوں جانب سے بھری ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں تورات کے مذکورہ مقام پر بہت سی دوسری تفصیلات بھی ہیں جو جماعتی تنظیم و تشکیل سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی نوعیت ایسی ہے کہ اس مرحلہ میں بنی اسرائیل

کو ان سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔ پھر یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے تورات کی طرح صرف دو ہی تختیوں کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ 'الواح' کا لفظ استعمال کیا ہے جو جمع کے لیے آتا ہے اور عربی میں جمع کا اطلاق دو سے زیادہ پر ہوتا ہے۔

صیغۂ تفضیل کا ایک خاص محل

'فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا' اس کو مضبوطی سے پکڑو یعنی پورے عزم و جزم کے ساتھ اس کو اختیار کرو اور ہر طرح کے حالات میں، خواہ نرم ہوں یا سخت، اس کی ہدایات پر جمے رہو اور اپنی قوم کو بھی ہدایت کرو کہ دوسری جاہل قوموں کی ریس میں ان کے جیسے بتوں کی فرمائش نہ کرے اور نہ ان کے طور طریقے اختیار کرے بلکہ اس سے بہتر طریقے کو اپنائے جو اس نوشتہ میں بتایا گیا ہے۔ 'بِاَحْسَنِهَا' میں جو تقابل و تفاضل ہے وہ نوشتۂ الواح کی مختلف ہدایات میں نہیں ہے اس لیے کہ وہ تو ساری کی ساری احسن ہی تھیں اور سب بلا استثناء انتخاب اختیار کرنے کے لیے بھی تھیں بلکہ یہ ترجیح مشرک قوموں کے اس طور طریقے کے مقابل میں ہے جن سے بنی اسرائیل کو دریا پار کرنے کے بعد سابقہ پیش آیا اور جن سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ کے سامنے وہ مطالبہ پیش کر دیا جس کا ذکر اوپر آیت ۱۳۸ میں گزرا۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو کہو کہ بت پرست قوموں کی خرافات پر نہ ریجھیں بلکہ اس پاکیزہ اور اعلیٰ و احسن طریقہ کو اپنائیں جو ان الواح میں ان کو بتایا گیا ہے۔ تفضیل کا صیغہ اس مفہوم کے لیے قرآن میں بعض دوسرے مواقع میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورۂ زمر آیت ۵۵ میں۔ ان شاء اللہ کسی موزوں مقام میں ہم اس کی مزید تفصیل بیان کریں گے۔

آگے کے مراحل کے لیے بدرقہ

'سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ' یہ آگے کے مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ ان تعلیمات و ہدایات کو مضبوطی سے پکڑنا تمھارے اور تمھاری قوم کے لیے، اس واسطے بھی ضروری ہے کہ آگے تمھیں کفار و فساق کے علاقوں سے گزرنا اور ان سے سابقہ پیش آنا ہے۔ کفر و فساد کے ان علاقوں میں یہی چیزیں تمھارے لیے بدرقہ اور زادِ راہ کا کام دیں گی اور انہی کے ذریعہ سے تم غالب اور فتح مند رہو گے۔ ان سے مسلح رہے بغیر تمھاری قوم کے لیے ہر قدم پر فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۴۶-۱۴۷)

ایک برسرِ موقع تنبیہ

یہ برسرِ موقع ایک جامع تنبیہ و تذکیر ہے کہ کون لوگ ان تعلیمات کی قدر کریں گے، ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور کون ان سے منہ موڑیں گے اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی محرومی سے دوچار ہوں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی زمین میں رہتے بستے اپنے آپ کو خدا سے بے نیاز، اس کے امر و حکم سے اپنے آپ کو بالاتر، اور اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنا استحقاق ذاتی سمجھیں گے، اللہ ان کو ان ہدایات کی طرف مائل ہونے کی توفیق نہیں دے گا

ایسے لوگوں کے اندر خیر اور ہدایت کی رغبت مردہ ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کو ہدایت کی راہ دکھائی جائے تو وہ اس سے بھاگتے ہیں اور اگر گمراہی کی راہ کی دعوت دی جائے تو اس پر فوراً چل پڑتے ہیں۔ ان کی یہ حالت نتیجہ ہوتی ہے اس بات کا کہ وہ خدا کی نشانیوں سے بے پروا، زندگی گزارتے ہیں اور واضح سے واضح بات بھی ان کے سامنے آئے تو اس کو جھٹلا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اللہ کی آیات اور آخرت کی ملاقات کے جھٹلانے والے ہیں، ان کے سارے اعمال اکارت اور بے ثمر ہو کے رہ جائیں گے۔ آخرت میں صرف اس عمل کی قدر و قیمت ہے جو خدا کی رضا کے لیے آخرت کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِن بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ ۚ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ (۱۴۸)

اس سارے اہتمام کی بنی اسرائیل کی طرف سے قدردانی

یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان کی ہدایت کے لیے یہ کچھ جتن کیے جو مذکور ہوئے لیکن انھوں نے اس کی قدر یہ کی کہ حضرت موسیٰ کے جانے کے بعد ایک بچھڑے کی مورت بنا کر اس کی پوجا پاٹ میں لگ گئے۔

'مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ' اس مورت کو بنانے کے لیے تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اپنے سونے کے زیورات چندہ میں دیے۔ انہی زیورات سے بچھڑے کی ایک مورت بنائی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ صنعت گری یہ کی گئی کہ اس میں سے جب ہوا گزرتی تو جس طرح بچھڑے ڈکرتے ہیں اس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی۔ خُوَار عربی میں بیل کے ڈکرنے کی آواز کو کہتے ہیں۔

قرآن نے یہ ساری تصریح بنی اسرائیل کی بلادت، عقلی بے مایگی اور ساتھ ہی ان کی ناقدری و ناسپاسی ظاہر کرنے کے لیے کی ہے کہ جس خدائے بے ہمتا و بے مثال نے ان کو اپنے جلال و جمال کی وہ شانیں دکھائیں جو اوپر مذکور ہوئیں اس کی قدر انھوں نے یہ کی کہ اپنے ہی زیوروں سے ایک بچھڑا بنایا، بچھڑا بھی کوئی سچ مچ کا نہیں بلکہ صرف ایک جسد، ایک قالب، ایک دھڑ، جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی اور اس کے متعلق یہ باور کر لیا کہ یہی وہ خداوند خدا ہے جو بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے چھڑا کر لایا اور یہی اپنی رہنمائی میں بنی اسرائیل کو ارض موعود کی بادشاہی دلائے گا!! اس طرح انھوں نے اپنا وہ شوق پورا کر لیا جس کا اظہار انھوں نے حضرت موسیٰ کے سامنے ان کے طور پر جانے سے پہلے کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰ نے ان کو ڈانٹ بتائی تھی۔

سامری کا فن

تورات والوں نے تو یہ سارا فتنہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن قرآن نے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اس کی شدت کے ساتھ تردید کی ہے اور اس سارے فساد کا ذمہ دار، جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں آئے گا، سامری کو قرار دیا ہے جو بڑا ہی شاطر اور کیاد منافق تھا اور محض اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے حضرت موسیٰ کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو مصر وغیرہ کی بت پرستی اور صنعت گری سے واقف ہو ایک ایسا بچھڑا ڈھال لینا کچھ مشکل نہ تھا جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلے۔ مندروں کے پجاریوں

اور پروہتوں نے عوام فریبی کے لیے ہر دور میں، ایسے ایسے عجائب اور کمالات دکھائے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس سے بھی کہیں زیادہ عجیب چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ جہاں بت پرستی ہو قدرتی طور پر وہاں بت گری کا فن بھی بہت ترقی کر جاتا ہے۔ مصر کے اسوان بند کی تعمیر کے سلسلہ میں ابو سمبل کا قدیم اور عظیم مندر جو بین الاقوامی اہتمام میں اپنی جگہ سے منتقل کیا گیا ہے، ایک انگریزی مجلے میں اس کی تفصیلات کے مطالعے کا مجھے موقع ملا۔ میں یہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ مندر میں بادشاہ (فرعون) اور ملکہ کے اسٹیچو ایسے زاویے سے نصب کیے گئے تھے کہ سال میں جو تاریخ بادشاہ کی ولادت کی ہوتی اس دن سورج کی پہلی کرنیں بادشاہ کی پیشانی پر پڑتیں۔ اب غور کیجیے کہ جو بادشاہ سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا ہو عوام کالانعام کے دلوں میں اس کی خدائی کا سکہ جمانے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی تھی؟

الغرض سامری کے لیے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس طرح کا کوئی بچھڑا بنا لینا کوئی مشکل کام نہ تھا، جس سے بچھڑے کی سی آواز نکلے لیکن اس نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ عوام فریبی کے لیے اس نے ایک مکاشفہ اور ایک خاص کرامت کا بھی ڈھونگ رچایا جس سے اس کا رنگ عوام پر خوب جم گیا۔ یہاں اتنے پر کفایت کیجیے، سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں انشاء اللہ اس کی تفصیل آئے گی۔

معبود کی ضرورت

'اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُکَلِّمُهُمْ وَلَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا' یہ بات کے بیچ میں جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ ذرا نہ سوچا کہ جو نہ بات کر سکتا نہ رہنمائی کر سکتا آخر وہ کس مرض کی دوا ہے کہ اس کو معبود مان کر اس کی پرستش کی جائے۔ معبود کوئی کھلونا نہیں ہے بلکہ اس سے زندگی کی سب سے بڑی ضرورت وابستہ ہے کہ وہ رہنمائی کرتا ہے۔ اگر اس پہلو سے ایک چیز کا وجود بے معنی ہے تو اس کو معبود کیوں مانیے اور اس کی عبادت کیوں کیجیے۔

'اِتَّخَذُوْهُ وَکَانُوْا ظٰلِمِیْنَ' یہ اصل بات کا حصہ ہے۔ یعنی وہ بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَیَغْفِرْ لَنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (۱۴۹)

بعد از وقت تنبہ

'سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْهِمْ' عربی زبان کا محاورہ ہے جس کے معنی عام طور پر نادم اور خجل ہونے کے کیے گئے ہیں لیکن ندامت و خجالت کا لازم چونکہ غلطی پر متنبہ ہونا بھی ہے اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ متنبہ ہونا کیا جائے تو میرے نزدیک غلط نہ ہوگا۔ اس محاورے کی اصل کیا ہے؟ اس بارے میں اہل لغت کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے اس بات کا کہ ہر محاورے کی اصل کی تحقیق ہے بڑا مشکل کام۔ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ کس چیز کا ہاتھ میں گرایا جانا گویا اس کا سامنے آجانا ہے ایسی حالت میں ایک غبی بھی اس پر متنبہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ ہاتھ کنگن کے لیے آرسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر یہ توجیہ صحیح مان لی جائے تو مطلب یہ ہوا کہ سامری اور

اس کے ساتھیوں کے پروپیگنڈے سے مسحور ہو کر بنی اسرائیل یہ حماقت کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن سامنے جب بھاں بھاں کرتا ہوا بچھڑا نظر آیا اور معلوم ہوا کہ یہ بنی اسرائیل کا خدا برآمد ہوا ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ان کو اپنی حماقت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آئی اور اپنی گمراہی کا احساس ہوا اور بولے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارے اس جرم کو معاف نہ کیا تو ہم تو نامراد ہوئے۔

قرینہ دلیل ہے کہ یہ احساس ان لوگوں کو ہوا جن کے اندر کچھ سوجھ بوجھ موجود تھی۔ عوامی جوش کے بحران میں تو وہ صحیح صورت حال کا اندازہ نہ کر سکے لیکن جب نتیجہ سامنے آگیا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے دیکھا کہ یہ تو معاملہ بہت ہی خراب ہو گیا ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس طرح کے مواقع بڑی ہی آزمائش کے اور بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں۔ کوئی ایک شیطان اٹھتا ہے اور جذباتی عوام کی بھیڑ اپنے ارد گرد جمع کر کے کوئی ایسا فتنہ اٹھا دیتا ہے جس سے پوری جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور بسا اوقات سمجھ دار اور ذمہ دار لوگ بھی اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۱۵۰-۱۵۱)

حضرت موسیٰؑ پر حمیت حق کا غلبہ

تورات اور قرآن دونوں ہی سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو پہاڑ ہی پر اس حادثہ کی اطلاع مل چکی تھی بلکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ ہی نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھی چنانچہ جب وہ پلٹے ہیں تو نہایت غصہ اور غم و افسوس کی حالت میں پلٹے ہیں۔ غصہ ان کو مفسدین کی اس کامیاب شرارت پر تھا اور غم و افسوس اپنی قوم کی نادانی و جہالت پر۔ آتے ہی انھوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کی خبر لی جن پر ان کی غیر موجودگی میں قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عاید ہوتی تھی، فرمایا کہ تم لوگوں نے میرے بعد میری بہت بری جانشینی کی کہ قوم کو اس برے راستے پر ڈالا یا جانے دیا۔

'اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ' یعنی قبل اس کے خدا یہ بتائے کہ اس کی عبادت کا کیا طریقہ ہے کیا (اور یہی بتانے کے لیے اس نے مجھے پہاڑ پر بلایا) تم نے سبقت کر کے خود عبادت کا ایک طریقہ ایجاد کر لیا حالانکہ یہ چیز تمھارے ایجاد کرنے کی نہیں بلکہ خدا ہی کے بتانے کی تھی۔ استفہام یہاں سرزنش اور ملامت کے لیے ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ بت پرستی دراصل عقیدۂ حلول کے تحت وجود میں آئی ہے۔ مشرکین سمجھتے ہیں کہ خدا ان صورتوں اور مورتوں میں حلول کر جاتا ہے اس وجہ سے ان کی عبادت خدا کی عبادت کے ہم معنی ہے۔ آگے اسی سورہ میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث آئے گی۔

'وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ' یہ ان کے غلبۂ حال اور جوش حمیت کی تصویر ہے کہ تختیاں تو انھوں نے

ایک طرف ڈال دیں اور حضرت ہارونؑ کا سر اور شانہ پکڑ کر ان کو جھنجھوڑنے لگے، مطلب یہ کہ یہ کیا ہُوا؟ تم نے اس فتنہ کو کیوں سر اٹھانے دیا؟ چونکہ اصل ذمہ داری حضرت ہارونؑ ہی پر تھی اور ان پر پورا پورا اعتماد بھی تھا اس وجہ سے وہ سب سے زیادہ عتاب کی زد میں آئے۔ اللہ کے معاملے میں یہ جوش و جذبہ غیرتِ ایمانی کا بھی تقاضا ہے اور حضرت ہارونؑ کے ساتھ قلبی محبت کا بھی۔

حضرت ہارونؑ کی طرف سے صفائی

'قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ' یہ حضرت ہارونؑ نے اپنی صفائی پیش فرمائی ہے اور اندازِ خطاب بہت پیارا ہے۔ 'یَا اَخِیْ' نہیں کہا بلکہ 'ابنَ امَّ' اے میرے ماں جائے، کہا جس سے شفقت اور استمالت دونوں چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ حضرت ہارونؑ نے صفائی میں فرمایا کہ قوم نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں۔ اس سے واضح ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس فتنہ سے لوگوں کو روکا بلکہ اس کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی لیکن قوم کی بھاری اکثریت سامری کے چکمے میں آگئی اور خود ان کے ساتھ اتنی قلیل تعداد رہ گئی کہ طاقت کے زور سے ان کے لیے اس کو روکنا ممکن نہیں رہا۔ اس وجہ سے انھوں نے، جیسا کہ دوسری جگہ بیان آئے گا، مصلحت اسی میں دیکھی کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں کہ مبادا ان کا کوئی اقدام کسی مزید مضرت کا باعث ہو جائے۔ چنانچہ قرآن میں ان کا یہ قول نقل ہوا ہے۔ 'اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ' (طٰہٰ: میں ڈرا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ کیا)

'فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ الاٰیۃ' یعنی دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھے ان ظالموں میں شمار نہ کر، یہ سارا فتنہ شریروں کا اٹھایا ہوا ہے، میں اس سے بالکل بری ہوں لیکن جب وہ دیکھیں گے کہ سارا عتاب مجھ پر ہُوا تو وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوں گے کہ فتنہ تو انھوں نے اٹھایا اور ذمہ داری ساری مجھ پر آئی۔

حضرت ہارونؑ پر مرتبین تورات کے جھوٹ کی تردید

اس سے مرتبین تورات کے اس جھوٹ کی پوری پوری تردید ہو گئی جو انھوں نے حضرت ہارونؑ پر لگایا ہے کہ گوسالہ سازی کا یہ سارا کام حضرت ہارونؑ کے اہتمام میں انجام پایا۔ قرآن نے نہ صرف حضرت ہارونؑ کو اس ذلیل تہمت سے بری کیا بلکہ اس فتنہ کے اصل بانی کی بھی نشان دہی کی اور اس کے اس سارے ڈھونگ کو بھی بے نقاب کیا جو عوام فریبی کے لیے اس نے رچایا۔ اس کے موقع پر اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ آئے گی۔

'قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ الاٰیۃ' حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کے اس عذر کو قبول کر لیا۔ حضرت ہارونؑ پر یہ شبہ تو کسی طرح ہو سکتا ہی نہیں تھا کہ خدانخواستہ وہ اس فتنہ کے بانیوں میں ہوں گے البتہ یہ شبہ حضرت موسیٰؑ کو ہُوا ہوگا کہ انھوں نے اس کے روکنے کے لیے اپنی ذمہ داری کما حقہٗ ادا نہیں کی۔ حضرت ہارونؑ کے مذکورہ بالا جواب سے یہ شبہ دُور ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ اپنا سر دے کر بھی اس فتنہ کو روک نہیں سکتے تھے تو ان کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس سے اپنے آپ کو الگ رکھیں اور حضرت موسیٰؑ کا انتظار کریں۔ صورت معاملہ واضح ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگی اور پہلے اپنے لیے مغفرت مانگی اس لیے کہ دعائے مغفرت میں صحیح ادب یہی ہے اور اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے

کہ حمیت حق کے جوش میں بھائی کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ﴿﴾ وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ؗ اِنَّ رَبَّکَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۵۲-۱۵۳)

گوسالہ پرستوں پر غضب الٰہی

یہ وہ وعید ہے جو اس موقع پر بنی اسرائیل کو سنائی گئی کہ جن لوگوں نے یہ گوسالہ سازی کی ہے ان پر آخرت سے پہلے دنیا کی زندگی میں بھی خدا کا غضب اور ذلت کی مار ہوگی، اس لیے کہ یہ اللہ پر افترا کیا گیا ہے اور اللہ پر افترا کی سزا یہی ہے۔ البتہ جو لوگ توبہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کر لیں گے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ غضب جس شکل میں ظاہر ہوا اس کی تفصیل سورۂ بقرہ آیت ۵۴ کے تحت ہم پیش کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے ہر قبیلہ کے مومنین مخلصین کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے ان مجرمین کو قتل کر دیں جو فتنہ میں شریک رہے ہیں، چنانچہ یہی ہوا۔ صرف وہ لوگ قتل سے بچے جنھوں نے توبہ کر لی۔ شرک کو اللہ پر افترا قرار دینے کی وجہ دوسری جگہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

یہاں توبہ کے ساتھ ایمان کی شرط مذکور ہے۔ 'ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا' اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن سے آدمی کا ایمان ہی سلب ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کا یہ گناہ انھی گناہوں میں سے تھا اس وجہ سے توبہ کے ساتھ تجدید ایمان کی شرط لگائی گئی۔ اگر گناہ کی نوعیت یہ نہ ہو تو توبہ کے ساتھ رویے کی اصلاح توبہ کو مکمل کر دیتی ہے۔

وَلَمَّا سَکَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚ وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ یَرْهَبُوْنَ (۱۵۴)

'سَکَتَ' کے بعد 'عن' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ 'ذال' یا اس کے کسی ہم معنی لفظ کے مفہوم پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب حضرت موسیٰ خاموش ہوئے اور ان کا غصہ دور ہوا۔

تورات کی ایک غلط روایت کی تردید

'اَخَذَ الْاَلْوَاحَ' انھوں نے وہ تختیاں، جو ایک طرف ڈال دی تھیں، پھر اٹھا لیں۔ اس سے ضمناً تورات کی اس غلط روایت کی تردید ہو گئی کہ تختیاں پھینکنے سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ یہ واضح رہے کہ ان تختیوں کو اس طرح ڈال دینے میں ان کی ناقدری کا کوئی پہلو نہیں تھا بلکہ بنی اسرائیل نے اس نعمت گراں مایہ کی جو ناقدری کی تھی اس پر اظہار غم و غصہ تھا کہ تمھارے رہنے تو تمھارے لیے یہ توقیع سیادت و امامت بھیجا اور تم ہو کہ تم نے اس طرح اپنی ناک کٹوائی۔

'وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًی وَّرَحْمَةٌ' 'نُسْخَة' کسی تحریر کی حرف حرف نقل کو بھی کہتے ہیں۔ اصل تورات چونکہ انھی الواح کی نقل تھی اس وجہ سے تورات کو ان کے نسخہ سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ اس میں ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈریں۔ یہ دوسرے لفظوں میں وہی بات ہے جو قرآن سے متعلق 'هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ہدایت و رحمت سے متعلق ہم دوسرے مقام میں عرض کر چکے ہیں کہ جب یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ آئیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت۔ دنیا کی زندگی میں یہ

رہنما ہوگی اور آخرت میں خدا کی رحمت کا وسیلہ۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَہٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْہُمُ الرَّجْفَۃُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَہْلَکْتَہُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِیَّایَ ؕ اَتُہْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَہَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ ہِیَ اِلَّا فِتْنَتُکَ ؕ تُضِلُّ بِہَا مَنْ تَشَآءُ وَتَہْدِیْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ ۝ وَاکْتُبْ لَنَا فِیْ ہٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ اِنَّا ہُدْنَآ اِلَیْکَ ؕ قَالَ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَکْتُبُہَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ہُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ (۱۵۵-۱۵۶)

کوہِ سینا پر حاضری توبہ کے لیے تھی

یہ حضرت موسیٰؑ کے دوبارہ کوہِ سینا پر جانے کا ذکر ہے جب وہ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد توبہ کے لیے گئے ہیں۔ تورات کے راویوں نے اس واقعہ کو پہلے واقعہ کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ اس وجہ سے بات گھپلا ہو کر رہ گئی ہے۔ قرآن نے ان دونوں واقعات کو الگ الگ بیان کیا ہے اس لیے کہ یہ واقعہ بجائے خود بنی اسرائیل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھنے والا واقعہ ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص وقت مقرر کیا اور حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب فرمائے تاکہ جس نوعیت کا اجتماعی جرم صادر ہوا ہے اسی نوعیت کی اجتماعی توبہ بھی ہو، نیز جو کچھ پیش آئے وہ قوم کے تمام ممتاز آدمیوں کے سامنے پیش آئے کہ وہ قوم کے سامنے اس کی گواہی دیں۔

'فَلَمَّآ اَخَذَتْہُمُ الرَّجْفَۃُ' اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنا جلال ظاہر فرمایا تاکہ بنی اسرائیل کے لیڈروں کو پھر یاددہانی ہو جائے کہ جس خداوند کے ساتھ ان کا معاملہ ہے اس کے جلال و جبروت کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے۔ تورات میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

> "جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے ...... اور کوہِ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا ..... اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا" خروج باب ۱۹ - ۱۸ - ۱۹

اگرچہ تورات میں یہ ذکر اس موقع کا ہے جب بنی اسرائیل کو مشہور احکام عشرہ دیے گئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہی صورتِ حال اس توبہ کے موقع پر بھی پیش آئی ہے جس کا ذکر قرآن نے 'اَخَذَتْہُمُ الرَّجْفَۃُ' سے کیا ہے۔

'قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَہْلَکْتَہُمْ' اب یہ حضرت موسیٰؑ کی گریہ و زاری اور ان کی دعا و فریاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ جلال تیرے غضب کا مظہر ہے اور تو نے ہمارے ہلاک کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے تو یہ کام اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی کر دیتا لیکن اب جب کہ تو نے ہمیں باریابی کا موقع عنایت فرمایا اور ہم یہاں حاضر ہو بھی گئے تو یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو ہمیں ہلاک کرے۔

'اَتُہْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَہَآءُ' مطلب یہ کہ یہ جو کچھ ہوا جماعت کے اندر کے نادانوں کی بدبختی سے ہوا اور یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو نادانوں کے کسی جرم کی پاداش میں سب کو ہلاک کر دے۔

'اِنْ ہِیَ اِلَّا فِتْنَتُکَ الایۃ' مطلب یہ کہ یہ تو تیری ایک آزمائش تھی اور تیری آزمائش سے عہدہ برا تو وہی

خدا کی آزمائش سے عہدہ برآ ہونا آسان بازی نہیں ہے

ہوتے ہیں جن کو تیری توفیق حاصل ہو۔ تو ہی جن کو توفیق بخشتا ہے تیرے امتحان میں کامیاب ہوتے اور ہدایت پاتے ہیں، اور جن کو اپنی توفیق سے محروم کر دیتا ہے وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں حضرت موسیٰؑ نے اسی سنت اللہ کا حوالہ دیا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کا ذکر بار بار قرآن میں ہو چکا ہے لیکن ساتھ ہی نہایت ہی ادب کے ساتھ اور نہایت ہی لطیف طریقہ پر اس میں معاملے کی نزاکت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ تیرے امتحانوں میں پورا اترنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ یہ تیرے فضل اور تیری توفیق بخشی ہی پر منحصر ہے۔ تو ہی ہمارا ولی اور کارساز ہے تو ہمیں بخش، ہم پر رحم فرما تو بہترین بخشنے والا ہے۔

'وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً الآية' اس دنیا میں بھی تو ہمارے لیے بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی بھلائی لکھ دے۔ آخرت کے ساتھ لفظ 'حَسَنَةً' کو حذف کر دیا اس لیے کہ مذکور محذوف پر خود دلیل ہے۔ لفظ 'هُدْنَا' پر دوسری جگہ ہم بحث کر چکے ہیں۔ اس کے معنی رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہود کے لیے ایک لطیف یاد دہانی بھی ہے کہ اگر ان میں کچھ حیا ہے تو اپنے نام کی لاج رکھیں۔

خدا کی رحمت اور نقمت کا ضابطہ

'قَالَ عَذَابِيْ أُصِيْبُ بِهٖ مَنْ أَشَاءُ الآية' حضرت موسیٰؑ کی دعا مطلق تھی اور قوم کے ساتھ ان کو جو محبت تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اسی تعمیم کے ساتھ قوم کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی دعا مانگیں۔ تورات میں بھی اس موقع کی دعا اسی تعمیم کے ساتھ مذکور ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اپنے عذاب و رحمت کا اصل ضابطہ بیان فرما دیا۔ فرمایا کہ جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں انہی پر نازل کرتا ہوں جن پر چاہتا ہوں۔ "جن پر چاہتا ہوں" کا مطلب بار بار ہم واضح کر چکے ہیں کہ خدا کا ہر چاہنا اس کی حکمت اور اس کے عدل کے تحت ہے اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں اپنا عذاب صرف ان پر نازل کرتا ہوں جو میرے قانون عدل کے تحت اس کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ رہی میری رحمت تو وہ اس دنیا میں تو ہر چیز کو عام ہے جس کو بھی وجود کی نعمت ملی ہے میرے ہی فضل سے ملی ہے، جس کو بھی رزق پہنچ رہا ہے میرے ہی خوان کرم سے پہنچ رہا ہے، امیر و غریب، شاہ و گدا اور کافر و مومن جس کے پاس بھی جو کچھ ہے سب میرا ہی عطا کردہ ہے لیکن وہ رحمت جو آخرت سے متعلق ہے اس کو میں ان لوگوں کے لیے خاص رکھوں گا جو اس دنیا کی زندگی میں مجھ سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ ادا کرتے رہیں گے اور خاص کر ان کے لیے جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔

ایک توجہ طلب ٹکڑا

'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ'، کا ٹکڑا یہاں خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ یوں نہیں فرمایا کہ 'يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا' بلکہ اسلوب بدل کر فرمایا 'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ' اسلوب کی اس تبدیلی سے مبتدا پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہے کہ خاص کر وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو لوگ قرآن کے نظائر پر نگاہ رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اس عہد و میثاق کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آئندہ آنے والے انبیا پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا اور جس کی وضاحت مائدہ کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ۱۲ - مائدہ	اور اللہ نے فرمایا میں تمھارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کا اہتمام قائم رکھو گے، زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی تائید کرو گے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے۔ اگر تم یہ کرو گے تو میں تمھارے گناہ تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ پس جو اس کے بعد تم میں سے کفر کرے گا تو وہ اصل شاہراہ سے بھٹک گیا۔

یہ عہد یوں تو ان تمام نبیوں اور رسولوں پر مشتمل تھا جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے لیکن اس میں خاص اشارہ اس نبی امی کی طرف تھا جس کی بعثت کی پیشین گوئی خود سیدنا موسیٰؑ نے، جیسا کہ بقرہ میں گزر چکا ہے، بڑی تصریح کے ساتھ فرمائی تھی۔ آل عمران میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۸۱ - آل عمران	اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے نبیوں کے باب میں میثاق لیا کہ ہم نے تم کو کتاب اور حکمت سے نوازا، پھر آئے گا تمھارے پاس ایک رسول تصدیق کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کی جو تمھارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ پوچھا کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس باب میں میری سونپی ہوئی ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اس پر گواہ رہو، میں بھی تمھارے ساتھ اس کے گواہوں میں سے ہوں۔

یہی عہد و میثاق ہے جس کی طرف وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ کے الفاظ میں اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰؑ کی درخواست کے جواب میں یہ تصریح فرما دی کہ میری ابدی اخروی رحمت کے سزاوار صرف وہ لوگ ٹھہریں گے جو میرے عہد شریعت پر قائم رہیں گے، آگے آنے والے نبیوں اور رسولوں کی تائید کریں گے اور ان میں سے جن کو میرے آخری رسول کی بعثت نصیب ہوگی وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے مددگار و خدمت گزار بنیں گے۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو قرآن نے بر سبیل تضمین و تفسیر وضاحت فرما دی کہ آج اس وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ کے مصداق کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ

وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْہِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۷)

ایک ابہام کی وضاحت

یعنی وہ لوگ جو اس نبی امی کی پیروی کریں جس کی پیشین گوئیاں خود ان کی اپنی کتابوں، تورات و انجیل میں موجود ہیں۔ نبی امی سے مراد ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رسول، نبی، امّی، یہ تینوں الفاظ یہاں آپ کی تعریف اور تعارف کے طور پر وارد ہوئے ہیں۔ نبی اور رسول کے فرق کی طرف مختلف مقامات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ رسول اپنی قوم کے لیے کامل حجت اور کامل عدالت کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے قوم پر اللہ کی حجت پوری کر دی جاتی ہے اس وجہ سے اگر وہ قوم ایمان نہیں لاتی تو لازماً تباہ کر دی جاتی ہے اور رسول اور اس کے ساتھیوں کو لازماً مخالفین پر غلبہ حاصل ہوتا ہے، عام اس سے کہ یہ نبی کی زندگی ہی میں ہو یا اس کی وفات کے بعد۔ نبی کے لیے ان خصوصیات کا حامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس پہلو سے ہر رسول نبی لازماً ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی اور رسول دونوں حیثیات کے جامع تھے۔

بنی اسمٰعیل کے لیے اُمیین کا لقب

لفظ 'امّی' پر ہم آل عمران کی آیت ۔ کے تحت بحث کر آئے ہیں۔ یہ لفظ بنی اسمٰعیل کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔ بنی اسمٰعیل چونکہ تعلیم و تعلم اور کتاب و شریعت سے ناآشنا لوگ تھے، اس پورے دور میں جو ان کے بزرگ خاندان حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد گزرا ان کے ہاں کسی نبی یا رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی جب کہ اسی دوران میں بنی اسرائیل کے اندر بے شمار نبی پیدا ہوئے جن میں سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ نبی اور رسول دونوں حیثیات کے جامع تھے اس وجہ سے بنی اسرائیل بنی اسمٰعیل کو اُمیینؔ کہتے تھے۔ اگرچہ بنی اسرائیل اس لفظ کو بنی اسمٰعیل کے صرف ایک وصف امتیازی ہی کو پیش نظر رکھ کر نہیں استعمال کرتے تھے بلکہ اپنے مقابل میں ان کی تحقیر کا پہلو بھی ان کے ذہن میں ہوتا تھا لیکن امیت و بدویت اور کتاب و شریعت سے بیگانگی چونکہ بطور ایک امر واقعہ کے ان کے اندر موجود تھی اس وجہ سے قرآن نے، جیسا کہ سورۂ جمعہ میں ہم واضح کریں گے، اس لفظ کو ان کے لیے بطور ایک امتیازی لقب کے استعمال کیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا اور صحابہؓ بھی اس کو بلا کسی احساس کہتری کے استعمال کرتے تھے گویا بنی اسرائیل کے بالمقابل ان کے لیے یہ ایک امتیازی لقب تھا۔

نبی امّی کی پیشینگوئیاں پچھلے صحیفوں میں

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات و انجیل کی جن پیشین گوئیوں کا حوالہ ہے ان میں سے بعض کا، جو موجودہ تورات و انجیل میں بھی موجود ہیں، ذکر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ محض بطور یاد دہانی ان کا حوالہ یہاں ہم پھر دیے دیتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کتاب، بنی اسمٰعیل کے اندر ایک صاحب رسالت نبی کی بعثت سے پہلے سے واقف تھے اور اس کا چرچا ان کے ہاں برابر قائم رہا ہے۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا

کرے گا، تم اس کی سُننا ..... اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں ۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ استثنا ۱۸ ۔ ۱۵ ۔ ۱۹

اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰؑ ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آنے والا نبی بنی اسمٰعیل یعنی امیوں میں پیدا ہوگا اس لیے کہ اس سیاق میں 'تیرے بھائیوں میں سے' یا 'انہی کے بھائیوں میں سے' کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا ۔ یہ حضرت موسیٰؑ کی زبان مبارک سے گویا اسی بشارت کا اعادہ تھا جو سیدنا ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ایک رسول کی بعثت کی دی تھی تفصیلات اس کی بقرہ میں گزر چکی ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہُوا کہ وہ صرف نبی نہیں ہوگا بلکہ رسول بھی ہوگا اس لیے کہ 'میری مانند' اور 'تیری مانند' سے مراد حضرت موسیٰؑ کے مانند ہے اور حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی اور فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح اپنی قوم قریش اور اہل عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔

'خدا سینا سے آیا، اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔' استثنا ۳۳ ۔ ۲

آتشی شریعت سے میرے نزدیک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا مسیحؑ نے ظاہر فرمائی ہے کہ اس کے ہاتھ میں اس کا چھاج ہوگا، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا، دانے کو بھُس سے الگ کرے گا، پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھُس کو جلا دے گا۔ یہ ٹھیک ٹھیک رسول کی وہ خصوصیت بیان ہوئی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ وہ اپنی قوم کے لیے عدالت بن کر آتا ہے اور حق و باطل کے درمیان اس کے ذریعے سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔

یسعیاہ نبی کی پیشینگوئی ان الفاظ میں مذکور ہے ۔

'دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا، بڑا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے ۔ میں نے اپنی روح اس پر رکھی، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا، اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا۔' یسعیاہ ۴۲ ۔ ۱ ۔ ۴

سیدنا مسیحؑ کی پیشنگوئی ملاحظہ ہو۔

یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہُوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے ۔ اس لیے میں

تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا" متی باب ۲۱ ۴۲-۴۴

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے" یوحنا باب ۱۴۔ ۱۷

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں" یوحنا باب ۱۴ ۳۱

ان پیشینگوئیوں پر غور کیجیے۔ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر ان پیشینگوئیوں کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ آخر وہ پتھر کون ہو سکتا ہے جس کو معماروں نے تو رد کر دیا تھا لیکن بالآخر وہی کونے کے سرے کا پتھر بن گیا؟ یہ کس کی شان ہے کہ جو اس پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا اور وہ باتیں بتائے گا جو حضرت مسیح بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ضد اور مکابرت کی بات اور ہے لیکن جو شخص بھی ان پیشینگوئیوں پر انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر راست آ سکتی ہیں تو صرف نبی امی اور رسول خاتم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی راست آ سکتی ہیں۔ نبی امی کے سوا اور کوئی ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت صلعم کا تعارف

'یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ الاٰیۃ'۔ ان باتوں کا حوالہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور تعارف ہی کے طور پر دیا گیا ہے۔ یہود نے اپنے اوپر بہت سی خود ساختہ پابندیاں بھی لاد رکھی تھیں اور بعض پابندیاں ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر عاید کر دی گئی تھیں۔ ان ساری چیزوں کے دور ہونے کا انحصار آخری رسول کی بعثت پر تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے ان کی یہ ساری زنجیریں کاٹ دیں لیکن انھوں نے اپنی شامتِ اعمال کے سبب سے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ اس مسئلہ پر آل عمران آیت ۹۳ - مائدہ آیت ۵ کے تحت بھی ہم لکھ چکے ہیں اور سورہ انعام کی تفسیر میں بھی اس پر وضاحت سے بحث ہوئی ہے اس وجہ سے یہاں اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

اہل کتاب کی نجات کا انحصار نبی امی پر ایمان لانے پر ہے

'فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ الاٰیۃ' یہ اہل کتاب کو دعوت ایمان ہے کہ جو لوگ اس رسول کے باب میں سابق پیشینگوئیوں کے امین ہیں اور جن کو اس کی بعثت سے یہ سعادت حاصل ہونے والی ہے کہ تمام غیر فطری بندشوں اور پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے سب سے پہلے انہی کا حق ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں، لوگوں میں اس کا تعارف کرائیں، مخالفوں کے مقابل میں اس کی حمایت کریں اور اس روشنی یعنی قرآن کی پیروی کریں جو اللہ

کی طرف سے دے کر وہ بھیجا گیا۔ فرمایا کہ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پانے والے بنیں گے باقی سب محروم و نامراد ہوں گے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۵۸)

آنحضرتؐ کی بعثت تمام عالم کے لیے ہوئی

جب بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر تک پہنچ گئی تو برسرِ موقع آپ کی زبان مبارک سے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت بھی دلوا دی گئی کہ اے لوگو، میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ "سب لوگوں کی طرف" یعنی بنی اسمٰعیل و بنی اسرائیل، عرب اور غیر عرب سب کی طرف۔ اوپر کی پیشینگوئیوں میں بھی تصریح ہے کہ اگرچہ آپ کی بعثت بنی اسمٰعیل میں ہوگی لیکن آپ کی رسالت سب کی طرف ہوگی اور دنیا کی سب قومیں آپ کی برکات میں سے حصہ پائیں گی۔ اہل عرب پر، عام اس سے کہ وہ بنی اسمٰعیل ہوں یا بنی اسرائیل، آپ نے اللہ کی حجت براہِ راست قائم کی اور وقت کے ملوک و سلاطین کو بھی آپ نے دعوت دی اور آپ کے بعد اس دعوت و شہادت کی ذمہ داری قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت پر ڈالی جس کو 'شُہَدَاءُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ' کے منصب عالی پر سرفراز فرمایا۔

'اَلَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' یعنی آسمان و زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے جس کا میں رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اسی کے اختیار میں تو لوگوں کا عزل و نصب ہے تو کسی بے جا عصبیت، کسی غلط اعتماد اور کسی بے بنیاد غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اللہ اور اس کے نبی اُمّی رسول پر جس کی پیشینگوئیاں تمہاری اپنی کتابوں میں موجود ہیں ایمان لانے سے گریز نہ اختیار کرو۔

'اَلَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے جو اوپر حضرت موسیٰؑ کی پیشینگوئی میں مذکور ہوئی ہے کہ 'میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہ وہی لوگوں سے کہے گا'، مطلب یہ ہوا کہ نبی کے اس دعوائے نبوت اور اس کی اس دعوت کو کسی وہم، کسی خیال اور دوسروں پر برتری اور سیادت حاصل کرنے کی کسی خواہش پر مبنی نہ سمجھو۔ یہ تو وہی کچھ تمھیں سنایا جا رہا ہے جو اللہ کی طرف سے آ رہا ہے۔ پیغمبر خود اللہ پر اور اس کی ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اسی ایمان کی دعوت تمھیں دے رہا ہے۔ یہ اس کی اپنی کوئی ایجاد نہیں ہے۔ دوسرے اس میں وہ دھمکی بھی مضمر ہے جو اوپر والی پیشینگوئی میں مذکور ہے کہ چونکہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی چیز ہے اس وجہ سے اس میں پیغمبر کی طرف سے کسی کمی بیشی، کسی حذف و اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر پیغمبر نے اس کی تبلیغ میں کوئی مداہنت برتی تو خدا اس سے اس کا مواخذہ فرمائے گا اور اگر لوگوں نے اس سارے اہتمام کے باوجود اس کا حق نہ پہچانا تو ان سے مواخذہ ہوگا۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۱۵۹)

صالحین اہل کتاب کی حوصلہ افزائی

ہم پیچھے ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ قرآن نے جہاں جہاں بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں اور بداعمالیوں پر شدت کے ساتھ سرزنش کی ہے وہاں ان کے اندر کے اس گروہ قلیل کی تحسین بھی فرمائی ہے جو حق و عدل پر قائم رہا ہے اور جس کی بدولت بنی اسرائیل کو ان کے جرائم کے باوجود مہلت ملتی رہی ہے۔ یہاں بھی اسی گروہ کی طرف اشارہ ہے اور لفظ 'اُمَّۃٌ' کی تنکیر اس کی قلت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ 'یَھْدُوْنَ' اور 'یَعْدِلُوْنَ' مضارع کے صیغے استمرار کو ظاہر کر رہے ہیں اس لیے کہ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں فعل ناقص محذوف ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جہاں موسیٰ کی قوم میں اس طرح کے ناب کار و ناہنجار پیدا ہوتے ہیں، جن کا ذکر اوپر گزرا، وہیں ان کے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی برابر رہا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور عدل کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے رہے ہیں۔ یعنی علما اور قضاۃ دونوں ہی گروہوں میں اچھے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح کا ایک گروہ، قلیل تعداد میں سہی، ان آیات کے نزول کے زمانے میں بھی موجود تھا اور یہی لوگ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ ان کے یہاں ذکر سے مقصود ان کی حوصلہ افزائی ہے اور اس میں اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ پیغمبرؐ نے یہ اہل کتاب کو جو دعوت دی ہے وہ اس طرح کے صالحین پر اثر انداز ہوگی اور وہ نبی امی پر ایمان لائیں گے۔

اس آیت پر وہ تضمین بالتخلیص جو اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ سے شروع ہوئی تھی ختم ہوئی اور آگے سلسلۂ کلام پھر بنی اسرائیل کی اسی سرگزشت سے جڑ گیا جو بیان ہو رہی تھی۔

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝ وَاِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِیْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ (۱۶۰-۱۶۲)

ناشکری کے باوجود بنی اسرائیل پر احسان

معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ یہ آیتیں بقرہ میں بھی گزر چکی ہیں۔ وہاں پوری تفصیل سے ان کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ۶۰، ۵۷، ۵۸ بقرہ۔ لفظ 'اَسْبَاط' پر بھی بقرہ کی آیت ۱۳۶ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔ لفظ 'تقطیع' یہاں اچھے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایک ہی باپ کی اولاد بارہ خاندانوں کی شکل میں پھلی پھولی، اور ہم نے ہر خاندان کو امتوں اور قوموں کی شکل میں بڑھایا اور پھیلایا اور اسی اعتبار سے ان کو اپنی نعمتوں اور رحمتوں سے بھی نوازا لیکن انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری کی۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ یَعْدُوْنَ فِی السَّبْتِ اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ

يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَىِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ (۱۶۳-۱۶۶)

'وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الاية' جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کا ذکر بقرہ آیات ۶۵-۶۶ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ان چیزوں پر روشنی ڈالیں گے جو وہاں بیان نہیں ہوئی ہیں۔

بنی اسرائیل کو ان کی پچھلی کارستانیوں کی یاددہانی

'وَسْئَلْهُمْ' کا اسلوب زجر و توبیخ کو ظاہر کر رہا ہے۔ 'هُم' سے مراد یہود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی ان تمام کرتوتوں کے باوجود جو بیان ہوئیں اپنی پاکی و برتری کے زعم سے باز نہیں آتے اور اپنے آپ کو خدا کا چہیتا اور لاڈلا بنائے بیٹھے ہیں تو ذرا ان سے اس قریہ کا ماجرا پوچھو جس نے سبت کی بے حرمتی کی اور اس کی سزا میں خدا نے اس کو نمونۂ عبرت بنا دیا۔ قرآن نے اس قریہ کی اس سے زیادہ تصریح نہیں فرمائی کہ یہ سمندر کے کنارے تھا۔ تورات میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن قرآن کا انداز بیان ظاہر کرتا ہے کہ زمانۂ نزول قرآن کے یہود اپنی تاریخ کی ایک مشہور روایت کی حیثیت سے اس کو جانتے تھے۔ چنانچہ بقرہ میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے 'وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ' (اور ان کو تو تم جانتے ہی ہو جنھوں نے تم میں سے سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی سے تجاوز کیا) ظاہر ہے کہ یہود کے روبرو اس اسلوب میں وہی بات کہی جا سکتی ہے جو ان کے درمیان شہرت رکھتی ہو ورنہ وہ قرآن کے اس بیان کی ضرور تردید کرتے۔ بعض لوگوں نے اس کو ایلہ اور عقبہ کے پاس کا کوئی شہر بتایا ہے۔ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ سمندروں کے کنارے کے شہر، اگر جائے وقوع مناسب ہو تو تجارتی مرکز بن جاتے ہیں اور بہت ترقی کر جاتے ہیں۔ عقبہ کے علاقے کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں قدیم زمانے سے شہرہ حاصل ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے بحری بیڑے کا مرکز بھی یہی تھا۔ لفظ 'قریۃ' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ صرف چھوٹی بستیوں ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ اس کا اطلاق بڑی بڑی مرکزی آبادیوں پر بھی ہوتا ہے۔

لفظ شُرَّع کی تحقیق اور مچھلیوں کے ابھرنے کی نوعیت اور حکمت

'اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا'، شُرَّع، 'شَارِعَة' کی جمع ہے۔ جب یہ لفظ نیزوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد سیدھے اٹھائے ہوئے نیزے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لیے آیا ہے تو اس سے منہ اٹھائے ہوئے مچھلیاں مراد ہیں۔ پلی ہوئی مچھلیوں کے تالاب کے کنارے ان کے ابھرنے کے اوقات میں کھڑے ہو جائیے تو یہ دلکش منظر نظر آئے گا کہ مچھلیاں اپنے سر سطح پر اس طرح ابھارے ہوئے نظر آئیں گی گویا وہ اپنے نیزے سیدھے کیے ہوئے ہیں۔ سمندروں کے کنارے جو شکارگاہیں ہوتی ہیں ان میں یہ منظر او

بھی دلفریب اور طمع انگیز ہوتا ہوگا۔ یہود کی شریعت میں سبت یعنی ہفتہ کے دن کام کاج اور بیرونی شکار وغیرہ کی ممانعت تھی لیکن وہ صبر نہ کر سکے۔ انھوں نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار کے لیے مختلف قسم کے حیلے ایجاد کر لیے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نافرمانی میں اصرار کے حد تک بڑھ جاتی ہے اور اچھوں کے سمجھانے سے بھی باز نہیں آتی تو اس معاملے میں اس کی آزمائش سخت سے سخت تر ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی صورتِ حال بنی اسرائیل کے لیے پیدا کر دی۔ عام دنوں میں تو یہ مچھلیاں نظر نہ آتیں یا بہت ہی کم نظر آتیں لیکن سبت کے دن معلوم ہوتا کہ ان کے ہاں بارات اتری ہوئی ہے۔ یہ چیز ان کی حرص کو اور بھڑکا دیتی۔ مشہور ہے کہ آدمی جس چیز سے روک دیا جائے اس کی خواہش اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور خواہش وہ بلا ہے کہ اس کے اثر سے بسا اوقات آدمی کی نگاہ بھی بدل جاتی ہے۔ خواہش نہ ہونے کی صورت میں جو چیز چھٹانک بھر نظر آتی ہے، خواہش کے غلبہ کی حالت میں وہی سیر بھر نظر آنے لگتی ہے۔ مشہور ہے کہ حُسن کا اندازہ کرنے میں حسن سے زیادہ حسنِ نظر کو دخل ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل اپنی شامتِ اعمال سے اس ذہنی غلطی میں مبتلا ہو گئے اور پھر اس حد تک خراب ہوئے کہ نیکوں کی تلقین و موعظت تو درکنار خدا کے عذاب سے بھی ان کو تنبیہ نہیں ہوئی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی۔

بنی اسرائیل اور امت مسلمہ کے امتحان میں مشابہت

سورۂ مائدہ آیت ۹۴ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ جس طرح بنی اسرائیل کو سبت کے دن شکار کی ممانعت تھی اسی طرح ہمارے لیے حالتِ احرام میں خشکی کے شکار کی ممانعت ہوئی اور ہم کو بھی اس طرح کی آزمائش سے بچتے رہنے کی تاکید کی گئی جس میں بنی اسرائیل مبتلا ہو کر اپنے کو تباہ کر بیٹھے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّکُمُ اللّٰہُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُہٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّخَافُہٗ بِالْغَیْبِ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۹۴ (مائدہ) (اے ایمان والو، اللہ تمھیں کسی ایسے شکار سے آزمائے گا کہ تم خیال کرو گے کہ تمھارے ہاتھ اور نیزے ان کو پا لیں گے تاکہ اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے جو اس سے غیب میں ڈرتے ہیں۔ و جو اس کے بعد حدود سے تجاوز کریں گے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے)۔ تَاْتِیْھِمْ حِیْتَانُھُمْ یَوْمَ سَبْتِھِمْ شُرَّعًا اور تَنَالُہٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ کے الفاظ پر ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر غور کیجیے تو دونوں کی مشابہت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

حقِ نصیحت آخری دم تک

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّۃٌ مِّنْھُمْ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے تفاوت کی یہ راہ سمجھانے بجھانے والوں کے علی الرغم اختیار کی۔ یہ نہیں تھا کہ ان کو کوئی آگاہ کرنے والا نہیں تھا، اللہ کے ایسے بندے وہاں تھے جنھوں نے ان کو نہ صرف اس جرم سے روکنے کی کوشش کی بلکہ اس حد تک کوشش کی کہ ان کے اپنے ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے اب مزید سمجھانے کو بالکل غیر مفید سمجھا اور یہ کہا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا حاصل جو اب یا تو ہلاک ہونے والے ہیں یا کم از کم یہ کہ کسی شدید عذاب کی پکڑ میں آنے والے ہیں۔ لیکن اللہ کے ان بندوں نے اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو یہ جواب دیا کہ ہمارا سمجھانے

کا کام جاری رہنا چاہیے، اگر یہ لوگ نہ مانے تو ہم اللہ کے ہاں اپنے فرض سے سبکدوش ٹھہریں گے اور کیا عجب کہ مان ہی جائیں، سو اگر مان گئے تو یہی مطلوب ہے۔

نہی عن المنکر کے بارے میں ذمہ داری کی حد

اس سے اس ذمہ داری کی حد معین ہوتی ہے جو ہر مومن پر دوسروں کو برائی سے روکنے اور بھلائی کی دعوت دینے کی عاید ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں کوئی مرحلہ ایسا نہیں آتا جب داعی اور ناصح یہ فرض کر لیں کہ اب دعوت و نصیحت کا فرض ادا ہو گیا اس لیے نہ ماننے والوں کو عذاب الٰہی کے لیے چھوڑ دینا چاہیے بلکہ یہ کام زندگی کے آخری لمحے تک کرتے رہنا چاہیے اگرچہ ایک شخص بھی نصیحت کا قدر کرنے والا نہ نکلے۔ عنداللہ ایسے ہی لوگ اپنے فرض سے سبکدوش قرار پائیں گے۔ وہ لوگ اللہ کے ہاں بری نہیں ہوں گے جو خود اگرچہ برائی میں مبتلا نہ ہوں لیکن دوسروں کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہو کر زندگی گزاریں۔ اس مضمون پر مفصل بحث انفال آیت ۲۵ کے تحت آئے گی۔

خدا کی پکڑ سے صرف حق نصیحت ادا کرنے والے ہی بچتے ہیں

'فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُکِّرُوۡا بِہٖۤ اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ' یعنی جب وہ تنبیہات جو انھیں کی گئی تھیں وہ بھلا بیٹھے اور کسی طرح سوچنے سمجھنے پر راضی نہ ہوئے تو اللہ نے ان کی اس نافرمانی و عہد شکنی کی پاداش میں ان پر ایک سخت عذاب بھیجا جس سے صرف وہ لوگ محفوظ رہے جو لوگوں کو برائی سے روکنے والے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی اجتماعی نافرمانیوں پر جب اللہ کا کوئی فیصلہ کن عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی پکڑ سے صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو برائی سے روکنے والے ہوتے ہیں۔

لعنت بدترین عذاب ہے

'فَلَمَّا عَتَوۡا عَنۡ مَّا نُہُوۡا عَنۡہُ' الآیۃ یہ اس لعنت کا ذکر ہے جو ان نافرمانوں پر ہوئی اور جس کا ذکر بقرہ ۶۵ اور مائدہ ۶۰ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔ کسی قوم پر اللہ کی لعنت اس عذاب سے بھی سخت تر چیز ہے جو کسی قوم کو فنا کر دیتا ہے اس لیے کہ لعنت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم بظاہر زندہ رہتی ہے لیکن اس کی زندگی صرف ذلت و خواری کی ایک داستانِ عبرت ہوتی ہے۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ اس بستی پر اللہ کی ایسی لعنت ہوئی کہ وہ دیکھنے والوں کے لیے ایک نمونۂ عبرت بن کر رہ گئی۔

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبۡعَثَنَّ عَلَیۡہِمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ یَّسُوۡمُہُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّکَ لَسَرِیۡعُ الۡعِقَابِ ۚۖ وَاِنَّہٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (۱۶۷)

یہود پر ابدی لعنت ہے

'تاذن' کا صحیح مفہوم کسی فیصلۂ قطعی سے لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کی اس طرح کی بد عہدیوں کی بنا پر ان کو ان کے نبیوں کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر ایسے لوگوں کو قیامت تک مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت سخت عذابوں میں مبتلا کرتے رہیں گے۔ اس طرح کی تنبیہ ان کو حضرت موسیٰ نے بار بار فرمائی اور بعد کے نبیوں نے بھی نہایت آشکارا الفاظ میں اس سے آگاہ کیا۔ احبار میں ہے۔

"اگر تم میرے سننے والے نہ ہو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو ...... اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ایسا ہی کروں گا ...... اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہو گا اور تم دشمنوں کے سامنے قتل کیے جاؤ گے اور

جو تمہارا کینہ رکھتے ہیں تم پر حکومت کریں گے" احبار باب ۲۶ ۱۴-۱۷۔ اسی طرح کتاب استثنا میں ہے "تیرے بیٹے اور عزیز بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی اور تیری آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہ ہوگا۔ استثنا باب ۲۸-۳۲۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی عملی تصدیق تاریخ کے صفحات میں مرقوم ہے۔ اس کے لیے بخت نصر اور ٹیٹس سے لے کر جرمنی کے ہٹلر تک کی تاریخ پڑھ جائیے۔ ہر دور میں آپ کو اس قوم کی ذلت و بربادی کی نہایت لرزہ خیز داستان مل جائے گی۔ یہ ملحوظ رہے کہ بیچ بیچ میں مہلت کا کوئی وقفہ مل جانے سے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی نفی نہیں ہوتی ہے۔ قرآن کا اسلوب بیان خود شاہد ہے کہ ان کو وقفے بھی ملتے رہیں گے لیکن ہر وقفہ ان کے لیے کسی تازہ مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ آج ارض مقدس میں ان کا جو اجتماع ہو رہا ہے یہ آشیاں بندی بھی ایک نئے طوفان کی دعوت ہے جس کے بعد ان کی پوری مجتمع قوت ان شاء اللہ یک قلم ختم ہو جائے گی۔ یہاں اشارہ پر کفایت کیجیے۔ اس کی وضاحت سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں آئے گی۔

'اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ' میں اس فیصلہ الٰہی کی حقیقت صفات الٰہی کے آئینہ میں دکھائی گئی ہے کہ کوئی خدا کو اس دنیا کے معاملات سے بے تعلق یا الگ تھلگ نہ خیال کرے۔ جو لوگ اس کی راہ سے بے راہ ہوتے ہیں ان کو وہ سزا بھی بڑی ہی سخت دیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لیے وہ بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔ 'عقاب' کے ساتھ 'سریع' کی صفت ان لوگوں کی بلادت پر ضرب لگانے کے لیے ہے جو خدا کی دیر کو اندھیر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی اس کی بخشی ہوئی مہلت سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ وہ جب پکڑتا ہے تو آناً فاناً پکڑتا ہے اور جن کو پکڑتا ہے وہ بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہ صبح کی شام بھی نہیں ہونے پائی کہ دھر لیے گئے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۱۶۸)

بنی اسرائیل کا انتشار

'وَقَطَّعْنٰهُمْ' اوپر آیت ۱۶۰ میں بھی گزر چکا ہے، وہاں جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا اچھے مفہوم میں ہے۔ یہاں یہ لفظ اس کے برعکس ان کی پراگندگی اور انتشار کے دور کے حالات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کی جو تنظیم کی وہ اپنے پورے شباب پر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دور میں پہنچی۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد اس تنظیم میں ضعف پیدا ہونا شروع ہوا اور پھر بتدریج حالات ایسے خراب ہوتے گئے کہ یہود اپنے مرکز میں بھی محکوم ہو گئے۔ یہاں تک کہ گروہ گروہ ہو کر دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ اگرچہ انفرادی حیثیت سے ان میں نیک بھی تھے اور بد بھی لیکن اجتماعی حیثیت سے وہ ان اوصاف سے محروم ہو چکے تھے جو ایک ملت کی حیثیت سے ان کو دنیا میں سربلند رکھنے کے لیے ضروری تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان کو اچھے اور برے ہر طرح کے حالات سے آزمایا تاکہ وہ اپنے رب کی

طرف رجوع کریں لیکن ان کی خواہشیں اس طرح ان پر غالب آگئی تھیں کہ ان کے آگے ان کی قوت ارادی بالکل مسلوب ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ یہ احساس رکھتے ہوئے بھی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں غلط ہے وہی کام کیے جاتے اور اپنے ضمیر کو یہ دھوکا دیتے کہ ہم خدا کے چہیتوں اور محبوبوں کی اولاد ہیں، خدا ہمیں معاف ہی کر دے گا۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۶۹)

روز افزوں زوال

عربی میں جب لفظ 'خلف' سکون لام کے ساتھ آتا ہے تو بُرے جانشینوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہ یہود کے تدریجی زوال کی طرف اشارہ ہے کہ دن بدن ان کے اخلاقی حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے یہاں تک کہ ایسے بُرے لوگ کتاب (تورات) کے وارث ہوئے جو ایک طرف کتاب الٰہی کے وارث ہونے کے مدعی ہیں دوسری طرف پست ہمتی اور دناءت کا یہ عالم ہے کہ جو لقمۂ حرام بھی ملتا نظر آئے اس کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ کتاب الٰہی کے نام لیوا ہونے کے سبب سے اگر ضمیر میں کوئی خلش پیدا ہوتی بھی ہے تو ان جھوٹی آرزوؤں سے اس کو بہلا لیتے ہیں جو انھوں نے بالکل بے دلیل و سند اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں کہ ہم برگزیدہ امت ہیں، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب جیسے نبیوں کی اولاد ہیں، دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہے، اپنے محبوب بندوں کے صدقے میں اللہ ہمیں معاف ہی کر دے گا۔ اس طرح انھوں نے اپنے ضمیر اور ایمان کو اس طرح کند بنا دیا ہے کہ ایک حرام کے بعد اگر اسی طرح کی حرام خوری کا کوئی اور موقع نکل آئے تو اس پر بھی پھسل پڑتے ہیں۔ ان کی اسی دناءت کی وجہ سے آگے چل کر ان کی مثال کتے سے دی ہے جو ہر وقت اپنی زبان نکالے رکھتا ہے خواہ اسے چمکاریے یا جھڑکیے۔

سارا پڑھا لکھا برباد

'اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ الاٰية' یعنی کتاب کے باب میں تو، جیسا کہ آیت ۴۵ میں گزرا اور تورات میں بھی بار بار ذکر ہوا ہے، ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جو ہدایات اس کتاب میں دی جا رہی ہیں ان کو مضبوطی سے پکڑیں، بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہ ہوں، کوئی بات حق کے خلاف خدا پر نہ لگائیں، تو پھر انھوں نے حرام خوری اور حرام کاری کی یہ راہ کس طرح کھول لی اور اس کے حق میں شریعت کی سند کہاں سے فراہم کر دی؟

'وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ' یعنی انھوں نے اچھی طرح اس کتاب کو پڑھا بھی ہے، یہ نہیں کہ اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ 'درس' کے لفظ پر ہم انعام آیت ۱۰۵ کے تحت بحث کر آئے ہیں کہ اس کے اصل معنی گھسنے کے ہیں جب کتاب بار بار پڑھی جائے، اور وہ بھی انگلی رکھ کے تو ورق گھس جایا کرتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی اچھی طرح پڑھنے کے آنے لگے۔ یہاں یہ لفظ یہود کے لیے بطور تعریض استعمال ہوا ہے کہ کتاب کو تو پڑھتے پڑھتے انھوں نے گھس ڈالا لیکن حال وہی رہا کہ ساری زلیخا پڑھ جانے کے بعد بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ زلیخا زن بود کہ مرد۔ 'وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ' یعنی یہ سگانِ دنیا جو کتاب و شریعت سب کو بالائے طاق رکھ کے

اس طرح دنیا کے پیچھے پڑ گئے، انھیں آخرت کی نعمتوں اور کامرانیوں کا کوئی اندازہ نہیں، حالانکہ چاہنے کی اصل چیز وہی ہے لیکن ان بے وقوف لوگوں میں وہ عقل کہاں؟

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (۱۷۰)

مصلحین اہل کتاب کی حوصلہ افزائی

'تَمَسُّك' اور 'تَمْسِيك' دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنا یا تھامنا۔

آیت کا مطلب اوپر کی آیت کی روشنی میں یہ ہے کہ یہ بدقسمت لوگ تو اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چل کھڑے ہوئے حالانکہ جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں وہ لوگ خلق کی اصلاح کرنے والے بنتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ اقامت نماز، یہاں تمسک بالکتاب کی علامت کی حیثیت سے بھی مذکور ہے اور یہ چیز درحقیقت ہر عہد الٰہی کی جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں، محافظ بھی ہے۔ آیت میں بقاعدۂ ایجاز ایک ٹکڑا محذوف ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے "اور جو کتاب کو مضبوطی سے تھامتے ہیں اور جنھوں نے نماز کا اہتمام کیا وہی لوگ اصلاح کرنے والے ہیں اور بے شک ہم اصلاح کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے"۔ میرے نزدیک اس آیت میں اہل کتاب کے اس قلیل التعداد گروہ کی حوصلہ افزائی بھی ہے جو قوم کے عام بگاڑ کے باوجود حق پر قائم رہا اور جو بالآخر مشرف باسلام ہوا۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۱)

اس آیت کی تفسیر بقرہ آیت ۶۳ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہ اس میثاق کی طرف اشارہ ہے جو یہود سے دامن کوہ میں کتاب پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لیے لیا گیا تھا اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال و جبروت کا بھی ان کو مشاہدہ کرایا تھا تاکہ وہ یاد رکھیں کہ جس خدا سے وہ عہد کر رہے ہیں وہ بے پناہ قوت و قدرت والا ہے لیکن انھوں نے اپنی خواہشات کے پیچھے ہر چیز کو بھلا دیا۔

۱۶- آگے کا مضمون ——— آیات ۱۷۲-۲۰۶

آگے کا مضمون خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم تمہید میں عرض کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں مخاطب اصلاً قریش ہیں۔ ان کو پہلے خود ان کے اپنے ملک کی ان قوموں کے حالات سنائے گئے جو ماضی میں گزر چکی تھیں پھر بنی اسرائیل کی بھی پوری تاریخ تفصیل سے سنا دی گئی جو سامنے موجود تھے۔ مقصود ان قوموں کی تاریخ سنانے سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اپنی اس دنیا کے احوال و معاملات سے بے تعلق اور کنارہ کش نہیں ہے۔ وہ خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے ہمیشہ اپنے رسول بھیجتا رہا ہے اور وہ رسول جب بھی آئے ہیں عزل و نصب کی میزان بن کر آئے ہیں۔ جن قوموں نے ان کی تکذیب

کی خدا نے ان کو مٹا دیا اور جن لوگوں نے ان کی تصدیق کی وہ برومند ہوئے۔ یہی فیصلہ کن مرحلہ اب قریش کے سامنے ہے۔

آیت ۱۰۱ پر تاریخی سرگزشتوں کا یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اب آگے قریش کو مخاطب کر کے پہلے ان کو اس عہد فطرت کی یاددہانی کی ہے جو تمام بنی آدمؑ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید و ربوبیت کا لیا ہے اور اس کو بنیاد قرار دے کر ان پر حجت قائم کی ہے کہ کل کو خدا کے حضور میں تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ تم اس چیز سے بے خبر تھے۔ اس کے لیے خدا نے تم سے عہد بھی لیا ہے اور اب اس کی یاددہانی کے لیے اپنا رسول بھی تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ اہل عرب کتاب و شریعت سے ناآشنا امی تھے اس وجہ سے ان سے بحث کی بنیاد یا تو ان کی جانی پہچانی ہوئی تاریخ پر قائم ہو سکتی تھی یا پھر فطرت اور عقل کی بدیہیات پر۔ چنانچہ پہلے ان کے سامنے تاریخ کے واقعات صحیح زاویے سے پیش کیے، پھر عہد فطرت کی اساس پر آگے گفتگو بڑھائی۔

عہدِ فطرت کی یاددہانی کے بعد ان کے سامنے بنی اسرائیل کی تمثیل پیش کی ہے کہ تم اس قوم کی طرح خدا کی نعمت کے ناقدرے اور ناشکرے نہ بنو۔ اللہ نے اس قوم پر بڑا احسان کیا لیکن یہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نہایت بیزر قوم نکلی۔ اللہ نے اس کو ہمیشہ بلند کرنا چاہا لیکن یہ برابر پستی ہی کی طرف جھکی رہی۔ جس طرح کتے کو پیار کرو تو زبان نکالے رہتا ہے، جھڑکو تو زبان نکالے رہتا ہے اسی طرح ان کے لیے تنبیہ اور احسان دونوں یکساں ہیں۔

اس کے بعد آنکھ کان اور دل و دماغ کی نعمتوں کی قدر کرنے اور ان سے صحیح کام لینے کی دعوت دی کہ دین کے معاملے میں لکیر کے فقیر بن کر نہ چلو کہ جن کو باپ دادا پوجتے آئے بے سمجھے بوجھے تم بھی انہی کو پوجتے رہو۔ یاد رکھو کہ جو لوگ اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں اور اپنے سمع و بصر کی قوتوں سے کام نہ لیں گے اور تذکیر و تنبیہ کے باوجود ڈھور بن کر کھاتے پھریں گے اللہ ان سب کو جہنم میں جھونک دے گا۔

اس کے بعد پیغمبرؐ کی طرف توجہ دلائی کہ جو شخص آج تمھیں آنے والے عظیم خطرے سے آگاہ کر رہا ہے یہ کوئی دیوانہ یا خبطی نہیں ہے۔ نظامِ کائنات پر غور کرو گے تو خود تمہاری عقل گواہی دے گی کہ یہ دنیا کوئی کھیل تماشا نہیں ہے۔ اس کے پیچھے عظیم حکمت و غایت ہے اس وجہ سے کچھ عجب نہیں کہ تمہارے اس فیصلہ کا وقت قریب آ لگا ہو جس سے یہ پیغمبرؐ تمھیں ہوشیار کر رہا ہے۔ اس امر سے اس حقیقت کے ایک اٹل حقیقت ہونے میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا کہ پیغمبرؐ تمھیں اس کا معین وقت نہیں بتا سکتا۔ پیغمبر کوئی غیب دان نہیں ہوتا، وہ صرف ایک بشیر و نذیر ہوتا ہے۔

اس کے بعد انسان کی اس بدقسمتی پر اظہارِ افسوس ہے کہ وہ نعمتیں تو سب خدا سے پاتا ہے لیکن گن دوسروں کے گاتا ہے اور ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بناتا ہے جو نہ تو اس کو نفع پہنچا سکتی ہیں نہ کوئی ضرر۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفوں کی بے ہودہ بکواسوں اور ان کے لایعنی اعتراضات پر صبر و استقامت کی تلقین فرمائی اور اس صبر کے حصول کے لیے جو چیز واسطہ اور وسیلہ ہے اس کی طرف رہنمائی فرمائی۔ اب اس روشنی میں

آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۷۲-۲۰۶

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ
عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ ۚ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُوْلُوْا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ أَوْ تَقُوْلُوْٓا إِنَّمَآ
أَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا
بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ
مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا
لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ
كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۚ
ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ
لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلًا ٱلْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَأَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ
الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾ وَلَقَدْ
ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا
يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا
يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ أُولٰٓئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولٰٓئِكَ هُمُ
الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ وَلِلّٰهِ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ

معانقہ

يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٨٠﴾ وَمِمَّنْ
ع ٢٢ / ١٢
خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿١٨١﴾ وَالَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٢﴾
وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿١٨٣﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٜ مَا بِصَاحِبِهِمْ
مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٨٤﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ
يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٥﴾
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ ﴿١٨٦﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ
وقف منزل
اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِي
وقف لازم
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ
حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٧﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ
معانقہ
اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا
ع ٢٣ / ١٣
مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٨﴾
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا
لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ
اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ

الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ
فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا
وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَآءٌ
عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ
يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ
يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾
اِنَّ وَلِيِّ َۧ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ښ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَ
الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ
يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ
وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا
مَسَّهُمْ طٰۗىِٕفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ ۚ
وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَاِذَا لَمْ
تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى

إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠٣﴾ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٢٠٤﴾ وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ﴿٢٠٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ ﴿٢٠٦﴾ السجدة

ع ۲۴ ۱۸ ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۷۲ - ۲۰۶

اور یاد کرو، جب نکالا تمھارے رب نے بنی آدم سے ـــــ ان کی پیٹھوں سے ـــــ ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ بولے ہاں تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔ یا عذر کرو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا اور ہم ان کے بعد ان کے خلف ہوئے تو کیا باطل پرستوں کے عمل کی پاداش میں تو ہم کو ہلاک کرے گا؟ اور ہم اسی طرح اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ رجوع کریں۔ ۱۷۲ - ۱۷۴

اور ان کو اس کی سرگزشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا، پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔ تو اس کی تمثیل کتے کی ہے اگر تم اس کو دھتکارو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔

توان کو سرگزشت سناؤ تاکہ وہ غور کریں۔ کیا ہی بری تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتی رہی۔ جسے اللہ ہدایت بخشے وہی ہدایت پانے والا بنتا ہے اور جنھیں وہ گمراہ کر دے وہی ہیں جو نامراد ہوتے ہیں۔ (۱۷۵-۱۷۸)

اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سُنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں اور اللہ کے لیے تو صرف اچھی ہی صفتیں ہیں تو انھی سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑو جو اس کی صفات کے باب میں کجروی اختیار کر رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، عنقریب اس کا بدلہ پائیں گے۔ اور جن کو ہم نے پیدا کیا ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی رہا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور اس کے مطابق فیصلے کرتے رہے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہم ان کو وہاں سے داؤں پر لے جا رہے ہیں جہاں سے انھیں علم نہیں اور میں انھیں ڈھیل دیے جا رہا ہوں کیونکہ میری تدبیر بہت ہی محکم ہے۔ ۱۷۹-۱۸۳

کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے وہ تو بس ایک کھلا ہوا ہوشیار کرنے والا ہے۔ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام اور ان چیزوں پر نگاہ نہیں کی جو خدا نے پیدا کی ہیں اور اس بات پر کہ کیا عجب کہ ان کی مدت قریب آ لگی ہو تو اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ جن کو خدا گمراہ کر دے ان کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ان کو وہ ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا

چھوڑ دیتا ہے۔ وہ تم سے قیامت کے باب میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ کہہ دو کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ آسمان و زمین اس سے بوجھل ہیں، وہ تم پر بس اچانک ہی آ دھمکے گی۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا تم اس کی تحقیق کیے بیٹھے ہو۔ کہہ دو، اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ کہہ دو، میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچ پاتا۔ میں تو بس ان لوگوں کے لیے ایک ہوشیار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں جو ایمان لائیں۔ ۱۸۴-۱۸۸

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا کہ وہ اس سے تسکین پائے تو جب وہ اس کو چھا لیتا ہے تو وہ اٹھا لیتی ہے ایک ہلکا سا حمل، پھر وہ اس کو لیے کچھ وقت گزارتی ہے تو جب بوجھل ہوتی ہے دونوں اللہ اپنے رب سے دعا کرتے ہیں، اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد بخشی ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔ تو جب اللہ ان کو تندرست اولاد دے دیتا ہے تو اس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ اس کے لیے دوسرے شریک ٹھہراتے ہیں۔ اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ نہ ان کی کسی قسم کی مدد کر سکتی ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتی ہیں۔ اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو وہ تمھارے ساتھ نہ لگیں گے، یکساں ہے خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو یہ تو تمھارے ہی جیسے بندے

ہیں۔ پس ان کو پکار دیکھو، وہ تمھیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، کیا ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟ کہہ دو، تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، میرے خلاف چالیں چل دیکھو اور مجھے مہلت نہ دو۔ میرا کارساز اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ نیکو کاروں کی کارسازی فرماتا ہے اور جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو نہ وہ تمھاری ہی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو وہ تمھاری بات نہ سنیں گے اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمھاری طرف تاک رہے ہیں لیکن انھیں سوجھتا کچھ بھی نہیں۔ درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔ اور اگر تمھیں کوئی وسوسۂ شیطانی لاحق ہونے لگے تو اللہ کی پناہ چاہو، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے وہ خدا کا دھیان کرتے ہیں اور دفعتًہ ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔ اور جو ان ناخدا ترسوں کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں بڑھاتے ہیں پھر کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ۱۸۹ - ۲۰۲

اور جب تم ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے کہتے ہیں کہ اسے کیوں نہ گھڑ لائے! کہہ دو، میں تو بس اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے آنکھیں کھولنے والی آیات اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ اور جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۲۰۳ - ۲۰۴

اور اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور پست آواز سے اور غافلوں میں سے نہ بنو۔ بے شک جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی کرنے سے نہیں اکڑتے، وہ اس کی تسبیح کرتے اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ ۲۰۵-۲۰۶

۱۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ أَنْفُسِهِمْ ۚ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ۝ أَوْ تَقُولُوٓا إِنَّمَآ أَشْرَكَ آبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ۝ وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۱۷۲-۱۷۴)

'اِذْ' اور واحد کے خطاب کے مواقع استعمال

'وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'اذ' کے ذریعہ سے کسی ایسے امر واقعی کی یاد دہانی بھی کی جاتی ہے جو متکلم کے نزدیک ایک حقیقت ہو، قطع نظر اس سے کہ مخاطب اس کو فراموش کیے ہوئے ہوں یا اس سے منحرف ہوں۔ اسی طرح واحد کے خطاب کے متعلق بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرینہ دلیل ہو تو یہ جمع کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے اور اس صورت میں گویا مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہوتا ہے۔

'مِنْ ظُهُورِهِمْ' کی قید کا فائدہ

'مِنْ بَنِيٓ آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ' میں 'مِنْ ظُهُورِهِمْ'، 'مِنْ بَنِيٓ آدَمَ' سے بدل واقع ہے اور اس بدل کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بنی آدم سے متعلق یہاں جو حقیقت بیان ہو رہی ہے وہ کسی خاص دور ہی کے بنی آدم سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ قیام قیامت تک جتنے بھی بنی آدم پیدا ہونے والے ہیں سب ہی سے متعلق ہے۔

تمام بنی آدم سے خدا نے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا

'وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور وہ اس طرح کہ اس نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں، اس کے جواب میں سب نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہاں بے شک تو ہمارا رب ہے اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ یہ اقرار اللہ تعالیٰ نے صرف اس بات کا نہیں لیا کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس بات کا لیا کہ وہی رب بھی ہے۔ یہ ملحوظ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ اہل عرب کو اللہ کے اللہ ہونے سے انکار نہیں تھا لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا لیے تھے حالانکہ عہد فطرت میں اقرار صرف اللہ ہی کی ربوبیت کا ہے۔

توحید بدیہیات فطرت میں سے ہے

'اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنۡ ھٰذَا غٰفِلِیۡنَ'، 'اَنۡ' سے پہلے 'کراھۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ مبادا تم قیامت کے دن عذر کرو، اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک توحید اور بدیہیات فطرت کا تعلق ہے ان کے باب میں قیامت کے دن مواخذہ ہر شخص سے مجرد اس اقرار کی بنا پر ہوگا جو مذکور ہوا، قطع نظر اس سے کہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی یا نہیں۔ اگر کسی نبی کی دعوت اس کو پہنچی ہے تو یہ گویا ایک مزید حجت اس پر قائم ہوگئی کہ اس کی مسئولیت دوچند ہوگئی لیکن نبی کی دعوت اگر نہیں پہنچی تو یہ بدیہیات فطرت کے معاملے میں کوئی عذر نہیں بن سکے گی۔ ان پر مواخذہ کے لیے فطرت کا یہ عہد کافی ہے۔

'اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَکَ اٰبَآؤُنَا الایۃ' اسی طرح لوگوں کا یہ عذر بھی کچھ کام نہ آئے گا کہ ہمارے باپ دادا مشرک تھے، ہم انہی کے ہاں پیدا ہوئے اور پھر قدرتی طور پر ہم نے انہی کے طریقے کی پیروی کی اس وجہ سے یہ جرم ہمارا نہیں بلکہ ان کا ہے، اس کی سزا ان کو ملنی چاہیے نہ کہ ہم کو۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ اقرار توحید انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے اس وجہ سے اس باطنی شہادت سے انحراف کے لیے خارجی اثرات کا عذر بھی کسی کا خدا کے ہاں مسموع نہیں ہوگا۔

'وَکَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ الایۃ' اس آیت میں قرینہ دلیل ہے کہ 'وَلَعَلَّھُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اگر اس کو کھول دیا جائے تو ہمارے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل اس لیے کر رہے ہیں تاکہ ہم لوگوں پر اپنی حجت اس طرح قائم کر دیں کہ ان کے لیے کوئی ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہ جائے اور تاکہ اس وضاحت کے بعد ان میں سے جو شرک سے تائب ہو کر اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہیں وہ رجوع کر لیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے مذکورہ عہد لینے کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و احسان ہے کہ اس نے اس عہد و میثاق کی پوری تفصیل بھی سنا دی تاکہ جو اپنی غلطی سے توبہ کرنا چاہیں وہ توبہ کر لیں اور جو اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہیں وہ اس کے نتائج کا ذمہ دار اپنے ہی کو سمجھیں، کسی اور کی گردن پر اس کا الزام ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔

عہد فطرت سے متعلق بعض سوال اور ان کے جواب

اس عہد کا ذکر قرآن نے ایک امر واقعہ کی حیثیت سے کیا ہے اور اس کی اہمیت یہ بتائی ہے کہ جہاں تک خدا کی ربوبیت کا تعلق ہے ہر شخص مجرد اسی عہد کی بنا پر عنداللہ مسئول ہوگا۔ اس کی اس اہمیت کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عالم غیب کے کسی ایسے ماجرے کی یادداشت انسان کے ذہن میں محفوظ ہے جس کا یہاں ذکر ہوا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ کس طرح باور کیا جائے کہ فی الواقع انسان نے اس طرح کا کوئی اقرار کیا ہے اور اس کی بنیاد پر وہ توحید کے معاملے میں عنداللہ مسئول ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک اس اقرار کا تعلق ہے وہ تو ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے، رہا اس کا موقع و محل اور اس کی تاریخ تو وہ اگر یاد نہیں رہی تو اس سے نفس اقرار کی صحت و صداقت

پر کوئی اثر نہیں پڑتا، زیادہ سے زیادہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اقرار تو مجھے یاد ہے البتہ اس کا موقع و محل یاد نہیں ہے، سو اللہ تعالیٰ نے اس کا موقع و محل بتا دیا کہ یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالم غیب میں خدا نے اس سے لیا ہے اور یہ بات خدا ہی بتا سکتا تھا اس لیے کہ غیب کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔ انسان پر حجت قائم ہونے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس اقرار کی یادداشت اس کے اندر موجود ہے۔

دین کا نقطۂ آغاز

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کے اندر ابتدا ہی سے یہ اقرار موجود ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان وجود میں آنے کے بعد دین کا آغاز خالص خدا پرستی اور توحید سے کرتا لیکن ہمارے نئے فلسفی تو یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا ہے۔ دنیا میں گوناگوں حوادث کے ظہور نے اس کے اندر مختلف ان دیکھی طاقتوں کا خوف پیدا کیا، اس خوف نے اس کے اندر ان ان دیکھی طاقتوں کی پرستش کا خیال پیدا کیا، چنانچہ اس نے ان کی پرستش شروع کی، پھر آہستہ آہستہ اس کے علم میں جتنی ترقی ہوتی گئی ان وہمی معبودوں سے چھوٹ کر وہ اقرار توحید کی منزل تک پہنچا۔ ہم نے نئے فلسفیوں کے اس واہمہ کی تردید سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بھی کی ہے اور اس سے زیادہ تفصیل اپنی کتاب حقیقت شرک میں کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تقریر بالکل غیر منطقی ہے۔ ہم نے مذکورہ کتابوں میں واضح کیا ہے کہ خوف نام ہے کسی ایسی چیز کے زائل ہونے یا چھن جانے کے اندیشہ کا جو انسان کو حاصل بھی ہو اور جو عزیز و محبوب بھی ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ نعمت، منعم، اور اس کی شکر گزاری کا شعور اور جذبہ، خوف کے جذبہ اور اس کے عوامل پر مقدم ہے اس وجہ سے انسان نے خوف سے دین کا آغاز نہیں کیا بلکہ اپنے منعم پروردگار کی شکر گزاری اور اس کی عبادت سے دین کا آغاز کیا لیکن پھر مختلف اسباب کے تحت، جن کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب حقیقتِ شرک میں کی ہے، وہ اس جادۂ مستقیم سے ہٹ کر مختلف پگڈنڈیوں پر نکل گیا ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی فطرت بالکل ایک لوح سادہ ہوتی ہے، اس پر جتنے نقوش بھی ابھرتے ہیں بعد میں ادراک و شعور پیدا ہونے کے بعد محض ماحول کے اثر سے ابھرتے ہیں لیکن یہ خیال محض مغالطہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ماحول اپنے اندر نئے آنے والوں پر جو اثرات ڈالتا ہے وہ خود اس نے کہاں سے لیے ہیں۔ ماحول کے پاس رطب و یابس روایات کا جو اندوختہ بھی ہے وہ سب اس کی فطرت ہی کے بناؤ یا بگاڑ کا کرشمہ ہے جو باتیں اس کی فطرت کے اصل منبع سے ابھری ہیں وہ خیر، عدل اور معروف ہیں اور جن پر ان کی خواہشات کی بے اعتدالیاں غالب آگئی ہیں وہ شر اور ظلم بن گئی ہیں۔ خدا کے معاملے میں بھی یہی بے اعتدالی اس سے صادر ہوئی ہے۔ اس کی اصل فطرت کے اندر صرف ایک خدائے وحدہ لاشریک ہی کا اقرار مضمر ہے۔ اتنے پر دنیا کے مشرک اور موحد سب متفق ہیں اس وجہ سے یہ چیز کسی دلیل کے قیام کی محتاج نہیں ہے البتہ شرک کے مدعیوں پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اس ایک پر جو دوسرے معبودوں کا اضافہ کرتے ہیں ان کی وہ دلیل پیش کریں چنانچہ قرآن نے ان سے جگہ جگہ یہی مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ شریکوں

کے حق میں کوئی دلیل لائیں۔

قرآن کا سارا فلسفہ درحقیقت انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جن عقائد و اعمال اور جن اچھائیوں اور نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے اور جن برائیوں سے روکتا ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے خارج سے اس پر لادی نہیں جا رہی ہے بلکہ اس کو انہی باتوں کی یاددہانی کی جا رہی ہے جو اس کی اپنی فطرت کے اندر ودیعت ہیں لیکن اس نے اپنی لذات عاجلہ کے پیچھے پڑ جانے کے سبب سے ان کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ قرآن نے اس وجہ سے اپنے آپ کو 'ذکر' اور 'ذکریٰ' کہا ہے جن کے معنی یاددہانی کے ہیں اور اپنی تعلیم و دعوت کو 'تذکیر' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی فراموش کردہ یا نظرانداز کردہ حقائق کے یاد دلانے کے ہیں۔

یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے لیکن اس زمانے کے نئے تعلیم یافتہ لوگوں پر مارکس اور فرائڈ کا جادو چلا ہوا ہے۔ ان ظالموں کی خاکبازیوں نے لوگوں کو اس طرح اندھا بنا دیا ہے کہ اب لوگوں کو انسان کے اندر بطن اور فرج کے سوا اور کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ ان کے نزدیک انسان کا سارا فکر و فلسفہ بس انہی دو محوروں پر گھوم رہا ہے۔ اس روایتی چوہے کی طرح جسے ہلدی کی ایک گرہ مل گئی تو اس نے پنساری کی ایک دکان کھول لی، مارکس اور فرائڈ نے بھی بطن و فرج پر سارے فکر و فلسفہ اور تمام مذہب و اخلاق کو ڈھا دیا اور اس طرح ان لوگوں کو جو پہلے ہی بطن و فرج کے غلام تھے دو ایسے مرشد بھی مل گئے جن کا وہ فخر کے ساتھ حوالہ دیتے ہیں کہ وہ بے پیرے نہیں ہیں بلکہ انھیں بھی شرفِ نسبت و ارادت حاصل ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ سَآءَ مَثَلَا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۷۵-۱۷۸)

'وَاتْلُ عَلَيْهِمْ الاٰية'۔ 'هُمْ' سے مراد قریش ہیں جن کو اوپر والی آیات میں مخاطب کر کے عہدِ فطرت کی یاددہانی کی گئی ہے۔

یہود کی تمثیل

'اَلَّذِيْ' اگرچہ اصلاً معرفہ کے لیے آتا ہے لیکن تمثیلات میں یہ لازم نہیں ہے کہ اس سے کوئی معین شخص ہی مراد ہو جو خارج میں بھی موجود ہو بلکہ متکلم جس کی تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے اس کو نگاہ میں رکھ کر اس کا ایک ایسا سراپا آراستہ کر دیتا ہے جو اس پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ چونکہ پیش نظر صرف واقعہ کی تصویر کشی ہوتی ہے اس وجہ سے تقاضائے بلاغت یہ ہوتا ہے کہ اس کو نکرہ کے بجائے معرفہ کے لفظوں میں ذکر کیا جائے تاکہ تمثیل ایک خاص شخص کی صورت میں متمثل ہو کر اس طرح سامع کے سامنے آ جائے

کہ گویا اس نے اس کی سرگزشت صرف سُنی ہی نہیں بلکہ خود اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ یہاں اس 'الَّذِیْٓ' سے مراد یہود من حیث القوم ہیں جن کی تمثیل ایک ایسے شخص سے دی گئی ہے جس کو خدا نے اپنی آیتوں سے نوازا لیکن اس نے ان کی قدر نہ کی بلکہ یہ خلعت اس نے اتار پھینکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سنتِ الٰہی کے مطابق جو سورۂ زخرف آیت ۳۶ میں بیان ہوئی ہے کہ 'وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ' (جو خدائے رحمان کی یاد دہانی سے منہ پھیرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے) شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے بن گیا۔ یہ بات کہ یہ کسی معین شخص کا ذکر نہیں بلکہ خدا کی آیات کی تکذیب کرنے والی ایک قوم کی تمثیل ہے خود قرآن کے الفاظ ہی سے واضح ہے چنانچہ اس کے بعد فرمایا 'ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا' (یہ اس قوم کی تمثیل ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی) اس وجہ سے ہمارے نزدیک 'الَّذِیْٓ' سے کسی بلعام بن باعو کو مراد لینے کی ضرورت نہیں۔ یہود میں کوئی ایک ہی بلعام بن باعور نہیں تھا جس کی مثال دی جائے۔ اوپر یہود کی تفصیل کے ساتھ جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے خود واضح ہے کہ یہ پوری قوم کی قوم ہی شروع سے ہی بلعام بن باعور بنی رہی ہے۔ 'انسلاخ' کے معنی کپڑے اتار کر ننگے ہو جانے کے ہیں۔ 'اِنْسَلَخَ مِنْ ثِیَابِهٖ، تجرد' یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان کو اپنی کتاب کی تشریف و خلعت سے نوازا لیکن انھوں نے یہ اتار پھینکی اور بالکل ننگے الف بن کر رہ گئے۔

'وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ'، 'اَخْلَدَ اِلَى الشَّیْءِ' کے معنی کسی شے کی طرف اس طرح جھک جانے اور مائل ہو جانے کے ہوتے ہیں کہ آدمی بس اسی کا ہو کر رہ جائے۔ یہ اس سنتِ الٰہی کا بیان ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں پسند فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو اپنی آیات سے نوازتا ہے اگر وہ ان کی قدر کرتے ہیں تو وہ ان کے ذریعہ سے ان کو دین و دنیا دونوں کی سرفرازی عطا فرماتا ہے، ان کی عقل کو ان سے رفعت اور ان کی روح کو ان سے معراج حاصل ہوتی ہے، لیکن جو لوگ ان آیات کے پانے کے بعد بھی اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے اور کتے کی طرح زمین کو سونگھتے ہی ہوئے چلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اُن کی خواہشوں ہی کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

یہود کی تمثیل کتے سے

'فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ'۔ اب یہ ان کے برابر پستی کی طرف جھکے رہنے اور خواہشات کے پیچھے چلنے کی تمثیل بیان ہوئی ہے اور دیکھیے کیسی دلنشین اور مطابقِ واقعہ تمثیل ہے۔ اوپر آیات ۱۶۸-۱۶۹ میں ان کا حال یہ بیان ہوا تھا کہ خدا نے اپنے انعامات اور اپنی تنبیہات دونوں سے ان کو آزمایا (بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ) لیکن یہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں ایسے بے بس رہے کہ نہ انعامات سے ذرا متاثر ہوئے نہ تنبیہات سے بلکہ ہر طمع نے ان کو ٹھوکر کھلائی

اور ہر خواہش کے آگے انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے (یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰی وَیَقُوْلُوْنَ سَیُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ یَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ یَاْخُذُوْهُ) ان کی اس حالت کی تمثیل کتے سے دی ہے۔ کتے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ کبھی بخطِ مستقیم گردن اٹھا کر نہیں چلتا بلکہ ہمیشہ زمین کو سونگھتا ہوا اور ہر پاک و ناپاک چیز کا اپنی ناک سے جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے کہ شاید کوئی چیز کھانے کی مل جائے۔ اس کی رہنما اس کی آنکھ نہیں بلکہ ناک ہوتی ہے جو اس کی خواہشوں کی سراغ رساں ہے۔ پھر اس کی یہ بھی خصلت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان نکالے ہوئے رہتا ہے، چمکاریے، پیار کیجیے جب بھی اس کی یہی حالت رہے گی، دھتکاریے، جھڑکیے جب بھی اس کا یہی انداز رہے گا۔ یہ اس کی حرص اور دناءت ہے جو اس کی جبلت پر اس طرح غالب ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔ بھوکا رہے گا جب بھی اس کو آپ اسی حال میں پائیں گے، پیٹ بھر کے کھلا دیجیے جب بھی اسی ہیئت میں دیکھیں گے۔ صاحبوں کے کتے مخملیں جھول، ریشمی پٹوں اور چاندی کے گھنگرووں سے آراستہ ہوتے ہیں، پیٹ بھر گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہیں لیکن کار کے اندر صاحب کی بغل میں بیٹھے ہوئے بھی زبان نکالے ہوئے ہوں گے اور پارک کے اندر سیر کرتے ہوئے بھی زمین میں تلاش کرتے، سونگھتے اپنی ناک کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ فرمایا کہ بالکل یہی حال یہود کا ہے۔ ان کو اپنے نفس پر ذرا قابو نہیں رہا ہے۔ ان کی قوتِ ارادہ بالکل معطل ہو چکی ہے۔ اب یہ اپنی خواہشوں کے غلام اور اپنی حرص کے بندے ہیں اور حرص دنیا ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ ان کی شکلیں آدمیوں کی ہیں لیکن ان کی فطرت کتوں کی جبلت کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔

آیت میں 'تَحْمِلْ عَلَیْهِ' میرے نزدیک 'تَحْمِلَ الْعَصَا عَلَیْهِ' یا 'تَحْمِلَ الْحَجَرَ عَلَیْهِ' کے معنی میں ہے یعنی لکڑی اٹھاؤ یا اس پر پتھر پھینکو اس کا حال ایک ہی رہے گا۔ 'لَهَثَ' کے معنی زبان نکالنے کے ہیں اور اس کا غالب استعمال کتے کے لیے ہے۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا الاٰیة اس ٹکڑے سے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ بات واضح ہوئی کہ یہ تمثیل کسی شخص کی تمثیل نہیں بلکہ اس قوم کی تمثیل ہے جس نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی۔ اور اس سے مراد، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، یہود ہیں۔ سورۂ نحل آیات ۹۱-۹۲ کے تحت انشاء اللہ ہم تمثیل کے اس پہلو پر مزید بحث کریں گے۔

یہود کی یہ تمثیل، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، قریش کو سنائی گئی ہے اور مقصود اس سے قریش کو اس نعمت کی قدر کرنے کے لیے ابھارنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری شریعت کی شکل میں ان کو مل رہی تھی لیکن وہ اس کی قدر کرنے کے بجائے اس سے بدک رہے تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان کو آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والی قوم کا حال سنا دو کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی آیات سے نوازتا ہے ان کو وہ ان آیات کے ذریعہ سے زمین و آسمان دونوں کی سرفرازیاں عطا فرمانا چاہتا ہے بشرطیکہ وہ

ان کی قدر کریں، ان کو اپنائیں اور زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ اگر وہ قدر نہیں کرتے بلکہ اپنی خواہشات ہی کے غلام بنے رہتے ہیں تو ان کا حال وہی ہوتا ہے جو یہود کا ہوا۔

'سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ' مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرنے والی قوم اپنی خواہشات کی غلامی کے سبب سے بالکل بے بزبن کے رہ جاتی ہے۔ اس کی مثال، جیسی کہ اوپر بیان ہوئی، نہایت ہی مکروہ اور گھنونی ہے۔ سو یہ راہ تم نہ اختیار کرو۔ جو لوگ یہ راہ اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کی آیات کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ خود اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔ وہ ان آیات کی ناقدری کر کے خود اپنے ہاتھوں عزت کے تاج کے بجائے اپنے لیے ذلت کا طوق اختیار کرتے ہیں۔

'مَنْ يَهْدِ اللّٰهُ' یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور قریش کے لیے تہدید و وعید بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت وہی پائیں گے جن کو خدا ہدایت کی توفیق بخشے اور خدا کی توفیق انہی کو حاصل ہوتی ہے جو ہدایت کے طالب ہوں اور خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال کریں۔ جو لوگ اپنی آنکھوں اور اپنے دل و دماغ پر خواہشات کی پٹی باندھ کر زندگی گزارتے ہیں خدا انھیں گمراہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور اصلی نامراد اور بدقسمت لوگ وہی ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۷۹)

ہدایت سے محروم رہنے والے

اب یہ بتایا کہ کون لوگ ہیں جو ہدایت سے محروم رہتے ہیں اور بالآخر وہ جہنم کے ایندھن بنتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ جنوں اور انسانوں میں سے وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے دل تو دیے ہیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، ان کو آنکھیں تو بخشیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، ان کو کان تو عنایت فرمائے لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ سمجھنا، دیکھنا اور سننا اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں بس اپنی خواہشات کی تابعداری میں لگا رکھی ہیں۔ ان سے ہٹ کر کسی چیز کو سننے سمجھنے اور اس کو اختیار کرنے کا ان کے اندر دم داعیہ نہیں پایا جاتا۔ فرمایا کہ یہ لوگ چوپایوں کے مانند بلکہ ان سے بھی زیادہ بے عقل ہیں۔ چوپایوں کے مانند اس وجہ سے ہیں کہ جس طرح چوپایوں کی طلب و جستجو بس اپنے پیٹ اور تن کی مطلوبات ہی تک محدود ہوتی ہے اسی طرح ان کی تگ و دو بھی اپنی مادی ضروریات و خواہشات ہی تک محدود ہے اور چوپایوں سے زیادہ بے عقل اس وجہ سے ہیں کہ چوپائے بہرحال اپنی جبلت کی تمام صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس میں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے لیکن انسان کی فطرت کے اندر قدرت نے جو اعلیٰ صلاحیتیں رکھی ہیں ان سے نہ صرف یہ کہ وہ حقیقی فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ بسا اوقات اس سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی ہیں جو ایک بیل یا گدھے سے کبھی صادر نہیں ہوتیں۔ مثلاً انسان انسان ہو کر اتنا بے عقل اور کج فہم بن جاتا ہے کہ درختوں، پتھروں اور جانوروں کی پرستش شروع کر دیتا ہے لیکن ایک

گدھا یا بیل ایسی بے عقلی کبھی نہیں کر سکتا۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو اصلی اور حقیقی بے خبر ہیں اس لیے کہ یہ بے خبری
چوپایوں میں بھی نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ جو فرمایا ہے کہ ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا۔ تو اس کا مطلب
یہ نہیں ہے کہ ان کو ان کی ماؤں کے پیٹ سے جہنم کے لیے پیدا کیا۔ ماؤں کے پیٹ سے تو اللہ تعالیٰ نے
دل، دماغ، سمع، بصر کی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن ضابطہ یہ بنا دیا ہے کہ جو ان صلاحیتوں سے صحیح
فائدہ اٹھائیں گے اللہ ان کی رہنمائی جنت کی طرف فرمائے گا اور جو ان سے فائدہ نہ اٹھائیں گے ان کو جہنم میں جھونک
دے گا۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہ دھمکی قریش کے لیے ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۸۰)

اللہ تعالیٰ صرف اچھی صفتوں سے متصف ہے

یہ آیت، اوپر آیت ۱۷۲ میں توحید کا عہد فطرت ہونا جو بیان ہوا ہے، اس سے متعلق ہے۔ بیچ میں ان
لوگوں کا ذکر آ گیا تھا جنھوں نے اللہ کی آیات کی قدر نہیں کی اور خدا کی طرف سے نہایت اعلیٰ صلاحیتیں پا کر
اندھے بہرے بن گئے۔ اب یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے صرف اچھی ہی صفتیں اور اچھے ہی نام ہیں تو اس کو انھیں
صفتوں سے پکارو اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جو صفات الٰہی کے باب میں گمراہی کی روش اختیار
کیے ہوئے ہیں، اس کے شریک ٹھہراتے ہیں یا اس کے بیٹے بیٹیاں مانتے ہیں۔ یہ باتیں خدا کی صفات الوہیت،
اس کی شان یکتائی، اس کی قدرت، اس کی بے نیازی اور اس کے علم کی نفی کرنے والی ہیں۔ خدا کو
صرف انہی صفات سے متصف کرنا چاہیے جن کا اس کی الوہیت اور اس کی بے ہمگی و بے ہمتائی کے ساتھ
جوڑ ہو سکے، کوئی ایسی صفت اس کی طرف منسوب نہیں کرنی چاہیے جو خالق کو مخلوقات کی صف میں لا کر کھڑا
کر دے۔ 'الحاد' کا لفظ یہاں صفاتِ الٰہی کی بے حرمتی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ عربی میں اگر کہیں
'فلان الحد فی الحرم' تو اس کے معنی ہوں گے 'استحل حرمته وانتهكها'۔ 'يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ' کے
معنی ہوئے جو خدا کی صفات کی بے حرمتی و بے توقیری کرتے ہیں یعنی اس کے ساتھ ایسی صفات کا جوڑ لگاتے
ہیں جو اس کی ذات و صفات کی اہانت کرنے والی ہیں اور جن سے وہ پاک و برتر ہے۔ یہ جو فرمایا کہ 'ان
کو چھوڑ دو' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اگر نہیں مانتے تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ 'سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ'۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کی سزا عنقریب خود بھگتیں گے۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۱۸۱)

مُردوں کے اندر زندہ بھی ہیں

یعنی خدا کی مخلوق میں سب ایک ہی طرح کے نہیں ہیں۔ اگر ایک طرف وہ اندھے بہرے ہیں جن کا ذکر
اوپر گزرا تو کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں، حق کو پہچانتے ہیں، اسی کے مطابق لوگوں کی رہنمائی
اور معاملات کے فیصلے کرتے ہیں۔ اوپر آیت ۱۵۹ میں جس طرح بنی اسرائیل کے اندر کے اچھے لوگوں کا ذکر کر کے
ان کی حوصلہ افزائی کی ہے اسی طرح یہاں 'لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ الآیہ' کے مرگ انبوہ کے ذکر کے بعد ان زندہ روحوں
کی طرف اشارہ کر دیا جن کی فطرت اس وبائے عام اور اس مرگِ انبوہ کے اندر بھی زندہ رہی اور جو بالآخر اسلام

کے نور سے منور ہوئے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (۱۸۲-۱۸۳)

خدا کی ڈھیل ہلاکت کا پھندا ہے

اوپر آیت ۱۸۰ میں آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کو جو دھمکی دی گئی ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلانے کے باوجود دندنا رہے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ خدا کی پکڑ سے باہر ہیں۔ ہم ان کو وہاں سے اپنے ہدف پر لا رہے ہیں جہاں سے ان کو کسی خطرے کا سان گمان بھی نہیں ہے۔ ہم نے ان کو جو ڈھیل دی ہے اس کو یہ اپنی جیت سمجھے ہیں حالانکہ یہی ڈھیل ان کی ہلاکت کا پھندا ہے۔ ہم نے یہ ڈھیل اس لیے دی ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ جب شکاری کو اپنی ڈور پر پورا اعتماد ہوتا ہے تو وہ مچھلی کو آخری حد تک ڈھیل دیتا ہے، مچھلی سمجھتی ہے کہ اب اس نے بازی مار لی حالانکہ شکاری اس لیے اس کو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ کتنا ہی زور لگائے لیکن وہ اس کے قابو سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس کی بھاگ دوڑ اس کے لیے نجات کی راہ نہیں کھولے گی بلکہ اس کو تھکا کر اتنا چور کر دے گی کہ بالآخر وہ بے جان ہو کر خود بخود گھسٹتی ہوئی کنارے پر آ لگے گی۔ یہی حال خدا کی تدبیر کا ہے۔ اس کی تدبیر نہایت محکم اور اس کی گرفت نہایت شدید ہوتی ہے۔ کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے۔ اس ڈھیل کو سرکش اپنی کامیابی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ جتنی ہی زور آزمائی کرتے ہیں اتنے ہی اپنی ہلاکت کے گڑھے سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ جلد بازی وہ کرتا ہے جس کو اپنی تدبیر کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہو، جس کا تیر بے خطا اور جس کا وار بے پناہ ہو اس کو جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔

'اِسْتَدْرَجَه' کے معنی ہیں دناہ من درجۃ الی درجۃ، 'خدعہ' اس کو آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ چڑھالایا، اس کو چکمہ دے دیا، یہ اللہ تعالیٰ کے فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک فتنہ ہے جس میں اس کے باغی مبتلا کیے جاتے ہیں۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۸۴-۱۸۶)

آنحضرت صلعم پر جنون کا الزام

'صَاحِبِهِمْ' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے قریش کو اس امر واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ پیغمبر ان کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں بلکہ ان کے دن رات کے ساتھی ہیں۔ ان کا بچپن ان کی جوانی سب انہی کے اندر اور انہی کے ساتھ گزری ہے۔ ہر دور اور ہر مرحلہ میں انھوں نے ان کو دیکھا اور آزمایا اور ہر طرح کے حالات میں ان کو جانچا اور پرکھا ہے۔ پھر آخر یہ اس امر پر کیوں نہیں غور کرتے کہ جو شخص ہمیشہ اپنی سلامت روی، اپنی صداقت شعاری، اپنی بے غرضی، اپنی پاکبازی، اپنی فکر و رائے کی

اصابت اور اپنی دانش و بینش کی پختگی کے اعتبار سے ساری قوم میں گل سر سبد رہا دفعۃً وہ اب خبطی اور دیوانہ کیسے بن گیا؟ آخر ان میں دیوانوں اور خبطیوں کی سی کون سی بات ان کو نظر آئی ؟ یہ دیوانے اور خبطی نہیں ہیں بلکہ جس طرح ایک نذیر عریاں، خطرے کے دیدبان سے اپنی قوم کو دشمن کے حملہ سے ہوشیار کرتا ہے اسی طرح یہ خدا کے نذیر مبین ہیں جو آنے والے دقت اور تم پر نازل ہونے والے عذاب سے تم کو ڈرا رہے ہیں۔ ان کے اندر تمھیں ہوشیار و بیدار کرنے کے لیے جو بے قراری و بے چینی ہے اور انھوں نے تمھارے پیچھے اپنے رات دن جو ایک کر رکھے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے دماغ میں کوئی خلل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس عظیم خطرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو تمھارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور جو تمھیں بے بصیرتی کے سبب سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ یہ جنون نہیں بلکہ حقیقت کا سچا احساس اور اپنی قوم کی محبت کا بے پایاں جذبہ ہے جو انھیں ہلکان کیے ہوئے ہے۔ یہ تمھاری انتہائی بلادت، ناسپاسی اور سنگ دلی ہے کہ تم اس کو خبط اور جنون قرار دیتے ہو۔

یہ واضح رہے کہ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مجنون کہتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ فی الواقع آپ کو کوئی مجنون سمجھتے تھے۔ آخر قریش کے ذہین لوگ اتنے کودن کیسے ہو سکتے تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے پیکر متانت و رزانت کو مجنون کہیں؟ پھر وہ کہتے تو ان کی بات کو لائق اعتنا کون مانتا؟ اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رات دن جو اس بات کی لگن تھی کہ اپنی قوم کو اس آنے والے عذاب سے ڈرائیں جو سنت الٰہی کے بموجب، رسول کی تکذیب کی صورت میں، لازماً ان پر آ دھمکتا، یہ چیز قریش کے لیڈروں کو بہت عجیب معلوم ہوتی، ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی تھی کہ آخر ان پر عذاب کدھر سے آ جائے گا اور کیوں آ جائے گا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے صاحب کردار شخص کا اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر، رات دن ان کو اس عذاب سے ڈرانا اور اس جزم و یقین کے ساتھ ڈرانا کہ گویا آنے والے طوفان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، ایسی صورت حال نہیں تھی جس کو قریش کے لیڈر نظر انداز کر سکیں۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کی کوئی توجیہ تلاش کریں۔ اس کی کوئی توجیہ تلاش کرنا یا گھڑنا ان کی سیاسی مصلحت کا بھی تقاضا تھا اس لیے کہ ان کے اندر جو لوگ خالی الذہن تھے، کسی پندار یا کسی خود غرضی میں مبتلا نہ تھے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے لوثی اور درد مندی سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کو اس اثر سے بچانے اور اپنی سیادت کی دھاک قائم رکھنے کے لیے انھوں نے یہ اشغلا چھوڑا کہ جس طرح بھلے چنگے آدمی کو بھی لبا اوقات کسی چیز کا خبط اور سودا ہو جایا کرتا ہے، رات دن اس پر وہی دھن سوار رہتی اور اٹھتے بیٹھتے ہر جگہ اسے وہی چیز نظر آتی ہے اسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی نعوذ باللہ عذاب اور قیامت کا سودا لاحق ہو گیا ہے، ان کی یہ چیز پروا کرنے کی نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں قریش کی اسی طفل تسلی کی تردید کی ہے کہ جس شخص کو تم مدت العمر کے تجربہ سے جانتے ہو کہ توازن فکر و عمل اور اعتدال ذہن و مزاج کے اعتبار سے تمھاری پوری قوم میں کوئی اس کا

ثانی نہ ہوا آج تم اس کو خبطی اور دیوانہ قرار دیتے ہو جب وہ سن وسال اور رشد وکمال دونوں کی تجلّی کا ایک پیکر قدسی ہے۔ نادانو، یہ دیوانہ نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا ہوشیار کرنے والا اور ڈرانے والا ہے جو آنے والے طوفان کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ تو ع

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

پیغمبر کی تائید میں آفاق کی شہادت

'اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ' مطلب یہ ہے کہ اگر یہ آسمان و زمین کے نظام اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ انھیں جو عذاب اور قیامت سے ڈرا رہا ہے وہ دیوانہ اور خبطی نہیں ہے بلکہ یہ خود اندھے اور بہرے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی صدا اس کائنات کے گوشے گوشے سے اٹھ رہی ہے۔ جو شخص بھی اس کائنات کے نظام پر غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ کائنات عبث اور بے غایت و بے مقصد نہیں ہے بلکہ یہ لازماً ایک روز جزا و سزا پر منتہی ہونے والی ہے جس میں فلاح صرف وہی لوگ پائیں گے جو راستی و پاکبازی کی زندگی بسر کریں گے، جو لوگ اس راہ سے ہٹ کر چلیں گے وہ جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ یہ اس مجموعی نظام کائنات کی بدیہی شہادت ہے جس کو صرف وہی لوگ جھٹلا سکتے ہیں جو عقل و شعور کے کان اور آنکھ بند کیے بیٹھے ہوں۔ پھر اس مجموعی کائنات کا ایک ایک جزو بھی اسی حقیقت نفس الامری کی شہادت پکار پکار کر دے رہا ہے۔ خدا نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ اس کی قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کا مظہر ہے اور اس نے اس کے لیے ایک مدت بھی ٹھہرائی ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ جس حکیم و قدیر ذات کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہے وہ اس دنیا کو یوں ہی چھوڑے رکھے، اس کے خیر و شر میں کوئی امتیاز نہ کرے اور جس نے ہر چیز کے لیے ایک اجل معین کی وہ اس مجموعی دنیا اور اس کی قوموں کے لیے کوئی اجل معین نہ کرے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ آسمان و زمین کے نظام میں غور جس نتیجہ تک آدمی کو پہنچاتا ہے اس کے ایک حصہ کو، جو واضح ہے، یہاں حذف کر دیا ہے۔ اگر اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ 'کیا انھوں نے آسمان و زمین کے نظام اور اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں غور نہیں کیا کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اللہ نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا'۔ بعض جگہ اس محذوف کو واضح کر دیا ہے۔ مثلاً 'یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ' - ۱۹۱ - آل عمران (اور وہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب تو نے یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا، تو پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو)

'وَاَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ' یہ اسی محذوف پر عطف ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ یعنی اگر یہ آسمان و زمین کے نظام اور مخلوقاتِ الٰہی کی حکمتوں پر غور کرتے تو ان پر اس کائنات کا با مقصد اور ایک اجل معین کے لیے ہونا بھی واضح ہو جاتا اور ان پر یہ بات بھی کھل جاتی کہ کیا عجب کہ

اب ان کی وہ اجل بھی قریب آ گئی ہو، جس سے پیغمبر ان کو ہوشیار کر رہے ہیں اس لیے کہ جب اس دنیا کو خدا نے کھیل تماشہ نہیں بنایا ہے تو آخر وہ ان کو شتر بے مہار کی طرح کیوں چھوڑے رکھے گا، جس طرح دوسری قوموں کو، جن کی تاریخ اوپر بیان ہوئی، اللہ نے پکڑا اب انھیں بھی پکڑے تو کیا بعید ہے۔ یہ گویا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں آفاقی شہادت کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کو خبط پر محمول نہ کرو بلکہ اپنی بلادت اور سرگشتگی پر ماتم کرو۔

وقت گزر جانے کے بعد ایمان بے فائدہ ہے۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ، 'بَعْدَهٗ' کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں دو قول ہو سکتے ہیں، ایک اجل، جس کا ذکر اوپر گزرا، اور دوسرے قرآن جس کی آیات کی تکذیب کا یہ سارا نتیجہ ظاہر ہو رہا ہے۔ استاذ رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان دوسرے قول کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن میرا رجحان غالب پہلے قول کی طرف ہے کہ جب وہ اجل آ دھمکے گی تو پھر کس بات پر ایمان لائیں گے۔ ایمان لانے کا وقت تو اب ہے لیکن یہ منتظر ہیں کہ پیغمبر جس انجام کی دھمکی سنا رہے ہیں اس کو دیکھ لیں گے تب ایمان لائیں گے لیکن ان بدبختوں سے کوئی پوچھے کہ پھر ایمان لانے کے لیے کون سی بات باقی رہ جائے گی جس پر وہ ایمان لائیں گے؛ پھر تو سارا قصہ ہی ختم ہو جائے گا، جھگڑا جس چیز کے ماننے نہ ماننے کا ہے وہ تو اسی وقت تک ہے جب تک اس کا ظہور نہیں ہوتا، جب وہ ظاہر ہو گئی تو مانا تو کیا، انکار کیا تو کیا، پھر تو نتیجہ بھگتنا ہے نہ کہ کوئی چیز ماننے کے لیے باقی رہ جائے گی جس پر ان سے ایمان لانے کے لیے کہا جائے گا۔

'مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ الاٰيۃ' اوپر والا ٹکڑا، جیسا کہ واضح ہے، حسرت کے انداز میں ہے۔ اسی مضمون کی یہ تاکید مزید ہے کہ جن لوگوں کی سمجھ میں اتنی واضح بات نہیں آ رہی ہے درحقیقت وہ سنت الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں اور جو لوگ سنت الٰہی کی زد میں آ چکے ہوں ان کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ ایسے لوگ اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۂ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۸۷)

سوال بطور استہزاء

'يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا' سوال، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، مذاق اور استہزا کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ اسی نوعیت کا سوال مراد ہے۔ 'ساعۃ' کے معنی وقت اور گھڑی کے ہیں۔ یہاں مراد اس عذاب اور قیامت کی گھڑی ہے جس کے دفعۃً آ دھمکنے کا ڈراوا ان کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سنا رہے تھے۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کو دو عذابوں سے ڈراتا ہے۔ ایک اس عذاب سے جو اسی دنیا میں ظاہر ہوتا ہے، اگر اس کی قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے، دوسرے اس عذاب سے جس سے کفار قیامت میں دوچار ہوں گے۔ 'السَّاعَة' کا لفظ دونوں ہی پر حاوی

ہے اس لیے کہ پیغمبروں کو جھٹلانے والے ان دونوں ہی کا مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ 'ایان' وقت سے متعلق سوال کے لیے آتا ہے۔ جس طرح 'متیٰ' آتا ہے۔ لیکن یہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کسی چیز سے متعلق استغراب واستنکار کے لب ولہجہ میں سوال کیا جائے۔ 'مُرْسٰی' جہاز وغیرہ کے لنگر انداز ہونے کو کہتے ہیں (مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا) مطلب یہ ہوا کہ وہ تم سے استہزاء اور طنز کے انداز میں سوال کرتے ہیں کہ اس عذاب یا قیامت کی گھڑی کب نمودار ہوگی جس کے اتنے دنوں سے ڈراوے سنا رہے ہو، آخر یہ جہاز چلا تو کہاں اٹک کے رہ گیا، یہ ساحل پر کب لنگر انداز ہوگا۔

'قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ' فرمایا کہ کہہ دو کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا، نہ مجھے اس کے وقت کا پتہ ہے اور نہ میں اس کے لا سکنے پر قادر ہوں۔

ایک اعلیٰ تلمیح

'ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً' اس کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ یہ آسمان وزمین میں ایک بھاری حادثہ ہوگا۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے لیکن اسلوب بیان ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ وہ گھڑی آسمان وزمین میں ایک بوجھ بنی ہوئی ہے۔ اس میں اس حقیقت کی طرف ایک تلمیح ہے کہ جس طرح ایک حاملہ عورت، ولادت کے قریب بار حمل سے گرانبار ہوتی ہے، اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ولادت کا صحیح وقت کیا ہے لیکن ہر آنکھیں رکھنے والا دیکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ عورت جنے گی اور بہت جلد جنے گی وہی حال قیامت اور عذاب کے معاملے میں آسمان وزمین میں غور کرنے والے ارباب بصیرت کا ہے وہ آسمانوں اور زمین کو اس بوجھ سے گرانبار دیکھتے ہیں اور اگرچہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس بوجھ سے کب سبکدوش ہوں گے لیکن جس طرح ایک حاملہ اپنے آخری مرحلہ میں اپنے بوجھ سے سبکدوش ہونے کے لیے منتظر اور بے قرار ہوتی ہے، وہی بے قراری آسمان وزمین کے اندر نمایاں ہے۔ اس میں اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو آسمان وزمین کے اندر قیامت اور عذاب کی نشانیاں نظر نہیں آرہی ہیں ان کو گویا آخری مرحلہ میں پہنچی ہوئی حاملہ کا حمل نظر نہیں آرہا ہے 'لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً' یعنی اس کے علامات وآثار دیکھو اور انھی کو دیکھ کر اس کے آنے کا یقین کرو اور اس کے لیے تیاری کرو، اس کا ظہور جب بھی ہوگا، اچانک ہوگا، اس کے صحیح وقت کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن اس کے وقت کے نہ جاننے سے اس کے واقع ہونے کی نفی نہیں ہو جاتی۔ ایک حاملہ کے متعلق ہر شخص یقین رکھتا ہے کہ وہ جنے گی اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس وقت جنے گی۔

'حفی' کا مفہوم

'يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا' 'حَفِيٌّ' اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شخص یا کسی چیز کی کھوج کرید، دریافت، جستجو اور اہتمام کے درپے رہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ تم سے اس گھڑی کے وقت کے ظہور کے متعلق اس طرح سوال کر رہے ہیں گویا تم رات دن اسی کے وقت ہی کی دریافت کے درپے رہتے ہو اور تم نے

منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ ساری معلومات اس کے متعلق جمع کر رکھی ہیں حالانکہ کوئی عاقل نہ کسی ایسی جستجو کے درپے ہوتا نہ اس کو ہونا چاہیے جو اس کے حدود علم و تحقیق سے ماورا ہو۔

انسان کی عجیب بدبختی

'وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ' لیکن اکثر لوگ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ کیا چیز ان کے جاننے کی ہے جس کے انھیں درپے ہونا چاہیے اور کیا چیز ان کے حدود علم سے ماورا ہے جس کے پیچھے پڑنا محض اوقات کی اضاعت اور اپنے آپ کو فتنوں میں مبتلا کرنا ہے۔ انسان کی یہ عجیب بدبختی ہے کہ وہ زیادہ تر ان چیزوں کے پیچھے پڑتا ہے جن کو نہ تو وہ جان سکتا ہے نہ وہ اس کے جاننے کی ہیں اور پھر ان کو بہانہ بنا کر ان حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے جن کو جاننا اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ متشابہات کے پیچھے پڑ کر محکمات کا انکار کرتے ہیں ان کی بھی اصلی بیماری یہی ہے۔ اس پر ہم نے آل عمران کی تفسیر میں مفصل بحث کی ہے۔

قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِکُ لِنَفۡسِیۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ وَلَوۡ کُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ لَاسۡتَکۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَیۡرِ ۚۛ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوۡٓءُ ۚۛ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ وَّبَشِیۡرٌ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (۱۸۸)

پیغمبر غیب کا عالم نہیں ہوتا

یعنی ان کو بتا دو کہ میں جو اللہ کا رسول ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں سارے غیب کا عالم ہو گیا ہوں اور مجھے اس بات کا اختیار مل گیا ہے کہ میں اپنے آپ کو جس نفع سے چاہوں بہرہ ور کر لوں اور جس نقصان سے بچانا چاہوں بچا لوں۔ غیب کا عالم اور حقیقی نافع و ضار صرف اللہ ہی ہے۔ دوسروں کی طرح میرے معاملات میں بھی اصلی کارفرما خدا کی مشیت ہی ہے۔ میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے نہ کہ خدائی کا تو مجھ سے ان چیزوں کا مطالبہ نہ کرو جن کا تعلق صرف خدا کے ارادے اور اختیار میں ہے۔ مجھے وحی عطا ہوئی ہے، علم غیب کی کنجیاں مجھے نہیں ملی ہیں۔ اگر مجھے غیب کا علم مل گیا ہوتا تو میں خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند بھی نہ پہنچ پاتا لیکن تم دیکھتے ہو کہ مجھے مختلف قسم کے گزند بھی پہنچتے ہیں اور خیر کی راہوں میں بھی میری سبقت اسی حد تک ہے جس حد تک مجھے رب کی مرضیات کا علم ہے۔ 'لَاسۡتَکۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَیۡرِ' کے ٹکڑے میں جس خیر کی زیادہ سے زیادہ مقدار جمع کر لینے کی تمنا کا اظہار ہے وہ پیغمبر کے ظرف اور اس کی طلب کے اعتبار سے ہے۔ پیغمبر اپنے حوصلہ اور اپنے ارمان کے اعتبار سے اس مقام بلند پر ہوتا ہے کہ وہ خیر کی کسی وادی کو نا طے کردہ نہیں چھوڑنا چاہتا لیکن وہ خیر سے واقف اسی حد تک ہوتا ہے جس حد تک اس کو وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس کو پورا غیب معلوم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے اپنے امکان کے حد تک تو اس کی کوشش یہی ہوگی کہ خیر کی راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے۔ لیکن دائرہ وحی سے باہر اسے بھی دوسروں کی طرح اپنی صواب دید ہی پر کام کرنا اور اپنی عقل ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جس میں کامیابی اور ناکامی دونوں کے امکانات مضمر ہوتے ہیں۔

'اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ وَّبَشِیۡرٌ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ' یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ میں نہ

عالم الغیب ہوں نہ صاحب اختیار مطلق۔ میں تو صرف ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ میرے اختیار میں یہ بھی نہیں ہے کہ کسی کے دل میں ایمان اتار دوں، یہ چیز بھی لوگوں کے اپنے ارادے اور اللہ کی توفیق بخشی ہی پر منحصر ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ۖ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا ۚ فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۱۸۹-۱۹۰)

اضداد کی باہمی سازگاری توحید کی دلیل ہے

'هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا' اس ٹکڑے کے مضمرات پر ہم سورۂ نساء آیت ۱ کے تحت بحث کر آئے ہیں۔ یہاں 'جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ مرد اور عورت کا باہمی تعلق کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی فطری مناسبت تو نہ ہو، محض اتفاق سے وہ ایک دوسرے کے لیے سازگار، ہم جنس، سرمایہ تسکین، راحت جان و دل اور ذریعۂ اولاد و احفاد بن گئے ہوں بلکہ سورج کی طرح یہ چیز روشن نظر آتی ہے کہ خالق کائنات نے مرد کے اندر عورت کے لیے اضطراب اور تڑپ پیدا کی ہے اور پھر اس کے اس اضطراب اور اس کی اس تڑپ کی تسکین ہی کے لیے اسی کی جنس سے عورت کو وجود بخشا ہے۔ ان دونوں میں ان کے فطری داعیات اور ان کی داخلی اور خارجی ساخت کے اعتبار سے ایسی گہری سازگاری ہے کہ ایک ہٹ دھرم کے سوا کوئی نہیں یہ کہہ سکتا کہ یہ سازگاری کسی اندھے بہرے مادے کی پیدا کردہ ہے یا یہ کہ ان کا ارتقا آپ سے آپ خود رو درختوں کی طرح ہوا پھر دونوں اپنے اپنے طور پر بھٹکتے ہوئے کہیں راستے میں مل گئے تو اچانک تڑپ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے اور پھر اس طرح باہم دگر جان و تن بن گئے۔ ع

تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

پھر یہ سازگاری، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس حقیقت کا بھی پتہ دیتی ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک ہی حکیم و علیم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر اس میں مختلف ارادے کارفرما ہوتے تو اس کے اضداد کے اندر وہ سازگاری کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں۔ عورت اور مرد دونوں متضاد خصوصیات سے متصف ہیں لیکن مدبر کائنات نے ان دونوں کے درمیان اس طرح جوڑ ملایا ہے کہ ایک نے داد اور دوسری نے دوا کی شکل اختیار کر لی ہے۔

سائنس کا ایک انکشاف

'جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا' پر غور کرتے ہوئے جدید سائنس کے اس انکشاف کو بھی ذہن میں رکھیے کہ زندگی کے آغاز میں جسد انسان کی اولین صورت ایک جونک کی طرح ایک ہی خلیہ پر مشتمل تھی اور ایک خلیہ کے جاندار کے توالد کا طریق یہ ہے کہ وہ بڑھ کر خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جن میں سے ہر ایک حصہ ایک مکمل جاندار ہوتا ہے۔ پھر بدنی ارتقا کے اگلے مراحل پر ایک حصہ مادہ کے فرائض کے لیے اور دوسرا حصہ

نر کے فرائض کے لیے موزوں بن جاتا ہے[1]۔

ایک عام انسانی کمزوری کا بیان

فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ، آیات ۱۲۴ - ۱۲۵ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ تصویر حال کے مواقع میں 'لَمَّا'، 'کُلَّمَا' اور 'اِذَا' کی جگہ پر بھی استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے یہاں کسی خاص شخص کا حال یا واقعہ بیان نہیں ہو رہا ہے بلکہ عام انسانوں کا حال بیان ہو رہا ہے کہ باوجودیکہ مرد اور عورت دونوں کو خدا ہی نے بنایا اور ان کی باہمی سازگاری دلیل ہے کہ ایک خدا کے سوا ان کے بنانے میں کسی اور کا ہاتھ نہیں ہے لیکن انسان کی یہ عجیب خرد باختگی ہے کہ جب اولاد پیدا ہونے والی ہوتی ہے تب تو میاں بیوی دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں بھلی چنگی اولاد عطا فرما لیکن جب اللہ ان کو بھلی چنگی اولاد دے دیتا ہے تو اس کو منسوب کسی درگاہ و خانقاہ اور کسی بزرگ یا کسی بت کی طرف کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ فلاں کی توجہ اور فلاں کی برکت و عنایت کا کرشمہ ہے۔ بعض لوگوں نے 'لما' کی وجہ سے اس کو ایک معین واقعہ سمجھا اور جب معین واقع سمجھا تو ضروری ہوا کہ اس کو کسی خاص شخص کی طرف منسوب کریں چنانچہ انھوں نے اس کو حضرت آدمؑ اور حوا کی طرف نسبت دے دی اور اس کے لیے ایک بے بنیاد واقعہ بھی گھڑ کر تفسیروں میں شامل کر دیا حالانکہ قطع نظر اس سے کہ حضرت آدمؑ پیغمبر ہیں، اس مہمل روایت کی تردید کے لیے یہی بات کافی ہے کہ یہ بات یہاں اس عہد فطرت کی خلاف ورزی کی مثال کے طور پر بیان ہو رہی ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۱۷۲ میں گزر رہا ہے کہ اس عہد میں تمام نسل انسانی کے باپ کی حیثیت سے حضرت آدمؑ سب سے پہلے شریک ہیں تو نعوذ باللہ اگر وہی اس عہد میں بودے ثابت ہو جاتے تو پھر دوسروں سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۔ 'صَالِح' کا لفظ عربی میں بھلے چنگے، تندرست، ذی صلاحیت کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب عورت پوری طرح بوجھل ہو جاتی ہے اور وضع حمل کا وقت قریب آتا ہے تو بیوی اور میاں دونوں پر ایک اندیشے کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس اندیشہ میں وہ خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور چونکہ اصل فطرت کے اندر صرف خدا ہی کا نقش ہے، کسی اور کا نقش نہیں ہے اس وجہ سے یہ توجہ خدا کی طرف بلا شرکت غیرے ہوتی ہے۔ وہ اسی سے دعا کرتے ہیں کہ خدا بھلی چنگی، تندرست و خوب صورت اور ذی صلاحیت اولاد بخشے لیکن جب خدا اولاد دے دیتا ہے تو نہ جانے کن کن کو وہ اس میں شریک بنا بیٹھتے ہیں۔

قرآن میں انسانی فطرت کا یہ خاص پہلو جگہ جگہ بیان ہوا ہے کہ انسان اپنی اصل ضرورت اور اصل احتیاج کے وقت تو اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن جب وہ احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو اس کو دوسرے

---

[1] یہ بات محترم ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کی کتاب 'قرآن اور علم جدید' میں میری نظر سے گزری تھی۔ میں خود بدقسمتی سے سائنس کا کبھی طالب علم نہیں رہا۔

اسباب و وسائل کا کرشمہ قرار دینے لگتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کا تجربہ ہر شخص خود اپنے اندر کر سکتا ہے۔ انسان کی عام حالت یہی ہے اور یہاں عام حالت ہی بیان ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسے بلید بھی پائے جاتے ہوں جو کسی حال میں بھی خدا کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوں لیکن فرعون تک کا حال قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ڈوبتے وقت اسے بھی خدا یاد آیا۔ بہرحال مستثنیات سے یہ کلیہ ٹوٹ نہیں جاتا۔ آدمی پر جب حقیقی افتقار کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ دل دل میں یا زبان اور دل دونوں ہی سے خدا کو پکارتا ہے اور یہ عہد بھی کرتا ہے کہ اگر اس مرحلہ یا اس بھنور سے وہ گزر گیا تو آئندہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے گا لیکن جونہی اس مرحلہ سے گزر جاتا ہے، وہ یہ سارا عہد و پیمان بھلا کر انہی خود فراموشیوں میں پھر گم ہو جاتا ہے جن میں پہلے کھویا ہوا تھا۔ اس مسئلہ پر ہم نے اپنی کتابوں میں سے 'حقیقت شرک' اور 'حقیقت توحید' میں بھی بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب ان کو پڑھیں۔

نظم کے پہلو سے یہ آیات اس مضمون سے تعلق رکھتی ہیں جو اوپر ۱۷۲-۱۷۴ میں عہد فطرت کا بیان ہوا ہے۔ بیچ میں کچھ آیتیں تنبیہ و تذکیر اور انذار کی نوعیت کی آگئی ہیں۔ اب یہ پھر اسی مضمون کو لے لیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ انسان کی فطرت کی اصل صدا کیا ہے اور انسان (یہاں خاص اشارہ قریش کی طرف ہے) اپنی فطرت کی اس صدا سے کان بند کر کے کس طرح مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

'فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' میں ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ خدا کی صفات کے ساتھ ایسی صفات کا جوڑ ملانا جو اس کی بنیادی صفات کو باطل کر دیں بالکل خلاف عقل ہے۔ شرک، جس نوعیت کا بھی ہو، تمام صفات کمال کی نفی کر دیتا ہے اس وجہ سے خدا ایسی تمام نسبتوں اور شرکتوں سے منزہ اور ارفع ہے۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۱۹۱-۱۹۲)

خدا کے مزعوم شرکاء کی بے حیثیتی

یہ 'تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' کے مضمون کی وضاحت ہے کہ خدا ہی سب کا خالق اور سب کا ناصر ہے تو ان چیزوں کو خدا کی خدائی میں شریک بنانے کا کیا تک ہے جو کسی چیز کو بھی خلق نہیں کرتی ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں اور جو نہ تو ان کی کوئی مدد کر سکنے پر قادر ہیں اور نہ اپنی ہی کوئی مدد کر سکتی ہیں؟

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۹۳-۱۹۴)

مشرکوں کو چیلنج

'اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ' مطلب یہ ہے کہ معبود سے عابد کی سب سے بڑی احتیاج تو یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں رہنمائی فرماتا ہے لیکن تم جن معبودوں کو پوجتے ہو اگر تم ان کو زندگی کے کسی موڑ پر پکارو کہ وہ تمہاری رہنمائی کریں تو نہ وہ سنیں گے اور نہ تمہاری رہنمائی کے لیے تمہارے ساتھ لگیں گے۔ لفظ 'اتباع' یہاں اپنے ابتدائی لغوی مفہوم میں ہوگا۔ 'اتبع'، مشی خلفہ۔ مضی معہ، لحقہ

اس کے پیچھے چلا، اس کے ساتھ ہولیا، اس کو جا پہنچا۔ آگے اس مضمون کی وضاحت یوں ہوئی ہے سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا ، وَتَرَاهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے۔ تم خیال کرتے ہو کہ وہ تمھیں دیکھ رہے ہیں حالانکہ انھیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے) أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنتُمْ صَامِتُونَ یعنی روو، چیخو، فریاد کرو یا خاموش رہو، ان کے لیے دونوں یکساں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ ... الآیۃ یعنی یہ خود تمھاری ہی طرح خدا کی مخلوق ہیں تو یہ تمھاری مدد یا رہنمائی کیا کر سکتے ہیں اور اگر تمھارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ تمھاری مدد اور رہنمائی کر سکتے ہیں تو ان کو پکارو، یہ تمھاری مدد کریں۔ یہ مشرکین کو اسی طرح کا چیلنج ہے جس طرح کا چیلنج وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (اور بلاؤ اپنے شریکوں کو بھی جن کو تم اللہ کے سوا مانتے ہو، اگر تم سچے ہو) میں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اب تک تو تم نے اپنے ان خیالی معبودوں کو جو چاہا مانا اور جو چاہا منوایا لیکن اب پیغمبر اور قرآن نے ان سب کی خدائی کو چیلنج کر دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ تمھاری مدد اور رہنمائی کے لیے پہنچیں اور تم کو بھی اور خود اپنے آپ کو بھی سنبھالیں۔ اگر انھوں نے اپنی خدائی بچالی تو بے شک معلوم ہو گا کہ تم سچے ہو۔ یہ بات واضح رہے کہ اہل عرب جن بتوں کو پوجتے تھے وہ ان کے گمان کے مطابق فرشتوں، جنات اور کواکب کے بت تھے اس وجہ سے ان کو عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فرمایا ہے۔ تفصیل اس کی ہماری کتاب 'حقیقت شرک' میں ملاحظہ فرمائیے۔

أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ فَلَا تُنظِرُونِ (۱۹۵)

بت پرستی کی تردید اس کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے

بت پرستی دو جزوں سے مرکب ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ذوات ہیں جن کو بت پرست اپنے زعم کے مطابق خدائی میں شریک مانتے اور ان کو الٰہ قرار دیتے ہیں۔ دوسرے وہ پتھر اور سونے یا چاندی کی مورتیں ہیں جن کو وہ ان ذوات کے پیکر اور قالب کی حیثیت سے ڈھالتے یا تراشتے ہیں اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ ان مظاہر کے اندر ان کے مزعومہ دیوتا حلول کر جاتے ہیں اور ان مظاہر کی پرستش ان آلہہ کی پرستش کا واسطہ اور ذریعہ ہے۔ نظریہ کے اعتبار سے تو بت پرستی کے حامی اس کی حمایت میں یہی بات کہتے ہیں لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ عوام کالانعام سب کچھ ان مورتوں ہی کو سمجھتے ہیں جن کے آگے وہ ڈنڈوت کرتے اور نذر و قربانی پیش کرتے ہیں۔ قرآن نے یہاں بت پرستی کی اس کے دونوں ہی پہلو سامنے رکھ کر تردید کی ہے۔ اوپر کی آیات میں ذوات کو پیش نظر رکھ کر تردید فرمائی، اب یہ ان کے مظاہر کو پیش نظر رکھ کر اس کی تردید ہو رہی ہے کہ دیکھ لو ان کے جو ہاتھ پاؤں، کان، آنکھ تم نے بنائے ہیں سب نمائشی اور دکھاوے کے ہیں، یہ اپنے چہرے سے مکھی بھی نہیں ہٹا سکتے اور اپنے سامنے رکھے ہوئے دودھ اور حلوے کی بھی کتوں اور بلیوں سے حفاظت نہیں کر سکتے تو یہ بھلا تمھاری کیا مدد کر سکیں گے جو تم نے ان کو اپنا ملجا و ماویٰ اور ولی و کارساز بنا یا ہے۔

بعینہٖ یہی حقیقت زبور میں بدیں الفاظ واضح فرمائی گئی ہے۔

ان کے بت چاندی اور سونا ہیں۔
یعنی آدمی کی دست کاری۔
ان کے منہ ہیں، پر وہ بولتے نہیں۔
آنکھیں ہیں، پر وہ دیکھتے نہیں۔
اُن کے کان ہیں، پر وہ سنتے نہیں۔
ناک ہیں، پر وہ سونگھتے نہیں۔
ان کے ہاتھ ہیں، پر وہ چھوتے نہیں۔
پاؤں ہیں، پر وہ چلتے نہیں۔
اور ان کے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔
ان کے بنانے والے انھیں کے مانند ہو جائیں گے۔
بلکہ وہ سب جو ان پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

زبور باب ۱۱۵ : ۲-۸

'قُلِ ادْعُوا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ' یہ مشرکین کی دھمکیوں کا جواب ہے کہ تم ان بے جان اور بے حرکت مورتوں سے مجھے ڈراتے ہو کہ ان کی مذمت و مخالفت کے نتیجہ میں ان کا غضب مجھ پر بھڑکے گا۔ اگر تم یہ گمان رکھتے ہو تو تم اپنے ان سب دیویوں دیوتاؤں کو اپنی مدد کے لیے پکار دو اور میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے ہو کر گزرو، ذرا بھی رعایت نہ برتو اور ایک دن کے لیے بھی مجھے مہلت نہ دو۔

إِنَّ وَلِـۧيَ اللّٰهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِينَ ۝ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهٖ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَآ أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ۝ وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوا ۖ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (۱۹۶ - ۱۹۸)

اللہ تعالیٰ کی شان

إِنَّ وَلِـۧيَ اللّٰهُ الاية۔ 'وَلِيّ' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، حامی و ناصر اور مرجع و کارساز کے آتے ہیں۔ اوپر آیات ۱۹۲-۱۹۳ میں گزر چکا ہے کہ یہ بت جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں ان کی تو کیا مدد کریں گے خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور اگر یہ ان کو مدد و نصرت اور حمایت و ہدایت کے لیے پکاریں تو ان کا پکارنا اور نہ پکارنا دونوں یکساں ہے، وہ ان کی مدد و رہنمائی کے لیے کبھی نہیں پہنچیں گے۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی شان بیان ہو رہی ہے کہ میرا حامی و ناصر وہ اللہ ہے جس نے میری اور خلق کی ہدایت کے لیے نہایت اہتمام کے ساتھ کتاب اتاری ہے اور جو اپنے نیکوکار اور صالح بندوں کو دوست رکھتا اور ہر مرحلہ میں ان کی مدد اور رہنمائی فرماتا ہے۔ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'نَزَّلَ' میں اہتمام کا مضمون پایا جاتا ہے۔ یعنی اس نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے بندوں

کی رہنمائی کے لیے کتاب اتاری ہے۔ یوں تو بندہ ہر چیز کے لیے اپنے رب ہی کا محتاج ہے لیکن اس کی سب سے بڑی احتیاج ہدایت کے لیے ہے جس کا اہتمام خدا ہی نے فرمایا ہے تو آخر یہ اصنام و آلہہ کس مرض کی دوا ہیں اور کس احتیاج کے لیے ان کی پوجا ہو رہی ہے۔

'وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ الاية' یہ اوپر آیت ۱۹۲ کا مضمون کسی قدر اسلوب کی تبدیلی کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

اعجازِ بیان کی ایک مثال

'وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا' یہ اوپر آیت ۱۹۲ کے مضمون کی وضاحت ہے یہاں 'لَا يَسْمَعُوْا' کا لفظ 'لَا يَتَّبِعُوْكُمْ' کے صحیح مفہوم پر روشنی ڈال رہا ہے۔ 'وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ' اس ٹکڑے میں 'رویت'، 'نظر' اور 'ابصار' کے الفاظ اس خوبی سے استعمال ہوئے ہیں کہ بس قرآن کا اعجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے بصرو، تم تو یہ خیال کر رہے ہو کہ یہ تمھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں لیکن انھیں سوجھتا سمجھتا کچھ بھی نہیں۔

'وَتَرٰهُمْ' میں واحد کا خطاب، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، جمع کے مفہوم میں ہے اور مخاطب مشرکین ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَىِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ (۱۹۹ - ۲۰۲)

پیغمبر اور مسلمانوں کو بعض ہدایات

'خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ' اب یہ سورہ کے آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطہ سے مسلمانوں کو بعض مناسب وقت ہدایات دی گئی ہیں۔ لفظ 'عفو' جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے اس طرح کے سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو دل سے معاف کر دینے کے معنی میں نہیں بلکہ مجرد درگزر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ 'عُرْف' ایسی بات کو کہتے ہیں جو عقل اور فطرت اور معقول لوگوں کے نزدیک جانی پہچانی ہوئی ہو۔ یہاں اس سے مراد توحید و معاد اور نیکی و عدل کی وہی باتیں ہیں جن کی اس دور میں اہلِ عرب کو دعوت دی جا رہی تھی اور جو یکسر عقل و فطرت کی شہادت پر مبنی اور سلیم الفطرت طبائع کے لیے ان کے دل کی آواز تھیں۔ فرمایا کہ تم توحید اور معاد، نیکی اور عدل کی جو دعوت دے رہے ہو اس پر جمے رہو اور ان جاہلوں کی نازک خاطریوں سے ابھی درگزر کرو۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہ اپنی ان بوالفضولیوں کا نتیجہ خود دیکھ لیں گے۔

'وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ الاية' 'نَزْغ' کے معنی چرکا لگانا، کچوکا لگانا، زخم پہنچانا۔ یہ تدبیر بیان ہوئی ہے روشِ عفو پر قائم رہنے اور جاہلوں کی روش سے اعراض اور ان کے کچوکوں اور طعنوں کے صدمات سے اپنے دل کو محفوظ رکھنے کی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان شیاطین جن و انس کی ہرزہ سرائیوں اور خاکبازیوں سے دل کو کوئی صدمہ پہنچے تو اپنے رب کی پناہ ڈھونڈو۔ تمہارا رب سمیع و علیم ہے، تم جب بھی اس کی طرف رجوع کرتے ہو وہ تمہاری دعائیں اور فریادیں سنتا، تمہارے حالات اور پریشانیوں کو جانتا

ہے اور شیاطین کی فتنہ انگیزیوں اور چیرہ دستیوں سے بھی وہ اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ تمہارے ہر غم کو دور فرمائے گا۔

'اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا' اور 'خُذِ الۡعَفۡوَ' میں خطاب اگرچہ لفظاً واحد سے ہے لیکن یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے تمام مسلمانوں سے ہے چنانچہ اس آیت میں جمع کے اسلوب نے اس مخفی حقیقت کو واضح کر دیا۔ فرمایا کہ جو لوگ جہالت کے بجائے تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں جب کبھی ان کو جاہلوں کی جہالت اور شیاطین کی شیطنت کا کوئی جھٹکا لگتا ہے تو وہ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں جس سے فوراً ان کا باطن روشن ہو جاتا ہے اور اشرار و معاندین کی ساری ناکبازی کے باوجود ان کی راہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتی۔ یہ گویا اس استعاذہ کا طریقہ اور فائدہ بتا دیا گیا جس کی اوپر والی آیت میں ہدایت ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ میں داخل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کو یاد کرے یہ چیز دل کے اندر ایسی بصیرت اور ایسی قوت و ہمت پیدا کر دے گی کہ دفعتہً آنکھوں کے آگے کا سارا غبار چھٹ جائے گا۔

'وَاِخۡوَانُهُمۡ يَمُدُّوۡنَهُمۡ'۔ 'هُمۡ' کا مرجع وہ 'جاہلین' ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۱۹۹ میں گزرا۔ 'اخوان' سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جن کے ہاتھوں میں ان کی باگ ہے، عام اس سے کہ وہ شیاطین انس میں سے ہوں یا شیاطین جن میں سے۔ فرمایا کہ اہل ایمان کو تو خدا کی یاد سنبھال لیتی ہے لیکن جاہلین کو ان کے شیاطین گمراہی کی وادیوں میں بھٹکاتے بھٹکاتے آخری منزل پر پہنچا دیتے ہیں، ذرا بھی کسر نہیں اٹھا رکھتے کہ بازگشت کا کوئی امکان باقی رہے۔

وَاِذَا لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بِاٰيَةٍ قَالُوۡا لَوۡلَا اجۡتَبَيۡتَهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوۡحٰۤى اِلَىَّ مِنۡ رَّبِّىۡ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۔ وَاِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ وَاَنۡصِتُوۡا لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ (۲۰۳-۲۰۴)

شیطانی طعنے اور ان کا مقابلہ

یہ ان شیطانی طعنوں اور نزغات کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جن سے کفار کے ہاتھوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت سابقہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم ان کے مطالبہ پر ان کے انتخاب کے مطابق معجزہ نہیں دکھاتے تو یہ تمہیں طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کہیں سے کیوں نہیں چھانٹ لائے؟ اس قول سے ظالموں کا مطلب یہ ہوتا کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا معاملہ تو بہت آسان ہے۔ ادھر اُدھر سے جو باتیں اگلوں کے واقعات اور کاہنوں اور اہل کتاب کی روایات پر مشتمل کانوں میں پڑیں ان میں سے جو باتیں دل کو بھا گئیں ان کو جوڑ جاڑ کر کچھ کلام بنایا اور اس کو لا کر ہمیں اس دعوے کے ساتھ سنا دیا کہ یہ اللہ نے اپنے خاص فرشتے کے ذریعہ سے وحی بھیجی ہے لیکن اب ہم نے مطالبہ جو معجزے کا رکھ دیا ہے تو تمہاری کچھ پیش نہیں جاتی اس لیے کہ ادھر اُدھر سے باتیں چھانٹ لینا اور چیز ہے، معجزہ دکھانا اور چیز ہے۔ یہ چھانٹ لینے کی چیز نہیں تھی کہ کہیں سے چھانٹ کر لاتے اور ہمیں دکھا دیتے کہ یہ لو، تمہارا مطالبہ

پورا کر دیا۔ گویا اس طعنہ میں صرف معجزہ نہ دکھا سکنے ہی کا طعنہ نہیں بلکہ اس سے زیادہ زہر آلود طعنہ اس کے اندر یہ مضمر ہے کہ نعوذ باللہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جو ادھر ادھر سے اپنے ذوق کے مطابق چھانٹی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہے۔

'اِجْتِبَاء' کا اصل لغوی مفہوم تو مجموعہ میں سے کسی چیز کو انتخاب کر لینا اور چھانٹ لینا ہے لیکن جب طنز کے سیاق و سباق میں یہ لفظ استعمال ہو، جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی گھڑنے اور بنا لینے کے ہو جائیں گے اسی وجہ سے فراء نے اس کی تفسیر 'اِخْتَلَقْتَهَا اِفْتَرَيْتَهَا' سے کی ہے اور یہ تفسیر ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ طنزیہ اسلوب میں الفاظ کے مفہوم بدل جایا کرتے ہیں۔

طنز کا باوقار اور بھرپور جواب

'قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ الاية' یہ پیغمبر کی طرف سے کفار کے مذکورہ بالا طنز کا جواب ہے اور دیکھیے کیسا باوقار اور بھرپور جواب ہے۔ فرمایا کہ کہہ دو تم جو چاہو سمجھو اور جو چاہو کہو، میں تو بس اسی وحی کی پیروی کر رہا ہوں جو میرے اوپر میرے رب کی جانب سے آتی ہے۔ اوپر جاہلوں کی جہالت سے اعراض کی جو ہدایت ہوئی تھی، یہ جواب اس ہدایت کی تعمیل کی بہترین مثال ہے۔ ان کی جاہلانہ بات کا سرے سے نوٹس ہی نہیں لیا، صرف اصل حقیقت نہایت سادہ مگر نہایت باعظمت اسلوب میں ظاہر فرما دی 'هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ' یعنی تم اس چیز کو میری گھڑی ہوئی چیز کہتے ہو لیکن یہ تمھارے رب کی جانب سے آنکھوں اور دلوں کے پردے اٹھا دینے والی آیتیں اور تمھارے لیے ہدایت و رحمت ہیں۔ ہدایت اپنے آغاز کے اعتبار سے اور رحمت اپنے انجام کے لحاظ سے۔ لیکن یہ ان کے لیے نافع ہیں جو ایمان لائیں۔ 'لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' میں یہ لطیف تلمیح بھی مضمر ہے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اصل خرابی تمھارے اپنے دلوں کے اندر ہے کہ تم حقیقت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

قرآن سے مستفید ہونے کا طریقہ

'وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ الاية' اب یہ بتایا ہے کہ قرآن کی ہدایت و بصیرت سے مستفید ہونے کا طریقہ کیا ہے، فرمایا کہ جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموشی سے اس پر کان لگاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو رحمت الٰہی تمھاری طرف متوجہ ہو گی اور اس پر ایمان لانے کے لیے تمھارے دل کھلیں گے 'انصات' کے معنی خاموشی سے کسی کی بات سننے کے لیے کان لگانا ہے۔ اس میں کفار کے اس غلط رویہ کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے قرآن کے معاملہ میں اختیار کر رکھا تھا۔ سورہ فصلت میں ہے۔ 'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ ۲۶ فصلت' (اور کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن کو مت سنو اور جب سنایا جائے تو اس میں گھپلا ڈالو) فرمایا کہ یہ روش جہالت کی روش ہے جس کا نتیجہ رحمت سے محرومی ہے۔ صحیح روش اس کے بالکل برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو سنو اور شور و شغب کے بجائے خاموشی سے کان لگا کر سنو۔ یہ طریقہ اس رحمت سے مستفید ہونے کا ہے۔

اس آیت کو ہمارے فقہا کے ایک گروہ نے امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک دلیل کا بھی ماخذ بنایا

ہے۔ لیکن یہ آیت، جیسا کہ واضح ہے، اس سیاق و سباق کی آیت نہیں ہے اور اگر سیاق و سباق سے قطع نظر کر کے کوئی اس طرح کا استنباط آیت سے کرنا ہی چاہے تو بات ان لوگوں کے حق میں نہیں جاتی جو امام کے پیچھے یک قلم فاتحہ پڑھنے کے مخالف ہیں بلکہ ان لوگوں کے حق میں جاتی ہے جو جہری نمازوں میں تو فاتحہ پڑھنے سے روکتے ہیں لیکن سری میں نہیں روکتے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغٰفِلِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ (۲۰۵-۲۰۶)

خدا کو یاد کرنے کا طریقہ

'وَاذْكُرْ رَّبَّكَ الآية' اوپر خدا کی پناہ میں آنے کا طریقہ خدا کو یاد کرنا بتایا ہے۔ اب خدا کو یاد کرنے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ اس کے لیے تین باتیں ارشاد ہوئیں۔

ایک یہ کہ یہ فروتنی، مسکنت، لجاجت اور خوف کے ساتھ دل دل میں ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناز، تدلل اور احساس استحقاق و استکبار اس کے منافی ہے۔

دوسری یہ کہ اگر قول سے ذکر ہو تو دون الجہر ہو یعنی بہت زیادہ بلند آواز سے نہ ہو۔ اس بات کی وضاحت سورہ بنی اسرائیل میں یوں ہوئی ہے۔ 'وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا۔ بَنِيْ اِسْرَآءِيْل ۱۱۰' (اور اپنی دعا نہ بہت بلند آواز سے کرو، نہ بہت پست آواز سے، ان کے درمیان کی راہ اختیار کرو) یہ ہدایت مشرکین کے طریقہ سے بچانے کے لیے بھی ہوئی اور اس لیے بھی کہ ہمارا پروردگار سمیع و علیم ہے، نعوذ باللہ بہرا نہیں ہے۔ یاد ہوگا کہ ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زیادہ بلند آواز سے ذکر کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا تھا۔ علاوہ ازیں اس میں ریا، شہرت اور نمائش کا بھی زیادہ امکان ہے جو اخلاص کے بالکل منافی چیزیں ہیں۔

تیسری یہ کہ اللہ کی یاد ہر وقت رہنی چاہیے۔ 'بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ' کے الفاظ، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہوتے ہیں جس طرح ہم صبح و شام کے الفاظ بولتے ہیں اسی طرح عربی میں یہ الفاظ ہیں۔ 'وَلَا تَكُن مِّنَ الْغٰفِلِينَ' اسی مفہوم کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی خدا کی یاد سے کسی وقت بھی غفلت نہ ہو۔ جس طرح جسم کی زندگی کے لیے سانس کی آمد و شد ضروری ہے، اسی طرح روح کی زندگی کے لیے ذکر الٰہی ضروری ہے۔ شیطان ہر وقت حملہ کی گھات میں رہتا ہے، کسی وقت بھی اس کام سے غافل نہیں ہوتا اس وجہ سے اس سے پناہ حاصل کرنے کے لیے جو حرز ہے آدمی کو اس سے بھی کسی وقت غفلت نہیں ہونی چاہیے۔ اس ذکر کی شکلیں اور صورتیں حالات، ضروریات مقتضیات اور اوقات کی تبدیلی سے بدل بدل جاتی ہیں لیکن اس سے غفلت کسی وقت بھی جائز نہیں۔ انسان جہاں غافل ہوا شیطان کسی نہ کسی راہ سے حملہ آور ہو جائے گا —— اس امر کی یاددہانی کی یہاں ضرورت نہیں ہے کہ خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد ہے لیکن اس کی نوعیت وہی ہے جو اوپر آیت ۱۹۹ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔

'اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ الاٰیۃ' جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں، سے اشارہ فرشتوں کی طرف ہے۔ ان کے بابت فرمایا کہ وہ خدا کی بندگی سے کسی وقت سرتابی نہیں کرتے، برابر اس کی تسبیح میں لگے رہتے اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ آیت ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں برابر سرگرم رہنے والوں کے زمرہ کو بتاتی ہے کہ جو لوگ خدا کو ہر وقت یاد رکھتے ہیں گو وہ رہتے بستے زمین میں ہیں لیکن ان کا تعلق فرشتوں کی بزم قدس سے ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح وہ ہر وقت زمزمہ سنج تسبیح و تہلیل رہتے ہیں، یہ بھی اسی طرح مصروفِ یادِ الٰہی رہتے ہیں۔ دوسری طرف اس میں مشرکین پر تعریض بھی ہے کہ یہ تو فرشتوں ہی کی سفارش کے بل پر اکڑتے پھرتے ہیں، نہ خدا کو خاطر میں لاتے ہیں نہ رسول کو لیکن خود فرشتوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر وقت خدا کے آگے تسبیح و سجود میں لگے ہوئے ہیں۔

سورۂ اعراف کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو قلم بند ہوئیں۔ جو باتیں صحیح قلم سے نکلی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نکلی ہیں۔ جو غلط نکلی ہیں وہ میری کم علمی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ضرر سے مجھ کو اور اس کتاب کے پڑھنے والوں کو محفوظ رکھے۔ وَاٰخِرُ دَعۡوٰنَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔

لاہور

۲۱ر شعبان ۱۳۸۸ھ

۱۳ر نومبر ۱۹۶۸ء

تدبرِ قرآن

۸

الانفال

۱۔ سورہ کا عمود

سورۂ انفال دوسرے گروپ کی تیسری سورہ ہے۔ یہ مدنی ہے۔ اس میں مسلمانوں کو تقویٰ، باہمی اخوت و ہمدردی اور اللہ و رسول کی اطاعت کی اساس پر منظم اور جہاد کے لیے تیار ہونے کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ اس ملت ابراہیمیؑ اور مرکز ملت ابراہیمیؑ۔ بیت اللہ۔ کی امانت و تولیت کے اہل ہو سکیں جو اب قریش کی جگہ ان کی تحویل میں دی جانے والی ہے۔

پچھلی دونوں سورتوں۔ انعام اور اعراف۔ میں آپ نے دیکھا کہ قریش کو عقائد، اعمال اور اخلاق، ہر پہلو سے اس امانت کے لیے نااہل ثابت کر دیا ہے۔ اب اس سورہ میں مسلمانوں کی تطہیر و تنظیم، ان کی اصلاح اور تزکیہ کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ غزوۂ بدر کے دوران میں بعض کمزور مسلمانوں کی طرف سے جو کمزوریاں، اللہ و رسول کی اطاعت اور ایمان و توکل کے منافی، صادر ہوئی تھیں، ان پر پہلے گرفت فرمائی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو ان کمزوریوں سے پاک کریں۔ پھر ان غیبی تائیدات کی طرف اشارہ فرمایا جو غزوۂ بدر کے دوران میں ظاہر ہوئیں تاکہ مسلمانوں کا اعتماد اللہ پر مضبوط ہو اور جو لوگ ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے ہیں وہ یکسو ہو کر آگے کے مراحل کے تقاضے پورے کرنے کے اہل ہو سکیں۔ پھر مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد پر ابھارا ہے اور یہ وعدہ فرمایا ہے کہ اگر انھوں نے کمزوری نہ دکھائی تو جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ حریف کی سازشوں کے سارے تار و پود بکھر جائیں گے۔ بیچ بیچ میں قریش کو بھی تنبیہ فرمائی ہے کہ بدر کے واقعہ میں تمھارے لیے بڑا سبق ہے، تمھارے لیے اب بہتر یہی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ یاد رکھو کہ اگر تم نے مزید کوئی شرارت کی تو پھر منہ کی کھاؤ گے، اب تک تمھارے ساتھ جو رعایت ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ رسولؐ تمھارے اندر موجود تھا۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب تک رسولؐ قوم کے اندر موجود رہتا ہے اس وقت تک قوم پر عذاب نہیں آتا لیکن اب جب کہ رسول تمھارے اندر سے ہجرت کر چکا ہے، تمھاری امان اٹھ چکی ہے اور تم ہر وقت عذاب الٰہی کی زد میں ہو۔ تمھارا یہ غرہ بالکل بے جا ہے کہ تم بیت اللہ کے متولی اور مجاور ہو، بیت اللہ کے متولی ہونے کے اہل تم نہیں ہو،

تم نے ابراہیم کے بنائے ہوئے اس گھر کا مقصد بالکل برباد کرکے رکھ دیا بلکہ اس کی حرمت کو بٹہ لگایا، تم جس نماز اور عبادت کے مدعی ہو یہ نماز عبادت نہیں بلکہ محض مذاق ہے، تمہارے لیے سلامتی کی راہ یہ ہے کہ تم توبہ اور اصلاح کی روش اختیار کرو ورنہ یاد رکھو کہ اب اس حرم کی سرزمین پر نہ اہلِ ایمان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کا کوئی موقع باقی چھوڑا جائے گا اور نہ اللہ کے دین کے سوا یہاں کوئی اور دین باقی رہنے دیا جائے گا۔

آگے بدر کے واقعات ہی کی روشنی میں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور کفار کو تنبیہ کرتے ہوئے بات ان اعتراضات کے جواب تک پہنچ گئی ہے جو قریش نے بدر میں شکست کھانے کے بعد لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کے لیے اٹھائے۔ بدر سے پہلے تک تو وہ مسلمانوں کی کمزوری و مجبوری کو اسلام کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے لیکن بدر میں انہی کمزور مسلمانوں کے ہاتھوں جب پٹ گئے تو یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر کس طرح ہو سکتے ہیں، بھلا پیغمبر کا کہیں یہ کام ہوتا ہے کہ اپنی ہی قوم کو باہم لڑا دے۔ اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرائے، پھر ان کو قید کرے، ان سے فدیہ وصول کرے اور ان کا مال و اسباب غنیمت بنا کر کھائے اور کھلائے؟ اس اعتراض سے بھی کمزور قسم کے لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہو سکتے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کو بھی صاف کیا اور آخر میں انصار اور مہاجرین کو باہمی اخوت کی تعلیم و تلقین فرمائی کہ دونوں مل کر کفر کے مقابلہ میں بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہوں۔

اگرچہ سورہ کا نظام سمجھنے کے لیے یہ اجمالی نظر بھی کافی ہے لیکن ہم مزید وضاحت کے لیے سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) مالِ غنیمت کی تقسیم سے متعلق بعض کمزور قسم کے مسلمانوں کی طرف سے معترضانہ نوعیت کے سوال کا حوالہ اور اس کا اجمالی جواب۔ اس اعتراض کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو اس امر کی ہدایت کہ اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو، اپنے آپس کے تعلقات رشک و رقابت سے پاک رکھو، اللہ و رسول کی ہر مرحلے میں اطاعت کرو۔ سچے اور پکے اہلِ ایمان کی خصوصیات کا بالاجمال حوالہ اور ان کے لیے اللہ کے ہاں اجرِ عظیم کا وعدہ۔

(۵-۸) کمزور قسم کے مسلمانوں کی ایک اور کمزوری کی طرف اشارہ جو جنگِ بدر کے لیے نکلتے ہوئے ان سے صادر ہوئی کہ باوجودیکہ ان پر یہ بات واضح تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نکلنا قریش کی اس فوج سے مقابلہ کے لیے ہے جو تجارتی قافلہ کی حفاظت کا بہانہ بنا کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتی ہے لیکن وہ فوج کے مقابلہ سے ڈرتے رہے اور انھوں نے پورا زور اس بات پر لگایا کہ آنحضرت تجارتی قافلہ کا رخ کریں تاکہ بغیر کسی خطر کے لقمۂ تر ہاتھ آئے حالانکہ اللہ و رسول کا منشا یہ تھا کہ حق کا بول بالا ہو اور باطل کا زور ٹوٹے جو اسی صورت میں متصور تھا جب قریش کی عسکری قوت مجروح ہو نہ کہ ایک غیر مسلح تجارتی قافلہ۔

(۹-۱۴) مسلمانوں کی تقویت اور حوصلہ افزائی کے لیے ان غیبی تائیدات کا حوالہ جو بدر کے موقع پر ظاہر ہوئیں۔ مسلمانوں کی دعا کے جواب میں بروقت ہزار فرشتوں کی مدد کا وعدہ۔ برسرِ موقع میدان جنگ میں اطمینان کی نیند اور بارش کے نزول سے مساعد حالات کا ظہور۔ امدادی فرشتوں کو یہ ہدایت خداوندی کہ مسلمانوں کا حوصلہ بحال رکھو، کفار کو مرعوب کر دو اور ان کے پرخچے اڑا دو۔

(۱۵-۱۸) مذکورہ تائیدات غیبی کی روشنی میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ کفار سے جب مقابلہ ہو تو کبھی پیٹھ نہ دکھاؤ، منظم فوج کشی کی صورت میں پیٹھ دکھانے والے خدا کے غضب اور جہنم کے عذاب کے سزاوار ٹھہریں گے۔ مسلمان جب خدا کی راہ میں لڑتے ہیں تو صرف وہی نہیں لڑتے بلکہ ان کی طرف سے خدا بھی لڑتا ہے اور اہلِ ایمان کے لیے جوہر دکھانے کے مواقع فراہم کرتا ہے، بدر میں اس حقیقت کا مشاہدہ تم کر چکے ہو۔ اور یہ جو کچھ ہوا ہے اس پر بس نہ سمجھو، آئندہ اللہ ان کفار کی ساری چالیں بے کار کر دے گا۔

(۱۹) قریش کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برسرِ موقع تنبیہ کہ تم کہتے تھے کہ اس جنگ میں جس کو فتح حاصل ہوگی وہ برسرِ حق سمجھا جائے گا تو دیکھ لو فتح ظاہر ہو گئی۔ اب بہتر ہے کہ کسی مزید شرارت کی جرأت نہ کرو۔ اگر تم باز نہ آئے، پھر شرارت کی تو یاد رکھو ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں، ہم بھی اپنی شان پھر دکھائیں گے اور یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ تمہارے لاؤ لشکر کی کثرت کچھ کام نہ آئے گی، مسلمانوں کے پہلو پر ہم ہیں۔

(۲۰-۲۳) مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ پوری وفاداری کے ساتھ اللہ و رسول کی اطاعت کرو، رسول کی عین موجودگی میں اس سے انحراف نہ اختیار کرو۔ یہ روش ان یہود کی ہے جو کہتے تھے کہ ہم نے مانا لیکن مانتے نہیں تھے۔ اللہ کے نزدیک سب سے بدتر جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو سوچنے سمجھنے سے عاری ہیں۔ اللہ نے ان میں کوئی صلاحیت نہیں پائی۔ اس وجہ سے ان کو قبولِ حق سے محروم کر دیا۔ توفیقِ الٰہی انہی لوگوں پر کارگر ہوتی ہے جو اپنے اندر اثر پذیری اور قبولِ حق کی صلاحیت زندہ رکھتے ہیں۔

(۲۴-۲۶) مسلمانوں کو تنبیہ کہ رسول کی دعوت تمہارے لیے روح و قلب کی زندگی کی دعوت ہے تو اس دعوت کی قدر کرو اور اس پر لبیک کہو۔ اگر تم نے کمزوری دکھائی اور تذبذب کے شکار رہے تو یاد رکھو کہ آدمی اور اس کی قوتِ ارادی کے درمیان سنتِ الٰہی حائل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ خیر کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں جو خرابیاں کچھ مخصوص لوگوں کی طرف سے ظاہر ہوتی ہیں اگر دوسرے ان کی اصلاح کی کوشش نہ کریں تو ان کے برے نتائج کی لپیٹ میں اچھے برے سب آ جاتے ہیں۔ اسلام کے مستقبل کی طرف سے کسی تذبذب اور اندیشے میں مبتلا نہ ہو۔ تم اس ملک میں تھوڑے تھے۔ خدا نے تمہیں زیادہ کیا اور اپنی تائید و نصرت سے تمھیں نوازا۔ اسی خدا پر بھروسہ رکھو وہ آگے کے مراحل میں بھی تمہارا کارساز ہے۔

(۲۷-۲۹) کمزور قسم کے مسلمانوں کو تنبیہ کہ اللہ اور رسول سے عہدِ اطاعت و وفاداری کر چکنے کے بعد بے وفائی نہ کرو۔ مال و اولاد کی محبت اللہ و رسول کی محبت کے تقاضوں میں مانع نہ ہو۔ یہ چیزیں فتنہ ہیں۔ ان

فتنوں میں پڑ کر اس اجرِ عظیم کو ضائع نہ کرو جو اللہ کے پاس اس کے وفادار بندوں کے لیے محفوظ ہے۔ جو لوگ محبت دنیا کو اپنے اوپر غالب نہ ہونے دیں گے اللہ ان کے آگے سے باطل کے تمام حجابات چاک کر دے گا اور ان کو اپنی مغفرت سے نوازے گا۔

(۳۰-۳۷) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ان تائیدات ربانی کی یاد دہانی جو قریش کی مسلسل سازشوں کے مقابل میں ظاہر ہوئیں اور جن سے ان کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے، ان کی ساری چالیں شکست کھا گئیں اور خدا کی تدبیر غالب رہی۔ وہ قرآن کو اگلوں کا فسانہ کہتے تھے لیکن اس کا انذار ان کے لیے واقعہ ثابت ہوا۔ وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر تم پیغمبر برحق ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسیں یا کوئی اور عذاب آئے تو ہم مانیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے ان پر عذاب نہیں بھیجا کہ تم ان کے اندر موجود تھے لیکن اب جب کہ تم ان کے اندر سے نکل چکے ہو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ عذاب سے محفوظ رہیں۔ وہ اپنے آپ کو مسجد حرام کا متولی سمجھتے ہیں لیکن وہ اس کے متولی کہاں سے ہوئے؛ اس کے متولی تو صرف خدا سے ڈرنے والے بندے ہی ہو سکتے ہیں۔ ان مدعیوں کو اللہ کے اس گھر کی اصل تاریخ اور اس کے مقاصد تعمیر کا کوئی علم نہیں، تالی پیٹنا اور سیٹی بجانا ان کی نماز ہے، بھلا اس مسخرا پن کو نماز ابراہیمی سے کیا علاقہ؛ یہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنے اور اسلام کو شکست دینے کے لیے بڑی دلبری سے جو اپنے مال خرچ کر رہے ہیں اس کا کچھ حاصل نہیں۔ یہ سارا خرچ ان کے لیے موجب حسرت و اندوہ بنے گا۔ اب ان کے آگے صرف جہنم ہے۔ خدا اس سارے ذخیرۂ خبیث کو اکٹھا کر کے دوزخ کی آگ میں جھونک دے گا۔

(۳۸-۴۰) کفار قریش کو تنبیہ کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز آ جائیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے اگر انھوں نے اپنے رویے کی اصلاح کر لی تو ان کی پچھلی غلطیاں معاف کر دی جائیں گی اور اگر وہ باز نہ آئے تو یاد رکھیں کہ ان کا بھی وہی حشر ہونا ہے جو ان سے پہلے انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کا ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ کمزور مسلمانوں پر ان کے جبر و ظلم کا خاتمہ ہو جائے اور اس سرزمین پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہ جائے۔ اگر یہ باز آ گئے تو ان کے لیے بہتر ہے، اگر باز نہ آئے تو خدا تمھارا مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

(۴۱-۴۴) مال غنیمت کی تقسیم سے متعلق سوال مذکورہ آیت ۱ کا تفصیلی جواب اور مسلمانوں کو یہ تنبیہ کہ اس تقسیم کو خوش دلی سے قبول کریں۔ اللہ و رسول کے فیصلہ پر راضی رہنا ہی سچے ایمان کی علامت اور اس کا تقاضا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ بدر کے دن تمھیں جو کامیابی حاصل ہوئی یہ تمھاری اپنی تدبیر اور تمھارے اپنے تدبر کا کرشمہ نہیں تھی بلکہ یہ ساری اسکیم اللہ کی بنائی ہوئی تھی۔ یہ اسی کی کارسازی تھی اور اس نے ٹھیک اس وقت تمھاری فوج کو اس وادی کے ایک سرے پر پہنچا دیا جس کے دوسرے سرے پر دشمن کی فوجیں پہنچ چکی تھیں

اگر تم ایک دوسرے کو الٹی میٹم دے کر نکلتے تو تمہارا یہ عین وقت پر دشمن کے مقابلہ کے لیے پہنچ جانا ممکن نہ تھا۔ یہ اللہ کی اسکیم تھی جو پوری ہوئی۔ اس نے یہ چاہا کہ تمہارے اور قریش کے درمیان ایک ایسا معرکہ ہو جائے جو حق و باطل کے درمیان ایک امتیاز پیدا کر دے تاکہ اس کے بعد جو کفر پر جمے رہنا چاہیں ان پر حجت قائم ہو جائے اور جو اسلام کو اختیار کریں ان کو ایک روشن دلیل مل جائے۔ یہی رمز تھا کہ خدا نے کفار کی فوج کو پیغمبر کی رویا میں کم دکھایا تاکہ مسلمانوں میں ہراس نہ پیدا ہو اور وہ ان سے ٹکر لینے کے لیے پُر حوصلہ رہیں اور پھر یہی رمز تھا کہ جب تمہاری اور ان کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو تمہاری نگاہوں میں خدا نے ان کو حقیر دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تم کو کم دکھایا تاکہ ٹکر لینے سے کوئی بھی نہ جھجکے اور وہ معرکہ واقع ہو ہی جائے جو حق و باطل کے درمیان ایک فرق بن کر نمایاں ہو۔ یاد رکھو کہ سارے معاملات کا سررشتہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔

(۴۵-۴۶) مسلمانوں کو آئندہ کے لیے نصیحت کہ بدر کی اس جنگ میں تم نے دیکھ لیا کہ اصل کارساز خدا ہے تو جب کفار کے کسی گروہ سے تمہاری ٹکر ہو جائے تو پورے جماؤ اور پوری ثابت قدمی سے لڑو اور اپنے مرجع حقیقی خدا کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو۔ یہی فلاح کا راستہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی پوری اطاعت کرو، کسی امر میں اختلاف نہ کرو ورنہ ہزیمت اٹھاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ دوسری چیز جو اطاعت کے ساتھ مطلوب ہے وہ ثابت قدمی اور پامردی ہے۔ خدا انہی کے ساتھ ہوتا ہے جو اس کی راہ میں ثابت قدمی دکھاتے ہیں۔

(۴۷-۴۹) ان کفار کی روش سے بچتے رہنے کی ہدایت جو اکڑتے، اتراتے اور اپنے کر و فر کی نمائش کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں اترے تھے اور مقصود جن کا لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا تھا، ان لوگوں کو پتہ نہیں کہ خدا کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی، سب کا زور و زر اور سب کا کر و فر اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ان لوگوں کو شیطان نے پٹی پڑھائی تھی کہ آج تمہارا کوئی مدمقابل نہیں اور میں تمہارا ساتھی ہوں لیکن جب اس نے میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھا تو اپنی روایت کے مطابق دُم دبا کر بھاگا کہ میں تو اللہ رب العلمین سے ڈرتا ہوں (یہاں ایک لطیف تعریض یہود کی طرف بھی ہے، تفسیر میں اس کی وضاحت آگے آئے گی) منافقین اور حاسدوں کے اس طعنہ کا جواب جو وہ مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کے لیے دیتے تھے کہ ان کو ان کے دین کے غرّے نے نتائج و عواقب سے بے پروا کر دیا ہے، یہ ہاتھیوں سے گنے کھانے چلے ہیں۔ ان منافقین کو پتا نہیں تھا کہ خدا کا بھروسہ بڑی چیز ہے، خدا عزیز و حکیم ہے۔

(۵۰-۵۴) قریش کو تہدید کہ یہ بدر میں جو کچھ پیش آیا ہے یہ تو محض نقد عاجل ہے، مرنے کے بعد جو کچھ تمہارے سامنے آنے والا ہے وہ بڑی ہی سخت چیز ہے اور یہ جو کچھ ہوا ہے یا جو کچھ ہو گا یہ تم پر کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ تمہارے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اپنے

رویے کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنا رویہ نہ بدل لے۔ تم سے پہلے قوم فرعون اور دوسری قوموں کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ نے یہی معاملہ کیا۔ جب انھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی خدا نے ان کو تنبیہ کی۔ پھر جب اس تنبیہ کے بعد بھی وہ سرکشی سے باز نہ آئے تو خدا نے ان کو اپنے عذاب میں دھر لیا اور وہ فنا کر دیے گئے۔ اسی طرح بدر کا واقعہ تمھارے لیے ایک تنبیہ ہے۔ اگر اس سے تم نے سبق نہ لیا تو تمھارے سامنے بھی وہی انجام آجائے گا جو فرعون اور اس کی قوم کے سامنے آیا۔

(۵۵-۶۲) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ جن گروہوں نے تم سے معاہدہ کر رکھا ہے لیکن وہ اس کا احترام نہیں کر رہے ہیں بلکہ جب کوئی موقع ان کو ہاتھ آجاتا ہے معاہدے کو توڑ دیتے ہیں، ان کے ساتھ ذرا رعایت نہ کرو۔ اگر کسی جنگ میں وہ تمھارے مقابل میں آئیں تو ان کو ایسا سبق دو کہ جو اُن کی پشت پناہی کر رہے ہیں اُن کے بھی ہوش درست ہو جائیں۔ یہ لوگ تمھارے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے مقدور بھر اپنی فوجی قوت بڑھائیں تاکہ اللہ کے اور اپنے ان دشمنوں کو مرعوب رکھ سکیں جن میں سے بعض ظاہر ہیں اور بعض ابھی پس پردہ ہیں۔ مسلمان اس مقصد کے لیے جو بھی خرچ کریں گے خدا کے ہاں سب پورا کر دیا جائے گا، کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ہاں اگر یہ صلح کے خواہشمند ہوں تو تم بھی صلح سے گریز نہ کرو۔ اللہ پر بھروسا کر کے ان سے صلح کر لو۔ اگر اس مصالحت سے ان کا مقصد تم کو دھوکا دینا ہو تو تمھارے لیے وہ اللہ کافی ہے جس نے اپنی تائید خاص اور مسلمانوں کے ذریعے سے تمھاری مدد فرمائی۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہوا ہے کہ اس نے اہل ایمان کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا ہے ورنہ یہ کام تو دنیا جہان کی دولت بھی تم لٹا دیتے جب بھی ہونا ممکن نہیں تھا۔

(۶۳-۶۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دہانی کہ تم اپنے ساتھیوں کی افرادی قوت کی کمی سے کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہو، تمھارے لیے اللہ اور مومنین کی یہی مختصر سی جماعت کافی ہے۔ تم انھی مسلمانوں کو جہاد پر ابھارو۔ تمھارے بیس ثابت قدم جانباز کفار کے دو سو آدمیوں پر بھاری رہیں گے اور تمھارے سو مجاہد حریف کے ایک ہزار کے لشکر کو شکست دیں گے۔ جنگ، عزم و ایمان سے لڑی جاتی ہے۔ ان ناسمجھ کفار کے اندر یہ جوہر کہاں!

(۶۶) ایک آیت تخفیف جو بعد میں اس زمانہ میں نازل ہوئی جب لوگ اسلام کے اندر فوج در فوج داخل ہونے لگے۔ چونکہ ان مسلمانوں کے اندر وہ پختہ کاری نہیں تھی جو سابقون الاولون کے اندر تھی۔ اس وجہ سے وہ عددی نسبت گھٹا دی گئی جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی۔ اب نسبت صرف ایک اور دو کی رہ گئی۔ وضاحت آیت کی تفسیر کے تحت آئے گی۔

(۶۷-۶۹) کفار کے اس طعنہ کا جواب جو بدر میں شکست کھانے کے بعد انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کہ بھلا یہ پیغمبر کس طرح ہو سکتے ہیں، پیغمبر کا کہیں یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی قوم سے جنگ کرے، اس کا

خون بہائے، اس کے اندر سے قیدی پکڑے، ان سے فدیہ وصول کرے، اور قوم کے مال کو مالِ غنیمت قرار دے کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کرے اور کھائے کھلائے؟ اس طعنہ سے ان کا مقصود بدر میں مسلمانوں کی فتح کے ان اثرات کو مٹانا تھا جو قدرتی طور پر عام لوگوں کے دلوں پر پڑتے نظر آئے۔ چونکہ قریش کے لیڈروں نے خود اس جنگ کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنا دیا تھا، اس وجہ سے انھیں بدر میں منہ کی کھانے کے بعد اپنے پروپیگنڈے کا رخ بدل دینا پڑا۔ اب انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اقتدار اور حکومت کے خواہاں ہیں۔ اور اس مقصد کی خاطر انھوں نے اپنی ہی قوم کو آپس میں ٹکرا دیا ہے جو ایک پیغمبر کا کام کبھی نہیں ہوتا۔ قرآن نے ان کو یہ جواب دیا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے پیغمبر کی وجہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے باعث تم خود ہوئے ہو۔ دنیا کے طالب تم ہو، اللہ و رسول دنیا کے طالب نہیں ہیں۔ تم نے اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کی سازش کر کے جو اقدام کیا تھا وہ ایسا سنگین مجرمانہ اقدام تھا کہ حق تھا کہ تم پر خدا کی طرف سے عذاب عظیم آ جاتا جو تمہارا فیصلہ ہی کر دیتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لیے جو مہلت لکھ رکھی ہے وہ تم کو ملی اور تم عذاب سے تباہ کر دیے جانے کے بجائے صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیے گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو خطاب کر کے ان کو اطمینان دلایا کہ یہ تمہارے مالِ غنیمت پر جو اعتراض کر رہے ہیں تم اس کی کوئی پروا نہ کرو۔ اس کو کھاؤ برتو، یہ تمہارے لیے حلال طیب ہے۔

(۷۰) اسی سلسلہ میں بدر کے قیدیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے یہ کہلوایا کہ اگر اللہ نے ان کے دلوں میں کوئی بھلائی پائی، انھوں نے اس احسان کی قدر کی کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تو ان کے لیے مزید بھلائی کی راہیں کھلیں گی۔ اور اگر انھوں نے بے وفائی اور بدعہدی کی اور پھر خدا سے لڑنے کے لیے نکلے تو یاد رکھیں کہ خدا ان پر پھر تم کو اسی طرح قابو دے دے گا جس طرح اس نے بدر میں ان کو تمہارے قابو میں دے دیا۔

(۷۱ - ۷۵) مہاجرین اور انصار کے درمیان اخوت کی تاسیس۔ اس اخوت میں وہ تمام مسلمان شریک ہیں جو کفر کے علاقوں سے ہجرت کر کے اس میں آ شامل ہوں۔ جو مسلمان ہجرت نہ کریں، دارالاسلام کے مسلمانوں پر ان کی نصرت و حمایت کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اگر اپنے دین و ایمان کے تحفظ کے لیے وہ کسی مدد کے طالب ہوں تو ان کی مدد کی جائے بشرطیکہ یہ مدد مسلمانوں کے کسی معاہد گروہ کے خلاف یا اس کے مقابل میں نہ ہو۔ اب حقوق و فرائض اور حمایت و نصرت کی ذمہ داری ایمان و ہجرت کی بنیاد پر ہو گی۔ پچھلے خاندانی اور قبائلی تعلقات کی بنیاد پر نہیں ہو گی۔ البتہ مسلمانوں کے آپس کے حقوق کی بنیاد انہی رحمی رشتوں کے تحت ہو گی جو اللہ کی کتاب میں بیان ہوئے ہیں۔

سُورَةُ الْاَنْفَالِ (۸)

مَدَنِيَّةٌ ——————— اٰيَاتُهَا ۷۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴ كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّاۗىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ

يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ⑧

ترجمۂ آیات ۱-۸

وہ تم سے غنیمتوں کے بابت سوال کرتے ہیں، ان کو بتا دو کہ غنیمتیں اللہ اور رسول کے لیے ہیں، پس اللہ سے ڈرتے رہو، اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم سچے مومن ہو۔ مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھیں۔ جو نماز کا اہتمام کریں اور اس مال میں سے، جو ہم نے ان کو بخشا ہے، خرچ کریں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ ۱-۴

اسی طرح کی بات اس وقت ظاہر ہوئی جب تمہارے رب نے ایک مقصد کے ساتھ تم کو گھر سے نکلنے کا حکم دیا اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو یہ بات ناگوار تھی۔ وہ تم سے امر حق میں جھگڑتے رہے باوجودیکہ حق ان پر اچھی طرح واضح تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ یاد کرو جب کہ اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمہارا لقمہ بنے گا اور تم یہ چاہ رہے تھے کہ غیر مسلح گروہ تمہارا لقمہ بنے اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے کلمات سے حق کا بول بالا کرے اور کافروں کی جڑ کاٹے تاکہ مجرموں کے علی الرغم وہ حق کو پایرجا اور باطل کو نابود کرے۔ ۵-۸

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا

اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗٓ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۱)

لفظ انفال کی تحقیق

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ۔

انفال، نفل کی جمع ہے، اس کے معنی اضافہ اور زیادتی کے ہیں۔ جو چیز کسی کو اس کے حق سے زیادہ دی جائے تو جتنی حق سے زیادہ دی گئی وہ نفل ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے حق واجب سے زیادہ ادا کیا تو اس حصہ مزید کو 'نفل' کہیں گے۔ یہاں انفال سے اس مالِ غنیمت کو تعبیر کیا گیا ہے جو راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کو مفتوح دشمن سے میدان جنگ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس تعبیر میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے دشمن سے جو مال غنیمت حاصل کرتے ہیں اس کی حیثیت ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نفل مزید اور انعام مزید کی ہے اس لیے کہ جہاد کا جو اجر ہے وہ اس سے بالکل الگ مستقلاً اللہ کے ہاں دائمی اور بے پایاں اجر کی شکل میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

غنیمت سے متعلق سوال کی نوعیت

سوال، جیسا کہ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، بعض اوقات اعتراض کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے، خواہ وہ الفاظ سے ظاہر ہو یا اس کے اندر مضمر ہو۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اسی نوعیت کے سوال کا حوالہ ہے۔ یہ سوال، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، غزوۂ بدر میں حاصل شدہ مال غنیمت سے متعلق ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کو کفار سے نہ تو کوئی منظم جنگ پیش آئی تھی نہ مال غنیمت اور اس کی تقسیم کا سوال پیدا ہوا تھا۔ ۲ھ میں یہ جنگ پیش آئی جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح بھی شاندار عطا فرمائی اور مال غنیمت بھی ان کو کافی مقدار میں حاصل ہوا۔ جاہلیت میں تو دستور یہ تھا کہ جو جتنا مال جنگ میں لوٹے وہ اس کا حقدار ہے۔ اسی دستور کی بنا پر بعض لوگوں نے، خاص طور پر کمزور قسم کے مسلمانوں نے ایسے سوالات اٹھائے جن سے یہ بات نمایاں ہوئی کہ تقویٰ، باہمی خیر خواہی، اطاعت اللہ و رسول کی وہ روح جو سچے ایمان کا تقاضا ہے ابھی ایک گروہ کے اندر اچھی طرح پختہ نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ سوال، جیسا کہ قرآن سے واضح ہے، کچھ خاص افراد ہی کی طرف سے اٹھایا گیا لیکن اسلامی معاشرہ کے اندر اس سے ایک بڑی خامی کی نشان دہی ہوئی تھی اس وجہ سے قرآن نے مسلمانوں کی تطہیر و تنظیم کی اس سورہ کا آغاز اسی واقعہ سے کیا کہ

سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل   چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

اور اس کا ذکر بھی عام صیغہ سے کیا تاکہ کسی خاص گروہ کی پردہ دری نہ ہو بلکہ تمام مسلمان بحیثیت مجموعی اس تعلیم کو قبول کریں اور اپنے اندر کسی ایسے رجحان کو نشو و نما نہ پانے دیں جو تقویٰ و توکل، باہمی ہمدردی اور اطاعت اللہ و رسول کے خلاف ہو۔

جس قسم کے سوال کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل تاریخ و سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ ابن ہشام میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے فارغ ہونے کے بعد حکم دیا کہ فوج

کے لوگوں نے جتنا مالِ غنیمت جمع کیا ہے سب اکٹھا کیا جائے چنانچہ وہ سب اکٹھا کیا گیا۔ اب لوگوں میں اختلاف ہوا کہ یہ کس کا حق ہے؟ جن لوگوں نے جمع کیا تھا وہ مدعی ہوئے کہ یہ ہمارا حق ہے، اگر ہم نہ ہوتے تو یہ مال حاصل نہ ہوتا، ہم نے دشمن کو مار بھگایا اس وجہ سے یہ ہاتھ لگا۔ اسی طرح جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر تھے انھوں نے کہا کہ ہم بھی سب کچھ کر سکتے تھے، لڑ بھی سکتے تھے، غنیمت بھی جمع کر سکتے تھے لیکن ہم نے رسول اللہ کی حفاظت کے کام کو دوسرے تمام کاموں پر مقدم رکھا اس وجہ سے مالِ غنیمت میں دوسرے لوگ ہم سے زیادہ حق دار نہیں ہو سکتے۔ غرض مختلف سوالات اٹھ کھڑے ہوئے جن سے لوگوں کے اندر دبی ہوئی بعض کمزوریاں سامنے آگئیں اور حکمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ ان کمزوریوں کا بر سر موقع علاج ہو جائے تاکہ یہ مزید بڑھنے نہ پائیں۔

سوالات کا اصولی جواب

قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ یہ ان تمام سوالات کا جامع اور اصولی جواب ہے کہ ان کو بتا دو کہ اموالِ غنیمت اللہ اور رسول کی ملک ہیں۔ 'اللہ و رسول کی ملک'، قرآن میں اجتماعی ملکیت کی تعبیر ہے۔ اس اصولی جواب نے اموالِ غنیمت کے باب میں اس جاہلی دستور کا خاتمہ کر دیا جو اب تک رہا تھا اور جس کی بنا پر ہی وہ سوالات پیدا ہوئے تھے جو اوپر مذکور ہوئے۔ گویا اموالِ غنیمت میں استحقاق کی بنیاد یہ نہیں ہوگی کہ کس نے جمع کیا، کس نے بالفعل جنگ کی، کس نے پہرہ دیا بلکہ اس میں سب مجاہدین، بلالحاظ اس کے کہ کس کی خدمت کی نوعیت کیا رہی ہے، شریک ہوں گے اور دوسرے مسلمانوں کا بھی اس پر حصہ ہوگا۔ یہاں یہی اصولی جواب دے کر کلام کا رخ ان خامیوں کی اصلاح کی طرف مڑ گیا ہے جو اس واقعہ سے نمایاں ہوئی تھیں۔ پھر آگے چل کر آیت ۴۱ میں اس اجمال کی تفصیل بھی فرما دی کہ اس کا کتنا حصہ مجاہدین پر تقسیم ہوگا اور کتنا حصہ دوسرے مسلمانوں کے حق کی حیثیت سے بیت المال میں جمع ہوگا۔

مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کی بنیاد

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ۔ جس طرح تقویٰ اور پاس رحم کو سورۂ نساء میں تمام خاندانی و معاشرتی صلاح و فلاح کی اساس ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح یہاں تقویٰ اور اصلاح ذات البین کو مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اموالِ غنیمت اصلاً اللہ اور رسول کی ملکیت ہیں تو اللہ و رسول جس طرح ان کو تقسیم کریں پوری خوش دلی اور رضامندی سے اس تقسیم کو قبول کرو۔ نہ اللہ کے حکم سے متعلق دل میں کوئی بدگمانی یا رنجش پیدا ہو اور نہ اپنے دینی بھائیوں کے خلاف کوئی رشک و حسد کا جذبہ ابھرے کہ فلاں اور فلاں کو اس مال میں کیوں شریک بنا دیا گیا؟ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کے باہمی تعلقات کی بنیاد اخوت، رحم اور محبت پر ہے۔ یہ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا گروہ ہے، ان کے اندر حسد رقابت، خود غرضی اور نفسا نفسی کی حالت اس ایمان اور تقویٰ کے منافی ہے جس کو انھوں نے اختیار کیا ہے۔ جن کے اندر ابھی کوئی کانٹا اپنے دینی بھائیوں کے خلاف موجود ہے وہ اس کو نکال ڈالیں اور اپنے دامنِ دل کو ہر قسم کے غبار سے پاک و صاف کر لیں۔

فَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗۤ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۔ یہ ایمان باللہ کا اصل تقاضا بیان ہوا کہ جو لوگ اللہ و رسول پر ایمان کے مدعی ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ اللہ و رسول کے ہر حکم کی اطاعت کریں۔ یہ بات ایمان کے منافی ہے کہ اللہ و رسول کا کوئی حکم اپنی خواہشات نفس کے خلاف ہو تو اس کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرے یا اس سے متعلق دل میں کوئی رنجش یا بدگمانی جگہ پائے۔ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ ایمان کی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جنھوں نے ایمان کی یہ حقیقت نہیں سمجھی ہے ان کا دعوائے ایمان بالکل بے حقیقت ہے۔

ایمان باللہ کا لازمی تقاضا

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُہُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْہِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْہُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰہُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَہُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝ (۲-۴)

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ .... اب یہ حقیقی ایمان اور سچے اہلِ ایمان کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں۔ گویا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کے الفاظ میں جن کمزور قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ تھا ان کے سامنے سچے اہلِ ایمان کی تصویر رکھ دی گئی کہ اگر ایمان کا دعویٰ ہے تو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرو۔ ان صفات کے بدون یہ دعویٰ کسی کو زیب نہیں دیتا۔

سچے اہلِ ایمان کے اوصاف

اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُہُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْہِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْہُمْ اِیْمَانًا ۔ ان کی پہلی علامت یہ بتائی کہ ان کے اندر خدا کی عظمت و کبریائی اور اس کی جلالت کا شعور ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ خدا سے برابر ڈرتے رہتے ہیں۔ جب ان کے سامنے خدا کا نام آجائے، جب ان کو اس کی یاددہانی کی جائے، جب ان کے سامنے کوئی بات خدا کی بات کی حیثیت سے پیش کی جائے، وہ اس کو خوف و خشیت کے گہرے احساس کے ساتھ سنتے ہیں۔ گویا ایمان کا پہلا تقاضا خدا کا خوف ہے جو اس کی عظمت و جلالت اور اس کی صفات عدل و حکمت و ربوبیت و رحمت کے صحیح تصور سے پیدا ہوتا ہے اور اسی سے وہ تقویٰ وجود میں آتا ہے جس کی اوپر وَاتَّقُوا اللّٰہَ کے الفاظ سے ہدایت فرمائی گئی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خدا کی رحمت و ربوبیت بھی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، خدا کے عدل اور اس کے روزِ جزا کو مستلزم ہیں، اس وجہ سے ان صفات کا صحیح تصور بھی بندے کو خدا سے بے خوف نہیں بناتا بلکہ اس کے خوف کو بڑھاتا ہے اور اس خوف کی بنیاد خدا کی محبت پر ہوتی ہے۔

ایمان کی پہلی علامت

دوسری علامت یہ بتائی کہ جب اللہ کی آیات ان کو سنائی جاتی ہیں یہ ان کے ایمان کو بڑھاتی ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں آیات سے مراد خدا کے احکام اور اس کے قوانین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا پر ایمان کے بعد ان کو سب سے زیادہ مرغوب و مطلوب خدا کی پسند و ناپسند اور اس کی مرضیات و احکام کا علم ہوتا ہے اور یہ علم ان کی دولتِ ایمان میں اضافہ کرتا ہے۔ ایمان کی مثال جڑ کی ہے اور آداب و احکام

ایمان کی دوسری علامت

اور قوانین و شرائع کی حیثیت اس جڑ سے پھوٹی ہوئی شاخوں اور ان سے ظہور میں آئے ہوئے برگ و بار کی۔ گویا پوری شریعت، ایمان ہی کا مظہر اور اسی کے مضمرات کی تفصیل ہوئی۔

'زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اندر ایمان موجود ہوتا ہے جب ان کے سامنے ایمان کے مقتضیات و مطالبات آتے ہیں تو وہ پوری بشاشت سے ان کا خیرمقدم کرتے ہیں۔ وہ ان مقتضیات و مطالبات کو اپنے ہی لگائے ہوئے درخت کا پھل اور اپنی ہی بوئی ہوئی کھیتی کا حاصل سمجھتے ہیں اور جس طرح ہر کسان اپنی کھیتی کے حاصل اور اپنے درخت کے پھلوں میں افزونی دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے اسی طرح یہ اہلِ ایمان بھی اپنے ایمان کی یہ افزائش دیکھ کر شاد ماں ہوتے ہیں۔ یہ گویا ان مدعیانِ ایمان پر ایک لطیف تعریض ہوئی جو ایمان کا دعوے کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن جب اس کے مطالبے سامنے آئے تو ان سے خوش ہونے کی بجائے ان کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے کہ یہ کیا بلا نازل ہو گئی۔

ایک نکتہ

یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ ایمان کے اقرار کے بعد اس کے مطالبات میں سے بڑا یا چھوٹا جو مطالبہ بھی اہلِ ایمان کے سامنے آتا ہے وہ ان کے لیے آزمائش و امتحان کا ایک میدان کھولتا ہے اور جو سچے اہلِ ایمان ہوتے ہیں وہ اس امتحان سے گھبرانے کی بجائے اس میں بازی جیتنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کوشش ان کی مومنانہ غیرت کا ایک فطری تقاضا ہوتی ہے۔ جس کے بروئے کار آنے سے ان کے لیے ہر امتحان فتح مندی کا ایک نیا دروازہ کھولتا ہے جس سے ان کا ایمان قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ احزاب میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۲۲- احزاب (اور جب مومنوں نے پارٹیوں کے ہجوم کو دیکھا تو بولے، یہ تو وہی صورتِ حال سامنے آئی ہے جس سے اللہ اور رسول نے پہلے ہی ہمیں خبردار کر دیا تھا، اور اس چیز نے ان کے ایمان و اطاعت میں اضافہ ہی کیا)

ایمان کی تیسری علامت

'وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ' یہ ان کی تیسری علامت بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے یعنی ایمان کے مطالبے، خواہ سخت ہوں یا نرم، ان سے دنیوی مفادات کو نقصان پہنچے یا نفع، ان کی خاطر تعلقات ٹوٹیں یا جڑیں وہ بہر حال دین و دنیا کی فلاح اپنے رب کے احکام کی تعمیل ہی میں سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایمان کی راہ میں انھیں اپنے سر بھی کٹوانے پڑ جاتے ہیں تو وہ یہی یقین رکھتے ہیں کہ حیاتِ جاوداں کے حصول کی راہ یہی ہے۔ ان کو اپنے رب پر پورا بھروسہ ہوتا ہے کہ اس نے جو حکم بھی ان کو دیا ہے اور جس آزمائش میں بھی ان کو ڈالا ہے اس میں سرتاسر انہی کی فلاح ہے۔ اپنے بندوں کے ساتھ خدا کا کوئی معاملہ بھی حکمت و مصلحت اور رحمت و برکت سے خالی نہیں۔ اس مکڑے میں بھی ان

خام کاروں پر تعریض ہے جو دین کے مطالبات کو اپنے مفادات کی میزان میں تولنے کے خواہش مند تھے اور وہ باتیں ان کو بالکل بے مصلحت نظر آتی تھیں جن کو وہ اپنی خواہشات کے خلاف پاتے تھے۔

ایمان کی چوتھی علامت۔

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ یہ چوتھی علامت بیان ہوئی اور اس کی حیثیت، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، راس الصفات کی ہے اس لیے کہ انہی دو چیزوں۔ اہتمام نماز اور انفاق۔ سے ان تمام اوصاف کی شیرازہ بندی ہوتی ہے جن سے ایمان اہل ایمان کو سنوارتا ہے۔ گویا اوپر ان چند خاص اوصاف کو بیان کرنے کے بعد جن کا بیان کرنا پیش نظر گروہ کی خامیوں کی اصلاح کے لیے ضروری ہوا، آخر میں ان دو چیزوں کا ذکر فرمایا جو سب کی جامع بھی ہیں اور سب کی محافظ بھی۔

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ یعنی جن کے اندر یہ اوصاف ہیں سچے مومن وہی ہیں، رہے وہ لوگ جو اہل ایمان کی صفوں میں آ تو گھسے ہیں لیکن ان اوصاف سے عاری ہیں، وہ محض مدعی ایمان ہیں سچے مومن نہیں ہیں۔ گویا اوپر اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کے الفاظ میں جو بات اشارۃً فرمائی گئی تھی اب وہ پوری طرح واضح ہو کر سامنے آگئی۔

لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے ہاں جو درجے اور مرتبے ہیں وہ ہر مدعی ایمان کے لیے نہیں ہیں بلکہ انہی لوگوں کے لیے ہیں جو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سیاق میں 'مغفرۃ' کا لفظ بڑا بلیغ اور بشارت انگیز ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر چند مطلوب و مطبوع تو یہی اوصاف ہیں اور مراتب انہی کے اعتبار سے قائم ہوں گے لیکن اللہ رحیم و کریم ہے، وہ اپنے بندوں کی کمزوریوں سے بھی واقف ہے اس وجہ سے ان غلطیوں اور کوتاہیوں کے لیے اس کی مغفرت کا دامن بھی ہے جو انسان کی بشریت کے لوازم میں سے ہیں۔

'رزق' کا لفظ، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں ایک جامع لفظ ہے اور کریم کی صفت اس کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اگرچہ بندوں کو سارا رزق و فضل رب کی عنایت ہی سے ملے گا لیکن اس کے ساتھ بندوں کے لیے عزت کی یہ سرفرازی بھی ہوگی کہ یہ سب کچھ ان کے حق کی حیثیت سے ان کو عطا ہوگا۔

ایمان کے گھٹنے اور بڑھنے کی نوعیت

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ایمان کوئی ٹھونٹھ درخت نہیں ہے بلکہ یہ جڑ بھی رکھتا ہے اور شاخیں اور برگ و بار بھی۔ قرآن میں اس کی تمثیل یوں بیان ہوئی ہے کہ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے جس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی ہوں اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ یہ جس طرح عقائد پر مبنی ہے اسی طرح احکام و شرائع پر بھی مشتمل ہے اور جس طرح ایک شاداب درخت اپنی جڑوں سے بھی غذا حاصل کرتا ہے اور اپنی شاخوں اور پتوں سے بھی، اسی طرح یہ عقائد کی معرفت اور اعمال کی بجا آوری دونوں سے غذا اور قوت

حاصل کرتا ہے۔ اگر عقائد میں کھوکھلا پن پیدا ہو جائے جب بھی یہ سوکھ جاتا ہے اور اگر اس کی شاخوں کو کوئی روگ لگ جائے جب بھی یہ مضمحل ہو جاتا ہے۔ اس کے صحیح نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جڑ اور اس کی شاخوں دونوں کی دیکھ بھال ہوتی رہے۔ اس دیکھ بھال سے یہ بڑھتا، پھیلتا اور پھلتا پھولتا ہے اور اس کے مفقود ہو جانے سے وہ گھٹتا، سکڑتا اور مردہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن و حدیث دونوں سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ ہمارے فقہاء اور متکلمین میں سے جن لوگوں نے ایمان کے گھٹنے بڑھنے سے انکار کیا ہے ان کی بات کا کوئی صحیح محل اگر ہو سکتا ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو قانونی ایمان سے متعلق مانا جائے۔ قانون چونکہ صرف ظاہری حالات سے تعلق رکھتا ہے، باطن اس کی دسترس سے باہر ہے اس وجہ سے اس کی نظر میں ایک مخلص اور ایک منافق کے ایمان میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حقیقت کی نگاہ میں بھی دونوں کا ایمان یکساں ہے۔ یہاں اس اجمالی اشارے پر قناعت کیجیے۔ اس پر تفصیلی بحث اپنے محل میں آئے گی۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۵-۸)

کَمَا کے مواقع استعمال

'کَمَا' عربی زبان میں 'کَذٰلِکَ'، 'کَاَیِّنْ' اور 'کَمَا' اب اوقات واقعہ کی مماثلت واقعہ سے ظاہر کرنے کے لیے بھی آتے ہیں۔ ایسی صورت میں متعین الفاظ کے اندر ان کا مشبہ اور مشبہ بہ نہیں ہوتا بلکہ بحیثیت مجموعی واقعہ کے اندر ہوتا ہے۔ 'کَذٰلِکَ' بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں اسی نوعیت سے آیا ہے۔ امرأ القیس نے اپنے مشہور قصیدہ میں پہلے اپنی ایک سرگزشت عشق بیان کی اس کے بعد 'کدابک من ام الحویرث قبلہا' کہہ کر اپنی اسی طرح کی دوسری سرگزشتوں کا ذکر شروع کر دیا کہ اسی طرح کا ماجرا اس کو فلاں اور فلاں کے ساتھ بھی پیش آچکا ہے۔ بقرہ آیت ۱۵۱ سے اوپر تحویل قبلہ کا ذکر ہوا پھر بدون کسی تقریب و تمہید کے ارشاد ہوا 'کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ' یہ بھی اسی طرح کا اسلوب بیان ہے یعنی تمہارے قبلہ کو اہل کتاب کے قبلہ سے الگ کر کے خدا نے تم کو ایک علیحدہ امت کی حیثیت سے ممتاز کر دیا۔ اسی طرح کا 'کَمَا' یہ زیر بحث آیت میں بھی ہے۔ اوپر جیسا کہ مذکور ہوا، ان کمزور قسم کے مسلمانوں کے رویہ پر گرفت فرمائی ہے جو بدر میں حاصل شدہ مال غنیمت کی تقسیم پر معترض ہوئے تھے۔ جب ان کی یہ کمزوری زیر بحث آگئی تو تعلیم و تربیت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان لوگوں کی ایک اور کمزوری کی طرف بھی توجہ دلا دی جائے جو اس سے پہلے ان سے اس وقت ظاہر ہوئی جب آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ گویا اس وقت تو ان کی غلطی نظر انداز فرما دی گئی کہ حکمت کا تقاضا یہی تھا لیکن جب اسی طرح کی غلطی ان سے پھر صادر ہوئی تو اس پر گرفت فرمائی گئی اور ساتھ ہی سابق غلطی کی طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا کہ لوگ متنبہ ہو جائیں کہ یہ بیماری کہاں سے چلی ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوئی تو کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔

بدر کے لیے مسلمانوں کا نکلنا ایمائے الٰہی سے ہوا

'اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ'۔ 'اَخْرَجَكَ رَبُّكَ' کے الفاظ اس امر پر نہایت واضح دلیل ہیں کہ بدر کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکلنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا تھا۔ آگے آیت ۴۲-۴۴ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ آپ کو رویا میں شام کی طرف سے قافلۂ قریش کی واپسی اور مکہ کی طرف سے فوج قریش کی آمد کا مشاہدہ کرا دیا گیا تھا اور حملہ آور فوج کی حقیقت بھی واضح کر دی گئی تھی کہ معنوی اعتبار سے وہ کچھ زیادہ وزنی نہیں ہوگی بلکہ مسلمانوں سے مغلوب ہو جائے گی۔ بلکہ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسی رویا میں حضورؐ کو قریش کے خاص خاص لیڈروں کے قتل ہونے کی جگہیں بھی دکھا دی گئیں۔ اسی رویا کی ہدایت کے بموجب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اس وجہ سے اس کو 'اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آگے آیت ۴۲ سے یہ بات بھی واضح ہوگی کہ اسی خدائی رہنمائی کی برکت تھی کہ مسلمان بالکل ٹھیک اس وقت قریش کی فوج کے مقابلہ کے لیے بدر کے مقام پر پہنچ گئے جب کہ وادی کے ایک سرے پر ان کی فوج تھی اور نیچے سے قافلہ گزر رہا تھا۔

بدر کے لیے نکلنے کا اصل مقصد

'بِالْحَقِّ' یعنی اللہ تعالیٰ نے نکلنے کا یہ حکم ایک مقصدِ حق کے لیے دیا تھا۔ اس مقصدِ حق کی وضاحت آگے یوں فرما دی ہے 'يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ' (اللہ تعالیٰ اپنے حکموں سے یہ چاہتا ہے کہ حق کا بول بالا کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے) 'لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ' (تاکہ حق کا بول بالا کرے اور باطل کو نابود کرے مجرموں کے علی الرغم) اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکلنا ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ایک مقصدِ حق کے لیے تھا اور وہ مقصدِ حق یہ تھا کہ دین کا بول بالا ہو اور کفر کی جڑ کٹے۔ ظاہر ہے کہ کفر کی جڑ کٹ سکتی تھی تو قریش کی ہزیمت سے کٹ سکتی تھی نہ کہ ان کے کسی تجارتی قافلہ کو لوٹ لینے سے اس وجہ سے سیرت و مغازی کی کتابوں کی وہ روایت قرآن کے الفاظ کے صریحاً خلاف ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اس تجارتی قافلے پر حملہ کرنا چاہتے تھے جو ابو سفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آ رہا تھا۔

مسلمانوں کے اندر کے ایک کمزور گروہ کی طرف اشارہ

'وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ'۔ 'فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' سے کمزور قسم کے مسلمانوں کی وہ ٹولی مراد ہے جس کا کردار ابتدائے سورہ ہی سے زیر بحث ہے اور جس نے مال غنیمت سے متعلق بعد میں وہ سوالات بھی اٹھائے جن پر اوپر کی آیات میں تبصرہ ہوا ہے۔ 'فَرِيْقًا' کے لفظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے

کہ ان لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی، بس ایک مختصر سی جماعت تھی۔ ان لوگوں نے جب یہ سنا ہو گا کہ کفار کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے مقابلہ درپیش ہے تو یہ بات تو وہ فوراً تاڑ گئے ہوں گے کہ یہ مقابلہ بہر حال فوج سے ہونا ہے نہ کہ تجارتی قافلہ سے اس وجہ سے ان لوگوں پر دہشت طاری ہوتی اور یہ دہشت ان کے اس ضعفِ اعتماد علی اللہ کا نتیجہ تھی جس کی طرف اوپر آیت ۲ میں اشارہ ہوا ہے

کمزوروں کی کمزوری پر گرفت — يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ لفظ مُجَادلۃ کے معنی یہاں، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اس کی تحقیق بیان کر چکے ہیں، باصرار و بلطائف الحیل مخاطب سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ اب یہ وضاحت ہو رہی ہے اس بات کی کہ جب ان کو خطرہ لاحق ہو گا کہ مقابلہ فوج سے درپیش ہے تو اس سے فرار کی انھوں نے کیا راہ نکالنی چاہی۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باصرار اور بلطائف الحیل اپنی چرب زبانی سے اس رخ پر لانا چاہا کہ آپ تجارتی قافلے کا قصد کریں۔ بظاہر تو انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہو گی کہ یہ مشورہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی میں دے رہے ہیں کہ قافلہ کو لوٹ لینے سے قریش کی کمر اقتصادی اعتبار سے ٹوٹ جائے گی اس لیے کہ ان کے سرمایہ کا بڑا حصہ اس قافلے کے ساتھ ہے جس سے مسلمانوں کی موجودہ کمزور مالی حالت کو درست کرنے میں بڑی مدد ملے گی لیکن اس مشورہ کی تہ میں ان کا وہی خوف بیٹھا ہوا تھا جس کو قرآن نے بے نقاب کر دیا ہے کہ "گویا وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہوں اور وہ موت کو سامنے دیکھ رہے ہوں"۔ اس مشورے کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ تھا کہ ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا، جیسا کہ قرآن کے الفاظ 'بَعْدَمَا تَبَيَّنَ' سے ثابت ہے، اچھی طرح واضح تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی بات منوانے کے لیے تمام حربے استعمال کیے۔ ہر چند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرحلے تک، جیسا کہ آگے والی آیت میں اشارہ آ رہا ہے، بعض خاص اسباب سے، جن کی تفصیل آگے آئے گی، اپنا منشا واضح الفاظ میں ظاہر نہیں فرمایا تھا لیکن یہ لوگ اتنے غبی نہیں تھے کہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ جب ایک طرف تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف سے فوج آرہی ہے تو آنحضرتؐ کا یہ نکلنا کس سے نمٹنے کے لیے ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ دل کے بودے ضرور تھے لیکن عقل کے اتنے غریب نہیں تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج، اسلام کے مقصد، احقاقِ حق کے تقاضوں سے اتنے نابلد ہوں کہ یہ موٹی سی بات بھی نہ سمجھ سکیں کہ کسی تجارتی قافلہ کو تاخت و تاراج کرنا ایسا کیا کام ہو سکتا ہے جس کے لیے خدا کا رسول اپنے جاں نثاروں کے ساتھ یوں سربکف ہو کر نکلے! چنانچہ آگے تفصیل آئے گی کہ نہ مہاجرین کے لیڈروں کو آنحضرتؐ کا منشا سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا نہ انصار کے جان نثاروں کو۔ سب نے پہلے ہی مرحلے میں تاڑ لیا کہ حضورؐ کا منشا کیا ہے اور اس منشا کی تکمیل کے لیے وہ سربکف ہو گئے۔ صرف ایک گروہ موت کے ڈر سے آخر وقت تک سخن سازی کرتا رہا اس وجہ سے اس کا رویہ قرآن میں زیر بحث آیا تاکہ آئندہ کے

مراحل میں مسلمان ان داخلی فتنوں سے ہوشیار رہیں۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ۔

جماعت کے حوصلہ کا اندازہ کرنے کے لیے ایک حکیمانہ طریقہ

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ کے اسلوب بیان میں جو ابہام ہے وہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکلتے وقت انصار و مہاجرین سے جب اس مہم کے باب میں استمزاج فرمایا تو بات کھل کر یوں نہیں فرمائی کہ تجارتی قافلہ کی حفاظت کا بہانہ بنا کر قریش نے ہم پر حملہ کرنے کے لیے اپنی فوج بھیج دی ہے بلکہ مبہم انداز میں یوں فرمایا کہ کفار کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک کو اللہ تعالیٰ ہمارے قابو میں کر دے گا۔ یہ مبہم انداز بیان حضورؐ نے کیوں ارشاد فرمایا؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اہم مہم پر روانہ ہونے سے پہلے حضورؐ نے چاہا کہ ہر گروہ کا جائزہ لے لیا جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ اگر مسئلہ کو بالکل دوٹوک انداز میں لوگوں کے سامنے رکھ دیتے تو مخلص و منافق سب کو آمنا و صدقنا کہتے ہی بن پڑتی۔ پھر نہ تو کسی کو اس سے اختلاف کی جرأت ہوتی اور نہ کسی کی کمزوری ظاہر ہو سکتی۔ یاد ہوگا، یہی طریقہ آپ نے جنگ احد کے موقع پر بھی اختیار فرمایا۔ اس وقت آپ نے لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ جنگ شہر سے باہر نکل کر کی جائے یا شہر میں محصور ہو کر اور خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرمائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جاں نثاروں نے شہر سے باہر نکل کر جنگ کرنے کی رائے دی اور کمزور قسم کے لوگوں نے شہر میں محصور ہو کر۔ اس طرح آپ کو جماعت کے قوی و ضعیف اور مخلص و منافق سب کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا[1]۔ اسی حکمت و مصلحت سے حضورؐ نے اس موقع پر بھی بات مبہم انداز میں فرمائی کہ لوگوں کے جواب سے اندازہ ہو جائے کہ کون کس طرز پر سوچ رہا ہے چنانچہ پہلے آپ نے مہاجرین کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ وہ صاف سمجھ گئے کہ حضورؐ کا منشا کیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے مقداد بن عمرؓ نے اٹھ کر ایک ایسی تقریر کی جس کی گونج اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ انہوں نے فرمایا:

> "اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ کو جس بات کا حکم دیا ہے آپ اس کے لیے اقدام کیجیے۔ آپ جہاں کے لیے نکلیں گے ہم آپ کے ہم رکاب ہیں۔ ہم آپ سے وہ بات کہنے والے نہیں ہیں جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہی تھی کہ تم اور تمہارا رب دونوں جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھتے ہیں بلکہ ہمارا قول یہ ہے کہ آپ اور آپ کا رب دونوں جنگ کے لیے نکلیں، جب تک کہ ایک آنکھ بھی ہم میں گردش کرتی ہے ہم سر کٹانے کے لیے حاضر ہیں۔"

کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان الفاظ میں جن لوگوں کی ترجمانی کی گئی ہے ان کے کسی فرد میں بھی کسی

---

[1] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث آل عمران کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

تجارتی قافلے پر حملے کا کوئی موہوم وسوسہ بھی ہو سکتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد اپنے وہی الفاظ جو اوپر مذکور ہوئے پھر دہرائے۔ انصار سمجھ گئے کہ اب حضورؐ ہمارا عندیہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انصار کے لیڈر سعد بن معاذؓ اٹھے اور انھوں نے عرض کیا کہ حضور کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ پھر انھوں نے وہ تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ میدان جہاد کا رجز ہے اور جس کی حرارت ایمانی ۱۴سو سال گزرنے پر بھی ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

"ہم آپ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپ کی تصدیق کی ہے ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ جو دین آپ لے کر آئے ہیں وہی حق ہے۔ ہم نے آپ سے سمع و طاعت کا عہد و میثاق کیا ہے۔ پس اے اللہ کے رسول، آپ نے جو ارادہ فرمایا ہے وہ پورا کیجیے۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں اس سمندر کے کنارے لے جا کر اس میں کود پڑیں گے تو آپ کے ساتھ ہم بھی اس میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم میں سے پیچھے رہنے والا نہیں ہوگا۔ ہم اس بات سے نہیں گھبراتے کہ کل آپ ہمیں ہمارے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے لے جا کھڑا کریں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔ مقابلہ کے وقت ہم راست باز ثابت ہوں گے اور کیا عجب کہ اللہ ہمارے ہاتھوں وہ کچھ دکھائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں تو اللہ کا نام لے کر آپ ہمیں ہمرکابی کا شرف بخشیے۔"

غور کیجیے کہ کیا یہ تقریریں ان لوگوں کی ہو سکتی ہیں جو ایک غیر مسلح قافلہ پر، جس کی جمعیت شاید کل چالیس آدمیوں پر منحصر تھی، حملہ کی سکیمیں سوچ رہے ہوں اور پھر اس امر پر غور کیجیے کہ کیا لفظ لفظ سے یہ بات واضح نہیں ہو رہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کے اس ابہام کے باوجود، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، انصار و مہاجرین دونوں گروہوں پر یہ بات سورج کی طرح روشن تھی کہ آپؐ کا منشا کیا ہے اور آپؐ کا رخ کدھر کو ہے۔ البتہ ایک گروہ، جیسا کہ قرآن کے الفاظ سے واضح ہے، ضعیف الایمانوں کا ایسا تھا جو حقیقت کی وضاحت کے باوجود محض اپنی بزدلی کے سبب سے یہ چاہتا تھا کہ حملہ قافلہ پر کیا جائے جو غیر مسلح ہے تاکہ خطرہ کوئی نہ پیش آئے اور لقمہ تر ہاتھ آئے۔ انھی کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ (تم چاہتے تھے کہ غیر مسلح گروہ تمھارا لقمہ بنے) 'شوک' اور 'شوکۃ' عربی میں کانٹے کو کہتے ہیں یہیں سے لفظ 'شوکۃ' ہتھیار اور پھر قوت اور دبدبہ کے معنی میں استعمال ہوا۔ چونکہ تجارتی قافلہ غیر مسلح تھا اس وجہ سے اس کے لیے 'غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ' کا لفظ استعمال ہوا۔

خدائی احکام کا منشا سمجھنے کے لیے ایک عقلی کسوٹی

'وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ' اب یہ اللہ کے ارادے اور منشا کو سمجھنے اور جانچنے کے لیے ایک عقلی اور فطری معیار بتایا گیا ہے کہ اللہ کا ہر حکم [illegible]

احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے مقصد کے لیے ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی باتوں کا منشا، اگرچہ وہ مجمل ہوں، معین کرنے میں اس اصول کو نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے۔ جن لوگوں نے قافلہ پر حملہ کرنے کا ارمان کیا انھوں نے اس بات کا خیال نہ کیا کہ خدا ایک ایسی بات کیسے چاہ سکتا ہے جس سے نہ حق کا بول بالا ہو نہ کفر اور اہل کفر کی جڑ کٹے۔ 'کلمات' کا لفظ، جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں تصریح کر چکے ہیں، ایک قسم کے ابہام کا حامل ہے۔ چونکہ اس موقع پر بات، جیسا کہ ہم اوپر وضاحت کر چکے ہیں، لوگوں کے سامنے مبہم طور پر رکھی گئی تھی اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'کلمات' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جن باتوں کے اندر کوئی اجمال یا ابہام ہوتا ہے درحقیقت وہی باتیں ہوتی ہیں جن کے منشا کے تعین کا کام دشوار ہوتا ہے۔ ایسے مواقع میں اہلِ ایمان کی روش یہ ہونی چاہیے کہ بات کا وہ پہلو اختیار کریں جو اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی شان سے موافقت رکھنے والا ہو نہ کہ ان کے منافی۔ 'یَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ' کے الفاظ سے قرآن نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ سارے کفر کی جڑ تو قریش کی جمعیت تھی، کاٹنے کی چیز تو وہ تھی اور اللہ چاہ سکتا تھا تو اس کا کاٹنا چاہ سکتا تھا لیکن ایک گروہ نے تجارتی قافلہ ہی پر وار کر کے تیس مار خاں بننے کی کوشش کی۔

'لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ کَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ'، یہ ٹکڑا 'یَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ' کی غایت واضح کر رہا ہے کہ اللہ نے ان کافروں کی جڑ کاٹنے کا جو ارادہ فرمایا ہے تو اس کا مقصد حق کا بول بالا کرنا اور باطل کو مٹانا ہے۔ خدا کو کسی سے پرخاش نہیں ہے البتہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل اس کی صفات کا مقتضی ہے اور اس کا فیصلہ اب خدا نے فرما لیا ہے اور یہ کام ہو کر رہے گا اور ان مجرموں کے علی الرغم ہو کر رہے گا۔

قرآنی اشارات کی روشنی میں غزوۂ بدر کی اصل تصویر

اوپر قرآن نے جو اشارات کیے ہیں ان کی روشنی میں غزوہ بدر کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو سیرت و مغازی کی کتابوں میں پیش کی گئی ہے اور جس میں رنگ آمیزی کر کے مستشرقین نے اس کو اور زیادہ بھیانک شکل دے دی ہے۔

قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں کے ذہن میں قریش کے قافلۂ تجارت سے تعرض کرنے کا کوئی خیال موجود نہیں تھا۔ مدینہ پر حملہ کی ساری اسکیم قریش نے بنائی اور اس کے لیے قافلۂ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراشا۔ قریش مدینہ میں مسلمانوں کے جڑ پکڑنے سے بہت خائف تھے۔ مذہبی عناد کے علاوہ انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اب مکہ اور شام کی تجارتی شاہراہ ان کے لیے محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہی وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی عذر تلاش کر کے مسلمانوں کو ایک قوت بننے سے پہلے ہی ختم کر دیں۔ اب یا تو قافلۂ تجارت کے سالار ابوسفیان نے واپسی کے موقع پر کوئی وہمی خطرہ مسلمانوں کے حملے کا محسوس کیا ہو کہ آدمی بھیج کر قریش کو حملہ کی خبر بھیج

دی یا اس کے لیے بھی پہلے سے قریش کے لیڈروں میں کوئی سازش رہی ہو۔ بہرحال ابوسفیان کی اطلاع پر مکہ سے ایک بھاری بھرکم لشکر مدینہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ مرحلہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے ذریعے سے یہ اطلاع ہوتی ہے کہ قریش کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے مسلمانوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا اور مسلمانوں کے حوصلہ کا اندازہ کرنے کے لیے صورتِ حال مبہم انداز میں ان کے سامنے رکھی کہ کفار کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے ہمارا مقابلہ ہوگا۔ اور وہ ہم سے شکست کھائے گی۔ مسئلہ کے سامنے آتے ہی مہاجرین و انصار سب سمجھ گئے کہ قریش کی فوج آرہی ہے اور اس سے معاملہ درپیش ہے۔ چنانچہ ان کے لیڈروں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفاداری اور اسلام کے لیے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا۔ البتہ ایک مختصر سی ٹولی ان میں ایسی بھی تھی جس نے اپنا زور اس بات کے لیے لگایا کہ قریش کی فوج کے بجائے قافلۂ تجارت کا رخ کیا جائے تاکہ بغیر ایک قطرۂ خون بہائے بھاری غنیمت ہاتھ آسکے۔ اسی گروہ کو بے نقاب کرنے کے لیے حضورؐ نے اپنی بات مبہم انداز میں پیش کی تھی تاکہ جن لوگوں کے اندر کوئی کمزوری چھپی ہوئی ہے وہ اپنی کمزوری ظاہر کردیں اور مخلص و منافق میں مرحلۂ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی امتیاز ہو جائے۔

آگے اسی سورہ کی بعض آیات کی روشنی میں ہم انشاء اللہ یہ بھی دکھائیں گے کہ اس جنگ کے لیے یہود نے بھی قریش کی پیٹھ ٹھونکی تھی لیکن میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ کر وہ اپنی عادت کے مطابق دبک گئے۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹-۱۹

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنی ان غیبی تائیدات کا حوالہ دیا ہے جو اس موقع پر مسلمانوں کی مدد اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ظاہر ہوئیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور اسلام کے مستقبل پر ان کا ایمان و اعتماد مضبوط ہو۔ اوپر کے ٹکڑے میں جن کمزور لوگوں کا ذکر آیا تھا ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کی جماعتی اصلاح ہی کے نقطۂ نظر سے آیا تھا، اب گویا اسی مقصد کے تحت ان باتوں کی یاد دہانی کی جارہی ہے جن کی یادداشت آگے کے مراحل میں کام آنے والی تھی۔ مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ کفارِ قریش کو بھی مخاطب کرکے تنبیہ کردی گئی کہ یہ چپت جو تمہیں لگی ہے یہ تو تمہید ہے، تمہاری روش اگر یہی رہی تو آگے اس سے سخت دنوں کا انتظار کرو، تم نے اس جنگ کے نتیجے کو حق و باطل کا معیار ٹھہرایا تھا تو اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آگیا، اب بھی تمہاری آنکھیں نہ کھلیں، تم نے پھر

شرارت کی تو یاد رکھو ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں۔ کثرت تعداد و وسائل کا سارا گھمنڈ دھرا رہ جائے گا اور تم پھر منہ کی کھاؤ گے، اہل ایمان کے پہلو پر ہم ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۱۹

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ
الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ﴿٩﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ
بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم
مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ
الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾ إِذْ
يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ
سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ
الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٢﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا
اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَن يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١٣﴾ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ
النَّارِ ﴿١٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا
زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ﴿١٥﴾ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ
دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ
بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٦﴾ فَلَمْ
تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ
اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ

ع ۱۰/ ۱۵

سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوۡهِنُ كَيۡدِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۸﴾ اِنۡ تَسۡتَفۡتِحُوۡا فَقَدۡ جَآءَكُمُ الۡفَتۡحُ‌ ۚ وَاِنۡ تَنۡتَهُوۡا فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ تَعُوۡدُوۡا نَـعُدۡ‌ ۚ وَلَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡكُمۡ فِئَتُكُمۡ شَيۡـئًـا وَّلَوۡ كَثُرَتۡ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۹﴾

ع ۹ / ۱۶

ترجمہ آیات ۹ - ۱۹

اور یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سنی کہ میں ایک ہزار فرشتے تمہاری کمک پر بھیجنے والا ہوں جن کے پرے کے بعد پرے نمودار ہوں گے اور یہ صرف اس لیے کیا کہ تمہارے لیے خوش خبری ہو اور اس سے تمہارے دِل مطمئن ہوں اور مدد تو خدا ہی کے پاس سے آتی ہے۔ بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے۔ یاد کرو جب کہ وہ تم کو چین دینے کے لیے اپنی طرف سے تم پر نیند طاری کر دیتا ہے اور تم پر آسمان سے پانی برسا دیتا ہے تاکہ اس سے تم کو پاکیزگی بخشے اور تم سے شیطان کے وسوسے کو دفع کرے اور تاکہ اس سے تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور قدموں کو جمائے۔ یاد کرو جب تمہارا رب فرشتوں کو وحی کرتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم ایمان والوں کو جمائے رکھو۔ میں کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا تو مارو ان کی گردنوں پر اور مارو ان کے پور پور پر۔ یہ اس سبب سے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ کو اٹھے ہیں اور جو اللہ و رسول کے مقابلہ کو اٹھتے ہیں تو اللہ ان کے لیے سخت پاداش والا ہے۔ سو یہ تو نقد چکھو اور کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔ ۹ - ۱۴

اے ایمان والو، جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو فوج کشی کی صورت میں تو ان

کو پیٹھ نہ دکھائے ہو اور جو ان کو اس وقت پیٹھ دکھائے گا، بجز اس کے کہ جنگ کے لیے پینترا بدلنا چاہتا ہو یا کسی جماعت کی طرف سمٹ رہا ہو، تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔ پس تم لوگوں نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور جب تو نے ان پر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی کہ اللہ اپنی نشانیں دکھائے اور اپنی طرف سے اہل ایمان کے جوہر نمایاں کرے۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا سامنے ہے اور اللہ کافروں کے سارے داؤں بے کار کر کے رہے گا۔ اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو تمھارے سامنے فیصلہ آگیا اور اگر تم باز آجاؤ تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم پھر یہی کرو گے تو ہم بھی یہی کریں گے اور تمھاری جمعیت تمھارے کچھ کام نہ آئے گی خواہ کتنی ہی زیادہ ہو اور بے شک اللہ مومنین کے ساتھ ہے۔ ۱۵-۱۹

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۹-۱۰)

غزوۂ بدر میں تائیدات الٰہی

'اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ' 'فَاسْتَجَابَ لَكُمْ' کی تفصیل ہے اور فاعل کا صیغہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کی قطعیت کے اظہار کے لیے ہے۔ 'اِرْدَاف' کے معنی 'توالی' یعنی یکے بعد دیگرے ظاہر ہونے کے ہیں۔

اس سلسلہ کی پہلی تائید الٰہی

یہ اس سب سے پہلی تائید الٰہی کا بیان ہے جو اس موقع پر ظاہر ہوئی۔ مسلمانوں کی تعداد اس جنگ میں بہت تھوڑی تھی یعنی کل ۳۱۳ اور وہ بے سرو سامان بھی تھے۔ ادھر کفار ایک ہزار کے قریب تھے اور ہر قسم کے اسلحہ سے لیس اور سرو سامان سے بھرپور۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کو واحد سہارا خدا کی تائید ہی کا ہو سکتا تھا چنانچہ ایک ایک شخص سراپا عجز و نیاز اور یکسر دعا و فریاد بنا ہوا تھا۔ ان دعاؤں کی نوعیت

کا اندازہ کرنے کے لیے خود سرور عالم کی اس دعا کو پڑھ لینا کافی ہے جس کے الفاظ احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب نہتے مسلمانوں نے اپنے دل نکال کر اپنے رب کے سامنے رکھ دیے ہوں گے تو یہ دعائیں قبولیت سے کیسے محروم رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ یہ قبول ہوئیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت نازل ہوئی کہ تم ہراساں نہ ہو، میں تمہاری کمک کے لیے ہزار فرشتے نازل کرنے والا ہوں۔ مطلب یہ کہ تم ہزار کافروں کی کیا پروا کرتے ہو، تمہارے جلو میں تو ہزار فرشتے ہوں گے۔ ان فرشتوں کے ظہور کی شکل یہ بتائی کہ ان کے دستے کے بعد دستے اور پرے کے بعد پرے نمایاں ہوں گے۔ میدان جنگ میں لڑنے والوں کی یہ سائیکالوجی ملحوظ رہے کہ جن کی حمایت میں کمک کے بعد کمک آ رہی ہو ان کا حوصلہ ہر کمک پر دونا ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے حریف کے اعصاب ڈھیلے پڑتے جاتے ہیں۔ یہ مضمون آل عمران کی آیات ۱۲۵ - ۱۲۶ میں بھی گزر چکا ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

اہل ایمان کے لیے ابدی بشارت

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ۔ ضمیر مفعول کا مرجع وہی وعدۂ نصرت ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر تمہارے رب نے یہ صریح الفاظ میں تمہاری مدد کا پہلے سے جو وعدہ فرمایا تو محض اس لیے کہ تم ہراساں تھے، تمہاری ڈھارس بندھ جائے اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا کہ خدا کی یہ مدد اسی موقع کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ جب بھی اللہ کے مومن بندے اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکلیں گے اور ایمان و اخلاص کے ساتھ اس سے طالب مدد ہوں گے، وہ ان کی مدد فرمائے گا خواہ اس مدد کے لیے پہلے سے ان کو بشارت ملی ہو یا نہ ملی ہو۔ اس وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ صریح الفاظ میں ہر موقع وعدۂ نصرت نبی کے ذریعہ ہی سے اور اس کی موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے تو نبی کی غیر موجودگی میں یا اس کے زمانہ کے بعد کے لوگ کس طرح اطمینانِ قلب حاصل کر سکتے تھے۔ اس شبہ کے ازالے کے لیے یہ فرما دیا کہ یہ وعدہ اسی موقع کے لیے نہیں تھا بلکہ اہل ایمان کے لیے ابدی ہے۔

کم سوادوں کی بے بصیرتی

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ اس لیے کہ مدد تو جب بھی آتی ہے یا آئے گی اللہ ہی کے پاس سے آتی ہے یا آئے گی۔ پس خدا پر بھروسہ کرنے والے ہمیشہ خدا پر بھروسہ کریں، وہ ہمیشہ ان کی مدد فرمائے گا۔ خدا عزیز اور غالب ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس کے ہاتھ پکڑ سکے لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اگر کبھی اہل ایمان کو کوئی افتاد پیش آ جائے تو اس میں بھی کوئی حکمت کارفرما اور اس کی تہ میں بھی بندوں ہی کی کوئی مصلحت مضمر ہوتی ہے۔ یہ مضمون سورۂ آل عمران میں احد کی شکست کے اسباب کے ذیل میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

اس زمانے کے بعض کم سوادوں نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا کہ فرشتوں کی فوج اتارنے کا وعدہ محض مسلمانوں کو ذرا بڑھاوا دینے کے لیے تھا تاکہ وہ ہمت کر کے کفار سے بھڑ جائیں۔ ان کے

خیال میں قرآن نے جنگ کے بعد خود یہ راز کھول دیا کہ یہ بات محض تمہاری تسلی کے لیے کہہ دی گئی تھی، اس کی حقیقت کچھ نہیں تھی۔ گویا نعوذ باللہ پہلے تو اللہ میاں نے مسلمانوں کو چکمہ دیا اور پھر خود ہی اپنا بھانڈا پھوڑ دیا کہ اب کے تو میں نے تم کو چکمہ دے کر لڑا دیا، آئندہ میرے بھرے میں نہ آنا، فرشتوں درشتوں کی بات محض ایک بھرہی تھی۔ شاید یہ حضرات اللہ میاں کو اپنے برابر بھی عقلمند نہیں سمجھتے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱)

اس سلسلہ کی دوسری تائید الٰہی نیند کے ذریعے تائید

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ، یہ اس جنگ کے سلسلہ کی دوسری تائید الٰہی کا بیان ہے اور ذکر اس شب کا ہے جس کی صبح کو جنگ واقع ہوئی۔ تصویر حال کے مقصد سے صیغہ مضارع کا استعمال ہوا ہے جس کا استعمال تصویر حال کے لیے معروف ہے۔ فرمایا کہ یہ بات بھی خاص اللہ کی طرف سے ہوئی کہ شب میں اس نے تم پر نیند طاری کر دی کہ تمہارے اعصاب و دماغ کو سکون مل گیا اور تم صبح کو جنگ کے لیے چاق و چوبند ہو گئے۔ اس نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اس لیے کہ عین میدان جنگ میں ان لوگوں کا جن کی مٹھی بھر جماعت کو صبح ایک دل بادل فوج سے لڑنا ہے تھوڑا سا سو لینا بھی فی الواقع خدا کی تائید ہی کا مظہر ہے۔ نیند تو تھوڑی سی پریشانی سے بھی اچاٹ ہو جاتی ہے چہ جائیکہ ایک ایسی پریشانی میں جیسی کہ اس موقع پر مسلمانوں کو لاحق رہی ہو گی لیکن جن کو خدا کی طمانیت بخشیوں کی تھپکیاں حاصل ہوں وہ تختہ دار پر بھی سو سکتے ہیں۔ چنانچہ شب میں مسلمان سو لیے اور اس سے ان کے اعصاب اور دل و دماغ کو اتنا سکون حاصل ہو گیا کہ وہ جنگ کے لیے تازہ دم ہو گئے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۴ کے تحت ہم لکھ آئے ہیں کہ میدان جنگ میں فوج کے لیے سو لینے کا موقع مل جانا ہی اول تو بڑی نعمت ہے لیکن اس سے بڑی نعمت اس موقع سے صحیح فائدہ اٹھا سکنا ہے اس لیے کہ نیند کے لیے موقع مل جانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی انحصار دل و دماغ کی حالت پر ہے اور یہ چیز ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، انہی کو حاصل ہوتی ہے جن پر خدائے مقلب القلوب اپنے فضل خاص سے یہ سکینت طاری کر دے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ اونگھ کی یہ حالت مسلمانوں پر عین اس وقت طاری ہوئی جب زور و شور کا معرکہ گرم تھا اور حالت یہ ہوئی کہ لوگوں کے ہاتھوں سے تلواریں چھوٹ کر گری پڑتی تھیں۔ لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ اول تو یہی بات بڑی عجیب سی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی حالت کو اپنے انعام کے طور پر گنائے جس کا فائدہ سرتاسر کفار کے حق میں جاتا ہے۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا تائید ہو سکتی تھی کہ مسلمان عین لڑائی کے وقت اونگھنے لگ جائیں خواہ وہ کتنے ہی قلیل وقت کے لیے ہو۔ دوسرے یہ بات قرآن کے صریح الفاظ کے بھی بالکل خلاف ہے اس

طرح کی نیند کا ذکر قرآن میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک آلِ عمران آیت ۱۵۴ میں، دوسرے یہاں۔ آلِ عمران کے الفاظ یہ ہیں: ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا یَّغْشٰی طَآئِفَۃً مِّنْکُمْ وَطَآئِفَۃٌ قَدْ اَھَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ (پھر اللہ نے تم پر غم کے بعد سکون اتارا یعنی نیند جس نے تم میں سے ایک گروہ کو ڈھانک لیا اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی رہی) اس آیت میں ظاہر ہے کہ غم سے وہی غم مراد ہے جو مسلمانوں کو احد کی شکست سے پیش آیا تو جب نیند کے اتارے جانے کا واقعہ اس غم کے پیش آنے کے بعد پیش آیا تو اس کا تعلق وقت جنگ سے کیسے ہو سکتا ہے، یہ تو لازماً جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد ہی کا واقعہ ہو سکتا ہے۔ اس نیند کے موقع اور اسکی اہمیت کی تفصیل ہم آلِ عمران کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

انفال کی زیر بحث آیت میں اس نیند کا ذکر ان تائیدات کے بیان کے ذیل میں ہوا ہے جو بالفعل جنگ شروع ہونے سے پہلے ظہور میں آئی ہیں۔ اس کے اوپر آپ نے دیکھا کہ فرشتوں کی فوج اتار جانے کی بشارت کا حوالہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بشارت جنگ سے پہلے دی گئی ہے۔ بعد کی آیت میں بارش کے نزول کا ذکر ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ واقعہ بھی جنگ سے پہلے ہوا ہے۔ پھر ان دونوں کے بیچ میں ایک ایسی بات کیسے آسکتی ہے جس کا تعلق معرکۂ کارزار سے ہو؟ قرآن نے اپنی ترتیب بیان ہی سے واقعہ کا موقع و محل نہایت خوبی سے واضح کر دیا ہے لیکن آفت یہ ہے کہ لوگ قرآن پر غور ہی نہیں کرتے۔

ممکن ہے یہاں کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ قرآن نے یہاں 'نُعَاس' کا لفظ استعمال کیا ہے جو عربی میں ابتدائی نیند یعنی اونگھ اور جھپکی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگر مقصود اطمینان کی نیند کا بیان کرنا ہوتا تو 'نوم' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہ شبہ کچھ وزن نہیں رکھتا۔ اول تو یہ خیال کیجیے کہ شدید پریشانی میں آدمی جس چیز سے محروم ہو جاتا ہے وہ ابتدائی نیند ہی ہے، وہ اگر کسی طرح آجائے اور ذرا آنکھ لگ جائے تو آدمی کچھ سو ہی لیتا ہے۔ خدا نے اپنے فضل خاص سے یہ چیز مسلمانوں پر اڑھا دی، جیسا کہ 'یُغَشِّیْکُمْ' کے لفظ سے عیاں ہے اسی وجہ سے مسلمان سو لیے۔ دوسری بات یہ کہ سفر یا میدان جنگ میں گھوڑے بیچ کر اور مردوں سے شرط باندھ کر تو کوئی ذی ہوش بھی نہیں سوتا، جو بھی سوتا ہے وہ جھپکی والی نیند ہی سوتا ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک قرآن نے یہ لفظ نہایت برمحل اور بلیغ استعمال کیا ہے۔

اس سلسلہ کی تیسری تائید الٰہی

وَیُنَزِّلُ عَلَیْکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَہِّرَکُمْ بِہٖ وَیُذْھِبَ عَنْکُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ:

یہ تیسری تائید الٰہی کا حوالہ ہے کہ عین موقع پر اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسمان سے پانی برسا دیتا ہے۔ یہاں 'مِنَ السَّمَآءِ' کے الفاظ بڑے بامعنی ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے پہلے

بارش کے ذریعے تائید

پہنچ کر پانی کے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے پانی کے باب میں مسلمانوں کو بڑی تشویش تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مِنَ السَّمَآءِ کے الفاظ سے گویا اپنے اس التفات خاص کی طرف مسلمانوں کی توجہ دلائی کہ کفار نے جب تمھیں زمین کے پانی سے محروم کرنے کی تدبیر کی تو وہ تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکے، تمھارے رب نے تمھارے لیے آسمان سے پانی بھیج دیا۔

'لِيُطَهِّرَكُمْ' میں پانی کا جو فائدہ بتایا ہے اس سے صحابہؓ کے ذوق و رجحان پر روشنی پڑتی ہے کہ ایمان و اسلام نے ان کے اقدار و پیمانے کس قدر بدل دیے تھے۔ پانی کا یہ فائدہ کہ پیا جاتا ہے، ہر آدمی کو معلوم ہے بلکہ بیل اور گدھے بھی اس سے واقف ہیں۔ مومن کی نگاہ میں پانی کا اصلی فائدہ اور اس کی حقیقی قدر و قیمت اس بات میں ہے کہ وہ پاکیزگی اور طہارت کا ذریعہ اور شیطانی وسوسوں کے دور کرنے کا واسطہ ہے اور یہ چیز اللہ کو بہت محبوب ہے۔ صحابہؓ نے اس موقع پر پانی کے مسئلہ پر غور کیا ہوگا تو ان کے سامنے پینے کی ضرورت سے زیادہ اہمیت کے ساتھ یہ بات آئی ہوگی کہ وضو کیسے ہوگا، طہارت کے لیے کیا بنے گا، غسل کی ضرورت پیش آئی تو کیا صورت ہوگی؟ ان کی اس مخصوص پریشانی کی وجہ سے، جو ان کے جوش ایمان کا مظہر تھی، اللہ تعالیٰ نے پانی کی ان روحانی برکات کا خاص طور پر ذکر فرمایا اور اس کے عام حیوانی فوائد سے صرف نظر فرمایا کہ وہ تو سبھی کے علم میں ہیں۔

'رِجْزَ الشَّيْطٰنِ' سے مراد شیطانی وساوس ہیں۔ اس کے ذکر کا بھی ایک خاص محل ہے۔ آدمی جب ناپاکی کی حالت میں ہو تو جس طرح گندی چیزوں پر مکھیوں کا زیادہ ہجوم ہوتا ہے، اسی طرح گندگی کی حالت میں شیطانی وساوس کا بھی آدمی پر زیادہ غلبہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بعض احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ علاوہ بریں یہ بات بھی ہے کہ اگر پانی جیسی ناگزیر شے کی نایابی کا سوال پیدا ہو جائے اور وہ بھی عین جنگ کی حالت میں تو شیطان اس کی آڑ میں ایسی بد دلی اور مایوسی پھیلا سکتا ہے کہ بہتوں کا ایمان متزلزل ہو جائے۔

'رجز الشیطٰن' سے مراد

وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) ربط الله على قلبه : قَوَّاهُ وَصَبَّرَهٗ خدا نے اس کے دل کو مضبوط کر دیا، اس کو اثبات قلب بخشا، اس کو تھام لیا۔ عام طور پر لوگوں نے اس اثباتِ قلب اور ثباتِ قدم کو بھی مذکورہ بارش ہی کے تحت شمار کیا اور اس پہلو سے اس ٹکڑے کی تاویل کی ہے لیکن میرا رجحان یہ ہے کہ یہ اس نیند کے فوائد کی تفصیل ہے جس کا اوپر ذکر ہے۔ میرے رجحان کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

نیند کے فوائد کی تفصیل

اول یہ کہ 'لِيَرْبِطَ' میں 'لِ' کا اعادہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بعینہٖ لِيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ کے تحت نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو بغیر اعادہ 'ل' کے آتا جس طرح 'وَيُذْهِبَ' ہے۔ فصیح عربی میں اسلوب بیان یہی ہے۔ کلام عرب اور قرآن کے نظائر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کتاب

ہیں اس کی ایک سے زیادہ مثالیں گزر چکی ہیں۔ بقرہ میں ہے۔ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۸۵- بقرہ)

اور اللہ تمھارے لیے سہولت چاہتا ہے، تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم تعداد پوری کرو اور تاکہ تم اس ہدایت پہ جو اس نے تم کو بخشی ہے اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم شکرگزار رہو۔ ہم نے اس آیت کے تحت وضاحت کی ہے کہ یہ اوپر کے بیان کردہ احکام کی الگ الگ علتیں واضح کی گئی ہیں اس وجہ سے ہر ایک کے ساتھ ل کا اعادہ کیا گیا اور ترتیب بیان نزولی نہیں بلکہ صعودی ہے یعنی نیچے سے اوپر کو چڑھتے ہوئے ایک ایک حکم کی غایت واضح کی گئی ہے۔ بالکل اسی اصول پر یہاں بھی ترتیب صعودی ہے۔ پانی کا ذکر سب سے آخر میں ہے، پہلے اس کا فائدہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر نیند کا فائدہ بیان ہوا جس کا ذکر اوپر تھا اور لِ کا اعادہ کر کے یہ اشارہ فرما دیا کہ اس کا تعلق قریبی شے سے نہیں ہے بلکہ دوسری چیز سے ہے

دوم یہ کہ ثبات قلب، سکون دماغ اور ثبات قدم کا واضح تعلق نیند ہی سے ہے اسی وجہ سے قرآن نے اس کو امنۃً سے تعبیر فرمایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر رات بے خوابی اور پریشانی میں گزری ہو تو دماغ اڑا اڑا پھرتا ہے، دل پراگندہ اور پریشان رہتا ہے۔ آدمی قدم رکھتا کہیں ہے، پڑتے کہیں ہیں۔ ایسی ذہنی اور قلبی پریشانی میں آدمی کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی سلیقہ سے نہیں کر پاتا، چہ جائیکہ دشمن سے مقابلہ اور وہ بھی اس دور کی جنگ میں جس میں کامیابی کا انحصار مشینوں کی قوت پر نہیں بلکہ لڑنے والوں کے اپنے اعصاب کی چستی اور قوت پر تھا۔ یہ بات بھی یہاں ملحوظ رہے کہ متعدد عرب شعرا نے اپنے جنگی کارناموں کی تفصیل کرتے ہوئے یہ بات بیان کی ہے کہ ہم نے رات میں اپنے دشمن کو سونے نہیں دیا جس کے سبب سے صبح کو ان کے دل ایسے اڑے ہوئے تھے کہ ہمارے سامنے ان کے قدم نہ جم سکے

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ (۱۲-۱۴)

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ، یہاں ملائکہ سے مراد ملائکہ کی وہی فوج ہے جس کی اوپر بشارت دی گئی۔ یہ فوج براہ راست رب الافواج کی کمان میں تھی اس وجہ سے اس کو احکام بھی براہ راست اسی کی طرف سے ملتے تھے اور ان احکام کا ذریعہ وحی الٰہی تھی اس لیے کہ فرشتے بھی باایں علو مرتبت خدا تک براہ راست رسائی نہیں رکھتے۔

خدا کی شان ابتلاکے پردے سے ظاہر ہوئی

اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ' یہ پہلا حکم ہے جو اس فوج کو ملا۔ ارشاد ہوا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں تو تم مسلمانوں کو ثابت قدم رکھو۔ اس سے ایک بات تو یہ نکلی کہ خدا کی معیت کے بغیر فرشتے

بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسری یہ کہ فرشتوں کا کام بھی بہر حال یہ نہیں تھا کہ وہ مسلمانوں سے یہ کہہ دیں کہ تم الگ ہو کر بیٹھو، ہم لڑ کر تمھارے لیے میدان جیتے دیتے ہیں بلکہ ان کا فریضۂ منصبی مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا تھا۔ گویا اصلی چیز مسلمانوں کی خود اپنی شجاعت اور ثابت قدمی تھی۔ مسلمان اپنا یہ جوہر دکھائیں تو خدا کی امداد ان کے ساتھ ہے۔ سنت الٰہی یہی ہے کہ خدا کے ہاتھ ہمیشہ اسباب کے اوٹ سے کام کرتے ہیں۔

اصل طاقت حوصلہ ہے

'سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ' مطلب یہ کہ اہلِ ایمان اپنی ثابت قدمی کا ثبوت دے دیں پھر زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ ہم کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دوں گا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ فوج کی اصلی قوت اس کے حوصلہ (MORALE) میں ہوتی ہے۔ اگر حوصلہ بحال رہے تو سپاہی بے تیغ و تفنگ بھی لڑتا ہے اور اگر حوصلہ ٹوٹ جائے تو اسلحہ کے بڑے بڑے ذخیرے غنیم کے لیے چھوڑ کر فوج بھاگ کھڑی ہوتی ہے تو یہ جو فرمایا کہ میں ان کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہوئی بلکہ یہ تعبیر ہوئی ان کی کمر توڑ دینے کی۔

'فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ' یہ ان کی مرعوبیت کے نتیجہ کی نہایت حقیقت افروز تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا تو ان کو بھیڑوں بکریوں بلکہ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دو۔ ان کی گردنوں کے اوپر مارو، ان کے ایک ایک پور پر مارو۔ یہ تصویر ہے مرعوبیت کے باعث ان کی بے بسی کی۔ حریف میں جب تک دم خم ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس بات کا موقع وہ مشکل ہی سے دیتا ہے کہ آپ جہاں چاہیں اس کے ماردیں لیکن جب اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تو پکڑ کر اس کی چند یا پر جوتے لگا دیجیے۔ وہ چوں بھی نہ کر سکے گا۔ تعیین محل کے ساتھ جب کسی کو مارنے کے لیے کہا جائے تو اس میں اس کی تحقیر و تذلیل بھی مدنظر ہوتی ہے اور اس سے اس کی بے بسی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ یُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ

یہ وجہ بیان ہوئی اس بات کی کہ کیوں خدا ان کے دلوں میں رعب ڈال دے گا اور کیوں یہ مسلمانوں کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کاٹے جائیں گے؟ فرمایا کہ اس لیے کہ یہ اللہ و رسول کے مقابلہ کے لیے اٹھے ہیں اور جو لوگ اللہ و رسول سے مقابلہ کے لیے اٹھتے ہیں اللہ ان کو شدید پاداش سے دوچار کرتا ہے۔ انسانی فطرت کے اندر خدا اور خدا کے رسول سے لڑنے کے لیے کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ لڑائی کا جواز وہاں ہوتا ہے جہاں کسی حق کی حفاظت مدنظر ہو اور اسی صورت میں لڑائی کا حوصلہ بھی ابھرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے مقابل میں کسی حق کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس وجہ سے اس قسم کی جہالت کے لیے جو لوگ اٹھتے ہیں وہ اٹھیں چاہے طوفان کی طرح لیکن مقابلہ پیش آجائے تو بیٹھ جاتے ہیں بلبلے کی طرح، اس لیے کہ ان کے حوصلہ کی بنیاد کسی حق پر نہیں ہوتی۔

'ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ' اوپر خطاب مسلمانوں سے تھا یہ اثنائے کلام میں ایک بات قریش کو مخاطب کرکے فرما دی کہ یہ جو کچھ بدر میں تمھارے سامنے پیش آیا ہے یہ نقد عاجل ہے اس کو چکھ لو اور دوزخ کے عذاب کا انتظار کرو۔ یہ گویا 'اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ' کی وضاحت ہوئی کہ خدا کی طرف سے جو پاداش تمھارے لیے مقرر ہے اس کو اسی پر ختم نہ سمجھو، اصل پاداش کی جگہ دوزخ ہے۔ اس کا انتظار کرو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۵-۱۶)

'زحف' کا مفہوم

'اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا' زحف کے اصل معنی گھسل گھسل کر یا گھٹنوں پر چلنے کے ہیں یہیں سے یہ کسی بھاری بھرکم، سازوسامان سے لدے پھندے لشکر کے جنگ کے لیے نکلنے کے معنی میں استعمال ہوا اس لیے کہ وہ بھی آہستہ آہستہ ہی مارچ کرتا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ لفظ کا یہ استعمال اس مشینی دور کا نہیں بلکہ اس دور کا ہے جب فوج کی نقل و حرکت گھوڑوں، گدھوں اور اونٹ وغیرہ کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

عرب میں جنگ کے دو معروف طریقے

عرب میں جنگ کے دو طریقے معروف تھے۔ ایک منظم فوج کشی کا، دوسرا وہ جس کو اس زمانے میں گوریلا وارفیر کہتے تھے۔ گوریلا وارفیر کا اصول یہ تھا کہ حملہ کرو، لوٹو اور بھاگ جاؤ۔ اس کو کہتے بھی کرّ و فرّ کی جنگ تھے۔ اس کے لیے چھوٹے چھوٹے دستے نکلتے اور چھاپہ مار کر اپنی جا پناہوں میں چھپ جاتے تھے۔ اس کا کوئی مخصوص ضابطہ نہیں تھا بس جس طرح کامیاب چھاپہ مارا جا سکے اور اپنے کو بچایا جا سکے وہی اس کا اصلی ہنر تھا۔

منظم فوج کشی کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے لیے ایک ضابطہ تھا جس کی پابندی اہل لشکر کو بھی کرنی پڑتی تھی اور فریقین جنگ بھی، جو آپس میں لڑتے تھے، اس کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ یہاں آیت میں زیر بحث وہی منظم فوج کشی والی صورت ہے چنانچہ اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے 'زَحْفًا' کا لفظ استعمال ہوا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس حکم کا تعلق گوریلا وارفیر کی صورت سے نہیں ہے۔

آئندہ کی جنگوں سے متعلق ضروری ہدایت

اب یہ مسلمانوں کو آئندہ پیش آنے والی جنگوں سے متعلق ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب منظم فوج کشی کی شکل میں دشمن سے تمھارا مقابلہ ہو تو پیٹھ نہ دکھانا۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی انہی تائیدات پر مبنی ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہیں کہ جن کی پشت پر خدا اور اس کے فرشتے یوں مدد و نصرت کے لیے کھڑے ہوں ان کے لیے حرام ہے کہ وہ اپنی پیٹھ دشمن کو دکھائیں۔

جنگ میں پیٹھ دکھانے کے جرم کی شدت

'وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ' الآیہ ایسی صورت میں جو لوگ دشمن کو پیٹھ دکھائیں گے فرمایا کہ وہ خدا کا غضب لے کر لوٹیں گے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جرم کفر و ارتداد کے

برابر ہے۔ اس جرم کی یہ شدت ظاہر ہے کہ اسی بنیاد پر ہے کہ جو شخص میدانِ جنگ سے بھاگتا ہے وہ اپنی اس بزدلی سے بسا اوقات پوری فوج بلکہ پوری ملت کے لیے ایک شدید خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔ 'اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ' یعنی اس سے مستثنیٰ وہ شکلیں ہیں جو کوئی سپاہی کسی جنگی تدبیر کے لیے اختیار کرتا ہے یا کوئی ایسی صورت اس کے سامنے آ گئی ہے کہ وہ اپنے ایک مورچہ سے ہٹ کر اپنے ہی کسی دوسرے مورچے کی طرف سمٹنا چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حرام جو چیز ہے وہ فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا ہے، وہ پیچھے ہٹنا اس سے مستثنیٰ ہے جو تدبیر جنگ کی نوعیت کا ہو۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۷-۱۸)

پیغمبر مسلم کی آستین سے دستِ غیب کے کارنامے

'فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ' میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے اور 'وَمَا رَمَيْتَ' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اس وجہ سے دونوں میں جمع اور واحد کا فرق ہے۔ 'رمی' تیر مارنے، کنکر پتھر پھینکنے، خاک اور راکھ جھونکنے، سبھی کے لیے آتا ہے۔ روایات میں ہے کہ جب کفار کی فوجیں سامنے ہوئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر خاک زمین سے اٹھائی اور شاھت الوجوہ کہہ کر کفار کی طرف پھینکی۔ 'شاھت الوجوہ' عربی میں لعنت کا فقرہ ہے اور کسی کے اوپر خاک جھونکنا نہایت قدیم زمانہ سے لعنت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ تورات میں بھی اس کا ذکر آتا ہے اور عرب کی روایات سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ سورۂ فیل کی تفسیر میں مولانا فراہی نے اس کے حوالے دیے ہیں۔

یہاں زبان کا یہ اسلوب بھی نگاہ میں رہے کہ بعض مرتبہ فعل کی نفی سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس فعل کے ساتھ ان شاندار نتائج کی نسبت کی نفی ہوتی ہے جو اس فعل کے پردے میں ظاہر ہوئے۔ مٹھی بھر نہتے مسلمانوں کا قریش کی دل بادل غرق آہن فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دینا یا آنحضرت کے دست مبارک سے پھینکی ہوئی چٹکی بھر خاک کا ایک ایسا طوفان بن جانا کہ تمام کفار کو اپنی اپنی آنکھوں کی پڑ جائے، یہ مسلمانوں کی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواروں یا پیغمبر کی رمی کے کارنامے نہیں تھے۔ بلکہ اس دستِ غیب کے کارنامے تھے جو مسلمانوں کی میانوں اور پیغمبرِ عالم کی آستینوں میں چھپا ہوا تھا۔

'اَبْلٰى فُلَانٌ فِى الْحَرْبِ بَلَآءً حَسَنًا' کے معنی ہوں گے اس نے میدانِ جنگ میں خوب خوب اپنی بہادری کے جوہر دکھائے یہاں تک کہ سب نے اس کا لوہا مان لیا۔ 'اَبْلَى اللّٰهُ عِبَادَهٗ بَلَآءً حَسَنًا' کے معنی ہوں گے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے اچھے جوہر نمایاں کیے۔ 'وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ' کا معطوف علیہ یہاں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق محذوف ہے۔ اس لیے کہ اوپر کے الفاظ سے وہ خود بخود واضح ہے۔ اس محذوف کو کھول دیجیے تو گویا پوری بات یوں ہوگی "تاکہ اللہ اپنی نصرت کی شانیں دکھائے اور مسلمانوں کے جوہر اچھی

طرح نمایاں کر دے۔

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ کی صفات سمع و علم کے حوالے سے یہاں مقصود مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا ہے کہ خدا کسی بات سے بھی بے خبر نہیں رہ وہ اپنے بندوں کی دعائیں اور فریادیں ہر وقت سنتا اور ان کی ضرورتیں اور حاجتیں ہر لمحہ جانتا ہے۔ بدر میں اس کی تائیدات کا بروقت ظہور اس کی تازہ شہادت ہے۔

ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ذٰلِكُمْ جب اس طرح آتا ہے تو یہ پورے جملے کا قائم مقام ہوتا ہے اور اس کے بعد جو حرفِ ربط آتا ہے اس کا تعلق اس مخفی مضمون سے ہوتا ہے جو اس کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا کی تائید و نصرت کی یہ شانیں جو ظاہر ہوئیں یہ تمہارے لیے نقد ہیں اور مزید براں یہ ہے کہ خدا کفار کی ساری چالیں جو وہ تمہارے خلاف چلیں گے بودی ثابت کرتا رہے گا۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ جملہ ٹھیک ٹھیک اوپر کے جملہ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ کا متقابل جملہ ہے یعنی کفار کے لیے یہ چپت نقد ہے جو ان کو بدر میں لگی اور تمہارے لیے یہ فتح عظیم نقد ہے جو تمہیں حاصل ہوئی اب آگے ان کے لیے دوزخ ہے اور تمہارے لیے یہ بشارت کہ کفار کی سازشوں کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے اور دین حق کا بول بالا ہو گا۔

جنگ بدر کفار کی ایک سازش تھی

كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ کے الفاظ سے وہ بات صاف نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے پیچھے اشارہ کیا ہے کہ یہ جنگ قریش کے لیڈروں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے قافلۂ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراش کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ آگے آیت ۴۲ کے تحت واضح ہو گا، بروقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سازش سے باخبر کر دیا اور مسلمان مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کو کید کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی چال اور سازش کے ہیں۔ آگے آیت ۴۸ سے ان شاء اللہ یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ اس سازش میں یہود بھی شریک تھے۔

اجزا کی وضاحت کے بعد آیت کے سیاق و سباق پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو جس جان بازی و سرفروشی کی دعوت دی گئی ہے یہ اسی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ تم کیوں جان چراؤ اور کیوں پیٹھ دکھاؤ جب کہ تم نہیں لڑتے بلکہ تمہاری طرف سے خدا لڑتا ہے۔ لڑتا دراصل خدا ہے البتہ وہ تمہارے لیے میدان فراہم کرتا ہے کہ تمہارے جوہر نمایاں ہوں اور تم دین و دنیا دونوں کی سرفرازی حاصل کرو۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۹)

جنگ بدر فیصلہ کی میزان

اس آیت میں براہ راست قریش کو مخاطب کر لیا گیا ہے کہ بولو، اب کیا کہتے ہو؟ تم یہی تو کہتے تھے کہ اس جنگ میں جو جیتا وہ حق پر سمجھا جائے گا تو فتح تو تمہارے سامنے آگئی۔ یہ بات بھی یہاں ملحوظ رہے کہ قریش کے لیڈروں نے اپنی کثرتِ تعداد کے نشہ میں اس موقع پر خوب بڑھ بڑھ کے تقریریں کیں۔ چونکہ

ان کو اپنی فتح کا سو فی صدی یقین تھا اس وجہ سے انھوں نے اس جنگ کو فیصلہ کی میزان ٹھہرا لیا کہ یہ میزان جو فیصلہ کر دے گی وہ اس کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں گے۔ ابوجہل اس جنگ کے برپا کرنے میں سب سے زیادہ سرگرم تھا۔ اس کی یہ دعا کتابوں میں مذکور ہے کہ اللھم اقطعنا للرحم فاحنہ الغداۃ (اے اللہ فریقین میں سے جو سب سے زیادہ قطع رحم کا مجرم ہوا ہے تو کل اس کو کچل دیجیو) قرآن نے قریش کی انھی لن ترانیوں کو سامنے رکھ کر کہا کہ اگر اس جنگ کی فتح پر فیصلہ کا انحصار تھا تو اس قاضی کا فیصلہ تو صادر ہو گیا۔

یہ امر بیاں ملحوظ رہے کہ غزوۂ بدر کی اسی خاص نوعیت کی بنا پر قرآن نے اس کو یوم الفرقان سے تعبیر فرمایا ہے یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والی جنگ۔ آگے آیت ۳۲ کے تحت یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ قریش علانیہ بڑی ڈھٹائی سے یہ کہتے تھے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت حق ہے تو خدا ہم پر پتھر برسا دے یا کوئی اور عذاب ہم پر آجائے تب ہم مان لیں گے۔

نصیحت اور فضیحت دونوں

وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ میں نصیحت بھی ہے، فضیحت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ بہتر ہے کہ اس سے سبق لو اور اگر سبق نہ لیا تو یاد رکھو کہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑو گے اپنی ہی شامت بلاؤ گے۔ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ میں کھلی ہوئی دھمکی ہے کہ اگر تم نے اس قسم کی شرارت پھر کی تو یاد رکھو کہ ہم کہیں چلے نہیں جائیں گے، تمھارا سر کچلنے کے لیے اسی طرح ہم پھر آموجود ہوں گے۔ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ اور تمھاری جمعیت تمھارے کچھ کام نہ آسکے گی، تخواہ کتنی ہی زیادہ ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ واحد چیز جو تم سوچ سکتے ہو یہی ہے کہ آیندہ مزید قوت و شوکت کے ساتھ حملہ کرو، سو یہ چیز بھی تمھارے کچھ کام آنے والی نہیں۔ بس یہ ہوگا کہ ہماری بھٹی کے لیے کچھ اور ایندھن فراہم کر کے لاؤ گے۔ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ، یہ ٹکڑا ساری آیت کی جان ہے اور اس کے دو لفظوں میں کفار کے لیے دھمکیوں کا اور اہل ایمان کے لیے بشارتوں کا ایک جہان ہے۔ فرمایا کہ اب آئے جس کو آنا ہو اور لڑے جس کو لڑنا ہو اور جمع کرے وہ جتنی جمعیت جمع کر سکتا ہو، اہل ایمان کے ساتھ ہم ہیں ہم!! سبحان اللہ

کیا غم ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

۴- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۰-۲۸

مسلمانوں کی تربیت و اصلاح اور تطہیر و تنظیم کا وہی مضمون جو اوپر سے چلا آ رہا ہے اپنے تدریجی انکشافات کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور جن لوگوں کی کمزوریاں اس تقریر کی محرک ہوئی ہیں ان کو کچھ کھلی ہوئی دھمکیاں بھی دی گئی ہیں اور مجموعی طور پر مسلم معاشرہ کو بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنے پیش و عقب سے آگاہ رہو، معاشرے کی برائیاں اور بھلائیاں دونوں مشترک ہوتی ہیں۔ اگر کچھ لوگوں نے کوئی فتنہ برپا

کرنے کی کوشش کی اور دوسروں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہ کی تو بالآخر وہ فتنہ نیک و بد سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اللہ و رسول کی اطاعت پر جم جاؤ، ان یہود کی روش سے بچو جو اپنے رسول کے سامنے تو دعوے کرتے کہ ہم نے مانا لیکن وہ مانتے نہیں تھے۔ پیغمبر کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہے اس پر دل و جان سے لبیک کہو۔ جو لوگ پیغمبر کی دعوت سن اور سمجھ کر بھی اس کے لیے اپنے دلوں کے دروازے نہیں کھولتے، ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان خدا کا قانون حائل ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۰-۲۸

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾ وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٧﴾ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٨﴾

ع ۳ / ۱۷

ترجمۂ آیات ۲۰ - ۲۸

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو جب کہ تم سن رہے ہو اور ان لوگوں کی روش نہ اختیار کرو جو دعویٰ تو کرتے کہ ہم نے سنا لیکن سنتے سناتے کچھ نہیں تھے۔ اللہ کے نزدیک بدترین جانور یہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور اگر اللہ ان میں کوئی صلاحیت دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق دیتا اور اگر صلاحیت بدوں ان کو سنواتا تو وہ اعراض کرتے ہوئے منہ پھیرتے۔ ۲۰ - ۲۳

اے ایمان والو! اللہ و رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ رسول تمھیں اس چیز کی دعوت دے رہا ہے جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جایا کرتا ہے اور یاد رکھو کہ اسی کی طرف تمھارا اکٹھا ہونا ہے اور بچتے رہو اس فتنہ سے جو مخصوص طور پر انہی لوگوں کو نہیں لاحق ہو گا جنھوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہو گا اور جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۲۴ - ۲۵

اور یاد کرو جب کہ تم تھوڑے اور ملک میں دبے ہوئے تھے، ڈرتے تھے کہ لوگ تمھیں اچک نہ لیں تو خدا نے تمھیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے نوازا اور تم کو پاکیزہ روزی دی تاکہ شکر گزار رہو۔ اے ایمان والو، اللہ و رسول سے بے وفائی اور اپنی امانتوں میں خیانت جانتے بوجھتے نہ کرو اور جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد فتنہ ہیں اور یہ کہ اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔ ۲۶ - ۲۸

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُونَ ۝ (۲۰-۲۳)

خطاب عام لیکن روئے سخن خاص لوگوں کی طرف

'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا' خطاب اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن روئے سخن انہی کمزور اور منافق لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر شروع سے چلا آ رہا ہے۔ قرآن کا عام انداز یہی ہے کہ کمزوروں اور منافقوں کی غلطیوں پر گرفت بھی فرماتا ہے تو ان کا ذکر بصیغۂ عام ہی کرتا ہے کہ ان کا فضیحتا نہ ہو اور اگر وہ اصلاح قبول کرنا چاہیں تو قبول کر لیں۔ رہے اچھے لوگ تو وہ بہر حال اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گویا دوسروں کی غلطیاں ان کے اپنے علم و عمل کو پختہ کرنے کے لیے مزید اسباب فراہم کر دیتی ہیں۔

رسول سے اعراض اللہ سے اعراض کے ہم معنی ہے

'أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ' میں فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی اللہ و رسول کی اطاعت اس طرح کرو جس طرح ایمان کا تقاضا ہے۔ 'وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ'، یعنی رسول کی عین موجودگی میں، جب کہ دونوں کانوں سے اس کی دعوت سن رہے ہو، اس سے اعراض نہ کرو۔ 'وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ' کے الفاظ ان کے رویہ کی شناعت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ جب تم رسول کی موجودگی میں ٹھوکر کھاؤ گے تو کل کو تمہارا کیا حال ہوگا؟ جو لوگ پورے دن کی روشنی میں گرتے ہیں ان کے پاس ان کے گرنے کے لیے کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ 'عَنْهُ' کی ضمیر رسول کی طرف لوٹتی ہے حالانکہ اوپر ذکر اللہ و رسول دونوں کا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسول سے اعراض اللہ سے اعراض کے ہم معنی ہے، جس نے رسول سے منہ موڑ لیا اس نے خدا سے منہ موڑ لیا۔ خدا سے تعلق اور اس کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کا رسول ہی ہے۔

ایک اشارہ یہود کی طرف

'وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ' یعنی ان لوگوں کے مانند نہ بنو جو دعویٰ تو 'سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا' کا کرتے لیکن عمل ان کا 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' پر ہوتا۔ بات اگرچہ اشاروں میں کہی گئی ہے لیکن قرآن کا ہر ذوق رکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ یہ اشارہ یہود کی طرف ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت سے سورۂ بقرہ میں بتایا ہے کہ یہود کہتے تو 'سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا' ہیں لیکن عمل ان کا 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' پر ہوتا ہے اور اس بات کی بھی قرآن نے تصریح کی ہے کہ ان کا یہ رویہ اس کے رسول کی عین موجودگی میں رہا ہے۔ گویا در پردہ ان منافق قسم کے مسلمانوں کو یہ بتا دیا گیا کہ تمہارا یہ طرزِ عمل اتباعِ رسول نہیں بلکہ اتباعِ یہود ہے۔ ایمان کا دعویٰ ہے تو اس مغضوب قوم کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔

خدا کے نزدیک بدترین جانور

'إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ' - اگرچہ لہجہ کی درشتی اوپر والے ٹکڑے میں جھلک رہی تھی لیکن اس ٹکڑے میں بالکل نمایاں ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ خدا کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ مطلب یہ کہ اگر تم سب کچھ

سن کر اسی طرح بہرے گونگے بنے اور رسول کی ستی ان سنی کرتے رہے۔ عقل و فہم سے تم نے کام نہ لیا تو تم خدا کے نزدیک بدترین جانور رہو۔ قرآن نے جگہ جگہ یہود اور مشرکین کو بدترین جانور کہا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انھوں نے سننے سمجھنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جو گروہ بھی ان کی روش اختیار کرے گا وہ انھی میں سے ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ انسان کا اصلی وصف امتیازی اس کا سننا سمجھنا ہی ہے۔ اس وصف سے یہ اپنے کو محروم کرے تو بس یہ دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہی ہے اور جانور بھی بدترین جانور۔ بدترین اس لیے کہ جانور خواہ کتنا ہی برا ہو وہ اپنی جبلت پر قائم رہتا ہے اور اپنے محل میں اس کی ایک قیمت اور اس کی ایک افادیت ہے لیکن انسان اپنی خصوصیت نوعی سے محروم ہو جائے تو اس کے آگے شیطان بھی اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ یہ عقل و بصیرت سے کام لے تو جس طرح اس کے عروج کی کوئی حد نہیں اسی طرح عقل و بصیرت سے محروم ہو جانے کی صورت میں اس کی پستی کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ یہ ایک دفع دخل مقدر یعنی ایک پیدا ہونے والے شبہے کا برسر موقع جواب ہے۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سننے سمجھنے ہی پر انسان کی انسانیت کا انحصار ہے اور اس سے محرومی خدا کو اس درجہ ناپسند ہے کہ اس سے محروم ہو کر انسان اس کے نزدیک بدترین جانور بن جاتا ہے تو وہ اپنی قدرت سے ان کے کان کھول کیوں نہیں دیتا اور ان کی عقل پر پڑے ہوئے پردے ہٹا کیوں نہیں دیتا؟ اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ اللہ اگر ایسے لوگوں کے اندر کوئی صلاحیت پاتا تو ان کو سننے سمجھنے کی توفیق دیتا۔ یہ صلاحیت ان کے اندر اس نے نہیں پائی اس وجہ سے ان کو توفیق نہیں بخشی۔ یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت ہم بار بار کر چکے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں خدا کا قانون یہ ہے کہ اس نے ہر انسان کے اندر خیر و شر کے امتیاز کی صلاحیت بخشی ہے جو لوگ اس کو زندہ رکھتے اور اس سے کام لیتے ہیں ان کو مزید ہدایت ملتی ہے اور وہ درجہ بدرجہ علم و عمل میں ترقی کرتے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ان لوگوں کا حال ہوتا ہے جو خدا کی اس ودیعت کردہ فطری صلاحیت کو ضائع کر بیٹھتے ہیں ان کو مزید ہدایت ملنا تو الگ رہا، قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ان کو جو ہدایت فطرت سے ملی ہوئی ہوتی ہے وہ بھی سلب ہو جاتی ہے۔ سیدنا مسیح نے اس حقیقت کو نہایت بلیغ پیرایہ میں یوں سمجھایا ہے کہ جو غلام ایک پیسہ میں چور ثابت ہوا اس کو اس کا مالک ایک لاکھ کی امانت کیسے سونپے گا؟

ہدایت و ضلالت کے باب میں

وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ یعنی اگر بدون اس صلاحیت کے خدا ان کے اندر ہدایت ڈالنا توڑ لنے کو تو وہ ڈال دیتا لیکن وہ ان کے اندر جڑ نہ پکڑتی، ان کی طبیعتیں اس سے ابا کرتیں

بالآخر وہ اس کو اگل دیتے۔ غذا کتنی ہی صالح ہو لیکن معدہ فاسد ہو چکا ہو تو وہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ آدمی لقمہ حلق سے اتار تو لیتا ہے لیکن بڑی جلدی قے کر دیتا ہے۔ ایک پودے کی صحیح نشو و نما کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذات سے تندرست ہو بلکہ اس کے لیے زمین کی زرخیزی بھی مطلوب ہوتی ہے۔ ایک مالی اگر ایک بنجر زمین میں عمدہ سے عمدہ پودا لگا دے تو لگانے کو تو وہ لگا دے گا اور چند روز وہ پودا اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل پر زندہ بھی رہے گا لیکن جب زمین کے اندر سے اس کے مزاج کے مطابق اس کو مطلوب غذا نہیں ملے گی تو بالآخر وہ سوکھ جائے گا۔ ٹھیک یہی حال نیکی اور ہدایت کے بیج کا بھی ہے۔ یہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق نشو و نما صالح فطرت کی زمین کے اندر پاتا ہے۔ اگر کسی شخص کی فطرت کی زمین شور ہو چکی ہو تو یہ بیج ڈالنے کو تو قدرت اس کے اندر بھی ڈال سکتی ہے لیکن قدرت ہی کا قانون یہ ہے کہ وہ اس کے اندر نشو و نما نہ پا سکے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَجِيبُوا۟ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ وَأَنَّهُۥٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (۲۴)

اللہ و رسول کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہے

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان کی انسانیت کا انحصار اس کی عقل و بصیرت پر ہے اور اس کی زندگی عبارت ہے اس کی روح اور اس کے دل کی زندگی سے۔ اگر وہ صحیح بات سوچنے سمجھنے سے عاری اور کلمۂ حق سننے اور ماننے سے محروم ہو جائے تو درحقیقت وہ اپنے منشائے تخلیق کے اعتبار سے مردہ ہے۔ چنانچہ قرآن نے کفار کو جگہ جگہ مردہ کہا ہے۔ اللہ و رسول کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہوتی ہے اسی کو قبول کرنے سے بصارت کو بصیرت نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے عقل کو وہ نور حاصل ہوتا ہے جو آفاق و انفس کے اسرار و حقائق سے اس کے لیے پردے اٹھاتا ہے۔ اس سے دل کو وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جو اس کو ایک مضغۂ گوشت سے تجلیات و انوارِ الٰہی کا ایک آئینہ بنا دیتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ و رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو اس لیے کہ اسی سے تم کو حقیقی اور جاوداں زندگی حاصل ہوگی۔ سیدنا مسیح نے اس حقیقت کو یوں واضح فرمایا کہ انسان روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔ اس مضمون کی وضاحت انعام کی آیت ۱۲۲۔ أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَٰهُ الآیہ کے تحت ہو چکی ہے۔

ایک نہایت سخت تنبیہ

وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ وَأَنَّهُۥٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے ان لوگوں کے لیے جو کسی دعوت خیر بالخصوص پیغمبر کی حیات بخش دعوت کی قدر نہیں کرتے بلکہ گونگے بہرے بن جاتے ہیں۔ فرمایا کہ یاد رکھو، جو لوگ یہ روش اختیار کرتے ہیں ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان خدا حائل ہو جایا کرتا ہے۔ خدا کے حائل ہونے سے مراد یہاں خدا کے قانون کا حائل ہو جانا ہے۔ اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جو باتیں خدا کے قانون اور اس کی مقررہ سنت کے تحت ظہور میں آتی ہیں، بسا اوقات اللہ تعالیٰ نے ان کو

براہ راست اپنے فعل کی حیثیت سے تعبیر فرماتا ہے۔ 'خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ' کے تحت یہ بحث تفصیل سے گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دل پھر ایسے عنان گسیختہ اور بے قابو ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کو کسی طرح بھی قابو میں نہیں لا سکتے۔ انسان کا دل جب برائیوں کے پیچھے لگتا ہے تو ایک خاص حد تک تو اس کا حال یہ رہتا ہے کہ انسان اگر متنبہ ہو جائے اور اس کو روکنا چاہے تو روک سکتا ہے اور اس کو اصلاح کی راہ پر لگا سکتا ہے لیکن جب اس حد سے دل آگے بڑھ گیا اور انسان کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس کو لگام دے تو پھر نہ آدمی کا ہاتھ باگ پر رہ جاتا ہے اور نہ پاؤں رکاب میں بلکہ وہ دل کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔ نبی کی دعوت، جیسا کہ اوپر گزرا، آنکھوں، کانوں اور دلوں کو کھولنے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر دعوت ہوتی ہے اس وجہ سے جو لوگ اس دعوت سے اپنے کان بند کر لیں وہ خدا کے اس قانون کی زد میں آجاتے ہیں۔ جس کو قرآن نے 'ختم قلوب' یا 'رین' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہاں قرآن نے کمزور اور منافق قسم کے لوگوں کو اسی چیز سے ڈرایا ہے کہ ابھی فرصت باقی ہے، سنبھلنا چاہو تو سنبھل سکتے ہو، نہ سنبھلے، اسی طرح اپنی بیماریوں کی پرورش کرتے رہے تو پھر تمھارے دل اسی طرح مسخ اور مختوم ہو جائیں گے کہ کوئی صیقل بھی ان پر کارگر نہ ہو سکے گا۔ مزید برآں یہ بات بھی یاد رکھو کہ معاملہ یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ آگے خدا کے حضور میں بھی حاضر ہونا ہے۔ اس دن کے احوال و نتائج کو بھی سوچ لو۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲۵)

ہر شخص پر معاشرے کی اصلاح کی بھی ذمہ داری ہے

یہ خطاب پورے معاشرے سے عموماً اور ان لوگوں سے خصوصاً ہے جن پر انفرادی اصلاح کا رجحان غالب تھا اور اس رجحان کے سبب سے انھیں اس امر سے کچھ زیادہ تعلق خاطر نہ تھا کہ دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جھنجھوڑنے کے لیے فرمایا کہ اپنے معاشرے کے اندر ابھرنے والی خرابیوں سے بے تعلق نہ رہو بلکہ اپنے امکان اور اپنی صلاحیت کے حد تک اس کی اصلاح کی کوشش کرو اس لیے کہ معاشرے میں اگر کوئی خرابی جڑ پکڑ لے تو وہ بالتدریج ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور جب وبائے عام کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اس کے برے اثرات و نتائج انہی لوگوں کی حد تک محدود نہیں رہتے جو بالفعل ان برائیوں میں ملوث ہوتے ہیں بلکہ ان خرابیوں پر راضی یا خاموش رہنے والے بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں اگرچہ وہ عملاً ان میں مبتلا نہ ہوں۔

اس حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی کے مسافروں کی تمثیل سے سمجھایا ہے کہ اگر کچھ لوگ ایک کشتی میں سفر کریں، کچھ اس کے اوپر کے حصے میں، کچھ نیچے والے حصے میں، نیچے والے یہ محسوس کر کے کہ انھیں پانی کے لیے اوپر جانے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے، یہ فیصلہ کریں کہ ہم کیوں نہ کشتی کے نیچے کے حصے میں سوراخ کر لیں اور اوپر والے یہ خیال کر کے کہ وہ اپنے حصے میں سوراخ کر رہے ہیں، ہمیں اس سے کیا سروکار، اس پر خاموش رہیں تو نیچے والوں کے اس فعل کے نتیجہ میں جب کشتی ڈوبے گی تو اوپر والوں اور

نیچے والوں دونوں کو لے کر ڈوبے گی۔

اس بنیاد پر اسلام نے ہر شخص پر دوسروں کو برائی سے روکتے رہنے کی ذمہ داری ڈالی ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے جو شخص بھی کوئی برائی دیکھے، اگر ہاتھ سے اس کو روک سکتا ہو تو ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے نہ روک سکتا ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے۔ اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے۔ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

یہ آیت جس سیاق میں آئی ہے اگر اس سیاق پر نظر ڈالیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو حق کو ماننے کا زبان سے تو مدعی ہے لیکن اس کے مطالبات پورے کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ان کو قرآن نے اس بات سے ڈرایا ہے کہ ایسے لوگ اگر اپنے رویے کی اصلاح نہیں کرتے تو خدا کا قانون ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو حق کو مانتے ہیں لیکن اس حق سے انھیں اتنا لگاؤ نہیں ہوتا کہ وہ اس کی خاطر دوسروں کی ناراضگی مول لینے کے لیے تیار رہوں، ان لوگوں کو اس بات سے ڈرایا کہ اگر معاشرے میں کوئی برائی پھیل گئی تو اس کے نتائج بد سے یہ لوگ بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ محفوظ صرف وہ لوگ رہیں گے جو اپنی صلاحیت کی حد تک اپنا حق نصیحت ادا کرتے رہیں گے۔ قطع نظر اس سے کہ کوئی ان کی بات سنتا ہے یا نہیں اور خوش ہوتا ہے یا ناخوش۔

'وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ' یہ پاداش عمل کے قانون کے بے لچک اور بے رو رعایت ہونے کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے قوانین جس طرح جسمانیات و مادیات میں بے لچک ہیں اسی طرح اخلاقیات میں بھی بے لچک ہیں۔ فاسد آب و ہوا میں سانس لینے والا جس طرح آب و ہوا کے فساد سے لازماً متاثر ہوتا ہے اگر وہ ضروری احتیاطیں نہ کرے، اسی طرح بُرے ماحول میں زندگی گزارنے والا اس کے برے عواقب کی زد میں آجاتا ہے، اگر وہ شرطیں وہ ملحوظ نہ رکھے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ اس معاملے میں قانون الٰہی کسی کی رعایت اور کسی کی جانبداری نہیں کرتا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲۶)

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں پر کے انعامات

اطاعت اللہ اور اطاعت رسول کے جس مطالبہ سے یہ کلام چلا ہے اس کو مؤکد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اپنے انعامات گنائے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اللہ و رسول نے جس راہ کی تمھیں دعوت دی ہے اب تک تم نے دیکھا کہ اس راہ میں ہر قدم پر اس نے تمھیں سہارا دیا ہے۔ تم تھوڑے تھے، کمزور اور دبے ہوئے تھے، ڈرتے تھے کہ قریش تمھیں اچک نہ لیں تو خدا نے تمھیں مدینہ میں پناہ دی، بدر میں اپنی خاص نصرت سے تمھیں نوازا، تمھارے لیے پاکیزہ معاش و معیشت کی راہیں کھولیں۔ یہ سب باتیں مقتضی ہیں کہ تم خدا کے شکر گزار اور اس کے دین کے کارگزار بندے بنو۔ اس اندیشے میں مبتلا نہ ہو کہ

اس راہ پر چل کر تم کسی خطرے میں پھنس جاؤ گے۔ جس نے اب تک تمہارے ساتھ اتنا اچھا معاملہ کیا ہے، یہ گمان نہ کرو کہ وہ آئندہ تمہارے ساتھ کوئی برا معاملہ کرے گا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (۲۷-۲۸)

ہر عہد ایک امانت ہے

یہ آیت ٹھیک آیت ۲۴ کے مقابل میں ہے۔ اس میں جس بات کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کے ضد سے اس میں روکا گیا ہے اور 'لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' میں جس شکرگزاری کا حق یاد دلایا گیا ہے اس کے منافی رویہ سے اس میں باز رہنے کی تاکید ہے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ شکر کی اصلی حقیقت خدا کا حق پہچاننا، اس کا اعتراف کرنا اور خلوص کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ اس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اللہ و رسول سے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا اقرار کر کے بے وفائی اور غداری نہ کرے بلکہ ہر حال میں اس عہد کو پورا کرے۔ ہر عہد ایک امانت ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی خلاف ورزی خفیہ ہو یا علانیہ، خیانت ہے۔

لفظ امانت کا وسیع مفہوم

'وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' یہ اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جو بقرہ ۴۲ 'وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم بیان کر چکے ہیں کہ لائے نفی کا اعادہ نہ کرنا اس بات کا قرینہ ہے کہ حق اور باطل کو گڈمڈ کرنا اخفائے حق کو مستلزم ہے۔ اسی طرح یہاں ہر چند یہ جملہ 'لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ' کے تحت ہی ہے لیکن صرف نہی کا اعادہ نہیں فرمایا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ و رسول سے خیانت ہی ہے جو لوگوں کے لیے اپنی امانتوں اور ذمہ داریوں میں خیانت کے لیے راہ کھولتی ہے۔ لفظ 'امانت' پر ہم نساء آیت ۵۸ کے تحت تفصیل سے بحث کر آئے ہیں کہ قرآن میں یہ لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ تمام حقوق اور ذمہ داریاں خواہ وہ کسی عہد و اقرار کے تحت عائد ہوتی ہوں یا حق اور ذمہ داری کے معروف فطری قانون کے تحت سمجھی اور مانی جاتی ہوں یا وہ صلاحیتیں اور نعمتیں ہوں جو انسان کو ودیعت ہوتی ہیں سب اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں فرمایا کہ جانتے بوجھتے ان امانتوں میں کوئی خیانت نہ کرو۔ 'وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' کا ٹکڑا یہاں جس سیاق میں ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ لوگ، جن کی طرف اشارہ ہے جانتے بوجھتے یہ حرکت کر رہے تھے اور مقصود اس ٹکڑے کے لانے سے ان کی مذمت ہے لیکن بجائے خود یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ شریعت میں کوئی فعل جرم اسی وقت بنتا ہے جب اس کا ارتکاب علم اور ارادے کے ساتھ کیا جائے۔

اصل بیماری

'وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ' یہ اصل بیماری کا پتہ دیا ہے کہ جو لوگ خدا اور رسول کی محبت و اطاعت میں کمزور ہیں وہ درحقیقت مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہیں۔ مال و اولاد کی محبت جب اس درجہ غالب آجائے کہ آدمی ان کے پیچھے خود اس کے حقوق و فرائض سے جی چرانے لگے

جس کے فضل سے مال و اولاد ملے ہیں تو پھر مال و اولاد فتنہ بن جاتے ہیں۔ خدا اور رسول سے بے وفائی ہو یا دوسروں کے حقوق میں خیانت، اگر اس کے اسباب کا سراغ لگایا جائے تو اس کی تہ میں انہی دونوں چیزوں کی حد سے بڑھی ہوئی محبت نکلے گی۔ اس اعتبار سے یہ نفاق کا سب سے بڑا دروازہ ہیں اور اسی پہلو سے ان کو فتنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس فتنہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس اجرِ عظیم کو یاد رکھے جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے محفوظ کیا ہے جو مال یا اولاد کی محبت میں خدا اور رسول سے بے وفائی نہیں کرتے بلکہ جب ان کے سامنے کوئی ایسی آزمائش آتی ہے جس میں ایک طرف خدا اور رسول کی خوشنودی ہو، دوسری طرف مال و اولاد کی محبت تو وہ ہمیشہ خدا اور رسول کی طرف جھکتے ہیں، فرمایا کہ ایسے باوفاؤں کے لیے اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے۔

۶۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۹-۴۰

آگے پہلے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ اگر تم اللہ کے عہد و پیمان پر مضبوطی سے قائم رہے، مال و اولاد کی محبت میں پھنس کر تم نے کمزوری نہ دکھائی تو جلد وہ وقت آ جائے گا کہ وہ تمہارے لیے فرقان نمایاں کرے گا اور وہ سارے حجابات چاک ہو جائیں گے جو آج حق کے پوری طرح نمایاں ہونے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد اپنی اس بہترین تدبیر کی طرف اشارہ فرمایا جو اس نے اپنے رسول کو کفار کی متفقہ سازش سے بچانے اور اس کے لیے ہجرت کی راہ کھولنے کے لیے اختیار فرمائی۔ یہ ہجرت غلبۂ اسلام کا دیباچہ اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی تمہید ہوئی۔ اب تک کفار قرآن کے انذار کا مذاق اڑا رہے تھے، وہ کہتے تھے اگر یہ دعوت حق ہے تو اللہ ہم پر کوئی عذاب کیوں نہیں بھیج دیتا؟ لیکن اللہ نے ان پر عذاب نہیں بھیجا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم پر فیصلہ کن عذاب نہیں بھیجتا جب تک پیغمبر ان کے اندر موجود رہتا ہے لیکن اب جب کہ پیغمبر اور مومنین ہجرت کر چکے ہیں عذاب کے آنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی ہے۔

پھر کفار کے مستحقِ عذاب ہونے کے وجوہ بیان ہوئے ہیں۔ بیت اللہ کی تولیت اور دینداری کے ادعائے میں وہ جو یہ گمان کیے بیٹھے تھے کہ وہ خدا کے دین کو تھامے ہوئے ہیں، فرمایا کہ ان پر یہ غلط... اب ختم ہو جانے کا وقت آگیا ہے۔ اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین سے روکنے اور اس دین کو شکست دینے کے لیے وہ جو زر پاشیاں کر رہے ہیں یہ ان کے لیے عنقریب سرمایۂ حسرت بنیں گی۔ وہ دنیا میں شکست کھائیں گے اور آخرت میں اللہ ان سب کو اکٹھا کر کے جہنم میں جھونک دے گا۔

آخر میں قریش کو دھمکی ہے کہ بہتر ہے کہ وہ اپنی روش بدلیں اور اس دعوت کو قبول کر لیں، ورنہ یاد

رکھیں کہ ان کے سامنے بھی وہی انجام آنے والا ہے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والی پچھلی قوموں کے سامنے آچکا ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت ہے کہ ان سے جنگ جاری رکھو تا آنکہ فتنہ کا قلع قمع ہو جائے اور اس سرزمین پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہے۔ اللہ تمہارا یار و ناصر ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۴۰

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۲۹﴾ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴿۳۰﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا ۙ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۳۱﴾ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِن كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِندِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۳۲﴾ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۳۵﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ

يُغْلَبُوْنَ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

ع ۹ ۱۸

ترجمۂ آیات ۲۹-۴۰

اے ایمان لانے والو، اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے تو وہ تمھارے لیے فرقان نمایاں کر دے گا اور تم سے تمھارے گناہ جھاڑ دے گا اور تمھاری مغفرت فرمائے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ خیال کرو جبکہ کفار تمھارے باب میں سازش کر رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ سازش کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر فرما رہا تھا اللہ بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔ ۲۹-۳۰

اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتیں، کہتے، بس سن لیا۔ اگر ہم چاہیں ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کر دیں۔ یہ تو بس اگلوں کے فسانے ہیں اور یاد کرو جب انھوں نے کہا کہ اے اللہ اگر یہی حق ہے تیرے پاس سے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب لا۔ اور اللہ ان کو عذاب دینے کا روادار نہ تھا جب کہ تم ان میں موجود تھے اور اللہ ان کو عذاب دینے کا روادار نہیں ہو سکتا جب کہ وہ مغفرت کے طلب گار ہوں۔ اور ان کو کیوں نہ عذاب دے گا جب کہ وہ مسجد حرام سے

روک رہے ہیں درآنحالیکہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو صرف خدا سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت سے واقف نہیں اور بیت اللہ کے سامنے ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا کچھ نہیں۔ تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ ۳۱-۳۵

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے وہ اپنے مال اللہ کی راہ سے روکنے کے لیے خرچ کر رہے ہیں۔ وہ اس کو خرچ کریں گے، پھر یہ ان کے لیے سرمایۂ حسرت بنے گا، پھر یہ مغلوب ہوں گے اور یہ کافر جمع کر کے جہنم کی طرف ہنکائے جائیں گے تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے چھانٹ کر الگ کرے اور خبیث کو ایک دوسرے پر ڈھیر کرے، پھر اس کو جہنم میں جھونک دے۔ یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔ ۳۶-۳۷

ان کفر کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر یہ باز آجائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے وہ معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ پھر یہی کریں گے تو اگلوں کے باب میں سنت الٰہی گزر چکی ہے اور ان سے جنگ کرو تاآنکہ فتنہ کا قلع قمع ہو جائے اور سارا دین اللہ کا ہو جائے۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر انھوں نے اعراض کیا تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا مولیٰ و مرجع ہے۔ کیا ہی خوب مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار!! ۳۸-۴۰

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۹)

'فرقان' کا مفہوم

'فُرْقَان' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دے۔ یہ امتیاز پیدا کرنے والی شے داخلی بھی ہو سکتی ہے، خارجی بھی، علمی اور عقلی بھی ہو سکتی ہے، عملی اور واقعاتی بھی۔ قرآن نے دلائل

براہین کو فرقان کہا ہے جیسا کہ بقرہ آیت ۱۸۵ میں ہے، اس لیے کہ ان سے حق و باطل میں امتیاز ہوتا ہے۔ خود قرآن بلکہ اصل تورات کے لیے بھی ایک سے زیادہ مقامات میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس لیے کہ اللہ نے یہ کتابیں حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لیے اتاریں۔ اسی طرح اس سورہ کی آیت ۴۱ میں غزوہ بدر کو فرقان سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے کہ اس جنگ نے واقعات کی دنیا میں یہ دکھا دیا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔

مسلمانوں سے غلبہ کا وعدہ

اس آیت میں مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم تقویٰ پر مضبوطی سے جمے رہے، یعنی اللہ و رسول کے ساتھ بدعہدی و بے وفائی کے مرتکب نہ ہوئے تو اللہ جلد وہ وقت لائے گا کہ مطلع پر جو غبار نظر آ رہا ہے یہ سب چھٹ جائے گا اور حق اس طرح غالب ہو کر چمکے گا کہ دشمنوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گی۔ قرینہ بتا رہا ہے کہ یہاں یہ لفظ اسلام اور مسلمانوں کے کامل غلبہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اگرچہ ایک فرقان کا ظہور معرکۂ بدر میں بھی ہو چکا تھا جس کو مسلمان دیکھ چکے تھے تاہم ابھی باطل دہنے بائیں ہر طرف سے مسلمانوں کو گھیرے ہوئے تھا اس وجہ سے ایک گروہ تذبذب کی حالت میں مبتلا تھا اور یہی تذبذب اس کو ان کمزوریوں میں مبتلا کر دیتا تھا جو اوپر زیر بحث آئی ہیں۔ اس طرح کے مذبذب لوگوں کو حق پر جمانے کے لیے فرمایا کہ وہ وقت دور نہیں ہے جب باطل کی یہ ساری گھٹائیں چھٹ جائیں گی اور آفتاب حق اپنی پوری تابانی سے تمہارے سامنے آ جائے گا۔ بس یہ شرط ہے کہ تم اللہ و رسول کی اطاعت اور تقویٰ پر جمے رہو۔

وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ الایہ یہاں 'سیئات' سے مراد وہ چھوٹی موٹی غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں جو بشر کی بشریت کا لازمہ ہیں۔ فرمایا کہ اگر بڑے جرموں سے تم بچتے رہے تو اللہ تعالیٰ فروگزاشتوں اور کوتاہیوں پر تمہیں نہیں پکڑے گا، وہ بڑے فضل والا ہے۔ کبائر سے بچنے والوں کے صغائر معاف ہو جاتے ہیں۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (۳۰)

'اثبات' کا اصل لغوی مفہوم پابند کر دینا، روک دینا ہے، جس میں قید کر دینا بھی شامل ہے۔

قریش کی سازشوں کی طرف اشارہ

یہ دارالندوہ کی اس سازش کی طرف اشارہ ہے جو قریش کے لیڈروں نے آپ کی دعوت حق کو یک قلم ختم کر دینے کے لیے کی۔ اس کے لیے مختلف لیڈروں کی طرف سے مختلف تجویزیں پیش ہوئیں۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و بحث کے بعد قتل کی تجویز پر اتفاق ہوا اور قتل کی یہ تدبیر سوچی گئی کہ قریش کے تمام بڑے خاندان اس میں شریک ہوں تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لوگ قصاص کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

خیر الماکرین کا مفہوم

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ' لفظ 'مکر' پر آل عمران آیت ۵۴ کے تحت

بحث گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی طرف جب اس کی نسبت ہوتی ہے تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ خدا کی تدبیر دوسروں کی سازشوں پر ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ ظاہراً اس تدبیر کو دشمن اپنی ہی فتح مندی کیوں نہ تصور کرے لیکن بالآخر وہ حق کی فتح مندی کے نہایت وسیع دروازے کھول دیتی ہے۔ اس کی بہترین مثال خود یہ واقعۂ ہجرت ہے۔ قریش نے آنحضرتؐ کی ہجرت کے بعد اطمینان کا سانس لیا کہ چلو پہلو کا کانٹا نکل گیا لیکن جلد ہی حالات نے ثابت کر دیا کہ کانٹا نہیں نکلا بلکہ ان کے جسد قومی کی روح نکل گئی۔ اس کے بعد اسلام کو نشوونما کے لیے آزاد فضا مل گئی اور قریش مکہ، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے، اپنی قضائے مبرم کے انتظار کے لیے رہ گئے۔

یہاں اس واقعہ کو یاد دلانے سے مقصود اسی وعدۂ فرقان کو مؤکد کرنا ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دیکھنا ہو کہ خدا اپنی تدبیر و کارسازی سے کس طرح ناموافق حالات کو موافق اور مخالف ہواؤں کو سازگار بنا دیتا ہے تو اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پیغمبر کی زندگی خود اس کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ ایک وقت تھا جب اسلام کی قسمت صرف پیغمبر کے وجود اقدس اور چند بے یار و مددگار نفوس کے ساتھ وابستہ تھی۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ پیغمبر کو قتل کر دیں کہ سارا قصہ ہی تمام ہو جائے۔ اس کے لیے سب نے متفق ہو کر سازش کی لیکن اللہ نے ایسی تدبیر فرمائی کہ پیغمبر اپنے خونی دشمنوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر نکل آئے اور کوئی ان کا بال بیکا نہ کر سکا۔ پھر صرف یہی نہیں ہوا کہ پیغمبر نکل آئے بلکہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ سورج گہن سے نکل آیا۔ قریش سمجھے کہ جب پیغمبر اپنی قوم سے جلا وطن ہو کر کسی غیر قوم میں چلے جائیں گے تو ان کی دعوت ایک اجنبی ماحول میں خود بخود مرجھا جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کارسازی سے دکھا دیا کہ اسلام کے پودے کی نشوونما کے لیے سب سے زیادہ زرخیز اور مہرپرور سرزمین یثرب ہی کی سرزمین تھی جس کی طرف کفار نے خود اسلام کو دھکیل کر بھیجا۔ خدا اپنی اسکیمیں اسی طرح بردئے کار لاتا ہے۔ دشمن سمجھتا ہے کہ بازی اس نے جیتی، لیکن حقیقت میں داؤں خدا کا کامیاب ہوتا ہے۔ وہ حق کے دشمنوں ہی کے ہاتھوں جب چاہتا ہے وہ کام کرا دیتا ہے جس میں حق کی فتح مندی اور خود دشمن کی موت مضمر ہوتی ہے تو موجودہ نامساعد حالات سے ہراساں نہ ہو۔ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ خدا پر بھروسہ رکھو۔ انہی تاریکیوں کے پردے سے بہت جلد نیّر فرقان برآمد ہونے والا ہے۔

وعدۂ فرقان کی تاکید مزید

اس آیت کا خطاب، جیسا کہ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ سے واضح ہے اگرچہ آنحضرتؐ سے ہے لیکن یہ اپنے موقع و محل اور اپنے مدعا کے اعتبار سے دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک پہلو سے یہ اوپر کے مضمون سے جڑتی ہے، دوسرے پہلو سے آگے آنے والے مضمون کی تمہید ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

خطاب کی ایک بلاغت

خطاب کر کے یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ اب تک قریش جو عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے اور ہم طرح دیے جا رہے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم بے بس تھے بلکہ یہ تھی کہ تم ان کے اندر موجود تھے لیکن اب جب کہ تم ان کے اندر سے نکل گئے تو اب کون سی چیز ہے جو ان کو ہمارے تازیانۂ عذاب سے بچا سکتی ہے؟ اب تو امان کی سپر سے انھوں نے خود اپنے کو محروم کر لیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ اس نازک موقع پر وہ اپنے پیغمبر پر یہ واضح فرما دے کہ اس کا مرتبہ و مقام اللہ کی نظروں میں کیا ہے، اس وجہ سے تقاضائے بلاغت یہ ہوا کہ یہاں اسی کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ بات کہہ دی جائے کہ غم نہ کرو کہ انھوں نے تم کو نکال دیا ہے، یہ تو تمھارے ہی صدقے میں جی رہے تھے۔ اب یہ دیکھ لیں گے کہ ہم ان کی کیسی مرمت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس سے اس فرقان کے ظہور کی بشارت بھی امت کو دے دی گئی جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۱-۳۲)

قریش کے مطالبہ کا واضح جواب

یہ مضمون اَمام آیت ۹۲ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہاں یہ آیتیں یہ واضح کرنے کے لیے آئی ہیں کہ قریش کی طرف سے برابر خدا کو کس کس طرح کے چیلنج پر چیلنج دیے جا رہے تھے اور پیغمبر کو زچ کرنے کے لیے کیا کیا شیخیاں بگھاری جا رہی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے چیلنج کے جواب میں ان پر عذاب نہیں بھیجا جس سے ان کی جسارت بڑھتی گئی اور وہ اپنے باطل کو حق باور کرانے کے لیے اور بھی زیادہ دلیر ہو گئے۔ وہ اپنی رعونت کے باعث یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کے اس پیہم مطالبہ کے باوجود کہ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ، ہم نے اب تک ان کو کیوں ڈھیل دی؟ آج وہ سوال کا واضح جواب سن لیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (۳۳)

عذابِ الٰہی کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ جواب ہے اس سوال کا جو اوپر مذکور ہوا اور چونکہ مقصود اس موقع پر خاص طور پر پیغمبر کی دل نوازی ہے اس وجہ سے خطاب پیغمبر سے ہوا۔ فرمایا کہ اللہ اس بات کا روادار نہیں ہو سکتا تھا کہ ان پر عذاب نازل فرمائے درآنحالیکہ تم ان کے اندر موجود ہو۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی قوم پر عذاب بھیجنے کے معاملے میں مقرر فرمائی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ نبی جب تک اپنی قوم کے اندر موجود رہتا ہے وہ قوم کے اندر بمنزلہ دل کے ہوتا ہے۔ وہ قوم کے لیے اپنے رب سے مغفرت بھی مانگتا رہتا ہے اور قوم کو استغفار کی دعوت بھی دیتا رہتا ہے۔ قوم کے اندر اس کا وجود اس بات کا شاہد ہے کہ ابھی قوم میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ اس کی دعوت سے ان لوگوں کو زندگی ملتی ہے

جن کے اندر حیاتِ ایمانی قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور ان کا استغفار بھی قوم کے لیے سپر بن جاتا ہے۔ قوم کے اشرار خواہ کتنی ہی شرارتیں اور خدا اور رسول کو کتنا ہی چیلنج کریں، لیکن اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرماتا ہے اور اگر ان کو کسی آفت میں مبتلا کرتا بھی ہے تو اس کی نوعیت ایک تنبیہ کی ہوتی ہے نہ کہ فیصلہ کن عذاب کی۔ لیکن جب قوم اپنی سرکشی میں اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ نبی کے قتل کے منصوبے بنانے لگتی ہے اور اپنے اندر کے صالحین پر زندگی دشوار کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ نبی اور اس کے ساتھیوں کو ہجرت کا حکم دے دیتا ہے جس کے بعد قوم اس امان سے محروم ہو جاتی ہے جو نبی اور صالحین کی برکت سے اسے حاصل رہی ہوتی ہے۔ پھر دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت لازماً پیش آکے رہتی ہے۔ اگر نبی کے اوپر ایمان لانے والے صرف گنتی کے چند نفوس ہی ہوتے ہیں تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد قوم پر عذابِ الٰہی آجاتا ہے جو خدا کی زمین کو اس کے ناپاک وجود سے پاک کر دیتا ہے اس لیے کہ باطل محض کی پرورش اس کائنات کی فطرت اور فاطر کائنات کی حکمت کے خلاف ہے اور اگر نبی پر ایمان لانے والوں کی تعداد بھی معتدبہ ہوتی ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں ہوا تو اہلِ حق اور اہلِ باطل میں کشمکش شروع ہوتی ہے اور باطل حق سے ٹکرا ٹکرا کر بالآخر ایک دن پاش پاش ہو کر نابود ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرقانِ حق کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ یعنی ہر چند نبی کی ہجرت کے بعد اب ان سے امان اٹھ چکی ہے۔ اب کوئی چیز ان کو عذاب سے بچانے والی نہیں رہ گئی ہے لیکن وہ استغفار کرنے والے بنیں تو خدا انھیں عذاب سے بچائے رکھے گا۔ گویا اوپر والے ٹکڑے میں جو شدید قسم کی تہدید ہے اس ٹکڑے نے اس کو ذرا نرم کر دیا ہے کہ اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ چاہیں تو اپنی روش بدلیں، خدا سے معافی مانگیں اور اپنے آپ کو اس کی پکڑ سے بچا لیں۔ یوں سمجھیے کہ تہدید کے بعد یہ قریش کو دعوتِ استغفار ہے۔ آگے یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (ان کفر کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر وہ باز آ گئے تو جو کچھ ہو چکا ہے اس کو معاف کر دیا جائے گا)۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۳۴-۳۵)

قریش کی غلط فہمی

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ۔ اردو میں اس اسلوب کا مدعا یہ ہوگا کہ آخر ان کو ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ خدا ان کو عذاب نہیں دے گا! یہ قریش کے اس غرورِ باطل پر ضرب لگائی گئی ہے جو خانہ کعبہ کی تولیت اور اس سے متعلق بعض رسوم و خدمات کی ادائیگی کی بنا پر ان کو تھا۔ قوموں کی یہ عجیب

مشترک بدقسمتی رہی ہے کہ انھوں نے اللہ کے دین کو ہمیشہ اپنی خواہشات و بدعات کے سانچہ میں ڈھال کر مسخ کیا لیکن انہی مسخ شدہ رسوم کی پرستش کو اتنی اہمیت دی کہ اپنے آپ کو دین کی محسن، خدا کی چہیتی اور محبوب بنا بیٹھیں اور یہ گمان کیا کہ جب ان کے ہاتھوں خدمتِ دین کے یہ کارنامے انجام پا رہے ہیں تو خدا ان پر کس طرح ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ اسی فتنہ میں یہود مبتلا ہوئے، اسی میں نصاریٰ ہلاک ہوئے، یہی گمراہی قریش کو پیش آئی اور بڑے غم سے کہنا پڑتا ہے کہ اسی فتنہ میں شیطان نے اس امت کو بھی ڈال دیا۔ قریش کو یہ زعم تھا کہ وہ خانۂ کعبہ کے متولی، رفادہ اور سقایا کی خدمتیں انجام دینے والے اور حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں۔ اتنے سارے نسبی و حسبی امتیازات کے بعد خدا کے ہاں مقرب و محترم ہونے کے لیے اور کیا چاہیے۔ اس غرور کے سبب سے پیغمبر کی طرف سے عذاب کے ڈراوے ان پر بڑے شاق گزرتے۔ وہ اپنے آپ کو خانہ کعبہ کا پاسبان سمجھے بیٹھے تھے اور ساتھ ہی یہ زعم بھی ان کو تھا کہ خانہ کعبہ بھی ان کا پاسبان ہے۔

وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، فرمایا کہ مسجد حرام کی تولیت کا یہ زعم باطل ان کو کس طرح عذاب سے بچا سکتا ہے، جب کہ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے ان بندوں کو اس گھر سے روکتے ہیں جو اس کے سب سے زیادہ حق دار ہیں، جو اصل دینِ ابراہیمی کے حامل ہیں اور جو اس گھر کو توحید کی اذان اور خدائے واحد کی عبادت سے از سرِ نو معمور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اشارہ مسلمانوں کی طرف ہے جو صرف اس گھر ہی سے نہیں بلکہ اس شہر سے بھی نکالے جا رہے تھے جس میں یہ گھر واقع تھا۔

قریش کے دعوائے تولیتِ بیت اللہ کی نفی

وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ، یہ ان کے دعوائے تولیت کی نفی کر دی کہ یہ اس گھر کے متولی کہاں سے ہوئے؟ اس کے متولی تو صرف اللہ کے متقی بندے ہی ہو سکتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہ خائن، غدار اور اس گھر کے مقصدِ تعمیر اور اس کی حرمت کے برباد کرنے والے ہیں اس وجہ سے نہ انھیں اس پر مسلط رہنے کا کوئی حق ہے، نہ ان کے نام پر انھیں خدا سے کسی رعایت کی امید کرنی چاہیے۔ اس گھر کی تولیت کے اصلی حقدار ہمارے وہ متقی بندے ہیں جو ان ظالموں کے ہاتھوں اس سے روک دیے گئے ہیں۔

اس مقام پر وہ بات یاد رکھنی چاہیے جو بقرہ ۱۲۴ میں گزر چکی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو ایک عظیم امت کی امامت کے منصب پر سرفراز کرنے کا وعدہ فرمایا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ کیا یہ منصب میری ذریت کو بھی حاصل رہے گا؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ میرا یہ عہد تمہاری ذریت کے صالحین کے لیے ہے، ظَالِمِينَ اس میں شامل نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیم کی اس امامت کا مرکز (مثابہ) بیت اللہ قرار پایا اس وجہ سے آپ کی اس دعا اور اللہ تعالیٰ کی تصریح کے بموجب اس گھر کی تعمیر ہی کے وقت یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ اس کی تولیت اور ذریتِ ابراہیم کی قیادت و امامت کے اصلی وارث صرف وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی توحید پر قائم رہنے والے، اس کے

حدود و قیود کی پابندی کرنے والے اور اس کے عہد و میثاق کا احترام کرنے والے ہوں گے نہ کہ وہ جنھوں نے ملتِ ابراہیمؑ اور بیت اللہ الحرام سب کی آبرو مٹا کر رکھ دی ہے۔ یہاں سیدنا مسیحؑ کے وہ الفاظ بھی یاد رکھیے جو اسی طرح کے موقع پر آنجناب نے بیت المقدس کی تولیت کے مدعی فقیہوں اور پروہتوں کو مخاطب کر کے فرمائے تھے کہ تم نے میرے باپ کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا ڈالا ہے۔

وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ، میں اس عام جہالت و بے خبری کی طرف اشارہ ہے جس میں اہل عرب اس وقت مبتلا تھے۔ ایک طویل مدت تک جاہلیت کی تاریکی میں زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ اپنی اصل تاریخ بالکل بھلا بیٹھے تھے۔ انھیں قومی تفاخر کے طور پر اتنی بات تو یاد رہی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں لیکن اس سے آگے انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ حضرت ابراہیمؑ اس سرزمین پر کیوں تشریف لائے، ان کی دعوت کیا تھی، وہ جس ملت کے داعی ہوئے اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں، حضرت اسماعیل کو انھوں نے یہاں کیوں بسایا، خانہ کعبہ کی تعمیر کس مقصد کے لیے ہوئی اور اس گھر کے تعلق سے ذریت اسمٰعیلؑ کو اللہ کے دین کی کیا کیا امانتیں اور کیا ذمہ داریاں سپرد ہوئیں۔ چند معاشرتی رسوم اور حج کے کچھ مناسک جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلے آ رہے تھے ان میں بھی اتنی تبدیلیاں ہو گئی تھیں کہ اصلی اور ملاوٹ میں امتیاز مشکل ہو گیا تھا۔ خانہ کعبہ کو انھوں نے اپنا قومی معبد بنا لیا تھا جس کی کلید برداری اور اس کے مختلف شعبوں کی سربراہی وراثت کے طور پر مختلف خاندانوں میں منتقل ہوتی رہتی۔ جن پر آبائی جاگیر کی طرح ان کو فخر بھی ہوتا اور اسی حیثیت سے وہ ان پر متصرف بھی ہوتے۔ قرآن نے ان کی اسی جہالت کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے کہ یہ خانہ کعبہ کی تولیت کے مدعی تو ہیں لیکن انھیں کچھ خبر نہیں کہ یہ خانہ کعبہ ہے کیا چیز اور اس کی تولیت کے شرائط کیا ہیں؟

خانہ کعبہ کی تعمیر کا اصل مقصد

وَمَا کَانَ صَلَاتُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَۃً ط فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ــــ یہ ایک مثال بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ نہ یہ خانہ کعبہ کی تولیت کے اہل ہیں نہ انھیں اس گھر کے مقصد تعمیر کا کچھ پتا ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے جس مقصد کے لیے کی تھی اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ یہاں سورۂ ابراہیم کی مندرجہ ذیل آیات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا	اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی: اے میرے رب،
الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ	اس سرزمین کو پرامن سرزمین بنا دے اور مجھ کو
نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّھُنَّ اَضْلَلْنَ	اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھ۔
کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ج فَمَنْ تَبِعَنِیْ	اے میرے رب، ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کر رکھا ہے
فَاِنَّہٗ مِنِّیْ ج وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ	سو جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری

غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ (ابراہیم - ۱۴ : ۳۷)

نافرمانی کرے تو تو غفور رحیم ہے۔ اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک بن کھیتی کی سرزمین میں بسایا ہے۔ اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں۔ پس لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرے شکر گزار رہیں۔

خانۂ کعبہ کے مقصد کی بربادی

اس دعا کے الفاظ پر غور کیجیے تو اس سے واضح ہو جائے گا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ میں کیوں بسایا تھا، اپنی ذریت کے لیے انھوں نے کیا دعا فرمائی، بیت اللہ کی تعمیر کا مقصد کیا تھا اور ذریت اسمٰعیل کو اس گھر کے جوار میں بسانے سے ان کے پیش نظر کیا مدعا تھا؟ خاص طور پر 'رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ' کے الفاظ شاہد ہیں کہ جس طرح بیت اللہ اللہ کی عبادت کا مرکز بنایا گیا تھا۔ اسی طرح ذریت اسمٰعیل کو اس گھر کے جوار میں بسانے سے اصل مدعا نماز کا اہتمام و قیام تھا۔ لیکن قریش نے جس طرح بیت اللہ کو شرک و بت پرستی کا ایک گڑھ بنا کے رکھ دیا اسی طرح نماز کی بھی، جس کی خاطر ہی انھیں یہاں بسایا گیا تھا، بالکل آبرو مٹا کر رکھ دی۔ فرمایا کہ ان کی نماز کیا ہے، سیٹی بجانا اور تالی پیٹنا۔ مکا، یمکو، مکاءً کے معنی شسکارنے اور منہ سے سیٹی بجانے کے ہیں۔ 'تصدیہ' کے معنی تالی پیٹنے کے ہیں۔ قرآن نے نہایت بلاغت سے ان کی عبادت کی ظاہری ہیئت ہی سے نمایاں کر دیا کہ بھلا اس مسخراپن کو نماز سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ صورت بین حالت مپرس۔ ہم کسی دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ جانچنے کے لیے کہ کیا بات دین کی ہے، کیا نہیں ہے جہاں باطنی کسوٹیاں ہیں وہیں ظاہری کسوٹیاں بھی ہیں۔ اگر کوئی شخص دین کا ذوق رکھتا ہو تو بہت سی بدعتوں کو ان کی ظاہری ہیئت ہی سے پہچان جاتا ہے کہ ان خرافات کو دین سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ تعزیہ داری کے رسوم مزاروں پر ہونے والی خرافات اور متصوفین کی مجالس کی حرکتیں، ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کی لغویت کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی علمی کاوش کی ضرورت ہو۔ ہر صاحب ذوق بیک نظر دیکھ کر فیصلہ کر لیتا ہے کہ ان چیزوں کو دین سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہو سکتا۔ دین کی ہر بات میں وقار، متانت، فروتنی، خشیت اور پاکیزگی کی جھلک اور معرفت، حکمت، دانش اور روحانیت کی مہک ہوتی ہے۔ جس کی آنکھوں میں کچھ بصیرت اور جس کی روحانی قوت شامہ میں ذرا بھی زندگی ہو تو وہ صرف دیکھ اور سونگھ ہی کر جان جاتا ہے کہ فلاں چیز دین کی نہیں ہے۔ علمی تحقیق و کاوش کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے اور اس کے وسائل و ذرائع الگ ہیں۔ یہاں قرآن نے یہی دکھایا ہے کہ یہ ان مدعیان تولیت کعبہ کی نماز ہے جس کی صورت ہی گواہی دیتی ہے کہ یہ شیطان کی ایجاد ہے۔ اس میں اس نماز کی ادنیٰ جھلک بھی نہیں ہے، جس کے

اہتمام و قیام کے لیے یہ یہاں بسائے گئے تھے اور جس کی خاطر خدا کا یہ گھر ان کی تحویل میں دیا گیا تھا۔

مشرکانہ عبادت کے اجزاء

یہ سیٹی بجانا، سیٹی بجانا، سنکھ بجانا، ناقوس بجانا سب ایک ہی نوع کی چیزیں ہیں۔ یہ چیزیں شروع سے مشرکانہ عبادت کے اجزا میں سے ہیں۔ یہ تحقیق مشکل ہے کہ ان کے پیچھے کیا تصور کارفرما رہا ہے، ممکن ہے یہ حرکتیں بھوت بھگانے کے لیے اختیار کی گئی ہوں۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ قریش نے سارے عرب پر اپنی مذہبی سیادت جمانے کے لیے یہ چالاکی کی تھی کہ تمام قبیلوں کے بت خانہ کعبہ اور اس کے جوار میں جمع کر دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ بت آئے تو ان کے ساتھ ان کی پرستش کے آداب و رسوم بھی آئے۔ بالآخر بات یہاں تک پہنچی کہ ابراہیمی نماز تو حرم سے بالکل خارج کر دی گئی، یہاں تک کہ اس کے جاننے والے بھی باقی نہیں رہ گئے، البتہ سیٹی اور تالی بجانے کی حماقتیں باقی رہ گئیں۔

قریش کو تہدید

فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۔ اوپر وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ سے جو بات بصیغۂ غائب شروع ہوئی تھی، قریش کے مذکورہ جرائم گنانے کے بعد وہی بات قریش کو مخاطب کر کے کہہ دی گئی اور اس خطاب میں تہدید کے پہلو سے جو بلاغت ہے وہ واضح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خبط ذہن سے نکالو کہ تم خانہ کعبہ کے متولی اور اس کے پاسبان ہو۔ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو۔ تمہارے کفر اور تمہاری خیانت و بدعہدی کی ایک پوری تاریخ بن چکی ہے تو اب اس کی پاداش میں خدا کا عذاب چکھو۔ اس میں اشارہ اس چپت کی طرف بھی ہے جو بدر میں ان کو لگی اور آئندہ جو طمانچے لگنے والے ہیں ان کی دھمکی بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب خدا کی مار پڑنی شروع ہو گئی ہے یکے بعد دیگرے چکھتے جاؤ اور گنتے جاؤ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۥ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۙ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۳۶-۳۷)

خدا کا انتقام بے پناہ ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ الاية۔ اب یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ اس وقت قریش کے لیڈروں میں اسلام کے مٹانے کے لیے جو جوش و خروش ہے اور اس جوش میں وہ بڑی فیاضی سے جو اپنی دولت لٹا رہے ہیں، یہ چیز بھی اس فرقانِ حق کے نمایاں ہونے میں مانع نہ ہو سکے گی جس کا اہلِ ایمان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے تھی کہ فی الواقع قریش کے لیڈروں نے بدر کے موقع پر بڑی دریا دلی دکھائی تھی، جنگ کا سامان اور فوج کی رسد فراہم کرنے میں ہر سردار نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ کمزور قسم کے مسلمانوں پر یہ چیز بھی اثر انداز ہوئی کہ قریش کے پاس تعداد اور سامانِ جنگ کی کثرت بھی ہے، مال کی بہتات بھی ہے اور خرچ کرنے کے لیے جوش و خروش بھی ہے، بھلا ایسے لوگوں سے تھوڑے سے بے سروسامان مسلمان کیا مقابلہ کر

سکیں گے؛ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ راہِ حق سے روکنے کے لیے یہ زرپاشیاں جو ہو رہی ہیں ان سے مرعوب نہ ہو۔ ان خزف ریزوں اور تنکوں سے اس سیلاب کے مقابل میں بند نہیں باندھا جا سکے گا جو آ رہا ہے۔ بے شک انھوں نے بڑی فیاضی سے خرچ کیا ہے اور ابھی اور بھی یہ خرچ کریں گے لیکن ان تمام زرپاشیوں کا حاصل کفِ افسوس ملنے کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا۔ یہ بہت جلد منہ کی کھائیں گے۔ دنیا میں ان کے لیے شکست مقدر ہو چکی ہے اور آخرت میں یہ جہنم کی طرف ہانک کے لے جائے جائیں گے 'یُحْشَرُوْنَ' کے ساتھ 'اِلٰی' کے صلہ نے اس کے اندر ہانک کر لے جائے جانے کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کا لحاظ رکھا ہے۔

'لِیَمِیْزَ اللّٰهُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ الایۃ' یہ اس فرقان کا بیان ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔ وہاں اللہ تعالیٰ سارے خبیث کو طیب سے بالکل الگ کر دے گا۔ پھر خبیث کو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ڈھیر کر دے گا، پھر اس پورے ڈھیر کو جہنم میں جھونک دے گا۔ 'رَکْم' کے معنی کسی شے کو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ڈھیر کرنے کے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کو جلانا ہو تو اس کے لیے طریقہ یہی اختیار کیا جاتا ہے۔ سب کو جمع کر کے تہ بہ تہ ڈھیر کیا جاتا ہے پھر اس کو آگ دکھا دی جاتی ہے۔ تہ بہ تہ جمع کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آگ زیادہ مقدار میں ایندھن پا کر پورے زور سے بھڑکتی ہے اور جمع شدہ انبار کا ہر حصہ دوسرے حصہ کو جلانے میں مددگار بن جاتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہلِ کفر جس طرح اس دنیا میں تائیدِ کفر میں ایک دوسرے کے پشت پناہ ہیں، اسی طرح جہنم میں ایک دوسرے کو جلانے کے لیے باہمدگر ایندھن کا کام دیں گے۔

'اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ' فرمایا کہ اصلی نامراد یہی ہیں۔ اس لیے کہ دنیا میں ان کا انجام یہ ہوگا کہ یہ اپنے مال برباد کریں گے، کفِ افسوس ملیں گے، ذلت کے ساتھ شکست کھائیں گے اور آخرت میں یہ ہوگا کہ کوڑے کرکٹ کے انبار کی طرح اکٹھا کر کے جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۝ ۳۸-۴۰

قریش کو دعوتِ استغفار

'قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ' اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ قریش کو دعوتِ استغفار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اس عذاب سے بچنا چاہتے ہیں جس کی انھیں خبر دی جا رہی ہے تو وہ اس روش سے باز آئیں۔ توبہ اور اصلاح کریں، رسول کی دعوت پر لبیک کہیں۔ اگر انھوں نے اپنی روش بدل لی تو جو شرارتیں اور جو ظلم وہ اب تک کر چکے ہیں اللہ ان کو معاف کر دے گا، ان کی بنا پر وہ کسی عذاب میں نہیں پکڑے جائیں گے۔

ترغیب کے بعد ترہیب

'وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ' یہ ترغیب کے بعد ترہیب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ

باز نہ آئے، اسی طرح شرارتیں کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ وہ بھی اسی سنت الٰہی سے دو چار ہوں گے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی پچھلی قومیں دو چار ہو چکی ہیں۔ یہ اشارہ ہے عاد و ثمود، مدین اور قوم لوط وغیرہ کی طرف جن کی تاریخ تفصیل سے اعراف میں قریش کو سنائی جا چکی ہے۔ یہ بات ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ جس قوم میں رسول کی بعثت ہوتی ہے اس پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے وہ قوم اگر اپنے کفر پر اڑی رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو لازماً ہلاک کر دیتا ہے۔ خواہ وہ قہر الٰہی سے ہلاک ہو یا اہل ایمان کی تلوار سے۔ رسول اتمام حجت کا سب سے بڑا بلکہ آخری ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے بعد اس کی قوم کو مہلت نہیں ملتی۔

مسلمانوں کو جہاد کا حکم

'وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ' یہ مسلمانوں کو قریش سے جنگ کرنے کا حکم ہے اور اس جنگ کے پیش نظر مقصد دو بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ فتنہ کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرا یہ کہ دین تمام تر اللہ کا ہو جائے۔

'فتنہ' کا مفہوم

'فِتْنَةٌ' کا لفظ جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، یہاں (PERSECUTION) کے مفہوم میں ہے۔ یعنی مسلمانوں کو بجبر و ظلم دین حق سے روکنے کا وہ سلسلہ جو قریش اور ان کے اعوان نے جاری کر رکھا تھا فرمایا کہ ان سے جنگ کرو اور یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ اس سرزمین سے اس فتنہ کا استیصال ہو جائے۔ کسی کے لیے اس کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے کہ وہ کسی مسلمان کو اسلام لانے کی بنا پر ستا سکے، عام اس سے کہ وہ امیر ہو یا غریب، آزاد ہو یا غلام۔

حرمین میں دین الٰہی کا قیام

'دین' تمام تر اللہ کا ہو جائے، یعنی حرم کی سرزمین پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہے۔ اوپر ہم وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ بیت اللہ کی تعمیر ملت ابراہیم کے مرکز اور اس کے قبلہ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ یہ گھر اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا اور اس کی تولیت کے حق دار وہ لوگ ٹھہرائے گئے جو ملت ابراہیم کے حامل اور نماز کے قائم کرنے والے ہوں۔ قریش نے، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، اس گھر کے تمام مقاصد برباد کر کے اس کو ایک بت خانہ بنا ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی دعا کے مطابق جب اپنا آخری نبی اس قوم میں بھیجا اور اس نے لوگوں کو اصل ملت ابراہیم کی دعوت دی تو قریش کے مفاد پرست لیڈر نبی اور اس کے ساتھیوں کے دشمن ہو گئے اور ان کو اس گھر سے روک دیا حالانکہ اس گھر کی تولیت کے اصلی حق دار وہی تھے نہ کہ قریش جنھوں نے ملت ابراہیم چھوڑ کر دین شرک اختیار کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان غاصبوں اور خائنوں سے جنگ کرو اور یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ سرزمین حرم پر اللہ کے دین یعنی اسلام کے سوا جو ابراہیم کا دین تھا کوئی اور دین باقی نہ رہ جائے۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں مؤکد فرمایا کہ اس سرزمین پر دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔ اصلاً تو یہ حکم سرزمین حرم کے لیے ہے لیکن کفر و شرک کے اثرات سے اس کی

حفاظت بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ پورا علاقہ کفر و شرک کی مداخلت سے پاک رہے جس میں حرم واقع ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جس طرح مکہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے محترم ہے اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو محترم قرار دیا جس سے اس حکم کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ اس تمام علاقے سے غیر مسلم عناصر بے دخل کر دیے جائیں جس میں حرمین واقع ہیں۔ چنانچہ اس پورے علاقے سے کفار قریش کا تسلط بھی ختم کر دیا گیا اور پھر بالتدریج یہود و نصاریٰ بھی یہاں سے نکال دیے گئے۔

قریش کے ساتھ مسلمانوں کی نزاع کی نوعیت

اس سے معلوم ہوا کہ قریش کے ساتھ مسلمانوں کی نزاع کسی جزوی معاملے کے لیے نہیں تھی کہ وہ طے ہو جائے تو نزاع ختم ہو جائے بلکہ اصلاً اس بات کے لیے تھی کہ خانہ کعبہ روزِ اول سے ملت ابراہیمؑ کا مرکز ہے۔ اس ملت کے سوا کسی اور ملت کے لیے اس سرزمین پر گنجائش نہیں ہے، اس ملت کی تجدید اور بیت اللہ کی تطہیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے قریش ہی کے اندر اپنے آخری رسول کو مبعوث فرمایا تاکہ اس کے ہاتھوں اللہ کا دین کامل ہو اور یہ گھر، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی تھی، تمام عالم کے لیے ہدایت و برکت کا سرچشمہ بنے۔ یہاں ان اشارات پر اکتفا فرمائیے۔ انشاء اللہ اس کی تفصیل سورۂ برأت اور سورۂ حج کی تفسیر میں آئے گی۔

'فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ'۔ اس 'انتھو' کا مفہوم بھی وہی ہے جو اوپر والی آیت کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ یعنی اگر انھوں نے اپنی روش کی اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ ان کی ماضی کی غلطیوں کو نہیں دیکھے گا بلکہ ان کے مستقبل کے اعمال کو دیکھے گا، اگر انھوں نے اخلاص کا ثبوت دیا تو اس کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

مسلمانوں سے نصرت کا وعدہ

'وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ' اور اگر انھوں نے اعراض کیا، اپنی اسی ضد اور ہٹ پر جمے رہے تو تمھارا مولا و مرجع اللہ ہے۔ تم ان کی کثرتِ تعداد اور ان کے سر و سامان کی بہتات سے ہراساں نہ ہو۔ خدا نے اپنی شانیں جس طرح اب تک دکھائی ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی شانیں آیندہ بھی دکھائے گا۔ وہ بہترین مولیٰ ہے، اپنی مشکلات میں جو اس سے رجوع کرتے ہیں وہ ان کو کبھی مایوس نہیں کرتا، وہ بہترین مددگار ہے، جن کی مدد کے لیے وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے وہ کبھی شکست نہیں کھاتے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۴۱-۴۹

یاد ہوگا اس سورہ کا آغاز انفال یعنی اموال غنیمت سے متعلق لوگوں کے سوال سے ہوا تھا۔ وہاں سوال کا ایک اصولی جواب دے کر کلام کا رخ مسلمانوں کے ایک گروہ کی ان کمزوریوں کی اصلاح کی طرف مڑ گیا تھا جو اس سوال اور اسی نوعیت کے بعض دوسرے معاملات کی وجہ سے سامنے آئی تھیں۔ اب سوال کے تعلق سے

اموالِ غنیمت کی تقسیم کا ضابطہ بیان فرمایا اور مسلمانوں کو تاکید کی کہ اللہ کی اس تقسیم کو راضی خوشی قبول کرو اس لیے کہ جو کچھ تمھیں حاصل ہوا خدا کی تدبیر اور کارسازی سے حاصل ہوا اور آئندہ جو کچھ حاصل ہوگا اسی کی تدبیر و کارسازی سے حاصل ہوگا۔ یہ نہ خیال کرو کہ یہ سب کچھ تمھاری کارفرمائی ہوتی ہے بلکہ اصل چیز خدا کی تدبیر ہے جس کو وہ تمھارے واسطہ سے بروئے کار لاتا ہے۔

اس کے بعد آئندہ پیش آنے والی جنگوں سے متعلق کچھ ہدایات دی ہیں جو جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بھی ناگزیر ہیں اور جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنے والوں کو دوسرے جنگ آزماؤں سے ممتاز بھی کرتی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے اور اس امر کو برابر ملحوظ رکھیے کہ اس پوری سورہ میں خطاب اگرچہ بظاہر الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن مسلمانوں کے اس گروہ کی طرف خاص طور سے ہے جو ابھی اچھی طرح پختہ نہیں ہوا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۴۱-۴۹

وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۴۲﴾ۙ اِذْ یُرِیْكَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَاِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْٓ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا وَّیُقَلِّلُكُمْ فِیْٓ اَعْیُنِهِمْ لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَی اللّٰهِ

ع
تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾
ع ۲

ترجمۂ آیات ۴۱ - ۴۹

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم غنیمت حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری فیصلہ کے دن، جس دن دونوں جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۱
خیال کرو جب تم وادی کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر اور قافلہ تم سے نیچے تھا اور اگر تم باہم میعاد ٹھہرا کر نکلتے تو میعاد پر پہنچنے میں ضرور تم مختلف

ہو جاتے لیکن اللہ نے فرق نہ ہونے دیا تاکہ اللہ اس امر کا فیصلہ فرما دے جس کا ہونا طے ہو چکا تھا، تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے۔ بے شک اللہ سمیع و علیم ہے۔ یاد کرو جب اللہ تیری رویا میں ان کو کم دکھاتا ہے اور اگر زیادہ دکھا دیتا تو تم پست ہمت ہو جاتے اور معاملے میں اختلاف کرتے لیکن اللہ نے بچا لیا، بے شک وہ دلوں کے حال سے باخبر ہے اور خیال کرو جب کہ تمھاری مڈبھیڑ کے وقت ان کو تمھاری نظروں میں کم دکھاتا ہے اور تم کو ان کی نظروں میں کم دکھاتا ہے تاکہ اس امر کا فیصلہ فرما دے جس کا ہونا طے شدہ تھا اور سارے معاملات اللہ ہی طرف لوٹتے ہیں۔ ۴۲-۴۴

اے وہ جو ایمان لائے ہو، جب تمھارا کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو زیادہ یاد کرو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں اختلاف نہ کرو کہ تم پست ہمت ہو جاؤ اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے اور ثابت قدم رہو۔ بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں کی مانند نہ بننا جو اپنے گھروں سے اکڑتے اور لوگوں کے آگے اپنی نمائش کرتے نکلے اور جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، حالانکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور یاد کرو جب کہ شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیئے اور کہا کہ آج لوگوں میں کوئی نہیں کہ تم پر غالب آسکے اور میں تمھارا پشت پناہ ہوں تو جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور بولا کہ میں تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت پاداش والا ہے۔ یاد کرو

جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہتے تھے، ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں تو اللہ عزیز و حکیم ہے۔ ۴۵-۴۹

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰي وَالْيَتٰمٰي وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۱)

'وَاعْلَمُوْٓا' کا محل

'وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ' 'اعلموا' کا لفظ یہاں جس سیاق میں ہے اس سے اس حکم کی قطعیت اور عظمت واضح ہو رہی ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔ چونکہ اموالِ غنیمت سے متعلق، جیسا کہ سورہ کے شروع میں معلوم ہو چکا ہے، کچھ لوگوں نے ناروا قسم کے سوال اٹھا دیے تھے اس وجہ سے پہلے تو ان کی کمزوریوں پر تفصیل سے تبصرہ کیا، پھر جب ان کے سوال کا جواب دیا تو اس کا آغاز ایک تنبیہی کلمہ سے فرمایا کہ لوگ گوش ہوش سے سنیں اور بادشاہ کائنات کے فرمان کی حیثیت سے بے چون وچرا اور بلا اختلاف و نزاع اس کی تعمیل کریں۔

اموالِ غنیمت کی حیثیت

'غَنِمَ الشَّیْءَ' کے معنی ہیں 'فَازَ بِهٖ وَنَالَهٗ بِلَا بَدَلٍ' فلاں چیز بلا کسی عوض کے حاصل کر لی۔ اسی سے 'غنیمت' ہے جس سے مراد وہ مال و اسباب ہوتا ہے جو میدانِ جنگ میں کفار سے مسلمان مجاہدین کو حاصل ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں حاصل شدہ مال و اسباب کو 'نفل' یا 'غنیمت' کے الفاظ سے تعبیر کر کے قرآن نے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ یہ جہاد و قتال کا کوئی معاوضہ نہیں ہے بلکہ ایک ضمنی اور زائد فائدہ ہے جو ایک مجاہد کو حاصل ہوتا ہے۔ مجاہد، اللہ کی راہ میں جو جہاد کرتا ہے وہ ایک فرض ادا کرتا ہے اور اس کا اجر اس کو اللہ کے ہاں ملتا ہے جو اس کی ابدی زندگی کے لیے محفوظ ہو گیا۔ رہی یہ چیزیں جو اسے سر راہے حاصل ہو جاتی ہیں تو یہ زوائد ہیں۔ حاصل ہو جائیں تو غنیمت، نہ حاصل ہوں تو نہ ان کی طمع کرے نہ غم۔ قرآن نے یہ تصور دے کر اس جاہلی تصور کی اصلاح کی ہے جس میں اہل عرب اب تک مبتلا رہے تھے کہ وہ جنگ کا اصلی حاصل لوٹ کے مال کو سمجھتے تھے اور اسی چیز سے وہ اس کے نفع و نقصان کا اندازہ لگاتے تھے۔ اس تصور کا کچھ اثر مسلمانوں کے ایک گروہ کے اندر بھی باقی تھا جو بدر کے موقع پر ظاہر ہوا اور قرآن نے اس کی اصلاح فرمائی۔ 'فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰي وَالْيَتٰمٰي وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ' یہ اس مجمل جواب کی تفصیل ہے جو آیت ۱ میں 'قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ

مَا اسْتَوْسُوْلِ، کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔ وہاں ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ اجمالی جواب دے کر کہ اموال غنیمت کی حیثیت انفرادی ملکیت کی نہیں ہے، جیسا کہ جاہلیت میں دستور رہا ہے بلکہ اجتماعی ملکیت کی ہے' کلام کا رُخ اس ذہنیت کی اصلاح کی طرف مڑ گیا تھا جس کا اظہار مسلمانوں کے ایک مخصوص گروہ کی طرف سے ہوا تھا۔ اب یہ اس اجتماعی ملکیت کی تقسیم کا طریقہ بیان فرما دیا۔

اموالِ غنیمت کی تقسیم

فرمایا کہ اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ یعنی جاہلیت کا یہ دستور کہ جو شخص جو مال واسباب لوٹے وہ اس کا ہے، ختم ہوا۔ اب سارا مالِ غنیمت اکٹھا کیا جائے گا اور اس میں سے پانچواں حصہ اللہ و رسول کا حق نکال کر بقیہ مال مجاہدین میں تقسیم ہوگا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں سرداران قبائل لوٹے ہوئے مال میں سے چوتھ لیتے تھے جس کو مرباع کہتے تھے، اور یہ مال ان کے ذاتی تصرف میں آتا تھا۔ اسلام نے مالِ غنیمت میں سے اللہ و رسول کا حق صرف پانچواں حصہ رکھا اور یہ بھی، جیسا کہ آگے آرہا ہے، تمام تر معاشرہ کی اجتماعی بہبود کے کاموں کے لیے معاشرہ کو لوٹا دیا۔

اللہ کا حق اور اس کا مصرف

اس پانچویں حصہ کے مصارف کی تفصیل میں سب سے پہلے اللہ کا حق بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ظاہر ہے کہ ہر چیز سے بے نیاز اور غنی ہے۔ اس کے حق کا اصلی مصرف وہ کام ہوں جو اعلائے کلمۃ اللہ، اقامتِ دین اور حفاظت و مدافعت ملت کی نوعیت کے ہوں گے۔ زمانہ اور حالات کی تبدیلی سے ان کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن ہر شکل میں اعلائے کلمۃ اللہ کے نصب العین کو مدنظر رکھنا لازمی ہوگا۔

رسول کا حق اور اس کی نوعیت

دوسرا حق رسول کا بتایا گیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات بار بار آتی ہے کہ رسول کا یہ حق بحیثیت رسول کے نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول بھی تھے اور آپ کے ہاتھوں مدینہ منورہ میں جو اسلامی حکومت قائم ہوئی اس کے قائد و سربراہ بھی۔ جہاں تک فریضۂ رسالت کا تعلق ہے اس پر آپ کو اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا تھا اور قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اس نے اپنے رسول کی ساری ذمہ داریاں براہِ راست اپنے ہی اوپر لی تھیں لیکن ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے جب کہ آپ کے مبارک اوقات کا لمحہ لمحہ اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں صرف ہو رہا تھا یہ ضروری ہوا کہ اس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ یہ حق درحقیقت ریاست کے سربراہ کا حق تھا جو حضورؐ کے وصال کے بعد آپ سے آپ حضورؐ کے خلفا اور جانشین کی طرف منتقل ہو گیا۔

ذوی القربیٰ کا حق اور اس کی نوعیت

تیسرا حق 'ذِی الْقُرْبٰی' کا بیان ہوا ہے۔ 'ذِی الْقُرْبٰی' سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار مراد ہیں اور قرابت دار بھی ظاہر ہے کہ وہ قرابت دار ہوں گے جن کی کفالت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ عام اس سے کہ یہ ذمہ داری عرفی و شرعی نوعیت کی ہو یا اخلاقی نوعیت کی جو بہر کریم النفس سربراہ خاندان پر خاندان کے غریبوں، محتاجوں اور معذوروں کے متعلق اخلاقاً عائد

ہوتی ہے۔ یہ بات اس وسعت و عمومیت سے نکلتی ہے جو ذوی القربیٰ کے لفظ میں ہے اور یہ بات بھی نکلتی ہے کہ 'لِذِی الْقُرْبیٰ' کا یہ حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی قائم رہنے والا تھا۔ اگر یہ آپ کی حیاتِ مبارک ہی تک محدود ہوتا تو اس کے مستقل ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

یتیموں اور مسکینوں کا حق اور اس کی نوعیت

چوتھا حق یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے۔ ان کا حق بیان کرتے ہوئے اس 'ل' کا اعادہ نہیں فرمایا جو اوپر 'اللہ'، 'رسول' اور 'ذوی القربیٰ' تینوں کے ساتھ الگ الگ لگا ہوا ہے بلکہ ان کا ذکر 'ذِی الْقُرْبیٰ' کے تحت ہی کر دیا ہے۔ اس سے مقصود اس طبقہ کی تشریف اور عزت افزائی ہے کہ گویا یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ ہی کے تحت ہیں۔ جو لوگ اسلامی نظام کے مزاج سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ یتیموں اور مسکینوں کی حیثیت ایک صحیح اسلامی نظام میں سربراہ ریاست کے کنبے کی ہے۔ سربراہ حکومت کو جس طرح اپنے کنبہ کی فکر کرنی پڑتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کو یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل اس کی ناقابلِ تردید اور زندۂ جاوید شہادت ہے۔ حضرت عمرؓ نے تو کہیں فرمایا بھی ہے کہ ریاست کے مال میں سے میرا حق بس اتنا ہی ہے جتنا ایک یتیم کے متولی کا حق یتیم کے مال میں سے ہے۔ اس حقیقت کا بھی انھوں نے بار بار اظہار فرمایا کہ مملکت کے ہر یتیم و مسکین اور مسافر کی ذمہ داری براہِ راست مجھ پر ہے۔ جس مملکت میں یتیم دھکے کھائیں، مسکین بھوکے سوئیں، مسافر کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو اس مملکت کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے خواہ وہ اسلام کے کتنے ہی بلند بانگ دعاوی کرے۔

غرباء و فقراء کے اموال کا اجتماعی مقصد

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جو لوگ 'ل' کو لامِ تملیک کے معنی میں لے کر غرباء، فقراء، یتامیٰ اور مساکین کی اجتماعی بہبود کے کاموں پر ان کے حصہ کے مال کو خرچ کرنے سے روکتے ہیں، ان کی بات عربیت کے پہلو سے کچھ زیادہ وزن دار نہیں ہے۔ حرفِ 'ل' عربی میں تملیک ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ متعدد معانی کے لیے آتا ہے جن میں سے ایک معروف مفہوم نفع رسانی اور بہبود کا بھی ہے۔ ہم نے اس پر مفصل بحث اپنے ایک مستقل مقالے میں کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بالکل جائز ہے کہ اسلامی حکومت جن کاموں کو غرباء اور فقراء کی اجتماعی بہبود کے نقطۂ نظر سے مفید پائے ان پر بھی ان کے حصہ کی رقوم جو اس کی تحویل میں آئیں، خرچ کرے۔ انفرادی تملیک ہر حال میں لازمی نہیں ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ۔

غزوہ بدر جانچ کی کسوٹی

'يَوْمَ الْفُرْقَانِ' سے مراد غزوۂ بدر کا دن ہے۔ 'يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ' کے الفاظ سے اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ اس لیے کہ وہی پہلا دن تھا جب مسلمانوں اور کفار کے درمیان جماعتی حیثیت سے تصادم ہوا ہے۔ غزوۂ بدر کو یوم الفرقان سے تعبیر کرنے کی وجہ کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ قریش کے لیڈروں نے خود اس جنگ کو ایک کسوٹی کی حیثیت دے دی تھی کہ جو اس جنگ میں ہارا وہ باطل پر سمجھا

جائے گا، جو جیتا وہ حق پر مانا جائے گا۔ اس طرح خود اپنی کی انتخاب کردہ کسوٹی نے حق و باطل کا فیصلہ کر دیا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ اس جنگ میں تائیدِ الٰہی گوناگوں شکلوں میں اس طرح بے نقاب ہوئی کہ گویا ہر شخص نے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حق کس کے ساتھ ہے اور خدا کس کے پہلو پر ہے۔ 'مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا' سے اسی نصرتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔

یہ ٹکڑا اوپر والے مضمون ہی کو مؤکد کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تقسیمِ غنیمت کے باب میں یہ حکم جو تمھیں دیا ہے بے چون و چرا اس کی تعمیل کرو، اگر اللہ پر اور اس نصرتِ الٰہی پر تمھارا ایمان ہے جو ہم نے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والی جنگ میں اپنے بندوں پر اتاری۔ چونکہ روئے سخن ان نکتہ چینوں کی طرف خاص طور سے ہے جنھوں نے اموالِ غنیمت سے متعلق سوال اٹھائے تھے، اس وجہ سے فرمایا کہ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس قسم کے سوالات غمازی کرتے ہیں کہ ابھی تمھارے اندر ایمان راسخ نہیں ہوا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یوں نہیں فرمایا کہ اگر تم اس نصرتِ الٰہی پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے تم پر اتاری بلکہ یوں فرمایا کہ 'اپنے بندے پر اتاری' جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ کسی گروہ کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ کامیابی جو حاصل ہوئی ہے یہ اس کا کارنامہ ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے اللہ کی کارسازی اور اس رسول کی برکت سے ہوا ہے جس کی مدد کے لیے اللہ نے اپنی غیبی فوج بھیجی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ نہ اللہ کسی کا محتاج ہے اور نہ اس کا رسول کسی کا دست نگر ہے۔ اللہ جب چاہے گا اپنے رسول کی مدد کے لیے اپنی افواجِ قاہرہ بھیج دے گا۔

اِذۡ اَنۡتُمۡ بِالۡعُدۡوَۃِ الدُّنۡیَا وَهُمۡ بِالۡعُدۡوَۃِ الۡقُصۡوٰی وَالرَّكۡبُ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ ؕ وَلَوۡ تَوَاعَدۡتُّمۡ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ فِی الۡمِیۡعٰدِ ۙ وَلٰـكِنۡ لِّیَقۡضِیَ اللّٰهُ اَمۡرًا كَانَ مَفۡعُوۡلًا ۙ۬ لِّیَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۡۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ (۴۲)

غزوۂ بدر میں خدا کی کارسازی

یہ اللہ تعالیٰ کی اس تدبیر و کارسازی کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ کس طرح اللہ نے تم کو ٹھیک وقت پر دشمن کے مقابلہ کے لیے محاذِ جنگ پر پہنچا دیا کہ وادی کے ایک سرے پر تم پہنچے، دوسرے سرے پر قریش تھے اور تجارتی قافلہ نیچے ساحلِ سمندر کی طرف سے گزر رہا تھا۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی فوج اور قافلہ کی آمد کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے رویا میں دکھا دیا تھا۔ اسی رویا کی رہنمائی کے مطابق آپ مدینہ سے نکلے اور ٹھیک اس وقت آپ وادی بدر میں پہنچ گئے جب قریش کی فوج قافلہ کی حفاظت کے بہانے وادی کے دوسرے کنارے پر پہنچی۔ فوج کا دشمن کے مقابلہ کے لیے ٹھیک وقت پر اپنے موقع و محل پر پہنچ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ جنگ کا بہت کچھ انحصار اسی پر ہوتا ہے۔ معمولی تاخیر بھی بسا اوقات شکست کے مترادف بن جاتی ہے۔ پھر وقت سے بہت پہلے پہنچنا بھی خطرات اور نقصانات سے خالی

نہیں، اور کچھ نہیں تو مسلمانوں کے لیے رسد کا مسئلہ ہی بڑا مشکل تھا بالخصوص اس زمانے میں جب کہ مسلمان نہتے بھی تھے اور نہایت غریب بھی۔ فریقین اس معاملے میں چالیں بھی بہت سی چلتے ہیں جس سے ان کا مقصود ایک دوسرے کو دھوکہ دینا ہوتا ہے۔ منصوبے کچھ ہوتے ہیں، اعلانِ جنگ اور الٹی میٹم میں ظاہر کچھ کیے جاتے ہیں۔ نشانہ کوئی ہوتا ہے، اشارہ کسی طرف کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس قسم کی تمام چالوں سے محفوظ رکھا اور خاص اپنی رہنمائی میں، ٹھیک وقت پر دشمن کے مقابلہ کے لیے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں ان کا پہنچنا ضروری تھا۔ فرمایا کہ یہ حسن اتفاق خدا ساز تھا۔ اگر تم ایک دوسرے کو اعلان اور الٹی میٹم دے کر نکلتے تو یہ اجتماع اس شکل میں آسان نہ ہوتا۔

'وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا'۔ 'لِيَقْضِيَ' سے پہلے فعل محذوف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی تدبیر و کارسازی سے تم کو اور تمہارے دشمنوں کو اس طرح ایک دوسرے کے آمنے سامنے اس لیے لا کھڑا کیا کہ وہ بات واقع ہو جائے جس کا واقع ہونا اس کی اسکیم میں طے پا چکا تھا۔

خدا کی اسکیم کے فوائد و مصالح

'لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ'، یہ وضاحت ہو رہی ہے خدا کی اسکیم اور اس کے فوائد و مصالح کی۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے چاہا کہ قریش اور مسلمانوں میں ایک ٹکر ہو اور وہ فرقان نمایاں ہو جائے جو حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دے تاکہ اس کے بعد جو ہلاکت کی راہ اختیار کریں وہ بھی اتمام حجت کے ساتھ یہ راہ اختیار کریں، جو زندگی کی راہ اختیار کریں وہ بھی ایک روشن دلیل دیکھ کر اختیار کریں۔ ہلاکت اور زندگی سے مراد، ظاہر ہے کہ یہاں روحانی و معنوی ہلاکت اور زندگی ہے۔ حرف 'عن' عربی میں کسی چیز کے منبع و مصدر اور مولد و منشا کا بھی سراغ دیتا ہے۔ بدر کے معرکہ نے اہل کفر اور اہل ایمان دونوں گروہوں کے سامنے ایک ایسی واضح برہان رکھ دی کہ نہ اہل کفر کے لیے کوئی عذر باقی رہ گیا نہ اہل ایمان کے لیے کوئی ابہام۔ ان کے لیے ان کا کفر بالکل عریاں ہو کر سامنے آ گیا اور اہل ایمان کے لیے ان کا ایمان سورج کی طرح چمک اٹھا۔

'وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ' ان صفات کا حوالہ اس پوری اسکیم کے تعلق سے یہاں آیا ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ کہاں تم، کہاں قریش اور کہاں قافلہ لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کے بھید معلوم کر لیے، سب کی سرگوشیاں سن لیں اور سب کے ارادے تاڑ لیے اور پھر سب کو اس طرح جمع کر کے وہ بات پوری کر کے دکھا دی جو اس نے طے کر لی تھی اس لیے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۴۳)

پیغمبر کو رویا میں صورت حال کا مشاہدہ

یہ دوسری مثال بیان ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ کی کارسازی کی کہ اس نے پیغمبر کو رویا میں کفار کی فوج کی تعداد تھوڑی دکھائی اور پیغمبر نے ایک قلیل التعداد جماعت ہی کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے اس

کا ذکر بھی کیا، بلکہ جیسا کہ آیت ، بیں گزر چکا ہے یہ بھی خوش خبری دے دی کہ یہ قلیل التعداد گروہ مسلمانوں سے مغلوب ہو جائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے کیا کہ اگر ان کو کثیر تعداد میں دکھایا جاتا، جتنے کہ وہ فی الواقع تھے تو پیغمبرؐ لازماً اسی شکل میں مسلمانوں سے ان کا ذکر بھی کرتے جس کا اثر کمزور مسلمانوں پر یہ پڑتا کہ وہ ہمت ہار بیٹھتے اور جنگ کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں مختلف الرائے ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ دلوں کی کمزوریوں سے اچھی طرح باخبر ہے اس وجہ سے اس نے یہ تدبیر اختیار فرمائی تاکہ مسلمانوں کا حوصلہ قائم رہے اور وہ کسی کمزوری کے اظہار سے محفوظ رہیں۔

ایک غلط خیال کی تردید

بعض لوگوں نے یہاں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کبھی کبھی حضرات انبیاء کو بھی رویا میں کوئی چیز خلاف واقعہ دکھا دی جاتی ہے۔ چنانچہ قریش کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ تھوڑی دکھائی گئی۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔ رویا وحی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اس وجہ سے پیغمبر کی رویا خلاف واقعہ نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ہوتا ہے کہ رویا میں کبھی کوئی حقیقت مجاز کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کسی شے کے ظاہر کے بجائے اس کی معنوی حقیقت کسی پیرایہ میں دکھائی جاتی ہے۔ یہاں یہی صورت حال ہے۔ کفار کی فوج تعداد میں ہر چند بہت زیادہ تھی لیکن معنوی اور اخلاقی اعتبار سے اس کی حیثیت بہت کم تھی۔ ان کی یہی معنوی قلت رویا میں قلت تعداد کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ رویا کا یہی پہلو ہے جس کے سبب سے اس میں تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس کی تاویل میں کبھی کبھی خود نبی کو بھی، وقتی طور پر، کوئی تردد پیش آجاتا ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ نبی کی رویا کبھی کبھی خلاف واقعہ ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ قرآن نے 'قلیل' کا لفظ بہت جنچا تلا استعمال کیا ہے عربی میں لفظ 'قلیل' صرف عددی اور مقداری اعتبار ہی سے قلیل کے لیے نہیں آتا بلکہ معنوی اعتبار سے بے وزن و بے حقیقت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کسی حماسی کا یہ شعر بہت معروف ہے۔

فان اکُ فی شوادکم قلیلا فانی فی خیادکم کثیر

(اگر میں تمہارے اشرار کی نگاہوں میں کم رتبہ ہوں تو کچھ غم نہیں۔ تمہارے اخیار کی نگاہوں میں میرا بڑا رتبہ ہے)

یہاں ہم اس اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔ کسی مناسب مقام پر ہم 'رویا' پر انشاء اللہ مفصل بحث کریں گے۔

خطاب کہ ایک خاص نوعیت

'فَشِلْتُمْ اور تَنَازَعْتُمْ' میں خطاب اگرچہ عام ہے لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ یہ مسلمانوں کے پورے گروہ سے متعلق ہے بلکہ یہ قرآن کے معروف اسلوب بیان کے مطابق عام الفاظ میں مسلمانوں کے اس مخصوص گروہ کے کردار کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورہ کے آغاز سے چلا آرہا ہے۔ آیت ، کے تحت جس گروہ کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ یہ جانتے بوجھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نکلنا قریش کی فوج سے مقابلہ

کے لیے ہے، وہ کوشش کرتا رہا کہ آپ قافلہ کا رخ کریں اور آنحضرت کی طرف سے اس بشارت کے باوجود کہ جس سے مقابلہ ہونا ہے وہ ہم سے شکست کھائے گا، وہ اس طرح لرزہ براندام رہا کہ گویا اسے موت کے منہ میں لے جایا جا رہا ہے۔ اسی گروہ کی طرف کلام کا رخ یہاں بھی ہے۔ جن کے حوصلہ کا یہ حال ہو، ظاہر ہے کہ اگر وہ پہلے سے کہیں یہ سن پاتے کہ مقابلہ لشکر سے ہے اور وہ بھی ایک کثیر التعداد لشکر سے تو ان کے تو دل ہی بیٹھ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں لوگوں کی رعایت سے دشمن کی فوج کی عددی حیثیت کی بجائے اس کی معنوی حیثیت ان کے سامنے رکھی۔

اس امر پر بھی یہاں نگاہ رہے کہ 'یریکھم'، 'منامک'، 'اراکھم'، سب میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لیے ہے کہ رویا میں جو کچھ دکھایا گیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دکھایا گیا۔ نبی اہل ایمان کے لیے بمنزلۂ دل اور آنکھ کے ہوتا ہے اس وجہ سے دیکھتا تو وہی ہے لیکن وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس کا تعلق سب سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جہاں تک دیکھنے کا تعلق ہے اس کو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی تک محدود رکھا ہے لیکن اس کے ردعمل کے ذکر میں تمام مسلمانوں کو شامل کر لیا ہے۔

وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۴۴﴾

اللہ تعالیٰ کی ایک اور کارسازی

یہ اللہ تعالیٰ اسی سلسلہ کی اپنی ایک اور کارسازی بیان فرما رہا ہے کہ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میں ہوئیں تو ابتدائی مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نظروں میں کفار کے لشکر کو کم کر کے دکھایا اور کفار کی نظروں میں مسلمانوں کو کم کر کے دکھایا تاکہ دونوں میں سے کوئی فریق بھی ٹکر لینے میں خوف نہ کھائے اور وہ معرکہ ہو کے رہے جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دے اور جس کا واقع ہونا اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں طے ہو چکا ہے۔

کفار کی نگاہوں میں مسلمانوں کا کم نظر آنا تو اس لیے تھا کہ ان کی ظاہر بین آنکھوں کو مسلمانوں کی صرف عددی حیثیت نظر آئی، اس کی معنوی و اخلاقی قوت و حیثیت ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی۔ حالانکہ یہی قلیل التعداد فوج بعد کے مرحلہ میں، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، معرکۂ کارزار گرم ہو جانے کے بعد، ان کو ایک طوفان کی شکل میں نظر آئی اس لیے کہ اس وقت مسلمانوں کی معنوی و روحانی حیثیت پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آ گئی۔

جنگ کے دوران کی ایک نفسیاتی حقیقت

مسلمانوں کی نگاہوں میں کفار کے ان کی عددی اکثریت کے باوجود کم نظر آنے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ان کی معنوی و اخلاقی حیثیت بے نقاب کر دی۔ نگاہ بہت بڑی حد تک دل کے تابع ہوتی ہے۔ اگر دل میں حوصلہ اور امنگ ہو، ایمان و اعتماد ہو، جزم و یقین ہو، مقصد کی صداقت اور اس کے لیے مرمٹنے کا جذبہ صادق ہو تو سامنے پہاڑ بھی ہو تو ایک تودۂ ریگ کی شکل میں نظر آتا ہے اور اگر دل ان چیزوں سے

خالی ہو تو آدمی گلہری کو پہاڑ اور بکری کو شیر سمجھنے لگتا ہے۔ آدمی سے زیادہ طاقت ور اور آدمی سے زیادہ ناتواں، کوئی بھی نہیں ہے اور اس طاقت اور ناتوانی دونوں کا سرچشمہ خارج میں نہیں بلکہ اس کے باطن ہی میں ہے۔ مادیت کے اس دور میں لوگوں کو یہ باور کرانا آسان نہیں کہ سو مسلمان اپنے آپ کو کسی زمانہ میں ہزار کفار پر بھاری سمجھتے تھے لیکن ہے یہ واقعہ اور تاریخ اس پر شاہد ہے اور آج بھی ہر شخص اس کا تجربہ کر سکتا ہے اگر وہ ایمان کی حلاوت سے آشنا ہو جائے۔

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سررشتہ سارے معاملات کا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کم دکھانا اور زیادہ دکھانا، جتانا اور ہرانا، بڑھانا یا گھٹانا جو کچھ بھی ہوتا ہے اصلاً خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے، باقی سب خدا پر چھوڑے۔ اس غلط فہمی میں کبھی مبتلا نہ ہو کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر بھی کچھ بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۴۵-۴۶)

جنگ کے باب میں مومنین کو ہدایات

یہ آگے کے مراحل کے لیے ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب تمہارا کفار کے کسی گروہ سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ۔ ثابت قدمی اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی نصرت ہمیشہ اسباب کے پردے سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دنیا بندوں کے لیے امتحان گاہ ہے۔ جب بندے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں تو اس کے پردے میں اللہ کی نصرت ظاہر ہوتی ہے۔ بندوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی طرح خدا کا امتحان کریں کہ خود تو گھروں میں بیٹھے رہیں اور خدا سے یہ امید کریں کہ وہ فتح کر کے کنجیاں ان کے حوالے کر دے تب وہ شہر میں داخل ہوں گے۔

ثابت قدمی کا ذریعہ اللہ کی یاد ہے

اللہ کا ذکر ثابت قدمی کا ذریعہ ہے۔ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اصلی قوت دل کی قوت ہے اور دل کو قوت ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایمان سرسبز و شاداب، ذکر الٰہی کی جھڑی سے رہتا ہے۔ یہ ذکر الٰہی یوں تو سانس کی طرح ہر وقت ایمانی زندگی کے لیے ضروری ہے اس لیے کہ انسان ہر وقت شیطان سے نبرد آزما ہے لیکن حالات زیادہ صبر آزما ہوں تو یہ ذکر بھی زیادہ مقدار میں مطلوب ہوگا۔ اسی وجہ سے یہاں کثیرا کی قید لگی ہوئی ہے۔

حصول فلاح کا ذریعہ

لفظ 'فلاح' ایک جامع لفظ ہے۔ یہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی پر مشتمل ہے۔ مجرد غلبہ تو ہو سکتا ہے کہ بغیر ذکر الٰہی کے بھی حاصل ہو جائے لیکن وہ فلاح کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ فلاح اسی غلبہ سے حاصل ہوگی جس کا دروازہ ذکر الٰہی کی مدد سے کھلے اور جس میں غلبہ حاصل کرنے والوں کو خدا کی معیت حاصل ہو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کسی فوج کی ثابت قدمی میں اصلی عامل کی حیثیت ہمیشہ اس کے حوصلہ ہی کو حاصل ہوتی

ہے۔ اس چیز کی اہمیت جس طرح پہلے تسلیم کی گئی ہے اسی طرح آج بھی تسلیم کی جاتی ہے۔ اسلام نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے حوصلہ برقرار رکھنے کا ذریعہ ذکر الٰہی کو بتایا ہے اور حق یہ ہے کہ مومن کے اندر عزم اور حوصلہ کا سرچشمہ یہی چیز ہے۔

اطاعتِ اللہ و رسول کا ایک خاص مفہوم

'وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ' یہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کے عام مفہوم کے سوا اس کا ایک خاص مفہوم بھی پیش نظر ہے۔ یعنی دشمن کے مقابل میں کامل نظم اور کامل ڈسپلن کا ثبوت دو۔ جو حکم اللہ نے دیے ہیں ان کی بھی پوری اطاعت کرو اور جو حکم رسول دے اس کی بھی بے چون و چرا تعمیل کرو۔ جس طرح دل ذکر الٰہی سے محروم ہو تو اس میں انتشار برپا ہو جاتا ہے اسی طرح جماعت اگر اطاعت میں ڈھیلی ہو تو جماعت کا نظم درہم برہم ہو جاتا ہے اور پھر اس کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔

نظم اور ڈسپلن کی پابندی

'وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ' اسی بات کو منفی پہلو سے واضح فرمایا کہ اللہ و رسول کے دیے ہوئے احکام سے اختلاف نہ کرنا ورنہ جماعت میں انتشار برپا ہو گا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ یہی وہ ہدایت ہے جس کی غزوہ احد کے موقع پر ایک جماعت نے خلاف ورزی کی اور اس کا تلخ نتیجہ پوری جماعت کو بھگتنا پڑا۔ قرآن نے آل عمران میں اسی کا حوالہ دیا ہے۔ 'حَتّٰٓی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىکُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۱۵۲' (یہاں تک کہ جب تم حوصلہ ہار بیٹھے اور تم نے نبی کے حکم میں اختلاف کیا اور تم نے نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی تھی جس کو تم عزیز رکھتے تھے)

خدا کی معیت حاصل ہونے کی شرط

'وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ' وہی بات جو اوپر 'فَاثْبُتُوْا' کے لفظ سے فرمائی ہے یہاں 'وَاصْبِرُوْا' کے لفظ سے فرمائی ہے۔ البتہ اوپر والی بات افراد کو پیش نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے اور یہ جماعت کو پیش نظر رکھ کر ارشاد ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی مدد و نصرت اور اس کی معیت کے طالب ہو تو اپنے جماعتی کردار سے اس کا استحقاق پیدا کرو۔ خدا منتشر بھیڑ کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ ان لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو اس کی راہ میں جہاد کے لیے بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہوں۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۭ وَاللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ۝ وَاِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ ۭ وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ (۴۷-۴۸)

'وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ'

بطر کا مفہوم

'بطر' کے معنی حق سے اکڑنے اور اس سے متکبرانہ منہ موڑنے کے ہیں۔ قرآن نے اس سے اس بدمستی اور سرکشی کو تعبیر فرمایا ہے جو اللہ کی نعمتیں پا کر کسی شخص یا گروہ پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ تکبر اور

تواضع کے بجائے غرور اور طغیان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے وَکَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْیَةٍ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَهَا ۵۸ (اور کتنی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو اپنے وسائل معیشت کی فراوانی پر اکڑنے لگی تھیں)

اہلِ ایمان کی جنگ بھی عبادت ہے

یہ قرآن نے اس روش کے منافی روش سے مسلمانوں کو روکا ہے جس کی تعلیم اوپر والی آیت میں 'وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا' کے الفاظ سے دی ہے۔ 'كَالَّذِیْنَ' سے اشارہ قریش کی طرف ہے جو جنگ بدر کے لیے، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، اپنی کثرتِ تعداد اور اسباب و وسائل کی بہتات کے گھمنڈ میں بڑے طنطنہ اور بڑے طمطراق سے نکلے تھے فرمایا کہ کسی مرحلے میں بھی ان لوگوں کی روش تم نہ اختیار کرنا۔ تم خدا کی بندگی و اطاعت کی رسم دنیا میں قائم کرنے اٹھے ہو تو بندگی کی تواضع اور عبدیت کی فروتنی ہر جگہ تم پر نمایاں رہے۔ خواہ برم میں ہو یا رزم میں۔ اگرچہ مقصود یہاں مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ تمہاری جنگ جنگ نہیں بلکہ خدا کی عبادت ہے، اس کی شانِ عبادت ہر جگہ قائم رہے لیکن اس سے یہ بات بھی سامنے آگئی کہ آیندہ مسلمانوں کے سامنے ایسے حالات آنے والے ہیں کہ اگر وہ چوکنے نہ رہے تو وہ بھی اس قسم کے فتنوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ ایک بشارت بھی ہے اور ساتھ ہی تنبیہ بھی کہ ہمیشہ خدا ہی سے وابستہ رہنا، تعداد اور سامان کی فراوانی جب حاصل ہو جائے تو اس کے غرے میں اترانے نہ لگنا۔ اصل چیز سر و سامان نہیں بلکہ خدا کی کارسازی اور اس کی معیت ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح 'وَلَا تَنَازَعُوْا' کی ہدایت کی ایک گروہ نے خلاف ورزی کر کے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جنگ احد میں پوری جماعت کے لیے ایک سخت آزمائش پیدا کر دی۔ اسی طرح جنگ حنین کے موقع پر کثرتِ تعداد کے اعتماد نے مسلمانوں کو ایک سخت آزمائش سے دوچار کر دیا جس کی طرف قرآن نے یوں اشارہ فرمایا ہے وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْئًا وَّضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ۲۵- توبہ (اور حنین کے دن جب کہ تمہاری کثرت نے تمھیں غرور میں مبتلا کیا تو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پیچھے بھاگے)

ریا اور نمائش سے احتراز کی ہدایت

'وَرِئَآءَ النَّاسِ' سے قریش کے اس جذبۂ نمائش کی طرف اشارہ ہے جس سے ایک ایک سردار بدر کے موقع پر سرشار تھا۔ اس کا ضد اللہ کے لیے اخلاص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو کچھ کرنا ہمیشہ اللہ کے لیے کرنا اس لیے کہ تمھیں اپنے کسی عمل کی داد دنیا سے نہیں لینی ہے بلکہ آخرت میں اپنے رب سے لینی ہے۔

'وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ' یعنی ان کا یہ سارا طمطراق اور سارا جوش و خروش اس لیے تھا کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی راہ سے روکیں۔ ان نادانوں کو پتہ نہیں کہ انسان خواہ کتنی وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ اپنے جال پھیلائے اور اپنی ترکتازیوں کے کتنے ہی مظاہرے دکھائے، اس کی ہر چیز ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہے۔ اس کی ساری جولانیوں کے اردگرد خدا نے باڑ لگا رکھی ہے۔

وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ الآیۃ۔ یعنی قریش کے اس بطر وریا کے مظاہرے میں تعداد اور وسائل کی کثرت کو تو دخل تھا ہی، شیطان نے بھی جس کو اللہ کی راہ مارنے کے کام ہی کے لیے مہلت ملی ہوئی ہے، ان کو پٹی پڑھائی کہ شاباش، آگے بڑھو، بھلا آج کس میں دم ہے کہ تمھارا مقابلہ کر سکے، میں تمھارا ساتھی اور مددگار ہوں لیکن وہ اس وقت تک تو ان کی پیٹھ ٹھونکتا رہا جب تک دونوں فوجیں آمنے سامنے نہیں ہوئیں لیکن جب فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو وہ دم دبا کر پیچھے کھسک گیا کہ میں تم سے بری، میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو، مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے۔

جنگ بدر میں یہود کی ریشہ دوانیاں

شیطان کے متعلق ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی یہاں ہمارا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ اس سے اشارہ یہود کی طرف ہے۔ سیرت و مغازی کی کتابوں سے بھی اور قرآن کے اشارات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہود شروع ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے خائف تھے۔ ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ انھوں نے طرح طرح سے آپ کے خلاف قریش کو اکسانا شروع کر دیا، مدینہ ہجرت فرمانے اور آپ کو انصار کی حمایت حاصل ہو جانے کے بعد تو خاص طور پر انھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ان کے سینہ پر یہ ایک بھاری سل رکھ دی گئی ہے۔ مستقبل کے سیاسی اندیشوں کے علاوہ وہ خود اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر بھی ڈرتے تھے کہ مبادا یہ وہی پیغمبر ہوں جس کا ذکر ان کے ہاں پہلے سے چلا آرہا ہے۔ وہ اپنی قوم سے باہر کسی نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے لیکن اپنی بزدلی کے سبب سے وہ آپ کے خلاف براہ راست کوئی اقدام کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ درپردہ وہ قریش کے لیڈروں کو بھی برابر اکساتے رہے اور مدینہ میں اوس و خزرج کے اندر بھی سازباز کرتے رہے۔ ایسے حالات میں یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ قریش نے قافلہ کی حفاظت کے بہانے جب مدینہ پر حملہ کی اسکیم بنائی تو اس میں یہود کا مشورہ بھی شامل رہا ہو اور انھوں نے قریش کو ورغلایا ہو کہ اول تو تمھاری بھاری جمعیت خود ہی مٹھی بھر مسلمانوں کو کچل دینے کے لیے کافی ہے لیکن ضرورت ہوئی تو ہم بھی تمھاری مدد کو حاضر ہیں۔ اگرچہ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک معاہدے میں بھی شریک تھے لیکن آگے اسی سورہ کی آیات ۵۶ - ۵۷ کے تحت یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انھوں نے اس کا کبھی پاس و لحاظ نہیں رکھا بلکہ برابر ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔ البتہ اپنی روایتی بزدلی کے سبب سے انھوں نے سامنے آنے کی جرأت کبھی نہیں کی۔ اس موقع پر بھی انھوں نے قریش کو بڑھاوے تو بہت دیے لیکن جب دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل میں آگئے اور انھوں نے مسلمانوں کے حوصلہ کو دیکھا تو دم سادھ کر بیٹھ رہے۔ اس موقع پر ان کے اندر سمایا ہوا وہ خوف بھی نمایاں ہوا ہو گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے متعلق وہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے اور جن کی نسبت ان کے صحیفوں کے ذریعے سے ان کے کانوں میں یہ بات پڑی ہوئی تھی

کہ ان کے جلو میں ملائکہ اور کروبیوں کی فوجیں ہوں گی۔ وہ بات بھی یہاں یاد رکھیے جس کا ذکر ہم سورۂ بقرہ میں کر آئے ہیں کہ بدر کی لڑائی، اپنے نقشۂ جنگ، اپنی تعداد اور مقصد کے اعتبار سے بنی اسرائیل کی اس جنگ سے مشابہ تھی جو سموئیل نبی کے عہد میں، طالوت کی زیر قیادت جالوت سے لڑی گئی تھی۔

منافقین کی فریب کاریاں

قرآن نے یہاں جو تمثیل یہود کی دی ہے بعینہٖ یہی تمثیل ان منافقین کے لیے بھی استعمال کی ہے جو یہود ہی کے اندر کے تھے بھی اور مسلمانوں کے اندر گھس کر یہود سے ساز باز بھی رکھتے تھے۔ یہ ان کو اطمینان دلاتے تھے کہ اگر مسلمانوں نے ان کے خلاف کوئی اقدام کیا تو وہ مسلمانوں کے بجائے ان کا ساتھ دیں گے لیکن قرآن نے واضح کیا کہ یہ ویسا ہی فریب ہے جیسا شیطان ان لوگوں کو دیا کرتا ہے جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ چونکہ ان دونوں تمثیلات میں بڑی مشابہت ہے اس وجہ سے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں زیر بحث تمثیل اچھی طرح واضح ہو جائے۔ سورۂ حشر میں منافقین کے ایک گروہ کا، جو یہود میں سے تھا، یہ کردار بیان ہوا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ۔ ۱۱-۱۲ حشر

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو منافق ہیں، وہ اپنے ان بھائیوں سے جنھوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا، کہتے ہیں کہ اگر تم نکالے گئے تو ہم بھی تمھارے ساتھ نکلیں گے اور تمھارے بارے میں ہم کسی کی بھی کوئی بات نہیں مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔ اللہ شاہد ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ ہوئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے۔ اور اگر مدد کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔ پھر ان کی مدد کہیں سے نہیں ہوگی۔

پھر ان منافقین کی تمثیل ان الفاظ میں دی ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِنْكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝ (۱۶-۱۷ حشر)

ان منافقین کی مثال شیطان کی ہے جو انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر۔ پھر جب وہ کفر کر بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں۔ میں اللہ، عالم کے خداوند سے ڈرتا ہوں۔ تو ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔

جس طرح یہاں یہودی منافقین کی تمثیل شیطان سے دی ہے اسی طرح زیر بحث آیت میں اگرچہ ذکر

شیطان کا ہے لیکن اشارہ یہود کی طرف ہے۔ تمثیل کے بجائے اشارہ وکنایہ کی صورت اس لیے اختیار فرمائی کہ یہود کی یہ ساری کارستانیاں ابھی پردے میں تھیں اس وجہ سے قرآن نے بھی یہ چاہا کہ ابھی بات پردے ہی میں رہے لیکن اشاروں کنایوں میں نقاب کے بعض گوشے اٹھا بھی دیے کہ یہود بھی جان لیں کہ اللہ ان کے کارناموں سے بے خبر نہیں ہے اور مسلمان بھی متنبہ ہو جائیں کہ اس پردے میں کون چھپا ہوا ہے۔ یہاں خاص طور پر لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ وَإِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ اور بعض دوسرے فقروں پر غور فرمائیے تو اصل حقیقت واضح ہو جائے گی۔

یہود کے باطن کی تعبیر

شیطان کے متعلق یہ بات جو بیان ہوئی ہے کہ وہ انسان کو کفر پر اکسا کر خود یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جاتا ہے کہ میں تم سے بری ہوں' میں اللہ رب العلمین سے ڈرتا ہوں، یہ اس کے رد یہ اور اس کے باطن کی تعبیر ہے، یہ بات شیطان زبان سے کسی کفر کرنے والے سے نہیں کہتا۔ اسی طرح یہاں یہود کے متعلق جو یہ بات بیان ہوئی ہے کہ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ، إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ، یہ ان کے رویے اور ان کے ذہن کی تعبیر ہے، یہ نہیں ہے کہ انھوں نے یہ بات قریش سے الفاظ میں کہی ہو۔ قرآن نے جگہ جگہ قَالَ کا لفظ اس بات کے لیے بھی استعمال کیا ہے جو آدمی اپنے دل میں کہتا ہے۔ یہود اپنے جوش حسد سے اندھے ہو کر یہ تو دل سے چاہتے تھے کہ قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ختم کر دیں لیکن دل میں چونکہ یہ چور بھی تھا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، ان سے ٹکرانا پہاڑ سے ٹکرانا اور اپنے آپ کو تباہ کرنا ہے اس وجہ سے خود سامنے آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چاہتے تھے کہ یہ خطرہ کوئی اور مول لے۔

یہود کا شیطانی تقویٰ

یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ دوسروں کو کسی جرم پر آمادہ کر دینا اور خود مجرموں کے ساتھ اس جرم کے لیے اس اندیشہ سے نہ نکلنا کہ کسی لپیٹ میں نہ آ جائیں یہ شیطانی تقویٰ ہے۔ قرآن نے اوپر واضح فرما دیا کہ جو جرم کے لیے دوسروں کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں لیکن خود اس میں اس خوف سے شریک نہیں ہوتے کہ خدا کی پکڑ میں نہ آ جائیں ان کا یہ خوف ان کو خدا کے عذاب سے نہیں بچائے گا بلکہ جس طرح جرم کے اکھاڑے میں اترنے والے جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اسی طرح اکھاڑے کے کنارے بیٹھ کر داؤں پیچ بتانے والے بھی جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اگرچہ بزعم خود وہ خدا کے ڈر ہی سے اکھاڑے میں نہیں اترے۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی ہے جو دوسروں کو تو چوری اور بدمعاشی کی تربیت دیتا ہے لیکن خود اپنے تربیت دیے ہوئے چوروں اور بدمعاشوں کے ساتھ چوری اور بدمعاشی کے لیے اس ڈر سے نہیں نکلتا کہ کہیں پولیس کی گرفت میں نہ آ جائے۔ ظاہر ہے کہ قانون کے ایسے احترام کرنے والوں کو کوئی قانون نہیں بخشتا بلکہ جب یہ زد میں آ جاتے ہیں تو یہ بھی اپنے مریدوں ہی کے انجام سے دوچار ہوتے ہیں بلکہ ان پر کچھ زیادہ مار پڑتی ہے۔ یہی بات قرآن نے فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا' والی آیت میں فرمائی ہے جو سورۂ حشر کے حوالے سے ہم نے اوپر نقل کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہود بھی مسلمانوں کے معاملے میں اسی شیطانی تقویٰ

میں مبتلا تھے۔ وہ یہ تو دل سے چاہتے تھے کہ مسلمان تباہ کر دیے جائیں، اس مقصد کے لیے وہ قریش کو چڑھا بھی لائے لیکن خود قریش کے ساتھ میدان جنگ میں اترنے کے لیے تیار نہ ہوئے اس لیے کہ اس خدائی فوج اور پولیس کا بھی ان کو ڈر لگا ہوا تھا جس کا اشارہ 'إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ' سے نکلتا ہے۔

إِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ غَرَّ هَٰؤُلَاءِ دِينُهُمْ ۗ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۴۹)

منافقین کے طعنے

سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'مَرَضٌ' جب نفاق کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد حسد ہوتا ہے۔ یہود کی ریشہ دوانیوں کے بعد اب یہ منافقین اور حاسدین کی حوصلہ شکنیوں کا ذکر فرمایا کہ انھوں نے بھی اس موقع پر مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہیں تو مٹھی بھر، مقابلہ کرنے اٹھے ہیں قریش کی دل بادل فوج سے۔ یہ ہاتھی سے گنا کھانے چلے ہیں۔ مذہب کے خبط نے ان کو ہوش و خرد سے عاری کر دیا ہے۔ اس قسم کے فقرے اور طعنے بالخصوص جب کہ اپنے اندر ہی کے لوگوں کی زبان سے نکلیں اور حالات بھی بے سروسامانی اور قلت تعداد کے اعتبار سے وہ ہوں جو بدر کے موقع پر تھے تو ان کے اثرات بہت خطرناک ہو سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے زہر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔

'وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ' مطلب یہ ہے کہ ان منافقین و حاسدین کے علی الرغم جو لوگ اللہ پر بھروسہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا غالب اور حکیم ہے۔ وہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کا خود ساتھی بنتا ہے، اس کی قوت کو کوئی شکست نہیں دے سکتا، وہ ان کے لیے خود تدبیر فرماتا ہے اور اس کی تدبیر کے مقابل میں کسی کی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۵۰-۵۸

آگے یہ واضح فرمایا کہ یہ مار جو ان پر پڑی اسی پر بس نہیں ہے۔ اصل سزا جو انھیں ملنی ہے اس کا مرحلہ تو آگے آنے والا ہے، جب یہ مرنے سے دوچار ہوں گے۔ یہ مار تو محض بطور تنبیہ ہے۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنی بخشی ہوئی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنی روش بگاڑ نہ لے۔ جب کوئی قوم اپنی روش بگاڑ لیتی ہے تو پہلے اللہ اس کو تنبیہ فرماتا ہے۔ جب وہ تنبیہ سے کوئی سبق نہیں لیتی بلکہ اپنی سرکشی میں بڑھتی جاتی ہے تو پھر اس پر خدا کا فیصلہ کن عذاب آجاتا ہے۔ قوم فرعون کے ساتھ اللہ نے جو معاملہ کیا وہ ان کے لیے مثال ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو مختلف آزمائشوں میں پکڑا کہ وہ آنکھیں کھولیں لیکن جب انھوں نے آنکھیں نہیں کھولیں تو خدا نے ان کا بیڑا غرق کر دیا۔

اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ ناپاک وجود ان لوگوں کا ہے جو کفر پر اڑ

گئے ہیں اور ایمان لانے والے نہیں ہیں جو تم سے معاہدہ کر کے بار بار اپنے معاہدہ کو توڑتے ہیں۔ اگر یہ کسی جنگ میں تمہارے مقابل میں آئیں تو ان کو ایسی مار مارو کہ جو ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں ان کو بھی سبق مل جائے اور ان میں سے جس کی طرف سے بھی اب معاہدہ کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہو اس کا معاہدہ اس کے منہ پر پھینک مارو، خدا ایسے بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۰-۵۸

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝٥٠ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝٥١ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٥٢ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝٥٣ۙ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝٥٤ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٥٥ۖ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝٥٦ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝٥٧ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۝٥٨ۧ

ع ۳

ترجمۂ آیات ۵۰-۵۸

اور اگر تم دیکھ پاتے جب فرشتے ان کفر کرنے والوں کی روحیں قبض کرتے ہیں مارتے

ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر، اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو مزا جلنے کے عذاب کا، یہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے اور اللہ بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ ۵۰-۵۱

ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوا جو قوم فرعون اور ان لوگوں کے ساتھ ہوا جو ان سے پہلے گزرے۔ انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا۔ بے شک اللہ قوی، سخت پاداش والا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ اس انعام کو جو وہ کسی قوم پر کرتا ہے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اس چیز کو نہ بدل ڈالے جس کا تعلق خود اس سے ہے اور بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ان کے سامنے وہی معاملہ ہے جو آلِ فرعون اور ان لوگوں کو پیش آیا جو ان سے پہلے گزرے۔ انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب کردی تو ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور آل فرعون کو غرق کر دیا اور یہ سارے کے سارے ظالم تھے۔ ۵۲-۵۴

بے شک بدترین جانور اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے، جن سے تم نے عہد لیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں۔ پس اگر تم انھیں جنگ میں پا جاؤ تو انھیں ایسی مار مارو کہ جو ان کے پیچھے ہیں ان کو بھی تتر بتر کر دو تاکہ ان کے ہوش ٹھکانے ہوں اور اگر تمھیں کسی قوم سے بدعہدی کا خطرہ ہو تو تم بھی اسی طرح ان کا عہد ان پر پھینک مارو۔ اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۵۵-۵۸

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (۵۰-۵۱)

جواب شرط کے حذف کا ایک خاص محل

'وَلَوْ تَرٰۤى' جواب شرط یہاں محذوف ہے اور اس طرح کے مواقع ہیں، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم ذکر کر چکے ہیں، جواب شرط کا محذوف ہونا ہی تقاضائے بلاغت ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ جس منظر کے دیکھنے کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کی ہولناکی ناقابل بیان ہے۔

مبالغہ فی النفی کا اسلوب

'لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ' میں بھی عربی زبان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ عربی میں مبالغہ پر جب نفی آتی ہے تو اس سے مبالغہ فی النفی کا مضمون پیدا ہوتا ہے۔ یعنی خدا بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ امرؤالقیس نے 'لَیْسَ بِفَعَّالٍ' اور 'لَیْسَ بِقَتَّالٍ' کے قسم کی ترکیبیں استعمال کی ہیں یعنی فلاں میں کچھ بھی کرنے کی صلاحیت نہیں، فلاں میں لڑنے کا ذرا دم خم نہیں، بس باتوں کا غازی ہے، کردار کا غازی نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کفار کو بدر میں جو مار پڑی یہ کیا ہے، اصل مار تو وہ ہے جو فرشتوں کے ہاتھوں ان کی موت کے وقت ان پر پڑتی ہے۔ اگر کہیں اس کو دیکھ پاتے تو کچھ اندازہ ہوتا کہ ان کی کیا درگت بننے والی ہے۔ پھر اس کے بعد عذاب دوزخ کا مرحلہ ہے جس کا آج کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہر ایک کے آگے اس کے اپنے اعمال پیش ہوں گے

'ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ' یعنی ان کے سامنے یہ انھی کے ہاتھوں کی کرتوت رکھی جائے گی۔ جو بس بھری فصل انھوں نے دنیا میں بوئی، سینچی اور پروان چڑھائی اسی کا حاصل ان کے سامنے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کوئی ظلم و ناانصافی نہیں کرے گا۔ وہ اپنے بندوں کے ساتھ رتی بھر ظلم کا بھی روادار نہیں۔ اس کا قانون اور عدل بے لاگ ہے۔ ہر شخص جو کرے گا وہی بھرے گا۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ (۵۲-۵۴)

'آل' کا مفہوم

'كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ' 'آل' پر دوسری جگہ ہم تفصیل سے بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ یہ صرف اولاد کے معنی میں نہیں آتا بلکہ اس کا اطلاق قوم اور اتباع سب پر ہوتا ہے۔

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ قریش کو یہ افتاد جو پیش آئی ہے یہ اسی طرح کا معاملہ ہے جیسا کہ قوم فرعون اور اس سے پہلے کی قوموں کو پیش آیا کہ انھوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری، اس کی نشانیوں کی ناقدری اور اس کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا اس لیے کہ خدا قوی اور اپنے

قانون پاداش عمل کے اجراء و نفاذ میں بے لاگ ہے۔

غذاب بطور تنبیہ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ سے اس نوعیت کی پکڑ کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ قوموں کو بطور تنبیہ مبتلا کرتا ہے۔ نبی کی بعثت کے دور میں اس طرح کی تنبیہات کا خاص طور پر ظہور ہوتا ہے۔ اس سنت الٰہی کی تفصیل کے لیے اعراف ۹۴۔ انعام ۴۲۔ بقرہ ۱۵۵ ملاحظہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ افتاد جو قریش کو پیش آئی ہے اس سے مقصود ان کو جھنجھوڑنا اور جگانا ہے۔ یہ بات سنت الٰہی کے مطابق ظہور میں آئی ہے اور اس کی مثالیں پچھلی قوموں کی تاریخ میں بھی گزر چکی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قریش اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں یا اپنی پیشرو قوموں کی تقلید میں اللہ کی آیات اور نبی کی دعوت کی تکذیب پر اڑے جاتے ہیں۔ اگر یہ تکذیب پر اڑ گئے تو پھر اللہ ان کو بھی اسی طرح ہلاک کر دے گا جس طرح آلِ فرعون اور دوسری قوموں کو اس نے ہلاک کیا۔

یہاں كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ دو مرتبہ آیا ہے یہ تکرار نہیں ہے بلکہ دونوں جگہ دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے یہ بتایا کہ یہ اسی نوع کی تنبیہ ہے جس نوع کی تنبیہ فرعون اور دوسری قوموں کو کی گئی۔ پھر یہ بتایا کہ اگر اس تنبیہ سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو بالآخر ان پر بھی اسی طرح فیصلہ کن عذاب آ جائے گا جس طرح ان قوموں پر آیا۔

تذکیر و تنبیہ کا مقصد ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ یہ حکمت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیوں فرمایا کہ قوموں کو تذکیر و تنبیہ ہوتی رہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر انعام فرماتا ہے تو یوں ہی نہیں فرماتا بلکہ وہ انعام کچھ صفات و کردار پر مبنی ہوتا ہے، اسی طرح جب وہ کسی قوم کو اپنے اس انعام سے محروم کرتا ہے تو یوں ہی محروم نہیں کر دیتا بلکہ وہ یہ دیکھ کر کرتا ہے کہ قوم نے اپنے آپ کو ان صفات و اخلاق سے محروم کر لیا جن کی بنا پر وہ مستحق انعام ٹھہری تھی۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ جب کوئی انعام یافتہ قوم خرابیوں میں مبتلا ہو تو خدا تذکیر و تنبیہ کے ذریعہ سے اس پر حجت تمام کر دے۔ اس تذکیر و تنبیہ سے اگر قوم بیدار ہو گئی تو اس کا استحقاق باقی رہتا ہے۔ اگر نہ بیدار ہوئی تو وہ اللہ کی نعمت سے اتمام حجت کے بعد محروم ہو جاتی ہے اور ساری ذمہ داری خود اسی پر ہوتی ہے، خدا اس سے کوئی ناانصافی نہیں کرتا۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ ابھی موقع باقی ہے اس سے فائدہ اٹھا لو، خدا نے تم پر جو انعام فرمایا تھا وہ تم سے زبردستی نہیں چھیننا چاہتا بلکہ تمہارے عقائد و اعمال کے بگاڑ نے اس کے اسباب پیدا کیے ہیں، تم اپنے آپ کو بدل کر اور اصلاح کر کے پھر اپنے استحقاق کو بحال کر سکتے ہو۔

خدا کا معاملہ سمع و علم پر مبنی ہوتا ہے وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یعنی قوموں کے عزل و نصب میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ اندھے کی لاٹھی کی طرح نہیں ہے بلکہ تمام تر سمع و علم پر مبنی ہے۔ وہ قوموں کو اختیار و اقتدار اور اسباب و وسائل دے کر برابر ہر چیز کو دیکھتا، سنتا اور جانتا رہتا ہے کہ وہ کیا بنا رہی ہیں اور کس راہ پر جا رہی ہیں۔ اور اس کا معاملہ ان کے ساتھ اسی بے خطا سمع و علم پر مبنی ہوتا ہے۔

تنبیہات سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کا انجام كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ یہ وہ انجام بیان ہو رہا ہے جو آگے قریش کا ہو گا۔ اگر انھوں نے ان تنبیہات

سے سبق حاصل نہ کیا جو ان کو کی جارہی ہیں۔ یعنی پھر وہ تنبیہات کے بجائے خدا کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آجائیں گے۔ ان دونوں آیتوں میں الفاظ اور لہجہ کا جو فرق ہے اس کو نگاہ میں رکھیے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا ہے کَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اس میں ہے كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ۔ اوپر ہے فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ، یہاں ہے فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ۔ اس فرق کو ملحوظ رکھے بغیر دونوں آیتوں کا موقع و محل واضح نہیں ہوگا۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ه اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ه فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ه وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (۵۵-۵۸)

یہود کی وعدہ خلافیاں

اب یہ یہود اور ان قبائل کے باب میں ہدایت دی جارہی ہے جن سے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ناطرفداری کے معاہدے کرلیے تھے مثلاً جہنیہ، بنی ضمرہ، بنی مدلج وغیرہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کیے ہوئے معاہدے کا برابر احترام باقی رکھا لیکن یہود نے ایک دن بھی اس کا احترام نہیں کیا اور یہ قبائل بھی یہود کی انگیخت یا قریش کے دباؤ سے برابر معاہدے کی خفیہ یا علانیہ خلاف ورزیاں کرتے رہے۔

شَرَّ الدَّوَآبِّ کا مفہوم

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ کے اسلوب میں جو زور اور شدت ہے اس کی وضاحت آیت ۲۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہ اسلوب ان لوگوں کے وجود اور بقا کے جواز کی نفی کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کی قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک ان میں کوئی رمق سوچنے سمجھنے کی باقی ہے۔ جن کے اندر یہ رمق ختم ہوگئی، نہ وہ پہلے ایمان لائے، نہ آیندہ ایمان لانے والے ہیں، اب وہ صرف گندگی کے ایک ڈھیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب خدا کی زمین پر ان کے باقی رہنے میں کوئی خیر و برکت نہیں ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ جن کی آنکھوں کے پردے رسول کے بعد بھی نہیں اٹھتے ان کا اندھاپن لاعلاج ہوتا ہے اور زمین پر ان کا باقی رہنا بالکل بے مقصد ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو جینے کی جو مہلت دیتا ہے صرف جینے کے لیے نہیں دیتا بلکہ سوچنے سمجھنے اور زندگی سنوارنے سدھارنے کے لیے دیتا ہے۔

مذکورہ گروہ کی اخلاقی پستی

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ یہ انہی لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے۔ مِنْهُمْ یعنی مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اوپر ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ ان لوگوں نے معاہدہ تو کرلیا لیکن اس کو وفاداری کے ساتھ نبھایا ایک دن بھی نہیں۔ جب کوئی موقع امتحان کا آتا وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز نہ آتے۔ ان کی ہمدردیاں برابر قریش کے ساتھ رہیں۔ معاہدہ کر لینے کے

بعد بار بار نقضِ عہد کا ارتکاب یہ ان کے دل کی سختی، کردار کی پستی اور ان کے احساسِ غیرت و حمیت سے خالی ہونے کی دلیل تھی۔ 'فِیْ کُلِّ مَرَّۃٍ' سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح کے حالات کے لیے معاہدہ وجود میں آیا تھا اس طرح کی کوئی آزمائش جب کبھی پیش آتی تو یہ معاہدہ کا احترام نہ کرتے بلکہ اس کی خلاف ورزی کر گزرتے۔ 'لَا یَتَّقُوْنَ' سے یہاں مطلب یہ ہے کہ نقضِ عہد اور اس کے نتائج سے نہیں بچتے حالانکہ عہد کی پاسداری اور حرمت دنیا کے معروف میں بھی مسلّم ہے اور اللہ کے ہاں بھی اس کی پرسش ہونی ہے۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۔

'ثقف' کے معنی پالینے کے ہیں اور 'تشرید' کے معنی پراگندہ کر دینے، تتر بتر کر دینے کے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تو یہ جو کچھ کر رہے ہیں پردے میں کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی سامنے آنے کی جرأت نہیں کر رہا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی گروہ سامنے آنے کی جرأت کرے اور جنگ کے میدان میں تمھیں مل جائے تو انہیں ایسی مار مارو کہ ان کے بھی پرخچے اڑ جائیں اور جو ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے پر تول رہے ہیں ان کے پر و بال بھی جھڑ جائیں۔

'لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ' یعنی ان کا انجام دیکھ کر ان کو بھی سبق حاصل ہو کہ اگر انھوں نے بھی یہی حرکت کی تو ان کا بھی یہی انجام ہونا ہے۔

معاہدات سے متعلق عام ہدایت

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ۔ یہ مذکورہ قسم کے تمام معاہدوں سے متعلق عام ہدایت دے دی کہ ان کی ذمہ داری تم پر یک طرفہ نہیں ہے صرف اسی صورت میں ہے جب دوسرا فریق بھی ان کا احترام کرے۔ اگر وہ احترام نہیں کرتا تو تم بھی اس معاہدہ کو ان کے منہ پر پھینک مارو۔ 'عَلٰى سَوَآءٍ' کا مفہوم یہ ہے کہ انہی کے برابر کا اقدام تم بھی کرنے کے مجاز ہو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دینا چاہیے بلکہ جواب ہم وزن ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ لازم قرار دیا ہے کہ ختم معاہدہ کی اطلاع فریق ثانی کو دے دینی چاہیے۔ ان کی اس بات کی کوئی دلیل ان الفاظ میں مجھے نظر نہیں آتی۔ البتہ یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ محض فرضی اندیشہ کسی معاہدے کو کالعدم قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ عملاً اس کی خلاف ورزی کا اظہار ہوا ہو۔ اول تو یہاں 'تَخَافَنَّ' کا جو فعل استعمال ہوا ہے اس میں خود تاکید ہے۔ دوسرے 'عَلٰى سَوَآءٍ' کی قید بھی ان کو نمایاں کر رہی ہے۔

بدعہدوں سے اظہار براءت

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ' یہ اظہار براءت کا کلمہ ہے۔ یعنی اللہ کا ایسے بدعہدوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور جب اللہ کا ان سے کوئی تعلق نہیں تو اہل ایمان کوئی تعلق ایسے لوگوں سے کیسے رکھ سکتے ہیں۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اہل ایمان ان سے نباہیں تو گویا وہ ان سے نباہیں گے جن سے خدا کو نفرت ہے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۹-۶۶

آگے مسلمانوں کو جہاد کے لیے برابر تیار رہنے اور اس کے لیے اسلحہ اور قوت فراہم کرنے پر ابھارا ہے۔ اس لیے کہ بدر میں قریش کو جو شکست ہوئی اس نے قریش میں بھی آگ لگا دی اور یہود بھی جواب تک یہ توقع لیے بیٹھے تھے کہ وہ قریش کے ہاتھوں مسلمانوں کو ختم کرا دیں گے۔ اپنی اس توقع میں ناکام ہو کر نئے منصوبے بنانے میں پوری طرح سرگرم ہو گئے۔ ان حالات سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو بھی ہدایت ہوئی کہ اب پوری سرگرمی سے جہاد کے لیے تیاری کرو۔

اس ضمن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان بھی دلایا گیا کہ اگر یہ معاندین کوئی مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کا رجحان ظاہر کریں تو تم بھی مصالحت سے گریز نہ کرنا۔ اگر اس مصالحت کے پردے میں انھوں نے کوئی چال چلنے کی کوشش کی تو جس خدا نے اپنی نصرت اور انہی تھوڑے سے مسلمانوں کے ذریعہ سے بدر میں تمھیں فتح دلائی ہے وہ اب بھی تمھارے ساتھ ہے۔

پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی گئی کہ تم مسلمانوں کی تعداد کی کمی سے مطلق ہراساں نہ ہو۔ تمھارے لیے اللہ اور انہی تھوڑے سے مسلمانوں کی رفاقت کافی ہے۔ یہی قطرے سیلاب بنیں گے۔ مسلمانوں کو اطمینان دلاؤ کہ ان کے دس آدمی کفار کے سو آدمیوں پر بھاری ہوں گے۔ اصلی طاقت دلوں کی طاقت ہوتی ہے نہ کہ محض گنتی کی۔ جو لوگ تمھارے مقابل میں ہیں وہ محض کھوکھلے دل والے ہیں۔

اس مجموعہ کی آخری آیت ۶۶ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں، مسلمانوں کی کثرت کے دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس نے مسلمانوں پر سے وہ ذمہ داری کچھ ہلکی کر دی جو اوپر والی آیت میں ان پر عائد ہوئی تھی۔ چونکہ اس کا تعلق اسی مضمون سے تھا اس وجہ سے اس کو یہاں جگہ دی گئی۔ آگے اس کی وضاحت آئے گی۔

آیات ۵۹-۶۶

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿٥٩﴾ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٦٠﴾ وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦١﴾ وَإِنْ

يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾ ع يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَي الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اَلْــٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

ترجمۂ آیات ۵۹-۶۶

اور یہ کافر یہ گمان نہ کریں کہ وہ نکل بھاگیں گے، وہ ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکیں گے اور ان کے لیے جس حد تک کر سکو فوج اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جس سے اللہ کے اور تمھارے ان دشمنوں پر تمھاری ہیبت رہے اور ان کے علاوہ کچھ دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ انھیں جانتا ہے اور جو کچھ بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا کر دیا جائے گا اور تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ۵۹-۶۰

اور اگر وہ مصالحت کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لیے جھک جائیو اور اللہ

پر بھروسہ رکھیو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمھارے لیے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی نصرت سے اور مومنین کے ذریعے سے تمھاری امداد کی۔ اور ان کے دلوں کو باہم جوڑا۔ اور اگر تم زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر ڈالتے تو بھی ان کے دلوں کو باہم نہ جوڑ سکتے لیکن اللہ نے ان کو جوڑ دیا۔ بے شک وہ غالب اور حکیم ہے۔ ۶۱-۶۳

اے نبی تمھارے لیے اللہ اور یہی مومنین جنھوں نے تمھاری پیروی اختیار کی ہے کافی ہیں۔ اے نبی مومنین کو جہاد پر ابھارو۔ اگر تمھارے بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمھارے سو ہوں گے تو ہزار کافروں پر بھاری ہوں گے یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ بصیرت سے محروم ہیں۔ ۶۴-۶۵

اب اللہ نے تمھاری ذمہ داری ہلکی کر دی اور اس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔ سو تمھارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری ہوں گے اور اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ ۶۶

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ (۵۹)

اوپر کی آیات میں کفار کو جو دھمکی دی ہے اور خاص طور پر یہ بات جو فرمائی ہے کہ ان کی ساری دوا دوش اور ان کی تمام جولانیوں کا خدا احاطہ کیے ہوئے ہے یہ اسی مضمون کی تاکید مزید ہے۔ فرمایا کہ اب ہم نے ان کا تعاقب شروع کر دیا ہے۔ اب یہ اس غلط فہمی کو ذہن سے نکال دیں کہ یہ ہم سے بچ کے نکل جائیں گے۔ یہ ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکتے۔ 'اعجزہ الصید' کے معنی ہوں گے فاتہ ولم یقدر علیہ شکار قابو سے باہر نکل گیا۔ پکڑا نہ جا سکا۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۶۰)

لفظ 'قوۃ' کا مفہوم

'وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ' لفظ 'قوۃ' قرآن میں، جیسا کہ ۶۹- توبہ، ۸۰ ہود، ۹۵ کہف، ۱۵ فصلت اور دوسری آیات سے واضح ہے، عددی قوت اور (MAN POWER) کے لیے بھی آتا ہے۔

'رباط الخیل' سے مراد

مسلمانوں کو جنگی تیاریوں کا حکم

'رباط الخیل' سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو خاص جنگ کے لیے تربیت دیے جائیں اور اسی غرض کے لیے محفوظ اور تیار رکھے جائیں۔ جنگ میں ہر قسم کے گھوڑے کام نہیں آتے۔ اس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں ہی کی اصل اہمیت بھی تھی اور عرب کی مخصوص آب و ہوا کے لحاظ سے ان کے ہاں گھوڑوں کی تربیت کا خاص اہتمام بھی تھا۔ اسی چیز کی ہدایت یہاں مسلمانوں کو کی گئی ہے کہ جہاد کے لیے قابلِ جہاد لوگوں کو بھی منظم کرو اور تربیت دیے ہوئے گھوڑے بھی تیار رکھو۔ اب تک تو جب کسی جنگی مہم کی صورت پیش آتی عرب کے عام دستور کے مطابق یہ ہوتا کہ ہر سپاہی، جو سامان اس کو میسر ہوتا اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا لیکن اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ اپنی فوجی قوت نفری کے اعتبار سے بھی اور اسلحہ و اسباب جنگ کے اعتبار سے بھی زیادہ سے زیادہ بڑھائیں۔ اس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں کو وہی اہمیت حاصل تھی جو اس زمانے میں ٹینک اور ہوائی جہاز کو حاصل ہے جنگ بدر میں مسلمانوں کے ساتھ گھوڑے بہت کم تھے۔ آگے کے مراحل کے لیے ان کی تعداد زیادہ کرنے کی ہدایت ہوئی۔

مسلمانوں کے دشمن اللہ کے دشمن

'تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ' یہ اس تیاری کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ کے اور تمھارے دشمنوں پر تمھاری دھاک اور ہیبت قائم رہے کہ تمھیں نرم چارہ سمجھ کر وہ تم پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کریں۔ یہاں مسلمانوں کے تمام دشمنوں کو اللہ کا دشمن ٹھہرایا ہے اس لیے کہ مسلمانوں کی جنگ جس سے بھی تھی، اللہ کے دین کے لیے تھی، اس میں کسی اور چیز کا کوئی دخل نہیں تھا۔

مسلمانوں کے پس پردہ دشمنوں کی طرف ایک اشارہ

'وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ' اللہ اور مسلمانوں کے یہ دشمن دو قسم کے تھے۔ ایک تو وہ جو سامنے آچکے تھے، مثلاً قریش جو روزِ اول سے دشمن تھے۔ دوسرے وہ جو ابھی پردے میں تھے۔ مثلاً یہود، جن کی خفیہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ نیز وہ قبائل جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ غیر جانبداری تھا لیکن، یہود اور قریش کی تحریک سے وہ بھی پر تولنے لگ گئے تھے۔ علاوہ ازیں وہ منافقین جو منافقت میں بڑے مشاق تھے اور برابر دشمنوں کی مقصد برآری کے لیے مصروفِ سازش رہتے تھے۔ قرآن نے سورۂ توبہ میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ	اور تمہارے ارد گرد جو اعراب ہیں ان میں بہتیرے
وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا	منافق ہیں اور اہل مدینہ میں بھی منافق ہیں۔ یہ اپنے
عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ	نفاق میں بڑے مشاق ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے۔
سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ	ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے
اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (۱۰۱ توبہ)	پھر یہ ایک عظیم عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔

علاوہ ازیں بیرونی طاقتیں مثلاً رومی، غسانی، ایرانی وغیرہ بھی تھیں جو بعد میں اس وقت سامنے آئیں جب اسلام نے پورے عرب کو زیر نگین کر لیا۔ قرآن نے یہاں مسلمانوں کو حاضر سے متعلق ہدایت دیتے ہوئے ان دشمنوں کی طرف بھی ایک اشارہ کر دیا جو مستقبل قریب یا مستقبل بعید کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں تاکہ مسلمان دور تک نگاہ رکھ کر منصوبہ بندی کریں۔ یہ نہ خیال کریں کہ محض ایک وقتی جھونکا تھا، جو آیا اور اب گزر گیا ہے۔

جنگی تیاریوں کے لیے انفاق

'وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الاٰيۃ' یہ جنگی تیاریوں کے سلسلہ میں انفاق کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے کہ اس مقصد کے لیے جو کچھ بھی خرچ کرو گے تمہارا کوئی دھیلا پیسہ بھی ضائع جانے والا نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں تمہارا پائی پائی کا حساب موجود رہے گا اور وہ سب تمہیں پورا کر دیا جائے گا، اس میں ذرا کمی نہیں ہوگی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'یہ پورا کیا جانا' اسی اصول کے مطابق ہو گا جو نیکیوں کے اجر کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اور جو قرآن میں دوسرے مقام میں مذکور ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۔ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۶۱-۶۳)

صلح جوئی کی اجازت

'وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ' سَلْمٌ، سِلْمٌ، صلح اور مصالحت کے معنی میں آتا ہے اور یہ مؤنث بھی استعمال ہوتا ہے۔

اجتماعی اصول عدل کا احترام

اوپر جنگ کا جو حکم دیا ہے وہ 'حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ' کی تصریح کے ساتھ ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ قریش کے ساتھ یہ جنگ اس وقت تک ختم ہونے والی نہیں ہے جب تک فتنہ کا اور سرزمین حرم سے ہر شائبہ شرک و کفر کا استیصال نہ ہو جائے۔ یہاں یہ واضح فرمایا کہ یہ حکم اس بات کے منافی نہیں ہے کہ کسی مرحلے میں قریش اگر صلح کے خواہاں ہوں تو ان سے صلح کر لی جائے ان کی صلح کی پیشکش کو قبول کرنے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دے دی گئی۔ اس وقت تک قریش کے لیڈروں نے جس عناد کا اظہار کیا تھا اس کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کوئی مصالحت نیک نیتی

سے کریں گے بلکہ اندیشہ تھا کہ شرارت کرنے اور دھوکہ دینے ہی کے لیے کریں گے اس وجہ سے ان پر اعتماد کرنے کا مسئلہ بڑا مشکل تھا۔ تاہم چونکہ اجتماعی اصول عدل اسی بات کا مقتضی تھا کہ حریف کی صلح کی پیشکش ٹھکرائی نہ جائے اس وجہ سے آنحضرتؐ کو ہدایت ہوئی کہ اس اندیشے کے باوجود مصالحت قبول کر لینا اور اللہ پر بھروسا رکھنا۔ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اگر اس کے اعتماد پر تم ایک مقصد خیر کی خاطر خطرہ مول لو گے تو اللہ تمہاری مدد فرمائے گا اور حریف اس سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہ ہو گا۔

بین الاقوامی حالات میں اللہ کا احترام

'وَاِنۡ یُّرِیۡدُوۡۤا اَنۡ یَّخۡدَعُوۡکَ فَاِنَّ حَسۡبَکَ اللّٰہُ' یعنی زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا یہی نا کہ وہ تمہیں دھوکہ دینے کی کوشش کریں گے تو اس کی پروا نہ کرنا، اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔ 'اللہ تمہارے لیے کافی ہے' کے اجمال میں جو کچھ مضمر ہے قلم اس کی تعبیر سے اگرچہ قاصر ہے لیکن وہ بغیر کسی اظہار کے بھی ظاہر ہے۔ یہاں خاص طور پر غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام حق و انصاف کے جس اصول کی تلقین انسان کو اس کی انفرادی زندگی کے لیے کرتا ہے اسی کی تلقین اس کی اجتماعی زندگی کے لیے کرتا ہے اور اسی کی تلقین اس کی بین الاقوامی زندگی کے لیے بھی کرتا ہے اور اس تصریح کے ساتھ کرتا ہے کہ اگر اس میں کچھ خطرہ اور اندیشہ بھی ہو جب بھی کسی خیر کی پیشکش ٹھکرائی نہ جائے۔ بلکہ اللہ پر بھروسہ کر کے وہ قبول کر لی جائے۔ یہ توکل علی اللہ یہاں خاص طور پر نگاہ میں رہے۔ معلوم ہوا کہ توکل صرف مسجد کی چاردیواری تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ میدانِ جنگ میں بھی اہل ایمان کی قوت اور بین الاقوامی معاملات میں بھی اہل ایمان کی پشت پناہ ہے۔

'ھُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ' یہ اس 'حسبک اللہ' کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ جس خدا نے بدر میں اپنے فرشتوں کی فوج سے تمہاری مدد کی اور مٹھی بھر مسلمانوں سے کفار کی دل بادل فوج کچلوا دی وہ خدا تمہاری اس وقت بھی مدد فرمائے گا جب تمہارے یہ حریف صلح کے پردے میں تمہارے خلاف جنگ کی اسکیمیں بنائیں گے اور تمہاری نیکی سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔

خدا ساز بات

'وَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ' اوپر جو یہ اشارہ ہوا ہے کہ اللہ نے مومنین کے ذریعہ سے تمہاری مدد فرمائی، یہ اس کی وضاحت ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ خاص تائید غیبی ہی کا یہ کرشمہ ہے۔ کسی شیطانی مقصد کے لیے کسی بھیڑ کا اکٹھا کر لینا تو مشکل نہیں ہوتا۔ ہر نعرہ باز یہ کام کر سکتا ہے لیکن خاص اللہ کے کام کے لیے جس میں خدا کی خوشنودی اور آخرت کی طلب کے سوا کسی بھی دوسری چیز کا کوئی ادنیٰ شائبہ نہ ہو، کلمۂ حق کے جاں نثاروں کی ایک جمعیت کا فراہم ہو جانا بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تائید کی اور اس کی توفیق بخشی نے رہنمائی فرمائی۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع ہوئے تھے، اپنی یہ نئی زندگی اختیار کرنے سے پہلے، دورِ جاہلیت کی تمام برائیوں میں آلودہ تھے، ان کے قبیلے جدا جدا تھے اور ان میں شدید قسم کے تعصبات تھے، ان کے دیوتا الگ الگ تھے اور یہ آنکھیں بند کر کے ان کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے مفادات باہم متصادم تھے اور یہ ان کے

حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز اور عدل و ظلم کے تمام حدود و قیود سے آزاد تھے۔ اس طرح کے لوگوں کو ان کے تمام تعصبات و مفادات اور تمام رسوم و عادات سے چھڑا کر بالکل ایک نئے سانچہ میں ڈھال دینا اور اس سانچے کو ان کی نگاہوں میں اتنا محبوب بنا دینا کہ اس کی خاطر وہ قوم، وطن، خاندان، جائداد اور بیوی بچے سب کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں، یہ خدا ہی کے لیے ممکن ہے۔ کوئی انسان یہ کام نہیں انجام دے سکتا، اگرچہ وہ دنیا جہان کے سارے وسائل اس پر صرف کر ڈالے۔

اللہ عزیز و حکیم ہے۔ وہ جو کام کرنا چاہتا ہے کر ڈالتا ہے اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ اشارہ ہے ہدایت و ضلالت کے اس قانون کی طرف جس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (۶۴-۶۵)

مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنے کی ہدایت

'يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ' یہ آیت تمہید ہے اس حکم کی جو بعد والی آیت میں مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے لیے اللہ کی مدد اور ان تھوڑے سے مسلمانوں ہی کی رفاقت کافی ہے، تو تم کفار کی کثرت اور اپنے ساتھیوں کی قلت کی فکر نہ کرو۔ گویا وہی بات جو اوپر فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے، یہاں دوسرے اسلوب سے کہی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ 'وَمَنِ اتَّبَعَكَ' کا عطف 'اللہ' پر ماننے سے شرک کا پہلو پیدا ہوتا ہے لیکن یہ خیال کلام کے سیاق و سباق پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے جو تاویل کی ہے وہ بالکل واضح، قرآن کے نظائر کے مطابق اور شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔

مسلمانوں اور کافروں کی قوت کا تناسب

'يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ' یہ اسی اوپر والے مضمون کی وضاحت ہے کہ ہر چند تمھارے ساتھیوں کی تعداد باعتبار کمیت تھوڑی ہے لیکن باعتبار کیفیت بہت ہے۔ تمھارے بیس ثابت قدم مسلمان کفار کے دو سو آدمیوں پر اور تمھارے سو آدمی ان کے ہزار آدمیوں پر بھاری ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھارے ساتھیوں کو اللہ نے بصیرتِ ایمانی سے نوازا ہے اور تمھارے حریف اس بصیرت سے محروم ہیں۔

مسلمان کی اصل قوت

'لَا يَفْقَهُونَ' میں 'فقہ' سے مراد بصیرتِ ایمانی ہے۔ یہی بصیرت انسان کا اصل جوہر ہے۔ اس بصیرت کے ساتھ جب مومن میدانِ جنگ میں نکلتا ہے تو وہ اپنے تنہا وجود کے اندر ایک لشکر کی قوت محسوس کرتا ہے، اس کو اپنے دہنے بائیں خدا کی نصرت نظر آتی ہے، موت اس کو زندگی سے زیادہ عزیز و محبوب ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس کی بصیرت اس کے سامنے اس منزل کو روشن کر کے دکھا دیتی ہے جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہی بصیرت اس کے اندر وہ صبر و ثبات پیدا کرتی ہے جو اس

کو تنہا اس بصیرت سے محروم دس آدمیوں پر بھاری کر دیتی ہے۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۶۶)

مسلمانوں کی ذمہ داری میں تخفیف

'اَلْـٰٔنَ' کا لفظ یہاں اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ آیت اوپر کی آیات کے بہت بعد اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ چنانچہ دونوں میں تقابل کی نسبت بھی مختلف ہے۔ اوپر والی آیت میں بیس اور دو سو، سو اور ہزار کا تقابل ہے اور اس میں سو اور دو سو، ہزار اور دو ہزار کا تقابل ہے۔ یہ بھی قرینہ ہے کہ یہ مسلمانوں کی کثرت کے دور کی آیت ہے۔ اس کا تعلق چونکہ اسی مضمون سے تھا اس وجہ سے ترتیب میں اس کو یہیں جگہ ملی۔ قرآن میں نظم کے اعتبار کی ایک دلیل یہ بھی ہے۔

یہ بات کہ دس مسلمان سو پر بھاری رہیں گے وارد تو ہوئی ہے بشارت کے سیاق میں لیکن اس بشارت کے ساتھ اس نے مسلمانوں پر ایک بھاری ذمہ داری بھی ڈال دی تھی کہ بیس مسلمان دو سو کافروں کا اور سو مسلمان ہزار کافروں کا اپنے آپ کو مدمقابل سمجھیں اور اگر کہیں اسی نسبت کے ساتھ ان سے مقابلہ کی نوبت آن پڑے تو قلت تعداد کے عذر پر ان کو پیٹھ نہ دکھائیں۔ چونکہ پیٹھ دکھانے کا گناہ، جیسا کہ آیت ۱۶ میں بیان ہوا، بہت سخت ہے اس وجہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں نے اس ذمہ داری کو ایک بھاری ذمہ داری محسوس کیا ہوگا اور اسی احساس کے ساتھ اس کو ادا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ بعد میں جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو یہ بوجھ اللہ تعالیٰ نے ہلکا کر دیا اور سابق نسبت بدل کر سو اور دو سو، ہزار اور دو ہزار کی نسبت قائم کر دی گئی۔

تخفیف کے دو سبب

آیت کے الفاظ سے اس نسبت کی تبدیلی کی دو وجہیں سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو اس نے یہ پسند فرمایا کہ سابقون الاولون کے کندھوں پر جو زیادہ بوجھ ہے وہ ہلکا کر کے دوسرے بعد میں آنے والے مسلمانوں پر ڈال دیا جائے۔

دوسری یہ ہے کہ بعد میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ بصیرت و عزیمت کے اعتبار سے سابقون الاولون کے ہم پایہ نہیں تھے۔ بحیثیت مجموعی ان کا درجہ کم ہی تھا اس وجہ سے ان کی کمزوری کا لحاظ کر کے ان کی ذمہ داری بھی کم رکھی۔ اس کا اشارہ 'عَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًا' سے نکلتا ہے۔ 'ضعف' کا لفظ جسمانی اور مادی کمزوری کے لیے نہیں آتا بلکہ عزم و ارادہ اور معرفت و بصیرت کے ضعف کے لیے بھی آتا ہے۔

ان آیات پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو ایک تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی نصرت کا استحقاق اپنے اندر صفت صبر پیدا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ بغیر اس صفت کے پیدا کیے کسی گروہ کو اللہ کی

مدد حاصل نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ اسباب و وسائل جس رفتار سے بڑھتے جاتے ہیں خدا کی براہِ راست مدد اسی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے۔ تیسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ اصل قوت ایمان کی قوت ہے دوسری چیزیں سب اس کے توابع میں سے ہیں۔ چوتھی بات یہ نکلتی ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اصل اعتماد اللہ پر ہونا چاہیے نہ کہ اسباب پر۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۶۷-۷۱

آگے قریش کے اس پراپیگنڈے کا جواب دیا ہے جو انھوں نے بدر میں شکست کھانے کے بعد اسلام، مسلمانوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شروع کیا۔ جنگ بدر سے پہلے تک تو، جیسا کہ پیچھے تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے، وہ اسلام اور مسلمانوں کی کمزوری کو اسلام کے خلاف بطور ایک دلیل کے پیش کرتے تھے۔ کہتے کہ یہ دین اگر حق ہوتا تو کیا اس کو ایسے ہی کمزور و ناتوان حامل ملتے، اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے پیغمبر ہوتے تو کیا وہ ایسے ہی بے وسیلہ و ذریعہ اور بے حامی و مددگار ہوتے، اگر اسلام حق ہوتا تو کیا ہم پر کوئی عذاب نہ آ جاتا، مختصر یہ کہ وہ اپنے غلبہ اور اسلام کی مغلوبیت کو اسلام کے باطل ہونے اور اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہراتے۔ یہاں تک کہ غزوۂ بدر کو انھوں نے خود فیصلہ کی ایک کسوٹی کا درجہ دے دیا اور ان کے لیڈروں نے علانیہ یہ کہا کہ اس جنگ میں جو جیتے گا وہ حق پر سمجھا جائے گا، جو ہارے گا وہ باطل پر سمجھا جائے گا۔ بالآخر جب جنگ کا نتیجہ ان کے خلاف نکلا اور وہ خود اپنی ہی انتخاب کردہ کسوٹی پر کھوٹے ثابت ہو گئے تو انھیں اپنی قوم کو سنبھالنے اور بدر کی شکست کے اثرات سے اس کو بچانے کے لیے اپنے پروپیگنڈے کے رخ کو بدلنا پڑا۔ اب انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ کہیں کسی پیغمبر کے بھی یہ کام ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ہی قوم کو باہم لڑا دے، ملک میں خونریزی کرائے، اپنے ہی بھائی بندوں کو قیدی بنائے، ان سے فدیہ وصول کرے، ان کا مال لوٹے اور اس کو اپنے ساتھیوں کو بانٹے کر کھائے کھلائے؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ سارے کام تو اقتدار و سلطنت کے طالبوں اور دنیا داروں کے ہیں تو یہ پیغمبر کہاں سے ہوئے اور ان کو خدا سے کیا واسطہ؟

قریش نے اپنے پروپیگنڈے سے ایک طرف تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اپنی قوم کو بدر کی شکست کے اثرات سے بچانا چاہا کہ مبادا مسلمانوں کی اس فتح مبین سے وہ اسلام اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حقانیت کا کوئی تصور قبول کرے، دوسری طرف نہایت ہوشیاری سے مسلمانوں کے اس جوش جہاد پر ضرب لگانی چاہی جو بدر کے بعد قدرتی طور پر بہت نمایاں ہو گیا تھا اور جس پر، اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو ابھارا گیا ہے۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اس سلسلہ میں ان کے اس پروپیگنڈے کا جواب دے دیا جائے کہ کم از کم مسلمانوں پر اس کا کوئی برا اثر نہ پڑنے پائے۔ چنانچہ یہاں تمام متعلق گروہوں کو مخاطب

کر کے اس کا جواب دیا گیا۔

پہلے قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ جو کچھ پیش آیا اس کی ذمہ داری نبی پر نہیں بلکہ خود تم پر ہے۔ کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ وہ قیدی پکڑے، فدیہ وصول کرنے اور مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے زمین میں خونریزی تک نوبت پہنچا دے۔ ان چیزوں کے طالب تم ہو، خدا ان چیزوں کا طالب نہیں ہے۔ شکر کرو کہ ابھی بات یہیں تک رہ گئی۔ ورنہ تم نے جو شرارت کی تھی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم پر خدا کا کوئی سخت عذاب آ جاتا لیکن اللہ نے ہر چیز کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اس وجہ سے تمھیں کچھ مہلت دے دی گئی۔

اس کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ان شریر لوگوں کے پروپیگنڈے سے ذرا بھی متاثر نہ ہو۔ جو مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے وہ تمھارے لیے بالکل حلال طیب ہے۔

اسی سلسلہ میں جنگ بدر کے ان قیدیوں کو جنھیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا، یہ پیغام دلوایا کہ وہ یہ فدیہ لیے جانے سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ یہ ان کے اوپر ایک احسان کیا گیا ہے اور اگر انھوں نے اس احسان کی قدر کی تو بہت ممکن ہے کہ اللہ ان کو اپنے مزید احسان سے نوازے اور اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی بلکہ پھر اسلام کے مقابل میں جنگ کے لیے آئے تو یاد رکھیں کہ اس سے بھی سخت دن دیکھیں گے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۷-۷۱

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖؗ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۰﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ

۹ ع ۵ ۵

مِّنْهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾

ترجمۂ آیات ۶۷-۷۱

کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ اس کو قیدی ہاتھ آئیں یہاں تک کہ وہ اس کے لیے ملک میں خونریزی برپا کر دے۔ یہ تم ہو جو دنیا کے سروسامان کے طالب ہو، اللہ تو آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو روش تم نے اختیار کی اس کے باعث تم پر ایک عذاب عظیم آدھمکتا۔ ۶۷-۶۸

پس جو مال غنیمت تم نے حاصل کیا اس کو حلال و طیب سمجھ کر کھاؤ برتو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے (۶۹)

اے نبی تمہارے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تم کو وہ عطا فرمائے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اگر یہ تم سے بدعہدی کریں گے تو اس سے پہلے انھوں نے خدا سے بدعہدی کی تو خدا نے تم کو ان پر قابو دے دیا اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۷۰-۷۱

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۶۷-۶۸)

'ما کان' کا اسلوب بیان رفع الزام کے لیے

'مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ'، 'مَا كَانَ' کا اسلوب بیان الزام اور رفع الزام دونوں کے لیے آسکتا ہے اور قرآن میں دونوں ہی قسم کے مواقع میں یہ اسلوب استعمال

ہوا ہے۔ اس امر کا تعین کہ یہ الزام کے لیے ہے یا رفع الزام کے لیے موقع و محل، سیاق و سباق، قرینہ اور مخاطب کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی اسلوب بیان آلِ عمران ۱۶۱ میں ہے۔ 'وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ' (اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اپنی خیانت کے ساتھ حاضر ہوگا) ظاہر ہے کہ یہ آیت الزام کے لیے نہیں بلکہ رفع الزام اور نبی کی تنزیہ شان کے لیے ہے۔ اس آیت کے بارے میں تمام اہل تاویل کا اتفاق ہے کہ منافقین کو مخاطب کر کے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ تم نبی پر خیانت کی جو تہمت دھرتے ہو یہ سورج پر تھوکنے کی کوشش کے مترادف ہے، کوئی نبی بھی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ وہ خیانت اور بے ذمائی کا مرتکب ہو۔ ٹھیک اسی اسلوب پر آیت زیرِ بحث میں قریش کی تردید کی گئی ہے کہ تم نبی پر یہ الزام جو لگاتے ہو کہ یہ ہوسِ اقتدار میں مبتلا ہیں، اپنی قوم میں انھوں نے خونریزی کرائی، اپنے بھائیوں کو قید کیا، ان کا مال لوٹا، ان سے فدیہ وصول کیا، یہ ساری باتیں تمھاری اپنی کھسیاہٹ مٹانے کے لیے ہیں۔ کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ وہ قیدی پکڑتے، فدیہ وصول کرنے اور مالِ غنیمت لوٹنے کے شوق میں ملک میں خوں ریزی برپا کر دے۔ یہ باتیں تم اس لیے کہتے ہو کہ تم نبی کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہو۔ تمھاری چاہتیں چونکہ یہی کچھ ہیں، تم سمجھتے ہو کہ نبی بھی یہی کچھ چاہتا ہے۔

خطاب قریش سے

'تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ' یہ خطاب قریش سے ہے۔ قرآن میں خطاب کا انداز، جیسا کہ ہم بارہا واضح بھی کر چکے ہیں، بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے جو ایک اعلیٰ خطیب تقریر میں اختیار کرتا ہے۔ جتنی پارٹیاں سامنے ہوتی ہیں، بیک وقت، سب کی طرف رخ بدل بدل کر ان کے ذہن کے لحاظ سے بات کہتا چلا جاتا ہے۔ خود بات ہی واضح کر دیتی ہے کہ مخاطب کون ہے اور اس کے کس شبہ یا اعتراض کا کیا جواب دیا گیا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ اس آیت کا مخاطب مسلمانوں کو اور وہ بھی سید عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صدیق اکبرؓ کو ماننے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے اور بالفرض اس آیت کا مخاطب دل پر جبر کر کے نبیؐ اور صدیقؓ کو تھوڑی دیر کے لیے کوئی مان بھی لے تو اس کے بعد جو آیت آرہی ہے اس کا مخاطب نبیؐ اور صدیقؓ کو ماننے کے لیے کوئی دل و جگر کہاں سے لائے۔

اسلوب بیان کی بلاغت

بہرحال ہمارے نزدیک یہ خطاب قریش سے ہے اور یہ ان کے اس پروپیگنڈے کا جواب دیا جا رہا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ فرمایا کہ اس قسم کی دنیا طلبی تمھارا ہی شیوہ ہے۔ اللہ تو آخرت کو چاہتا ہے۔ یہاں اسلوبِ بیان کی یہ بلاغت ملحوظ رہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ نبی اور اہل ایمان آخرت کے طلب گار ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ نبی اور اہل ایمان کے ہاتھوں جو کچھ یہ ہو رہا ہے یہ ان کی اپنی مرضی سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ اللہ کی مرضی اور اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے، نبی اور اہل ایمان کی حیثیت اس سارے کام میں محض آلہ اور واسطہ کی ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں

یہی عین اللہ کا ارادہ اور اسی کی مرضی ہے۔ اللہ کی مرضی اپنے بندوں کے لیے یہ ہے کہ وہ ہر کام آخرت کو اپنا نصب العین بنا کر کریں تو نبی اور اس کے ساتھیوں کا کوئی اقدام اللہ کی مرضی کے خلاف کس طرح ہو سکتا ہے۔ گویا بدر اور اس سلسلہ کے تمام اقدامات کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لے لی۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ عزیز و حکیم ہے۔ وہ جو ارادہ فرماتا ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور اس کا ہر ارادہ عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اب تم جو ژاژ خائی کرنا چاہتے ہو کرتے رہو۔

آگے کے لیے ایک تنبیہ

'لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ' یعنی تم نے اتنے ہی پر یہ واویلا برپا کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ تو صرف ایک چرکا ہے جو تمھیں لگا ہے۔ تم نے جو شرارت اس موقع پر کی تھی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس پر تمھیں ایک عذاب عظیم آپکڑتا لیکن اللہ نے چونکہ ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، جس سے پہلے کسی قوم کا فیصلہ نہیں ہوتا اس وجہ سے اس نے تمھیں مہلت دے دی۔ مطلب یہ ہے کہ اس شور و غوغا کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤ اور اس فیصلہ کن گھڑی کے آنے سے پہلے پہلے اپنی روش کی اصلاح کر لو۔

'فِيْمَآ اَخَذْتُمْ' میں 'مَا' کے ابہام کی یہاں کوئی وضاحت موجود نہیں ہے اور 'اَخَذَ' کا لفظ لینے، پکڑنے، اختیار کرنے، کسی ڈھب کو اپنانے، کسی کام کو شروع کرنے سب کے لیے آتا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ ۵۰ (اور اگر تمھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ منافق کہتے ہیں خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا تھا) یہاں یہ مطلب ہو گا کہ جو طریقہ تم نے اختیار کیا اس کی بنا پر تم سزاوار تو تھے ایک عذاب عظیم کے لیکن اللہ کے قانون کے تحت تمھیں کچھ مہلت مل گئی۔

مفسرین کی ایک الجھن کا ازالہ

ہمارے مفسرین کو ان آیات کی تاویل میں بڑی الجھن پیش آئی ہے۔ ان کے نزدیک یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین پر عتاب ہے کہ وہ زمین میں خوں ریزی کیے بغیر بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے پر کیوں راضی ہو گئے۔ صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اب اس بات کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی تاہم چند باتیں ذہن میں رکھیے۔

ایک یہ کہ فدیہ قبول کرنے کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے بالفرض غلطی ہوئی بھی تو یہ کسی سابق ممانعت کی خلاف ورزی کی نوعیت کی غلطی نہیں تھی بلکہ صرف اجتہاد کی غلطی تھی۔ اجتہاد کی غلطی ایسی چیز نہیں ہے جس پر ایسی سخت وعید وارد ہو۔ بالخصوص ایک ایسا اجتہاد جس کی تصدیق فوراً ہی خود اللہ تعالیٰ نے کر دی ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہ اجتہاد کی غلطی بھی نہیں تھی۔ جنگ کے قیدیوں سے متعلق یہ قانون سورۂ محمد میں پہلے بیان ہو چکا تھا کہ وہ قتل بھی کیے جا سکتے ہیں، فدیہ لے کر بھی چھوڑے جا سکتے ہیں اور بغیر فدیہ لیے

محض جانا بھی چھوڑے جا سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ جہاں تک خوں ریزی کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے بھی بدر میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ قریش کے ستر آدمی، جن میں بڑے بڑے سردار بھی تھے، مارے گئے، کم و بیش اتنے ہی آدمی قید ہوئے۔ باقی فوج بھاگ، کمر ٹوٹی ہوئی تو آخر لڑائی کس سے جاری رکھی جاتی؟

چوتھی یہ کہ یہاں عتاب کے جو الفاظ ہیں وہ قرآن کے مخصوص الفاظ ہیں۔ جو شخص قرآن کے انداز بیان سے آشنا ہے وہ جانتا ہے کہ ان لفظوں میں قرآن نے کفار و منافقین کے سوا اور کسی پر عتاب نہیں کیا ہے۔ نقل کرنے میں طوالت ہوگی، جس کو تردد ہو وہ قرآن میں ان تمام مواقع پر ایک نظر ڈال لے جہاں 'لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ الایۃ' کے الفاظ سے کسی پر عتاب ہوا ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶۹)

مال غنیمت کے حلال ہونے کی یقین دہانی

اب یہ مسلمانوں کی طرف رخ کر کے انھیں اطمینان دلایا کہ تم ان لوگوں کی ان ہفوات کی مطلق پروا نہ کرو، جو مال غنیمت یا فدیہ تمھیں حاصل ہوا ہے اسے کھاؤ برتو، یہ تمھارے لیے حلال و طیب ہے۔ چونکہ یہ بات بعینہ اسی بات کا ایک حصہ ہے جو اوپر والی آیات میں مسلمانوں کے دفاع میں کہی گئی ہے اس وجہ سے 'ف' کے واسطہ سے اسی پر عطف کر دی گئی ہے۔ بس اتنا فرق ہوا ہے کہ اوپر کی بات قریش کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے اس لیے کہ وہ انہی سے کہنے کی تھی اور اس دوسری بات کا رخ مسلمانوں کی طرف ہو گیا ہے اس لیے کہ یہ انہی کو جتانے کی تھی۔ خطاب میں اس طرح کی جو لطیف تبدیلیاں ہوتی ہیں اس کی متعدد مثالیں خود اس سورہ میں بھی گزر چکی ہیں۔ ایک نہایت عمدہ مثال سورۂ یوسف میں موجود ہے۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ (۲۹ - یوسف)

یوسف، تم اس سے اعراض کرو، اور تم اپنے گناہ کی معذرت چاہ بے شک تو ہی خطا کاروں میں سے ہے۔

دیکھیے، ایک ہی سانس میں عزیز مصر نے حضرت یوسفؑ کو بھی خطاب کیا ہے اور اپنی بیوی کو بھی اور رخ کی تبدیلی اور بات کی نوعیت سے خطاب کا فرق بغیر کسی التباس کے نمایاں ہو گیا۔

یہاں مسلمانوں کو مال غنیمت کے حلال و طیب ہونے سے متعلق جو اطمینان دلایا گیا وہ درحقیقت قریش کے جواب میں ہے۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ واقعۂ بدر کے بعد قریش نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ مسلمان مدعی بن کر تو اٹھے ہیں دینداری کے لیکن ان کے کام بالکل دنیا داروں کے ہیں۔ بھلا دین داروں کے بھی کام ہوتے ہیں کہ ملک میں خونریزی کریں، مال غنیمت لوٹیں، فدیہ وصول کریں اور اس کو مزے سے کھائیں؟ یہ لوٹ پاٹ شیوہ ہے جو ہمیشہ سے دنیا داروں کا شیوہ ہے۔ قرآن نے یہ بتایا کہ تم ان مفتیوں کے فتوے کی ذرا پروا نہ کرو۔ ان کے نزدیک تو تم ہر شکل گنہگار ہو۔ اگر تم اس جنگ میں ہار جاتے تو تمھارا ہار جانا ان کے نزدیک تمھارے باطل ہونے کی دلیل تھا اب جب کہ جیت گئے ہو تو تمھارا قیدی پکڑنا، مال غنیمت پانا

اور فدیہ وصول کرنا اور اس کو کھانا ان کے نزدیک تمہارے باطل پر ہونے کی دلیل ہے۔ ان لوگوں سے عہدہ برآ ہونے کی شکل بس یہ ہے کہ ان کی پروا نہ کرو اور اللہ نے جو فتوح تمہیں بخشی ہیں ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہ تمہارے لیے حلال طیب ہیں۔

یہ امر یہاں ذہن میں رکھیے کہ اس زمانے میں عام طور پر مذہب کے رہبانی تصور کا غلبہ تھا اس وجہ سے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے نیک دل لوگ قریش کے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو جائیں جس کا اثر مسلمانوں کے اس ولولۂ جہاد پر پڑے جس کی اس سورہ میں دعوت دی جا رہی ہے۔ قرآن نے ان کی تردید کر کے اس امکان کا سدباب کر دیا۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ' مطلب یہ ہے کہ جو چیز جائز اور طیب ہے اس کو تو کھاؤ برتو البتہ اللہ سے ڈرتے رہو کہ کسی ایسی چیز میں آلودہ نہ ہو جاؤ جس سے خدا نے منع فرمایا ہے۔ اگر تم حدودِ الٰہی کے تجاوز سے بچتے رہے تو وہ تمہاری چھوٹی موٹی غلطیوں اور کوتاہیوں پر گرفت نہیں فرمائے گا، وہ غفور رحیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۷۰-۷۱)

جنگِ بدر کے قیدیوں سے خطاب

اب یہ بدر کے قیدیوں کے لیے ایک پیغام بھی ہے اور ساتھ ہی ایک دھمکی بھی۔ پیغام تو یہ ہے کہ تم سے جو فدیہ لیا گیا ہے اس سے دل گرفتہ ہونے کے بجائے تمہیں اللہ اور رسول کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ قتل کرنے کے بجائے تمہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ یہ تمہارے اوپر اللہ اور رسول کا بہت بڑا احسان ہے اور اس احسان کا حق یہ ہے کہ تم ٹھنڈے دل سے اپنے رویہ کا از سر نو جائزہ لو اور سارے معاملہ پر جذبات کے بجائے عقل و انصاف کی روشنی میں غور کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم احسان کی قدر کرنے والے ہو گے اور تمہاری یہ سعادت اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی توفیق کو تمہاری طرف متوجہ کرے گی اور اس فدیہ سے جو تم سے لیا گیا ہے، کہیں بڑھ کر وہ تمہیں اسلام کی نعمت سے بخش دے گا اور تمہاری مغفرت فرمائے گا۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ الایۃ۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور بدر کے قیدیوں کو دھمکی ہے۔ پیغمبر کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر انھوں نے بے وفائی کی اور تم نے ان پر جو احسان کیا ہے اس کی قدر نہ پہچانی، پھر لڑنے کے لیے آئے تو یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے، اپنی ہی شامت بلائیں گے اس سے پہلے انھوں نے خدا سے بے وفائی و بدعہدی کی تو اس کا مزا انھوں نے چکھا کہ خدا نے ان کو تمہارے ہاتھ میں دے دیا۔ اگر یہی حرکت انھوں نے پھر کی تو خدا پھر انھیں قابو میں دے دے گا اور یہ اپنی اس بدعہدی کی سزا بھگتیں گے۔ یہاں جس بدعہدی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے

کہ اللہ نے ان کو اپنے حرم کا پاسبان بنایا اور ان کو ملت ابراہیم کی وراثت سپرد کی تو انھوں نے حرم کی حرمت برباد کی اور ملت ابراہیم کو مسخ کیا جس کے نتائج ان کے آگے آ رہے ہیں۔ اگر اپنے اس جرم پر یہ کچھ اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ شوق بھی کر لیں، اس کے پھل بھی یہ چکھیں گے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کیجیے تو یہ بات واضح ہو گی کہ آنحضرتؐ نے بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر جو چھوڑ دیا تو نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ اس نے اس کو پسند فرمایا اور ان قیدیوں کو یہ پیغام بھجوایا کہ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اگر انھوں نے اس احسان کی قدر کی تو اس سے ان کے لیے قبول اسلام اور مغفرت کی راہیں کھلیں گی۔ غور کیجیے کہ کہاں یہ بات اور کہاں وہ جو محض بعض تفسیری روایات کی بنا پر مفسرین نے اختیار فرمائی کہ آنحضرتؐ پر اس بات کے لیے عتاب ہوا کہ اچھی طرح خون بہائے بغیر تم نے قیدی کیوں پکڑے اور فدیہ کیوں قبول کیا۔

۱۶۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۷۲-۷۵

اب آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ مسلمانوں کو ایمان و ہجرت کی اساس پر منظم ہو جانے اور ایمان و ہجرت ہی کو باہمی تعاضد و تناصر کی بنیاد قرار دینے کا حکم ہوا۔ جاہلیت کے خاندانی تعلقات اور ان کی ذمہ داریاں یک قلم ختم کر دی گئیں۔ حکم ہوا کہ جو لوگ ایمان لائیں، ہجرت کر کے مدینہ میں آ بسیں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر اہل کفر سے جہاد کریں وہ ایک ملت اور باہم دگر ایک دوسرے کے بھائی اور اولیاء ہیں۔ گویا اسلامی معاشرہ کو اس کی مخصوص اساسات پر منظم اور مستحکم کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ ملت کفر کے مقابلہ کے لیے انصار و مہاجرین ایک بنیان مرصوص کی طرح کھڑے ہو سکیں۔ اور مسلمانوں کو جہاد پر جو ابھارا گیا ہے یہ اس جہاد کی تیاری بھی ہے اور آگے والی سورہ میں کفار سے جو اعلان براءت ہونے والا ہے اس کی تمہید بھی۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۲-۷۵

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم

مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ؕ ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾ ع

ترجمۂ آیات ۷۲-۷۵

وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ باہم دگر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی تمھارا ان سے کوئی رشتۂ ولایت نہیں تا آنکہ وہ ہجرت کریں۔ اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے طالب مدد ہوں تو تم پر مدد واجب ہے الا آنکہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابلے میں ہو جن کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہو۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہے اور جنھوں نے کفر کیا وہ آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہیں تو اگر تم یہ نہ کرو گے تو ملک میں ظلم اور بڑا فساد ہوگا۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہی لوگ پکے مومن ہیں۔ ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ اور جو ایمان لائے اس

کے بعد ایمان لائیں اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ جہاد میں شریک ہوں، یہ بھی تمہی میں سے ہیں اور رحمی رشتے والے اللہ کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۷۲-۷۵

۷۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۷۲)

اسلام میں حمایت و نصرت کی بنیاد ایمان پر ہے

اسلام سے پہلے باہمی حمایت و نصرت کی بنیاد خاندانی و قبائلی عصبیت پر تھی۔ کوئی شخص یا خاندان کسی خطرے یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا تو اس کا خاندان یا قبیلہ اس کی حمایت و مدافعت میں سربکف ہوتا۔ اسلام نے مدینہ میں جو نیا معاشرہ قائم کیا اس میں حمایت و نصرت کی بنیاد ایمان اور ہجرت پر رکھی۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے مال و جان سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ باہم دگر ایک دوسرے کے یاور، ناصر اور حامی و مددگار ہیں۔ 'آمَنُوا وَهَاجَرُوا' سے ظاہر ہے کہ مہاجرین مراد ہیں اور 'آوَوا وَّنَصَرُوا' سے انصار۔ ان دونوں گروہوں کا ذکر ان کے اسماء و اعلام کے بجائے ان کی صفات اور ان کی دینی خدمات سے کیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس نئی سوسائٹی میں خاندان و نسب کی عصبیت کے بجائے اعتبار صرف ایمان و اسلام اور ہجرت و جہاد کا ہوگا۔ یہ ایک دوسرے کے ولی یعنی حامی و ناصر ہیں۔ ظاہر ہے کہ حمایت و نصرت اہل کفر کے مقابل میں ہے۔ یہ بات اگرچہ بیان واقعہ کے اسلوب میں ہوئی ہے لیکن اس کے اندر امر کا مضمون بھی مضمر ہے یعنی یہ حکم ہے کہ اہل کفر کے مقابل میں اہل ایمان ایک دوسرے کے حامی و مددگار بن کر کھڑے ہوں اور جب ضرورت پیش آئے ایک دوسرے کی حمایت و مدافعت کریں۔

ہجرت کے بعض وقتی مصالح

'وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا' ان لوگوں کو جو اسلام تو لا چکے تھے لیکن ابھی انھوں نے دارالکفر سے دارالاسلام مدینہ کو ہجرت نہیں کی تھی اس رشتۂ ولایت سے الگ رکھا یعنی دارالاسلام والوں پر ان کی حمایت و نصرت اور حفاظت و مدافعت

کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس ذمہ داری کے نہ اٹھانے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ عملاً یہ ناممکن بھی تھی اور اس سے بہت سی بین الاقوامی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس وقت مصلحت بھی تھی اور حکم بھی یہی تھا کہ تمام وہ لوگ جو اسلام لا چکے ہیں دارالکفر کے علاقوں سے نکل کر مدینہ میں مجتمع ہوں تاکہ اہل کفر سے نمٹنے اور بیت اللہ کی آزادی کے لیے منظم جدوجہد عمل میں آسکے۔

معاہدہ کا احترام

وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ۔ یعنی ہرچند دارالاسلام والوں پر ان مسلمانوں کی حمایت و مدافعت کی ذمہ داری نہیں ہے جنھوں نے دارالکفر سے ہجرت نہیں کی ہے تاہم اگر وہ دین کے معاملے میں طالب مدد ہوں تو ان کو ممکن مدد بہم پہنچائی جائے بشرطیکہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابل میں نہ ہو جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو۔ معاہدہ کا احترام مقدم ہے۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ یہ معاہدہ کے احترام کو مؤکد کرنے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معاہدہ کے احترام کے منافی خفیہ یا علانیہ جو قدم بھی تم اٹھاؤ گے خدا اس سے بے خبر نہیں رہے گا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (۷۳)

دین میں دارالکفر کے مسلمانوں کی امداد کی وجہ

یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ خاص دین کے باب میں دارالکفر کے مسلمانوں کی مدد کرنا کیوں ضروری ہے۔ فرمایا کہ جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کی عداوت کا تعلق ہے اس معاملے میں تمام کفار ایک دوسرے کے دست و بازو بن گئے ہیں۔ جو اللہ کا بندہ اسلام قبول کر لیتا ہے اس کی تعذیب و ایذا رسانی سب کے نزدیک کار ثواب ہے۔ یہاں تک کہ ظالموں کے ظلم سے اس کو بچانے کے لیے اس کے اپنے بھائی بندوں کی حمیت بھی مردہ ہو چکی ہے۔ اس کا مال اور اس کی جان سب مباح ہیں۔ ایسی حالت میں اگر تم بھی ان مظلوموں کی مدد نہ کرو گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دین سے پھرنے کے لیے سارے ملک میں ظلم و فساد عام ہو جائے گا۔ فتنہ کا لفظ یہاں (PERSECUTION) کے مفہوم میں ہے اور إِلَّا تَفْعَلُوهُ میں ضمیر مفعول کا مرجع وہی نصرت ہے جس کا ذکر فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ میں آیا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۷۴)

دارالکفر کے مسلمانوں کے لیے ہجرت صداقت کی کسوٹی ہے

اس آیت میں ہجرت کو دارالکفر کے مسلمانوں کے لیے صداقت کی کسوٹی قرار دیا ہے۔ جب یہ فرمایا کہ سچے اور پکے مسلمان وہی ہیں جنھوں نے ہجرت اور جہاد کیا اور جنھوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ اسلام کی اصل دولت مہاجرین و انصار ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لا چکے ہیں لیکن ابھی انھوں نے دارالکفر سے ہجرت نہیں کی ہے، انھیں اپنے ایمان کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دارالکفر سے نکل کر دارالاسلام میں آئیں اور مہاجرین و انصار کے دوش بدوش جہاد میں شریک ہوں۔ اس سے ہجرت کی وہ غایت بھی واضح ہوئی جس

کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ اس کا اہم مقصد مسلمانوں کو جہاد کے لیے منظم کرنا تھا، دوسرے یہ اشارہ بھی نکلا کہ یہ ایمان و نفاق کے جانچنے کی کسوٹی بھی ہے۔ چنانچہ بعد والی سورہ ۔ سورہ توبہ ۔ میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جن لوگوں نے ایمان کے دعوے کے باوجود، آخر تک بلا کسی عذر معقول کے ہجرت سے گریز اختیار کیا، ان کا شمار منافقین کے زمرے میں ہوا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۷۵)

دارالکفر کے مسلمانوں کو ترغیب، دارالاسلام کے مسلمانوں کو تنبیہ

یہ دارالکفر کے مسلمانوں کو ہجرت کی ترغیب و تشویق بھی ہے کہ تمہارے لیے بھی اسلامی معاشرہ کا یہ دروازہ کھلا ہوا ہے اس کی طرف سبقت کرو اور اس میں اپنا مقام حاصل کرو اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو تاکید بھی کہ بعد میں ایمان لانے والوں اور ہجرت کرنے والوں کے لیے بھی اپنے دلوں کے دروازے کھلے رکھو وہ بھی تمہارے ہی بھائی بند اور تمہارے ہی وجود ملی کے اجزا ہیں۔ نہ ان کے مقابل میں تمہارے اندر کوئی احساس برتری پیدا ہو، نہ دلوں میں کوئی تنگی۔

اولوالارحام کے شرعی حقوق مقدم ہیں

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ' یہ اخوت و نصرت کے اس عام ضابطہ کے ساتھ جو اوپر مذکور ہوا، حقوق اور وراثت کے اس خاص قانون کی یاددہانی کر دی گئی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رحمی رشتوں کی بنا پر جو حقوق اللہ تعالیٰ نے قائم فرمائے ہیں وہ بدستور قائم رہیں گے۔ یہ اخوت اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی۔ رحمی رشتوں کے حقوق کے ساتھ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ کی قید یہ بات واضح کرتی ہے کہ یہاں حقوق سے مراد رحم اور قرابت کے وہ حقوق ہیں جو اللہ کے قانون میں بیان ہوئے ہیں، وہ رسوم اس سے خارج ہیں جو جاہلیت میں رائج رہے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی جہاں مسلمانوں کو اپنے دینی و اسلامی بھائیوں اور اولیاء کے ساتھ حسن سلوک اور نصرت و اعانت کی تاکید کی گئی ہے وہاں یہ تنبیہ کر دی گئی ہے کہ اولوالارحام کے شرعی حقوق مقدم رہیں گے۔ سورۂ احزاب میں ہے وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۶ - احزاب (اور مومنین و مہاجرین میں رحمی رشتے والے ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں اللہ کے قانون میں، مگر یہ کہ تم اپنے اولیاء کے ساتھ کوئی حسن سلوک کرو، یہ چیز کتاب میں لکھی ہوئی ہے)۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ' مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر بات اس کے بے خطا علم پر مبنی ہے اور ہر چیز کا اس نے ایک محل و مقام مخصوص کیا ہے۔ دینی اخوت و ولایت کا اپنا دائرہ ہے اور رحمی قربت و قرابت کا اپنا مقام ہے۔ اپنے اپنے محل میں دونوں کا احترام کرو اور خدا نے ان کے جو حقوق ٹھہرائے ہیں ان کو ادا کرو۔

اسلامی سیاست کے چند اصول

اس مجموعۂ آیات پر تدبر کی نظر ڈالیے تو ان سے اسلامی سیاست کے چند اصول سامنے آئیں گے جو بین الملی بھی ہیں اور بین الاقوامی بھی۔ ہم اختصار کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کریں گے۔

۱۔ ایک یہ کہ انصار و مہاجرین ایک دوسرے کے اولیاء ہیں ان کے درمیان ایمان اور ہجرت کا رابطہ اور اسی کی اساس پر اخوت اور حمایت و نصرت کے حقوق و فرائض ہیں۔ پچھلی خاندانی و قبائلی عصبیتیں ختم ہوئیں اور باہمی تعاضد و تناصر اور حمیت و حمایت کی اساس اسلامی اخوت پر استوار ہوئی۔

۲۔ جو لوگ ایمان لائے لیکن انھوں نے دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی وہ اس نئے اسلامی معاشرہ کے حقوق حمایت و نصرت میں شریک نہیں ہیں تا آنکہ وہ ہجرت کریں۔

۳۔ یہ دارالکفر میں پڑے ہوئے مسلمان اگر اسلام لانے کے جرم میں کہیں ستائے جا رہے ہوں تو ان کو ظلم سے بچانے کے لیے ان کی مدد کی جائے بشرطیکہ اس کے لیے کسی معاہد قوم سے جنگ نہ کرنی پڑے۔

۴۔ ہجرت ہر مسلمان پر واجب قرار دی گئی تاکہ مسلمان کفر کی طاقتوں سے مقابلہ کے لیے ایک مرکز میں مجتمع اور منظم ہو سکیں۔

۵۔ رحمی رشتوں کی بنا پر قرآن نے جو حقوق قائم کیے ہیں اسلامی اخوت کے حقوق ان پر اثر انداز نہ ہوں گے۔ وہ بہرحال مقدم رہیں گے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوتی ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

لاہور

۱۹ر فروری ۱۹۶۹ء

تدبّرِ قرآن

٩

التوبة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور اس پر بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ

یہ سورہ، جیسا کہ گروپ کی تمہید میں ہم عرض کر چکے ہیں، سورتوں کے دوسرے گروپ کی آخری سورہ ہے۔ اس میں اور انفال میں بالکل اسی نوع کا تعلق ہے جس نوع کا تعلق متن اور شرح یا تمہید اور اصل مقصد میں ہوتا ہے۔ سورہ انفال میں مسلمانوں کو جس جہاد کے لیے ظاہراً و باطناً منظم کیا گیا ہے اس سورہ میں اس کا اعلان فرما دیا۔ مصحف کی ترتیب میں اس سورہ پر بسم اللہ نہیں لکھی ہوئی ہے اور روایات سے ثابت ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی سے چلی آ رہی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس پر بسم اللہ کا نہ لکھا جانا ایمائے الٰہی سے ہوا ہے۔ علمائے تفسیر نے اس کی مختلف توجیہیں کی ہیں۔ سب سے زیادہ قابلِ قبول توجیہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں میں عمود و مضمون کے لحاظ سے نہایت گہرا اتصال بھی ہے اور مقصد و غایت کے اعتبار سے فی الجملہ انفصال بھی۔ ایک کا رخ بالکلیہ مسلمانوں کی طرف ہے اور دوسری کا رخ اصلاً مشرکین، اہل کتاب اور منافقین کی طرف۔ ایک کی نوعیت تیاری کی ہے اور دوسری کی، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، الٹی میٹم اور اعلانِ جنگ کی۔ اشتراک و انفصال کے ان دونوں پہلوؤں کو ممیز کرنے کے لیے حکمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ یہ سورہ سابق سورہ سے بالکل الگ بھی نہ ہو لیکن فی الجملہ نمایاں اور ممتاز بھی رہے۔ بسم اللہ نہ لکھے جانے سے یہ دونوں پہلو بیک وقت نمایاں ہو گئے۔ بسم اللہ، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، دو سورتوں کے درمیان علامت فصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس علامتِ فصل کے نہ ہونے سے دونوں کا معنوی اتصال نمایاں ہو گیا اور ساتھ ہی اس کے علیحدہ وجود نے اس کو علیحدہ نام دے دیا جس سے اس کی امتیازی خصوصیت بھی سامنے آ گئی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے ان تمام مشرکین سے اعلان براءت کیا ہے

جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امن و صلح کے معاہدے کیے لیکن ان کی خلاف ورزیاں کر کے وہ ان کو کالعدم کر چکے تھے۔ جنھوں نے اپنے معاہدے قائم رکھے تھے ان کے متعلق یہ اعلان فرمایا کہ مدت پوری ہو جانے کے بعد یہ معاہدے بھی ختم کر دیے جائیں اور ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک یہ اسلام نہ قبول کریں۔

اس کے بعد اہل کتاب کے متعلق یہ اعلان فرمایا کہ ان سے بھی جنگ کرو تا آنکہ یہ تمہاری ماتحتی قبول کرنے اور تمھیں جزیہ ادا کرنے پر مجبور ہوں۔

اس کے بعد آخر سورۃ تک بڑی تفصیل کے ساتھ منافقین کا تعاقب کیا ہے اور ان کے باب میں بھی یہ ہدایت دی ہے کہ اب ان کا سختی سے محاسبہ کیا جائے، ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتی جائے تا آنکہ یہ یا تو سچے اور اچھے مسلمان بن جائیں یا پھر مشرکین اور اہل کتاب میں سے، جن کے ساتھ بھی ان کی وابستگی ہے، ان کے انجام میں یہ بھی شریک ہو جائیں۔

یہی تین گروہ اس وقت مسلمانوں کے کھلے یا چھپے دشمن تھے۔ ان تینوں کا ذکر پچھلی سورہ میں بھی آیا تھا لیکن ان کے باب میں قطعی پالیسی واضح نہیں ہوئی تھی۔ اس سورہ میں بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی۔

اگرچہ سورہ کے نظام کو سمجھنے کے لیے یہ اجمالی نظر بھی کافی ہے تاہم سورہ کے مطالب کا تفصیلی تجزیہ بھی ہم لیے دیتے ہیں۔

(۱-۴) جن مشرکین نے معاہدہ کر کے در پردہ یا علانیہ اپنے معاہدے توڑ دیے تھے ان سے برأت ذمہ کا اعلان۔ ان کو چار مہینے کی مہلت اور مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ حج کے موقع پر یہ منادی کر دی جائے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اب ان کے معاہدوں کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ اگر انھوں نے توبہ نہ کی تو یاد رکھیں کہ وہ خدا کے قابو سے باہر نہیں جا سکتے۔ صرف وہ مشرکین اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جنھوں نے نہ تو اپنے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی کی ہے نہ مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمنوں کی کوئی مدد کی ہے۔ یہ معاہدے قرارداد مدت تک باقی رکھے جائیں۔

(۵-۶) مسلمانوں کو یہ حکم کہ محترم مہینوں کے گزرنے کے بعد ان کے خلاف جنگی کارروائی کرو، ان کو پکڑو، گھیرو اور مارو اور اس وقت تک ان کا پیچھا نہ چھوڑو جب تک یہ توبہ کر کے نماز نہ قائم کریں اور زکوٰۃ نہ ادا کریں۔ البتہ ان میں اگر کوئی شخص پناہ کا طالب ہو تو اس کو اتنی مہلت دو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سن لے اور پھر اس کو اس کے مامن میں پہنچا دو۔ یہ رعایت ان کو اس لیے دی جائے کہ یہ امی لوگ رہے ہیں، ممکن ہے ان کو خدا کا کلام نہ پہنچا ہو۔

(۷-۱۶) مشرکین کے ساتھ آیندہ کوئی معاہدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے وجوہ کی تفصیل۔ مسجد حرام

کے پاس قریش سے جو معاہدہ ہوا ہے وہ بھی اسی وقت تک باقی رکھا جائے جب تک وہ اس کو نباہتے ہیں۔ اگر وہ اس کو توڑ دیتے ہیں تو تم ان ائمہ کفر سے بھی جنگ کرو۔ قریش کے بعض سنگین جرائم کی طرف اشارہ۔ مسلمانوں کو بشارت کہ تم ان سے ڈرو نہیں، لڑو، تمہارے ہاتھوں اللہ ان مظلوم مسلمانوں کے کلیجے ٹھنڈے کرے گا جو ان ظالموں کی قساوت کا ہدف بنے۔

(۱۷-۲۲) مشرکین قریش کو بیت اللہ اور مساجد الٰہی پر قابض رہنے کا کوئی حق نہیں۔ مساجد الٰہی کے متولی اور منتظم وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے، نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ حاجیوں کو پانی پلا دینا اور حرم کی کچھ دیکھ بھال کر دینا نیکی کے کام سہی لیکن یہ نیکیاں اللہ اور آخرت پر ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کا بدل نہیں ہو سکتیں۔

(۲۳-۲۸) مسلمانوں کو تنبیہ کہ ان لوگوں سے جنگ کرنے میں رشتہ و قرابت کا پاس و لحاظ مانع نہ ہو جو لوگ ایمان کے تقاضوں پر ان چیزوں کو ترجیح دیں گے ان کا شمار انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ اللہ اور رسولؐ کی محبت ہر چیز پر مقدم ہے۔ جنگ حنین اور پچھلے غزوات سے مسلمانوں کو سبق کہ اصل شے خدا کی مدد و نصرت ہے، پس اصلی بھروسہ خدا ہی پر ہونا چاہیے۔ یہ اعلان کہ مشرکین نجس ہیں۔ اس وجہ سے ان کو اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس پھٹکنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مسلمانوں کو یہ اطمینان دہانی کہ اس کا جو اثر تجارت اور معاشی حالات پر پڑے گا اللہ اپنے خزانۂ جود سے اس کی تلافی فرمائے گا۔

(۲۹-۳۵) اہل کتاب سے جہاد اور ان کو ذمی بنا کر جزیہ وصول کرنے کا حکم۔ ان کے فساد عقائد اور فساد اخلاق کی طرف بعض اشارات۔ ان کے علماء اور صوفیا کے فاسد کردار اور ان کی اسلام دشمنی کا حوالہ۔

(۳۶-۳۷) مسلمانوں کو یہ تاکید کہ یہ جنگ و جہاد اگرچہ تمام مشرکین سے من حیث القوم ہو، کسی گروہ کے ساتھ رعایت نہ کی جائے، تاہم محترم مہینوں کا احترام ہر حال میں ملحوظ رہے۔ یہ محترم مہینے بحساب سال قمری ملت ابراہیمؑ کی یادگار ہیں۔ اگر تم نے ان کی حرمت کو بٹہ لگایا تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنو گے۔ نسیٔ کی بدعت کی طرف اشارہ کہ اس بدعت نے ان مہینوں کو ان کے اصل مقام سے ہٹا کر موسموں کے ساتھ باندھ دیا اور یہ کفر میں ایک اضافہ ہے۔ تمہیں قمری مہینوں کے حساب پر، جو روز اول سے خدا کے مقرر کیے ہوئے مہینے ہیں، ان چار محترم مہینوں کی حرمت کو برقرار رکھنا ہے۔

(۳۸-۴۲) منافقین کو تنبیہ کہ تم جہاد سے جی چراتے ہو، یاد رکھو کہ اگر تم اسی طرح جی چراتے رہے تو تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے، اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنو گے۔ خدا تمہاری جگہ اپنے دین کی نصرت کے لیے دوسروں کو اٹھا کھڑا کرے گا۔ یاد کرو کہ ایک دن وہ بھی گزرا ہے جب ہمارا رسول

ایک غار میں پناہ گیر تھا اور اس کے ایک ساتھی کے سوا اور کوئی بھی اس کے ساتھ نہ تھا لیکن پھر وہ دن بھی آیا کہ خدا نے اپنی طرف سے اس پر سکینت نازل فرمائی۔ غیبی فوجوں سے اس کی مدد فرمائی، کفر کا سر نیچا اور اللہ کا کلمہ بلند ہوا۔ پس یہ خدا کی ضرورت نہیں بلکہ تمہاری اپنی سعادت ہے کہ جو سروسامان بھی میسر ہو اس کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھو۔ منافقین کے جہاد سے جی چرانے اور جھوٹی قسموں کے بل پر بہانہ سازی کی ایک مثال۔

(۴۳ - ۴۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محبت آمیز عتاب کہ جہاد سے جی چرانے والوں کے جھوٹے عذرات تم قبول کر لیتے ہو حالانکہ یہ منافق لوگ ہیں۔ اگر یہ چاہیں تو جہاد کے لیے نکلنے کا سامان مہیا کر سکتے ہیں لیکن یہ جھوٹے بہانے بنا کر تمہاری نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

(۴۷ - ۵۲) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی کہ جہاد کے لیے تمہارے ساتھ ان منافقین کے نہ نکلنے ہی میں خیر ہے۔ اگر یہ نکلتے تو کوئی نہ کوئی فساد ہی برپا کرتے۔ ان کے دلوں میں خیر خواہی کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ یہ تو ہر پہلو سے تمہارے لیے کسی مصیبت کے متمنی ہیں۔

(۵۳ - ۵۷) منافقین بادل ناخواستہ دین کے نام پر جو کچھ خرچ کرتے ہیں اللہ کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ اللہ و رسولؐ کے منکر ہیں اور ان کا انفاق اور ان کی نماز سب محض نمائش ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ ان کے مال کو کوئی وقعت نہ دو اور ان کی رفاقت کی ذرا پروا نہ کرو۔ یہ بزدل اور ڈرپوک تمہارے ساتھی نہیں بن سکتے۔

(۵۸ - ۶۰) منافقین کے اس گروہ کی طرف اشارہ جو محض صدقات کے مال میں حصہ بٹانے کی حد تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی تھا۔ اگر خواہش کے مطابق پا جاتے تو راضی ورنہ پیغمبرؐ کے خلاف طرح طرح کی باتیں بناتے۔ صدقات کے اصل حق داروں کی تفصیل۔

(۶۱ - ۶۶) ان شریر منافقین کی طرف اشارہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا کرتے کہ آپؐ کان کے کچے ہیں، لوگوں میں آپ کی رائے اور معاملہ فہمی کا مذاق اڑاتے، جب کسی بات پر گرفت ہوتی تو جھوٹی قسمیں کھاتے اور لایعنی صفائی پیش کرتے۔

(۶۷ - ۷۰) منافق مردوں اور منافق عورتوں کا کردار اور ان کا انجام دنیا اور آخرت میں۔

(۷۱ - ۷۲) مومنین اور مومنات کا کردار اور ان کی فوز و فلاح آخرت میں۔

(۷۳ - ۸۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ کفار کی طرح ان منافقین کے معاملے میں بھی اب سخت رویہ اختیار کرو کہ تمہاری نرمی سے فائدہ اٹھا کر یہ اسلام کے ساتھ چمٹے نہ رہیں۔ یہ جھوٹی قسموں کے پردے میں اپنے کفر کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اللہ کے فضل اور رسول کی کریم النفسی نے ان کو اسلام دشمنی میں اور زیادہ دلیر بنا دیا ہے۔ انھوں نے وعدے کچھ کیے اور ان کا عمل اس

کے بالکل خلاف ہوا اور اس چیز نے ان کے نفاق کو پختہ سے پختہ تر کر دیا۔

(۷۹-۸۴) منافقین کی اس شرارت کا بیان کہ خود تو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور اگر اللہ کے مخلص اور غریب بندے اپنی گاڑھی کمائی میں سے خرچ کرتے ہیں تو ان کا مذاق اڑاتے اور ان کی دل شکنی کرتے ہیں۔ اسی طرح خود تو جہاد میں نکلنے کے بجائے گھروں میں بیٹھ رہتے ہیں اور جو اللہ کے بندے نکلتے ہیں ان کو گرمی اور سردی کے ڈراوے سنا سنا کر بٹھا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان اشرار کے بارے میں وعید الٰہی کا بیان اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لیے دعا و استغفار کرنے کی شدید ممانعت۔

(۸۵-۹۶) دین کے مطالبات سے جی چرانے والوں کے جھوٹے عذرات کی طرف اشارہ سچے اہل ایمان کے کردار کا بیان۔ ان معذورین کی تفصیل جن کا عذر قابل قبول ہے۔ عذر تراشوں اور بہانہ بازوں کو یہ دھمکی کہ اگر تم پیغمبرؐ اور مومنین کو اپنے خانہ ساز عذرات سے دھوکا دینے میں کامیاب بھی ہو جاؤ جب بھی یہ چیز تمہارے لیے کچھ سود مند نہیں، خدائے علام الغیوب کو تم بہر حال ان بہانہ سازیوں سے فریب نہیں دے سکتے۔

(۹۷-۱۰۱) اعراب یعنی اہل بدو میں جو منافقین تھے ان کی طرف اشارہ اور ان کے اندر جو مخلصین تھے ان کی حوصلہ افزائی۔ سابقون الاولون اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کی تحسین منافقین اعراب اور منافقین مدینہ دونوں کو دھمکی۔

(۱۰۲-۱۰۶) ان لوگوں کو قبولیت توبہ کی بشارت جنھوں نے ان تنبیہات سے متاثر ہو کر اپنے رویہ میں تبدیلی کر لی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی مزید تربیت اور ان کے لیے دعا کی ہدایت۔ اس گروہ کے بعض افراد کی قبولیتِ توبہ کے معاملہ کا التوا۔

(۱۰۷-۱۱۰) مسجد ضرار کے بانیوں کو نہایت تند الفاظ میں وعید۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسجد میں نماز پڑھنے کی ممانعت۔

(۱۱۱-۱۱۳) اہل ایمان اور اللہ کے درمیان جو عہد و میثاق ہے اس کی نوعیت کی وضاحت اور اس کے حقیقی مقتضیات کا بیان۔

(۱۱۴-۱۱۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو شرک پر مرنے والوں کے لیے دعائے استغفار کرنے کی ممانعت اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے باپ کے لیے دعا کی اس کی نوعیت۔

(۱۱۷-۱۱۸) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مخلص مہاجرین و انصار کے لیے عام قبولیت توبہ کی بشارت۔ جن لوگوں کی توبہ کی قبولیت کا معاملہ آیت ۱۰۶ میں ملتوی کیا گیا تھا، رجوع کامل کے بعد ان کی

توبہ کی قبولیت کا اعلان۔

(۱۱۹ - ۱۲۲) اہل مدینہ اور اعراب کو راست بازی اور کامل وفاداری کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جان نثاری کی تلقین۔ اس جان نثاری کی راہ میں چھوٹی یا بڑی جو تکلیف بھی اہل ایمان اٹھائیں گے اس کے اجر عظیم کا بیان۔ اہل بدو کو یہ ہدایت کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے منتخب آدمی حصول تربیت کے لیے مجلس نبوی میں بھیجتے رہیں تاکہ یہ لوگ وہاں سے کسب فیض کر کے اپنی قوم کی تربیت کر سکیں۔

(۱۲۳ - ۱۲۹) مسلمانوں کو یہ عام ہدایت کہ ہر جگہ کے مسلمان اپنے اپنے علاقہ کے کفار سے مصروف جہاد ہوں۔ ان لوگوں کی طرف اشارہ جو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہہ سے گریز کرتے تھے۔ پیغمبر کے وجود قدسی کی صورت میں دنیا پر اللہ کی جو عظیم رحمت نازل ہوئی تھی اس کی قدر کرنے کی تلقین۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقدروں سے بے پروا ہو کر صرف اللہ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت۔

اس فہرست مطالب پر ایک سرسری نظر ڈال کر بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سورہ کا ہر جزو نہایت مربوط و منظم ہے اور آغاز سے لے کر انتہا تک باہم دگر ایک فطری تسلسل کے ساتھ وابستہ و پیوستہ۔ اب ہم توفیق الٰہی کے اعتماد پر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُوْرَةُ التَّوْبَةِ (۹)

مَدَنِيَّةٌ ________ اٰيَاتُهَا ۱۲۹

آيات ۱ - ۲۸

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝۲ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ

الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ
مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ كَيْفَ يَكُوْنُ
لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷﴾ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا
فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ
وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸﴾ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ
مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ فَاِنْ تَابُوْا
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَ
نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ
اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا
نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ
اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ
وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَ
يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ

ع ۲

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَ
لَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ مَا
كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ
بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾
اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ
اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ
وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ
وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ
اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ
عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾
قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ

ع ۲ ۱۰ ۸

وقف لازم

وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ
مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ
سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ
حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ
عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ
اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ
تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ
يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا
الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً
فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ
حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۸

ان مشرکین سے اللہ اور رسول کی طرف سے اعلانِ براءت ہے جن سے تم نے
معاہدے کیے تھے۔ سو اب ملک میں چار ماہ چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کے
قابو سے باہر نہیں جا سکتے اور اللہ کافروں کو رسوا کر کے رہے گا۔ اور اللہ و رسول کی
طرف سے بڑے حج کے دن لوگوں میں منادی کر دی جائے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں
سے بری الذمہ ہیں تو اگر تم توبہ کرو تو تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر رو گردانی کرو گے

تو جان رکھو کہ تم اللہ سے بھاگ نہیں سکتے اور کافروں کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری پہنچا دو۔ وہ مشرکین اس سے مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے معاہدہ کیا اور انھوں نے اس میں نہ تم سے کوئی خیانت کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی سو ان کے معاہدے ان کی قرارداد مدت تک پورے کرو، اللہ نقض عہد سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ سو جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو، ان کو پکڑو، ان کو گھیرو، اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک لگاؤ۔ پس اگر یہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تب ان کی جان چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اگر ان مشرکین میں سے کوئی تم سے امان کا طالب ہو تو اس کو امان دے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اس کو اس کے امان کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں اللہ کی باتوں کا علم نہیں۔ ۱-۶

مشرکین کے کسی عہد کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول پر کس طرح باقی رہ سکتی ہے؟ —— ہاں جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا ہے تو جب تک وہ قائم رہیں تم بھی ان کے لیے معاہدے پر قائم رہو، اللہ نقض عہد سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے —— کس طرح باقی رہ سکتی ہے جب کہ حال یہ ہے کہ اگر وہ کہیں تمھیں دبا پائیں تو نہ تمھارے بارے میں کسی قرابت کا پاس کریں نہ عہد کا۔ وہ تمھیں باتوں سے مطمئن کرنا چاہتے ہیں، پر ان کے دل انکار کر رہے ہیں اور ان کی اکثریت بدعہد ہے۔ انھوں نے اللہ کی آیات کے عوض میں ایک نہایت حقیر قیمت اختیار کر لی ہے۔ اور اس طرح وہ اللہ کی راہ سے رک گئے ہیں، بے شک بہت ہی برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں کسی صاحب ایمان

کے معاملے میں نہ ان کو کسی قرابت کا پاس ہے اور نہ کسی عہد کا۔ اور یہی لوگ ہیں جو حدود کو توڑنے والے ہیں۔ پس اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمھارے دینی بھائی ہیں اور ہم آیات کی تفصیل کیے دے رہے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ ۷۔ ۱۱

اور اگر عہد کر چکنے کے بعد یہ اپنے قول و قرار توڑ دیں اور تمھارے دین پر نیش زنی کریں تو تم کفر کے ان سرخیلوں سے بھی لڑو۔ ان کے کسی قول و قرار کا کوئی وزن نہیں تاکہ یہ اپنی حرکتوں سے باز آئیں۔ بھلا تم ایسے لوگوں سے نہ لڑو گے جنھوں نے اپنے قول و قرار توڑ دیے، اور رسول کو نکالنے کی جسارت کی، اور وہی ہیں جنھوں نے تم سے جنگ چھیڑنے میں پہل کی! کیا تم ان سے ڈرو گے؟ اصلی حق دار تو اللہ ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو۔ تم ان سے لڑو، اللہ تمھارے ہاتھوں ان کو سزا دے گا، ان کو رسوا کرے گا، تم کو ان پر غلبہ دے گا، اہلِ ایمان کے ایک گروہ کے کلیجے ٹھنڈے کرے گا اور ان کے دلوں کا غم و غصہ دور فرمائے گا اور جس کو چاہے گا اللہ توبہ کی توفیق دے گا۔ اللہ علم و حکمت والا ہے۔ ۱۲۔ ۱۵

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو چھانٹا ہی نہیں جنھوں نے جہاد کیے اور اللہ و رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جنھوں نے دوست نہیں بنایا اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ مشرکین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مساجدِ الٰہی کا انتظام کریں درآنحالیکہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ ان لوگوں کے سارے اعمال ڈھے گئے اور دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے

تو یہی ہیں۔ مساجدِ الٰہی کے انتظام کرنے والے تو بس وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، نماز قائم کرتے ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، یہ لوگ توقع ہے کہ راہ یاب ہونے والے بنیں۔ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے انتظام کو ان لوگوں کے عمل کے ہم رتبہ کر دیا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیے۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہوں گے۔ خدا ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ جو ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جنھوں نے اپنے جان و مال سے جہاد کیا، ان کا درجہ اللہ کے ہاں بڑا ہے اور وہی لوگ فائز المرام ہونے والے ہیں۔ ان کا رب ان کو خوش خبری دیتا ہے، اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کے لیے ابدی نعمت ہے۔

اے ایمان والو، تم اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو اپنا ولی نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ اور تم میں سے جو لوگ ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی لوگ اپنے اوپر ظلم کرنے والے ٹھہریں گے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا، وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمھیں پسند ہیں اگر تمھیں اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرما دے اور اللہ بد عہدوں کو بامراد نہیں کرتا۔ بے شک اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمھاری مدد فرمائی ہے۔ اور حنین کے دن بھی جب کہ تمھاری کثرت نے تمھیں غرہ میں مبتلا کر دیا تو وہ کثرت تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ

ہوگئی پھر تم پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بالآخر اللہ نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسی فوجیں اتاریں جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو سزا دی اور یہی کافروں کا بدلہ ہے۔ پھر اللہ اس کے بعد جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق دے دیتا ہے اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ۲۵-۲۷

اے ایمان والو، یہ مشرکین بالکل نجس ہیں تو یہ اپنے اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ پھٹکنے پائیں اور اگر تمھیں معاشی بدحالی کا اندیشہ ہو تو اللہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تم کو مستغنی کر دے گا۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۲۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ (۱-۲)

لفظ 'برآءۃ' کا مفہوم

'بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ الایۃ'۔ 'براءۃ' کے معنی کسی ذمہ داری سے دستبردار اور بری الذمہ ہونے کے ہیں۔ یہاں یہ ان معاہدات کی ذمہ داری سے دستکش ہونے کے معنی میں ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد مشرکین عرب کے مختلف قبائل سے موقت اور غیر موقت نوعیت کے کر لیے تھے۔ 'مشرکین' سے یہاں بھی اور قرآن میں جہاں جہاں بھی یہ لفظ بشکل علم استعمال ہوا ہے مشرکین بنی اسمٰعیل یا بالفاظ دیگر مشرکین عرب مراد ہیں۔ ان کے معاہدات کی ذمہ داری سے اس اعلان برأت کی وجہ آگے آیت ۴ سے واضح ہوتی ہے کہ بہت سے قبائل نے معاہدات کرنے کو تو کر لیے تھے لیکن ان کو وفاداری اور راستبازی کے ساتھ نباہ نہیں رہے تھے اس وجہ سے اس قسم کے معاہدوں کے کالعدم ہونے کا اعلان کر دیا گیا، صرف ان قبائل کے معاہدے باقی رکھے گئے جنھوں نے کوئی غداری یا عہد شکنی نہیں کی تھی اور وہ بھی صرف ان کی قرار داده مدت تک کے لیے۔ لفظ 'براءۃ' کے بعد حرف 'الی' جو آیا ہے یہ دلیل ہے اس بات پر کہ یہاں 'ابلاغ' کا مفہوم بھی مضمر ہے۔ یعنی اس دستبرداری کی اطلاع تمام ناقضِ عہد مشرکین کو پہنچا دی جائے چنانچہ بعد والی آیت میں اس کی تصریح بھی آ رہی ہے۔

ایک قابلِ توجہ نکتہ

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ جہاں تک معاہدہ کرنے کا تعلق ہے اس کی ذمہ داری تو اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ 'عٰهَدْتُّمْ' کے لفظ سے واضح ہے تمام مسلمانوں پر ڈالی ہے اس لیے کہ پیغمبر کی اٹھائی ہوئی ذمہ داری تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے لیکن براءت ذمہ کے معاملے میں مسلمانوں کی ذمہ داری معین نہیں فرمائی ہے کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ اس سے اس اعلان براءت کی شدت ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ و رسول تو ان لوگوں کے معاہدوں سے بری ہوئے، اب اہلِ ایمان خود فیصلہ کریں کہ انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، اللہ و رسول کا ساتھ دے کر اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہے یا عزیزداری، برادری اور خاندان و قبیلہ کی پاسداری میں نفاق کی روش اختیار کرنی ہے۔ بات کے اس انداز سے کہنے میں مصلحت یہ بھی کہ پس منظر میں، جیسا کہ آگے تفصیل آرہی ہے، منافقین بھی تھے جو ابھی اپنے خاندانی و قبائلی بندھنوں سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے تھے۔ ان لوگوں پر اس اسلوب سے یہ حقیقت واضح کردی گئی کہ اللہ اور رسول کی طرف سے یہ فیصلہ قطعی ہے، اس میں کسی لچک کا امکان نہیں ہے، جس کو اس کا ساتھ دینا ہو، ساتھ دے ورنہ اپنی راہ اور اپنی منزل کا خود فیصلہ کرے۔

براہِ راست مشرکین سے خطاب

'فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ' الآیۃ اوپر والی آیت کا خطاب مسلمانوں سے تھا، اس آیت میں خطاب کا رخ براہِ راست مشرکین کی طرف ہوگیا ہے۔ خطاب کی یہ تبدیلی اس دھمکی کی شدت اور اس کے فیصلہ کن ہونے کی دلیل ہے۔ مسلمانوں کو خطاب کر کے یوں نہیں فرمایا کہ دھمکی مشرکین کو سنا دو بلکہ جس طرح اعلانِ براءت خود فرما دیا اسی طرح براہِ راست مشرکین کو خطاب کر کے فرمایا کہ بس اب چار ماہ کی مہلت تمھیں اور حاصل ہے، اس کے بعد ان لوگوں کے معاہدات کی اللہ و رسول پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے جو اپنے معاہدوں کی خلاف ورزیاں کر چکے ہیں بلکہ ہر قدم پر ان کی دار و گیر شروع ہو جائے گی۔

معاہدات میں براءت میں چار ماہ کی مہلت کی مصلحتیں

چار ماہ کی مہلت میں کئی مصلحتیں مدنظر ہو سکتی ہیں۔ یہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے کہ معاہدے کے باوجود جو لوگ شرارتیں کر رہے تھے وہ اپنے رویے پر نظرثانی کرنا چاہیں تو نظرثانی کرلیں، یہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے کہ اس دوران میں مسلمان اپنے اس اہم اقدام سے پوری طرح یکسو، منظم اور تیار ہو جائیں۔ علاوہ ازیں آیت ۵ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آگے اشہر حرم آرہے تھے جن کا احترام کسی جنگی اقدام سے مانع تھا۔

'وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ' کی وضاحت انفال آیت ۵۹ کے تحت گزر چکی ہے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳)

حج کے موقع پر اعلان براءت کی عام منادی

'اَذَان' یہاں اپنے لغوی مفہوم یعنی اعلان و منادی کے معنی میں ہے۔ ہدایت ہوئی کہ حج اکبر کے

دن یہ منادی کرادی جائے کہ اللہ و رسولؐ اس قسم کے معاہدوں سے بری الذمہ ہیں، اب جو توبہ کرلے گا اس کی خیر ہے اور جو رو گردانی کریں گے وہ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکیں گے۔ حج کے موقع پر منادی کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ عرب میں حج ہی کا اجتماع ایک ایسا اجتماع ہوتا تھا جس میں ملک کے کونے کونے سے لوگ جمع ہوتے جس کے سبب سے ہر وہ بات جو وہاں پھیل جائے پورے ملک میں پھیل جاتی تھی۔ خاص طور پر ۹ھ کے حج تک چونکہ صورت یہ تھی کہ مشرکین بھی حج کو جاتے تھے اس وجہ سے وہاں کا ہر اعلان سب کے کانوں تک پہنچ جاتا تھا، خواہ مسلمان ہوں یا کفار۔ اسی وجہ سے آیت میں لفظ بھی 'الی الناس' استعمال ہوا ہے جو عام ہے۔

حج اکبر سے کیا مراد ہے؟

'حج اکبر' سے کیا مراد ہے اور یہ کس سن کے حج کی طرف اشارہ ہے؟ اس سوال کا جواب مفسرین نے یہ دیا ہے کہ اس سے مراد ۹ھ کا حج ہے جو حضرت ابوبکرؓ صدیق کی امارت میں ہوا۔ ہمارے نزدیک یہ بات ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ یہی پہلا موقع ہے جب مسلمانوں کو باقاعدہ حج کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے انھیں دو تین مواقع جو ملے ان میں وہ صرف عمرہ کرسکے تھے۔ عمرہ کو حج اصغر (چھوٹا حج) بھی کہتے ہیں۔ اس نسبت سے پورے حج کے لیے 'حج اکبر' (بڑا حج) کا لفظ استعمال ہوا جس میں گویا مسلمانوں کو پہلے سے یہ بشارت بھی دے دی گئی کہ اب تک وہ صرف چھوٹے حج ہی کی سعادت حاصل کرسکے ہیں، آگے ان کو بڑے حج سے بھی سعادت اندوز ہونے کا موقع ملنے والا ہے۔

سورۂ توبہ کا زمانۂ نزول

یہیں سے عام طور پر لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس سورہ کا نزول ۹ھ میں ہوا ہے لیکن اس نتیجہ کے قبول کرنے میں مجھے تردد ہے اس لیے کہ آگے جو آیات آرہی ہیں ان سے، جیسا کہ آپ دیکھیں گے، صاف واضح ہے کہ کم از کم یہ اور آگے کی آیات معاہدہ حدیبیہ کے خاتمہ اور فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی ہیں لیکن اعلانِ برأت کی منادیٔ عام چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ کے حج کے موقع پر ہی کرائی اس لیے بعض لوگوں کو یہ گمان گزرا کہ ان آیات کا نزول بھی اسی موقع پر ہوا۔ حالانکہ یہ ایک پیشگی ہدایت تھی اس بات کی کہ جب حج اکبر کی سعادت حاصل کرنے کا موقع آئے تو اس موقع پر اس فیصلہ کی منادیٔ عام بھی کرادی جائے۔ اس سے ضمناً مسلمانوں کو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، حج سے مشرف ہونے کی بشارت بھی حاصل ہوگئی۔

میرے لیے ان آیات کا زمانۂ نزول ٹھیک ٹھیک متعین کرنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ عرب میں حجۃ الوداع سے پہلے تک دو جنتریاں رائج رہی ہیں، ایک سادہ قمری حساب پر مبنی تھی دوسری نسی کے اس قاعدے پر مبنی تھی جس کی طرف آگے اسی سورہ میں اشارہ آئے گا۔ اگر کوئی شخص اس فرق کو معلوم کرسکے جو نسی کے قاعدے نے اصل قمری مہینوں میں پیدا کردیا تھا تو وہ ان چار مہینوں کو بھی معین کرسکے گا جو آیت نمبر ۲ میں مذکور ہیں اور ان محترم مہینوں کو بھی ٹھیک ٹھیک بتا سکے گا جن کا حوالہ آیت ۵

میں ہے۔ اس تحقیق میں اس مسلّم حقیقت سے بڑی رہنمائی مل سکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۱۰ھ میں جو حج کیا وہ قمری حساب سے بھی ٹھیک نویں ذی الحجہ کو پڑا تھا اور نسی کے حساب سے بھی اس کی تاریخ یہی تھی، گویا دونوں جنتریوں کا قِران ہو گیا تھا۔ استدار الزمان کھیئتہ یوم خلق السموت والارض، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ میں حساب کتاب کے میدان کا مرد نہیں ہوں اس وجہ سے اس باب میں عزم و جزم سے کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے لیکن قرآن کے الفاظ اور اس کے نظم کی روشنی میں اس بات پر میں مطمئن ہوں کہ یہ آیات معاہدہ حدیبیہ کے خاتمہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی ہیں۔ دلائل و قرائن کی تفصیل آئے گی۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۴)

اعلان براءت سے مستثنیٰ مشرکین

یہ ان مشرکین کا بیان ہے جو مذکورہ اعلان سے مستثنیٰ تھے۔ یہ وہ قبائل ہیں جو اپنے عہد پر قائم رہے، نہ خود معاہدے کے خلاف کوئی چھوٹا یا بڑا اقدام کیا، نہ مسلمانوں کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی مدد کی۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مذکورہ بالا اعلان ناقضین عہد ہی سے متعلق تھا لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس سے واضح ہوتی ہے کہ یہ معاہدے بھی صرف ان کی قرارداد مدت ہی تک باقی رکھنے کی اجازت ہوئی۔ مدت گزر جانے کے بعد یہ بھی کالعدم۔ آگے کے لیے ان سے کسی نئے معاہدے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ اس اعلان براءت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے کسی گروہ سے کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مشرکین سے جو معاہدے کیے گئے تھے وہ صرف دعوت و تبلیغ اور اتمام حجت کی مصلحت سے کیے گئے تھے۔ مقصود ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے نباہ کرنا نہ تھا۔ یہ سنت الٰہی ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ جس قوم کی طرف براہِ راست رسول کی بعثت ہوتی ہے اگر وہ تبلیغ و دعوت اور اتمام حجت کے بعد بھی رسول کی تکذیب پر اڑی رہتی ہے تو وہ لازماً ختم کر دی جاتی ہے۔ خواہ اس کا خاتمہ خدا کے کسی براہِ راست عذاب سے ہو یا اہلِ ایمان کی تلوار سے۔ مشرکین عرب کا معاملہ اسی نوعیت کا تھا اب تبلیغ و دعوت اور اتمام حجت کا دوران کے لیے ختم ہو رہا تھا اس وجہ سے اب ان کے کسی گروہ کے ساتھ کسی معاہدے کا سوال خارج از بحث تھا۔

'اجتماعی تقویٰ' کی وضاحت

'اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ' میں جس تقویٰ کا ذکر ہے، یہ انفرادی تقویٰ نہیں بلکہ اجتماعی و سیاسی تقویٰ ہے۔ اسلام جس طرح ہر شخص سے انفرادی تقویٰ کا مطالبہ بھی کرتا ہے اسی طرح مسلمانوں سے من حیث الجماعت اجتماعی اور سیاسی تقویٰ کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ یعنی مسلمان دوسری قوموں سے جو معاملات اور معاہدات کریں ان میں راست باز، صداقت شعار اور وفادار رہیں، کسی عہد اور قول و قرار کی کوئی ادنیٰ خلاف ورزی بھی نہ کریں۔ خدا ایسے ہی متقیوں کو دوست رکھتا ہے اور خدا جن کو دوست رکھتا ہے

وہی دنیا اور آخرت میں برومند اور فائز المرام ہو رہے ہیں۔

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۵)

'اشہر حرم' سے مراد

'اَشْهُرُ حُرُمٌ' سے مراد ذی قعدہ، ذی الحجۃ، محرم اور رجب کے مہینے ہیں۔ 'اَشْهُرُ حُرُمٌ' ان مہینوں کے لیے بطور اسم وعلم استعمال ہوتا ہے۔ ان کے سوا کوئی اور مہینہ اس لفظ سے مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ مہینے زمانہ جاہلیت بلکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے محترم چلے آرہے تھے۔ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ حج وعمرہ کے مہینے بھی تھے اور اہل عرب کی بیشتر تجارتی کاروباری نقل وحرکت انہی مہینوں میں ہوتی تھی۔ ان میں لڑنا بھڑنا شرعاً ممنوع تھا اور اہل عرب اپنی جنگ جویانہ طبیعت کے باوجود ان کا احترام برابر ملحوظ رکھتے تھے۔ اوپر آیت ۲ میں جو چار ماہ کی مہلت مذکور ہوئی ہے ان میں تین مہینے حرمت والے تھے۔ تین مہینے اس وجہ سے کہ حرمت کے چاروں مہینے یکجا نہیں ہیں۔ تین ایک سلسلہ میں ہیں، رجب الگ ہے۔ اگرچہ نسی کے قاعدے کے تحت یہ اپنے اصل مقام سے ہٹے ہوئے تھے تاہم اگر ان تین حرمت والے مہینوں سے پہلے وقت کے مہینوں میں سے شوال کو ملا دیا جائے تو یہ چار مہینے بن جاتے ہیں۔ فرمایا کہ جب محترم مہینے گزر جائیں تو ان ناقض عہد مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ 'جہاں پاؤ' سے مراد، جیسا کہ سورہ بقرہ کی تفسیر میں وضاحت گزر چکی ہے، یہ ہے کہ حدودِ حرم میں بھی ان سے جنگ وقتال مباح ہے۔

مشرکین عرب کی داروگیر

'وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ' یعنی ان کے خلاف ہر قسم کی جنگی کارروائی کی جائے اور ہر پہلو سے ان کا ناطقہ بند کیا جائے۔ اس شدت کے ساتھ ان کی داروگیر کے اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ اس کی نوعیت محض ایک دشمن کے خلاف اقدام کی نہیں تھی بلکہ یہ مشرکین عرب کے لیے اس سنت الٰہی کا ظہور تھا جو رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کے لیے ہمیشہ ظاہر ہوتی ہے اور جس کی تفصیلات سورۂ اعراف میں بیان ہوئی ہیں۔

مشرکین عرب کے لیے دو راہیں: اسلام یا تلوار

'فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ' مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ داروگیر اس وقت تک بند نہ کی جائے جب تک یہ اپنے کفر وشرک سے تائب ہو کر نماز نہ قائم کریں اور زکوٰۃ نہ ادا کرنے لگ جائیں۔ نماز اور زکوٰۃ ایک جامع تعبیر ہے اسلام کے نظام عبادت واطاعت میں داخل ہونے کی۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام کے بغیر نہ ان کے لیے ذمی یا معاہد بن کر اسلامی نظام میں باقی رہنے کی گنجائش رہی نہ لونڈی غلام بن کر۔ ان کے لیے صرف دو راہیں باقی رہیں، یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔

مشرکین عرب کے ساتھ خاص معاملہ کی وجہ

مشرکین عرب کے ساتھ یہ خاص معاملہ کرنے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول بھیجا، انہی کی زبان میں ان پر اپنی کتاب اتاری، اسی ملت کی ان کو دعوت دی گئی جس کے وہ مدعی تھے۔ رسول نے مسلسل ۲۳ سال تک ان کو جھنجوڑا اور جگایا، ان کی ہر مجلس اور ہر بزم میں وہ پہنچا، ان کے ایک ایک دروازے پر اس نے دستک دی۔ ان کے ایک ایک شبہ اور ایک ایک اعتراض کا جواب دیا۔ ان کی تمام الزام تراشیوں، تہمتوں اور عداوتوں کا مقابلہ کیا۔ ان کے مطالبہ پر معجزے بھی دکھائے اور ان کی منتخب کی ہوئی کسوٹیوں پر بھی اپنے کو کھرا اور سچا ثابت کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کے اندر جو اچھے لوگ تھے وہ اس کے ساتھی بھی بن گئے تو اس سارے اہتمام کے بعد بھی جو لوگ قبولِ حق پر آمادہ نہیں ہوئے آخر وہ کس لیے باقی رکھے جاتے۔ رسول اتمامِ حجت کا کامل اور آخری ذریعہ ہوتا ہے، جو لوگ اس کے جگانے سے بھی نہیں جاگتے وہ مردہ ہیں اور مردوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ دفن کر دیے جائیں۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۶)

اتمامِ حجت کی خاطر آخری رعایت

اوپر والی آیت میں مشرکین کی داروگیر کا جو حکم ہوا ہے، اتمامِ حجت کی خاطر یہ اس میں آخری رعایت ہے۔ فرمایا کہ اس داروگیر کے دوران میں اگر کوئی شخص امان کا طالب ہو تو اس کو امان دے دو۔ اور اس کو اللہ و رسول کی دعوت اور اس کا مقصد اچھی طرح سنا سمجھا کر اس کی امان کی جگہ پر پہنچا دو تاکہ وہ ٹھنڈے دل سے اپنے معاملہ پر غور کر کے فیصلہ کر سکے کہ وہ اسلام قبول کرتا ہے یا تلوار۔ یہ امان بخشی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، محض اتمامِ حجت کے نقطۂ نظر سے تھی۔ اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ وہ اس داروگیر کے حکم سے امان پا گیا۔ اگر وہ ایمان نہ قبول کرے گا تو اس کے لیے وہی حکم باقی رہے گا جو اوپر بیان ہوا ہے اور جب وہ دوبارہ زد میں آئے گا تو نہ یہ امان اس کے لیے نافع ہوگی، نہ از سرِ نو طلبِ امان کی اس کے لیے کوئی گنجائش ہی باقی رہے گی۔

'ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ' یہ اس رعایت کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ چونکہ یہ امی لوگ رہے ہیں دین و شریعت سے بے خبر اور نبوت و رسالت سے ناآشنا، اس وجہ سے اس کا امکان ہے کہ اتنے طویل سلسلۂ تبلیغ و دعوت کے بعد بھی، کسی کے معاملہ میں اتمامِ حجت کے پہلو سے کوئی کسر رہ گئی ہو اور چونکہ اس داروگیر کا حکم، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اتمامِ حجت ہی کی بنیاد پر تھا اس وجہ سے ہدایت ہوئی کہ اگر کوئی شخص طالبِ رعایت ہو تو اس کو رعایت دے دی جائے۔ ہر چند اس میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی شخص اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر جاسوسی کرے یا دوبارہ حریف بن کر سامنے آئے۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ (۷-۸)

اعلانِ براءت کے وجوہ

یہ اعلان برأت کے وجوہ اور دلائل بیان ہو رہے ہیں۔ خطاب اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن روئے سخن ان مسلمانوں کی طرف خاص طور سے ہے جو مشرکین کے اندر اپنے تعلقات اور عزیزداریوں کے باعث اس اعلان سے تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس اعلان سے اتنی بات تو ہر شخص کے سامنے آگئی کہ اب حدیبیہ کے اس معاہدے کے دن بھی قریب آگئے ہیں جس نے مسلمانوں اور قریش کے درمیان ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی راہ کھول دی تھی۔ جو لوگ ضعیف الایمان تھے قدرتی طور پر ان کا ایمان ایک سخت آزمائش میں پڑ گیا۔ قریش میں گھر گھر ان کی عزیزداریاں تھیں اور وہ توقع لیے بیٹھے تھے کہ ملنے جلنے کا یہ دروازہ کھلا رہے گا اور وہ کفر اور اسلام دونوں کے ساتھ نباہ کرتے رہیں گے۔ اس اعلان نے نہ صرف اس توقع کا ہمیشہ کے لیے یک قلم خاتمہ کر دیا بلکہ انھوں نے دیکھا کہ اب وہ وقت سر پر آرہا ہے کہ انھیں اپنے ان تمام عزیزوں اور رشتہ داروں کے خلاف تلوار سونتنی پڑے گی۔ اس ذہن کے لوگوں کو سامنے رکھ کر فرمایا جا رہا ہے کہ بھلا ان مشرکین کے کسی عہد و پیمان کی کوئی ذمہ داری اللہ و رسول پر کیسے ہو سکتی ہے جن کا حال یہ ہے کہ اگر تم پر کہیں ان کا زور چل جائے تو نہ قرابت کا پاس کریں نہ کسی عہد کا۔ باتوں سے وہ تمھیں خوش کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے دل تمھارے اوپر غم و غصہ سے کھول رہے ہیں۔ ان کی اکثریت بدعہدوں پر مشتمل ہے۔

آیات ۷-۸ کا دروبست

اس آیت کا دروبست ذرا قابلِ غور ہے اس کو سمجھ لیجیے۔ کلام کا آغاز تو فرمایا کَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ' سے لیکن بات پوری کرنے سے پہلے ایک استثنا کا ذکر بطور جملہ معترضہ کر دیا کہ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ' پھر اس بات کو جو اس جملہ معترضہ کے سبب سے ادھوری رہ گئی تھی از سر نو لیا اور اس کو بعینہٖ اسی تمہید سے شروع کر کے اس کی تکمیل کی۔ فرمایا كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً۔ الآیۃ

معاشرتی و سیاسی تعلقات کی بنیادیں

تعلقات کی بنیاد دو ہی چیزوں پر ہوتی ہے۔ معاشرتی تعلقات کی بنیاد رشتۂ رحم و قرابت کے پاس و لحاظ پر اور سیاسی روابط کی بنیاد باہمی معاہدات کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے احترام پر۔ پہلی کو 'آل' سے تعبیر فرمایا ہے جو ان حقوق کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک اصل و نسل، ایک جوہر و معدن سے ہونے یا قرابت اور پڑوس کی بنا پر ایک دوسرے پر آپ سے آپ قائم ہو جاتے ہیں۔ دوسری کو

'ذمّۃ' سے تعبیر فرمایا ہے جو ان ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کسی معاہدہ میں شریک ہونے والی پارٹیوں پر ازروئے معاہدہ عائد ہوتی ہیں۔ فرمایا کہ اس اعلان براءت سے تم میں سے کوئی اس تشویش میں مبتلا نہ ہو کہ اب ان لوگوں کے ساتھ تمام معاشرتی اور اجتماعی تعلقات ختم ہو رہے ہیں۔ یہ ختم ہو رہے ہیں تو اب ان کو ختم ہی ہونا تھا۔ تعلقات کبھی بھی یک طرفہ قائم نہیں رہتے۔ تم میں سے جو لوگ ان کے تعلقات کو عزیز رکھتے ہیں انھیں یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیے کہ وہ اگر تم پر کبھی قابو پا جائیں گے تو نہ قرابت مندی کا لحاظ رکھیں گے نہ کسی معاہدے کا۔ ملاقاتوں میں یہ جو چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں وہ محض زبانی ہمدردی کی نمائش اور تمھیں بے وقوف بنانے کی ایک کوشش ہے ورنہ حقیقت میں ان کے دل ان کی زبان سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ان کے دلوں کے اندر تمھارے اور تمھارے دین کے خلاف عناد بھرا ہوا ہے۔

'فسق' کا مفہوم

'وَاَکْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ' یعنی جس طرح ان کی قرابت داری محض زبانی اور نمائشی ہے اسی طرح اپنے عہد و پیمان کے معاملے میں بھی یہ بالکل جھوٹے اور غدار ہیں۔ ان کی اکثریت عہد شکن ہے۔ 'فسق' کا لفظ یہاں غداری اور عہد شکنی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور قرآن میں اس لفظ کا استعمال اس معنی میں معروف ہے۔ جس طرح اوپر 'تقویٰ' کا لفظ پاس عہد کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں 'فسق' کا لفظ نقض عہد کے لیے استعمال ہوا ہے۔

معاہدۂ حدیبیہ کی طرف اشارہ

'اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ'، ہمارے نزدیک یہ اشارہ اس معاہدہ کی طرف ہے جو قریش کے ساتھ صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوا تھا۔ اس رائے کے دلائل تو آگے واضح ہوں گے لیکن ایک قرینہ یہاں قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اس کا تعارف 'الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ' سے کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی معاہدے ہجرت کے بعد مشرکین کے ساتھ کیے ان میں سے اگر کوئی معاہدہ مسجد حرام کی نسبت کے ساتھ تعارف کا سزاوار ہو سکتا ہے تو وہ صرف حدیبیہ کا معاہدہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہی معاہدہ مسجد حرام کے قرب و جوار میں طے پایا تھا۔ اس نسبت کے اظہار سے ایک طرف تو معاہدے کا تعارف ہو گیا، دوسری طرف اس سے اس کی غیر معمولی حرمت بھی واضح ہوئی کہ کوئی ایسا ویسا معاہدہ نہیں ہے بلکہ اس کی تکمیل جوار حرم میں ہوئی ہے جس سے زیادہ کوئی دوسری جگہ مقدس و محترم نہیں ہو سکتی۔ ہم کسی دوسرے مقام میں اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اہل عرب بالعموم اپنے معاہدات اپنے معبدوں اور استھانوں کے سامنے کرتے تھے تاکہ فریقین کے اندر معاہدات کے احترام کا جذبہ پیدا ہو۔

معاہدۂ حدیبیہ کی پابندی کی ہدایت

فرمایا کہ 'فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَهُمْ'، یعنی جب تک قریش اس معاہدے پر قائم رہیں تم بھی اس پر قائم رہو۔ اگر وہ اس کو توڑ دیں تم بھی اس کو توڑ دو۔ کوئی معاہدہ یک طرفہ قائم نہیں رہتا۔

دونوں پارٹیاں مل کر اس کو قائم رکھتی ہیں۔ یہی تقاضائے عدل ہے اور اسلام اسی کا تمہیں حکم دیتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ ایسے ہی عدل پسندوں کو دوست رکھتا ہے۔

معاہدات سے متعلق تین باتیں

اوپر کی آیات سے اس وقت تک کے ان تمام معاہدات کے بارے میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کی مختلف پارٹیوں کے درمیان طے پائے تھے تین باتیں واضح ہوئیں۔

۱۔ جن مشرکین نے اپنے معاہدات کی خلاف ورزیاں کی تھیں ان سے اعلان براءت اور چار ماہ کی مہلت کے بعد ان سے جنگ۔

۲۔ جنھوں نے اپنے معاہدات پوری وفاداری سے نباہے تھے اور ان کے معاہدات موقت تھے، اختتام مدت کے بعد یہ معاہدات بھی ختم۔

معاہدۂ حدیبیہ کی خاص نوعیت

۳۔ معاہدۂ حدیبیہ کو اس وقت تک قائم رکھنے کی ہدایت جب تک قریش اس کو قائم رکھیں۔ یہ یاد رہے کہ معاہدۂ حدیبیہ غیر موقت تھا اور ان آیات کے نزول کے وقت تک معلوم ہوتا ہے قریش لشتم پشتم اس کو نباہ رہے تھے اس وجہ سے قدرتی طور پر اس کے متعلق بہت سے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ چار ماہ کی مذکورہ مدت گزرنے کے بعد اس کا کیا انجام ہوگا؟ یہ اسی سوال کا جواب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی دوران میں قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بنی خزاعہ کے خلاف اپنے حلیف بنی بکر کی مدد کر کے اس معاہدہ کی بھی خلاف ورزی کی جس کے نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی کی اور اس کو فتح کر لیا۔

اِشْتَرَوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۹-۱۱)

اعلان براءت کے وجوہ کی مزید وضاحت

یہ اعلان براءت کے وجوہ کی مزید وضاحت ہے کہ ان مشرکین کا معاملہ خالق اور خلق کسی کے ساتھ بھی درست نہیں۔ ان کے لیے اللہ کی ہدایت اتری تو انھوں نے اس کے مقابل میں اس دنیا کی متاع حقیر کو ترجیح دی، خود بھی اس سے منہ موڑا اور دوسروں کو بھی، جن پر ان کا بس چلا، اس سے روکا۔ خلق کے ساتھ ان کے معاملے کی نوعیت یہ ہے کہ کسی مسلمان کے معاملے میں ان کو نہ رحم اور قرابت کا پاس ہے نہ عہد و ذمہ کا۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ یعنی حقوق تلف کرنے اور حدود توڑنے میں انہی نے سبقت کی ہے تو ایسے بدعہدوں اور ایسے ظالموں کے ساتھ اللہ و رسول کا کوئی عہد کیسے رہ سکتا ہے۔ اب ان کے لیے بس یہی راہ ہے کہ توبہ کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں تو تمھارے دینی بھائی بن جائیں گے۔ وَنُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ میں فی الجملہ تنبیہ کا مضمون ہے مسلمانوں اور کفار دونوں کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جاننا اور سمجھنا چاہیں ان کے لیے اس باب میں اللہ کے احکام کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔ کوئی ابہام باقی نہیں رہا ہے۔ اب اگر مسلمانوں میں سے کسی نے ان مشرکین کے ساتھ اس سے الگ ہو کر کوئی معاملہ کرنا چاہا تو اس کی ذمہ داری

خود اسی پر ہے، اسی طرح مشرکین میں سے اگر کسی نے اس سے کچھ الگ امید باندھی تو اس کی ذمہ داری بھی خود اسی پر ہے۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۲ - ۱۵)

قریش کے باب میں ہدایات

'وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ' یہ اوپر آیت ۷ سے متعلق ہے۔ وہاں فرمایا تھا کہ جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا ہے جب تک یہ لوگ اس پر قائم رہیں تم بھی اس پر قائم رہو۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر قریش بھی اپنا معاہدہ توڑ دیں تو تم ان ائمۂ کفر سے بھی لڑو۔ 'ائمۂ کفر' کا اطلاق عرب میں ظاہر ہے کہ قریش کے سوا کسی اور پر نہیں ہو سکتا تھا۔ دین کے معاملہ میں سارا عرب انہی کے تابع تھا۔ پیشوائی اور سرداری کا مقام انہی کو حاصل تھا۔ قریش کے لیے اس لقب کے استعمال میں ان کے خلاف جہاد کی ایک مضبوط دلیل بھی ہے کہ سارے کفر کے امام و سرغنہ جب یہ ہیں تو ان سے نہ لڑو گے تو کس سے لڑو گے۔ اسلام کے خلاف طعن و طنز اور استخفاف و استہزا کے جتنے تیر و نشتر اور جتنے پروپیگنڈے اور اشتلے ایجاد ہوتے تھے سب انہی کے کارخانے میں ڈھلتے تھے، پھر انہی سے دوسروں میں پھیلتے تھے۔ اسی چیز کی طرف 'وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ' میں اشارہ ہے۔

'اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ' بطور جملہ معترضہ ہے اور 'لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ' اصل سلسلۂ کلام سے مربوط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے عہد و پیمان کا کوئی وزن نہیں۔ یہ زیادہ دیر اس کو نباہ نہ سکیں گے۔ آج نہیں تو کل یہ اس کو توڑ دیں گے تو جب بھی اس کو توڑ دیں تم ان سے جنگ کرو تاکہ یہ اپنی شرارتوں سے باز آئیں۔ ان کے باز آنے کا مفہوم وہی ہے جو اوپر کی آیات سے واضح ہو چکا ہے کہ توبہ کریں اور اسلام لائیں۔

نقض عہد کے بعد قریش سے قتال کی ہدایت

'اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ' یہ قریش کے خلاف مسلمانوں کو جنگ پر ابھارا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ آیت کچھ فصل سے نازل ہوئی ہے۔ اوپر والی آیت میں تو 'وَاِنْ نَّكَثُوْٓا' کے الفاظ تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی معاہدہ کم از کم رسمی طور پر باقی تھا لیکن اس آیت میں 'نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں جو بتاتے ہیں کہ انھوں نے معاہدہ توڑ دیا۔ اس معاہدہ کے توڑنے کی شکل، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہوئی کہ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیفوں کے خلاف اپنے حلیفوں کی مدد کی۔

قریش کے جرائم

'وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ' نقض عہد کے جرم کے ساتھ ان کے بعض پچھلے جرائم کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔

خاص طور پر ان جرائم کی طرف جو انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف کیے۔ ان میں سب سے زیادہ سنگین جرم اللہ کے رسول کو جلاوطن کرنے کا جرم تھا۔ یہ جرم ایک ایسا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب پر، جیسا کہ پچھلی سورتوں میں وضاحت ہو چکی ہے، فیصلہ کن عذاب آجایا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ سنت الٰہی کے مطابق عذاب کے مستحق ہیں، کیا تم ان سے جنگ کرنے سے جی چراؤ گے؟ اس جرم کا ذکر 'هَمُّوا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ' کے الفاظ سے فرمایا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا اصل جرم یہ ہے کہ انھوں نے رسول کے جلاوطن کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ جسارت ہی بجائے خود ایک جرم عظیم ہے۔ رہا رسول کا نکلنا تو وہ تمام تر اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی حکمت و مشیت کے تحت ہوتا ہے۔ 'وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ' یعنی صرف رسول کے جلاوطن کرنے کی جسارت ہی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے بعد جنگ چھیڑنے میں بھی پہل انہی نے کی۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے جس پر تفصیلی بحث انفال میں گزر چکی ہے۔ ان الفاظ سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے جو ہم پیچھے واضح کر چکے ہیں کہ جنگ بدر کے لیے پیش قدمی تمام تر قریش کی طرف سے ہوئی۔ قافلۂ تجارت کی حفاظت کا انھوں نے محض ایک بہانہ پیدا کیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مذکورہ جرائم اصلاً قریش ہی کے جرائم تھے اس وجہ سے ان آیات کا تعلق قریش ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو پیچھے ہم نے اس سورہ کے زمانۂ نزول سے متعلق ظاہر کیا ہے۔

کمزور قسم کے مسلمانوں کو تنبیہ

'اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ' خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن خاص طور پر کمزوروں اور منافق قسم کے لوگوں کی طرف ہے۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں اور آگے تفصیل آرہی ہے، قریش کے ساتھ جنگ کے معاملے میں بہت ہراساں تھے اور اس کی وجہ جنگ سے زیادہ یہ تھی کہ یہ لوگ اپنے پچھلے تعلقات و روابط کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان کے دل کسی طرح اس بات پر راضی نہیں ہوتے تھے کہ یہ تعلقات یک قلم ختم ہو کے رہ جائیں۔ فرمایا کہ تم ان لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ ڈرنے کا زیادہ حق دار اللہ ہے۔ اگر ایمان کے مدعی ہو تو تمھیں دوسروں کے تعلقات سے زیادہ اپنے اس تعلق کا اہتمام ہونا چاہیے جو تم اللہ سے رکھنے کا دعویٰ کرتے ہو۔

مقابلے میں دشمن کی رسوائی کی بشارت

'قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ' یہ مسلمانوں کی عموماً اور کمزور مسلمانوں کی خصوصاً حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ تم ان ائمہ کفر سے جنگ کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے تمھارے ہاتھوں ان کو عذاب دینے اور ان کو رسوا کرنے کا فیصلہ فرما لیا ہے۔ ہم پیچھے اس سنت الٰہی کا ذکر کر چکے ہیں کہ جو قوم اپنے رسول کی تکذیب پر اڑ جاتی ہے، رسول کی ہجرت کے بعد اس پر لازماً عذاب آجاتا ہے۔ اگر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے تو یہ عذاب براہ راست خدا کی طرف سے آتا ہے۔ اور اگر ایمان لانے والوں کی تعداد معتدبہ ہوتی ہے تو پھر انہی اہل ایمان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ

اس قوم کو عذاب دیتا اور ان کو رسوا کرتا ہے۔ یہ رسوائی بھی اس عذاب کا خاص حصہ ہوتی ہے، اس لیے کہ تکذیبِ رسول کا اصل محرک، جیسا کہ اپنے مقام میں واضح ہو چکا ہے، استکبار ہے اور استکبار کی سزا رسوائی ہے۔

منظلوم مسلمانوں کی دلداری

وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ، میں ان مسلمانوں کی دلداری ہے جو بےبس و بےکس ہونے کے سبب سے قریش کے شریروں اور سنگ دلوں کے ہاتھوں مکہ میں سنگ دلانہ مظالم کے ہدف بنے تھے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں ان سنگ دلوں کو اس طرح ذلیل و خوار کرے گا کہ ان کے اس عبرت انگیز انجام کو دیکھ کر ان لوگوں کے کلیجے ٹھنڈے ہو جائیں گے جو اسلام لانے کے جرم میں ان اشقیاء کے ہاتھوں ستائے گئے تھے۔ یہ امر بیان ملحوظ رہے کہ اعدائے حق کے خلاف دل میں غم و غصہ کا پایا جانا اور ان کی بربادی پر خوش ہونا ان لوگوں کے لیے بالکل روا ہے جو ان پر حق کی حجت تمام کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہوں۔

اپنے اعزہ و اقارب کے ایمان کے آرزومند مسلمانوں کے لیے بشارت

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ، میں ایک لطیف اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ان لوگوں کے اندر سے ابھی کچھ لوگوں کو توبہ کی توفیق نصیب ہوگی اور وہ ایمان سے مشرف ہوں گے۔ یہ ایک قسم کی خوش خبری ہے ان مسلمانوں کے لیے جو اپنے عزیزوں اور قریبوں کے ایمان کے آرزومند تھے۔ فرمایا کہ مطمئن رہو۔ اگر اس گھورے میں رلے ملے کچھ اور جواہر ریزے بھی ہوئے تو اللہ ان کو بھی چن لے گا۔ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ اور وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ سے اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ فرما دیا ہے جو توفیق توبہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کی وضاحت اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِن دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۶)

وَلِيجَةً، بطانة الانسان و خاصة او من يتخذه معتمدا عليه من غير اهله۔ یعنی محرم راز، دوست اور معتمد۔

اعلان براءت مومنین کی تطہیر کے لیے ایک

اوپر ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ ہر چند یہاں خطاب باعتبار الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن ان مسلمانوں ہی کی طرف ہے جو ابھی اپنے سابق روابط و تعلقات کے بندھنوں سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے ان کے لیے یہ اعلان براءت ایک سخت آزمائش بن گیا۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ اعلان ایک کسوٹی ہے جو تمہارے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کر دے گی کہ کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور ایسے بےلاگ ہیں کہ انھیں اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی کی دوستی اور قرابت کی کوئی پروا نہیں ہے اور کون لوگ دوسروں کی خاطر اللہ و رسول اور اہلِ ایمان کو نظر انداز کر دینے والے ہیں۔ یہ امتحان

ایک سنتِ الٰہی ہے جس سے ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو لازماً گزرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے لیکن اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ امتحان کی کسوٹی پر پرکھ کے غث وسمین کو نمایاں اور اہلِ ایمان کی تطہیر کرتا رہتا ہے۔ اگر تمہارا گمان یہ تھا کہ تم ایمان کا دعویٰ کر کے یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے تو یہ خیال غلط تھا۔ اب تمہاری جانچ کا مرحلہ آ گیا کہ تم میں کون اللہ و رسول اور اہلِ ایمان کا وفادار ہے اور کون محض جھوٹا مدعی ہے۔

اہلِ ایمان کا دشمن اللہ و رسول کا دشمن ہے۔

یہاں یہ بات خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کا ذکر ایک ہی ساتھ ہوا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اس میں تقسیم کی گنجائش نہیں ہے۔ جو شخص اللہ کا وفادار ہونے کا مدعی ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اس کے رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کا بھی اپنے آپ کو وفادار ثابت کرے۔ اگر کوئی شخص اہلِ ایمان کے مقابل میں کسی اور کو اپنا دوست اور معتمد بناتا ہے تو وہ خدا اور رسول کا بھی ساتھی نہیں ہے اگرچہ وہ کتنی ہی بلند آہنگی سے اس کا دعویٰ کرے۔ یہ مضمون نہایت وضاحت سے آگے آیات ۲۲-۲۴ میں بھی آ رہا ہے۔

لفظ 'علم' 'یعلم' کے مفہوم پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ (۱۷-۲۲)

جزوی نیکی اصل مقصود کی قائم مقام نہیں ہو سکتی

اوپر کے پیرے میں مشرکینِ قریش کے ان جرائم کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جو ان کو اعلانِ برأت اور جنگ کا سزاوار قرار دیتے ہیں۔ اب یہ تولیتِ بیت اللہ کے سلسلہ میں ان کی بعض خدمات کا حوالہ دے کر یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ ان کی یہ خدمات بالکل بے حقیقت اور بے وزن ہیں۔ ان کی بنیاد پر یہ ہرگز اس بات کے سزاوار نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی رعایت کی جائے۔ کوئی خدمت اور نیکی اس وقت معتبر ہوتی ہے جب وہ اصل مقصود کے تحفظ کے ساتھ ہو۔ اگر اصل مقصد برباد ہو جائے تو کوئی جزوی نیکی اصل مقصود کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ ایک مسجد کا متولی اگر مسجد کو بت خانہ بنا دے تو محض اس بنا پر وہ کسی کریڈٹ کا سزاوار نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس نے مسجد میں پانی اور لوٹے کا انتظام کر رکھا ہے۔ مسجد میں پانی اور لوٹے

کا انتظام بجائے خود ایک اچھا کام ہے۔ لیکن ایسا کام نہیں ہے کہ اس کی خاطر کسی کے اس حق کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ مسجد کو بت خانہ بنائے رکھے اور اس کا متولی بنا رہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قریش بھی اپنی ان خدمات پر نازاں تھے اور ان کے دوسرے ہمدرد بھی ان کے ان کاموں کو قابلِ لحاظ سمجھتے تھے۔ خاص طور پر جب ان کے خلاف اعلانِ جنگ ہوا تو وہ مسلمان بھی، جو ابھی اچھی طرح یکسو نہیں ہوئے تھے، یہ سوچنے لگ گئے کہ یہ لوگ خانہ کعبہ کے متولی ہیں، اس کی خدمت کرتے ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اس وجہ سے یہ رعایت کے حق دار ہیں، ان کے ساتھ اتنا سخت معاملہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے آگے یہ دوٹوک فیصلہ رکھ دیا جائے کہ اسلام قبول کریں یا تلوار۔ یہ ذہنیت ایک فاسد ذہنیت تھی جو ایک طرف تو مکذبینِ رسول کے لیے ایک عذر فراہم کرتی تھی، دوسری طرف اس سے ایک نہایت مکروہ قسم کے نفاق کے پرورش پانے کا امکان تھا اس وجہ سے قرآن نے اس فساد کی اصلاح کی تاکہ ایک غلط تصورِ دین مسلمانوں کے اندر جڑ نہ پکڑنے پائے۔

'مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ'

قریش کی تولیت بیت اللہ سے معزولی

"عَمَرَ يَعْمُرُ" مکان بنانے، کسی زمین کو آباد کرنے، کسی گھر کو بسانے اور اس کا انتظام کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

'مشرکین' کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن یہاں اس عام سے مراد قریش ہیں جو بیت اللہ کی تولیت کے مدعی تھے۔ نام کی بجائے وصف سے ان کے ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ یہ حکم عام ہو جائے اور اس کی علت بھی واضح ہو جائے۔

'مَسٰجِدَ اللّٰهِ' سے مراد اگرچہ مسجد حرام ہی ہے، چنانچہ آیت ۱۹ میں اس کی وضاحت بھی ہو گئی ہے لیکن اس کو جمع کے لفظ سے تعبیر فرمایا اس لیے کہ مسجد حرام کا معاملہ تنہا مسجد حرام ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ تمام مساجدِ الٰہی کا معاملہ ہے۔ یہی تمام مساجد کی اصل، سب کا مرکز و محور اور سب کا قبلہ ہے۔ اس کے انتظام و انصرام، اس کے مقصد اور اس کی دعوت میں کوئی فساد پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام ہدایت و سعادت اور ساری خیر و برکت کا مرکز ہی درہم برہم ہو گیا۔

فرمایا کہ مشرکین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسجد حرام کے، جو تمام مساجدِ الٰہی کا مرکز اور قبلہ ہے، منتظم بنے رہیں جب کہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ کفر سے مراد یہاں ان کا شرک ہی ہے۔ شرک کو کفر سے تعبیر کر کے دین کی یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا بالکل اس کے نہ ماننے کے ہم معنی ہے۔ خدا کا ماننا صرف وہ معتبر ہے جو توحید کے ساتھ ہو بالخصوص اس شرک کے ساتھ تو ایمان باللہ کے جمع ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے جس کا کھلم کھلا اقرار و اظہار ہو۔ مشرکینِ عرب کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کے ہاں شرک کی نوعیت یہ نہیں تھی کہ ان کے کسی قول یا عمل سے شرک ایک لازمی

نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتا ہو بلکہ شرک کو بطور دین اور عقیدہ کے انھوں نے اختیار کیا تھا۔ یہ ان کے تصورِ الوہیت کا ایک غیر منفک حصہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس کفر کے علم بردار ہوں ان کو یہ حق کسی طرح نہیں پہنچتا کہ وہ اس گھر کی تولیت پر، جو دنیا میں توحید اور خالص خدا پرستی کا سب سے پہلا گھر اور تمام مساجد الٰہی کا قبلہ ہے، قابض رہیں۔ ان کا اس گھر کا متنظم بنے رہنا کوئی نیکی نہیں ہے جو ان کے حق میں سفارش بنے بلکہ ایک بہت بڑی بدی ہے جس سے اس گھر کو پاک کرنا اہلِ ایمان کا اولین فریضہ ہے۔

شرک کے ساتھ ہر نیکی برباد

'اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ وَفِی النَّارِ ھُمْ خٰلِدُوْنَ' 'اعمال' سے یہاں ان کے وہی اعمال مراد ہیں جن کو لوگ نیکی اور خدمت دین کے کام شمار کرتے تھے۔ فرمایا کہ ان کے یہ سارے اعمال ڈھے جائیں گے اور یہ لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ شرک کے ساتھ کوئی نیکی بھی نیکی نہیں رہ جاتی۔ خدا کے ہاں صرف وہی نیکی باقی رہتی ہے جو توحید کے ساتھ ہو۔ مذہبی صحیفوں میں مشرک کو زانیہ عورت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح ایک عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ سارا چاؤ پیار بیکار ہے اگر وہ بدکار ہے اسی طرح بندے کا سارا کیا دھرا برباد ہے اگر وہ اپنے رب کا کسی کو شریک ٹھہراتا ہے۔

مساجد الٰہی کی تولیت کے اصلی حق دار

'اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ' اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ بیت اللہ اور مساجد الٰہی کی تولیت کے اصل حق دار کون لوگ ہیں۔ فرمایا کہ صرف وہ لوگ اس کے حق دار ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، جو نماز قائم کریں اور جو زکوٰۃ ادا کریں۔ ظاہر ہے ان تمام صفات کے حامل اگر تھے تو مسلمان تھے نہ کہ مشرکین۔ لیکن مسلمانوں کا نام لینے کے بجائے صرف ان صفات کا ذکر فرمایا جو منصب تولیت کے لیے بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتی تھیں تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو جائے کہ یہ منصب کسی گروہ یا خاندان کا اجارہ نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر چند صفات اور فرائض کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر یہ صفات مفقود ہوں تو کوئی گروہ اس منصب کا دعوے دار نہیں ہو سکتا۔ 'وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ' شرک کی نفی کے لیے ہے یعنی ان کے اندر کسی غیر اللہ کا خوف نہ پایا جاتا ہو۔ ظاہر ہے یہاں خوف سے مراد وہ خوف ہے جو کسی غیر اللہ کو بذاتِ خود نافع و ضار ماننے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ خوف شرک ہے۔ یہاں شرک کی نفی اس کے اصل محرک کی نفی سے کی ہے۔ ہم اپنی کتاب "حقیقت شرک" میں یہ بات وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ شرک کا اصل سبب یہ خوف ہی ہوتا ہے۔

فائز المرام گروہ

'فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ' 'اہتداء' کا لفظ یہاں ہدایت منزل کے مفہوم میں ہے۔ یعنی جو مذکورہ صفات کے حامل ہوں گے انھی کے باب میں یہ توقع ہے کہ وہ منزل پر پہنچیں اور بامراد و فائز المرام ہوں۔ لفظ کے اس مفہوم کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ اس بات کو 'عَسٰی' کے لفظ سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے۔ اس میں قدم قدم

پر مشکلات اور آزمائشیں ہیں۔ صرف وہی لوگ جادۂ مستقیم پر استوار رہ سکتے ہیں جن کے پاس توفیقِ الٰہی کا زادِ راہ ہو اور جن کو خدا سے استعانت کا سہارا حاصل ہو۔

مشرکین کی خدمتِ بیت اللہ بے ثمر

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، 'كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ' میں مضاف محذوف ہے جس طرح 'وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ' میں محذوف ہے۔ مخاطب وہی لوگ ہیں جو حرم کی تولیت اور اس سے متعلق بعض خدمات، مثلاً حجاج کے لیے پانی کے انتظام کی خدمت، کی بنا پر مشرکین قریش کو دوسروں کے مقابل میں ایک امتیاز کا درجہ دے کر ان کو مستحق رعایت خیال کرتے تھے۔ فرمایا کیا حاجیوں کو پانی پلا دینا اور مسجدِ حرام کا انتظام کر دینا ایمان باللہ والآخرۃ اور جہاد فی سبیل اللہ کا قائم مقام ہو سکتا ہے؟ 'لَا يَسْتَوُونَ عِندَ اللَّهِ' اگر تم ان کاموں کو یکساں سمجھتے ہو تو سمجھو لیکن خدا کے ہاں یہ دونوں قسم کے لوگ یکساں نہیں ہوں گے۔ 'وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ' خدا ان مشرکوں کو بامراد نہیں کرے گا۔ ظلم سے مراد یہاں شرک ہے اور 'ہدایت' سے مراد مطلوب و مقصود کی ہدایت ہے۔ اور ہم واضح کر چکے ہیں کہ شرک کے ساتھ جو کام نیکی کے کیے جاتے ہیں وہ نقش برآب ہوتے ہیں۔ خدا کے ہاں وہ بالکل لاحاصل ہو کر رہ جائیں گے اور ان کی بنا پر جو امیدیں باندھی جائیں گی ان سب کا نتیجہ نامرادی کی شکل میں نکلے گا۔

فائز المرام صرف اہلِ ایمان ہوں گے

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً 'أَعْظَمُ دَرَجَةً' یہاں تقابل کے لیے نہیں بلکہ تفخیمِ شان کے لیے ہے۔ یعنی ایمان، ہجرت اور جہاد والوں کا مرتبہ اللہ کے ہاں بہت اونچا ہے۔ جس طرح سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے 'وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ' ۲۱۲ (جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے قیامت کے دن ان پر بالا ہوں گے) اس اسلوب میں یہاں اہلِ ایمان کے درجے کی عظمت کفار کے درجے سے قطع نظر کر کے بتائی گئی ہے۔ کفار کا جو حال ہوگا وہ 'أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ' سے واضح ہو ہی چکا ہے 'وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ' بالکل 'وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ' کے مقابل میں ہے یعنی کفار و مشرکین تو آخرت میں بالکل نامراد رہیں گے البتہ اہلِ ایمان فائز المرام اور بامراد ہوں گے۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۔ یہ اوپر والے ٹکڑے 'وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ' کی تفسیر ہے کہ ان کو ان کے ایمان اور ہجرت و جہاد کے صلہ میں ان کے رب کی طرف سے رحمت، رضوان اور ابدی نعمت کے باغوں کی بشارت ہے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ دنیا کی نعمتوں کی طرح ان نعمتوں کے لیے زوال نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ

عَلَى الْإِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰي يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۲۳ - ۲۴)

سچے اہل ایمان کی صفات

اوپر آیت ۱۶ میں یہ مضمون گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں کرتا کہ اہل ایمان کے اندر وہ لوگ بھی رلے ملے رہیں جو ایمان کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں اور کفار و مشرکین سے دوستی بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے صرف وہی لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جہاد کریں اور اللہ و رسولؐ اور اہل ایمان کے مقابل میں کسی اور کو اپنا دوست اور معتمد نہ بنائیں۔ اب یہ اسی مضمون کو دوسرے اسلوب سے نہایت واضح اور فیصلہ کن لب و لہجہ میں، تمام مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا ہے تاکہ ہر شخص اپنی راہ اور اپنی منزل کا انتخاب کر لے۔

فرمایا کہ تمہارے درمیان تعلق، دوستی اور اعتماد کی بنیاد نسب اور خاندان پر نہیں بلکہ ایمان پر ہے۔ اگر تم میں سے کسی کے باپ اور بھائی ایمان پر کفر کو ترجیح دیں تو تم ان کو اپنا معتمد اور دوست نہ بناؤ۔ جو ایسا کرے گا تو یاد رکھے کہ وہ خود اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا بنے گا فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی اس کے نتیجہ میں جو وبال اس پر دنیا اور آخرت دونوں میں آئے گا اس کی ذمہ داری خود اسی پر ہوگی۔ اس میں کسی دوسرے کی کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ الایۃ نہایت فیصلہ کن انداز میں اس باب کی آخری تنبیہ ہے انسان کی تمام محبوبات میں سے ایک ایک چیز کو گنا کر فرمایا کہ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی کسی کو اللہ اور رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز و محبوب ہے تو وہ اللہ کے فیصلے کا انتظار کرے۔

اللہ و رسول کے محبوب رکھنے کا مطلب

کسی چیز کا اللہ اور رسولؐ سے زیادہ عزیز و محبوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے سامنے جب دو بالکل متضاد مطالبے آئیں، ایک طرف اللہ و رسولؐ کا مطالبہ ہو، دوسری طرف مذکورہ چیزوں میں کسی چیز کی محبت کا مطالبہ اور آدمی خدا اور رسولؐ کے مطالبے کو نظر انداز کر کے دوسری چیز کے مطالبہ کو ترجیح دے دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ اور رسولؐ سے زیادہ اس کو وہ چیز محبوب ہے اور اگر اس کے برعکس وہ اس چیز کے مطالبہ پر اللہ و رسولؐ کے مطالبہ کو مقدم رکھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اللہ و رسولؐ کی محبت کو ترجیح دی۔ اللہ و رسول سے یہ محبت ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اس کے بغیر کسی کا دعوائے ایمان معتبر نہیں ہے اور یہ محبت ہی کے جانچنے کے لیے ایک ایسی کسوٹی ہے جس سے ہر شخص اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنے ایمان اور اپنی محبت کو جانچ سکتا ہے۔

مرغوباتِ نفس اور ایمان کا تقاضا

یہاں جن محبوبات و مرغوبات کی فہرست گنائی ہے ان میں نہایت لطیف نفسیاتی ترتیب ہے جو بجائے خود واضح ہے۔ پہلے باپ، بیٹے، بھائی، بیوی اور خاندان کو لیا ہے جن کی محبت یا عصبیت آدمی کے لیے حق کی راہ میں حجاب اور آزمائش بنتی ہے پھر اموال، کاروبار اور مکانات کا ذکر کیا ہے جو اصلاً مذکورہ متعلقین ہی کے تعلق سے مطلوب و مرغوب ہوتے ہیں اور آدمی صاحبِ توفیق نہ ہو تو اس کے لیے یہ فتنہ بن جاتے ہیں۔ اموال کے ساتھ 'اقترفتموھا' کی قید ہے۔ 'اقتراف' کے معنی اکتساب کے ہیں یہ قید اس مال کے محبوب ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جس مال کو آدمی نے خود کمایا اور بڑھایا ہو وہ اس کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اسی طرح 'تجارت' کے ساتھ 'تخشون کسادھا' کی قید اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ وہ تجارت کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہے اس لیے کہ کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہی وہ چیز ہے جس کے متعلق تاجر کو ہر وقت یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ اس پر کساد بازاری کا جھونکا نہ آ جائے اور اس خطرے سے اس کو بچائے رکھنے کے لیے وہ سارے جتن کرتا ہے یہاں تک کہ وہی اس کی معبود بن جاتی ہے۔ پھر نہ تو اسے حلال و حرام کی تمیز باقی رہ جاتی ہے اور نہ ہجرت، جہاد اور اللہ کی راہ میں قطع علائق کی آزمائشیں اسے گوارا ہوتی ہیں۔ فرمایا کہ ان میں سے ہر چیز ایک بت ہے اور جب تک بندہ اللہ کی خاطر ان میں سے ہر بت کو توڑنے کے لیے تیار نہ ہو جائے وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

جھوٹے مدعیانِ ایمان کا انجام

'فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ' دھمکی ہے اور نہایت سخت دھمکی۔ اس کے ابہام کے اندر بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ اوپر مکذبین رسول کا انجام بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو انجام مکذبین رسول کے لیے مقدر ہو چکا ہے اسی انجام بد سے دوچار ہونے کے لیے وہ مدعیان ایمان بھی تیار رہیں جو کفر اور ایمان دونوں کی کشتی پر بیک وقت سوار رہنا چاہتے ہیں۔

'وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ' جس طرح اوپر مشرکین کی بابت فرمایا تھا کہ 'وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' اللہ مشرکوں کو بامراد نہیں کرے گا اسی طرح یہاں کفر و اسلام دونوں کے درمیان ڈانواڈول لوگوں کی بابت ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کے فاسقوں کو بامراد نہیں کرے گا۔ 'فسق' کا لفظ خروج عن الایمان کے مفہوم میں ہے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ اللہ و رسول کے مقابل میں اہل کفر کو اپنا دوست اور معتمد بناتے ہیں وہ ایمان کے دعوے کے باوجود ایمان سے نکل جاتے ہیں۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۲۵-۲۷)

کمزوروں کی ہمت افزائی

'لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ' یہ بات انہی مذبذبین کی ہمت افزائی کے لیے فرمائی گئی ہے

کہ ان سے جنگ کرنے میں ہچکچاؤ نہیں، جس خدا نے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد فرمائی ہے اس کی مدد اب بھی تمھارے شامل حال ہے۔ ہجرت کے بعد سے فتح مکہ تک متعدد جنگیں مشرکین کے ساتھ ہو چکی تھیں جن میں سے ایک آدھ کے سوا سب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عنایت فرمائی۔ اب ان سب کا حوالہ دے کر فرمایا کہ جس خدا کی نصرت ہمیشہ تمھارے ہم رکاب رہی ہے اس پر بھروسہ رکھو، وہ تمھیں اپنی مدد سے محروم نہیں کرے گا۔

غزوۂ حنین کی مثال سے کمزوروں کی ہمت افزائی

'وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا' یہ ایک شبہ کا، جو مذکورہ وعدۂ نصرت سے متعلق کمزور ذہنوں میں پیدا ہو سکتا تھا، برسر موقع ازالہ ہے۔ اس سے کچھ ہی پہلے جنگ حنین میں مسلمانوں کو اول اول شکست کی افتاد سے سابقہ پیش آ چکا تھا۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس حادثہ کی اصلی نوعیت واضح کر دی جائے۔ فرمایا کہ حنین کے دن بھی اللہ نے تمھاری مدد فرمائی البتہ یہ ہوا کہ شروع شروع میں تمھاری کثرت تعداد نے تمھارے اندر غلط قسم کی خود اعتمادی اور بے پروائی پیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمھیں شکست سے سابقہ پیش آیا اور تم میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور مومنین مخلصین پر عزم و حوصلہ اتارا اور تمھاری مدد کے لیے اپنی غیبی فوجیں بھیجیں اور کفار کو تمھارے ہاتھوں پامال کروا دیا۔

غزوۂ حنین میں ابتدائی شکست کی وجہ

مطلب یہ کہ فتح تو اللہ نے تمھیں اس جنگ میں بھی دی البتہ تمھاری غلطی پر تمھیں تنبیہ کرنے کے بعد دی۔ غزوۂ حنین میں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا لشکر ۱۲ ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا۔ مسلمان اس سے پہلے بارہا قلیل تعداد اور معمولی اسلحہ سے کفار کی بڑی بڑی فوجوں کو شکست دے چکے تھے۔ وہ جب پہلی بار ایک لشکر جرار کی شکل میں نکلے تو یہ خیال تو ان کے دل میں پیدا ہونا ہی تھا کہ بھلا آج ہمارے مقابل میں کون ٹک سکتا ہے؟ اس غلط خود اعتمادی سے قدرتی طور پر ان کے اندر بے پروائی پیدا ہو گئی۔ بہتوں کے اندر نہ اللہ کی طرف وہ توجہ ہی باقی رہ گئی جس کی ہدایت سورۂ انفال کی آیت ۴۵ میں فرمائی گئی تھی کہ اِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (جب تمھارا کسی گروہ سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ کامیابی حاصل کرو) اور نہ نظم اور ڈسپلن، اطاعت اور اخلاص و انابت کا وہ اہتمام ہی باقی رہا جس کی تاکید آیت ۴۶-۴۷ میں فرمائی گئی ہے أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ (اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اختلاف رائے نہ پیدا ہونے دو ورنہ ہمت ہار بیٹھو گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی، ثابت قدم رہو کیونکہ اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے اور ان لوگوں کی مانند نہ ہونا جو اپنے گھروں سے اتراتے اور نمائش کرتے نکلے) اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح پیغمبر کی حکم عدولی اور تنازع فی الامر نے احد میں

شکست سے دوچار کیا اسی طرح کثرت تعداد کے عجب وغرور نے حنین میں خطرے سے دوچار کیا اس لیے کہ اس غرے میں اس بطر و ریا کی جھلک تھی جو اللہ کو ناپسند ہے اور جس سے اس نے اپنی راہ میں جہاد کے لیے نکلنے والوں کو روکا ہے۔ اس قسم کا غرہ آدمی کا اعتماد اللہ کے بجائے اسباب و وسائل پر جما دیتا ہے درآنحالیکہ مومن کا اعتماد ہر حال میں اللہ ہی پر ہونا چاہیے۔ اگر اللہ کا بھروسہ کمزور ہو جائے تو بڑی سے بڑی تعداد اور زیادہ سے زیادہ اسباب و وسائل سب خس و خاشاک بن کے رہ جاتے ہیں اور جن لوگوں کو یہ گھمنڈ ہوتا ہے کہ کوئی ہمارے مقابل میں ٹک نہیں سکتا ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ زمین اپنی تمام وسعتوں اور پہنائیوں کے باوجود ان پر اس طرح تنگ ہو جاتی ہے کہ انھیں کوئی راہ فرار سجھائی نہیں دیتی۔ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ میں اسی صورت حال کی تصویر ہے۔

غزوۂ حنین میں شکست کے بعد فتح

ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ اسلوب بیان اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا محض بطور تنبیہ و تذکیر پیش آیا۔ اس تنبیہ کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم جما دیے اور وہ اس طرح کہ اس نے اپنے پیغمبر اور اس کے مخلص جاں نثاروں پر سکینت نازل فرمائی اور ان کی سکینت دوسروں کے اندر سکینت پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ اس جنگ کے جو حالات سیرت و مغازی کی کتابوں میں مذکور ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فوج میں بھگدڑ مچ گئی تو صرف سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑے سے جاں نثاروں کے ساتھ اپنی جگہ پر جمے رہے۔ بالآخر آپ ہی کی عزیمت و استقامت نے دوسروں کے اندر روح پھونکی اور منتشر شیرازہ ازسرنو مجتمع ہوا اور اللہ نے شکست کے بعد فتح سے نوازا اور مومنین کے ہاتھوں کفار کو وہ سزا ملی جو ان کے لیے مقدر ہو چکی تھی۔ 'سکینت' سے مراد جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، قرار، عزم اور حوصلہ ہے۔ اور جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا سے اشارہ ملائکہ کی غیبی افواج کی طرف ہے جو ہر جگہ اہل ایمان کی ہم رکاب ہوتی ہیں گو وہ ناسوتی نگاہوں سے نظر نہیں آتیں۔

اپنے کافر عزیزوں کے باب میں تشویش میں مبتلا لوگوں کے لیے بشارت

ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ الآیۃ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان سب واقعات کے بعد بھی اللہ ان لوگوں کو توبہ کی توفیق دے گا جن کے اندر صلاحیت کی کوئی رمق باقی ہے۔ یہ گویا ایک قسم کی بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے کافر عزیزوں کے باب میں تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ مضمون آیت ۵ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہ بشارت نہایت واضح الفاظ میں سورۂ نصر میں بھی وارد ہوئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَاءَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۲۸)

اعلانِ براءت کے سلسلہ کی آخری ہدایات: مشرکین کو مسجد حرام کے پاس آنے کی ممانعت

یہ اس اعلانِ براءت کے سلسلہ کی آخری ہدایت ہے جس کا ذکر شروع سے چلا آرہا ہے۔ فرمایا کہ یہ مشرکین نجس ہیں اس وجہ سے اس سال کے بعد سے یہ مسجد حرام کے پاس پھٹکنے نہ پائیں۔ نجاست سے مراد ظاہر ہے کہ یہاں وہ عقائدی نجاست مراد ہے جس کی تفصیلات دوسرے مقامات میں بیان ہو چکی ہیں۔ فتح مکہ کے بعد بیت اللہ پر سے مشرکین کا تسلط تو ختم ہو چکا تھا لیکن ۹ھ کے حج تک ان کو یہ مہلت حاصل رہی کہ وہ حج کے لیے آتے اور اپنے جاہلی طریقے کے مطابق حج کے مراسم بھی ادا کرتے اور تجارتی خرید و فروخت بھی کرتے لیکن اسی حج کے موقع پر اعلانِ براءت کی عام منادی کے ساتھ ساتھ اس حکم کے بموجب یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ آئندہ سے مشرکین حج کے لیے نہ آئیں۔ یہ گویا حجۃ الوداع کی تیاریوں کی تمہید تھی کہ ۱۰ھ میں جب خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حج ادا فرمائیں تو مرکزِ ابراہیم شرک و کفر کی ہر آلائش سے بالکل پاک ہو۔

تجارتی کساد بازاری کے اندیشے کا ازالہ

وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ الآیۃ 'عیلۃ' کے معنی فقر و مفلسی کے ہیں۔ یہاں یہ معاشی اور تجارتی نقصان کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

ہم دوسرے مقام میں تفصیل سے بیان کر آئے ہیں کہ حج کو جس طرح ایک بہت بڑی مذہبی عبادت کی حیثیت حاصل تھی اسی طرح تجارتی اور کاروباری پہلو سے بھی اس کی بڑی اہمیت تھی۔ اس موسم میں باہر کا مال مکہ میں پہنچتا اور مکہ کی چیزیں باہر کے تاجر خریدتے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کے کاروباری پہلو کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ قریش نے نسئی کا قاعدہ ایجاد کر کے حج کو ایک خاص موسم میں کر دیا تھا تاکہ موسموں کا تغیر تجارتی چہل پہل پر اثر انداز نہ ہو۔ اب اسلام کے دور میں آکر جب یہ اعلان ہوا کہ آئندہ مشرکین حج کے لیے نہیں آسکتے تو ان لوگوں کو تشویش لاحق ہوئی جو کاروباری زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ مشرکین کو روک دینے سے کاروبار اور تجارت پر بڑا اثر پڑے گا جس سے مسلمانوں کی معاشی حالت خراب سے خراب تر ہو جائے گی۔ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے فرمایا کہ معاشی بدحالی کا غم نہ کرو۔ اللہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تمھیں غنی کر دے گا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ وعدہ پورا ہوا اور اس طرح پورا ہوا کہ ایک دن کے لیے بھی مکہ کی تجارت اس بندش سے متاثر نہ ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تو یہ حال ہوا کہ مصر و شام اور روم و ایران کے خزانے بھی اونٹوں پر لدلد کر اسلام کے بیت المال میں پہنچنے لگے اور اللہ نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو اس طرح غنی کر دیا کہ لوگ اپنی زکوٰۃ کا مال مدینہ کی گلیوں میں لیے پھرتے تھے لیکن اس کا کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔

اصل قدرو قیمت ایمانی اقدار کی ہے

إِنْ شَاءَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ چیز بہرحال اللہ ہی کی مشیت پر منحصر ہے اور اللہ کی مشیت اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ تنگی یا کشادگی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں، اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اس وجہ سے اصل بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہیے جس کا ہر کام

علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام میں اصلی قدر و قیمت روحانی و ایمانی اقدار کی ہے۔ سیاسی اور معاشی مصالح ان کے تحت ہیں۔ ایمانی اقدار کے لیے معاشی مصالح قربان کیے جا سکتے ہیں لیکن پیٹ اور زن کے مفاد پر ایمان کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔

۲- آگے کا مضمون ___ آیات ۲۹-۳۵

آگے اہل کتاب ___ یہود و نصاریٰ ___ سے جہاد کا حکم دیا ہے اور اور جس طرح مشرکین کے باب میں ایک واضح اور قطعی پالیسی سامنے رکھ دی ہے اسی طرح ان کے باب میں بھی ایک واضح اور قطعی پالیسی کا اعلان کر دیا ہے کہ اب یہ اسلامی حکومت میں رہنا چاہتے ہیں تو صرف ذمی بن کر رہ سکتے ہیں۔ ان کے نقض عہد اور ان کی سازشوں کی تفصیل انفال میں گزر چکی ہے۔ یہاں بھی ان کے عقائد اور ان کے کردار کے ان پہلوؤں کی طرف بعض اشارات فرما دیے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے اب ان کا وجود نہ صرف ایک ناکارہ وجود ہے بلکہ یہ سزاوار ہیں کہ اپنی کرتوتوں کی سزا بھگتیں ___ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۳۵

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿۲۹﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿۳۰﴾ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۳۱﴾ يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ

ع ۵ / ۱۰

إِلَّآ أَن يُتِمَّ نُورَهُۥ وَلَوْ كَرِهَ ٱلْكَٰفِرُونَ ﴿٣٢﴾ هُوَ ٱلَّذِىٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِٱلْهُدَىٰ وَدِينِ ٱلْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى ٱلدِّينِ كُلِّهِۦ وَلَوْ كَرِهَ ٱلْمُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ ٱلْأَحْبَارِ وَٱلرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَٰلَ ٱلنَّاسِ بِٱلْبَٰطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۗ وَٱلَّذِينَ يَكْنِزُونَ ٱلذَّهَبَ وَٱلْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِى نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا۟ مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾

النصف

ترجمۂ آیات ۲۹-۳۵

ان اہل کتاب سے جو نہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے، نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام ٹھہراتے اور نہ دین حق کی پیروی کرتے، جنگ کرو تا آنکہ وہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں۔ ۲۹

اور یہود عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور نصاریٰ مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں یہ سب ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ یہ ان لوگوں کی بات کی نقل کر رہے ہیں جو ان سے پہلے مبتلائے کفر ہوئے۔ اللہ ان کو غارت کرے کہاں ان کی عقل الٹی ہوئی جا رہی ہے۔ انھوں نے اللہ کے سوا اپنے فقیہوں اور راہبوں کو رب بنا ڈالا اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ انھیں صرف ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود

نہیں، وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ وہ کافروں کے علی الرغم اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اس کو سارے دین پر غالب کر دے ان مشرکوں کے علی الرغم۔ ۳۰-۳۲

اے ایمان والو، ان فقیہوں اور راہبوں میں بہتیرے ایسے ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقوں سے ہڑپ کرتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ اس دن جس دن دوزخ میں اس پر آگ دہکائی جائے گی پھر اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔ یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا۔ تو اب چکھو جو تم جمع کرتے رہے ہو۔ ۳۴-۳۵

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۲۹)

اہل کتاب کے جرائم اور ان کے بارے میں حکم

اہل کتاب کے مذہبی اور سیاسی جرائم کی تفصیل بقرہ، آل عمران، مائدہ اور انفال سب میں بیان ہو چکی ہے۔ اگرچہ یہ لوگ نہ صرف ایمان کے مدعی تھے بلکہ اپنے آپ کو دین و شریعت کا تنہا اجارہ دار سمجھے بیٹھے تھے لیکن مذکورہ سورتوں میں پوری وضاحت سے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ، آخرت اور شریعت کسی چیز پر بھی یہ ایمان نہیں رکھتے تھے۔ ایمان کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ کے شرائط کے تحت ہو لیکن ان کا ایمان اپنی خواہشوں اور بدعات کے تحت تھا۔ مشرکانہ عقائد ایجاد کر کے انھوں نے خدا کی نفی کر دی، اپنے آپ کو چہیتی اور مغفور امت قرار دے کر آخرت کا ابطال کر دیا اور اللہ اور رسول کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو جائز بنا کر شریعت کو کالعدم کر دیا۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کیا کہ اللہ نے اپنے آخری

رسول کے ذریعے سے، اپنے وعدے کے مطابق، جو دینِ حق بھیجا تو اس کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کیا بلکہ اس کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیا اور اس کے خلاف برابر سازشوں میں سرگرم رہے۔ فرمایا کہ اب، یہ مفسدین کسی مزید مہلت کے حقدار باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ ان سے بھی جنگ کرو یہاں تک کہ یہ مغلوب ہو کر جزیہ دیں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں۔

'عَنْ یَدٍ' کا مفہوم

حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ 'ید' کے اصل معنی تو ہاتھ کے ہیں لیکن یہ غلبہ، تسلط اور اختیار و اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یعنی ان کی طرف سے یہ ادائیگی جزیہ تمہارے اقتدار و غلبہ کے نتیجہ میں ہو۔ ان سے جنگ کر کے ان کے کس بل اس طرح نکال دو کہ یہ تمہارے آگے گھٹنے ٹیک دیں اور ہاتھ باندھ کر جزیہ دینے پر راضی ہوں۔ 'وَهُمْ صٰغِرُوْنَ' یعنی تمہاری ماتحتی و محکومی قبول کریں اور اس کو غنیمت جانیں۔

جزیہ کی حیثیت

یہ جزیہ ایک ٹیکس ہے جو تمام بالغ اور کمانے والے افراد پر اس امان کے معاوضہ کے طور پر لگایا گیا جو ان کے جان و مال اور زن و فرزند کو اسلامی حکومت کے اندر حاصل ہوتی۔ اس کی مقدار افراد کی حیثیت اور صلاحیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی تھی جس میں چھوٹ اور رعایت کی بھی بڑی گنجائش رکھی گئی تھی۔ تفصیلات اس کی ہماری کتاب اسلامی ریاست میں، غیر مسلموں کے حقوق کے باب میں ملے گی۔

اہل کتاب اور مشرکین میں فرق کی وجہ

یہاں ایک بات بہت نمایاں طور پر محسوس ہو گی کہ اہل کتاب کے ساتھ جو معاملہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے وہ اس سے مختلف ہے جس کی ہدایت اوپر مشرکین کے باب میں کی گئی ہے۔ مشرکین کے باب میں تو یہ حکم ہوا کہ جب تک یہ کفر سے توبہ کر کے اسلام نہ اختیار کر لیں اس وقت تک ان کا پیچھا نہ چھوڑو لیکن ان اہل کتاب کو جزیہ کی ادائیگی پر امان دے دینے کی ہدایت ہوئی۔ اس فرق کی وجہ وہی ہے جس کی وضاحت ہم پیچھے کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت براہ راست تھی، آپؐ انہی کے اندر سے اٹھائے گئے، انہی کی زبان میں آپؐ پر اللہ کا کلام اترا اور انہی کو آپؐ نے اپنی دعوت کا مخاطب اول بنایا اور ہر پہلو سے انہی کے معروف و منکر اور انہی کے مطالبات کے مطابق آپ نے ان پر اتمام حجت کیا۔ اس اہتمام کے بعد ان کے لیے کسی مزید مہلت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ چنانچہ مشرکین بنی اسمٰعیل ذمی نہیں بنائے جا سکتے تھے لیکن دوسرے غیر مسلموں کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ اسلامی حکومت میں ذمی بن کر رہ سکتے ہیں۔

دوسرے غیر مسلموں کا حکم

اصلاً تو یہاں جو حکم بیان ہوا ہے وہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے متعلق ہے لیکن صحابہؓ کے زمانہ ہی میں یہ مسئلہ بھی طے پا چکا تھا کہ یہی حکم دوسرے غیر مسلموں کا بھی ہے۔ چنانچہ مجوس کے ساتھ، ان کو مشابہ اہل کتاب قرار دے کر، یہی معاملہ کیا گیا جس کی ہدایت یہاں اہل کتاب کے باب میں ہوئی

ہے۔ اس باب میں فقہا میں کوئی اختلاف رائے ہے تو وہ فروعی نوعیت کا ہے جس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

مفتوح اور معاہد اہل ذمہ کا حکم

یہ بات یہاں خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہے کہ آیت میں جو حکم بیان ہوا ہے وہ مفتوح اہل ذمہ کا ہے یعنی جنھوں نے اسلامی حکومت سے جنگ کی ہو اور شکست کھا کر اس کی اطاعت پر مجبور ہوئے ہوں۔ وہ اہل ذمہ اس سے الگ ہیں جن کو فقہاء نے معاہد یا اہل صلح سے تعبیر کیا ہے۔ معاہد اہل ذمہ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے بغیر کسی جنگ و قتال کے بطور خود اپنی مرضی سے اسلامی حکومت کی رعیت بن کر رہنا اختیار کیا ہو۔ ان لوگوں کے ساتھ حکومت اسلامی اس عہد نامے کے مطابق معاملہ کرے گی جو ان کے اور حکومت کے مابین طے پا چکا ہو۔ یہاں تک کہ اگر وہ اس بات پر مصر ہوں کہ ان پر بھی اسی طرح کے مالی واجبات عائد کیے جائیں جو مسلمانوں پر عائد ہیں تو حکومت ان سے اپنی صواب دید کے مطابق اس شرط پر بھی معاہدہ کر سکتی ہے، دوسرے لفظوں میں اس فرق کو یوں سمجھیے کہ اگر جزیہ کی ادائیگی میں وہ عار اور ذلت محسوس کریں تو ان کو اس سے مستثنیٰ کر کے ان کے لیے کوئی اور مناسب شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں سے جو معاہدہ بھی طے پا جائے بلا کسی سبب معقول کے اس کو توڑنے کی اسلام میں سخت ممانعت آئی ہے۔ ہم نے اہل ذمہ کی ان دونوں قسموں پر اپنی کتاب اسلامی ریاست میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ جو لوگ مسئلہ کو دلائل کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہوں وہ اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ ۝ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللّٰهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلٰهًا وَاحِدًا ۚ لَّا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۳۰-۳۱)

'وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ'۔

عزیر کا زمانہ

'عزیر' کا نام تورات میں 'عزرا' آیا ہے۔ ان کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ بخت نصر کے ہاتھوں یہود پر جو تباہی آئی اس میں تورات کے صحیفے بھی بالکل ناپید ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی عزرا ہیں جنھوں نے اپنی یادداشت سے از سر نو تورات کو مرتب کیا۔ عجب نہیں کہ ان کے اسی کارنامے کی بنا پر یہود نے ان کو ابن اللہ بنا دیا ہو تاکہ اس دھونس سے ان کی مرتب کی ہوئی تورات کو درجۂ استناد حاصل ہو سکے اور اگر کوئی اس پر شبہ وارد کرے تو اس کو یہ جواب دے کر چپ کیا جا سکے کہ یہ وہی تورات ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، اس کی گم شدگی کے بعد اللہ نے اپنے بیٹے عزرا کے ذریعے سے اس کو از سر نو مرتب کرایا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس دور کے مشرکانہ ماحول میں اس قسم کا کوئی اشتغلا بہت کارآمد ہو سکتا تھا۔ مجھے یہود کے لٹریچر میں، یہود کے اس داہمہ کی کوئی

تفصیل نہیں مل سکی۔ لیکن قرآن کا انداز بیان شاہد ہے کہ یہود کے ہاں یہ ایک جانی پہچانی ہوئی بات تھی۔ اگر یہ جانی پہچانی ہوئی بات نہ ہوتی تو وہ قرآن کے اس بیان کے خلاف ضرور اعتراض اٹھاتے۔ چنانچہ قرآن نے اس ذیل میں یہ جو فرمایا ہے کہ انھوں نے اپنے احبار اور رہبان کو رب بنا لیا ہے تو بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال اٹھایا کہ ہم احبار اور رہبان کو رب تو نہیں مانتے۔ آنحضرتؐ نے ان کے اس سوال کا ان کو مسکت جواب دیا تب وہ مطمئن ہوئے۔ اسی طرح اگر قرآن کی اس بات پر کسی کو شبہ یا اعتراض ہوتا تو وہ ضرور سوال اٹھاتا لیکن اس طرح کا کوئی اعتراض یا شبہ کہیں نقل نہیں ہے۔

حضرت مسیحؑ کے ابن اللہ بنانے کی بحث پوری تفصیل سے آل عمران کی تفسیر میں گزر چکی ہے، اس کو اس کے محل میں دیکھیے۔

اہل کتاب کے عدم ایمان کے دلائل

اوپر والی آیت میں یہود و نصاریٰ کے متعلق یہ بات جو بیان ہوئی ہے کہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اب یہ اس کے دلائل بیان ہو رہے ہیں کہ یہود نے عزیر کو خدا کا بیٹا بنایا اور نصاریٰ نے مسیح کو۔ اس شرک کے بعد خدا پر ان کا ایمان معتبر نہیں۔ خدا پر ایمان کی یہ بنیادی شرط ہے کہ اس کی ذات، صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو ساجھی نہ قرار دیا جائے۔

ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ یعنی یہ ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں جو انھوں نے خود گھڑی ہیں۔ خدا نے کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں یا مسیحؑ خدا کے فرزند ہیں۔

اہل کتاب میں اگلوں کی عامیانہ تقلید

يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ، 'مضاہات' کے معنی مشابہت و مشاکلت کے ہیں۔ یعنی ان سے پہلے جن لوگوں نے یہ کلمہ کفر ایجاد کیا یہ بے سمجھے بوجھے طوطے کی طرح اس کی نقل کیے جا رہے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی تفسیر میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ نے اپنی بدعات میں نقل تو اڑائی ہے ہم عصر مشرک قوموں کی لیکن ان پر رنگ چڑھایا ہے اپنے ہاں کے متشابہ الفاظ و کلمات کا۔ مثلاً پال نے مسیحیت کو رومیوں اور یونانیوں میں مقبول بنانے کے لیے ان کے عقائد اور مشرکانہ تصورات سے مواد اخذ کیا اور پھر لفظ کلمہ 'اب' 'ابن' وغیرہ کی مدد سے، جو انجیلوں میں خدا اور مسیح کے لیے استعمال ہوئے تھے، ایک پوری ستھالوجی تیار کر دی۔ لفظ 'اب' اور 'ابن' جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، عبرانی میں باپ اور رب، بیٹے اور بندے کے معنوں میں استعمال ہوتے تھے اور اپنے محل میں یہ اپنے مفہوم کو بے تکلف واضح کرتے تھے لیکن جب عبرانی زبان ایک متروک زبان بن گئی اور مسیحیوں کے ہاتھوں میں صرف انجیلوں کے ترجمے رہ گئے تو ان الفاظ کے وہی مفہوم اصلی مفہوم بن گئے جو ترجمہ کی زبان میں معتبر تھے۔ مثلاً عرب کے عیسائی 'اب' اور 'ابن' کے الفاظ ٹھیٹھ باپ اور بیٹے کے معنی میں لینے لگے اس لیے کہ عربی میں ان کے یہی مفہوم معتبر تھے۔ یہی صورت حال دوسرے

مقامات میں بھی پیش آئی کہ عقائد کا ماخذ اصل کتاب نہیں رہ گئی بلکہ ترجمہ کی زبان بن گئی۔ قرآن نے یہاں اسی گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے پیشرو گمراہوں نے ان کے لیے جو گورکھ دھندا کفر و ضلالت کا تیار کر دیا ہے یہ آنکھ بند کر کے اسی کی تقلید کیے جا رہے ہیں اور اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانے والوں کی بات پر کان نہیں دھرتے۔

قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ، 'قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ' عربی میں لعنت کا کلمہ ہے۔ جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں 'خدا ان کو غارت کرے'۔ 'اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ' تعجب اور حسرت و افسوس دونوں کا حامل ہے اور اس موقع کے لیے موزوں ہے جب کوئی شخص بالکل بدیہی حقائق کے خلاف کوئی روش اختیار کرے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ۔

'احبار و رہبان' کو رب بنانے کا مفہوم

اوپر فرمایا تھا 'وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ' اب یہ اس کی دلیل بیان ہو رہی ہے کہ انھوں نے اپنے فقیہوں اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے۔ 'احبار'، 'حبر' کی جمع ہے جس کا غالب استعمال یہود کے فقہا کے لیے ہوا ہے۔ 'رہبان'، 'راہب' کی جمع ہے۔ یہ نصاریٰ کے مشائخ اور صوفیوں کے لیے معروف ہے۔ ان کو رب بنانے کی حقیقت عدی بن حاتم کی ایک مشہور روایت سے واضح ہوتی ہے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان کو رب تو نہیں مانتے۔ حضور نے فرمایا، کیا یہ بات نہیں ہے کہ جو وہ حرام کر دیں اس کو وہ حرام مان لیتے ہیں اور جس چیز کو جائز کر دیں اس کو وہ جائز مان لیتے ہیں؟ بولے یہ بات تو ہے۔ حضور نے فرمایا یہی ان کو رب بنانا اور یہی ان کی عبادت کرنا ہے۔

مسیح ابن مریم کے بارے میں مزعومات

'وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ'، اسی سیاق میں فرمایا کہ نصاریٰ نے مسیح ابن مریم کو رب بنا لیا لیکن فی الجملہ امتیاز پیدا کرنے کے لیے ان کا ذکر الگ کر دیا تاکہ ان تمام مزعومات کی طرف اشارہ ہو جائے جو نصاریٰ نے حضرت مسیح سے متعلق ایجاد کیے۔ وہ رب تو بنائے ہی گئے لیکن مزید برآں یہ ہوا کہ ان کو خدا کا بیٹا بلکہ عین خدا بنا دیا گیا۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ یعنی یہ شرک انھوں نے اس کے باوجود اختیار کیا کہ تورات اور انجیل دونوں میں نہایت تاکید اور وضاحت کے ساتھ صرف اللہ واحد کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس سے متعلق ضروری حوالے ہم تفسیر سورہ آل عمران میں نقل کر آئے ہیں[1]۔

'سُبْحٰنَهٗ' کا مفہوم

'سُبْحٰنَهٗ'، کا لفظ تنزیہ کے لیے آتا ہے لیکن اس کے اندر توحید کی نہایت واضح منطقی دلیل بھی ہے۔ وہ یوں کہ کسی چیز کی مسلّم اور بنیادی صفات سے بالکل متناقض صفات کا اس کے ساتھ

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد دوم: ص ۱۱۳

جوڑ ملانا بالبداہت خلافِ عقل ہے۔ اس اصول کے مطابق خدا کا کسی کو شریک ٹھہرانا اس کی شان اور اس کے منافی ہے کیونکہ اس سے اس کی مسلمہ صفات کی نفی لازم آتی ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیل بحث اپنے مقام میں گزر چکی ہے۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۳۲-۳۳)

حق کی مخالفت من گھڑت باتوں سے

'یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا' اوپر آیات ۲۹-۳۰ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اللہ نے ان کو گمراہی سے نکالنے کے لیے اپنا دین حق بھیجا ہے لیکن یہ اس کی پیروی پر آمادہ نہیں ہیں اور ان باتوں کی آڑ لے کر اس کی مخالفت کر رہے ہیں جو محض ان کے منہ کی باتیں ہیں، نہ ان کے لیے ان کے پاس خدا کی کوئی سند ہے، نہ عقل و فطرت ہی کے اندر ان کی کوئی شہادت ہے۔ اب یہ اسی حقیقت کو ایک تمثیلی رنگ میں نمایاں کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے دین حق کی اپنی منہ زبانی باتوں کی سند پر مخالفت کرنا ایسا ہی ہے کہ کوئی سورج کو مٹی کا دیا سمجھ کر اس کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ تو یہ کوشش کر رہے ہیں لیکن اللہ نے یہ فیصلہ فرما لیا ہے کہ وہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا اور وہ افق سے خورشید جہاں تاب بن کر چمکے گا اور اللہ کا یہ فیصلہ ان کافروں کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم پورا ہو گا۔ یہ آیت سورہ صف میں بھی زیر بحث آئے گی وہاں ہم اس کے بعض خاص پہلو نمایاں کریں گے۔

دین حق کے غلبہ کی بشارت

'هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ' اس آیت کے مضمون کی وضاحت بقرہ آیت ۱۹۲ اور انفال آیت ۳۹ کے تحت بھی ہو چکی ہے۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ سرزمین حرم کفر و شرک کی ہر آلائش سے پاک ہو جائے اور دین حق کے سوا کوئی اور دین یہاں دین غالب کی حیثیت سے باقی نہ رہے تاکہ دعوت ابراہیمی کا یہ مرکز، دعائے ابراہیمی کے بموجب، تمام عالم کے لیے ہدایت اور روشنی کا سرچشمہ بن جائے۔ وہی بات یہاں فرمائی گئی کہ جس طرح یہ اہل کتاب اپنی پھونکوں سے خدا کے چراغ کو گل نہ کر سکیں گے اسی طرح مشرکین عرب کی کوششیں بھی اس دین کو مغلوب نہ کر سکیں گی بلکہ یہ ان کی تمام کوششوں کے علی الرغم اس سرزمین کے ہر دین پر غالب ہو کے رہے گا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۭ وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۳۴-۳۵)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' اوپر اہل کتاب کے وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے مرتکب وہ خالق کے حقوق کے باب میں ہوئے، اب یہ ان کے وہ جرائم بیان ہو رہے ہیں جن کے مرتکب وہ خلق کے باب میں ہوئے ہیں تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ کسی پہلو سے بھی اب ان کی کوئی افادیت باقی نہیں رہی ہے بلکہ ہر اعتبار سے یہ خدا کی زمین کے لیے ایک بوجھ بن چکے ہیں، اور سزاوار ہیں کہ ان کے لعنتی وجود سے خلق خدا کو نجات ملے۔ یہ خاص پہلو بھی ملحوظ رہے کہ عوام کے کردار کے بجائے یہاں علماء اور مشائخ کے کردار کو بے نقاب کیا ہے تاکہ یہ حقیقت سامنے آجائے کہ جن کے علماء اور مشائخ کا کردار اس درجہ فاسد ہو چکا ہے ان کے عوام کا کیا ذکر اور اب ان کی اصلاح کی کیا توقع! اصلاح کا یہ ذریعہ علماء و مشائخ ہی ہو سکتے تھے۔ جب وہی مال و دولت کے پجاری بن کر رہ گئے ہیں تو اصلاح کن کے ہاتھوں ہو گی۔

اہل کتاب کے جرائم خلق کے باب میں

یہود کے ہاں قضا اور افتاء وغیرہ کے تمام مناصب ان کے علماء اور فقہا ہی کے ہاتھ میں تھے۔ اور عیسائیوں کے پادری تو لوگوں کو نجات کے پروانے تک بانٹنے کے مجاز تھے پھر اس پر مستزاد یہ کہ ان لوگوں نے صدقات و زکوٰۃ وغیرہ کی آمدنیوں کا مصرف اپنے آپ کو قرار دے لیا تھا اس وجہ سے ان کے لیے ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹنے کے نہایت وسیع دروازے کھلے ہوئے تھے۔ سودی کاروبار بھی انھوں نے کھلے جندوں اختیار کر رکھا تھا۔ قرآن میں یہ اشارہ بھی ہے کہ غیر اسرائیلیوں کے مال کو یہ شیر مادر سمجھتے تھے۔ سیدنا مسیح نے ان لوگوں کی زرپرستی پر نہایت سخت الفاظ میں ملامت فرمائی۔ ہیکل کی انتظامیہ اور اس کے کارپردازوں کا جو حال تھا اس کو دیکھ کر حضرت مسیح نے فرمایا کہ تم نے میرے باپ (رب) کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا دیا ہے، یہ بھی فرمایا کہ تم اوروں کو تو زیرے اور سونف پر بھی عشر کا حساب بتاتے ہو لیکن خود دوسروں کا مال ہڑپ کر جاتے ہو۔

علمائے اہل کتاب کی زرپرستی

'وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان علماء نے اپنے فرائض منصبی کے بالکل برعکس طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ علماء و مشائخ پر اللہ کی طرف سے تو یہ فریضہ عاید کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کا راستہ دکھائیں لیکن یہ اپنی ساری قابلیت لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے پر صرف کر رہے ہیں اور ہادی و مرشد بننے کے بجائے سیدنا مسیح کے الفاظ میں رہزن اور بٹ مار بن گئے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں علماء یہود کی ان مفسدانہ کوششوں کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے جو انھوں نے لوگوں کو اسلام سے روکنے کے لیے کیں۔

رہزن اور بٹ مار علماء

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ

اگرچہ اس ٹکڑے میں اشارہ انہی زرپرستوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر گزرا لیکن اس کا اسلوب بیان عام تعلیم

انفاق کی حقیقت اور اس کی برکات

کا ہے کہ جو لوگ بھی دولت جمع کریں گے اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کریں گے ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ اس تعلیم کا واضح مدعا یہی ہے کہ دولت جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہے۔ 'خدا کی راہ' سے مراد، جیسا کہ دوسرے مقام میں وضاحت ہو چکی ہے، وہ تمام مصارفِ خیر ہیں جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں یا بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے تحت آتے ہیں۔
یہ بات یہاں پیش نظر رکھنے کی ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ جو لوگ مالک نصاب ہوتے زکوٰۃ نہیں دیں گے ان کے لیے یہ وعید ہے بلکہ یہ فرمایا کہ جو لوگ مال و دولت ذخیرہ کریں گے اور اس کو راہِ خدا میں خرچ نہیں کریں گے ان کے لیے یہ وعید ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ ایتائے زکوٰۃ سے الگ چیز ہے۔ ہر صاحب مال سے اللہ تعالیٰ کے دو مطالبے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے، دوسرا یہ کہ وہ اپنا مال سینت کر رکھنے کی بجائے اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ پہلا مطالبہ قانونی ہے اور ایک اسلامی حکومت کو یہ اختیار ہے کہ وہ ہر شہری سے زکوٰۃ، اگر محسوس کرے، بجبر و بزور وصول کرے۔

قانونی اور اختیاری انفاق

دوسرا مطالبہ اگرچہ جبر و زور کے ذریعہ سے پورا نہیں کرایا جا سکتا بلکہ یہ صاحب مال کے اختیار پر چھوڑا گیا ہے لیکن اللہ کے ہاں آدمی کے درجہ و مرتبہ کا اصلی انحصار اسی آزادانہ اور رضاکارانہ انفاق پر ہے۔ اسی انفاق سے آدمی کے ایمان کو، جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں واضح کر آئے ہیں، ثبات و استحکام حاصل ہوتا ہے۔ یہی انفاق حکمت کا خزانہ بخشتا ہے، اسی سے نورِ قلب میں فزونی ہوتی ہے۔ اگر مال کے ڈھیر رکھتے ہوئے کوئی شخص اپنے پاس پڑوس کے یتیموں، بے کسوں، ناداروں سے بے پروا ہے یا دعوت دین، اقامت دین، تعلیم دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے دوسرے کاموں سے بے تعلق ہو جائے تو وہ عنداللہ مواخذہ اور مسئولیت سے بری نہیں ہو سکتا اگرچہ اس نے اپنے مال کا قانونی مطالبہ پورا کر دیا ہو۔ آگے اسی سورہ میں ان منافقین کا بیان آئے گا جو مال رکھتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کو تاوان سمجھتے تھے۔ قرآن نے ان کی اس زرپرستی کو ان کے نفاق کی دلیل قرار دیا ہے اور نہایت ہی سخت الفاظ میں ان کو وعید سنائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وعید ان کو زکوٰۃ نہ ادا کرنے پر نہیں سنائی گئی ہے۔ زکوٰۃ تو وہ طوعاً و کرہاً بہرحال ادا کرتے ہی تھے۔ نہ ادا کرتے تو تلوار کے زور سے ادا کرتے۔ ان کا اصلی جرم یہی تھا کہ وہ مال دار ہونے کے باوجود جہاد کے لیے انفاق سے جی چراتے تھے اور جہاد کے لیے انفاق سے جی چرانا علامات نفاق میں سے ہے بلکہ بعض حالات میں تو یہ نہایت غلیظ قسم کا نفاق بن جاتا ہے جس کے ساتھ ایمان جمع ہو ہی نہیں سکتا۔

صحابہ کرامؓ کی دولت مندی کی نوعیت

بعض لوگ بعض صحابہؓ کی دولت مندی کو مثال میں پیش کر کے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ ادائیگی زکوٰۃ کے ساتھ دولت جمع کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ صحابہؓ میں جو لوگ دولت مند تھے ان کی دولت مندی کاروباری اور تجارتی نوعیت کی تھی۔ جائز کاروبار

اور تجارت میں سرمایہ لگانا اور اس کو بڑھانا کنز نہیں بلکہ اکتساب دولت ہے اور اسلام میں کوئی مذموم فعل نہیں بلکہ ایک محمود فعل ہے۔ اگر ایک شخص ایک جائز کاروبار میں سرمایہ لگائے، حلال راستوں سے روپیہ کمائے، اسراف اور بخل دونوں سے پرہیز کرتا ہوا اپنی ضروریات پر خرچ کرے، اپنے مال کی زکوٰۃ نکالے اور اپنی فاضل دولت سرًا اور علانیۃً اللہ کی راہ میں اپنی مرضی سے خرچ کرے تو وہ اسلامی معاشرہ کا ایک سچا خدمت گزار اور آخرت میں اللہ کا مقبول بندہ ہے۔ صحابہ میں سیدنا عثمان غنیؓ ایسے ہی دولت مند تھے اور دوسرے اصحاب کی دولت مندی بھی اسی نوعیت کی تھی۔ عثمان غنیؓ کی دولت سے مسلمانوں کو جو فائدے پہنچے اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ پھر یہ بات کس طرح باور کی جا سکتی ہے کہ یہ غنیؓ دریا دل اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنی انفاق کی عادت مستمرہ کے خلاف دولت جمع کرنے کی فکر میں لگ گیا ہوگا۔

زکوٰۃ اور انفاق میں فرق

لیکن یہ خوب یاد رکھیے کہ یہ انفاق زکوٰۃ کی طرح کوئی قانونی اور جبری چیز نہیں بلکہ اختیاری چیز ہے۔ اور اس کے اس اختیاری ہونے ہی میں اس کی ساری برکتیں ہیں۔ ایک اسلامی معاشرہ میں یہ چیز ہر صاحبِ مال سے مطلوب ہے لیکن بالجبر نہیں بلکہ بالرضا۔ یہ حکومت کے فرائض میں ہے کہ وہ معاشرہ کے اندر لوگوں کے اندر دولت کی ذخیرہ اندوزی کی بیماری نہ پھیلنے دے بلکہ برابر اپنے تمام ترغیبی و تعلیمی ذرائع سے لوگوں کے جذبۂ انفاق کو ابھارتی اور اکساتی رہے۔ اس کا سب سے زیادہ کارگر اور موثر طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ اولوالامر کے درجہ پر فائز ہوں وہ خود معیارِ زندگی متوسطانہ رکھیں اور دوسروں کو بھی اسی کی تعلیم دیں بلکہ ان رجحانات کی شدت سے حوصلہ شکنی کریں جو لوگوں کو معیارِ زندگی اونچا کرنے کے تنافس میں مبتلا کرنے والے ہوں۔

جمع مال کا انجام

یَوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡہَا فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ الآیۃ یعنی راہ خدا سے بچا اور چرا کر جو دولت جمع کی جاتی ہے وہ قیامت کے دن پیشانی کا داغ اور پہلو اور پیٹھ کا زخم بنے گی۔ دولت جمع کرنے کی سرگردانی میں بڑا دخل دو چیزوں کو ہوتا ہے۔ ایک ہم چشموں میں اپنا سر اونچا رکھنے کی خواہش دوسری اپنے ذاتی آرام و راحت کی طلب۔ فرمایا کہ جو لوگ دنیا میں سربلندی اور فخر کی خاطر دولت جمع کریں گے ان کی دولت بروز قیامت ان کی پیشانی پر داغ لگائے گی۔ اسی طرح جو لوگ نرم ریشمیں و مخملیں گدوں، غالیچوں، قالینوں اور صوفوں کے درپے ہو کر انفاق کی سعادت سے محروم رہیں گے ان کی یہ بچائی ہوئی دولت ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو زخمی کرے گی۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۶-۳۷

اوپر کی آیات میں مشرکین اور اہل کتاب دونوں گروہوں سے جنگ کا حکم دینے کے بعد آگے کی

دو آیتوں میں چاروں محترم مہینوں کا احترام باقی رکھنے کی تاکید کر دی۔ یہ اسی ہدایت کی تاکید مزید ہے جو آیت ۵ میں گزر چکی ہے کہ جب محترم مہینے گزر جائیں تب ان سے جنگ شروع کرو۔ اس احترام کی تاکید کے ساتھ ان مہینوں کے باب میں نسئی کی اس بدعت کی اصلاح بھی فرما دی جو مشرکین عرب نے اہل کتاب سے اخذ کی تھی۔ پیچھے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ عربوں نے اپنے تجارتی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کبیسہ کے قاعدے پر ایک ایسی جنتری بنالی تھی کہ اشہر حرم برابر ایک ہی موسم میں پڑتے تھے۔ اس بدعت نے قمری مہینوں کو ان کی اصل جگہ سے ہٹا دیا تھا۔ چونکہ قمری مہینے ہی اصل خدائی مہینے ہیں اور سیدنا ابراہیم کے وقت سے یہی مہینے حج و عمرہ کی ادائیگی کے لیے قرار پائے تھے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اب جب کہ ملت ابراہیمؑ کی تجدید کا کام اپنے آخری مرحلہ میں داخل ہو رہا ہے۔ مشرکین کی اس بدعت کی بھی اصلاح کر دی جائے تاکہ اشہر حرم اور مناسک حج سب اپنی اصلی جگہ پر آجائیں۔ چنانچہ حجۃ الوداع ٹھیک اس تاریخ کو ہوا جو قمری حساب سے اس کی اصلی تاریخ تھی ——— اس روشنی میں آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۶-۳۷

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ ۚ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٦﴾ إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ ۖ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ ۚ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٧﴾

ع ۵ / ۱۱

ترجمۂ آیات ۳۶-۳۷

بے شک مہینوں کی تعداد، اللہ کے ہاں، نوشتۂ الٰہی میں، جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، بارہ مہینے ہیں جن میں چار حرمت والے ہیں۔ یہی دینِ قیّم

ہے تو تم ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ ڈھانا۔ اور مشرکوں سے جنگ کرو من حیث الجماعت، جس طرح وہ تم سے جنگ کرتے ہیں من حیث الجماعت۔ اور جان رکھو کہ اللہ خدا ترسوں کے ساتھ ہے۔ یہ نسئی کفر میں ایک اضافہ ہے جو کافروں کی گمراہی کا ایک ذریعہ بنائی گئی۔ کسی سال اس کو حلال ٹھہرا دیتے ہیں کسی سال حرام کہ خدا کے حرام کیے ہوئے کی گنتی پوری کر کے اس کے حرام کیے ہوئے کو جائز بنا لیں۔ ان کی نگاہوں میں ان کے برے اعمال کھبا دیے گئے ہیں اور اللہ کافروں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۳۶-۳۷

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ ۚ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (۳۶)

خدائی تقویم

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، یہ بطور تمہید قمری مہینوں کی عظمت و اہمیت واضح کی گئی ہے کہ یہی مہینے کائناتی، آفاقی اور خدائی مہینے ہیں اس لیے کہ ان کے تعین کے لیے قدرت نے خود، کائنات کے نظام میں ایک نہایت محکم انتظام کر دیا ہے جو پوری باقاعدگی سے سال اور مہینوں کا حساب ایک عامی سے عامی آدمی کے لیے بھی واضح کرتا رہتا ہے وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۵ یونس (اور چاند کو روشنی بنایا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرائیں تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب کا تعین کر سکو) یہی خدائی تقویم ہے جو نوشتۂ الٰہی میں موجود اور اس دن سے جاری و نافذ ہے جس دن خالق کائنات نے اس آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کی کوئی کائناتی شہادت ان تقویموں میں سے کسی بھی تقویم کے حق میں موجود نہیں ہے جو انسانوں نے بنائی ہیں۔ یہ خدائی کیلنڈر ہر مہینے میں افق پر نمایاں ہو کر، اپنے ہر روز بدلنے والے نمایاں اور چمکدار نشانوں کے ذریعہ سے دنوں، مہینوں اور سالوں کا حساب بتاتا رہتا ہے۔ اور کبھی اس میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ فِي كِتَابِ اللَّهِ یعنی اس خدائی کتاب میں، جس میں

اس کائنات سے متعلق تمام احکام و قوانین مندرج ہوئے، یہ حکم بھی مندرج ہوا کہ اس میں قمری مہینوں کے حساب سے ۱۲ مہینوں کا سال ہوگا جن میں سے چار مہینے حرمت والے قرار پائیں گے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان بارہ مہینوں میں کوئی کمی یا بیشی کرنا یا ان کو آگے یا پیچھے ہٹانا اس خدائی کیلنڈر میں خلل پیدا کرنا ہے جو کائنات کے خالق کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔

اصل دینی جنتری

'ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ' یعنی یہی صحیح، فطری اور کائناتی دینی تقویم ہے۔ جس طرح اسلام دین قیم ہے اس لیے کہ اس کی شہادت آفاق و انفس میں موجود ہے اسی طرح یہ قمری جنتری اصل دینی جنتری ہے اس لیے کہ اس کی شہادت آفاق میں موجود ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جس طرح ہماری کھیتی باڑی میں فصلوں اور موسموں کا اعتبار ہے اسی طرح دینی امور میں بھی اوقات، ایام اور سالوں کا اعتبار ہے۔ جس طرح بے وقت اور بے موسم کی زراعت لا حاصل اور بے برکت ہو کے رہ جاتی ہے اسی طرح بے وقت کی نماز، بے وقت کا روزہ اور بے وقت کا حج بھی لا حاصل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ اس جنتری کو بھی شرعی اور دینی حیثیت حاصل ہو جس کے تحت دین کی عبادات اور اس کے احکام و مناسک منضبط ہوتے ہیں۔ اسی پہلو سے اس تقویم کو دین قیم کہا ہے اس لیے کہ یہ بھی دین ہی کا ایک حصہ اور نہایت ہی اہم حصہ ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل کرنا دین میں تحریف کے ہم معنی ہے[1]۔

محترم مہینوں کا احترام

'فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ' یعنی نہ تو ان مہینوں میں ان کی حرمت کے خلاف کوئی کام کرو، نہ ان میں کسی قسم کا ردو بدل کرو۔ اگر تم نے خود پہل کر کے ان میں کوئی جنگ چھیڑی تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے بلکہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھاؤ گے اس لیے کہ خدا نے ان مہینوں کو جو محترم ٹھہرایا ہے تو تمہارے ہی مفاد کے لیے ٹھہرایا ہے، اسی طرح اگر تم ان میں کوئی ردو بدل کرو گے تو یہ بھی تم اپنے ہی کو نقصان پہنچاؤ گے اس لیے کہ ان کے اندر خدا نے جو برکتیں رکھی ہیں تم ان سے محروم ہو جاؤ گے۔

مشرکین سے من حیث الجماعت جنگ کا حکم

'وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ' مطلب یہ ہے کہ ان مہینوں کے حدود حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے تم ان مشرکین سے جنگ کرو اور یہ جنگ ان مشرکین سے من حیث الجماعت ہو۔ اس بنیاد پر ان کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہ کیا جائے کہ ان میں سے کسی کے ساتھ رشتہ و قرابت یا دوستی کا کوئی تعلق ہے یا خاندان اور قبیلہ کی بنا پر کسی قبیلہ سے ہمدردی ہے یا ان کے کسی گروہ سے کوئی سیاسی یا تجارتی یا معاشی مفاد وابستہ ہے۔ اس قسم کے

[1] یہ سوال ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے کہ مسلمان قمری تقویم کے سوا کوئی اور تقویم استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ہماری گزارش کا منشا صرف یہ ہے کہ دینی امور میں صرف یہی تقویم معتبر ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل جائز نہیں۔

تمام تعلقات و مفادات بالائے طاق رکھ کے تمام مشرکین کے خلاف بلا استثنا اعلان جنگ کرو اس لیے کہ خود ان کا رویہ تمہارے ساتھ عملاً یہی ہے۔ وہ تمہارے دشمن من حیث الجماعت ہیں۔ لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (وہ کسی مسلمان کے باب میں نہ کسی قرابت کا پاس رکھنے کے لیے تیار ہیں، نہ کسی عہد کا) اسی طرح تم ان کے دشمن من حیث الجماعت ہو اور جس کو پاؤ اس کو قتل کرو۔ البتہ محترم مہینوں کا لحاظ رکھو، ان میں کوئی جنگ پہل کر کے نہ چھیڑو، البتہ دفاعی جنگ، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں تفصیل گزر چکی ہے، ان میں بھی جائز ہے۔ یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنے انہی بندوں کے ساتھ ہے جو اس کے حدود و قیود کا پاس و لحاظ رکھنے والے ہیں۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ عربوں میں خاندانوں اور خاندانوں کے مابین بھی بسا اوقات حلف اور وِلا کی بنیاد پر بڑے گہرے تعلقات ہوتے تھے جن کی ذمہ داریوں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ یہاں اس عام اعلان برأت کے بعد جو اوپر مذکور ہوا مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ مشرکین کے خلاف جہادِ عام میں اس قسم کی کسی پابندی کو حائل نہ ہونے دیں بلکہ تمام مشرکین کو بلا استثنا اعلان جنگ دے دیں۔

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ (۳۷)

'نسئی' کی نوعیت

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ 'نسا' کے معنی مؤخر کرنے اور پیچھے ہٹانے کے ہیں۔ اسی سے 'نسأ البعیر دفعه عن الحوض' ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کو پانی کے گھاٹ پہنچنے سے روک دیا۔ 'نسأ الراعی فی ظمء الابل' چرواہے نے اونٹوں کے پانی پلانے کو چند دن پیچھے ہٹا دیا۔ اسی سے 'نسئ' کا اسم بنا لیا گیا ہے جس سے عرب جاہلیت کی اصطلاح میں وہ مہینہ مراد ہوتا ہے جس کو چند دن پیچھے ہٹا کر اس کے دنوں میں اضافہ کر دیتے تھے۔ شمسی سال قمری سال سے تقریباً گیارہ دن زیادہ ہوتا ہے۔ قمری سال کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اہل عرب یہ کرتے کہ اس میں کمی کے بقدر اضافہ کر دیتے جس کی عملی شکل یہ تھی کہ ہر آٹھ سالوں میں تین ماہ بڑھائے جاتے گویا ہر دوسرے یا تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ کبیسہ کا ہوتا۔ اس طرح اپنے زعم کے مطابق انھوں نے قمری مہینوں بالخصوص اشہر حرم کا احترام بھی قائم رکھا تھا اور اپنے تجارتی فوائد و مصالح کے نقطۂ نظر سے اس کو شمسی بھی بنا لیا تھا۔ اہل عرب نے تو یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس تخیل کے تحت کیا کہ اس طرح اشہر حرم کی تعداد بھی پوری ہو جاتی ہے جو دینداری کا مقتضی ہے اور ان کا کاروباری مفاد بھی محفوظ ہو جاتا ہے لیکن قرآن نے ان کی اس دینداری کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کو ان کے کفر میں ایک اضافہ قرار دیا جو راہ راست اور دین قیم، ملت ابراہیم سے ان کے مزید انحراف کا موجب ہوا۔

يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۔ نسئی کے یہ دلیل ارشاد ہوئی کہ کیوں یہ چیز کفر میں ایک اضافہ ہے۔ فرمایا کہ اس وجہ سے کہ اس طرح خدا کے محترم کیے ہوئے مہینوں کی گنتی تو ضرور پوری ہو جاتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اللہ کے محترم قرار دیے ہوئے مہینے شمسی سال کے اس چکر میں آکر کبھی محترم بن جاتے ہیں کبھی غیر محترم در آنحالیکہ اللہ نے جن مہینوں کو محترم قرار دیا محترم وہی ہیں، نہ یہ کسی دوسرے مہینے سے تبدیل ہو سکتے نہ ان کا احترام کسی دوسرے مہینے کی طرف منتقل ہو سکتا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس طرح قمری سال کو شمسی سال میں تبدیل کرنے کی جو کارروائی عمل میں آتی اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ موسم حج اور اشہر حرم سب ۳۳ سال کے لیے اپنی جگہ سے ہٹ جاتے۔ ۳۳ سال کی گردش کے بعد پھر یہ اپنی جگہ پر ایک مرتبہ کے لیے واپس آتے۔ تقدیر الٰہی نے یہ انتظام کیا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر، جب سرور عالم نے حج ادا فرمایا، اپنی گردش پوری کر کے حج ٹھیک اس تاریخ کو پڑا جو اس کی اصل خدائی اور ابراہیمی تاریخ تھی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا کہ ان الزمان استدار کھیئتہ یوم خلق السموٰت والارض (زمانہ گردش کر کے اپنی اصلی ہیئت پر آگیا ہے جو ہیئت اس کی اس دن قرار پائی تھی جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا) اسی دن سے آپ نے اس خدائی تقویم کے نفاذ کا اعلان فرما دیا اور نسئی کی تقویم ختم کر دی۔ حضورؐ کے الفاظ میں صاف اس آیت کی جھلک ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۔

زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ، یعنی یہ کفر و اسلام دونوں کا جوڑ ملا کر اشہر حرم کی گنتی پوری کرنے کی جو نمائش کی گئی یہ دین داری نہیں ان کی بدعملی ہے جو ان کی نگاہوں میں کھبا دی گئی ہے جس کو یہ دین سمجھے بیٹھے ہیں۔ اللہ ایسے کافروں کو بامراد نہیں کرے گا، اس طرح کی دینداری قیامت میں اکارت ہو کے رہ جائے گی۔

۶۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۳۸-۴۲

اوپر مشرکین اور اہل کتاب کے خلاف اعلانِ جہاد کر دینے کے بعد آگے کلام کا رخ منافقین کی طرف مڑ گیا ہے اور آخر سورہ تک انہی کا تعاقب فرمایا ہے۔ گویا کھلے ہوئے دشمنوں کے بعد اب یہ اسلام اور مسلمانوں کے چھپے ہوئے دشمنوں کی طرف توجہ فرمائی گئی ہے اور پوری تفصیل سے ان کی ایک ایک کمزوری اور ایک ایک شرارت بے نقاب کر کے رکھ دی گئی ہے تاکہ مسلمان ان سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں اور ان کے اٹھائے ہوئے فتنوں میں مبتلا نہ ہوں۔ اس سے پہلے منافقین کے رویہ پر جو تنقید بھی ہوئی اس کا لب و لہجہ نرم رہا ہے لیکن اس سورہ میں جس طرح مشرکین اور اہل کتاب کے

باب میں آخری فیصلہ کا اعلان کر دیا گیا ہے اسی طرح منافقین کے بارے میں بھی ایک قطعی فیصلہ سنا دیا گیا ہے تاکہ ان میں سے جن کے اندر توبہ اور اصلاح کی کوئی صلاحیت باقی ہے وہ توبہ اور اصلاح کے لیے اسلامی معاشرہ کے صالح جز و بن جائیں اور جو بالکل مردہ ہو چکے ہیں وہ خس و خاشاک کے اس ڈھیر میں شامل ہو جائیں جس کے صاف کر دینے کا آخری فیصلہ قدرت کی طرف سے ہو چکا ہے ــــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۸-۴۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

ع ۵ / ۱۲

ترجمۂ آیات ۳۸-۴۲

اے ایمان والو، تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو تم زمین پر ڈھیے پڑتے ہو۔ کیا تم آخرت کے مقابل میں دنیا کی زندگی پر قانع ہو بیٹھے ہو؟ آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا کی زندگی تو نہایت ہی حقیر ہے۔ اگر تم نہ اٹھوگے تو خدا تمھیں دردناک عذاب دے گا اور تمھاری جگہ دوسری قوم لائے گا اور تم اس کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکو گے اور اللہ ہر بات پر قادر ہے۔ اگر تم اس کی مدد نہ کروگے تو کچھ پروا نہیں۔ اس کی مدد تو اللہ نے اس وقت فرمائی جب کہ کافروں نے اس کو اس حال میں نکالا کہ وہ صرف دو کا دوسرا تھا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے، جب کہ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ تم غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور اس کی مدد ایسی فوجوں کے ذریعے سے کی جو تمھیں نظر نہیں آئیں۔ اور اس نے کافروں کی بات پست کی اور اللہ ہی کا کلمہ بلند رہا۔ اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۳۸-۴۰

اٹھو، معمولی سامان کے ساتھ بھی اور بھاری سامان کے ساتھ بھی، اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اگر نقد نفع ہوتا اور سفر آسان تو یہ تمھارے پیچھے ضرور لگ جاتے لیکن ان پر یہ منزل کٹھن ہوگئی اور اب یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم نکل سکتے تو تمھارے ساتھ ضرور نکلتے یہ خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۴۱-۴۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (۳۸)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ

'نفار' 'نفور' 'نفیر' کے معنی جنگ یا اسی نوع کے کسی اور مقصد کے لیے نکلنے اور اٹھنے کے ہیں۔
'تَثَاقَلَ' اور 'اِثَّاقَلَ' ایک ہی لفظ ہے۔ معنی اس کے کسی شے کو بوجھ محسوس کرنا اور لدھڑ بن جانا ہے۔ اس کے ساتھ 'اِلَى الْاَرْضِ' کے اضافہ نے مضمون کو بالکل مصور کر دیا ہے کہ تمھیں جنگ کے واسطے اٹھنے کو کہا جاتا ہے اور تم لدھڑ بن کر زمین پر ڈھیر پڑے رہے ہو۔

منافقین سے خطاب

آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جو اپنی تن آسانیوں اور مفاد پرستیوں کے سبب سے، جہاد کی منادیٔ عام کے باوجود اس سے جی چرا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان کے مدعی ہو اور اس کے بدیہی مطالبہ کے معاملے میں تمھارا حال یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بھاری بوجھ نے تمھاری کمریں توڑ کے رکھ دی ہیں اور تمھارے لیے اٹھنا پہاڑ ہو رہا ہے۔

منافقین کی اصل بیماری حبِ دنیا

'اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ' یہ استفہام کے اسلوب میں ان کی اصل بیماری کا پتہ دیا گیا ہے کہ یہ آخرت سے صرف نظر کر کے صرف دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں اور راحتوں پر قانع ہو گئے ہیں۔ یہی دنیا ان کے لیے سب کچھ ہے۔ وہ اس عیشِ نقد کو کسی نسیہ کی خاطر منغص کرنا نہیں چاہتے حالانکہ آخرت میں جب حقیقت کھلے گی تب معلوم ہو گا کیسی حقیر چیز کے لیے کیسی لازوال بادشاہی انھوں نے کھو دی۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ڏ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَـيْـــًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

منافقین کو دھمکی

یہ ان منافقین کو دھمکی ہے کہ اگر تم خدا کی راہ میں جہاد کے لیے نہ اٹھے تو خدا کے دردناک عذاب کی پکڑ میں آ جاؤ گے اور یہ نہ خیال کرو کہ اس نہ اٹھنے سے خدا کا کوئی کام بگڑ جائے گا۔ تمھارا اٹھنا خود تمھارے لیے موجب سعادت دنیا و آخرت ہے۔ ورنہ خدا کا کوئی کام تمھارے اوپر منحصر نہیں ہے۔ وہ اپنے دین کی حمایت و نصرت کے لیے اپنے دوسرے بندے اٹھا کھڑا کرے گا جو تمھاری طرح تن آسان، پست ہمت اور مفاد پرست نہیں ہوں گے۔ سورۂ محمد میں یہی مضمون اس

طرح بیان ہوا ہے وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۳۸) وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ بیک وقت کئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ خدا تمھیں عذاب دینے پر قادر ہے، دوسری یہ کہ تمھاری جگہ دوسروں کو اٹھا کھڑا کرنے پر قادر ہے، تیسری یہ کہ وہ اپنی ہر اسکیم بروئے کار لانے پر قادر ہے، اپنے کسی بھی ارادے کی تکمیل میں وہ کسی کا محتاج نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بے نیازی

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۴۰)

'تَنْصُرُوْهُ' میں ضمیر مفعول، آگے کے قرائن دلیل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹتی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نمایندے کی حیثیت سے آپؐ نے لوگوں کو اس جہاد کی دعوت دی تھی۔ اوپر والی آیت میں منافقین سے جس بے نیازی کا اظہار فرمایا ہے اسی بے نیازی کی یہ دلائل کی روشنی میں مزید وضاحت ہے۔ فرمایا کہ پیغمبرؐ جس اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اٹھے ہیں اگر اس کام میں تم نے ان کا ساتھ نہ دیا تو یہ نہ سمجھو کہ یہ کام رک جائے گا۔ جس خدا نے ہجرت سے لے کر اب تک ہر قدم پر اس کی مدد فرمائی ہے وہ اب بھی اس کی مدد کو موجود ہے۔ یاد کرو کہ ایک دن وہ تھا جب کفار نے اس حال میں اس کو گھر سے نکالا کہ وہ صرف دو کا دوسرا تھا، کوئی تیسرا اس کے ساتھ نہ تھا (یہ اشارہ ہے سفر ہجرت کی طرف جس میں صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ آپؐ کے ساتھ تھے اور سارا قریش آپؐ کے خون کا پیاسا تھا لیکن آپؐ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل آئے اور کوئی آپؐ کا بال بیکا نہ کر سکا) پھر یاد کرو اس وقت کو جب نبیؐ اور صدیقؓ دونوں غار ثور میں پناہ گیر تھے اور دشمن تعاقب میں نقش قدم کی ٹوہ لگاتے ہوئے غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ نبیؐ کے واحد ساتھی کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اب ہم دشمن کے نرغے میں ہیں اور خدانخواستہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے لیے آخری خطرہ سامنے آ گیا ہے لیکن پیغمبرؐ نے اپنے ساتھی کو تسلی دی کہ تم ذرا غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے، وہ ہماری حفاظت فرمائے گا چنانچہ اللہ نے اس پر اپنی جانب سے سکینت و طمانیت نازل فرمائی۔ پھر یاد کرو کہ کتنی جنگیں ان کفار کے ساتھ ہو چکی ہیں جن میں خدا کی غیر مرئی فوجیں پیغمبرؐ کی مدد و نصرت کے لیے اس کے ہم رکاب رہی ہیں یہاں تک کہ کفر سرنگوں اور دین کا بول بالا ہو گیا۔ غور کرو کہ کیا یہ پیغمبرؐ جس کی نصرت کے لیے خدا کی یہ شانیں ظاہر ہوئی ہیں وہ تم جیسے لوگوں کی مدد کا محتاج ہو سکتا ہے! اس کا خدا عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ وہ جس کام کو کرنا چاہے کسی کی طاقت نہیں کہ کوئی اس میں مزاحم ہو سکے اور اس کے ہر کام میں ایسی حکمت ہوتی ہے کہ کوئی اس حکمت کو پا نہیں سکتا۔

پیغمبرؐ کے ساتھ خدا کی مدد

جہاد میں سرسامان کی کمی کوئی عذر نہیں ہے

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۴۱)

'خفاف'، 'خفیف' کی اور 'ثقال'، 'ثقیل' کی جمع ہے۔ یہاں 'خفیف' کا لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جس کے پاس عسرت کے سبب سے زیادہ سروسامان جنگ اور زادِ سفر نہ ہو۔

'ثقیل'، جس کا حال اس کے برعکس ہو یعنی وہ سروسامان سے بھرپور اور اسلحہ سے لیس ہو۔

مطلب یہ ہے کہ سروسامان کی کمی کو، جیسا کہ آگے آرہا ہے، جہاد سے غیر حاضری کے لیے عذر اور بہانہ نہ بناؤ۔ جو سروسامان بھی میسر آسکے، کم یا زیادہ، اس کو فراہم کر کے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہو، یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اس کی سعادتوں اور برکتوں کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے اور بصورت محرومی اس کے خسران کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۭ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۴۲)

غزوۂ تبوک میں منافقین کی کمزوری

'شُقَّۃ' اس مسافت کو کہتے ہیں جو ایک مسافر طے کرتا ہے۔ 'بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ ان آیات میں منافقین کی ان کمزوریوں پر ان کو تنبیہ کی جا رہی ہے جو غزوۂ تبوک کے موقع پر ظاہر ہوئیں اس لیے کہ یہی غزوہ ہے جس میں موسم کی ناسازگاری کے ساتھ طولِ مسافت کی آزمائش سے بھی مجاہدین کو سابقہ پیش آیا۔ یہ غزوہ رجب ۹ھ میں پیش آیا۔ موسم گرم تھا۔ فصل پک کر تیار تھی۔ مسافت طویل تھی پھر مقابلہ بھی ایک منظم اور کثیر التعداد فوج سے تھا اس وجہ سے منافقین کی کمزوری اس موقع پر بالکل ہی بے نقاب ہو گئی۔ انھوں نے بے سروسامانی کا عذر اور دوسرے جھوٹے بہانے تراش کر اس جنگ کے لیے نکلنے سے گریز کیا۔ اگرچہ ان لوگوں کی بہانہ بازی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی نہیں تھی لیکن آپؐ نے اپنی کریم النفسی کے سبب سے ان سے اغماض فرمایا۔ آپؐ نے تو اغماض فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں سے نقاب الٹ دی تاکہ جو اپنی اصلاح کرنا چاہیں وہ اصلاح کر لیں ورنہ کم از کم مسلمان ان کی جھوٹ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ فرمایا کہ اگر ان کو توقع ہوتی کہ صعوبتِ سفر اور کسی خطرے کے بغیر مالِ غنیمت ہاتھ آجائے گا تو تمہارے ساتھ ہو لیتے لیکن سامنے کٹھن منزل تھی اس وجہ سے ان کی ہمتیں پست ہو گئیں لیکن یہ اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے بجائے ایک ایک کو قسمیں کھا کھا کے اطمینان دلانے کی کوشش کریں گے کہ اس جہاد میں ان کی عدم شرکت کا باعث بزدلی نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ اس کے لیے سامان نہیں کر پائے۔ اگر سامان کر پاتے تو پیچھے رہنے والے نہیں تھے۔ فرمایا کہ 'يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ' ان جھوٹے عذرات سے وہ اپنے آپ کو اپنی دانست میں بچانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن

حقیقت میں وہ اپنے کو بچا نہیں رہے ہیں بلکہ ہلاکت کے گڑھے میں جھونک رہے ہیں۔ اس لیے کہ نفیر عام کی صورت میں جہاد سے فرار کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔ بقرہ آیت ۱۹۵ کے تحت ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ خدا کے فرائض سے فرار درحقیقت ہلاکت کی طرف فرار ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۴۲-۶۰

آگے کی آیات میں پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت دلنواز انداز میں آپ کی اس نرمی پر ٹوکا ہے جو آپ برنبائے کریم النفسی منافقین کے تراشیدہ عذرات قبول کر لینے میں ظاہر فرماتے تھے۔ پھر آپ کے سامنے منافق اور مخلص کے درمیان امتیاز کے لیے ایک کسوٹی رکھ دی گئی ہے کہ سچے اور پکے مسلمان کبھی تمہارے سامنے جہاد سے معذرت پیش کرنے کے لیے نہیں آئیں گے۔ معذرت پیش کرنے کے لیے وہی آتے ہیں جن کے دلوں میں نفاق کا چور چھپا ہوا ہوتا ہے اور ان کے اس نفاق کے سبب سے اللہ نے ان کے لیے یہی چاہا ہے کہ وہ اس سعادت سے محروم ہی رہیں۔

پھر مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ اگر یہ منافقین جہاد کے لیے نہیں نکلے تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہی ہوا اس لیے کہ اگر یہ نکلتے تو مسلمانوں کے اندر اسی طرح کی فتنہ انگیزیاں کرتے جس کے تجربے پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ یہ بظاہر ہیں تو تمہارے ساتھ لیکن یہ ایجنٹ دوسروں کے ہیں۔

اس کے بعد بعض ایسے منافقین کی طرف اشارہ فرمایا ہے جنھوں نے عذر تراشنے میں کچھ دینداری کی بھی نمائش کی تھی کہ گویا وہ اپنے دین و اخلاق کو فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے اس جنگ میں نہیں جا رہے ہیں۔ ان کی اس جھوٹی دینداری پر برسر موقع گرفت فرمائی اور اچھی طرح ان کی قلعی کھول کر دکھا دی کہ ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کیا بغض بھرا ہوا ہے۔

پھر منافقین کو دھمکی دی کہ تمہارا کوئی انفاق بھی خدا کے ہاں مقبول نہیں اس لیے کہ تم ایمان سے عاری ہو۔ تمہارا انفاق مجبورانہ اور تمہاری نماز ریاکارانہ ہے۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ ان لوگوں کو ذرا وقعت نہ دو۔ ان لوگوں کا مال دین کے کام آنے والا نہیں۔ یہ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں موجب وبال بننے والا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر یہ تمہارے ساتھ بندھے ہوئے ہیں تو اس کا سبب یا تو ڈر ہے یا طمع۔ چونکہ ان کے سامنے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہی ہے اس وجہ سے یہ تمہارے اندر گھسے ہوئے ہیں۔ ان کی طمع کا حال اس سے ظاہر ہے کہ تم پر الزام لگاتے ہیں کہ تم صدقات کی مد سے ان کو بھرپور نہیں دیتے۔ اس کے ساتھ ہی صدقات کے مصارف کی وضاحت فرما دی تاکہ کوئی شخص صدقات کی حرص میں ناخواندہ مہمان بننے کی کوشش نہ کرے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۳-۶۰

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ
صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ
اَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ
فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ
عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا
مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا
وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ
لَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ
وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ
كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۗ اَلَا فِي
الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۗ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ
تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ
اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ
لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ
بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۗ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ
اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ

مُتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَاۤ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

ع ۱۳

ترجمۂ آیات ۴۳-۶۰

اللہ نے تمھیں معاف کیا، تم نے ان کو اجازت کیوں دے دی، یہاں تک کہ جو راست باز ہیں وہ بھی تم پر ظاہر ہو جاتے اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔ جو اللہ اور آخرت پر سچا ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی مال و جان سے جہاد نہ کرنے کی تم سے رخصت

مانگنے نہیں آئیں گے۔ اللہ اپنے متقی بندوں سے خوب باخبر ہے۔ رخصت مانگنے کے لیے تو وہی آتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل شک میں مبتلا ہیں، اور وہ اپنے شک میں ڈانواڈول ہیں۔ اور اگر وہ نکلنا چاہتے تو کچھ سامان کر ہی لیتے لیکن اللہ نے ان کے اٹھنے کو پسند نہیں کیا تو ان کو بٹھا دیا اور کہہ دیا گیا کہ جاؤ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔ ۴۳-۴۶

اگر یہ لوگ تم میں مل کر نکلتے تو تمھارے لیے خرابی ہی بڑھانے کے باعث بنتے اور تمھارے درمیان ان کی ساری بھاگ دوڑ فتنہ انگیزی کے لیے ہوتی۔ اور تم میں ان کی سننے والے ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب باخبر ہے۔ یہ پہلے بھی فتنہ انگیزی کی کوشش کر چکے ہیں اور انھوں نے واقعات کی صورت تمھارے سامنے بدلی یہاں تک کہ ان کے علی الرغم حق آگیا اور اللہ کا حکم ظاہر ہوا۔ ۴۷-۴۸

اور ان میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے رخصت دے دیجیے اور فتنہ میں مبتلا نہ کیجیے سن لو یہ فتنہ میں گر چکے۔ اور بے شک جہنم کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور اگر تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو انھیں دکھ ہوتا ہے اور اگر تمھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں خوب ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور مگن ہو کر لوٹتے ہیں۔ ان کو بتا دو کہ ہمیں صرف وہی چیز پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھی ہے۔ وہ ہمارا مولیٰ ہے۔ اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کے لیے بھروسہ کرنا زیبا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ تم تو بہرحال ہمارے لیے دو بھلائیوں ہی میں سے کسی ایک کے متوقع ہو۔ لیکن ہم تمھارے باب میں اس امر کے متوقع ہیں کہ اللہ یا تو تم پر اپنے پاس سے عذاب بھیجے گا یا ہمارے

ہاتھوں۔ تو تم بھی متوقع رہو، ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں شامل ہیں۔ ۴۹-۵۲

ان سے کہہ دو تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، تمہارا کوئی انفاق قبول نہیں ہوگا، تم بدعہد لوگ ہو۔ یہ اپنے انفاق کی قبولیت سے صرف اس وجہ سے محروم ہوئے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا کفر کیا اور نماز کے لیے جو آتے ہیں تو بارے باندھے آتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں تو بادل ناخواستہ۔ تو تم ان کے مال و اولاد کو کچھ وقعت نہ دو۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ یہ چیزیں ان کے لیے اس دنیا کی زندگی میں موجب عذاب بنیں اور ان کی جانیں حالتِ کفر میں نکلیں۔ ۵۳-۵۵

اور یہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کے اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ تم میں سے نہیں۔ بلکہ یہ ڈرپوک لوگ ہیں۔ اگر یہ کوئی ٹھکانا، کوئی غار یا کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ پا جاتے تو رسی تڑا کر ادھر کو بھاگ کھڑے ہوتے۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جو تم پر صدقات کے بارے میں عیب لگاتے ہیں۔ اگر اس میں سے پاتے ہیں تو راضی رہتے ہیں اور اگر نہیں پاتے تو برہم ہو جاتے ہیں اور اگر وہ اس پر قانع رہتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے کہ ہمارے لیے اللہ ہی بس ہے، اللہ اپنے فضل سے ہمیں نوازے گا اور اس کا رسول بھی، ہم تو اللہ ہی کے تمنائی ہیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔

صدقات تو بس محتاجوں، مسکینوں، عاملینِ صدقات اور تالیف قلوب کے سزاواروں کے لیے ہیں اور اس لیے کہ یہ گردنوں کے چھڑانے، تاوان زدوں کے سنبھالنے، اللہ کی راہ اور مسافروں کی امداد میں خرچ کیے جائیں۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۵۶-۶۰

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (۴۳)

آنحضرتؐ کی کریم النفسی سے منافقین کا فائدہ اٹھانے کی کوشش

چشم پوشی اور سماحت کریم النفسی کا ایک لازمی مقتضا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح تمام اعلیٰ صفاتِ انسانی کے مظہر تھے اسی طرح آپؐ میں چشم پوشی کی صفت بھی کمال درجہ موجود تھی۔ منافقین آپ کی اس کریم النفسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ فرائض دینی بالخصوص فریضۂ جہاد سے فرار کے لیے وہ مختلف قسم کے جھوٹے عذرات تراشتے اور آپؐ کی خدمت میں پیش کر کے گھر بیٹھ رہنے کی اجازت مانگتے۔ حضورؐ ان کے ان بناوٹی عذرات سے اچھی طرح واقف ہوتے لیکن بربنائے کریم النفسی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، درگزر فرما جاتے اور ان کو اجازت دے دیتے۔ حضورؐ کی اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر چونکہ ان کو اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کا ایک موقع مل جاتا جس سے ان کی فریب کاری پختہ ہوتی جا رہی تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ فرمایا۔ لیکن تنبیہ فرمانے کا انداز بہت دلنواز ہے۔ بات کا آغاز ہی عفو کے اعلان سے فرمایا کہ واضح ہو جائے کہ مقصود سرزنش اور عتاب نہیں بلکہ توجہ دلا دینا ہے کہ منافقین تمہاری کریم النفسی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تم اپنی چشم پوشی کی وجہ سے ان کے عذرات کو لاطائل سمجھنے کے باوجود ان کو اجازت دے دیتے ہو جس سے وہ دلیر ہوتے جاتے ہیں کہ ان کی مکاری کامیاب ہو گئی حالانکہ اگر تم اجازت نہ دیتے تو ان کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ ان کے جھوٹوں اور سچوں میں امتیاز ہو جاتا۔ تمہاری اجازت کے بغیر جو گھر میں بیٹھ رہتے ہر شخص پہچان جاتا کہ یہ منافق ہیں لیکن وہ تمہاری اجازت کو اپنے چہرے کی نقاب بنا لیتے ہیں۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ (۴۴-۴۵)

باخلاص مؤمنین اور منافقین کے درمیان واضح فرق

یہ ایک نمایاں فرق واضح فرما دیا ہے مخلصین اور منافقین کے درمیان کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر سچا اور پکا ایمان رکھتے ہیں وہ تمہارے پاس جہاد سے رخصت کی درخواستیں لے کر نہیں آتے۔ اللہ اپنے متقی بندوں سے خوب باخبر ہے۔ یہ رخصت کی درخواستیں وہی لوگ لے کر آتے ہیں جن کا اللہ اور آخرت پر سچا ایمان نہیں ہے بلکہ ان کے دلوں سے شک کا روگ چمٹا ہوا ہے جس کے سبب سے وہ زبان سے تو اللہ اور رسول کے ساتھی بنے ہوئے ہیں لیکن ان کے دل ڈانواڈول ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث وہی لوگ ہیں جو خود تو جھوٹے عذرات کی آڑ لے کر اپنے کو معذور

ٹھہراتے ہیں لیکن کسی دوسرے کو اپنے ان عذرات پر مطمئن نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ جہاد کے لیے جو چیزیں عذر بن سکتی ہیں وہ ایسی نہیں ہیں کہ دوسروں سے مخفی رہ سکیں۔ جو لوگ واقعی معذور ہوتے ہیں ان کا عذر بدیہی ہوتا ہے اور ہر شخص ان کو معذور ٹھہراتا ہے چنانچہ اسی سورہ میں آگے ان حقیقی معذورین کی تفصیل بھی بیان فرمادی ہے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (۹۱-۹۲)	کمزوروں، مریضوں اور ان لوگوں پر کوئی حرج نہیں ہے جن کو زاد و راحلہ میسر نہیں ہے جب کہ وہ اللہ اور رسول کے خیر خواہ رہیں۔ خوب کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے اور ان لوگوں پر بھی کوئی الزام نہیں ہے جو تمہارے پاس آتے ہیں کہ تم ان کے لیے کوئی سواری کا انتظام کر دو اور تم ان کو جواب دیتے ہو کہ میرے پاس تمہارے لیے سواری کا کوئی بندوبست نہیں ہے تو وہ تمہارے پاس سے اس حال میں لوٹتے ہیں کہ شدتِ غم سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتی ہیں کہ افسوس ان کے پاس مصارف کا انتظام نہیں۔

میرا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ 'وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ' میں ایسے ہی با اخلاص معذورین کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ (۴۶)

توفیق باندازۂ ہمت

یعنی ان کے سارے عذرات محض بناوٹی ہیں۔ اگر ان کے اندر جہاد کے لیے اٹھنے کا ارادہ موجود ہوتا تو کچھ نہ کچھ سامان تو یہ کر ہی لیتے، اگر بھرپور نہیں تو معمولی سامان، بقدرِ ضرورت مہیا کر لینا تو ان کے لیے کچھ دشوار نہ ہوتا لیکن ان کے اندر ارادہ ہی موجود نہیں تھا اور سنتِ الٰہی ازل سے یہ مقرر ہے کہ جو لوگ نیکی کمانے کے لیے خود اپنے ارادے کو حرکت میں نہیں لائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو توفیق بھی ارزانی نہیں ہوگی۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

انھوں نے اپنے لیے بچوں اور عورتوں، بوڑھوں اور مریضوں کی طرح گھر میں بیٹھے رہنا پسند کیا تو خدا نے بھی ان کو عزم و حوصلہ سے محروم کر دیا۔

'تثبیط' کے معنی کسی کو کسی کام سے روک دینے اور ہٹا دینے کے ہیں۔ یہ توفیق کے باب میں سنت الٰہی کا بیان ہے جس کی وضاحت ہم متعدد مقامات میں کر چکے ہیں۔ اُقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ میں اسلوب طنز کا ہے کہ جب میدان میں نکلنے کی ہمت سے عاری ہو تو جاؤ گھروں میں بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔ آگے کی بعض آیات میں یہ طنز اور بھی تیز ہو گیا ہے۔

توفیق کے باب میں سنت الٰہی

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۔ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَاۗءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (۴۷-۴۸)

'لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا۔ الاٰیۃ' 'خبال' کے معنی خرابی اور فساد کے اور ایضاع کے معنی بھاگ دوڑ کرنے کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ جنگ کے لیے نہیں نکلے تو مصلحت الٰہی یہی تھی کہ یہ نہ نکلیں۔ اگر یہ تمھارے ساتھ ہو کر نکلتے تو تمھارے لیے یہ مفید بننے کے بجائے الٹے مصیبت بنتے، ان کی ساری بھاگ دوڑ تمھارے درمیان کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھانے کی راہ میں ہوتی۔

منافقین کی فتنہ انگیزیاں

'وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ' یعنی تمھاری اپنی صفوں کے اندر بھی ان منافقین کی باتیں سننے اور ماننے والے موجود ہیں۔ یہ اشارہ ان سادہ لوح مسلمانوں کی طرف ہے جو اگرچہ منافق نہیں تھے لیکن اپنی سادہ لوحی کے سبب سے بسا اوقات ان منافقین کے چکمے میں آ جاتے تھے۔ ان دو لفظوں میں نہایت لطیف طریقے سے ان کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ مسلمان اپنے اندر کے ان لوگوں سے بھی بے خبر نہ رہیں جو فتنہ پردازوں کے فتنوں سے متاثر ہونے کے معاملے میں بڑے حساس اور بڑی آسانی سے آگ پکڑ لینے والے ہیں۔ 'سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ' کی لغوی تحقیق مائدہ کی آیت ۴۱ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ 'وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ' دھمکی کے موقع میں ہے۔ یعنی اللہ ان ظالموں سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ایک دن یہ کیفر کردار کو پہنچیں گے۔

'لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ ... الاٰیۃ' یہ اس گروہ منافقین کی بعض پچھلی شرارتوں کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور ان کے درمیان فساد برپا کرنے کے لیے کیں۔

منافقین کی پچھلی شرارتوں کی طرف اشارہ

یعنی معاملہ کچھ اور تھا، انھوں نے اپنی ملمع سازی اور فتنہ پردازی سے اس کو کچھ کا کچھ بنا دینے کی کوشش کی۔ قرآن نے صرف اجمالی اشارے پر اکتفا کیا ہے اس لیے کہ یہ باتیں مسلمانوں سے مخفی نہیں تھیں۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ بدر کے موقع پر، جیسا کہ تفصیل گزری، اللہ اور رسول کا منشا واضح ہونے کے باوجود مسلمانوں کو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنے کی راہ سجھانے کی کوشش کی، انہی لوگوں نے جنگ احد کے موقع پر پہلے تو شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا پھر جب ان کا مشورہ قبول نہیں ہوا تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر عین موقع پر الگ ہو گیا پھر جنگ کے بعد

اسی کے ہم خیالوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا کہ نعوذ باللہ آپؐ قوم کے بدخواہ ہیں کہ خیرخواہوں کے مشورے کے خلاف ایک غلط مقام پر لے جا کر ہمارے بھائیوں کو کٹوا دیا اور شکست کا سبب بنے۔ پھر یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ مریسیع کے موقع پر اپنی فتنہ انگیزی سے ایسی صورت پیدا کر دی کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان تلوار چلتے چلتے رہ گئی۔ اسی سلسلے میں ان کی ایک نہایت سنگین شرارت واقعۂ افک کی شکل میں ظاہر ہوئی جو بات کا بتنگڑ بنانے کی ایک نہایت گھنونی مثال ہے۔ حنین کے موقع پر تقسیم غنیمت کے معاملے میں انھوں نے اپنی بدطینتی سے دلوں میں سخت کدورت پیدا کر دینے کی کوشش کی۔ غرض جو موقع بھی ان کے ہاتھ آیا اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی مفسدانہ سرگرمیوں کے علی الرغم ان کے فتنوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ [۴۹]

نفاق تقویٰ کے بھیس میں

یہ بعض ایسے منافقین کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے جنگ تبوک میں عدم شرکت کے لیے یہ متقیانہ قسم کا بہانہ پیش کیا تھا کہ وہ عورت کے معاملے میں چونکہ بہت بے صبر ہیں اس وجہ سے انھیں اس جنگ کی شرکت سے معاف رکھا جائے مبادا وہ رومی عورتوں کے حسن و جمال سے کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔ اگرچہ یہ عذر پیش تو ایک آدھ احمقوں نے ہی کیا ہو گا لیکن یہ عذر کی ایک ایسی قسم تھی جس پر تقویٰ اور دین داری کا ملمع چڑھانے کی کوشش کی گئی تھی اس وجہ سے قرآن نے اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا تاکہ مسلمانوں کو شیطان کے ایک خاص حربے سے آگاہ کر دیا جائے کہ کبھی کبھی وہ تقویٰ کے بھیس میں بھی حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ عذر اسی قسم کا عذر ہے جیسا کہ بعض مدعیان تقویٰ نماز باجماعت کی حاضری سے متعلق پیدا کر لیتے ہیں اور اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ مسجدوں کی حاضری سے اس لیے بچتے ہیں کہ اپنے آپ کو ریا کے فتنہ سے محفوظ رکھیں۔

'اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا' نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ یعنی تبوک پہنچ کر فتنہ میں مبتلا ہونا تو ابھی دور کی بات تھی، یہ تو گھر بیٹھے ہی فتنہ میں اوندھے منہ گر پڑے۔ اس لیے کہ فرائض دینی سے فرار کے لیے اس قسم کا عذر تراشنا بجائے خود ایک ایسا فتنہ ہے جس کے بعد ان کی خانہ ویرانی کے لیے کسی اور فتنہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ان کی ایمانی و اخلاقی موت کے لیے رومی حسیناؤں کے چرتر سے زیادہ ان کا یہ اپنا ہی چرتر مہلک ہے۔

'وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ' سے ایک بات تو یہ نکلی کہ اس قسم کے سارے بہانہ باز کافر ہیں۔ دوسری بات یہ نکلی کہ یہ خدا سے فرار کے لیے جتنے بہانے چاہیں ڈھونڈ نکالیں لیکن خدا کی جہنم ان کا ہر طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ اس سے نہیں بھاگ سکتے۔

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ (۵۰)

منافقین کا اصل باطن

یہ ان کے اصل باطن سے پردہ اٹھایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذرات اور بہانے تو محض اوپر کا پردہ ہیں۔ ان کے دلوں کے اندر تو صرف تمھاری بدخواہی بھری ہوئی ہے جب تمھیں کسی مہم میں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو بڑا دکھ ہوتا ہے اور اگر تمھیں کوئی افتاد پیش آجائے تو بہت خوش ہو کر نوٹتے ہیں کہ خوب ہوا کہ ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا تھا۔ قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا کی تاویل بعض لوگوں نے قَدْ اَخَذْنَا حِذْرَنَا سے کی ہے ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح ہے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۡ ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ (۵۱-۵۲)

مومنین کے لیے مصیبت اور راحت دونوں میں خیر ہے

یہ جواب ہے اوپر والی بات کا کہ اگر یہ تمھیں کسی افتاد کے پیش آنے سے خوش ہوتے ہیں تو انھیں بتا دو کہ ہمیں وہی کچھ پیش آئے گا جو خدا نے ہمارے لیے لکھ رکھا ہے، وہ ہمارا مولیٰ ہے اور ہمیں اس پر پورا بھروسہ ہے کہ اس نے جو کچھ ہمارے لیے لکھ رکھا ہے اسی میں ہماری دنیا اور آخرت کی بہبود ہے۔ اگر تم ہمارے لیے کسی مصیبت کے خواہاں ہو تو ہمارا یہ ایمان ہے کہ وہ تمھارے کہنے سے نہیں آئے گی بلکہ ہمارے رب ہی کے چاہنے سے آئے گی اور اسی میں ہمارے لیے بہتری ہوگی۔ اہل ایمان کے لیے مصیبت اور راحت، دکھ اور سکھ، موت اور زندگی دونوں ہی میں خیر ہے۔ ایک سے مومن کو صبر، کمزوریوں کی اصلاح اور توبہ و انابت کی تربیت ملتی ہے، دوسری سے شکر نعمت، ادائے حقوق اور احسان کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے۔ مومن اللہ کی راہ میں لڑتا ہے تو غازی ہے مرتا ہے تو شہید ہوتا ہے۔ البتہ تمھارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تم نے جو روش اختیار کی ہے اس کی بنا پر ہم تمھارے لیے دو باتوں میں سے کسی ایک کی توقع رکھتے ہیں۔ یا تو اللہ تعالیٰ تم پر اپنے پاس سے کوئی عذاب بھیجے گا یا ہمارے ہی ہاتھوں تم کو سزا دلوائے گا اور ان میں سے کسی میں بھی تمھارے لیے خیر نہیں۔ تو تم ہمارے لیے جس چیز کا انتظار کر رہے ہو اس کا انتظار کرو، ہم بھی اب تمھارے لیے دونوں باتوں میں سے کسی ایک کے ظہور کے منتظر ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کامل اتمام حجت کے بعد کسی کے باب میں اس طرح کا انتظار تنگ دلی کی دلیل نہیں بلکہ یہ حالات و واقعات کے قدرتی نتیجہ کا انتظار ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں اس پر مفصل بحث آئے گی۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ○ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا

وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ (۵۳-۵۴)

نفاق کے ساتھ کوئی انفاق بھی قبول نہیں

یہ ان منافقین سے اظہارِ نفرت و کراہت ہے۔ فرمایا کہ ان کو سنا دو کہ تمہارا کوئی انفاق بھی، خواہ طوعاً ہو یا کرہاً، خدا کے ہاں قبول نہیں۔ انفاق ان کا قبول ہوتا ہے جو خدا کے وفادار ہوں۔ جو بدعہد اور غدار ہیں اور محض مارے باندھے یا دکھاوے اور نمائش کے لیے خرچ کرتے ہیں ان کے انفاق کی خدا کے ہاں کوئی وقعت نہیں۔ خدا کسی کے مال کا محتاج نہیں کہ جس طرح بھی کوئی اٹھا کر دے دے وہ اس کو قبول کرے۔ وہ صرف انہی کے انفاق قبول کرتا ہے جو سچے ایمان اور پورے جذبۂ اخلاص کے ساتھ اس کے دین کی خدمت کرتے ہیں۔

'وَمَا مَنَعَهُمْ ..... الاٰیۃ' یہ وضاحت ہے 'إِنَّكُمْ كُنتُمْ قَوْمًا فَاسِقِينَ' کی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ و رسول کے منکر ہیں۔ اس لیے کہ اللہ و رسول پر ایمان کے جو تقاضے ہیں ان میں سے یہ کسی تقاضے کو بھی پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ اگر نمازوں میں آتے ہیں تو مارے باندھے محض دکھاوے کے لیے آتے ہیں اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر نمازوں میں شامل نہ ہوں تو مسلمانوں کے اندر اپنے آپ کو شامل رکھنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے، اسی طرح اگر وہ دینی کاموں میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو خدمتِ دین کے لیے نہیں بلکہ بادلِ ناخواستہ محض اس خیال سے کہ مسلمانوں کے اندر شمار کیے جاتے رہیں اور اگر طوعاً بھی خرچ کرتے ہیں تو اس لیے کہ ان کی مالداری اور فیاضی کا مظاہرہ ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جس طرح نمائش کی نماز مجبورانہ دوسروں کو دکھانے کے لیے ہوتی ہے اسی طرح نمائش کا انفاق بھی محض دوسروں کو دکھانے ہی کے لیے ہوتا ہے اور خدا کے ہاں اس طرح کا کوئی عمل بھی مقبول نہیں ہوتا۔ سورۂ نساء آیت ۱۴۲ 'وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں ہم نے واضح کیا ہے کہ منافقین کی نماز، نماز نہیں ہوتی تھی بلکہ مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے ایک قسم کی ایکٹنگ ہوتی تھی تاکہ مسلمان ان کو اپنے اندر شامل سمجھیں۔ ظاہر ہے اس مقصد سے جو نماز پڑھی جائے گی وہ کسالی ہی ہو گی، اس میں نشاطِ خاطر، جوش و جذبہ اور خضوع و خشوع کہاں سے آئے گا!

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ (۵۵)

مال و اولاد کی قدر و قیمت ایمان کے ساتھ ہے

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ مال بھی بخشے اور اولاد سے بھی نوازے وہ ملت کے لیے بڑی دولت ہیں اگر ان کو ایمان و اخلاص بھی نصیب ہو جائے۔ ہر بہی خواہ ملت ایسے لوگوں کو قدر و وقعت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اس لیے کہ جان و مال دونوں سے اسلام کی جو خدمت ان کے امکان میں ہوتی ہے، دوسروں کے امکان میں نہیں ہوتی۔ ان منافقین میں بھی ایسے صاحبِ مال و اولاد موجود تھے جو اسلام کی بڑی خدمت اور آخرت میں بڑے مراتب حاصل کر سکتے تھے۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے لیے دل سے متمنی تھے کہ یہ ایمان و اخلاص سے بہرہ ور ہوں کہ اپنی ان نعمتوں کا حق ادا کر کے خدا کے ہاں مراتب عالیہ حاصل کریں لیکن سارے جتن کرنے کے بعد بھی جب یہ لوگ پھسڈی ہی ثابت ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرما دیا کہ ان بدبختوں کے مال و اولاد کو تم ذرا وقعت نہ دو، یہ ان کے لیے ترقی و عروج کی کمندیں نہیں بلکہ غلامی کے پھندے ہیں۔ یہ ان کی بدولت دنیا میں بھی اللہ کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور ان کی موت بھی حالت کفر ہی میں ہو گی۔

مال و اولاد کا پھندا

یہاں دنیا میں ان کے لیے جس عذاب کا حوالہ ہے اس سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکذبین کے لیے مقدر ہو چکا تھا اور جس کی تفصیلات پیچھے گزر چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ منافقین بھی وہی روش اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے تو ان کا انجام بھی وہی ہونا تھا جو اس روش کے اختیار کرنے والے دوسرے لوگوں کا بیان ہوا۔ تَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ دنیا کے مال و اسباب کو اپنے لیے پھندا بنا لیتے ہیں ان کی جانیں گھٹ گھٹ کر نکلتی ہیں اور یہ پھندا اس طرح ان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ اس سے چھوٹ کر ان کے لیے ایمان کی راہ پر آنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ میں اس سنت الٰہی کا بیان ہے جس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہم کر چکے ہیں۔

وَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمۡ لَمِنۡكُمۡ ؕ وَمَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ وَلٰـكِنَّهُمۡ قَوۡمٌ يَّفۡرَقُوۡنَ ۝ لَوۡ يَجِدُوۡنَ مَلۡجَاً اَوۡ مَغٰرٰتٍ اَوۡ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوۡا اِلَيۡهِ وَهُمۡ يَجۡمَحُوۡنَ (۵۶ - ۵۷)

منافقین کی نفسیاتی بیماری

وَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمۡ لَمِنۡكُمۡ۔ لفظ 'حلف' بالعموم اچھے معنوں میں نہیں آتا۔ ہم دوسرے مقام میں یہ نفسیاتی حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس کردار کی حجت نہیں ہوتی وہ اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لیے اکثر جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے منافقین کے متعلق جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ یہ اپنے اخلاقی خلا کو جھوٹی قسموں سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو مطمئن رکھنے کے لیے ان کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے کہ ہم آپ ہی لوگوں میں سے ہیں۔ ہمارے باب میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن نے فرمایا کہ یہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ محض ڈر کے سبب سے تمہارے ساتھ بندھے ہوئے ہیں! اب ان کے سامنے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہی ہے۔ کفار و مشرکین کا حشر یہ دیکھ چکے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کا انجام بھی ان کے سامنے ہے۔ اب جائیں تو کہاں جائیں؟ ملک چھوڑ کر باہر جائیں تو مفادات دامن گیر ہوتے ہیں۔ چار و ناچار تمہارے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ فَرِقَ يَفۡرَقُ فَرَقًا کے معنی ڈرنے اور گھبرانے کے ہیں۔ فَرُوۡقَةٌ، بزدل اور ڈرپوک کو کہتے ہیں۔

منافقین کی مجبوری

لَوۡ يَجِدُوۡنَ مَلۡجَاً ... الاٰية یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے

کہ ان کو آج اگر کوئی جائے پناہ، کوئی غار یا کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ مل جائے، جہاں اپنے مفادات کے ساتھ یہ اپنے کو محفوظ کر سکیں تو ایک دن بھی یہ تمھارے ساتھ رہنا پسند نہ کریں بلکہ رسی تڑا کر یہ بھاگیں گے۔ جَمَحَ الْفَرَسُ، کے معنی ہیں تَغَلَّبَ عَلٰی رَاکِبِہٖ وَذَھَبَ بِہٖ وَلَا یَنْثَنِیْ (گھوڑا سوار کے قابو سے باہر ہو گیا اور اس کو لے کر بگٹٹ بھاگا) یعنی تم سنبھالتے ہی رہ جاتے لیکن یہ بھاگ کھڑے ہوتے مگر وہ تو خیریت ہے کہ کوئی ٹھکانا ان کو نہیں مل رہا ہے اس وجہ سے خوف اور بزدلی نے ان کو تمھارے ساتھ باندھ رکھا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ (۵۸-۵۹)

غیر مالدار منافقین کا حال

اوپر کی آیات میں مالدار منافقین کا حال بیان ہوا تھا، اب یہ غیر مالدار منافقین کا حال بیان ہو رہا ہے کہ جس طرح ان کو خوف نے مسلمانوں کے ساتھ باندھ رکھا ہے اسی طرح ان کو طمع نے باندھ رکھا ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تم (خطاب پیغمبر سے ہے) ان کو صدقات کی مد سے خوب دیتے رہو تو یہ راضی رہتے ہیں اور اگر ذرا کمی کر دو تو روٹھ کر تمھاری عیب چینی شروع کر دیتے ہیں کہ دوسروں کو تو فیاضی سے دیا جا رہا ہے لیکن ان کو ان کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔

صحیح مومنانہ روش

'وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا .... الآیۃ' یہ ان کو صحیح روش یعنی اللہ اور رسول پر اعتماد اور قناعت کی تعلیم دی گئی ہے کہ اہل ایمان کی رغبت مال کی طرف نہیں بلکہ اللہ کی طرف ہونی چاہیے۔ فرمایا کہ جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے خزانۂ جود سے بخشا اور رسولؐ نے جتنا کچھ صدقات میں سے ان کو عطا فرمایا، اگر یہ اس پر قناعت کرتے، اللہ پر پورا بھروسا اور اس سے مزید فضل اور رسول کی طرف سے مزید عنایت کی امید رکھتے، عیب چینی، بدگمانی اور شکوہ و شکایت کے بجائے حسن ظن سے کام لیتے تو یہ چیز ان کے حق میں بہتر ہوتی۔ اس سے ان کے لیے اللہ کے فضل کے مزید دروازے کھلتے اور رسول کی شفقت و عنایت بھی ان کو مزید حاصل ہوتی لیکن ان کی بدبختی پر افسوس ہے کہ انھوں نے یہ مومنانہ اور غیرت مندانہ روش اختیار کرنے کے بجائے رسولؐ کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم شروع کر دی — ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ فصیح عربی میں اس قسم کے شرطیہ جملوں میں بالعموم جزا محذوف ہو جایا کرتی ہے جس سے کلام میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اگر موقع شدت کا ہو، اور حسرت، ملامت، زجر، شفقت، عنایت کے پہلو بھی زیادہ نمایاں ہو کر مخاطب کے سامنے آتے ہیں اگر موقع و محل ان کا ہو۔ ترجمہ میں ہم نے اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ

وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۶۰)

صدقات کے اصل مستحقین

اب یہ صدقات کے مستحقین کی تفصیل بیان فرما دی گئی ہے تاکہ منافقین میں سے جو غیر مستحق محض حرص مال کے سبب سے صدقات میں حصہ بٹانا چاہتے تھے ان پر واضح ہو جائے کہ کون لوگ اس مال میں حق دار ہیں، کون نہیں۔ اس سے یہ لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ منافقین جو صدقات سے اپنی خواہش کے مطابق نہ پانے کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی شروع کر دیتے تھے ان کی حیثیت زیادہ تر ناخواندہ مہمانوں کی تھی جو بغیر کسی استحقاق کے اس مال میں شریک بننا چاہتے تھے۔

صدقہ اور زکوٰۃ میں فرق

'صدقات'، زکوٰۃ کی نسبت عام ہے۔ اس میں وہ تمام عطایا شامل ہیں جو بہ نیت اجر و ثواب دیے جائیں۔ عام اس سے کہ وہ زکوٰۃ کا مال ہو یا انفاق و تبرع کی نوعیت کا کوئی اور مال۔ چونکہ اسی انفاق سے آدمی کے ایمان کی صداقت اور پختگی واضح ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو صدقہ کہتے ہیں جس کی اصل 'صدق' ہے جس کی روح قول و فعل کی کامل مطابقت اور رسوخ و استحکام ہے۔

ان صدقات کے مندرجہ ذیل مستحقین اور مصارف یہاں بتائے گئے ہیں۔

'فقراء' اور 'مساکین' سے مراد

'فُقَرَاء' اور 'مَسَاكِيْن' یہ دونوں لفظ اس اعتبار سے تو بالکل مشترک ہیں کہ دونوں کا اطلاق محتاجوں اور ناداروں پر ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں یہ دونوں ایک دوسرے کے محل میں استعمال بھی ہوئے ہیں لیکن ان کے درمیان فی الجملہ فرق بھی ہے۔ 'فقیر' 'غنی' کا مقابل ہے مثلاً اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۱۳۵۔ نساء۔ اس وجہ سے ہر وہ شخص جو غنی نہیں بلکہ محتاج ہے وہ فقیر ہے عام اس سے کہ وہ سوال کرتا ہے یا اپنی خودداری کی شرم رکھتے ہوئے سوال سے احتراز کرتا ہے۔ چنانچہ بقرہ ۲۷۳ میں ان خوددار محتاجوں کے لیے 'فقراء' ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

'مسکین'، کا لفظ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے فقر و مسکنت یا فقدانِ عزم و حوصلہ کے سبب سے زندگی کی جد و جہد میں حصہ لینے سے عاجز ہو، صرف دوسروں کی امداد ہی اس کا سہارا ہو۔ گویا فقر کے ساتھ اس کے اوپر مسکنت اور بے بسی کا بھی غلبہ ہو۔ اس اعتبار سے یہ لفظ 'فقیر' کے مقابل میں سخت ہے۔

'عاملین' سے مراد

'وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا' سے مراد وہ لوگ ہیں جو صدقات کی وصولی اور ان کے حساب کتاب پر حکومت کی طرف سے مامور ہوں۔ ان کی تنخواہیں اور ان کے دفاتر کے مصارف بھی اس مد سے ادا ہوں گے۔

'مؤلفة القلوب' سے مراد

'وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ'، 'مؤلفة القلوب' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی اسلامی حکومت کے مصالح کے تحت دل داری پیش نظر ہو۔ بسا اوقات حکومت کو بعض ایسے ذی اثر لوگوں سے معاملہ کرنا پڑتا ہے جو حکومت کی پوری رعیت نہیں ہوتے بلکہ ایسی پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ اگر ان کو بزور قابو میں رکھنے

کی کوشش کی جائے تو ڈر ہوتا ہے کہ وہ دشمن سے مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔ خاص طور پر سرحدی علاقوں میں اس طرح کے لوگوں سے بڑے خطرے پہنچ سکتے ہیں اگر یہ دشمن بنے رہیں یا دشمن ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس طرح کے لوگوں کو اپنی حمایت میں رکھنا اسلامی حکومت کے مصالح کا تقاضا ہوتا ہے اور اس کی شکل یہی ہوتی ہے کہ ان کی کچھ مالی سرپرستی کی جاتی رہے تاکہ ان کی ہمدردیاں اسلام کے دشمنوں کی بجائے اسلامی حکومت کے ساتھ رہیں۔ یہ ایک پولیٹیکل مصرف ہے جس پر حکومت اپنی دوسری مدوں سے بھی خرچ کر سکتی ہے اور اگر ضرورت محسوس کرے تو اس پر صدقات کی مد سے بھی خرچ کر سکتی ہے۔ یہ مؤلفۃ القلوب غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں اور نام کے مسلمان بھی۔ اس تالیفِ قلب سے ایک فائدہ یہ بھی متوقع ہوتا ہے کہ یہ غیر مسلم یا نام کے مسلمان مسلمانوں سے وابستہ رہنے کے سبب سے اسلام سے قریب تر ہو جائیں۔

ہمارے فقہاء کا ایک گروہ اس مصرف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات یا بالفاظِ دیگر اسلام کے غلبہ کے بعد ساقط قرار دیتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ بات کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔ یہ مصرف جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک پولیٹیکل مصرف ہے جو حالات کے تابع ہے جس کی ضرورت کبھی پیش آتی ہے کبھی نہیں۔ ایک مضبوط سے مضبوط حکومت بھی بعض اوقات دفع شر کے اس طریقے کو اختیار کرتی ہے اس لیے کہ جبر اور طاقت کا ذریعہ اختیار کرنے میں نہایت پیچیدہ بین الاقوامی جھگڑے اٹھ کھڑے ہونے کے اندیشے ہوتے ہیں۔ جن میں بروقت الجھنا حکومت کے مصالح کے خلاف ہوتا ہے۔

فکِ رقبہ کی وضاحت　'وَفِی الرِّقَابِ'، میں مضاف محذوف ہے یعنی 'فِی فَکِّ الرِّقَابِ' غلاموں کو طوقِ غلامی سے نجات دلانا بھی ان مقاصد میں سے ہے جن پر صدقات کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے۔ یہاں حرف 'فِی' کے استعمال سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ان کی بہبود و ترقی کے لیے کام بھی صدقات سے کیے جا سکتے ہیں جو ان کی رفاہیت اور حصولِ آزادی میں معین ہوں۔

'غارمین' سے مراد　'وَالْغٰرِمِیْنَ': غَرِمَ فِی التِّجَارَۃِ کے معنی ہوتے ہیں فلاں نے اپنی تجارت میں گھاٹا اٹھایا۔ غُرَامَۃ اور غُرْم' تاوان، نقصان اور جرمانہ کو کہتے ہیں۔ 'غارم' اس شخص کو کہیں گے جو اپنے کاروبار میں نقصان یا کسی اور سبب سے ایسے بار اور قرضے کے نیچے آگیا ہو کہ اس کے لیے تنہا اپنے ذرائع سے اپنے آپ کو سنبھالنا ناممکن ہو رہا ہو۔ ایسے اشخاص کے قرضے اتارنے اور ان کو سہارا دینے پر بھی صدقات کی رقم صرف ہو سکتی ہے تاکہ وہ از سرِ نو سنبھل کر معاشرے کو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچا سکیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اسلامی حکومت میں اکتساب کے تمام ناجائز ذرائع اور اسراف کے تمام حرام راستوں پر قدغن ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ 'غارم' کسی خلافِ شریعت طریقے کے اختیار کرنے کے سبب سے 'غارم' ہوا ہے یا اس کو یہ افتاد ناجائز راستے میں پیش آئی ہے کلام کا موقع و محل خود شاہد ہے کہ یہاں غارم سے مراد کوئی مجرم نہیں بلکہ وہ شخص ہے جس نے اپنی جائز

معاشی جدوجہد کی راہ میں ٹھوکر کھائی ہو یا کسی سبب سے تاوان میں پڑ گیا ہو۔

'وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ' یہ ایک جامع اصطلاح ہے جس کے تحت جہاد سے لے کر دعوتِ دین اور تعلیمِ دین کے سارے کام آتے ہیں۔ وقت اور حالات کے لحاظ سے کسی کام کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے گی کسی کو کم لیکن جس کام سے بھی اللہ کے دین کی کوئی خدمت ہو وہ 'فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ' کے حکم میں داخل ہے۔

'ابن السبیل' سے مراد

'وَابْنِ السَّبِیْلِ' اس کا مستقل ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ مسافر، مجرد مسافر ہونے کی بنا پر اس بات کا حق دار ہوتا ہے کہ صدقات سے اس کو فائدہ پہنچایا جائے۔ مسافرت اس کو ایسی حالت میں ڈال دیتی ہے کہ قانونی اور اصطلاحی اعتبار سے فقیر نہ ہونے کے باوجود بھی وہ ایک اجنبی جگہ میں اپنی بعض ضروریات کے لیے ایسا محتاج ہوتا ہے کہ اگر اس کی دستگیری نہ کی جائے تو وہ اپنے ذاتی ذرائع سے غریب الوطنی میں ان کا کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے سرائیں، مسافر خانے، قیام و طعام اور رہنمائی کے مراکز قائم کرنا بھی ان کاموں میں شمار ہے جن پر صدقات سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بھی 'فی' کے تحت بیان ہوا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ مسافروں کی سہولت اور آسائش کے تمام ضروری کام اس میں شامل ہیں۔

صدقات کے لیے تملیکِ ذاتی ضروری نہیں

ہمارے فقہا کا ایک گروہ 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' کے 'ل' کو تملیکِ ذاتی کے مفہوم کے لیے خاص کرتا ہے اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ صدقات و زکوٰۃ کی رقوم فقرا و مساکین کی کسی ایسی اجتماعی بہبود پر صرف نہیں ہو سکتیں جس سے ملکیتِ ذاتی تو کسی کی بھی قائم نہ ہو لیکن اس کا فائدہ بحیثیتِ مجموعی سب کو پہنچے۔ ہمارے نزدیک یہ رائے کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اول تو 'ل' کچھ تملیک ہی کے معنی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ یہ متعدد معانی کے لیے آتا ہے اور ان سب معانی کے لیے یہ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے، تملیکِ ذاتی ہی کے معنی کے لیے اس کو خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آخر بہبود، نفع رسانی اور استحقاق کے معانی کے لیے بھی جب اس کا استعمال معروف ہے تو ان معانی میں یہ کیوں نہ لیا جائے؟ پھر آیت میں آپ نے دیکھا کہ بعض چیزیں 'فی' کے تحت بیان ہوئی ہیں اور 'فی' کا متبادر مفہوم تملیک نہیں بلکہ خدمت، مصرف، رفاہیت اور بہبود ہی ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بدیہی ہے کہ صرف تملیکِ ذاتی کی صورت میں غربا کو جتنا فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ نفع ان کو بعض حالات میں اس صورت میں پہنچایا جا سکتا ہے جب کہ ان کی اجتماعی بہبود کے لیے بڑے بڑے کام کیے جائیں پھر تملیکِ ذاتی کے ساتھ اس کو خاص کر کے اس نفع کو محدود کیوں کیا جائے؟ یہاں ہم ان اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ مسئلہ تملیک پر مفصل بحث ہم نے اپنے ایک مستقل مقالے میں کی ہے۔

'فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ' اس اسلوب کے فوائد پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ اس میں اس حکم کے مؤکد اور واجب التعمیل ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے اور مبنی بر علم و حکمت ہونے کی طرف بھی۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۱-۷۲

آگے کی آیات میں پہلے انہی منافقین کی بعض شرارتوں اور ایذا رسانیوں کا ذکر اور ان کو تہدید و وعید ہے۔ پھر منافقین و منافقات اور مومنین و مومنات دونوں کے کردار و صفات کا تقابل کیا ہے تاکہ ایمان و نفاق دونوں واضح ہو کر ہر شخص کے سامنے آ جائیں۔ یہ تقابل حقائق کو نمایاں کرنے میں بھی سب سے زیادہ مددگار ہوتا ہے اور اس سے مقصد اصلاح کو بھی بڑی مدد ملتی ہے اگر اس سے صحیح فائدہ اٹھایا جائے ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۱-۷۲

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ

الثلثة

نَعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا
مُجْرِمِيْنَ ﴿٦٦﴾ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ
يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ
نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَعَدَ اللّٰهُ
الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾ كَالَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا
فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا
اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ
عَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ
اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾ وَعَدَ اللّٰهُ
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

ع ٧ ١٤

وقف لازم

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

ع ۹ ۱۵

ترجمۂ آیات ۶۱-۷۲

اور انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں وہ تو بس کان ہی کان ہیں۔ کہہ دو وہ سراپا گوش تمہاری بھلائی کے باب میں ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اہلِ ایمان کی بات باور کرتا ہے اور تم میں سے جو ایمان لائے ان کے لیے رحمت ہے اور جو اللہ کے رسول کو ایذا پہنچا رہے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ وہ تمہارے آگے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ تمہیں مطمئن کریں، حالانکہ اگر وہ مومن ہیں تو اللہ اور اس کا رسول اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ اس کو راضی کریں۔ کیا انھیں علم نہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔ ۶۱-۶۳

منافقین کو اندیشہ ہے کہ مبادا ان پر کوئی ایسی سورہ اتار دی جائے جو ان کو ان کے دلوں کے بھیدوں سے آگاہ کر دے۔ کہہ دو مذاق اڑا لو، اللہ ظاہر کر کے رہے گا جس سے تم ڈرتے ہو۔ اور اگر تم ان سے پوچھو گے تو جواب دیں گے کہ ہم تو محض سخن گستری اور جی بہلانے کی باتیں کر رہے تھے۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہنسی مسخری کر رہے تھے؟ باتیں نہ بناؤ، تم نے ایمان کے بعد کفر کیا ہے۔ اگر ہم تمہاری کسی جماعت سے درگزر بھی کر لیں تو دوسری کسی جماعت کو ضرور سزا دیں گے بوجہ اس کے کہ وہ مجرم ہیں۔ ۶۴-۶۶

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی چٹے کے بٹے ہیں۔ یہ برائی کا حکم دیتے

اور بھلائی سے روکتے اور ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو بھلا رکھا ہے تو اللہ نے بھی ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ منافق بڑے ہی بد عہد ہیں۔ منافق مردوں، منافق عورتوں اور کفار سے اللہ نے جہنم کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہی ان کے لیے کافی ہے اور ان پر اللہ کی لعنت اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ ان لوگوں کی مانند جو تم سے پہلے ہو گزرے۔ وہ قوت و شوکت میں تم سے زیادہ اور مال و اولاد میں تم سے بڑھ چڑھ کر تھے تو انھوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا اور تم نے بھی اپنے حصہ سے فائدہ اٹھالیا جیسا کہ تمھارے اگلوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا اور تم نے بھی اسی طرح بکواس کی جس طرح انھوں نے کی۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ڈھے گئے اور یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔ کیا انھیں ان لوگوں کی سرگزشت نہیں پہنچی جو ان سے پہلے گزرے۔ قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم ابراہیم، اصحاب مدین اور الٹی ہوئی بستیوں کی۔ ان کے پاس ہمارے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ تو اللہ ان کے اوپر ظلم کرنے والا نہیں بنا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۶۷-۷۰

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ اللہ ان کو اپنی رحمت سے نوازے گا۔ اللہ عزیز و حکیم ہے۔ مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ایسے باغوں کے لیے ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور پاکیزہ مکانوں کے لیے ابد کے باغوں

ہیں اور اللہ کی خوشنودی بھی جو سب سے بڑھ کر ہے بڑی کامیابی یہ ہے۔ ۷۱-۷۲

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۶۱)

'اذن' کا مفہوم

'وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ' 'اذن' کے معنی کان کے ہیں۔ جب یہ کسی شخص کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا جائے تو اس کے اندر ہجو ملیح کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی بس وہ نرا کان ہی کان ہے، ہر ایک کی بات سن لیتا اور اس کو باور کر لیتا ہے۔ ہم نے اس کو ہجو ملیح اس لیے قرار دیا ہے کہ عموماً یہ الزام بڑے لوگوں پر ان کے حاسدین یا منافقین لگاتے ہیں کہ ہے تو بڑا آدمی، اس میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں لیکن کان کا کچا ہے۔ ہر ایرے غیرے کی بات سن لیتا اور مان لیتا ہے۔ ہجو ملیح کا مضمون اس میں یہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی بات سن لینا جہاں آدمی کی شرافت اور کرم النفسی کی دلیل ہے وہیں یہاں اس کی سادگی، بھولے پن اور بے بصیرتی کی بھی دلیل ہے۔

آنحضرت صلعم کے لیے منافقین کی ہجو

منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ لفظ اس کے اسی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر استعمال کرتے۔ وہ اپنی نجی مجلسوں میں اللہ، اس کے رسول اور آیات الٰہی کا مذاق اڑاتے۔ جب آنحضرتؐ تک کسی ذریعہ سے اس کی خبر پہنچتی اور آپ اس پر کچھ خفگی یا ناراضی کا اظہار فرماتے تو منافقین اپنی صفائی میں لوگوں سے یہ کہتے کہ یہ نیک آدمی ہیں جو بات کوئی شخص کان میں ڈال جاتا ہے اس کو سچ جان لیتے ہیں اور اس کی بنا پر ہم جیسے وفاشعاروں اور اطاعت گزاروں سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ ورنہ بھلا ہماری زبانوں سے اللہ و رسول کی شان میں کوئی توہین کا کلمہ قصداً نکل سکتا ہے! ازراہ سخن گستری، مذاقاً اور تفریحاً بلا ارادۂ تحقیر کوئی لفظ زبان سے نکل گیا ہو تو اس کی بات اور ہے۔

منافقین کو جواب

'قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ' یہ منافقین کی بات کا جواب دلوایا ہے کہ اگر تم نبیؐ کو سراپا کان سمجھتے ہو تو اس کا وہ پہلو جو تمہارے ذہن میں ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ وہ سراپا گوش تمہاری بھلائی کے باب میں ہے۔ ان کے کان ہر وقت اس تمنا میں کھلے ہوئے ہیں کہ ان میں تمہاری اچھی باتوں، اچھے کاموں، اچھے ارادوں کی خبریں پڑیں اور ان سے وہ مسرور ہوں۔ وہ تمہاری بری خبریں اور بری سرگوشیاں سننے کے لیے کان نہیں لگائے ہوئے ہیں کہ کوئی آئے اور تمہاری کسی بری حرکت کی خبر سنا جائے اور وہ اس کو قیمتی سوغات سمجھ کر اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیں۔ باپ اپنے بیٹوں کے لیے جتنا شفیق ہوتا ہے نبی اس سے کہیں

زیادہ اپنی امت کے لیے شفیق و رحیم ہوتا ہے۔ وہ ان کی خرابیوں کی ٹوہ میں نہیں بلکہ بھلائیوں کی ٹوہ میں رہتا ہے اور ہر آن وہ یہی چاہتا ہے کہ اس کے کانوں میں کوئی نہ کوئی اچھی ہی بات ان کی بابت پڑے۔ پس اگر تم اس کو سراپا کان سمجھتے ہو تو اس پہلو سے بے شک وہ تمہارے لیے سراپا کان ہی ہے اور یہ چیز تمہارے لیے مبارک ہے نہ کہ کوئی ایسی چیز جس کو تم ہجو اور تحقیر کا موضوع بناؤ۔

نبی کا اعتماد اللہ اور اہل ایمان پر

'یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَیُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ'، یعنی پیغمبر کے متعلق تمہارا یہ گمان بھی بالکل غلط ہے کہ وہ ہر ایرے غیرے کی بات سن لیتے اور اس کو باور کر لیتے ہیں۔ ان کا ایمان اللہ پر ہے اور وہ صرف وہ بات باور کرتے ہیں جو سچے اور پکے اہل ایمان کے ذریعہ سے ان کو پہنچتی ہے۔ اللہ اگر تمہارے باب میں کوئی خبر دے تو اس سے سچی اور پکی خبر اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اگر اہل ایمان تمہارے باب میں نبی کو کوئی اطلاع پہنچائیں تو آخر نبیؐ اس کو کیوں نہ باور کرے؟ مطلب یہ کہ تمہارے باب میں نبی کے ذرائع اطلاع نہ تو ہوائی ہیں اور نہ پیغمبر ایسے بھولے بھالے ہیں کہ وہ ہوائی باتوں پر رائے قائم کرتے اور بدگمان ہوتے چلیں۔ وہ خدا کی رہنمائی میں چلتے اور اہلِ ایمان کی باتوں پر کان دھرتے ہیں۔ یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ ایمان کا صلہ جب 'ل' کے ساتھ آئے تو وہ صرف کسی کی بات کو ماننے اور باور کرنے کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

نبی سراپا رحمت

'وَرَحْمَۃٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ' یعنی تم میں سے جو لوگ صحیح ایمان کی روش اختیار کریں پیغمبر ان کے لیے سراپا شفقت و رحمت ہیں۔ وہ تمہارے بدخواہ نہیں ہیں کہ وہ اپنے کان تمہارے بدخواہوں کے لیے کھول دیں۔ وہ تمہاری اصلاح اور فلاح چاہتے ہیں اور تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی کامرانی اس بات میں ہے کہ تم صحیح ایمان کی روش اختیار کر کے پیغمبر کی رحمت و شفقت کے سزاوار بنو۔ فعل 'اٰمنوا' یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنوں میں ہے یعنی ان لوگوں کے لیے جو محض زبانی مدعیِ ایمان ہونے کے بجائے سچے اور پکے مومن بن جائیں۔ رہے وہ لوگ جو محض زبانی جمع خرچ کے اعتماد پر مومن بنے رہنا چاہتے ہیں اور اپنی باتوں اور حرکتوں سے پیغمبر کو دکھ پہنچا رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ لِیُرْضُوْکُمْ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ اِنْ کَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۶۲)

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

خطاب مسلمانوں سے ہے کہ منافقین اپنے ایمان کے بارے میں تم کو اطمینان دلانے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ ان کے اندر اگر ایمان ہوتا تو تمہارے اطمینان سے زیادہ ان کو اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرنے کی فکر ہوتی۔ یہ بڑی ہی برمحل گرفت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حرکت جو یہ اپنے ایمان کو معتبر ثابت کرنے کے لیے کر رہے ہیں بجائے خود ان کی بے ایمانی کی ایک واضح دلیل ہے۔ یہ اسی طرح کی گرفت ہے جس کی نہایت بلیغ مثال 'اَلَا فِی الْفِتْنَۃِ سَقَطُوْا' میں گزر چکی ہے۔ بسا اوقات

آدمی کا عذر گناہ بدتر از گناہ بن جاتا ہے۔ منافقین نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے جو روش اختیار کی وہ ان کو اور زیادہ مجرم ثابت کرنے والی بن گئی۔ وہ راست باز ہوتے تو اللہ اور رسول کو راضی کرنے کی کوشش کرتے نہ کہ جھوٹی قسموں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے سامنے اپنے کو معصوم اور پیغمبر کو کان کا کچا ثابت کرنے میں لگ جاتے۔ یہ تو پیغمبر کے خلاف پروپیگنڈے کی نہایت عیارانہ مہم ہوئی۔

یہاں 'یُرْضُوْہُ' میں واحد کی ضمیر بھی قابلِ لحاظ ہے۔ چونکہ اللہ اور رسول کی رضا ایک ہی ہے اس وجہ سے ضمیر واحد آئی ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ (۶۳)

'مُحَادَّۃ' کے معنی کسی کے مقابل میں دشمن بن کر اٹھنے کے ہیں۔ 'فَاَنَّ' کا عطف 'اَنَّهٗ' پر ہے۔

منافقین کو عذاب کی دھمکی

یہ منافقین کے مذکورہ بالا پروپیگنڈے پر ان کو دھمکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جرم پر اللہ سے معافی مانگنے اور رسول کو راضی کرنے کی جگہ انھوں نے جھوٹی قسموں کے بل پر مسلمانوں کے اندر اپنی معصومیت کی جو مہم چلا رکھی ہے اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے خلاف جو پارٹی انھوں نے بنائی ہے اس کو مزید مستحکم کریں تاکہ اپنا کام زیادہ مؤثر طریقے پر کر سکیں۔ کیا اتنی طویل تذکیر و تبلیغ کے بعد بھی ان پر یہ حقیقت واضح نہ ہو سکی کہ جو لوگ اللہ اور رسول کے حریف بن کر کھڑے ہوتے ہیں ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بہت بڑی رسوائی ہے۔ 'ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ' میں لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ آج کی رسوائی سے اپنے کو بچانے کے لیے جو کھیل یہ کھیل رہے ہیں بالفرض یہ اس میں کامیاب بھی ہو جائیں تو آخر اس سب سے بڑی رسوائی سے اپنے کو بچانے کی کیا تدبیر کریں گے۔

یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ (۶۴)

'حَذِرَ یَحْذَرُ' کے معنی خائف اور چوکنے ہونے کے ہیں۔ 'تُنَزَّلَ عَلَیْهِمْ'، 'تُقْرَأَ عَلَیْهِمْ' کے مفہوم میں ہے یعنی انھیں پڑھ کر سنا دی جائے۔

منافقین کو پردہ دری کا اندیشہ

منافقین نے مسلمانوں کے سامنے صفائی پیش کرنے کی جو مہم شروع کی تھی یہ اس کا پس منظر سامنے لایا جا رہا ہے کہ اب تک قرآن کے رویہ پر جو تنقید ہوئی تھی وہ اشارات کے انداز میں تھی کہ ان کا زیادہ فضیحتا نہ ہو اور یہ اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح کر لیں لیکن اس سورہ میں ان کو لب و لہجہ بدلا ہوا جو نظر آیا ہے اور ان کی نجی کی مجلسوں کے بعض اسرار جو زیر بحث آئے ہیں تو وہ گھبرا اٹھے ہیں کہ مبادا کوئی ایسی سورہ نازل ہو جائے جو ان کے سارے اسرار و دروں پردہ بے نقاب کر کے رکھ دے۔ چنانچہ

اسی اندیشے کے پیشِ نظر جھوٹی قسموں کے سہارے انھوں نے یہ اپنی صفائی کی مہم چلائی ہے۔ فرمایا کہ ان کو خبردار کر دو کہ اب تمھاری یہ پیش بندی کچھ کارگر ہونے والی نہیں۔ اللہ و رسول اور اللہ کی آیات کا جتنا مذاق اڑانا ہے اڑا لو۔ اب وقت آگیا ہے کہ جن چیزوں کے بے نقاب ہونے سے تم ڈر رہے ہو اللہ ان سب کو بے نقاب کر کے رہے گا۔ یہ امر واضح رہے کہ یہ سورہ جس طرح مشرکین اور اہلِ کتاب کے باب میں خاتمۂ بحث کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح منافقین کے باب میں بھی یہ فیصلہ کن سورہ ہے۔ اس میں، جیسا کہ آگے کے مباحث سے واضح ہو جائے گا، ان کو پوری طرح ننگا کر دیا گیا ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ (۶۵)

'خوض' کا مفہوم

'خوض' کے اصل معنی تو دریا وغیرہ میں گھسنے کے ہیں لیکن بات کے تعلق سے یہ آئے تو اس کا مفہوم بال کی کھال ادھیڑنا بھی ہو سکتا ہے اور ایک بات سے دوسری اور دوسری سے تیسری بات نکالتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلنا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے ترجمہ میں سخن گستری کا لفظ اختیار کیا ہے۔

ایک اور عذرِ گناہ بدتر از گناہ

یہ منافقین کے ایک اور عذرِ گناہ بدتر از گناہ کی مثال پیش کی گئی ہے کہ اگر تم ان سے اس استہزا کی بابت دریافت کرو گے جو وہ اپنی مجالس میں اللہ اور رسول کا کرتے ہیں تو جھٹ جواب دیں گے معاذ اللہ استہزا! ہم تو بس کچھ ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے! قرآن نے ان کو یہیں سے دھر لیا کہ 'أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ' کیا اب تمھاری ہنسی دل لگی اور مشقِ سخن گستری کے لیے اللہ، اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی رہ گئے ہیں، بازی بازی با ریش بابا ہم بازی!

لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۚ إِنْ نَعْفُ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ (۶۶)

آیاتِ الٰہی کا استہزا کفر ہے

یعنی باتیں نہ بناؤ۔ تمھارا یہ عذرِ گناہ تمھارے گناہ سے بھی بدتر ہے۔ اگر کوئی گروہ اللہ اور اس کی آیات کو ہنسی دل لگی کا کھلونا بنا لے تو اس کے مجرم ہونے کے لیے اور کیا چاہیے؟ یہ تو صریحاً ایمان کے اظہار کے بعد کفر کا اعلان ہے۔ تم نے ایمان کا دعویٰ کیا تھا تو اس کا حق تو یہ تھا کہ اپنے عمل سے اس کا ثبوت فراہم کرتے لیکن عمل سے تم نے ثبوت فراہم کیا ہے کفر کا اس لیے کہ اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کا استہزا کفر ہے۔ انعام آیت ... کے تحت اس مسئلہ پر گفتگو ہو چکی ہے۔

منافقین کی بعض خطرناک ٹولیاں

'إِنْ نَعْفُ عَنْ طَائِفَةٍ ... الآية' اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ منافقین کی بہت سی ٹولیاں تھیں جن کے نفاق کی نوعیتیں اور ان کے شر و فساد کے درجے مختلف تھے۔ ان کی بعض ٹولیاں جیسا کہ آگے اسی سورہ میں واضح ہوگا، نہایت خطرناک تھیں۔ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان

پہنچانے کے لیے ایسی ایسی چالیں چلیں کہ ان میں سے ایک چال بھی اگر کامیاب ہو جاتی تو کھلے معاندین کی تمام چالوں پر بھاری ہوتی۔ ایسی ہی بعض ٹولیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر ہم نے تمہاری بعض ٹولیوں سے اس دنیا میں درگزر بھی کر لیا اور ان کے معاملے کو آخرت ہی پر اٹھا رکھا تو بعض ٹولیاں تو لازماً اسی دنیا میں ہمارے عذاب کی زد میں آئیں گی اور ہم ان کے جرائم کی پاداش میں ان کی بیخ کنی کر کے رہیں گے۔ چنانچہ آگے اسی سورہ میں مسجد ضرار کے بانیوں اور بعض دوسرے گروہوں کا ذکر آئے گا۔ اور ان کا جو حشر ہوا وہ بھی بیان ہوگا۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ هِىَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ڏ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ۭ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۶۷-۷۰)

اسلامی معاشرہ کی تطہیر منافقین سے

اب تک منافقین اپنے دعوائے ایمان کے سبب سے مسلمانوں کے ساتھ رلے ملے ہوئے تھے۔ یہ پہلی بار ان کی علامتیں بتا کر ان کو اہل ایمان سے چھانٹ کر الگ اور دنیا اور آخرت دونوں ہی اعتبار سے ان کو مسلمانوں کے بجائے کفار و مشرکین کا شریک و سہیم قرار دیا گیا ہے۔ یہ منافقین کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ اپنے کو مسلمانوں کے اندر گھسائے رکھنے کی کوشش نہ کریں۔ اور مسلمانوں کو بھی آگاہی ہے کہ وہ اس رنگ کی بھیڑوں کو اپنے گلے میں شامل نہ ہونے دیں۔ یہ گویا اسلامی معاشرہ کی غیر مطلوب عناصر سے تطہیر کی راہ میں پہلا قدم ہے اور یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح مسلمانوں نے کفار و مشرکین اور اہل کتاب سے اعلانِ براءت کر دیا ہے اسی طرح اپنے اندر کے ان نام نہاد مسلمانوں کو بھی چھانٹ کر الگ کریں جو اپنے اعمال و اخلاق میں انہی کفار و مشرکین کے ہم رنگ ہیں۔

منافقین اور منافقات دونوں کا ایک ہی انجام

'اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ' یہاں منافقین کے ساتھ منافقات کا بھی ذکر تصریح کے ساتھ فرمایا ہے اور دونوں کو برابر کا شریک جرم قرار دیا ہے تاکہ ان کو بھی تنبیہ ہو کہ جو انجام ان کے مردوں کا ہونے والا ہے وہ بھی اس سے بچنے والی نہیں ہیں اگر انھوں نے اپنے کو خدا کے غضب سے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ دین کے معاملے میں تبعیت اور ماتحتی کوئی عذر نہیں ہے بلکہ اپنی نجات کے لیے جدوجہد ہر نفس کی، مرد ہو یا عورت، خود اپنی ذمہ داری ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے

کہ اس نفاق کے کمیل میں عورتوں کا بھی نمایاں حصہ تھا خاص طور پر اس پہلو سے کہ جان اور مال کی محبت نفاق کے اولین اسباب میں سے ہے اور اس محبت کو مردوں پر مستولی کرنے میں سب سے زیادہ ہاتھ عورتوں کا ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ بیوی بچے آدمی کو بخیل اور بزدل بنا چھوڑتے ہیں۔ اوپر جن منافقین کا ذکر گزرا ہے ان کی اصل بیماری یہی بتائی گئی ہے کہ مال و اولاد کی محبت دین کے تقاضوں کے مقابل میں ان پر غالب آگئی ہے۔

منافقین کی ہر بات دین کے برعکس

یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ یعنی ان کی ہر بات دین کے برعکس ہے۔ جن چیزوں کے لیے لوگوں کو ابھارنا چاہیے ان سے یہ لوگوں کو روکتے ہیں اور جن چیزوں سے روکنا چاہیے ان کے لیے لوگوں کو ورغلاتے ہیں۔ بخل کے سبب سے خود اپنی مٹھیاں بھی بھینچے رہتے ہیں اور اللہ کے جو بندے اپنی گاڑھی کمائی میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان پر بھی فقرے اور پھبتیاں چست کر کے ان کی دل شکنی کرتے ہیں۔

منافقین کی بے توفیقی کا اصلی سبب۔

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ یہ ان کی اس بے توفیقی اور محرومی کا سبب بیان ہوا ہے کہ یہ الٹی چال یہ اس لیے چل رہے ہیں کہ یہ خدا کو بھلا بیٹھے ہیں اور سنت الٰہی، جیسا کہ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ ....الآیۃ والی آیت میں بیان ہوئی ہے، یہ ہے کہ جو لوگ خدا کو بھلا بیٹھتے ہیں ان پر ایک شیطان مسلط ہو جاتا ہے جو ان کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ پھر ایسے لوگوں کو خدا بھی بھلا دیتا ہے۔ "بھلا دیتا ہے" یعنی ان کو نظر انداز اور توفیق خیر سے محروم کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور رہنمائی انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کو یاد رکھتے ہیں۔

اصلی غدار

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ فاسق یہاں بدعہد اور نافرمان کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان منافقوں کو ان کے اظہار اسلام کی بنا پر کوئی یہ نہ خیال کرے کہ ہیں تو بہرحال یہ اسلام کے نام لیوا۔ یہ اسلام کے نام لیوا نہیں بلکہ اصلی عہد شکن اور غدار یہی ہیں۔ انھوں نے سمع و طاعت کا عہد کر کے اس کو توڑا ہے اور اسلام کا کلمہ پڑھ کر اس کی بیخ کنی کی کوشش کی ہے۔ اس وجہ سے بدعہدی اور غداری میں جو درجہ ان کا ہے کسی کا بھی نہیں۔

غداروں کا انجام

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یہ ان کا آخرت میں انجام بیان ہوا ہے کہ یہ اسلام کے مدعی ہونے کے سبب سے کسی رعایت کے مستحق نہیں ہوں گے بلکہ جس طرح کھلے ہوئے کفار جہنم میں ہمیشہ کے لیے جھونک دیے جائیں گے اسی طرح اسلام کے یہ غدار جہنم میں ہمیشہ کے لیے جھونک دیے جائیں گے۔ هِيَ حَسْبُهُمْ یعنی یہ جہنم ہی ان کا کچومر نکال دینے کے لیے کافی ہوگی۔ مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ یعنی اللہ کی طرف سے ان پر لعنت ہو جائے گی جس کے نتیجے میں

امید کے سارے دروازے ان پر بند ہو جائیں گے۔ ایک دائمی عذاب ان پر مسلط ہوگا جس سے کبھی بھی ان کو رہائی نصیب نہیں ہوگی۔

منافقین کو براہِ راست دھمکی

'کَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ'، یہ دھمکی ہے جو منافقین کو براہِ راست مخاطب کر کے دی گئی ہے جس سے اس میں زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ مال و اولاد کی کثرت جو تمہارے حصہ میں آئی ہے اس سے یہ غرہ نہ ہو کہ خدا کی نظروں میں تمہارا رویہ مبغوض نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس نے تم کو یہ کچھ دے رکھا ہے۔ تم سے پہلے جو قومیں گزری ہیں ان کو تم سے بھی زیادہ اللہ نے دے رکھا تھا۔ لیکن کیا ہوا؟ ان کے لیے اس دنیا سے جتنا فائدہ اٹھانا مقدر تھا جب انھوں نے اتنا فائدہ اس سے اٹھا لیا تو خدا نے ان کو ہلاک کر دیا۔ انہی کی طرح تم نے بھی اپنے حصہ سے فائدہ اٹھا لیا اور انہی کی طرح کی موشگافیاں اور لاالفضولیاں بھی کر چکے تو تمہاری تباہی کی ساعت بھی آ کھڑی ہے۔ جس طرح ان کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ڈھے گئے اور وہ نامراد ہوئے اسی طرح تمہارے اعمال بھی دنیا اور آخرت میں ڈھے جائیں گے اور تم بھی نامراد ہو گے۔ مطلب یہ کہ مال و اولاد کو نہیں، اپنے اعمال کو دیکھو۔ مال و اولاد تو خدا شریروں اور بدبختوں کو بھی دے دیتا ہے۔ اس کے فیصلے اعمال و کردار پر صادر ہوتے ہیں۔

اقوامِ ماضیہ کے انجام کا حوالہ

'اَلَمۡ یَاۡتِہِمۡ نَبَاُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ..... الایۃ' یہ اوپر والی آیت کے اجمال کی تفصیل ہے۔ جن قوموں کی طرف اشارہ فرمایا تھا ان کا حوالہ دے دیا۔ ان تمام اقوام کی سرگزشتیں سورۂ اعراف میں بیان ہو چکی ہیں۔ قومِ ابراہیم سے مراد ان کی وہ قوم ہے جس کو انھوں نے توحید کی دعوت دی، پھر ان سے مایوس ہو کر اللہ کے حکم سے انھوں نے ہجرت فرمائی۔ 'مُؤۡتَفِکٰت' سے مراد قومِ لوط کی بستیاں ہیں۔ اس لفظ سے ان بستیوں کی تعبیر کی وجہ دوسرے مقام میں واضح ہو چکی ہے۔ فرمایا کہ یہ قومیں جو تباہ ہوئیں تو اس وجہ سے نہیں کہ اللہ نے ان پر کوئی ظلم کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ نے ان پر حجت تمام کرنے کے لیے اپنے رسول بھیجے لیکن انھوں نے ان کو جھٹلایا اور اپنی سرکشی پر اڑی رہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے ان کو تباہ کر دیا۔ مطلب یہ کہ اس سرگزشت کا اعادہ تمہارے ذریعے سے ہونے والا ہے۔

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ۘ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَیُطِیۡعُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ سَیَرۡحَمُہُمُ اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿ وَعَدَ اللّٰہُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ ؕ وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ (۷۱-۷۲)

منافقین اور منافقات کا کردار واضح کرنے کے بعد اب یہ مومنین اور مومنات کا کردار واضح کیا جا رہا ہے۔ ان کی بابت فرمایا تھا کہ ان کے مرد اور عورتیں سب ایک ہی چٹے کے بٹے ہیں، نفاق کی پرورش میں دونوں کی سرگرمیاں یکساں ہیں۔ ان کی بابت فرمایا کہ یہ ایمان کے مقتضیات و مطالبات کی تعمیل و تکمیل میں ایک دوسرے کے ساتھی، دست و بازو اور ہمدرد و غم گسار ہیں۔ مومن بندے جب اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کے لیے نکلتے ہیں تو مومنہ بندیاں ان کے پاؤں کی زنجیر اور گلے کا پھندا بننے کی کوشش نہیں کرتیں بلکہ سچے دل سے ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور اپنے ایثار، اپنی دعاؤں اور اپنی بے لوث وفاداری اور امانت داری سے ان کے جہاد میں تعاون کرتی ہیں اور اس طرح خود بھی اجر و ثواب میں شریک بنتی ہیں۔

مومنین اور مومنات کا کردار

منافقین اور منافقات کا حال یہ ہے کہ منکر کا حکم دیتے اور معروف سے روکتے ہیں، برعکس ان کے مومنین اور مومنات معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں۔

منافقین اور منافقات انفاق سے اپنے ہاتھ روکے ہوئے ہیں اور اللہ کو انھوں نے بھلا رکھا ہے لیکن مومنین اور مومنات کا حال یہ ہے کہ 'یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ' وہ نماز کا اہتمام کرتے ہیں جو ذکر الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے 'وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ' زکوٰۃ ادا کرتے ہیں جو آدمی کے ہاتھ کو راہ خدا میں انفاق کے لیے کھولتی اور اس کے بخل کو دور کرتی ہے۔

منافقین اور منافقات کا حال یہ ہے کہ وہ بدعہد اور غدار ہیں 'اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ' برعکس اس کے مومنین اور مومنات کا حال یہ ہے کہ 'یُطِیْعُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ' اللہ اور رسول سے سمع و طاعت کا جو عہد انھوں نے باندھا ہے ہر مرحلہ میں پوری راستبازی اور کامل وفاداری سے اس کو نباہ رہے ہیں۔

'سَیَرْحَمُھُمُ اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ' ظاہر ہے کہ جب اللہ کے ساتھ دونوں کا معاملہ الگ الگ ہے تو اللہ کا معاملہ بھی دونوں کے ساتھ مختلف ہے۔ منافقین اور منافقات کے لیے اوپر لعنت مذکور ہوئی ہے۔ اس کے مقابل میں مومنین اور مومنات کے لیے اللہ کی رحمت ہے۔ خدا عزیز اور حکیم ہے۔ اس کی قدرت اور حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا ہر معاملہ عدل اور رحمت پر مبنی ہو۔ حرف 'س' اس رحمت کے ظہور کی قربت کی بشارت ہے کہ اب اس میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ ظاہر ہی ہوا چاہتی ہے۔

مومنین اور مومنات کے لیے اللہ کا وعدہ

'وَعَدَ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ ... الایۃ' یہ آیت اوپر کی آیت ۶۸ کے مقابل میں ہے۔ اس میں وعید منافقین اور منافقات کے لیے مذکور ہوئی۔ اس میں اللہ کا وعدہ مومنین اور مومنات کے لیے بیان ہوا ہے۔ لفظ 'رضوان' اور لفظ 'عدن' پر دوسرے مقام میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں یہ اس لعنت کے مقابل میں ہے جو اوپر منافقین کے لیے مذکور ہے۔ جس طرح لعنت تمام نقمتوں اور ابدی محرومیوں کی ایک جامع

تعبیر ہے، اسی طرح 'رضوان' تمام رحمتوں اور لازوال و بے پایاں نعمتوں اور مسرتوں کی ایک جامع تعبیر ہے اسی لیے فرمایا کہ یہ بہت بڑی چیز اور بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس آیت کو پڑھتے ہوئے اوپر 'اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْخٰسِرُوْنَ' کے ٹکڑے کو پیش نظر رکھیے۔ تقابل نظم کے کھولنے اور حقائق کی توضیح میں بہت معین ہوتا ہے۔

۱۲- آگے کا مضمون ــــ آیات ۷۳-۸۰

آگے کی آیات میں پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ یہ منافقین تمہاری نرم مزاجی اور کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ چیٹے ہوتے ہیں۔ اب ان کے بارے میں اپنا رویہ سخت کرو تاکہ درست ہونا ہو تو یہ درست ہوں ورنہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔ یہ اپنی مجلسوں میں کفریہ کلمات بکتے اور جھوٹی قسموں سے تم کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے ارادے نہایت خطرناک تھے لیکن اللہ نے وہ پورے نہیں ہونے دئے۔ اب ان کو مزید مہلت دینے کی گنجائش نہیں۔ اللہ اور رسول نے ان کو اپنے فضل سے جو نوازا تو یہ چیز ان کے لیے شکر گزاری اور ممنونیت کی بجائے شرارت اور اسلام دشمنی کا باعث بن گئی۔ یہ اظہار تو یہ کرتے تھے کہ اللہ نے انھیں مال دیا تو وہ پوری فیاضی سے خدا کی راہ میں خرچ کریں گے لیکن جب اللہ نے انھیں مال دیا تو انھوں نے اللہ اور رسول سے منہ پھیرا اور ان کے اس رویہ نے ان کے دلوں میں نفاق کی جڑیں اتنی مضبوط جما دی ہیں کہ اب وہ اکھڑ نہیں سکتیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہی نہیں کہ یہ خود بخیل بن بیٹھے ہیں بلکہ اللہ کے جو مخلص بندے اپنی گاڑھی کمائی میں سے، خوش دلی اور نیازمندی سے خرچ کرتے ہیں یہ ان کا بھی مذاق اڑاتے اور ان کی دل شکنی کرتے ہیں تاکہ وہ بھی خرچ کرنے سے رک جائیں۔ ساتھ ہی نہایت شدت کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لیے استغفار کرنے سے روک دیا ہے کہ اب یہ تمہاری طرف سے اس رأفت و رحمت کے سزاوار نہیں رہے بلکہ ہر پہلو سے شدت ہی کے سزاوار ہیں ــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۳-۸۰

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٧٣﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ

فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ
اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ
مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٧٤﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ
فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ
مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧٦﴾ فَاَعْقَبَهُمْ
نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا
وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿٧٧﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ
سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿٧٨﴾ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ
الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِى الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ
اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿٧٩﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٨٠﴾ ع

ع ١٠ ٨ ١٦

ترجمۂ آیات ٧٣-٨٠

اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سخت بن جاؤ۔ اور ان کا ٹھکانا
جہنم ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔ یہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے
نہیں کہا حالانکہ انھوں نے کفر کا کلمہ کہا اور اپنے اسلام کے اظہار کے بعد کفر کا ارتکاب
کیا اور انھوں نے وہ چاہا جو وہ نہ پا سکے۔ ان کا یہ عناد صلہ ہے صرف اس بات کا
کہ اللہ اور اس کے رسول نے ان کو اپنے فضل سے غنی کیا۔ اگر یہ توبہ کر لیں تو ان کے

لیے بہتر ہے اور اگر یہ اعراض کریں گے تو خدا ان کو دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور زمین میں نہ کوئی ان کا یار ہو گا نہ مددگار۔ ۷۳-۷۴

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل سے نوازا تو ہم خوب صدقہ کریں گے اور خوب نیکیاں کرنے والوں میں سے ہوں گے تو اللہ نے جب ان کو اپنے فضل میں سے عطا فرمایا تو وہ اس میں بخیل بن بیٹھے اور برگشتہ ہو کر منہ پھیر لیا۔ تو اس کی پاداش میں خدا نے ان کے دلوں میں اس دن تک کے لیے نفاق جما دیا جس دن وہ اس سے ملیں گے بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔ کیا انھیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ ان کے راز اور ان کی سرگوشی کو جانتا ہے اور اللہ تمام غیب کو جاننے والا ہے۔ ان لوگوں کی سرگوشیوں کو جو خوش دلی سے انفاق کرنے والے اہل ایمان پر ان کے صدقات کے باب میں نکتہ چینی کرتے ہیں اور جو غریب صرف اپنی محنت مزدوری ہی سے انفاق کرتے ہیں تو ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں۔ اللہ نے ان کا مذاق اڑایا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔ اگر تم ان کے لیے ستر بار بھی مغفرت چاہو گے تو بھی اللہ ان کو بخشنے والا نہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اللہ بدعہدوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۷۵-۸۰

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ جَٰهِدِ ٱلْكُفَّارَ وَٱلْمُنَٰفِقِينَ وَٱغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ ٱلْمَصِيرُ (۷۳)

اصلاً تو یہاں مقصود صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی تاکید ہے کہ آپ اپنا رویہ منافقین کے باب میں یکسر تبدیل کرلیں اور شدت کے ساتھ ان کا احتساب کریں لیکن ساتھ ہی کفار کا بھی حوالہ دے دیا ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اب یہ منافقین مسلمانوں کے زمرہ کے لوگ نہیں ہیں بلکہ یہ بھی کفار ہی کے زمرہ میں شامل ہیں۔ جہاد کا لفظ قتال اور شدتِ احتساب و دارو گیر سب پر حاوی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کے ساتھ اس نوعیت کا جہاد کرو جس کا تمہیں اعلانِ براءت کے تحت تفصیل سے حکم دیا جا چکا ہے اور ان منافقین کے ساتھ احتساب اور دارو گیر کا جہاد کرو۔ 'وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ' اسی احتساب اور دارو گیر کی وضاحت ہے۔ یعنی اب تک تم نے ان کے ساتھ نرمی و رأفت کا جو رویہ رکھا اس کی قدر انھوں نے نہیں پہچانی۔ یہ تمہاری کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر اپنی شرارتوں میں اور دلیر ہوتے چلے گئے۔ جھوٹے بہانوں اور جھوٹی قسموں کو انھوں نے اپنے لیے سپر بنا رکھا ہے اور تم اپنی طبیعت کی نرمی کے سبب سے ان کی چالوں سے آگاہ ہونے کے باوجود طرح دے جاتے ہو۔ اب اس کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اب ان کو اچھی طرح کسو اور ہر معاملے میں سخت کسوٹی پر پرکھو تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ جھوٹ اور فریب کی نقاب ان کے چہروں پر باقی رہنے والی نہیں ہے۔ اب یا تو انھیں مسلمانوں کی طرح مسلمان بن کر رہنا ہوگا یا اس انجام سے دوچار ہونا پڑے گا جو کفار کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ آیت ۴۳ 'عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ...... الاٰية' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے اس لیے کہ یہ ہدایت اسی کی توضیح مزید ہے۔

منافقین کے شدید احتساب کا حکم

'وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ' یعنی اس دنیا میں یہ تمہاری اور اہلِ ایمان کی سختی اور سخت گیری کے سزاوار ہیں اور اس کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو نہایت برا ٹھکانا ہے۔ اس لیے کہ اس پر ایسے سخت گیر ملائکہ مامور ہیں جو ذرا بھی نرمی نہیں برتیں گے بلکہ ان کے باب میں خدا کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ 'عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ' (التحریم - ۶)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِـيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝۷۴

منافقین کا جھوٹ اور کفرِ غلیظ

'يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا' - اوپر آیت ۶۵ میں گزر چکا ہے کہ منافقین اپنی مجالس میں اللہ کا، اس کی آیات کا اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے لیکن جب ان سے پوچھ گچھ ہوتی تو اصل بات گول کر جاتے اور قسم کھا کر اطمینان دلاتے کہ ہم نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی، ہم تو محض ہنسی دل لگی کر

رہے تھے۔ فرمایا کہ ان کی یہ قسمیں جھوٹی ہیں۔ یہ کفر کا کلمہ بکتے ہیں اور پوچھ گچھ ہوتی ہے تو مکر جاتے ہیں ـــــ اوپر والی آیت میں ان کو زمرۂ کفار میں جو شامل کیا ہے یہ گویا اس کی دلیل بیان ہوگئی ہے۔

'وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ' یہ ان کے جرم کی سنگینی کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اظہار تو اسلام کا کیا لیکن اپنے اس استہزا سے ارتکاب کفر کا کیا۔ یہ امر واضح رہے کہ دعویٰ اسلام کا کرنا اور عمل سے اثبات کفر کا کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک صریح کفر سے زیادہ مبغوض ہے اس لیے کہ اس میں کفر کے ساتھ اللہ اور رسول اور اہل ایمان کے ساتھ دھوکا بازی بھی شامل ہو جاتی ہے جو کھلے ہوئے کفر میں نہیں ہوتی اسی حقیقت کی طرف سورۂ صف میں یوں اشارہ فرمایا ہے يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (اے ایمان والو، تم اس چیز کا دعویٰ کیوں کرتے ہو جو کرتے نہیں، اللہ کے نزدیک یہ بات زیادہ مبغوض ہے کہ تم جو کرتے نہیں اس کا دعویٰ کرو) اسی بنا پر منافقین، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔

منافقین کے خبیثانہ منصوبے اور ان کی نامرادی

'وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا' یہ دو لفظوں میں نہایت بلاغت کے ساتھ ان کے تمام خبیثانہ منصوبوں اور ساتھ ہی ان کی محرومیوں اور ناکامیوں کی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا بس چلتا تو انھوں نے تو وہ منصوبے بنائے تھے کہ اسلام کی جڑ ہی اکھاڑ کے پھینک دیتے لیکن اللہ نے ان کے ارادوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ آیت ۴۸ کے تحت ہم منافقین کی بعض فتنہ پردازیوں اور شرارتوں کا ذکر کر کے آئے ہیں اور آگے ان کی مزید شرارتوں کا ذکر آئے گا لیکن ہر موقع پر انھوں نے منہ کی کھائی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے برسر موقع ان کا راز فاش کر دیا۔

منافقین کی کمینگی اور ناسپاسی

'وَمَا نَقَمُوْا اِلَّا اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ' یہ ان کی تنگ ظرفی اور کمینگی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ و رسول نے تو ان پر احسان فرمایا لیکن انھوں نے اس احسان کا یہ حق ادا کیا کہ اللہ اور رسول کا مذاق اڑاتے اور رات دن اسلام کی بیخ کنی کی سازش کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مدینہ کے عام لوگ اسلام سے پہلے بیشتر نہایت غریب تھے۔ اسلام کے بعد جب فتوحات کے دروازے کھلے تو یوں تو بحیثیت مجموعی سب ہی کے حالات بدل گئے لیکن خاص طور پر منافقین کے تو دن پھر گئے۔ اول تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دلداری کے خیال سے ان کو دیتے بھی زیادہ تھے، [illegible] کے سبب سے لیتے بھی سو بہانوں سے تھے۔ مزید براں ان کے پاس صرف لینے ہی والے ہاتھ تھے دینے والے ہاتھ سرے سے تھے ہی نہیں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع آیا تو، اوپر بھی ذکر ہوا اور آگے بھی تفصیل آ رہی ہے، صاف کترا جاتے۔ اس طرح یہ لوگ مال دار بن گئے، اور اس مال داری کا صلہ اسلام کو، جس کے نام پر وہ مالدار بنے، انھوں نے یہ دیا کہ [illegible] کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں

کرتے رہے۔

فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ...... الاٰیۃ۔ یہ ان کو دھمکی ہے کہ اگر یہ توبہ کرلیں تو انہی کے حق میں بہتر ہے ورنہ یاد رکھیں کہ خدا انھیں دنیا میں بھی عذاب دے گا اور آخرت میں بھی۔ یہ دنیا میں اس عذاب میں حصہ دار ہوں گے جو کفار و مشرکین کے لیے مقدر ہو چکا ہے اور آخرت میں بھی انہی کے ساتھی ہوں گے اور یہ بھی اچھی طرح یاد رکھیں کہ اس سرزمین پر ان کا کوئی یار ہو گا نہ مددگار۔ جن کے ساتھ ان کا سازباز ہے ان سب پر عنقریب نفسی نفسی کا وہ وقت آنے والا ہے کہ وہ خود اپنی مدد نہیں کر سکیں گے تو ان کی مدد وہ کیا کریں گے۔

منافقین کو دھمکی

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۷۵-۷۷)

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ یہ انھی اسلام کی بدولت مال دار بنے ہوئے کچھ لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ جب یہ غریب تھے تو اس وقت تو ان کا حال یہ تھا کہ ہر جگہ یہ اپنے اس شوق اور اس تمنا کا اظہار کرتے پھرتے تھے کہ اگر ہمارے حالات بھی اللہ نے سدھار دیے تو ہم بھی خدا کی راہ میں خوب خرچ کریں گے اور دین کی بڑی بڑی خدمتیں کر کے صالحین میں اپنا نام روشن کریں گے لیکن جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کی تمنا پوری کر دی اور دینے کا وقت آیا تو اس طرح منہ پھیر کر چل دیے ہیں گویا اللہ اور رسول سے کبھی ان کا کوئی قول و قرار تھا ہی نہیں۔ "چل دینا" کبھی اس نوعیت کا ہوتا ہے جس کے بعد مڑ کے آنے کی توقع ہوتی ہے لیکن یہاں تَوَلّٰی کے بعد وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ کی قید نے یہ واضح کر دیا کہ انفاق کا نام سن کر وہ اس طرح چل دیتے ہیں کہ پھر مڑ کے دیکھتے بھی نہیں۔

اسلام کی بدولت مال دار بننے والوں کی کمزوری

یہ انسان کی عجیب کمزوری ہے کہ جب تک ایک چیز اس کو حاصل نہیں ہوتی اس وقت تک تو یہ تمنا کرتا ہے کہ اگر مجھے یہ حاصل ہو جائے تو دوسروں کی طرح اس کو کسی غلط مصرف میں ضائع نہیں کروں گا بلکہ اس کو فلاں اور فلاں اعلیٰ مقاصد میں صرف کر کے نیکی اور عدل کی ایک نظیر قائم کر دوں گا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ اس کو وہ چیز دے دیتا ہے تو اسے یہ بات یاد بھی نہیں رہتی کہ اسی چیز کے لیے اس نے اپنے رب سے دل میں کیا کیا قول قرار کیے ہیں اور کس کس طرح اپنی تمناؤں کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کو اپنی قابلیت اور اپنے استحقاق کا ثمرہ سمجھ کر وہ اس کا مالک بن بیٹھتا ہے اور خدا سے زیادہ اس کو شیطان کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے نکلتے ہیں جو نعمت پا کر منعم کا حق پہچانیں اور اس کو صحیح صحیح استعمال کریں۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ۔ اعقاب کے معنی ایک شے کے بعد دوسری چیز کو اس کے ثمرہ اور نتیجہ کے طور پر ظہور میں لانا ہے۔

نفاق کی جڑ جمادی الاعمل

یعنی جن لوگوں نے اللہ سے اپنے کیے ہوئے وعدے کی اس طرح خلاف ورزی کی اور برابر جھوٹ بولتے رہے۔ خدا نے ان کے اس عمل کی پاداش میں ان کے دلوں کے اندر نفاق کی ایسی جڑ جما دی ہے جو خدا کی ملاقات کے دن تک اسی طرح جمی رہے گی اور اسی وقت اکھڑے گی جب جزائے اعمال کا مرحلہ بالکل سامنے ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے نفاق کی رضاعت و پرورش پر ایک مدت صرف کر دی ہے۔ یہ چیز اتفاقاً ان کے اندر نہیں گھس آئی ہے بلکہ ان کے ایک دانستہ نقض عہد اور طویل جھوٹ اور فریب کا مولود فساد ہے جس سے ان کی جان اب مر کے ہی چھوٹے گی۔ یہ توقع نہ رکھو کہ ان کو توبہ اور اصلاح کی توفیق ہو گی۔ اب تو ان کے دلوں کا یہ کثیف پردہ اسی وقت ہٹے گا جب یہ اصل حقیقت کو سورج کی طرح سامنے دیکھ لیں گے۔ اسی سے ملتی جلتی بات آگے مسجد ضرار کے بانیوں سے متعلق فرمائی ہے۔ لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ۔ ۱۱۰ (یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ان کے دلوں میں ہمیشہ شک کی تعمیر بن کر جمی رہے گی۔ الا آنکہ ان کے دل پارہ پارہ ہو جائیں اور اللہ علیم و حکیم ہے)۔

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ۔ اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ (۷۸-۷۹)

منافقین کی بلادت

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ۔ یہ اسلوب کلام استعجاب اور حسرت کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی طویل تعلیم و تربیت، ایسی مسلسل سعی تطہیر و تزکیہ اور اتنے بے شمار حقائق کے انکشاف کے بعد بھی کیا یہ لوگ اتنے ٹھس اور غبی ہیں کہ اتنی موٹی سی بات بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ خدا ان کے سارے راز اور ساری سرگوشیوں کو جانتا ہے اور اللہ تمام غیب کا عالم ہے۔ یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ خدا ہر چیز کو فعلاً بھی جانتا ہے اور صفتہً بھی، اسی وجہ سے یہاں اور اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ قرآن کے دوسرے مقامات میں، خدا کے احاطہ علم کو فعل کے صیغہ سے بھی واضح کیا گیا ہے اور صفت کے صیغہ سے بھی۔ باعتبار نظم یہ آیت آگے والی آیت کی تمہید ہے جس میں ان منافقین کی ان نکتہ چینیوں اور سرگوشیوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو وہ مومنین مخلصین کی حوصلہ شکنی کے لیے اپنے حلقوں میں کرتے رہتے تھے۔

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ اَلَّذِیْنَ یہاں میرے نزدیک نجواهم، میں 'هُمْ'

سے بدل ہے۔ اگرچہ مجھے اس پر پورا جزم نہیں ہے لیکن میں نے ترجمہ میں اسی کا لحاظ رکھا ہے۔ کشاف میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

'مُتَطَوِّع' اور 'مُطَّوِّع' دونوں ایک ہی لفظ ہیں۔ 'مُطَّوِّع' اس کو کہتے ہیں جو صرف فرائض و واجبات ہی ادا کر لینے پر قناعت نہ کرے بلکہ اپنی خوشی اور حوصلہ مندی سے نفلی نیکیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔

'مُطَّوِّع' کا مفہوم

'لمز' کے معنی عیب لگانا، ہجو کرنا، مذمت کرنا۔

اوپر کی آیات میں یہ بیان ہوا تھا کہ منافقین اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ خود خرچ نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو بھی خدا کی راہ میں خرچ کرتے دیکھ نہیں سکتے۔ جس کو خرچ کرتے دیکھتے ہیں اس کو اپنے ہمز و لمز کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ جو فیاض اور مخلص مسلمان فیاضی اور خوش دلی سے خدا کی راہ میں دیتے ہیں ان کو تو کہتے ہیں کہ یہ ریاکار اور شہرت پسند ہے، اپنی دینداری اور سخاوت کی دھونس جمانے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ جو غریب بے چارے کچھ رکھتے ہی نہیں، اپنی محنت مزدوری کی گاڑھی کمائی ہی میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی حوصلہ شکنی کے لیے ان کا یہ مذاق اڑاتے اور ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں کہ لو آج یہ بھی اٹھے ہیں کہ حاتم کا نام دنیا سے مٹا کر رکھ دیں۔

منافقین کا ہمز و لمز

بخیلوں اور کنجوسوں کی نفسیات کا یہ پہلو ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اپنی بخالت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے ان کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ دوسرے بھی بخیل بنے رہیں۔ نکٹا دوسروں کو بھی نکٹا ہی دیکھنا چاہتا ہے تاکہ اسے کوئی نکٹا کہنے والا باقی نہ رہے۔ یہی نفسیات ان منافقین کی بھی تھی۔ پھر اس سے ان کے اسلام دشمنی کے جذبے کو تسکین ہوتی تھی۔ وہ خود اسلام کے لیے ایک کوڑی خرچ کرنا چاہتے تھے نہ اس پر راضی تھے کہ کوئی دوسرا خرچ کرے۔ اپنی اس خواہش کے برخلاف وہ دوسروں کو جب دیکھتے کہ وہ اسلام کے لیے سب کچھ اس دریا دلی سے لٹا رہے ہیں گویا اپنے ہی گھر بھر رہے ہیں، یہاں تک کہ مزدور اپنی مزدوری ہی میں سے، بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر، اس خوشی سے دیتا ہے گویا اپنی سیر آدھ سیر کھجور یا جو کے عوض دولت کونین خرید رہا ہے تو ان منافقین کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ وہ غصہ سے کھولتے اور حسد سے جلتے، پھر اپنے دل کا بخار طعن و تشنیع، طنز اور پھبتی سے نکالتے۔

بخیلوں کی نفسیات کا ایک خاص پہلو

'سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ' اسی طرح کا فقرہ ہے جس طرح بقرہ میں فرمایا ہے 'اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ' یعنی یہ تو اہل ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن اللہ ان کا مذاق اڑا رہا ہے کہ ان کی رسی دراز کیے جا رہا ہے کہ یہ خوب کلیلیں کر لیں تب ان کو وہاں سے پکڑے جہاں سے پکڑے جانے کا ان کو سان گمان بھی نہ ہو۔

اللہ کی ڈھیل

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۸۰)

یہ اسی سختی اور سخت گیری کی تاکید پر مبنی ہے جس کی ہدایت 'وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سراپا رحمت و شفقت تھے اس وجہ سے ان منافقین کی تمام شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں کے باوجود، ان کی اصلاح اور نجات، آپ کو اس قدر عزیز تھی کہ جس طرح آپ اپنی تمام امت کے لیے برابر خدا سے مغفرت چاہتے رہتے تھے اسی طرح ان کے لیے بھی برابر نجات کی دعا کرتے رہتے۔ لیکن ان کی شقاوت اس درجہ بڑھ گئی کہ یہ اس بات کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ کوئی دوسرا اسلام کی کوئی خیر خواہی کرے بلکہ ہر خیر خواہ کے حوصلہ کو پست کرنا انھوں نے اپنا پیشہ ٹھہرا لیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان اشقیا کے لیے استغفار سے روک دیا اور اس شدت و قطعیت کے ساتھ کہ اگر تم ستر بار بھی ان کے لیے استغفار کرو گے جب بھی اللہ ان کو معاف نہیں کرنے کا۔ ظاہر ہے کہ یہاں ستر کا عدد گنتی کو نہیں بلکہ کثرت کو ظاہر کرتا ہے۔ کثرت اور بے پایاں کثرت کے اظہار کے لیے یہ اسلوب عربی میں بھی معروف ہے اور ہماری زبان اردو میں بھی۔

منافقین کے باب میں سخت گیری کی سخت تاکید اور ان کے لیے استغفار کی ممانعت

'ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ' یہ سبب بیان ہوا اس شدت و قطعیت کے ساتھ مغفرت سے محروم ہونے کا۔ یعنی مغفرت تو ان کے لیے ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو ماننے والے ہوں۔ یہ اللہ اور رسول کے ماننے والے کب ہیں کہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ یہ واضح رہے کہ یہ ان لوگوں کے عدم ایمان کا اعلان ہو رہا ہے جو نہ صرف اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے بلکہ جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، دکھاوے کی نمازیں بھی پڑھ لیتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی انھیں کرتوتوں کی بنا پر جو اوپر مذکور ہوئیں ان کے ایمان کو تسلیم نہیں کیا۔

منافقین کے کفر کا اعلان

'وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ' ہدایت یہاں غایت و مقصد کی ہدایت کے مفہوم میں ہے۔ اس کی وضاحت دوسرے مقام میں ہم تفصیل سے کر چکے ہیں۔ 'فاسق' یہاں بدعہد اور غدار کے مفہوم میں ہے۔ اوپر آیت ۷۴ میں 'كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

۱۴- آگے کا مضمون ——— آیات ۸۱-۸۹

غزوہ تبوک کے موقع پر جو منافقین بہانے بنا کر گھروں میں بیٹھ رہے اور اپنی فریب کاری پر بہت خوش تھے ان کے باب میں یہ آیات عین میدان جنگ میں نازل ہوئیں۔ سیاق و سباق بالکل واضح ہے۔

آیات ۸۱-۸۹

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

رِفِيهَا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۸۹﴾

ع ۱۱ ۹ ۱۷

ترجمۂ آیات ۸۱-۸۹

جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے وہ اللہ کے رسول سے پیچھے بیٹھ رہنے پر بہت مگن ہوئے اور انھوں نے برا جانا کہ وہ اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انھوں نے کہا کہ اس گرمی میں نہ نکلو، کہہ دو دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش وہ سمجھتے ہوتے۔ پس وہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ اپنے کیے کی پاداش میں۔ پس اگر اللہ تم کو ان میں سے کسی گروہ کی طرف پلٹائے اور وہ تم سے جہاد کے لیے نکلنے کی اجازت مانگیں تو کہہ دیجیو کہ تم میرے ساتھ کبھی نہیں نکل سکتے اور میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے نہیں لڑ سکتے تم پہلے بیٹھ رہنے پر راضی ہوئے تو اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔ ۸۲-۸۳

اور نہ تم ان میں سے کسی پر جو مرے کبھی جنازے کی نماز پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ بدعہدی کے حال میں مرے اور تم ان کے مال اور اولاد کو کچھ وقعت نہ دو۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کے سبب سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں کفر کے حال میں نکلیں۔

اور جب کوئی سورہ اترتی ہے کہ اللہ پر ایمان کا حق ادا کرو اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کے لیے نکلو تو ان میں کے جو مقدرت والے ہیں وہ بھی تمھارے پاس رخصت مانگنے آکھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجیے ہم بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ رہیں گے۔ انھوں نے اس بات کو پسند کیا کہ پیچھے رہ جانے والیوں کے ساتھی بنیں۔ اور ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی ہے تو اب وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ البتہ رسول اور جو لوگ

اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں انھوں نے اپنے مال و جان سے جہاد کیا اور یہی ہیں جن کے لیے رحمتیں اور برکتیں ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ان کے لیے اللہ نے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ بڑی کامیابی یہی ہے۔ ۸۴-۸۹

۱۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (۸۱)

'مخلفون' سے مراد

'مُخلّف' کے معنی ہیں وہ جو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ 'مُخَلَّفُوْنَ' سے یہاں ان لوگوں کو مراد لیا گیا ہے جو جھوٹے عذرات پیش کر کے تبوک کی مہم میں شریک ہونے سے گریز کر گئے۔ یہاں قرآن نے ان کے لیے 'مُخَلَّفُوْنَ' کا لفظ استعمال کر کے ان کی اصل حیثیت واضح کر دی ہے کہ بظاہر تو وہ اپنے زعم میں رسول سے رخصت حاصل کیے ہوئے ہیں لیکن حقیقت میں وہ پیچھے چھوڑے اور نظر انداز کیے ہوئے لوگ ہیں۔ ان کے باطن کو بھانپ کر اللہ کے رسول نے، ان کے عذرات لایعنی ہونے کے باوجود، صرف اس وجہ سے ان کی رخصت منظور کر لی کہ ایسے بزدل اور مفسد لوگ اپنے گھروں ہی میں بیٹھیں تو خیر ہے۔ جنگ کے لیے نکلیں گے تو معلوم نہیں کیا کیا فساد مچائیں۔

'خلاف' کا مفہوم

لفظ 'خلاف' قرآن میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک بے ترتیب کے معنی میں مثلاً اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ (۳۳ مائدہ) (یا ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں) دوسرے بعد اور پیچھے کے معنی میں مثلاً اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (۷۶۔ اسراء) (تو تیرے پیچھے یہ بھی کچھ زیادہ نہ ٹک سکیں گے) یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں ہے۔ یعنی یہ لوگ اس بات پر بہت خوش ہیں کہ اللہ کا رسول تو اپنے جاں نثاروں کے ساتھ میدانِ جنگ کے لیے روانہ ہوا اور یہ بہانے بنا کر گھروں میں بیٹھے رہنے میں کامیاب ہوئے حالانکہ یہ کوئی خوشی کی بات نہیں بلکہ سوچیں تو ان کی شامت کی دلیل ہے۔ جو بھیڑ گلے یا چرواہے سے پیچھے رہ جاتی ہے شیطان بھیڑیا بن کر اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔

'وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا' فَرِحَ' کا ضد ہے۔ یعنی جو بات خوش ہونے کی تھی وہ تو ان کو ناگوار ہوئی

اور جو چیز ماتم کرنے کی تھی اس پر پھولے نہیں سماتے۔

وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ: یعنی صرف اپنے ہی بیٹھ رہنے پر قانع نہیں ہوئے بلکہ موسم کی شدت کے ڈراوے سنا سنا کر دوسروں کو بھی ورغلانے کی کوشش کی کہ گرمی کا شباب ہے، اس آگ میں اس سفر کے لیے نہ نکلو۔ یہ واضح رہے کہ تبوک کی مہم نہایت گرم موسم میں پیش آئی تھی۔

قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ، یعنی انھیں بتا دو کہ ایسے تن آسانوں عافیت کوشوں کے لیے آگے جہنم کی آگ ہے جس کی گرمی سے اس گرمی کو کوئی نسبت نہیں ہے۔ یہ گرمی سے بھاگے اور جہنم کی آگ میں کودے ہیں۔ کاش یہ اس حقیقت کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے!

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۲)

عمل اور جزا دونوں سامنے

یعنی جب یہ موسم کی گرمی سے بھاگ کر جہنم کی آگ میں کودے ہیں تو اپنی اس کرتوت کی پاداش میں حق یہ ہے کہ یہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ لیکن جیسا کہ اوپر والی آیت میں گزرا، یہ فہم و بصیرت سے عاری ہو چکے ہیں اس وجہ سے اپنی اس شامت اور بدبختی پر خوش ہیں گویا انھوں نے کوئی بڑا تیر مارا ہے۔ عام طور پر مفسرین نے یہاں انشاء کو خبر کے معنی میں لیا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں عمل اور جزا دونوں کو نگاہوں کے سامنے مستحضر کر دیا گیا ہے اس لیے کہ جس کے اندر بصیرت ہو وہ اس دنیا میں اپنے عمل کے آئینے میں اپنی جزا کو بھی دیکھ لیتا ہے اور اس پر اس کا اثر بھی وہی پڑتا ہے جو پڑنا چاہیے البتہ اندھے بہرے لوگ اس سے محروم رہتے ہیں۔

فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَىٰ طَائِفَةٍ مِنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ (۸۳)

ان آیات کا موقع نزول اور ان کے اشارات

'رَجَعَ' لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ اس آیت کے اسلوب بیان سے ایک تو یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ آیتیں تبوک کے سفر کے دوران ہی نازل ہوئی ہیں اس لیے کہ فرمایا ہے کہ اگر تمھیں خدا لوٹائے جو واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ اس سفر سے لوٹائے۔

دوسرا اشارہ یہ نکلتا ہے کہ منافقین کی ان حرکتوں کے سبب سے جو اوپر بیان ہوئی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس درجہ بیزار اور متنفر ہو گئے تھے کہ ان کے منہ دیکھنے کے روادار نہیں رہ گئے تھے، حضور کی یہ بیزاری عین اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم ہی کے تحت تھی۔ اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ ہر چند یہ لوگ اس قابل نہیں رہ گئے ہیں کہ تم ان کی شکل دیکھو لیکن اگر اللہ تقدیر سے ان کی کسی ٹولی سے، اس سفر سے واپسی پر، ملاہی دے اور یہ اپنی کھسیاہٹ مٹانے اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے تم سے کسی آیندہ جنگ میں شرکت کی درخواست کریں تو تم ان کی درخواست سختی سے رد کر دینا۔ یہ گویا اس حکم کا ایک پہلو واضح فرمایا گیا ہے جو اوپر آیت ۸۰ میں ان کے ساتھ سخت

رویہ اختیار کرنے کی بابت دیا گیا ہے۔

تیسرا اشارہ اس میں منافقین کے اس گمان کی طرف ہے جو وہ اس موقع پر اپنے دلوں میں رکھتے تھے ان کا گمان یہ تھا کہ اب کے رومیوں کی منظم اور کثیر التعداد فوج سے مقابلہ ہے اس وجہ سے مسلمانوں کو گھر پلٹنا نصیب نہ ہوگا۔ ان کے اسی گمان کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ اگر ان کے گمان اور ان کی خواہش کے علی الرغم خدا تم کو ان کی طرف پلٹا ہی دے۔ اسی قسم کا گمان منافقین کو حدیبیہ کے موقع پر بھی تھا جس کی طرف سورہ فتح کی آیت ۱۲ میں اشارہ ہے۔ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓی اَهْلِیْهِمْ اَبَدًا ...... الآیۃ (بلکہ تم نے گمان کیا کہ رسول اور مسلمانوں کو اپنے اہل و عیال میں پلٹنا نصیب ہوگا)۔

فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ ؕ یعنی ان کو صاف بتا دینا کہ نہ اب تم کسی سفر میں میرے ساتھی بن سکتے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کر سکتے۔ تم جس طرح پہلے گھروں میں بیٹھے رہے اسی طرح جاؤ پیچھے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔ یہ گویا سب سے بڑی جماعتی خدمت سے ان کو عملاً روک دینے کی شکل اختیار کرنے کی ہدایت ہوئی تاکہ یہ رسوا ہوں اور اب تک غدارانہ اور بہانوں کے پردے میں وہ مسلمانوں کے اندر جو گھسے ہوئے تھے یہ قصہ ختم ہو۔ اب تک تو وہ جہاد سے بچنے کے لیے رخصتیں مانگتے تھے، اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی کہ اگر یہ جہاد میں شرکت کی اجازت مانگیں تو انھیں اجازت نہ دیجیو۔ اس لیے کہ انھیں تنبیہ، جیسا کہ سورۂ فتح آیت ۱۵ سے واضح ہے، بہت پہلے کر دی گئی تھی۔ یہ اسلوب بیان توفیق کی نفی کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور ممانعت کے لیے بھی۔ میرے نزدیک سورۂ فتح والی آیت تو نفی توفیق کے مفہوم میں ہے لیکن آیت زیر بحث ممانعت کے سیاق میں ہے۔ والعلم عند الله۔

جماعتی خدمات سے منافقین کی محرومی

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸۴)

منافقین کی نماز جنازہ اور دعائے استغفار کی ممانعت

یہ جماعت سے ان کو کاٹ پھینکنے کی ایک اور سخت تر بلکہ آخری صورت اختیار کرنے کی ہدایت ہوئی۔ اوپر آیت ۸۰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لیے استغفار کی ممانعت ہو چکی ہے۔ اب یہاں کے جنازے کی نماز پڑھنے اور ان کی قبروں پر دعائے استغفار کے لیے کھڑے ہونے کی بھی ممانعت فرما دی گئی۔ گویا زندگی اور موت دونوں میں ان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا گیا۔ جماعتی زندگی سے آدمی کا آخری رشتہ یہی ہوتا ہے کہ مرنے پر اپنے جماعتی بھائیوں کے ہاتھوں دفن ہوتا اور ان کی دعاؤں کا زاد راہ لے کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ اس ممانعت نے پیغمبر اور اہل ایمان کے ساتھ ان کا یہ آخری رشتہ

بھی کاٹ دیا۔

'اِنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَاتُوْا وَھُمْ فٰسِقُوْنَ' یہ اس ممانعت کی علت بیان ہوئی ہے کہ ان کی موت ایمان پر نہیں بلکہ کفر پر ہوئی۔ 'فسق' یہاں بدعہدی اور غداری کے معنی میں ہے یعنی اگرچہ یہ ایمان کے مدعی اور دکھاوے کے لیے اسلام کے بعض رسوم بھی ادا کرتے رہے لیکن اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ انھوں نے جو عہد باندھا اس کو یہ توڑ چکے ہیں۔ اس کے شاہد ان کے وہ اعمال ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُھُمْ وَاَوْلَادُھُمْ ۭ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الدُّنْیَا وَتَزْھَقَ اَنْفُسُھُمْ وَھُمْ کٰفِرُوْنَ (۸۵)

اس آیت کی وضاحت اسی سورہ میں پیچھے گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۵۵۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَۃٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَجَاھِدُوْا مَعَ رَسُوْلِہِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْھُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِیْنَ ۔ رَضُوْا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَفْقَھُوْنَ (۸۶-۸۷)

لفظ 'سورہ' کا مفہوم

جس طرح لفظ 'کتاب' یا 'قرآن' بعض مقامات میں قرآن کے کسی حکم یا اس کے کسی حصہ کے لیے خود قرآن میں استعمال ہوا ہے، اسی طرح لفظ 'سورہ' یہاں اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ اس کے کسی حصہ یا ٹکڑے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

فعل اپنے کامل معنی میں

'اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَجَاھِدُوْا مَعَ رَسُوْلِہٖ' فعل 'اٰمِنُوْا' یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی اپنے ایمان باللہ کا ثبوت دو جو یہ ہے کہ اللہ کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کے لیے نکلو۔

منافقین کی بہانہ بازیاں

'اِسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْھُمْ' ۔ 'طول' کے معنی قدرت اور غنا کے ہیں۔ یعنی جب ان سے اللہ کی راہ میں جہاد کا مطالبہ ہوتا ہے تو یہ اپنے دعوائے ایمان میں بالکل پھسڈی ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے غربا اور مسکینوں کا تو کیا ذکر، ان میں جو مقدرت اور مال والے ہیں، تندرست جسم بھی رکھتے ہیں اور سامان جنگ فراہم کرنے کا وافر ذریعہ بھی، ان تک کا حال یہ ہے کہ کوئی عذر تراش کر پیغمبر کے پاس رخصت مانگنے آکھڑے ہوتے ہیں۔

ما فی الذہن کی تعبیر قول سے

'وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِیْنَ' میرے نزدیک یہ ان کے ما فی الذہن کو ان کے قول سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرآن میں بعض جگہ یہود کا قول نقل ہوا ہے 'وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا' ہرچند وہ کہتے تو تھے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' لیکن چونکہ ان کے دل کی آواز یہی ہوتی تھی کہ 'سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا' اور اپنے عمل سے بھی انھوں نے اسی کی گواہی دی اس وجہ سے قرآن نے ان کے دل کی شہادت کو ان کے قول سے تعبیر فرمایا، گویا انھوں نے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' نہیں بلکہ 'سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا' ہی کہا تھا۔ اسی طرح ان منافقین نے اگرچہ پیش تو کیے عذرات اور کچھ مجبوریاں لیکن ان سب کے باطن میں مضمر

بھی محض تن آسانی اور بزدلی۔ وہ نکلنے والے غازیوں کے ساتھی نہیں بلکہ بیٹھ رہنے والے بندوں، ناکاروں اور معذوروں کے ساتھی بننا چاہتے تھے۔ ان کے عذرات اور بہانوں کی اسی مضمر حقیقت کو قرآن نے ان کے قول سے تعبیر کر دیا ہے جس میں ایک نہایت لطیف قسم کا طنز پیدا ہو گیا ہے جس کی ایک سے زیادہ نظیریں قرآن میں موجود ہیں۔ یہی طنز آگے والی آیت میں ذرا تیز ہو گیا ہے۔

مرد ہو کر عورتوں کے ساتھی

رَضُوا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ۔ خوالف عورتوں کو کہتے ہیں اس لیے کہ مرد جنگ و جہاد اور دوسرے مردانہ کاموں کے لیے گھر سے باہر نکلتے ہیں اور یہ بچوں اور گھروں کی دیکھ بھال کے لیے گھروں میں بیٹھتی ہیں۔ فرمایا کہ انھوں نے مرد ہو کر غازیوں کی ہم سفری اور ہم رکابی کی بجائے اپنے لیے یہی پسند کیا کہ عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھیں۔ ان کی اس ایمانی اور اخلاقی موت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا، نہ اب وہ کوئی صحیح بات سوچتے ہیں۔ نہ کسی عزم و ہمت کے کام کے لیے ان کے اندر حوصلہ ہی پیدا ہوتا ہے۔

سچے اہل ایمان کا کردار

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَیْرٰتُ ؗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۸۸-۸۹)

اب یہ سچے اور پکے اہل ایمان کا کردار اور ان کا انجام بیان ہو رہا ہے اور مقصود اس سے ان مخلصین کی تحسین بھی ہے اور ان منافقین کو غیرت دلانا بھی کہ رسول کے جو سچے ساتھی ہیں وہ جب حکم جہاد ہوتا ہے تو ان منافقین کی طرح رخصت کی عرضیاں لے کر نہیں دوڑتے بلکہ اپنے مال اور سر لے کر رسول کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ اصلاً انہی کے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

۱۶- آگے کا مضمون ــــ آیات ۹۰-۹۹

اوپر زیادہ تر بحث شہری منافقین سے تھی جو مدینہ اور اس کے آس پاس آباد تھے۔ آگے ان منافقین کا ذکر آ رہا ہے جو دیہاتوں میں رہائش رکھتے تھے، بیماریاں دونوں کی ایک ہی قسم کی ہیں اس وجہ سے حکم بھی دونوں کا ایک ہی بیان ہوا ہے۔ اسی ضمن میں حقیقی معذورین کی تفصیل بھی بیان کر دی ہے تاکہ بہانہ بازوں اور حقیقی معذوروں کے امتیاز میں کوئی گھپلا پیش نہ آئے۔ منافقین کے باب میں چونکہ یہ فیصلہ کن بحث تھی، اندیشہ تھا کہ کوئی بے گناہ زد میں آ جائے، اس وجہ سے دونوں کے درمیان ایک خط واضح کھینچنا ضروری ہوا۔ آیات ملاحظہ فرمائیے۔

آیات ۹۰-۹۹

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ
كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا
يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَى
الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ
اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠
تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا
يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ
وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾ يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا
رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا
اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ
تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ
لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ
لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا

حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

ع ۱۲ ۱۰ ۱ ترجمۂ آیات ۹۰-۹۹

اور دیہاتیوں میں سے بھی بہانہ باز لوگ آئے کہ انھیں رخصت دی جائے اور جو اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولے وہ بیٹھ رہے۔ ان میں سے جنھوں نے کفر کیا ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ ۹۰

کمزوروں، بیماروں اور ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جنھیں خرچ کرنے کی مقدرت نہیں ہے جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیرخواہی کرتے رہیں۔ خوب کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ غفور رحیم ہے۔ اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ تمھارے پاس آتے ہیں کہ ان کے لیے کسی سواری کا انتظام کر دو، تم کہتے ہو میرے پاس تمھاری سواری کا کوئی بند و بست نہیں تو وہ اس حال میں واپس ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے اس غم میں آنسو رواں ہوتے ہیں کہ افسوس کہ وہ خرچ کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ الزام تو بس ان پر ہے جو تم سے رخصت مانگتے ہیں حالانکہ وہ مالدار ہیں۔ یہ لوگ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہنے پر راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔ پس وہ علم سے محروم ہو گئے۔ ۹۱-۹۳

جب تم لوگ ان کی طرف پلٹو گے تو یہ تمھارے سامنے باتیں بنائیں گے۔ کہہ دیجیو کہ باتیں نہ بناؤ۔ ہم تمھاری باتیں باور کرنے والے نہیں۔ اللہ نے ہمیں تمھارے حالات سے اچھی طرح باخبر کر دیا ہے۔ اب اللہ اور اس کا رسول تمھارے عمل کو دیکھیں گے، پھر تم غائب وحاضر کے جاننے والے کے آگے پیش کیے جاؤ گے اور وہ تمھیں تمھاری ساری کرتوت سے آگاہ کرے گا۔ یہ لوگ تمھاری واپسی پر تمھارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے چشم پوشی برتو۔ سو تم ان سے اعراض برتو۔ یہ یکسر ناپاک ہیں اور ان کی کرتوت کی پاداش میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ تمھارے سامنے قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ ان بدعہد لوگوں سے راضی ہونے والا نہیں۔ یہ دیہاتی کفر و نفاق میں زیادہ پختہ اور زیادہ لائق ہیں اس بات کے کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ اتارا ہے اس کے حدود سے بےخبر رہیں اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ ۹۴ - ۹۷

اور ان دیہاتیوں میں سے وہ بھی ہیں جو راہِ خدا میں اپنے خرچ کو ایک تاوان سمجھتے ہیں اور تمھارے لیے گردشوں کے متمنی ہیں۔ بری گردش انہی پر ہے اور اللہ سمیع وعلیم ہے۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو اور رسول کی دعاؤں کو حصولِ قربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سو بے شک یہ ان کے لیے واسطۂ قربت ہی ہے۔ اللہ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے ۹۷ - ۹۹

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۹۰)

'معذر' کا مفہوم

'معذّر' کے معنی ہیں جھوٹا اور بالکل بے سروپا عذرات تراشنے والا بہانہ باز جو ہر ذمہ داری سے بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی عذر گھڑ لیتا ہو۔ معذر اور معتذر میں یہ فرق ہے کہ معتذر کا عذر جھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور بعض حالات میں سچا بھی، لیکن معذر کہتے ہی اس کو ہیں جو نرا بہانہ باز ہو۔

'اعراب' سے مراد

'اعراب' 'اعرابی' کی جمع ہے۔ 'اعراب' 'سکان البادیہ' یعنی بدوی اور دیہاتی عربوں کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ اطراف مدینہ اور صحرائی علاقوں کے ان بادیہ نشینوں کے لیے استعمال ہوا ہے جن کی اکثریت نے اگرچہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کی سیاسی سیادت تسلیم کر لی تھی لیکن اسلام ان کے اندر رچا بسا نہیں تھا۔ اول تو یہ لوگ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اسلام کی طرف اس کی روحانیت کی جاذبیت سے زیادہ اس کی ابھرتی ہوئی طاقت سے متاثر ہو کر آئے تھے۔ ثانیاً مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم و تربیت کا کما حقہ، انتظام نہ تو ممکن ہی تھا اور نہ یہ اپنی کھیتی باڑی اور مال مویشی کے دھندوں سے کچھ وقت اس مقصد کے لیے نکالنے پر آمادہ ہی ہوتے تھے کہ مرکز میں آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی بابرکت صحبت سے فائدہ اٹھائیں۔ ان میں جو لوگ اپنے اندر صلاحیت رکھتے تھے وہ اگر چاہتے تو بجائے خود بھی اپنی اصلاح و تربیت کی کوشش کرتے اور وقتاً فوقتاً مدینہ آ کر نبیؐ اور صحابہؓ کی صحبت سے بھی فائدہ اٹھاتے لیکن اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام کا نام تو لیتے تھے لیکن اسلام کی حدود و قیود سے بالکل بے خبر، اجڈ اور گنوار تھے۔ یہی لوگ بعد میں اس فتنۂ ارتداد کی آگ کا ایندھن بنے جس کو بجھانے کے لیے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو سر دھڑ کی بازی لگا دینی پڑی۔

بہانہ ساز اور جھوٹے

'وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ' یعنی ان کے اندر کے کچھ بہانہ باز آئے تو عذر پیش کرنے اور رخصت مانگنے کے لیے آئے اور کچھ جو اللہ اور رسول سے سمع و طاعت کا عہد کرنے میں بالکل ہی جھوٹے تھے انھوں نے کوئی جھوٹا سچا عذر پیش کرنے کی بھی زحمت نہیں اٹھائی بلکہ دعوتِ جہاد کی پروا کیے بغیر یوں ہی گھر میں بیٹھ رہے۔

بہانہ بازوں اور حقیقی معذوروں میں فرق

'سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ'۔ 'مِنْهُمْ' یعنی مِنَ الْاَعْرَابِ۔ چونکہ ان اعراب میں جیسا کہ آگے تصریح آئے گی، ایک گروہ مومنین و مخلصین کا بھی تھا جو سچے دل سے اسلام لائے تھے اور دین کے ہر موقع پر ایثار و قربانی میں پیش پیش تھے، اس وجہ سے فرمایا کہ ان اعراب میں

سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے یعنی اظہارِ اسلام کے باوجود اس کے واجبات و فرائض سے جھوٹے بہانے بنا کر یا ان کو دیدہ دلیری سے نظر انداز کر کے گھروں میں بیٹھ رہے ہیں، ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ رہیں گے جو اللہ و رسول سے کیے ہوئے عہد پر قائم رہے ہیں یا وہ واقعی معذور و مجبور تھے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِن سَبِيلٍ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ ۝ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ ۚ رَضُوا بِأَن يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۹۱-۹۳)

اب یہ مُعَذِّرِین اور حقیقی معذورین کے درمیان فرق واضح کر دیا گیا ہے تاکہ نہ تو ہر بہانہ باز اپنے کو معذور ٹھہرا سکے نہ کسی واقعی معذور پر نفاق کی تہمت عائد کی جا سکے۔

حقیقی معذورین

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِن سَبِيلٍ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ: یعنی کمزور، مریض اور تنگ حال جو اپنے لیے زاد راہ اور سواری

جو جہاد کے لیے تو بے قرار ہیں لیکن اپنی ناداری کے سبب سے کسی سواری کا بندوبست خود کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اور جب تمہارے پاس کسی سواری کے لیے درخواست لے کر آتے ہیں تو تم بھی معذرت کا انتظام نہیں کر سکتے وہ حقیقی معذورین میں ہیں۔ یہ جہاد میں شامل نہ ہو سکیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ یہ اللہ کے دین اور اس کے رسول کے خیر خواہ رہیں۔ یہ قید نہایت اہم ہے اس لیے کہ بہت سے مریض اور غریب ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو گھر بیٹھے بیٹھے اپنی ریشہ دوانیوں اور فتنہ پردازیوں سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس قسم کے لوگ گناہ سے بری نہیں ہوں گے گناہ سے بری صرف وہی ہوں گے جو اپنی کمزوری، بیماری یا غربت کے سبب سے اگر میدان جنگ میں نہ پہنچ سکیں تو جہاں ہیں وہیں اپنے امکان کے حد تک اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کریں اور اگر کچھ نہیں کر سکتے تو اپنے اپنے بستروں پر اور گھروں میں صدق دل سے اسلام اور مسلمانوں کی فتح مندی کی دعائیں اور اپنی محرومی پر غم کریں کہ افسوس ہے کہ وہ جہاد کے اہل نہیں رہے۔ فرمایا کہ جو لوگ ایسے ہوں گے وہی محسن، یعنی خوب کار ٹھہریں گے اور ایسے خوب کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

حقیقی معذورین کی معذوری کی شہادت ہر

وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ: اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی الزام نہیں ہے

کر دیتے ہو کہ ان کے لیے کسی سواری کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ اس حالت میں تمہارے پاس سے لوٹتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتی ہیں کہ افسوس وہ اس قابل نہیں کہ اپنے خرچ سے شرکتِ جہاد کا بندوبست کر سکیں ـــــ اگرچہ اس طرح کے لوگوں کا حکم اوپر والی آیت میں بھی موجود تھا لیکن ان کا ذکر خاص طور پر یہ ظاہر کرنے کے لیے فرمایا کہ جن لوگوں کے لیے مانع صرف غربت و ناداری ہو، ایمان کی کمزوری نہ ہو، ان کی صداقت کا شاہد ان کا وہ جذبہ ہوتا ہے جو ایسے موقعوں پر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایسے مواقع پر یہ خیال کر کے مطمئن ہو بیٹھتے ہیں کہ ہم تو نادار ہیں، ہمارے پاس نہ ہتھیار، نہ سواری، نہ زادِ راہ، ہمیں تو جنگ و جہاد کی ذمہ داری سے اللہ ہی نے فارغ کر رکھا ہے، دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو آسانی سے اس سعادت سے محروم رہنے پر راضی نہیں ہوتے بلکہ جہاں سے بھی امید ہوتی ہے کہ ان کے لیے بھی کچھ بندوبست ہو جائے گا وہ اس کے لیے کوشش کرتے ہیں اور اگر ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو ان کے دل اپنی محرومی پر تڑپ اٹھتے ہیں اور ان کی اس تڑپ اور اس بے قراری کی گواہ ان کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ہوتی ہیں ـــ گویا غریبوں کے لیے بھی ان کی ناداری اسی صورت میں سچا عذر ہے جب ان کا ہر بُنِ مُو ان کے جوش و جذبے کا شاہد ہو۔

اصلی مجرمین

اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ ۔ اصل مجرمین یہ ہیں جو مال رکھتے ہیں، اسباب رکھتے ہیں، اسلحہ رکھتے ہیں، سواری رکھتے ہیں لیکن جب جہاد کا موقع آتا ہے تو رخصت کے طلب گار بن کر آن کھڑے ہوتے ہیں۔ جن کی بے حمیتی و بے غیرتی اس حد کو پہنچ گئی کہ عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھے رہنے پر راضی ہیں۔ ان کی اس اخلاقی و ایمانی موت کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور اب ان کا حال یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے کہ وہ کس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْکُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَیْهِمْ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِکُمْ وَسَیَرَی اللّٰهُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹۴)

'اِعْتِذَار' یہاں باتیں بنانے اور جھوٹے عذر تراشنے کے معنی میں ہے۔ یعنی جب تم اس سفر سے (اشارہ سفرِ تبوک کی طرف ہے) پلٹو گے تو یہ منافقین اپنے رویہ کے باب میں تم کو (خطاب مسلمانوں سے ہے) مطمئن کرنے کے لیے اپنے گھڑے ہوئے عذرات کی داستان سنائیں گے۔

پیغمبرکی حیثیت تمام اہل ایمان کے ترجمان

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِکُمْ ۔ قُلْ یہاں واحد ہے درآنحالیکہ اوپر والے ٹکڑے میں خطاب جمع سے ہے اور بعد میں بھی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکُمْ اور نَبَّاَنَا اللّٰهُ، جمع ہی کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سب مسلمانوں

کی طرف سے منافقین کو جواب دلوا دیا گیا ہے گویا پیغمبر کی زبان تمام مومنین مخلصین کے دلوں کی ترجمان ہے۔ پیغمبر اور امت کے درمیان جو اعتماد، جو حسن ظن اور جو کامل ہم آہنگی تھی یہ اسلوب اس کو بھی نہایت لطیف طریقہ سے ظاہر کر رہا ہے اور اس میں منافقین پر تعریض کا جو پہلو ہے وہ بھی نمایاں ہو رہا ہے۔

'لَن نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّأَنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ' یعنی چونکہ خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے حالات سے باخبر کر دیا ہے اس وجہ سے اب ہم تمہارے ان لاطائل عذرات کو باور کرنے والے نہیں ہیں، ہمارے سامنے باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو۔

معاملہ میں ظاہری حالات کا اعتبار

اس سے معلوم ہوا کہ ان منافقین کے تمام عذرات جو ناقابلِ قبول ٹھہرے اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کا پردہ خود اللہ تعالیٰ نے اٹھا دیا تھا جو تمام غائب و حاضر کو جاننے والا ہے۔ رسول کے سوا چونکہ دوسروں کا یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ کسی کے باب میں اللہ کے بتائے ہوئے علمِ غیب کا دعوے کر سکیں اس وجہ سے وہ اس طرح کے معاملات میں صرف ظاہر حالات اور شرعی دلائل کی بنا پر ہی کوئی حکم لگائیں گے۔ اگر کسی کے عذر، کسی کے دعوے اور کسی کے بیان کی تردید کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں ہے تو وہ بہر حال تسلیم کیا جائے گا اگرچہ وہ فی الحقیقت بالکل بے سروپا ہو۔ ہم ہر اس شخص کو مسلمان تسلیم کریں گے جو ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اگر ہمارے پاس اس کے ایمان و اسلام کے انکار کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، اگرچہ وہ اپنے باطن میں کٹر کافر یا منافق ہو۔

اصل شہادت عمل کی شہادت ہے

'وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ..... الآیۃ' یعنی عذرات، بہانوں اور جھوٹی قسموں کو سپر بنانے کی بجائے اپنے عمل سے راست بازی اور وفاداری کا ثبوت دو۔ اللہ و رسول تمہارے عمل کو دیکھیں گے۔ یہ لاطائل بہانے کام آنے والے نہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ ایک دن تمہاری پیشی غائب و حاضر اور ظاہر و باطن سب کے جاننے والے کے آگے ہونے والی ہے وہ تمہارا سارا کیا دھرا تمہارے سامنے رکھ دے گا اور جس عمل کے اندر جتنا اخلاص یا جتنا کھوٹ ہو گا وہ بھی تمہیں دکھا دے گا۔

سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ إِذَا انقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ ۖ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ ۖ إِنَّهُمْ رِجْسٌ ۖ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۹۵)

جھوٹی قسمیں کھانے والوں سے اعراض کی ہدایت

اس آیت میں ایک ہی لفظ 'اعراض' پہلو بہ پہلو نہایت بلاغت سے دو مختلف بلکہ متضاد معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ 'اعراض' کا ایک مفہوم تو کسی سے منہ پھیر لینا ہے۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آپ کسی کے عذر کو قبول کر کے اس سے درگزر کر لیں اور اس سے راضی ہو جائیں۔ فرمایا کہ تمہاری واپسی پر قسمیں کھا کھا کے تمہیں راضی اور مطمئن کرنے کی کوشش کریں گے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کو نظر انداز کر دو، سو ٹھیک ہے اب ان سے اعراض ہی کرو کیونکہ یہ گندے اور نجس ہیں اور نجاست سے اعراض ہی بہتر ہے۔ اس گندگی کے ڈھیر کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ اپنے اعمال کی پاداش میں اسی کے حوالہ ہوں گے۔

يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۖ فَإِن تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ (۹۶)

لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ سے اعراض کے اس مفہوم کی وضاحت ہو رہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا یعنی یہ قسموں کے ذریعے سے تمہیں (خطاب مسلمانوں سے ہے) خوش کرنا چاہیں گے۔ اگر تم ان سے خوش بھی ہو گئے تو یاد رکھو کہ اللہ ان بدعہدوں سے راضی ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ تو اسی وقت راضی ہوگا جب یہ اپنی توبہ اور اصلاح اور اپنے اعمال سے اس کو راضی کریں۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹۷)

خدا کے غضب کا سبب ان کا کفر و نفاق

یہ سبب بیان ہوا ہے اس بات کا کہ کیوں یہ اللہ تعالیٰ کے ایسے غضب کے مستحق قرار پائے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو یہ راضی بھی کرلیں جب بھی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہونے والا نہیں ہے۔ فرمایا کہ یہ ہرگز کسی رعایت و نرمی کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ اپنے کفر و نفاق میں دوسروں کی نسبت سخت تر ہیں۔ نہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صالحین کی صحبت اٹھائی اور نہ کتاب الٰہی کے حدود حرام و حلال سے آگاہ ہونے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفر و نفاق کی بیماری کا حملہ سب سے زیادہ سخت ان پر ہوا۔ اگر انھیں ایمان عزیز ہوتا تو یہ اپنی اصلاح و تربیت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صالحین سے ربط رکھتے اور اپنے ایمان اور علم کو برابر ترقی دیتے رہتے لیکن یہ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا کا عذر کر کے ہمیشہ اپنی تربیت کے کام کو ٹالتے رہے۔ آگے اسی سورہ میں ان لوگوں کی دین سے بے رغبتی اور مرکز سے بے تعلقی کا ذکر یوں آیا ہے۔ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَاۗفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْھُمْ طَاۗىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَھُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّھُمْ يَحْذَرُوْنَ ۱۲۲ (سارے مسلمانوں کا علم و تفقہ کے لیے نکلنا تو ممکن نہ تھا لیکن ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت دین کا علم و فہم حاصل کرنے کے لیے اٹھتی تاکہ جب علم حاصل کر کے لوٹتی تو اپنی قوم کو بھی آگاہ کرتی تاکہ دوسرے بھی ڈرنے والے بنتے) مطلب یہ ہے کہ ان کا دیہاتی ہونا ان کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔ اگر یہ دیہاتی ہیں تو انھیں اپنی تعلیم و تربیت کی راہ میں سرگرم ہونا تھا لیکن یہ تو اسلام کا دعویٰ کر کے برابر اپنے کفر و نفاق ہی کی پرورش میں لگے رہے تو جو جہل و نفاق ان کے اندر پروان چڑھا وہ اسی کے سزاوار تھے۔ اللہ علیم و حکیم ہے۔ اس کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ دین اور علم دین کسی کے سر نہیں منڈھتا بلکہ ہر ایک کو وہی دیتا ہے جس کا وہ اپنے کو سزاوار ثابت کرتا ہے۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَاۗىِٕرَ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹۸)

اعراب کا اسلام دشمنی اور بدخواہی

یعنی اسلام کے ساتھ ان کی بدخواہی کا حال یہ ہے کہ اول تو یہ اس کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہی نہیں اور اگر حالات سے مجبور ہو کر کچھ خرچ کرنا ہی پڑ جاتا ہے تو یہ اس کو گراں محسوس کرتے ہیں، گویا ان کو جرمانہ بھرنا

پڑ رہا ہے۔ ان کی ہر وقت تمنا یہ ہے کہ تم پر کوئی گردش آئے تاکہ کسی طرح تم سے ان کی جان چھوٹے عَلَیۡہِمۡ دَآئِرَۃُ السَّوۡءِ لیعنی یہ تمہارے لیے گردش کا انتظار کر رہے ہیں حالانکہ گردش خود انہی پر ہے اور گردش بھی نہایت بری گردش۔ اللہ سمیع و علیم ہے۔ اس سے کوئی راز اور بھید مخفی نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بتا رہا ہے سب سمع و علم پر مبنی ہے اور جو کچھ ان کے ساتھ معاملہ کرے گا وہ بھی سمع و علم پر مبنی ہوگا۔

وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰہِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّہَا قُرۡبَۃٌ لَّہُمۡ ؕ سَیُدۡخِلُہُمُ اللّٰہُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (۹۹)

"قربات"، "قربۃ" کی جمع ہے۔ اس سے مراد بر و تقویٰ اور احسان و انفاق کے وہ کام ہیں جو خدا کے تقرب کا وسیلہ و ذریعہ بنتے ہیں۔

اعراب میں مخلصین اور راستباز

اعراب میں جو مخلص اور راست باز مسلمان تھے یہ ان کا بیان ہے۔ فرمایا کہ ان اعراب میں سچے اور پکے مسلمان بھی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر مضبوط ایمان رکھتے ہیں۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کو یہ منافقین کی طرح جرمانہ نہیں سمجھتے بلکہ اپنے انفاق کو اور رسول کی دعاؤں کو خدا کے تقرب کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اوپر آیت ۸۰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے لیے استغفار سے اور آیت ۸۴ میں ان کی نماز جنازہ سے روک دیا گیا ہے لیکن مخلصین کو یہ دونوں چیزیں حاصل تھیں۔ اس لیے فرمایا کہ وہ اپنے انفاق اور رسول کی دعاؤں کو تقرب الٰہی کا ذریعہ بناتے جب کہ منافقین ان دونوں ہی چیزوں سے محروم ہیں۔ "اَلَاۤ اِنَّہَا قُرۡبَۃٌ لَّہُمۡ" میں ضمیر مؤنث ہر چند واحد ہے لیکن یہ سابق الذکر دونوں ہی چیزوں کی طرف لوٹے گی۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقام میں تفصیل سے ہم کر چکے ہیں۔

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ وہ اپنے انفاق کو نبی کی دعاؤں کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں لیکن مجھے اس مطلب کے قبول کرنے میں تردد ہے۔ یہ مطلب لینے کے لیے کلام میں ایسے محذوفات ماننے پڑیں گے جن کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ مولانا فراہیؒ کی تاویل بھی یہی ہے جو میں نے اختیار کی ہے۔ یہ مجھے زبان اور نظم کلام دونوں پہلوؤں سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔

۱۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۰-۱۱۲

آگے کی آیات میں پہلے ان لوگوں کی تحسین فرمائی ہے جو اسلام کی طرف سب سے پہلے سبقت کرنے والے بنے یا جنھوں نے کمال اخلاص کے ساتھ ان کے نقش قدم کی پیروی کی۔ اسلامی معاشرہ کے اصل اجزائے ترکیبی یہی ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی اور فوز عظیم کی بشارت دی۔

پھر مدینہ اور دیہاتی علاقوں کے منافقین کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کو دنیا اور برزخ اور آخرت تینوں ہی میں عذاب عظیم کی دھمکی دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ ان کو اسلام

اور اسلامی معاشرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کو اس عظیم سورہ نے جھنجوڑ کر اپنے گناہوں کے اعتراف اور توبہ استغفار کے لیے بے چین کر دیا تھا۔ ان کو قبولیت توبہ کی نوید سنائی گئی اور ان کی اصلاح و تربیت کے باب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض ہدایات دی گئیں۔ نیز بعض لوگوں کے بارے میں یہ ہدایت ہوئی کہ ان کی قبولیت توبہ کا معاملہ آئندہ پر ملتوی کیا جاتا ہے، وہ فیصلۂ الٰہی کا انتظار کریں۔

اس کے بعد مسجد ضرار اور اس کے بانیوں کے معاملہ کو لیا ہے اور ان کے باب میں اپنے فیصلہ کا اعلان فرمایا ہے۔

آگے مسلمانوں اور اللہ کے مابین جو عہد و پیمان ہے اس کا حوالہ دیا ہے اور اس عہد و پیمان کے بموجب مسلمانوں کو جن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے اس کی وضاحت فرمائی ہے تاکہ مسلم معاشرہ ہر قسم کے غیر مطلوب عناصر سے پاک صاف ہو کر اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہو جائے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۰-۱۱۲

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۰۰ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ړ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ڀ مَرَدُوْا عَلَي النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُھُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُھُمْ ۭ سَنُعَذِّبُھُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝۱۰۱ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۰۲ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُھُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّھُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۰۳ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ ھُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ

الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى
اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ
وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ
لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾
وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ
اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٠٧﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ
لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ
فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿١٠٨﴾
اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰي تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ
مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰي شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ
جَهَنَّمَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ
الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
حَكِيْمٌ ﴿١١٠﴾ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ
بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ
وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى
بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَ
ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾ اَلتَّاۗىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ

ع ١١ ٢

السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

ترجمۂ آیات ۱۰۰-۱۱۲

اور مہاجرین و انصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور پھر جن لوگوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔ اور اس نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں یہ ہمیشہ رہیں گے اور بڑی کامیابی یہی ہے۔ ۱۰۰

اور تمہارے اردگرد جو دیہاتی ہیں ان میں منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی منافق ہیں۔ یہ اپنے نفاق میں منجھ گئے ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں ہم انھیں دوبارہ سزا دیں گے۔ پھر وہ ایک عذاب عظیم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔ ۱۰۱

اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انھوں نے کچھ نیکیاں اور کچھ بدیاں ساتھ ہی دونوں کمائی ہیں۔ امید ہے کہ اللہ ان پر رحمت کی نظر کرے۔ اللہ غفور رحیم ہے۔ تم ان کے مالوں کا صدقہ قبول کر لو اس سے تم ان کو پاکیزہ بناؤ گے اور ان کا تزکیہ کرو گے اور ان کے لیے دعا کرو بے شک تمہاری دعا ان کے لیے سرمایہ تسکین ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا اور صدقات کی پذیرائی فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ان سے کہہ دو، عمل کرو، اب اللہ اور اس کا رسول اور اہل ایمان تمہارے عمل کو دیکھیں گے اور تم عنقریب غائب و حاضر کے جاننے والے کے حضور پیش کیے جاؤ گے۔ وہ تمہارے سارے کیے دھرے سے تم کو آگاہ کرے گا۔ ۱۰۲-۱۰۵

اور کچھ دوسرے بھی ہیں جن کا معاملہ اللہ کے فیصلہ تک ملتوی کیا جاتا ہے۔ یا تو ان کو سزا دے گا یا ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۱۰۶

اور جنھوں نے ایک مسجد بنائی ہے اسلام کو نقصان پہنچانے، کفر کو تقویت دینے، اہل ایمان کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور ان لوگوں کے واسطے ایک اڈا فراہم کرنے کی غرض سے جو اللہ اور اس کے رسول سے پہلے جنگ کر چکے ہیں اور یہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے یہ کام صرف بھلائی کی غرض سے کیا ہے اور اللہ شاہد ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ تم اس میں کبھی کھڑے نہ ہوجیو۔ وہ مسجد جس کی بنیاد روز اوّل سے تقویٰ پر پڑی ہے وہ حق دار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاکیزگی کو عزیز رکھتے ہیں اور اللہ پاکیزگی کو عزیز رکھنے والوں ہی کو عزیز رکھتا ہے۔ کیا وہ بہتر ہے جس نے اپنی تعمیر کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور اس کی خوشنودی پر رکھی یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک کھوکھلی گرتی ہوئی کگر پہ اٹھائی پس وہ اس کے سمیت دوزخ میں بیٹھ گئی؟ اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ اور یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ان کے دلوں میں شک کی بنیاد بن کر جمی رہے گی الا آنکہ ان کے دل ہی پاش پاش ہو جائیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۱۰۷-۱۱۰

بے شک اللہ نے اہلِ ایمان سے ان کے جان و مال ان کے لیے جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ اللہ کے ذمہ ایک سچا وعدہ ہے تورات، انجیل اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ سو تم اس سودے پر جو تم نے اس کے ساتھ کیا ہے خوشی مناؤ۔ اور یہی دراصل بڑی کامیابی ہے۔ توبہ کرتے رہنے والے، عبادت گزار،

شکرگزار، ریاضت کرنے والے، رکوع سجدہ کرتے رہنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی نگہداشت رکھنے والے اصلی مومن ہیں اور ان مومنوں کو خوش خبری سنا دو۔ ۱۱۱-۱۱۲

۱۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰۰)

اسلامی معاشرہ کے گلِ سرسبد لوگ

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اسلامی معاشرہ کے گلِ سرسبد اور اصل سرمایہ کون لوگ ہیں۔ یہ بتانے سے مقصود ایک طرف تو عام مسلمانوں کے سامنے ان لوگوں کو پیش کر دینا ہے جن کے عمل ان کے لیے مثال اور نمونہ ہیں اور جن کی انھیں پیروی اور تقلید کرنی ہے، دوسری طرف منافقین پر یہ واضح کر دینا ہے کہ وہ اپنے آپ کو تدویسیوں کی اس جماعت میں گھسائے رکھنے کی اب کوشش نہ کریں۔ اس جماعت میں شامل رہنا ہے تو ان کے رنگ ڈھنگ اختیار کریں ورنہ اپنے انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں۔ فرمایا کہ اس امت کا ہراول دستہ مہاجرین و انصار میں سے وہ سابقون اولون ہیں جنھوں نے سب سے پہلے نبی کی دعوت پر لبیک کہی، جو اس وقت اسلام کی طرف بڑھے جب ایک قدم بھی اس کی طرف بڑھنا گوناگوں مزاحمتوں کا مقابلہ کیے بغیر ممکن نہ تھا اور جو اس وقت نبی کی حمایت و مدافعت کے لیے اٹھے جب اس کی حمایت و مدافعت تمام احمر و اسود سے لڑائی مول لینے کے ہم معنی تھی۔

اسلامی معاشرہ میں دوسرے درجہ کے لوگ

دوسرے درجے پر وہ لوگ ہیں جو اگرچہ اولیت و اسبقیت کا درجہ تو حاصل نہ کر سکے تاہم انھوں نے پورے اخلاص اور پوری راست بازی سے سابقین اولین کے نقشِ قدم کی پیروی کی۔ اس پیروی میں انھوں نے کسی نمائش، کسی مصلحت، کسی غرض یا کسی نوع کے تذبذب اور نفاق کو دخیل نہیں ہونے دیا۔ ایک مرتبہ بڑھ کر انھوں نے پیچھے مڑنے کا نام نہیں لیا۔ جن سے کٹنا تھا ان کو کاٹا تو اس طرح کہ کوئی تسمہ لگا نہیں رہنے دیا اور جن سے جڑے تو اس طرح نہیں کہ ع

منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

بلکہ اس طرح جڑے کہ ع

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اسی خلوص و صداقت اور ظاہر و باطن کی اسی کامل ہم آہنگی اور ہم رنگی کو یہاں 'احسان' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ 'احسان' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ کسی کام کو کمال حسن و خوبی سے انجام دینے کے بھی ہیں۔

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی عظیم بشارت

'رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ' یہ ان سابقین اولین کے لیے عظیم بشارت بھی ہے اور ان کی بڑی سے بڑی تعریف بھی جو اس دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہو سکتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ ان سے اس لیے راضی ہوا کہ وہ اپنے بندوں سے حق کی راہ میں جو صبر و ثبات، جو عزیمت و استقامت، جو جانبازی و سرفروشی چاہتا ہے اس کا انھوں نے حق ادا کر دیا اور انھوں نے اللہ اور رسول سے جو عہد باندھا زندگی کے تمام نشیب و فراز میں، تمام مزاحمتوں اور مخالفتوں کے علی الرغم، پوری خوبی سے اس کو نبھایا۔ ان کے رب نے ان کو جو قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائیں ان کو انھوں نے درجہ کمال تک پروان چڑھایا اور ان کو اپنے رب ہی کی رضا طلبی میں صرف کیا۔ شیطان کو ان میں ساجھی بننے کا، اپنے امکان کے حد تک کوئی موقع نہیں دیا۔

'نفس مطمئنہ' کا مطلب

اللہ سے ان کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کو ہر رنگ میں انھوں نے اس کے عدل، اس کی حکمت اور اس کی رحمت پر محمول کیا۔ ان کو اگر کوئی افتاد پیش آئی تو اس کو انھوں نے اپنی کسی خامی کا علاج سمجھا، کوئی مشکل پیش آئی تو اس کو صبر و عزیمت کا امتحان جانا، سکھ ملا تو دل و جان سے اس کے شکرگزار ہوئے۔ دکھ ملا تو صابر و مطمئن رہے۔ کسی حال میں بھی اپنی امید کے چراغ کو انھوں نے گل نہیں ہونے دیا۔ طوفان اٹھے، بجلیاں چمکیں بلکہ کبھی کبھی برق خرمن سوز سارے خرمن کو جلا کر خاکستر بھی کر گئی لیکن ان کے نفس مطمئنہ کو کوئی چیز بھی ہلا نہ سکی وہ بدستور 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی چٹان پر جما رہا اور بالآخر اس نے 'فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ' کی ابدی بشارت حاصل کی۔

اصل کامیابی

'وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ' یہ صلہ بیان ہوا ہے اس رضا و اطمینان پر فائز ہونے کا۔ فرمایا، اصل کامیابی یہ ہے، جس کو بازی کھیلنی ہو اس کے لیے بازی کھیلے۔ اس چند روزہ دنیا کے پیچھے، جس کی ہر چیز فانی ہے۔ زندگی برباد کرنا اپنے آپ کو ابدی خسران و نامرادی کے حوالہ کرنا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۚ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۛ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (۱۰۱)

منافقین کی نشان دہی

یہ منافقین کی نشان دہی ہے۔ فرمایا کہ بدوؤں میں بھی بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح اہل مدینہ میں بھی ایک گروہ منافقوں کا ہے۔ یہ لوگ محض اپنے اغراض و مفاد کے لیے مسلمانوں میں گھسے

ہوئے ہیں اور نفاق میں یہ اتنے منجھے ہوئے ہیں کہ تمھارے لیے ان کا پہچاننا مشکل ہے۔ اللہ ہی ان سب سے واقف ہے مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ، 'مَرَدَ وَاسْتَمَرَّ عَلَيْهِ' یعنی یہ نفاق میں نہایت شاطر، مشاق اور پختہ کار ہو گئے ہیں اور اس مہارت سے انھوں نے اپنے اوپر اسلام کا نمائشی رنگ چڑھایا ہے کہ مسلمانوں کو بڑی کامیابی سے دھوکا دے دیتے ہیں لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ، میں مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہے اور ان منافقین کو بھی۔ مسلمانوں کو تنبیہ یہ ہے کہ ان کے معاملے میں بڑی زیرکی و ہوشیاری سے کام لو اور برابر چوکنے رہو، یہ ایسا بھگل بناتے ہیں کہ ہر شخص ان کو تاڑ نہیں سکتا۔ منافقین کو یہ تنبیہ ہے کہ خواہ تم کیسا ہی بھگل بناؤ، دوسرے تمھیں پہچانتے میں دھوکا کھا سکتے ہیں، لیکن اللہ تم کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ تم میں سے ہر ایک کو کیفر کردار کو پہنچائے گا۔ سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ، میں ایک تو اس سزا کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں ان کو ملنے والی ہے۔ دوسرے اس عذاب کی طرف جس سے یہ عالم برزخ میں دوچار ہوں گے۔ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ، یہ عذاب آخرت کی طرف اشارہ ہے جو سب سے زیادہ سخت ہوگا۔ اوپر اہل ایمان کے لیے 'فَوْزٌ عَظِيمٌ' کی بشارت گزری ہے۔ ان منافقین کے لیے یہ عذاب عظیم ہے۔

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ۖ وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۱۰۲-۱۰۵)

اپنے گناہوں کا اعتراف کر لینے والے

'وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ ..... الایۃ'۔ یہ ان لوگوں کا بیان ہے جو اگرچہ کمزوریوں میں مبتلا رہے تھے اور تبوک کے موقع پر بھی ان سے کمزوری صادر ہو گئی تھی لیکن ایمان کی رمق ان کے اندر باقی تھی۔ جب اس سورہ نے منافقین کو اچھی طرح جھنجھوڑا اور ان کے علم میں یہ باتیں آئیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انھوں نے باتیں بنانے کی کوشش کے بجائے صدق دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور نہایت بے چینی کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ اور رسول کے آگے ڈال دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ تک کیا کہ اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ دیا کہ نہ کچھ کھائیں گے نہ پئیں گے اور نہ اس وقت تک یہاں سے ٹلیں گے جب تک اللہ و رسول کی طرف سے معافی نہ ملے۔ بسا اوقات اپنے گناہوں پر بندے کی شرمساری اور توبہ کے لیے سچی بے قراری اللہ تعالیٰ کو اس کی نیکی سے بھی زیادہ پسند آتی ہے چنانچہ ان کا اعتراف گناہ اللہ تعالیٰ کو پسند آیا اور جیسا کہ 'عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ' کے الفاظ سے واضح ہے ان کو قبولیت توبہ کی امید دلا دی گئی۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ جب قرآن دنیا میں آیا ہے تو اس

کے الفاظ و کلمات کا دلوں پر کیا اثر پڑتا تھا اور اب ہمارے دلوں پر اس کی تاثیر کا کیا حال ہے ؟ قرآن وہی ہے اور نفاق کی بھی بدتر سے بدتر قسمیں ہمارے اندر موجود ہیں لیکن قلوب وہ نہیں ہیں جو قرآن کی آیتیں پڑھ کر یہ اثر لیں کہ لپنے او پر خواب و خور حرام کرلیں ۔ اس زمانے میں اپنی تنخواہوں میں چند روپے کے اضافہ کے لیے فاقہ کرنے والے بہتیرے مل جائیں گے لیکن اپنے گناہوں کے غم میں اپنی ایک رات کی نیند بھی قربان کرنے والے شاید کم ہی ملیں۔

نیکیوں کی برکت

'خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا' جو چیز ان کے حق میں سفارش بنی ہے ، یہ اس کا بیان ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ نفاق ہی پر نہیں پلے اور بڑھے بلکہ بدیوں کے ساتھ انھوں نے نیکیاں بھی کمائی ہیں، نیکی کی راہ پر چلتے چلتے انھوں نے ٹھوکریں بھی کھائیں لیکن اس طرح نہیں کہ گر کر پھر اٹھنے کا نام ہی نہ لیا ہو ، بلکہ گرنے کے بعد اٹھتے اور سنبھلتے بھی رہے ہیں۔ یہی چیز ان کے لیے اعتراف گناہ اور توبہ کا باعث ہوئی ہے اس وجہ سے یہ نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں بلکہ اللہ کی نظر عنایت کے سزاوار ہیں۔

قبولیت توبہ کی شرط

'عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْہِمْ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ' یہ ان کے لیے قبولیت توبہ اور رحمت کی بشارت ہے لیکن اسلوب بیان قطعی وعدے کا نہیں بلکہ لفظ 'عَسٰی' ظاہر کر رہا ہے کہ یہ بشارت مشروط ہے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں اس شرط کی طرف اشارہ بھی فرما دیا ہے۔ 'وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُہٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ...... الایۃ' ۔ یعنی ان سے کہہ دو کہ اب تم اپنے عمل سے ثابت کرو کہ تم اپنی توبہ میں راسخ ہو، اللہ اور رسولؐ اور اہل ایمان تمہارے رویہ کو دیکھیں گے اور اسی رویہ پر تمہارے باب میں آخری فیصلہ کا انحصار ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ بروقت تو ان لوگوں کو معافی دے دی گئی لیکن اس شرط پر کہ وہ اپنے رویہ کو آیندہ زیادہ سے زیادہ اللہ اور رسولؐ اور اہل ایمان کی پسند کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔ یہ گویا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان پر احتساب ابھی قائم رہے گا تا آنکہ یہ اپنے عمل سے اپنے آپ کو پورے اعتماد کے لائق ثابت کر دیں۔

بشارت

صدقہ ذریعہ تزکیہ ہے

'خُذْ مِنْ اَمْوَالِہِمْ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمْ وَتُزَکِّیْہِمْ بِہَا وَصَلِّ عَلَیْہِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمْ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ' پیچھے آیات ۵۳-۵۴ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس مرحلہ میں اگرچہ منافقین کے صدقات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل بے پروائی برتنے کی ہدایت فرما دی گئی تھی چنانچہ بعض کے صدقات آپ رد بھی فرما دیتے تھے۔ اسی طرح آیت ۸۴ میں آپ کو ان کے لیے دعا و استغفار سے بھی منع فرما دیا گیا تھا۔ لیکن جن لوگوں کو معافی دے دی گئی ان کے ساتھ ہی برکت و رحمت کے یہ دونوں دروازے بھی کھول دیے گئے، فرمایا کہ 'خُذْ مِنْ اَمْوَالِہِمْ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمْ وَتُزَکِّیْہِمْ بِہَا وَصَلِّ عَلَیْہِمْ' ان لوگوں کے پیش کردہ صدقات قبول کر لیا کرو اس لیے کہ اسی سے تم ان کو رذائل سے پاک اور فضائل

سے آراستہ کرو گے اور ان کے لیے دعا بھی کرتے رہو اس لیے کہ تمہاری دعا ہی ہے جو ان کے لیے سرمایۂ سکینت بنے گی۔

تطہیر اور تزکیہ کا فرق

یہاں تطہیر اور تزکیہ کے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن میں ان دونوں کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ 'تطہیر' میں غالب پہلو ظاہری اور باطنی نجاستوں اور رذائل سے پاک کرنے کا ہے اور 'تزکیہ' میں رذائل سے پاک کرنے کے ساتھ ساتھ صلاحیتوں اور خوبیوں کو نشو و نما دینے اور فضائل اخلاق سے آراستہ کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔

مرضِ نفاق کا مؤثر علاج۔ انفاق

اس ٹکڑے سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ نفاق کی بیماری کا سب سے زیادہ مؤثر علاج اللہ کی راہ میں انفاق ہے۔ یہ بیماری اصلاً محبت دنیا سے پیدا ہوتی ہے جو ان تمام رذائل کے پیدا ہونے کا سبب ہے جن کے مجموعے کا نام نفاق ہے۔ انفاق سے اس بیماری کی جڑ کٹتی ہے اور جب اس کی جڑ کٹ جاتی ہے تو ایک طرف رذائل مضمحل ہو جاتے ہیں دوسری طرف مکارم و فضائل پروان چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

انفاق کا اصلی فائدہ انفاق کرنے والے کو ہوتا ہے

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ اللہ اور رسول پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ اصل احسان اللہ اور رسول کا ہے کہ ان کے انفاق کو قبول فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ اس سے جو تطہیر و تزکیہ حاصل ہوتا ہے اس کے محتاج اللہ اور رسول نہیں ہیں بلکہ وہی لوگ ہیں جن کو انفاق کی دعوت دی جاتی ہے۔

معافی یافتہ لوگوں کے ساتھ مزید رعایت

'صَلِّ عَلَيْهِمْ' میں عام دعا و استغفار کے ساتھ ساتھ نمازِ جنازہ بھی شامل ہے۔ منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی جو ممانعت آیت ۸۴ میں وارد ہے، ان معافی یافتہ لوگوں کے باب وہ ممانعت اٹھا دی گئی۔

تسلی اور تنبیہ

'وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ' میں تسلی بھی ہے اور تنبیہ بھی۔ اس کی وضاحت ایک سے زیادہ مواقع میں ہو چکی ہے۔

توبہ اور انفاق کی ترغیب

'اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ ..... الاٰیۃ' اوپر والی آیت میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ آپ کو یہ ہدایت فرمائی گئی تھی کہ جب انھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے تو ان کو اپنی تربیت میں از سر نو لے لو، ساتھ ہی جو چیز ان کی تربیت و اصلاح میں سب سے زیادہ مؤثر ہو سکتی تھی اس کی طرف بھی رہنمائی فرما دی۔ اس آیت میں خود ان لوگوں کو توبہ اور انفاق میں سرگرم ہونے پر ابھارا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ اور ان کے صدقات قبول فرماتا ہے، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے، اگر جو خدا کی رضا اور قرب کے طالب ہوں انھیں چاہیے کہ وہ خدا کی پسند کے یہ کام زیادہ سے زیادہ کریں۔ اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ توبہ اور اصلاح کا کام کوئی وقتی کام نہیں ہے

بلکہ اس میں دوام اور استمرار مطلوب ہے۔

آئندہ کے لیے تنبیہ

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ ہر چند اس وقت تمہیں معافی دے دی گئی ہے لیکن اس معافی پر مطمئن نہ ہو بیٹھنا بلکہ آئندہ اپنے عمل سے ثابت کرو کہ تم سچے دل سے خدا کی طرف رجوع ہوئے ہو۔ اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان سب تمہارے رویہ پر نگاہ رکھیں گے۔ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، اگر تم رسول اور مومنین سے اپنی کوئی حرکت چھپا رکھنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو یاد رکھو کہ ایک دن تمہیں سارے غائب و حاضر کے علم رکھنے والے خدا کے سامنے بھی حاضر ہونا ہے، وہ تمہارا سارا کچا چٹھا تمہارے آگے رکھ دے گا۔

بے داغ ماضی رکھنے والے بعض لوگوں پر عتاب

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۰۶)

'اِرْجَاءٌ' کے معنی کسی معاملے کو مؤخر اور ملتوی کرنے کے ہیں۔

بعض لوگوں نے اگرچہ اپنے گناہ کا نہایت سچائی سے اعتراف کر لیا تھا لیکن ان کو اس وقت معافی نہیں ملی بلکہ ان کے معاملے کا فیصلہ آئندہ پر اٹھا رکھا گیا۔ آگے آیت ۱۱۸ میں ان کا حوالہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین آدمی تھے۔ روایات میں ان کے نام کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع مذکور ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ حضرات نفاق میں متہم نہیں تھے بلکہ اسلام کے لیے قربانیاں پیش کرنے والے لوگوں میں سے تھے، پچھلے غزوات میں بھی شریک رہ چکے تھے، لیکن تبوک کے موقع پر ان سے کمزوری صادر ہو گئی اور بعض خاص وجوہ کی بنا پر، جن کی طرف ہم اشارہ کریں گے، دوسروں کے مقابل میں ان پر زیادہ سخت گرفت ہوئی۔ فرمایا کہ ان کا معاملہ خدا کے فیصلہ تک ملتوی کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو ان کو سزا دے گا۔ چاہے گا تو ان کی توبہ قبول فرمائے گا، اللہ علیم و حکیم ہے۔ ان کے باب میں اس کے علم و حکمت کا جو تقاضا ہو گا وہ اس کے مطابق فیصلہ نافذ فرمائے گا۔

شدتِ عتاب کے وجوہ

عتاب بقدر اعتماد

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر جب کہ بظاہر ان کا ماضی بے داغ بھی تھا، اس قدر قدر عتاب کیوں ہوا؟ ہمارے نزدیک اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔

احساس کی کمی

ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کسی پر عتاب اس نسبت سے ہوتا ہے جس نسبت سے اس پر اعتماد اور اس سے حسن ظن ہوتا ہے۔ دوسروں نے اگر غلطی کی تو ان کی کمزوریوں کی بنا پر ان سے بعید نہیں تھی لیکن ان لوگوں نے جو غلطی کی اس سے اپنے پچھلے بے داغ ریکارڈ کو بھی انھوں نے داغدار کیا اور پیغمبرؐ کے اس اعتماد اور حسنِ ظن کو بھی ٹھیس پہنچائی جو ہر مومن کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے غالباً اس اعتماد کی بنا پر جو انھیں اپنی سابق خدمات پر رہا ہو گا، اپنی اس غلطی کا اس شدت کے ساتھ احساس بھی نہیں کیا جس شدت کے ساتھ انھیں اس کا احساس کرنا تھا چنانچہ آگے والی آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ اپنی کسی غلطی پر احساسِ ندامت کی

کی توبہ کی اصل روح کے منافی ہے اس وجہ سے حکمت تربیت مقتضی ہوئی کہ ان کی توبہ کی قبولیت لمبے عرصہ تک ملتوی رہے جب تک ان کے اندر وہ بے قراری اور دل کی وہ خستگی و شکستگی نہ پیدا ہو جائے جو توبہ کی قبولیت کے لیے اللہ کی بارگاہ میں سفارشی بنتی ہے۔

منافقانہ ذہنیت پر آخری ضرب

تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس مرحلہ میں، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، منافقانہ ذہنیت پر آخری ضرب لگائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ نفاق کے خلاف مسلمانوں کی حس اتنی بیدار ہو جائے کہ وہ اس کی کسی قسم کو بھی اپنے اندر گوارا کرنے پر راضی نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے ایسے لوگوں پر گرفت سب سے زیادہ مؤثر ہو سکتی تھی جو اپنی اس غلطی سے پہلے معاشرہ کے بے داغ لوگوں میں شمار ہوتے رہے ہوں۔ اس واقعہ نے منافقین کی آنکھیں بھی کھول دی ہوں گی کہ جب اس قسم کے لوگوں پر ایسی گرفت ہو سکتی ہے تو تا بدیگراں چہ رسد۔ اور دوسرے مسلمانوں نے بھی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ دین میں اصل معیار مطلوب کیا ہے جس کی کسوٹی پر کسے جانے کے لیے ہر مسلمان کو تیار رہنا چاہیے۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ ۚ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ ۖ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۚ لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ (۱۰۷-۱۰۸)

منافقین کا سب سے زیادہ شریر گروہ

یہ منافقین کے سب سے زیادہ شریر گروہ کا ذکر ہے۔ ان لوگوں کی جس شرارت کی طرف یہاں اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ مدینہ میں دو مسجدیں پہلے سے موجود تھیں، ایک مضافات شہر میں مسجد قبا، دوسری شہر کے اندر، مسجد نبوی۔ لیکن انھوں نے اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی ایک الگ مسجد بنائی۔ مقصود تو ان کا یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں وہ کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ایک اڈا مہیا کریں لیکن اس کو نام مسجد کا دیا تاکہ اس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر اپنی دینداری کی دھونس بھی جمائیں اور اپنے مقاصد بھی پورے کر سکیں۔ اس کو مسلمانوں کی نظروں میں مقبول اور مقدس بنانے کے لیے انھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس میں ایک مرتبہ نماز پڑھ دیں تاکہ اس کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں وہی احترام حاصل ہو جائے جو مسجد قبا کو حاصل ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اغراض مشؤمہ بھانپ کر پہلے تو ان کو ٹال دیا پھر جب اس کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہو گئیں تو اس میں نماز پڑھنا تو الگ رہا آپ نے تبوک سے واپسی پر اس کو گروا بھی دیا۔

مسجد ضرار کی تعمیر کے مقاصد فاسدہ

اس نام نہاد مسجد کی تعمیر جن اغراض فاسدہ کے لیے ہوئی تھی قرآن نے ان سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس کی پہلی غرض یہ بتائی ہے کہ یہ ضرار کے لیے بنائی گئی ہے۔ یعنی اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے۔ مسجد، اقامت نماز اور اقامت دین کا مرکز ہوتی ہے۔ لیکن یہ دام ہمرنگ مسجد اس لیے

بچھایا گیا تھا کہ مسلمان اس میں پھنسیں اور پھر ان کے اندر آہستہ آہستہ نفاق کا زہر اتارا جائے۔

دوسرا مقصد اس کا کفر بتایا ہے۔ یعنی جو کفر ان کے اندر رچا بسا ہوا تھا اس کی پرورش اور اس کی تائید و تقویت کے لیے ایک پرورش گاہ بنائی گئی تھی۔ مسجد ایمان کی تربیت گاہ ہوتی ہے لیکن یہ نام نہاد مسجد اس کے بالکل برعکس کفر کی خدمت کے لیے تعمیر کی گئی۔

تیسرا مقصد اس کا تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ بتایا ہے یعنی یہ اس غرض سے بنائی گئی کہ مسلمانوں کے شیرازے کو پراگندہ کیا جائے۔ اسلام میں مسجد ہی ہے جو مسلمانوں کو ایک سلک میں پروتی اور ان کی اجتماعی زندگی میں وحدت و تالیف پیدا کرتی ہے۔ ان منافقین نے یہ چاہا کہ ایک مسجد بنا کر پہلے مسلمانوں کو اس کی طرف کھینچیں اور پھر اپنی وسوسہ اندازیوں سے ان کو ملت سے کاٹ دیں۔

چوتھا مقصد اس کا اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ بتایا گیا ہے۔ یعنی یہ ان لوگوں کے لیے ایک کمین گاہ کا کام دے جو اللہ اور رسول سے برسرپیکار رہ چکے ہیں۔ ان منافقین کے متعلق یہ بات پیچھے واضح ہو چکی ہے کہ ان کی تمام ہمدردیاں اسلام سے برسرپیکار طاقتوں کے ساتھ تھیں۔ یہ رات دن انہی کی کامیابی کے متمنی اور مسلمانوں کے اندر انہی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اس مرحلے میں آ کر انھوں نے یہ سوچا کہ مسجد کے نام سے اپنا ایک اڈا بھی بنا لیں تاکہ ان کی معاندانہ سرگرمیوں پر پردہ بھی پڑا رہے اور اس پردے میں وہ مسلمانوں کے عین مستقر میں اسلام کے دشمنوں کے لیے ایک کمین گاہ بھی فراہم کر دیں۔

منافقین کی جھوٹی قسمیں

وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۔ یعنی اس نام نہاد مسجد کی تعمیر سے مقاصد تو وہ پیش نظر ہیں جو مذکور ہوئے لیکن یہ منافقین تمھیں قسمیں کھا کھا کے اطمینان دلانے کی کوشش کریں گے کہ یہ کام انھوں نے محض اسلام اور مسلمانوں کی بہبود پیش نظر رکھ کر کیا ہے کہ عبادت کے لیے ایک مسجد کا اضافہ ہو جائے، اللہ کے ذکر اور اس کی بندگی کا ایک گھر تعمیر ہو جائے، جو مسلمان اندھیری راتوں یا سردی اور بارش میں، مسجد قبا کی دوری کے سبب سے، جماعت کی حاضری سے محروم رہ جاتے ہیں، ثواب جماعت سے محروم نہ رہیں۔ فرمایا کہ یہ قسمیں کھا کھا کے تمھیں یقین دلائیں گے لیکن اللہ بھی قسم کھاتا ہے کہ یہ منافق بالکل جھوٹے ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ کے الفاظ قسم کے مفہوم میں آتے ہیں۔

حذف خبر کی ایک مثال

اس آیت سے متعلق ایک شبہ بھی ہے کہ اس میں خبر مذکور نہیں ہے۔ مفسرین نے عام طور پر تاویل یہ کی ہے کہ اوپر جن منافقین کا ذکر ہوا ہے انھیں منافقین کے زمرے میں یہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے مسجد ضرار بنائی لیکن اس بات سے صرف حرف عطف کی توجیہ سامنے آتی ہے خبر کا مسئلہ اس سے حل نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک یہاں خبر محذوف ہے۔ عربی زبان میں بعض اوقات شدت غضب کے مواقع میں خبر محذوف

ہو جاتی ہے گویا متکلم کی شدت لہجہ خود خبر کی قائم مقام بن جاتی ہے۔ اس کی نہایت عمدہ مثالیں ان شاء اللہ آخری گروپ کی سورتوں کی تفسیر میں آئیں گی۔

منافقین کی سازش کی ناکامی

'لَا تَقُمْ فِيهِ اَبَدًا ..... الاية' منافقین نے یہ فتنہ کھڑا کرنے کو تو کھڑا کر لیا لیکن اس کی کامیابی کا انحصار اس امر پر تھا کہ اس کے افتتاح کے لیے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لانے میں کامیاب ہو جاتے لیکن اس کوشش میں، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پہلے تو حضورؐ نے ان کی بات ٹال دی، بعد میں سفر تبوک کے دوران ہی میں یہ آیتیں اتریں جن سے ان کی سازش بے نقاب ہو گئی اور آپ کو اس نام نہاد مسجد میں نماز تو درکنار کھڑے ہونے سے بھی سے روک دیا گیا۔ اگرچہ شدت لہجہ کا رخ حضورؐ کی طرف نہیں بلکہ بالواسطہ منافقین کی طرف ہے۔

مسجد قبا اور اس کے نمازیوں کی تعریف

'لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى' سے مراد، قرینہ دلیل ہے، مسجد قبا ہے۔ اس لیے کہ مسجد ضرار اسی کے توڑ پر بنائی گئی تھی۔ منافقین نے تو اس کا توڑ کرنا چاہا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی اس تعریف سے اس کو اور اس کے نمازیوں کو زندہ جاوید بنا دیا۔ فرمایا کہ وہ مسجد جس کی بنیاد روز اول سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے تمہارے قیام کی اصلی حق دار وہ ہے۔ نہ کہ وہ جس کی بنیاد ضرار، کفر، تفریق ملت اور سازش پر رکھی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس کے نمازیوں کی تعریف فرمائی کہ وہ ظاہر و باطن کی پاکیزگی کو عزیز رکھتے ہیں اور اللہ ایسے ہی پاکیزہ لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اس میں مسجد قبا کے نمازیوں کی تعریف کے ساتھ مسجد ضرار کے مفسدین پر تعریض بھی ہے کہ ان کا ظاہر و باطن دونوں گندا ہے اور جب اللہ کے نزدیک وہ مبغوض ہیں تو تمہارا ان سے اور ان کی اس نام نہاد مسجد سے کیا تعلق۔

'افعل' کا مجرد استعمال

یہاں 'اَحَقُّ' کا لفظ ہے جس سے گمان ترجیح و تفضیل کی طرف جاتا ہے لیکن کلام عرب اور قرآن میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ 'اَفْعَلُ' بعض مرتبہ نسبت اور تقابل سے مجرد ہو کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ کسی موزوں مقام پر ہم اس کی مثالیں پیش کریں گے۔

مسجد کی بنیاد تقویٰ پر ہوتی ہے

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ مسجد کی بنیاد درحقیقت زمین پر نہیں بلکہ بانیوں کے دلوں پر قائم ہوتی ہے۔ اگر بانیوں کے دلوں میں تقویٰ ہو اور وہ اس تقویٰ پر مسجد کی بنیاد رکھیں تب تو وہ مسجد ہے۔ اگر دلوں میں شر و فساد ہو تو وہ مسجد نہیں بلکہ بت خانہ ہے جو اپنے بانیوں اور پجاریوں سمیت، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہو گا، ایک دن جہنم میں جا گرے گا۔

'شفا' کا مفہوم

'جُرُف' کا مفہوم

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰۹)

'شَفَا' کسی چیز کے کنارے اور اس کی دھار کو کہتے ہیں۔

'جُرُف' ندیوں، نالوں اور وادیوں میں دیکھا ہو گا کہ بعض اوقات پانی کا زور کسی کنارے کے نیچے

سے مٹی بہا لے جاتا ہے، اور پیچھے کی طرح صرف کنارہ لٹکا رہ جاتا ہے۔ اس طرح کی کھوکھلی اور بے ثبات گگر کو عربی میں 'جُرُف' کہتے ہیں۔

'هَارٍ' 'هَارَ، يَهُوْرُ، هَوْرًا' سے ہے۔ 'هَارَ الْبِنَاءُ' کے معنی عمارت پھٹ کر مائل بہ سقوط ہے۔ اسم فاعل 'هَائِرٌ' بھی آتا ہے اور قلب ہو کر 'هَارٍ' بھی آتا ہے جس طرح شَائِكُ السِّلَاحِ اور شَاكِي السِّلَاحِ دونوں آتا ہے۔

یہ تمثیل بیان ہوئی ہے ان لوگوں کی جو اپنے عمل کی بنیاد تقویٰ اور رضائے الٰہی کے بجائے کسی غرض فاسد پر رکھتے ہیں۔ فرمایا کہ ان کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص اپنی عمارت ایک کھوکھلی، گرتی ہوئی گگر پر بنائے جو بالآخر اس کے سمیت جہنم میں جا گرے۔ ثبات و قرار اور اخروی فوز و فلاح صرف اسی عمل کے حصہ میں ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لیے اللہ کے احکام کے مطابق کیا جائے۔

غرض فاسد پر مبنی عمل کی تمثیل

'وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' ہدایت یہاں غایت و مقصود کی ہدایت کے معنی میں ہے یعنی اپنی جانوں پر اس طرح ظلم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بامراد و فائز المرام نہیں کرے گا۔ یہ نامراد ہی رہیں گے۔

'ہدایت' کا مفہوم

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۱۰)

یعنی یہ نام نہاد مسجد بنا کر ان منافقین نے اپنے اندر نفاق کی جڑ اتنی مستحکم کر دی ہے کہ اب یہ ان کے دلوں کے ساتھ ہے۔ ان کا نفاق اس طرح ایک ایک رگ میں جڑ جما چکا ہے کہ اب اس کو اکھاڑنا دلوں کے پاش پاش ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ جس طرح ہم اپنے محاورے میں کہتے ہیں یہ داغ تو اب کپڑے کے ساتھ ہی جائے گا، اسی طرح 'اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ' تعلیق بالمحال کا ایک خوب صورت پیرایۂ بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل عمل کے اثرات و نتائج میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یوں تو نفاق کا ہر عمل اپنے اندر زہریلے اثرات رکھتا ہے لیکن مسجد ضرار جیسا فتنہ کھڑا کر دینا ایک ایسا عمل ہے جس کے نتائج و اثرات سے جان چھڑانے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ یہ رگ و پے میں جاری و ساری ہو جاتا ہے۔

دلوں کے ساتھ چمٹ جانے والا روگ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۱۱)

اب یہ حقیقت واضح کی جا رہی ہے اس بیعت کی جو نبی کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اور جس میں ہر مسلمان 'لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ' کا اقرار کر کے شامل ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے اظہار سے یہاں مقصود اس بیعت کے مقتضیات کو ہر مسلمان کے سامنے رکھ دینا ہے تاکہ ہر شخص اس کی روشنی میں خود فیصلہ کر سکے کہ اس عہد کے تقاضے کیا ہیں اور کون سا رویہ اس کے منافی ہے جو نفاق اور کفر میں داخل ہے۔

نبی کے ہاتھ پر بیعت کے مقتضیات

اللہ اور اہل ایمان کے بین بیع و شرا کا معاہدہ

فرمایا کہ یہ بیعت اللہ اور اہل ایمان کے درمیان بیع و شرا کا ایک معاہدہ ہے جس میں اہل ایمان اپنے مال اور اپنی جان اللہ کے حوالے کرنے کا اقرار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں ان کے لیے جنت کا وعدہ فرماتا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ انسان کو سب سے بڑا شرف جو حاصل ہے وہ یہی ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہونے کے باوجود یہ درجہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بیع و شرا کا ایک معاہدہ کرتا ہے جس میں وہ اپنے اوپر بھی اسی طرح کی ایک ذمہ داری لیتا ہے جس طرح بندوں پر ایک ذمہ داری ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا یہ شرف مبنی ہے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص دائرے کے اندر اس کو اختیار بخشا ہے اور یہ چاہا ہے کہ انسان اپنی مرضی سے اپنے مال و جان پر اللہ کے حق کو تسلیم کرے اور پھر اس کے عوض میں جنت کا ابدی مقام حاصل کرے۔

جان اور مال، دونوں سے جہاد

یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ۔ یعنی اس معاہدۂ بیع و شرا کے بعد کوئی راست باز مسلمان اپنے مال یا اپنی جان کو خدا سے چرانے کا روادار نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ اللہ کی راہ میں مال اور جان دونوں سے جہاد کرتے ہیں اور اس راہ میں مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ اگر مارتے ہیں تو غازی اور مجاہد کا درجہ حاصل کرتے ہیں اور مرتے ہیں تو شہید کا مقام پاتے ہیں۔

قربانی کے عوض جنت کا وعدہ

وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۔ یعنی جان و مال کی قربانی کے عوض جنت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے اور اس کا اظہار و اقرار تورات، انجیل اور قرآن سب میں ہے۔ یہ تمام آسمانی مذاہب اور خدائی صحیفوں کی ایک مسلمہ اور مشترک حقیقت ہے۔ مثلاً تورات میں ہے۔

"سن اے اسرائیل، خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ۔" استثنا ۶: ۴-۵

انجیل میں ہے:

"جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔" متی ۱۹: ۲۹

انجیلوں میں جنت کی تعبیر بالعموم آسمانی بادشاہت سے کی گئی ہے۔ تورات میں یہود نے حرص دنیا کے سبب سے تمام اخروی انعامات کو دنیوی انعامات سے بدل لیا ہے تاہم انبیاء کی تعلیمات میں بکثرت ابدی زندگی کے ابدی انعامات کا ذکر موجود ہے۔

حیاتِ چند روزہ کے بدلے ابدی زندگی کی بادشاہی

وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۔

یہ ابھارا گیا ہے اللہ کی راہ میں بے خوف و خطر جان و مال کی قربانیاں پیش کرنے پر۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے تو جو سودا تم اس کے ساتھ کر چکے ہو اس پر تمہیں باغ باغ ہونا چاہیے۔ خدا کے ہاتھ جو بیچ چکے ہو وہ اس کی طلب پر اس کے حوالے کر دو اور جو کچھ اس کے عوض میں تمہیں

ملنا ہے اس کے لیے تیار رہو۔ اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ خدا کی جنت بڑی چیز ہے۔ یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ چند روزہ حیات کے بدلے ابدی زندگی کی بادشاہی ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۱۲)

سچے اہل ایمان کی صفات

اوپر آیت ۱۰۹ میں جس طرح خبر محذوف ہے اسی طرح اس آیت میں بھی محذوف ہے۔ زجاج کی رائے یہی ہے اور یہ رائے مجھے قوی معلوم ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ زور کلام خبر کو خود ظاہر کر دیتا ہے اگرچہ وہ لفظوں میں ظاہر نہیں ہوتی۔ یہاں موقع کلام یہ ظاہر کرتا ہے کہ جن کی صفات یہ یہ ہیں وہی لوگ سچے مومن ہیں، ان مومنین کو خوش خبری پہنچا دو۔

سیاحت کا مفہوم

اس آیت میں جو الفاظ آئے ہیں 'سَآئِحُوْنَ' کے سوا ان میں سے ہر لفظ کی تحقیق اپنے اپنے محل میں بیان ہو چکی ہے۔ 'سَآئِحُوْنَ' کے ترجمے میں مجھے بڑی مشکل پیش آئی ہے۔ 'سَاحَ يَسِيْحُ' کے معروف معنی تو زمین پر چلنے پھرنے کے ہیں چنانچہ اسی سورہ کی دوسری ہی آیت میں فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ آیا ہے۔ لیکن یہاں جس سیاق وسباق میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لغوی سیاحت کے مفہوم میں نہیں بلکہ اصطلاحی سیاحت کے مفہوم میں آیا ہے۔ لفظ 'سیاحت' قدیم زمانے سے اہل دین کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم صاحب لسان نے یوں ادا کیا ہے اَلذَّهَابُ فِي الْاَرْضِ لِلْعِبَادَةِ وَالتَّرَهُّبِ 'عبادت وریاضت کے لیے کسی سمت کو نکل کھڑے ہونا'۔ اسلام سے پہلے اکثر مذاہب میں عبادت کے پہلو سے اس بات کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کہ آدمی گھر در، بیوی بچوں اور دنیا کے ہنگاموں سے الگ ہو کر جنگلوں، پہاڑوں اور سنسان جگہوں میں نکل جائے، اپنا سارا وقت دھیان گیان، ذکر وعبادت، چلہ کشی اور ریاضت میں گزارے۔ قوت لایموت پر قناعت کرے۔ بھوک پیاس ستائے تو جنگل کے پھل پھلاری اور ندیوں چشموں کے پانی پر گزارہ کرے۔ عیسائیوں کے راہبوں، گوتم بدھ کے بھکشوؤں اور ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کا محبوب طریقۂ عبادت یہی رہا ہے۔ یہ لوگ اگر خلق کی طرف متوجہ بھی ہوتے تھے تو اس طرح کہ صبح کسی بستی میں اور شام کسی بستی میں۔ جہاں پہنچے نیکی اور پرہیزگاری کے چند کلمے لوگوں کے کانوں میں ڈالے اور وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ اسی درویشانہ اور راہبانہ زندگی کے لیے قدیم اصطلاح سیاحت کی ہے۔

اسلام میں سیاحت کی حدود

اس سیاحت کا جتنا حصہ رہبانیت کے حکم میں داخل ہے وہ تو اسلام میں ممنوع ہے اس لیے کہ اسلام دین فطرت ہے اور رہبانیت فطرت کے خلاف ہے لیکن اس کا جو حصہ زہد و توکل، ذکر و فکر، خلوت وتبتل، ریاضت و مجاہدہ، جستجوئے حقیقت، طلب علم اور دعوت الی اللہ و جہاد فی سبیل اللہ سے تعلق رکھتا ہے وہ اسلام میں بھی مطلوب و مطبوع ہے اور اس کو اسلام نے روزہ، اعتکاف، عمرہ، حج اور جہاد میں سمو دیا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں سیاحت کے باب میں نفی اور اثبات دونوں طرح کی باتیں ملتی ہیں۔ ایک طرف یہ ارشاد ملتا ہے

کہ لَا سَیَاحَۃَ فِی الْاِسْلَامِ (اسلام میں سیاحت نہیں ہے) دوسری طرف یہ چیز بھی ملتی ہے کہ سیاحۃ ھذہ الامۃ الصیام ولزوم المساجد (اس امت کے لیے سیاحت روزے اور مسجدوں کے ساتھ وابستگی ہے۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیاحت اختیار کرنے کی اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا سیاحۃ امتی الجہاد فی سبیل اللہ (میری امت کی سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلنا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ سیاحت کا جو حصہ رہبانیت کی تعریف میں آتا ہے وہ تو اسلام نے اپنے نصاب سے خارج کر دیا ہے لیکن اصل مقصد سیاحت اسلام میں بھی باقی ہے اور روزہ، اعتکاف، ہجرت، جہاد، دعوت و تبلیغ اور طلب علم و حصول تربیت کے لیے سفر، یہ سب چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یہ سیاحت جس طرح مردوں کے لیے ہے اسی طرح، جیسا کہ سورہ تحریم کے لفظ 'سَائِحَات' سے واضح ہے، عورتوں کے لیے بھی ہے۔ البتہ عورتیں ان چیزوں سے مستثنیٰ رہیں گی جن سے شریعت نے ان کو مستثنیٰ رکھا ہے مثلاً قتال وغیرہ۔

عام طور پر ہمارے مترجموں نے اس کا ترجمہ 'روزہ رکھنے والے' یا 'راہ خدا میں پھرنے والے' یا 'بے تعلق رہنے والے' کیا ہے۔ لیکن ان ترجموں سے سیاحت کا صرف ایک ایک پہلو سامنے آتا ہے۔ درآنحالیکہ اس کے متعدد پہلو ہیں۔ میں نے 'ریاضت کرنے والے' ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ میں اس پر پوری طرح مطمئن تو نہیں ہوں لیکن میرے نزدیک یہ ترجمہ نسبتہً لفظ کی روح سے قریب تر اور اس کے کل نہیں تو اکثر اطراف کا جامع ہے۔ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ۔

منافقین کے سامنے ایک آئینہ

اوپر والی آیت میں بیعت ایمان و اسلام کی حقیقت واضح فرمائی تھی۔ اس آیت میں اہل ایمان کا اصلی کردار پیش کیا جا رہا ہے اور مقصود اس سے منافقین کے سامنے ایک آئینہ رکھ دینا ہے تاکہ وہ چاہیں تو اس آئینہ کو سامنے رکھ کر اپنے کو سنوار سکیں۔

توبہ

یہاں اہل ایمان کے کردار کے جو اجزا بیان ہوئے ہیں ان میں سب سے پہلے توبہ کا ذکر ہے۔ توبہ کے معنی رجوع الی اللہ کے ہیں۔ خدا کی بندگی اور اطاعت کی راہ میں بندے کا پہلا قدم یہی ہے کہ وہ شیطانی راہوں میں ہرزہ گردی چھوڑ کر اپنے رب کی طرف لوٹتا ہے اور اس کی صراط مستقیم پر چلنے کا عزم کرتا ہے۔ پھر یہی توبہ ہے جو ہر گام پر اس کو سنبھالتی ہے۔ جب کبھی اس کا کوئی قدم راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے یہ توبہ اس کی دست گیری کرتی اور اس کو راہ پر لگاتی ہے۔

عبادت

توبہ کے بعد عبادت کا ذکر ہے۔ یہ خدا کے سب سے بڑے حق کا حوالہ ہے۔ جو بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اس پر خدا کا اولین حق اس کی عبادت کا عائد ہوتا ہے اور چونکہ خدا کے سوا کوئی اور اس حق میں ساجھی نہیں ہے اس وجہ سے اس کا بلا شرکت غیرے ہونا اس کی صفت لازمی ہے اور ساتھ ہی اطاعت بھی چونکہ اس کا بدیہی تقاضا ہے اس وجہ سے وہ بھی اس کا جزو لاینفک ہے۔

حمد

عبادت کے ساتھ حمد کا ذکر ہے جو تمام عبادات کی روح ہے اس لیے کہ نماز اور زکوٰۃ وغیرہ، جیسا کہ

اپنے مقام پر واضح ہو چکا ہے، سب خدا کی شکر گزاری اور اس کی نعمتوں کے اعتراف کے مظاہر ہیں۔ اگر بندے کے اندر شکر گزاری اور اعتراف نعمت کا جذبہ بطور ایک صفت کے راسخ نہ ہو تو نہ تو وہ عبادت کا حق ادا کرنے پر آمادہ ہی ہوتا ہے اور نہ اس کی عبادت کے اندر کوئی روح ہی ہوتی ہے۔

سیاحت

اس کے بعد سیاحت کا ذکر ہے۔ اس کی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں۔ یہ ان تمام سرگرمیوں، مشقتوں اور ریاضتوں کی ایک جامع تعبیر ہے جو آدمی اپنے ظاہر و باطن کی تربیت و اصلاح، دین کو سمجھنے اور سمجھانے، اس کو پھیلانے اور بڑھانے کے لیے والہانہ اور سرفروشانہ اختیار کرتا ہے اور جن کی راہ میں اپنی زندگی کی لذتیں، راحتیں، امنگیں اور خوشیاں بے دریغ قربان کرتا ہے۔

خلوت کی نمازیں

پھر نماز کا ذکر ہے جس کے لیے اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ نماز کا ذکر قرآن میں جہاں جہاں اس اسلوب سے ہوا ہے۔ وہاں صرف فرض نمازیں مراد نہیں ہیں بلکہ خلوت کی نمازیں مراد ہیں۔ یہی نمازیں ان تمام چیزوں کی محافظ بھی ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور یہی اس ریاضت کو بھی زندگی اور نشو و نما بخشتی ہیں جو سیاحت کے لفظ سے تعبیر کی گئی۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر ہے۔ اوپر جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کا بیشتر تعلق فرد کی اپنی اصلاح و تربیت سے ہے۔ اب یہ ان کا تعلق قوم اور جماعت کے ساتھ واضح کیا جا رہا ہے کہ وہ نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ہیں۔ وہ دوسروں کے خیر و شر سے بے تعلق رہ کر زندگی نہیں گزارتے بلکہ دوسروں کی اصلاح و تربیت کے لیے بھی اپنے اندر تڑپ رکھتے ہیں اور اپنی طاقت و صلاحیت کے مطابق اصلاح منکر کا فرض انجام دیتے ہیں۔

حفاظت حدود الٰہی

آخر میں حفظ حدود اللہ کا ذکر ہے۔ یہ درحقیقت تقویٰ کی تعبیر ہے اور خاتمہ پر ایک ایسی صفت کا حوالہ دے دیا گیا ہے جو سب سے زیادہ جامع ہے۔ یعنی وہ زندگی کے تمام مراحل میں برابر چوکنے رہتے ہیں کہ خدا نے جو حدود قائم فرمائے ہیں ان میں سے کوئی حد ٹوٹنے نہ پائے۔ نہ وہ خود کسی حد کو توڑنے کی جسارت کرتے ہیں اور نہ اپنے امکان کی حد تک کسی دوسرے کو اس کے توڑنے کی اجازت دیتے ہیں۔

اہل ایمان کے کردار کے یہ پہلو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہاں اس لیے بیان ہوئے ہیں کہ منافقین کے سامنے سچے اہل ایمان کی تصویر آجائے کہ مومن ان صفات کے حامل ہوتے ہیں نہ کہ ہر مدعی ایمان جو کردار و اعمال میں تو اس کے بالکل برعکس ہے لیکن اپنا نام اہل ایمان کے رجسٹر میں لکھوانا چاہتا ہے۔

۲۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۱۳-۱۲۹

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ خطاب براہ راست مسلمانوں سے ہے۔ تمام عناصر فاسدہ سے ان کو پاک کر دینے کے بعد آخر میں یہ بعض ہدایات اور بشارتیں دی جا رہی ہیں۔

پہلی یہ ہدایت فرمائی کہ پیغمبرؐ یا اہل ایمان کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے خدا سے استغفار کریں اگرچہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لیے جو استغفار کیا، اس کا صحیح پہلو واضح فرما دیا تاکہ یہ واقعہ کسی کے لیے غلط فہمی کا سبب نہ بنے۔ اس ہدایت سے مقصود مسلمانوں کو باطل کے ہر لوث اور ہر شائبہ سے بالکل پاک کر کے صرف حق کے لیے جینے اور مرنے کے نصب العین پر قائم کرنا ہے۔ اگر حق کے سوا کسی اور حمیت کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی آدمی کے اندر باقی رہے تو یہیں سے نفاق اور کفر کی راہیں کھلتی ہیں اس وجہ سے پوری شدت کے ساتھ اس دروازے کو بند کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ان تمام مسلمانوں کو قبولیتِ توبہ کی بشارت سنائی گئی ہے جو ان تنبیہات کے بعد، جو اس سورہ میں وارد ہوتی ہیں، اپنی کمزوریوں کی اصلاح کے لیے بے چین و بے قرار ہو گئے تھے اور توبہ و استغفار میں سرگرم تھے۔

پھر اہل مدینہ اور اعراب کے تائبین کو یہ نصیحت فرمائی کہ اپنے آپ کو ہمیشہ راست بازوں اور صداقت شعاروں کے ساتھ وابستہ رکھو تاکہ ان کی صحبت و معیت تمھاری کمزوریوں کی اصلاح کا ذریعہ بنے، نیز اس عظیم اجر کو یاد رکھو جو اللہ نے اپنی راہ کی ہر چھوٹی بڑی نیکی کے عوض دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ علاوہ ازیں خاص طور پر اہل بادیہ کو یہ نصیحت فرمائی کہ ان کی جماعتیں برابر مرکز سے وابستہ رہیں تاکہ صحبتِ نبویؐ کی برکتوں سے وہ خود بھی مستفید ہو سکیں اور اپنی قوم کو بھی مستفید کر سکیں۔

آگے مسلمانوں کو اپنے اپنے گرد و پیش کے کفار سے جنگ کرنے اور ان کے مقابل میں سخت ہونے کی تاکید فرمائی۔ اور ان تمام تنبیہات کے بعد بھی جو لوگ ابھی نفاق کی آلودگیوں میں لتھڑے ہوئے تھے ان کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا۔

آخر میں مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ واضح فرمایا کہ کیسی عظیم نعمت و رحمت ہے جو اس پیغمبرؐ کی صورت میں تمھیں نصیب ہوئی ہے تو صدق دل سے اس کی قدر کرو اور اعراض کرنے والوں سے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے، کہلوایا ہے کہ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ میرے لیے اللہ کافی ہے۔ میرا بھروسا اسی پر ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے ــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱۳ - ۱۲۹

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَمَا

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ لا وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ لا وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ

ع ۱۵ ۴

إِذَا رَجَعُوٓا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۲۲﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا قَٰتِلُوا
ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَٱعْلَمُوٓا أَنَّ
ٱللَّهَ مَعَ ٱلْمُتَّقِينَ ﴿۱۲۳﴾ وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ

الربع

زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا ۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَهُمْ
يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۱۲۴﴾ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا
إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَٰفِرُونَ ﴿۱۲۵﴾ أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ
فِى كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿۱۲۶﴾ وَ
إِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَىٰكُم مِّنْ أَحَدٍ
ثُمَّ ٱنصَرَفُوا ۚ صَرَفَ ٱللَّهُ قُلُوبَهُم بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴿۱۲۷﴾ لَقَدْ
جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم
بِٱلْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِىَ ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ
إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ ٱلْعَرْشِ ٱلْعَظِيمِ ﴿۱۲۹﴾ ع

ع ۱۶ ۵ ترجمۂ آیات ۱۱۳-۱۲۹

نبی اور مومنین کے لیے روا نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت مانگیں اگرچہ وہ قرابت دار
ہی کیوں نہ ہوں جب کہ یہ ظاہر ہو چکا کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ ہیں اور ابراہیم کا اپنے باپ
کے لیے مغفرت مانگنا صرف اس وعدے کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کر لیا تھا۔ پھر
جب اس پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اعلانِ براءت کر دیا۔ بے شک
ابراہیم بڑا ہی رقیق القلب اور بردبار تھا۔ اور اللہ کسی قوم کو، اس کو ہدایت دینے کے بعد
گمراہ نہیں کرتا جب تک وہ وضاحت کے ساتھ ان کو وہ چیزیں بتا نہ دے جن سے ان کو بچنا

ہے۔بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اللہ ہی ہے جس کی آسمانوں اور زمین پر بادشاہی ہے۔ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی دوست ہے نہ مددگار۔ ۱۱۲-۱۱۶

اللہ نے نبی اور ان مہاجرین وانصار پر رحمت کی نظر کی جنھوں نے نبی کا ساتھ تنگی کے وقت میں دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ پھر اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی۔ بے شک وہ ان پر نہایت مہربان اور رحیم ہے اور ان تینوں پر بھی رحمت کی نگاہ کی جن کا معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں ضیق میں پڑ گئیں اور انھوں نے اندازہ کر لیا کہ خدا سے خدا کے سوا کہیں مفر نہیں۔ پھر اللہ نے ان پر عنایت کی نظر کی تاکہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ ہی ہے جو توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۱۷-۱۱۸

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور راست بازوں کی معیت اختیار کرو۔ اہل مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے اعراب کے لیے روا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھ رہیں اور نہ یہ کہ اپنی جان کو اس کی جان سے عزیز رکھیں۔ یہ اس لیے کہ جو پیاس، تکان اور بھوک بھی خدا کی راہ میں ان کو لاحق ہوتی ہے، اور جو قدم بھی وہ کفار کو رنج پہنچانے والا اٹھاتے ہیں اور جو چرکا بھی وہ کسی دشمن کو لگاتے ہیں، ان سب کے بدلے میں ان کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ اور جو کوئی چھوٹا یا بڑا انفاق وہ کرتے ہیں اور جو وادی بھی وہ قطع کرتے ہیں، سب ان کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔ یہ تو نہ تھا کہ سب ہی مسلمان اٹھتے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ کچھ لوگ نکلتے تاکہ دین میں بصیرت حاصل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو بھی آگاہ کرتے جب کہ

وہ ان کی طرف لوٹتے کہ وہ بھی احتیاط کرنے والے بنتے۔ ۱۱۹-۱۲۲

اے ایمان والو، تمہارے گرد و پیش جو کفار ہیں ان سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تمہارے رویہ میں سختی محسوس کریں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جو پوچھتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا، سو جو سچ مچ ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں۔ رہے وہ جن کے دلوں میں روگ ہے تو وہ ان کی نجاست پر ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیتی ہے اور وہ کفر ہی کی حالت میں مرتے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی نہ تو توبہ کرتے نہ یاددہانی ہی حاصل کرتے۔ اور جب کوئی سورہ اتاری جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے پھر کھسک جاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے بوجہ اس کے کہ یہ سمجھ سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔ ۱۲۳-۱۲۷

تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آچکا ہے جس پر تمہارا ہلاکت میں پڑنا بہت شاق ہے، وہ تمہارے ایمان کا حریص اور اہل ایمان کے لیے سراپا شفقت و رحمت ہے پس اگر وہ روگردانی کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ ۱۲۸-۱۲۹

۲۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ ج فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ (۱۱۳-۱۱۴)

مشرکین کے لیے استغفار کی ممانعت۔

'مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ ...... الایۃ' یہ مسلمانوں کو ایک نہایت خفی شائبہ شرک سے، جو نفاق کا ایک چور دروازہ ہے، پرہیز کرنے کی ہدایت ہے۔ وہ یہ کہ جن لوگوں پر حق پوری طرح واضح کیا جا چکا ہے اور جن سے اتمام حجت کے بعد اعلان برأت ہو چکا ہے، پھر بھی وہ ایمان نہ لائے، ان کے لیے اہل ایمان مغفرت نہ مانگیں اس لیے کہ اس قسم کے معاندین، خدا کے غضب کے مستحق ہیں۔ ان کے لیے رشتۂ قرابت یا کسی اور رابطۂ محبت کی بنا پر رحمت کی دعا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حمیت قرابت، حمیت حق پر غالب ہے۔ آیت میں مشرکین کا لفظ یہاں مشرکین عرب کے لیے ہے جن سے اس سورہ میں، جیسا کہ آپ پیچھے تفصیل سے پڑھ آئے ہیں، نہایت آشکارا الفاظ میں اللہ اور رسول کی طرف سے اعلان برأت ہو چکا ہے اور منافقین کی بڑی کمزوریوں میں سے یہ کمزوری بتائی گئی ہے کہ وہ ان سے اپنی قرابت اور دوستی کے روابط کاٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ تمام روابط ختم کر دینے کے بعد اہل ایمان کو یہ ہدایت ہوئی کہ ان کے لیے مغفرت کی دعا بھی نہ کی جائے۔ یاد ہوگا کہ اوپر یہی ممانعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کٹر منافقین کے باب میں بھی ہوئی ہے کہ آپ نہ ان کے لیے استغفار کریں نہ ان کی نماز جنازہ پڑھیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں ایک مرحلہ آتا ہے جب ان کو اور اہل ایمان کو کفار کے لیے ہدایت و مغفرت کی دعا سے بھی روک دیا جاتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر وہ وقت بھی آتا ہے جب کہ 'رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا' کے الفاظ بھی ان کی زبان سے ان کفار کے حق میں نکلتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اہل باطل کے ساتھ کوئی تسمہ بھی اہل حق کا لگا رہنے نہیں دینا چاہتا تاکہ جو عذاب ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے وہ اس کو بھگتنے کے لیے ہر امان سے محفوظ ہو جائیں۔ سورۂ انفال میں ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ نبی اور اہل ایمان کی دعائیں ان کی قوم کے لیے امان کا کام دیتی ہیں۔ یہاں نبیؐ اور اہل ایمان کو استغفار سے روک کر اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو گویا آخری امان سے بھی محروم کر دیا۔

'وَلَوْ کَانُوْٓا اُولِیْ قُرْبٰی' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ نبی کے ساتھ بھی کسی کی رشتہ داری ایمان کے بغیر خدا کے ہاں کچھ کام آنے والی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد دوسرے رشتوں ناتوں کی کیا اہمیت باقی رہی۔

ممانعت کے حدود

'مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّھُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ' کے الفاظ سے یہ بات تو واضح طور پر نکلتی ہے کہ جن کا جہنمی ہونا قطعی طور پر معلوم ہو چکا ہو ان کے لیے اہل ایمان کو استغفار کرنا جائز نہیں ہے لیکن اس سے کسی کافر کے لیے ہدایت کی دعا کرنے کی ممانعت نہیں نکلتی اس لیے کہ آیت میں جن مشرکین کا ذکر ہے ان کا جہنمی ہونا خود اللہ تعالیٰ نے بتا دیا تھا۔ رسول کے بعد، کسی کے باب میں قطعی طور پر اس بات کے معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ ہدایت نہیں اختیار کرے گا، لازمی جہنمی ہی ہوگا۔ اس وجہ سے ایسے لوگوں کی ہدایت کی دعا کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کفر ہی پر مرا ہے تو اس کے

لیے نجات کی دعا نہیں کرنی چاہیے اس لیے کہ اس سے ایمان کی بے توقیری اور خدا کے قانون عدل کی نفی ہوتی ہے جس سے احتراز اہل ایمان کے لیے لازمی ہے۔

حضرت ابراہیم کے استغفار کی نوعیت

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ ...... الاٰیۃ' یہ ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے یعنی کوئی یہ نہ خیال کرے کہ جب حضرت ابراہیم نے اپنے کافر باپ کے لیے مغفرت کی دعا کی تو آخر وہ اپنے کافر عزیزوں کے لیے استغفار کیوں نہیں کر سکتا؟ فرمایا کہ ابراہیم نے جو کچھ کیا وہ محض ایک وعدے کا ایفا تھا جو وہ اپنے باپ سے کر چکے تھے۔ پھر یہ اس وقت کا معاملہ ہے جب ان پر یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھی کہ باپ فی الحقیقت اللہ کا دشمن ہے جب ان پر یہ بات واضح ہو گئی، انھوں نے اس سے اعلان برأت کر دیا۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں واضح ہونے سے مراد یہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو آگاہ فرما دیا کہ بس اب اس کا پیچھا چھوڑو یہ ایمان لانے والا نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم کا اپنے باپ سے وعدہ

حضرت ابراہیم کے جس وعدے کا یہاں حوالہ ہے وہ قرآن میں کئی جگہ مذکور ہے۔ سورہ مریم میں ہے۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (۴۷-مریم)

اس نے کہا اچھا۔ السلام علیکم، میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا۔ وہ میرے حال پر بڑا مہربان ہے۔

اس سے وعدے کی غایت درجہ اہمیت واضح ہوتی ہے۔ آدمی اگر کسی سے وعدہ کر بیٹھے، خاص طور پر دعا و استغفار کا، تو حد جواز و امکان کے اندر اس کو ضرور پورا کرے۔

حضرت ابراہیم کی تعریف

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ - 'اَوَّاہ' کے معنی کثیر التأوہ' یعنی درد مند، غم خوار اور رقیق القلب کے ہیں اور حلیم کے معنی بردبار کے ہیں۔ یہاں ان الفاظ سے حضرت ابراہیم کی تعریف دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی باپ کے معاملے میں دردمندی اور بردباری بہت پسند آئی۔ اوپر سورۂ مریم کی جس آیت کا حوالہ ہم نے دیا ہے اس کے پیش و عقب کو قرآن میں پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آذر نے اس موقع پر حضرت ابراہیم کے ساتھ نہایت سنگدلانہ برتاؤ کیا تھا لیکن سعادت مند بیٹے نے حلم و بردباری سے نہ صرف باپ کی جھڑکی اور دھمکی برداشت کی بلکہ نہایت دردمندی کے ساتھ اس کے لیے دعا و استغفار کا وعدہ بھی کر لیا۔ غور کیجیے کہ ایک ایسے دردمند اور حلیم بیٹے نے جب باپ سے اعلان برأت کیا ہو گا تو جگر پر کتنا بھاری پتھر رکھ کر کیا ہو گا؟ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ اس کی محبت میں موم بھی بنے اور پتھر بھی اس وجہ سے حضرت ابراہیم نے اپنے دل کے یہ دونوں پہلو نمایاں کیے اور یہی صحیح نمونہ ہے دین کے خدمت گزاروں کے لیے۔ جب تک ان کے سینہ میں دردمند دل نہ ہو خلق کی ہدایت کے لیے ان کا اٹھنا بے سود اور جب تک عزم میں لوہے کی صلابت اور پہاڑ کی استقامت نہ ہو دین کے لیے ان کا وجود بالکل ناکارہ!

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا ۢ بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۱۱۵)

مسلمانوں کو ایک تنبیہ

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ..... الاٰیۃ" یہ آیت یوں تو اس عام سنت الٰہی کا بیان بھی ہو سکتی ہے جو قرآن میں بار بار مذکور ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو بھی گمراہی کے حوالہ کرتا ہے اتمام حجت اور توضیح حق کے بعد ہی کرتا ہے اس وجہ سے اس طرح کے لوگ اس ہمدردی کے سزاوار نہیں ہیں کہ ان کے لیے استغفار کیا جائے لیکن میرا ذہن 'بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ' کے الفاظ سے بار بار اس طرف جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ خدا نے تمھیں صراط مستقیم کی ہدایت دینے کے بعد اس راہ کے مسافر کو جن خطرات سے ہوشیار رہنا چاہیے، ان سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ اب یہ تمھارا فرض ہے کہ تم ان خطرات سے بچو۔ اگر تم نہ بچے تو راہ پا کر اس سے بھٹکنے کی ذمہ داری خود تم پر ہو گی۔ اللہ ایسے لوگوں کو گمراہی کے لیے چھوڑ دیا کرتا ہے۔ گویا یہ اس ممانعت کی تاکید ہوئی جو مشرکین کے لیے استغفار کے باب میں مسلمانوں کو، اوپر والی آیت میں کی گئی ہے۔ یہ بات ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ جن کی حق دشمنی واضح ہو چکی ہے ان کے ساتھ کوئی ذہنی اور قلبی لگاؤ بسا اوقات آدمی کے لیے فتنہ بن جایا کرتا ہے۔ یہی لگاؤ بالتدریج ترقی کرتے کرتے بالآخر اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اصول و عقائد نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور خون و نسب کا تعلق تمام حقائق پر غالب آجاتا ہے۔ آج جو لوگ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے کے باوجود 'نَحْنُ اَبْنَاءُ اَنْفُسِنَا' کا نعرہ لگاتے ہیں یا محمد بن قاسم کی بجائے راجہ داہر پر فخر کرتے ہیں وہ اسی فتنہ کا شکار ہوئے ہیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ' بھی اسی تنبیہ کا جزو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ظاہر و باطن ہر چیز سے آگاہ ہے جس کے اندر بھی شرک و کفر کے ساتھ کوئی لوث اور لگاؤ ہوگا وہ خدا سے مخفی نہیں رہے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۱۱۶)

یہ توحید کی آیت ہے اور یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید ہے۔ یہ تاکید در تاکید اسی لیے ہے کہ شرک کا ہر شائبہ مسلمانوں کے اندر سے یک قلم ختم ہو جائے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۷)

'تَابَ عَلٰی' کا مفہوم

'تَابَ، يَتُوْبُ، تَوْبَۃ' کے معنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے ہیں لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور صلہ 'علیٰ' کے ساتھ آئے تو، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں، یہ رحمت کے مضمون پر بھی متضمن ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا مفہوم کسی پر رحمت کی نظر کرنے کا ہو جاتا ہے جس کے لازم معنی بندے کی توبہ قبول کرنے کے بھی ہوئے۔

قبولیت توبہ کی عام بشارت

اب یہ قبولیت توبہ کی اس عام بشارت کا اعلان ہو رہا ہے جو اس سورہ کی تنبیہات و تحذیرات کے بعد رحمت کی گھٹا بن کر ان لوگوں کے لیے برسی جنھوں نے اپنے آپ کو اس کا سزاوار ثابت کیا۔ ہم پیچھے اشارہ کر آئے

ہیں کہ اس سورہ نے وقت کے پورے اسلامی معاشرہ کو چھاج میں پھٹک کر اس کو خس و خاشاک سے بالکل پاک صاف کر دیا۔ اس تطہیر و تنقید کے بعد تمام عناصر فاسد چھٹ کر الگ ہو گئے۔ صرف وہ لوگ بچ رہے جو زرِ خالص کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے اگر کسی کے دل پر وقتی طور پر کوئی غبار آ گیا تھا تو اس کو بھی، توبہ کی اس منادیٔ عام سے بیدار ہو کر، لوگوں نے دعا و استغفار کے آنسوؤں سے دھو لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی توبہ کی قبولیت کی بشارت سنا دی۔

نبی صلعم کے ذکر کی نوعیت

اس فہرست میں سرِ فہرست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اس لیے کہ اس پاکیزہ معاشرہ کے گلِ سرسبد حضورؐ ہی تھے۔ اس سیاق میں آپؐ کے ذکر کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ سے کوئی اس طرح کی غلطی صادر ہوئی تھی جس طرح کی غلطی بعض دوسرے لوگوں سے صادر ہوئی بلکہ حضورؐ اپنی طبعی رأفت و رحمت کی بنا پر، اب تک منافقین کے باب میں جو نرمی و چشم پوشی برتتے تھے، جس کی طرف عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ...... الاٰیۃ اور بعض دوسری آیتوں میں اشارہ گزرا، یہ اس طرح کی چشم پوشیوں کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دامنِ عفو و رحمت میں جگہ دی۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ حق و عدل کی کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی ان مسامحتوں پر بھی گرفت اور ان کی اصلاح فرماتا ہے جو اگرچہ ظہور میں تو آتی ہیں جذبۂ خیر سے لیکن وہ اس معیارِ مطلوب سے متجاوز ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں فرقِ مراتب کی ترتیب

دوسرے درجہ پر اس میں مہاجرین اور پھر انصار کا ذکر آیا ہے۔ اس سے ایک طرف تو اسلامی معاشرہ میں فرقِ مراتب کی ترتیب واضح ہوتی ہے کہ اس معاشرہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے اونچا درجہ مہاجرین کا ہے، اس کے بعد انصار کا ہے، دوسری طرف الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ کے الفاظ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں فرقِ مراتب کی بنیاد خاندان، نسب یا مال و جاہ پر نہیں بلکہ تمام تر اتباعِ رسول اور خدمتِ اسلام پر ہے۔ جو لوگ اس وصف خاص میں سب سے اونچے ہوئے وہ معاشرہ میں سب سے اونچے قرار پائے قطع نظر اس سے کہ وہ کس خاندان اور گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور دنیوی اسباب و وسائل کے اعتبار سے ان کا حال کیا ہے اور کیا رہا ہے۔

مہاجرین اور انصار کے ایمان کی خصوصیت

سَاعَةِ الْعُسْرَةِ کے الفاظ سے اصلاً تو تبوک کی مہم کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ وہ، جیسا کہ سیرت و مغازی کی کتابوں سے واضح ہے، نہایت مشکل حالات میں پیش آئی تھی لیکن اس میں ایک جامع اشارہ ان مشکلات و مصائب کی طرف بھی ہے جن سے مہاجرین و انصار کو شروع سے لے کر اب تک برابر گزرنا پڑا تھا۔ ان الفاظ کا حوالہ ایک تو اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ اصل ایمان ان کا ایمان ہے جو مصائب و شدائد کی کسوٹیوں پر جانچے اور پرکھے جا چکے ہوں۔ دوسری بات اس سے یہ نکلی کہ دراصل مہاجرین و انصار کے ایمان کی یہی خصوصیت ہے جو ان کے لیے سفارش بنی کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کی نظر اور ان کی توبہ قبول

فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وفادار و جاں نثار بندوں کو توفیقِ خیر سے محروم نہیں فرماتا۔ جب ان سے کوئی کمزوری صادر ہو جاتی ہے، ان کے دل میں وہ توبہ کی بے قراری پیدا کرتا ہے، پھر وہ توبہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نظر انداز صرف ان کو کرتا ہے جو صرف زبان سے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں، اس راہ میں چوٹ کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

'مِنْۢ بَعْدِ مَا کَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ' کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مہاجرین و انصار کا سوادِ اعظم ہر قسم کے مصائب و شدائد کے باوجود ہر دور میں حق پر ثابت قدم اور استوار رہا۔ ان میں سے صرف ایک چھوٹے سے گروہ سے تبوک کے موقع پر کچھ کمزوری صادر ہوئی لیکن تنبیہ کے بعد وہ بھی متنبہ ہو گئے۔ پھر انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی بھی توبہ قبول فرمائی۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَیْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ لِیَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۱۱۸)

ان تین معتوبین کو بشارت جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔

'وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا' قبولیتِ توبہ کی اس عام بشارت کے بعد، جو اوپر مذکور ہوئی، یہ ان تین آدمیوں کی قبولیتِ توبہ کی بشارت ہے جن کا معاملہ آیت ۱۰۶ میں آیندہ کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا۔

'حَتّٰۤی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ' یعنی جب توبہ کے لیے ان کے اندر دل کی وہ خستگی اور بے قراری پیدا ہو گئی جو رحمتِ الٰہی کو متوجہ کرتی ہے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ بھی قبول فرمائی۔ 'ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ' سے ان حالات کی طرف اشارہ ہے جو ان لوگوں کو پیش آئے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پورے پچاس دن ان لوگوں پر ایسے گزرے کہ ہر شخص نے ان سے آنکھیں پھیر لیں، یگانے بیگانے بن گئے۔ عزیزوں، رشتہ داروں اور بچپن کے ساتھیوں تک نے اس طرح بے رخی اختیار کر لی گویا کبھی آشنا ہی نہ تھے، یہاں تک کہ بیوی بچے بھی بالکل غیر بن کے رہ گئے۔ مدینہ وہی تھا، اس کی وسعتیں اور برکتیں بھی وہی تھیں، دلوں میں اسلام نے مہر و محبت اور اخوت و ہمدردی کی جو تخم ریزی کی تھی اس کی فصل بھی شباب پر تھی، لوگ آپس میں ملتے جلتے، کھاتے پیتے، ایک دوسرے کے لیے جاں نثاریاں اور غم گساریاں کرتے، صرف یہ تین شخص ایسے تھے جن کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا اس لیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے معتوب تھے۔ خدا کی زمین میں آدمی کے لیے بڑی وسعت ہے بشرطیکہ لوگوں کے دلوں کے دروازے اس کے لیے کھلے ہوئے ہوں۔ لیکن جب لوگوں کے دلوں ہی کے دروازے اس کے لیے بند ہو جائیں تو زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود اس کے لیے ایک زندان بن کے رہ جاتی ہے۔ ان تینوں صاحبوں کے لیے مدینہ کی سرزمین کا یہی حال ہو گیا تھا اور یہ حالت دو دن نہیں بلکہ جیسا کہ اوپر گزرا، پورے پچاس دن قائم رہی۔

معتوبین کے ساتھ معاشرہ کا برتاؤ

ان کے اپنے دلوں کا حال

'وَضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ' اوپر کے ٹکڑے میں اس حالت کی تصویر ہے جو ان لوگوں کو اپنے سے خارج کی دنیا میں پیش آئی۔ اس ٹکڑے سے خود ان کے باطن کا حال واضح ہو رہا ہے۔ جس طرح باہر کی

دنیا میں ان کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی اسی طرح خود ان کے اپنے باطن میں بھی ان کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہی تھی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ باہر کی فضا خواہ کتنی ہی گھٹی ہوئی ہو آدمی کا اپنا دل اپنے رویے پر مطمئن ہو تو وہ خلق کی بے مہری سے زیادہ برداشتہ خاطر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے باطن میں امن و سکون کا کوئی گوشہ تلاش کر ہی لیتا ہے۔ لیکن یہ لوگ خدا اور رسول کی ناراضگی پر ایک لمحہ کے لیے بھی صبر کرنے والے نہیں تھے چہ جائیکہ پورے پچاس دن اس حالت میں ان پر گزر جائیں کہ مدینہ کے در و دیوار شاہد ہوں کہ اللہ اور رسولؐ ان سے ناراض ہیں۔ جن کے دلوں میں ایمان ہو ان کے لیے اس سے بڑے غم و اندوہ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کا حال یہ ہوا کہ باہر کی دنیا ان سے جتنی بیزار تھی اس سے زیادہ یہ لوگ خود اپنے وجود سے بیزار تھے۔ اندازہ کیجیے کہ کیا حال ہوا ہوگا ان لوگوں کی دل شکستگی کا جن کو نہ تو باہر سے کوئی امید کی کرن نظر آ رہی ہو اور نہ خود اپنا ہی دل کسی طرح تسلی قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔

خدا کی گرفت سے خدا ہی کی پناہ

'وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ'۔ یہ ان لوگوں کے دل کی حالت کی ٹھیک ٹھیک تعبیر ہے کہ جتنی ہی شدت کے ساتھ ان لوگوں پر عتاب ہوا اتنی ہی بے قراری کے ساتھ ان لوگوں نے اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیا کہ جب گرفت خدا کی طرف سے ہے تو اس سے پناہ صرف وہی دے سکتا ہے چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین میں سے دو صاحبوں نے تو بالکل ہی خانہ نشینی اختیار کر لی، رات دن گریہ و زاری اور توبہ و استغفار کے سوا ان کا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔ تیسرے صاحب اگرچہ کسی کسی وقت باہر نکلتے لیکن صرف اس امید میں کہ شاید کسی گوشے سے خدا اور رسول کی رضا کی کوئی جھلک آ جائے۔ اگر ان کے اندر نفاق کا کوئی جز ذرہ ہوتا تو جب یہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے پھینکے گئے تھے، کسی اور کی پناہ ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے لیکن یہ راسخ الایمان لوگ تھے اس وجہ سے ٹھیک اس بچے کی طرح جو ماں کی جھڑکی سے سہم کر خود ماں ہی سے چمٹتا ہے، یہ خدا کے عذاب سے بچنے کے لیے خدا ہی کی طرف بھاگے، نہ کوئی جھوٹا عذر پیش کیا، نہ دوسروں سے مل کر کوئی ساز باز کرنے کی کوئی کوشش کی۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک صاحب ـــ کعب بن مالکؓ ـــ کے پاس انہی دنوں شاہ غسان کا قاصد خط لے کر آیا کہ "ہم نے سنا ہے کہ تمھارے صاحب نے تم پر ستم توڑ رکھا ہے، تم کوئی حقیر اور ضائع کیے جانے کے لائق آدمی نہیں ہو، تم ہمارے پاس آ جاؤ، ہم تمھاری قدر کریں گے۔" تو انھوں نے اس خط کو چاک کر کے چولھے میں جھونک دیا۔ اس لیے کہ کعب بن مالکؓ اس حقیقت پر ایمان رکھتے تھے کہ خدا کی گرفت سے بندہ صرف خدا ہی کی رحمت سے چھوٹ سکتا ہے، شاہ غسان اس سے نجات نہیں دلا سکتا۔ درحقیقت یہی عقیدہ روحِ ایمان اور مغزِ توحید ہے۔ بندہ اس عقیدے کے ساتھ، خدا کی کسی گرفت پر، اپنے آپ کو خدا ہی کے آگے ڈال دیتا ہے تو اس کی رحمت پہلے سے بڑھ کر اس کے لیے جوش میں آتی ہے۔

بیتابی توبہ کے لیے بھی بے قرار ہے

'ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ'۔ یعنی جب ہجر و فراق کی یہ سختیاں جھیل کر

ان کے دل اچھی طرح گداز ہوگئے، تب اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کی نظر فرمائی اور ان کو سچی اور خالص توبہ کی توفیق بخشی۔ 'لِيَتُوبُوا' فعل یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنی میں ہے۔ جہاں تک اعتراف گناہ کا تعلق ہے وہ تو، جیسا کہ پیچھے گزرا، ان لوگوں نے پہلے بھی کر لیا تھا لیکن اس وقت ان کی توبہ قبول نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان حضرات کو اپنی سابقہ دینی خدمات پر اعتماد تھا۔ اس وجہ سے ان کو نہ تو اپنی غلطی کی سنگینی کا صحیح صحیح اندازہ ہی ہوسکا اور نہ ان کے اندر وہ سچی تڑپ اور بے قراری ہی پیدا ہوسکی جو ان کے مرتبہ کے شایانِ شان تھی۔ آدمی سے توقع اس کے درجے اور مقام کے اعتبار سے کی جاتی ہے، ہر ایک کی وفاداری ایک ہی پیمانے سے نہیں ناپی جاتی۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش کے ایک سخت کورس سے گزارا تاکہ ان کو بھی اور ان کے واسطے سے دوسرے اہل ایمان کو بھی یہ تربیت حاصل ہو کہ سچی توبہ کے لیے دل کی کس درجے کی خستگی اور کس نوعیت کی بے قراری اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

توبہ کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے

'تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا' سے ایک اور حقیقت بھی واضح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ توبہ کی ابتدا اصلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہی پہلے بندے کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ پھر جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوبارہ اس پر رحمت کی نظر فرماتا اور اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اگر اس کے اندر ایمان ہو تو ہر گناہ پر اس کا دل کڑھتا اور آزردہ ہوتا ہے اور ایک احساسِ ندامت کے ساتھ اس کے اندر اپنے رب کی طرف رجوع ہونے کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ اگر آدمی اپنے اس جذبے کے مطابق عمل کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل اور زبان پر وہ الفاظ اور کلمات بھی جاری فرما دیتا ہے جو اس کو پسند ہیں اور جن کو وہ شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ اس سے محروم صرف وہ بدقسمت لوگ رہتے ہیں جن کا ضمیر کند اور جن کا ایمان مردہ ہو جایا کرتا ہے۔ ایسے لوگ خدا سے بے پروا ہو جایا کرتے ہیں جس کی سزا ان کو یہ ملتی ہے کہ خدا بھی ان سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ آدمؑ و ابلیس کی سرگزشت، جو سورہ بقرہ میں بیان ہوئی ہے، وہ اس کی نہایت حقیقت افروز مثال ہے۔ آیت فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۳۷- بقرہ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۱۹)

راستبازوں کی صحبت اختیار کرنے کی ہدایت

تطہیر و تزکیہ کا غسل دینے کے بعد اب یہ مسلمانوں کو بعض ہدایات دی جا رہی ہیں جن پر عمل کر کے وہ آیندہ اپنے آپ کو کفر و نفاق کی آلودگیوں سے پاک صاف رکھ سکتے ہیں۔

پہلی ہدایت یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کی صحبت و معیت اور راسخ الایمان اور کامل الحیاء لوگوں کی رفاقت اختیار کرو۔ صحبت و معیت کو آدمی کے بناؤ اور بگاڑ میں بڑا دخل ہے۔ اگر آدمی

کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا، کافروں، منافقوں اور جاہلوں کے ساتھ ہو تو کمزور تو درکنار بسا اوقات مضبوط آدمی بھی کچھ نہ کچھ ان کا اثر قبول کر ہی لیتا ہے۔ اسی طرح راسخ الایمان اور راسخ العمل لوگوں کے فیضِ صحبت سے کمزور آدمی کے اندر بھی اپنی کمزوریوں پر غالب آنے کا حوصلہ پیدا ہو جایا کرتا ہے اور وہ بالتدریج ان کے درجے کا آدمی بن جاتا ہے۔ صحبت اور معیت کی اسی اہمیت کے سبب سے ان لوگوں کو جو دارالکفر میں پڑے ہوئے تھے ہجرت کر کے دارالاسلام میں آنے کا حکم ہوا اور مسلمانوں کو جو مدینہ کے اطراف کے دیہاتوں میں آباد تھے یہ ہدایت ہوئی کہ ان کی جماعتیں برابر باری باری حصول تعلیم و تربیت کے لیے مدینہ آتی رہیں تاکہ ان کا ربط نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے ساتھ قائم رہے۔ پیچھے منافقین اور اعراب کے جو حالات بیان ہوئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روحانی و اخلاقی بیماریوں میں بڑا دخل ان کے خراب ماحول کا تھا۔ اس وجہ سے احتیاطی تدابیر میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ یہ بات بیان ہوئی کہ لوگ اللہ سے ڈرتے رہیں اور راست بازوں کی صحبت و رفاقت کا التزام کریں۔ خدا کا خوف دل کا پاسبان ہے۔ وہ اندر سے انسان کی حفاظت کرتا ہے اور راست بازوں کی صحبت باہر سے اس کو شیطان کے مقابل میں کمک پہنچاتی ہے۔

'صٰدِقِیْنَ' کا لفظ یہاں خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں اس لفظ کی حقیقت واضح کر چکے ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ یہ لفظ منافقین کا ضد ہے۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۲۰-۱۲۱)

اوپر کے مضمون کی تاکید مزید

یہ بھی اوپر والے مضمون ہی کی تاکید مزید یعنی صادقین کی رفاقت و معیت اختیار کرنے کے لیے کمزور مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ ہر چند اس راہ میں آزمائشیں، مشکلات اور خطرات ہیں لیکن حق کی راہ میں جس مشکل اور خطرے سے بھی بندہ گزرتا ہے، جو چوٹ بھی وہ کھاتا ہے، جو چرکا بھی وہ دشمن کو لگاتا ہے، ہر ایک کے بدلے میں اس کے کھاتے میں ایک عمل صالح درج ہوتا ہے اور جزا کے دن ہر شخص اپنے ہر عمل صالح کا بہتر سے بہتر صلہ پائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کا معاملہ اپنی راہ میں دکھ اٹھانے والوں کے ساتھ یوں ہے تو اہل مدینہ اور اعراب میں سے کسی کے لیے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کا ساتھ دینے سے ہچکچاتا اور اپنی جان کو ان کی جان کے مقابل میں اہمیت دیتا۔ اور نہ آیندہ یہ کسی کے لیے جائز ہے کہ راہ حق کے خطرات و اندیشوں سے ڈر کر حق اور حق پرستوں کا ساتھ چھوڑ کر باطل اور باطل پرستوں کا ہم سفر بن جائے۔

اعمال کی مقبولیت کی شرط۔ احسان

'إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ' میں لفظ 'مُحْسِنِينَ' اس شرط کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ کے ہاں ان

اعمال کی مقبولیت کے لیے ضروری ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ یہ اعمال 'احسان'، پوری خوبی کے ساتھ صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے انجام دیے جائیں، کسی اور غرض کا کوئی شائبہ اس میں شامل نہ ہو۔

'وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ' سے مراد اس طرح کے اقدامات ہیں جو دشمن کے حوصلے کو پست کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں، جن سے ان کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے اور اہلِ حق کے حوصلے کی ان پر دھاک بیٹھتی ہے۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (۱۲۲)

نفاق کی بیماری کا علاج

یہ بات بھی صادقین کی معیت اور رفاقت ہی کے پہلو سے ارشاد ہوئی ہے۔ اوپر آیت ۹۷ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اعراب نے نبیؐ اور صالحین کی صحبت بہت کم اٹھائی ہے۔ وہ حلال و حرام کی حدود سے بے خبر ہیں، اس وجہ سے کفر و نفاق کی بیماری کا حملہ ان پر آسانی سے ہو جاتا ہے۔ اب یہ ان کو اس کمزوری کے علاج کی طرف توجہ دلائی کہ ان لوگوں کو زیادہ سے زیادہ پیغمبرؐ اور صحابہؓ کی صحبت سے مستفید ہونے کی سبیل نکالنے کی کوشش کرنی تھی۔ اگر سب لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر مجلس نبویؐ میں نہیں پہنچ سکتے تھے تو ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت علم دین میں فہم و بصیرت حاصل کرنے کے لیے مجلس نبویؐ میں حاضر ہوتی تاکہ وہاں سے مستفید ہو کر اپنی قوم کو بھی اس سے مستفید کرتی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اب تک اس میں کوتاہی ہوئی ہے تو اب اس کا اہتمام کیا جائے اور ہر بستی سے لوگ باری باری مدینہ آئیں، دین سیکھیں اور سمجھیں اور پھر اپنی قوم میں، واپس جا کر لوگوں کو بتائیں اور سکھائیں۔ اس طرح دیہات کے لوگ اپنے گھر در اور مال مویشی کی دیکھ بھال بھی کر سکیں گے اور نبیؐ اور صحابہؓ کے فیوض صحبت سے بھی مستفید ہو سکیں گے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے مجلس نبویؐ میں حاضری کے لیے باریاں مقرر کر رکھی تھیں۔ اس طرح وہ اپنے باہمی تعاون سے اپنے کام کاج بھی جاری رکھتے اور مجلسِ نبویؐ کے فیوض و برکات سے بھی فائدہ اٹھاتے۔

اسلام میں تعلیم کا اصل مقصد

آیت میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے 'تَفَقُّهٌ فِي الدِّينِ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں دین میں فہم و بصیرت حاصل کرنا اور تعلیم دینے کے لیے 'اِنذار' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ڈرانے ہوشیار کرنے اور خاص طور پر آخرت کی زندگی کی تیاریوں کے لیے بیدار کرنے کے ہیں۔ یہ دونوں لفظ اسلام میں تعلیم کا جو اصل مقصد ہے، اس کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ اسلام میں تعلیم و تعلم کا اصل مقصد دین میں بصیرت حاصل کرنا اور آخرت کی فلاح کے لیے اپنی اور دوسروں کی تربیت کرنا ہے۔ باقی چیزیں سب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور اسی نصب العین کے تابع ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا

اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۱۲۳)

آیت ۱۲۳ پوری سورہ کے اصل مضمون کا خلاصہ ہے

یہ آیت پوری سورہ کے اصل مضمون کا خلاصہ ہے۔ اس سورہ میں، جیسا کہ آپ نے دیکھا، کفار و مشرکین پر اتمام حجت ہو چکنے کے بعد ان سے اعلانِ برأت اور ان کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ آیات ۲۲-۲۴ کے تحت یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ منافقین اپنے پاس پڑوس کے کفار و مشرکین سے عزیزانہ و دوستانہ روابط اور دوسرے کاروباری مفادات وابستہ رکھنے کے سبب سے، اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان سے جنگ کریں یا اپنے تعلقات ان سے یک قلم ختم کر لیں۔ ان کی اس منافقت کی اچھی طرح قلعی کھولنے اور ایمان، تقویٰ اور صداقت کے حقیقی مقتضیات تفصیل سے واضح کر دینے کے بعد اب یہ دین کا اصل مطالبہ ان کے سامنے پھر رکھ دیا گیا ہے۔ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ روئے سخن ان ہی کی طرف ہے۔ فرمایا کہ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ یعنی جو کفار تمھارے پاس پڑوس اور گرد و پیش میں ہیں ان سے جنگ کرو۔ گرد و پیش کے کفار جس طرح تمھاری دعوتِ ایمان و ہدایت کے سب سے زیادہ حق دار تھے اسی طرح اب، اللہ اور رسول کی طرف سے اتمام حجت اور اعلانِ جنگ کے بعد، تمھاری تلواروں کے بھی سب سے زیادہ سزاوار یہی ہیں، جو لوگ قرابت داری، دوستی اور اپنے دنیوی مفاد کی خاطر ان کے معاملے میں مداہنت برتیں گے، وہ جیسا کہ آیت ۲۳ میں فرمایا ہے، اپنی جانوں پر سب سے زیادہ ظلم ڈھانے والے ٹھہریں گے اور انہی کے لیے آیت ۲۴ میں یہ وعید ہے کہ تم انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمھارے باب میں اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔ یہ حقیقت ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کی جا چکی ہے کہ ایمان و اخلاص کی اصل روح اس وقت بیدار ہوتی ہے جب اس کی خاطر اپنوں سے جنگ کرنی پڑے۔ يَلُوْنَكُمْ کی قید اسی پہلو کو نمایاں کر رہی ہے۔

وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً یعنی اب وہ تمھارے طرزِ عمل سے یہ محسوس کر لیں کہ تمھارے اندر ان کے لیے موالات، دوستی اور محبت کی کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی ہے بلکہ جس طرح وہ من حیث القوم تمھارے اور تمھارے دین کے دشمن ہیں اسی طرح تم بھی من حیث الجماعت ان کے اور ان کے دین کے دشمن بنو۔ اب تک وہ تمھارے دل میں اپنے لیے بڑا نرم گوشہ پاتے تھے، اس وجہ سے ان کو توقع تھی کہ وہ اپنے مقاصد کے لیے تم کو برابر استعمال کرتے رہیں گے۔ اب یہ حالت یک قلم ختم ہو جانی چاہیے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ کے یہاں دو پہلو ہو سکتے ہیں۔

اہل ایمان کی حوصلہ افزائی

ایک تو یہ کہ اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہو۔ یعنی تم ان سے جنگ کرنے میں کوئی کمزوری و پست ہمتی نہ دکھاؤ، اللہ کی معیت و نصرت اس کے متقی بندوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر تم تقویٰ پر قائم رہے تو فتح و نصرت تمھاری ہی ہے، یہ لوگ ذلیل و خوار ہوں گے۔ یہ بات ہم دوسرے مقام پر واضح کر چکے ہیں کہ خدا کی معیت اس کی نصرت کو بھی مستلزم ہے۔ اس وجہ سے خدا کے ساتھ ہونے کے معنی اس کی مدد و نصرت

کے ساتھ ہونے کے ہیں۔

مسلمانوں کو جنگ میں حدود و قیود کی پابندی کا حکم

دوسرا یہ کہ مسلمانوں کو تنبیہ ہو کہ تمہیں ان سے جنگ اور ان کے معاملے میں شدت اختیار کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے تو اس میں بھی تم خدا کے مقرر کردہ حدود و قیود کی پوری پابندی کرنا، کسی مرحلے میں بھی حدودِ الٰہی سے تجاوز نہ کرنا، اللہ صرف اپنے متقی بندوں ہی کا ساتھی ہے پیچھے یہ ہدایات گزر چکی ہیں کہ جو کفار و مشرکین اپنے معاہدات پر قائم ہیں ان کے معاہدات کی مدت پوری کی جائے نیز محترم مہینوں کا احترام ملحوظ رکھا جائے۔ یہ انہی باتوں کی تاکید مزید ہے۔

وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا ۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ كَٰفِرُونَ ۝ أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِى كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَىٰكُم مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ ٱنصَرَفُوا۟ ۚ صَرَفَ ٱللَّهُ قُلُوبَهُم بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (۱۲۴-۱۲۷)

کفرِ منافقین کا طرزِ عمل

یہ ان منافقین کی طرف اشارہ ہے جو اس سورہ کی تمام تنبیہات و تحذیرات کے بعد بھی بدستور نہ صرف اپنے نفاق میں مبتلا رہے بلکہ درجہ بدرجہ ان کا نفاق سخت سے سخت تر ہی ہوتا چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی تنبیہ بھی ان کو توبہ کے لیے بیدار نہ کر سکی یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کو موت آئی۔

قرآن پر طنز

'وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا' 'سورہ' سے قرآن کی کوئی سورہ بھی مراد ہو سکتی ہے اور قرآن کا کوئی خاص حکم اور اس کا کوئی خاص ٹکڑا بھی۔

یہ منافقین مجلسِ نبوی میں مجبوراً محض دکھاوے اور مسلمانوں کو مطمئن رکھنے کے لیے جاتے تھے وہاں ان کو ہر روز قرآن کے نئے نئے مطالبات سے سابقہ پیش آتا کبھی کوئی حکم سنایا جاتا، کبھی کوئی۔ یہ روز روز کے نئے نئے احکام ان پر بڑے شاق گزرتے۔ ان کے خلاف کھل کر کچھ کہنے کی جرأت تو ہوتی نہیں تھی البتہ کچھ طنزیہ فقرے چست کر کے وہ دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتے۔ مثلاً کہتے کہ ہاں، بھئی بتاؤ، اس نئے حکم سے کن کن لوگوں کا ایمان تازہ ہوا ہے، اس قسم کے طنز و تعریض سے ان کا مقصود اللہ اور رسولؐ کے احکام کی تحقیر اور مخلص مسلمانوں کی حوصلہ شکنی ہوتا۔

اہلِ ایمان پر قرآن کا اثر

'فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ كَٰفِرُونَ' یہ ان کے اسی قسم کے زہر آلود طنزیہ فقرے کا جواب ہے کہ جو سچے اہلِ ایمان ہیں ان کے لیے تو قرآن کی ہر سورہ اور اس کا ہر حکم ان کے ایمان و اسلام میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے اور جب وہ سنتے ہیں کہ قرآن کا کوئی سا ٹکڑا نازل ہوا ہے تو بجائے اس کے کہ اس سے ان کے دل بھنچیں وہ خوش ہوتے ہیں کہ رحمتِ الٰہی کی ایک اور گھٹا برسی، البتہ جن کے دلوں

میں نفاق کا روگ ہوتا ہے ان کی اس نجاست پر مزید نجاست کے ردّے پر ردّے چڑھتے چلے جاتے ہیں، ان کو زندگی کے کسی مرحلے میں بھی توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی یہاں تک کہ اسی حالت کفر میں ان کو ایک دن فرشتۂ اجل آ دبوچتا ہے۔

اہلِ نفاق پر قرآن کا اثر

قرآن کی آیات سے اہلِ ایمان کے ایمان میں درجہ بدرجہ زیادتی ہونا اور اہلِ نفاق کے نفاق کا غلیظ سے غلیظ تر ہونا محض استعارہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ قرآن کا ہر حکم اہلِ ایمان کے لیے ایک میدانِ مسابقت کھولتا ہے اور جب وہ اس میدان کی بازی جیت لیتے ہیں تو ان کی قوتِ ایمانی میں مزید دوسرے میدان جیتنے کے لیے عزم و حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ درجہ بدرجہ وہ سعادت کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ برعکس اس کے اہلِ نفاق ایک محرومی کے بعد دوسری محرومی اور ایک پسپائی کے بعد دوسری پسپائی کی ذلتیں سہتے سہتے عزم و ایمان کی آخری رمق سے بھی بالکل خالی ہو جاتے ہیں اور ان کے دلوں پر نفاق پر نفاق کی اتنی موٹی تہیں جم جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے انسان کے دل کے اندر جتنی صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، سب ان کے نیچے دب دبا کر مردہ ہو جاتی ہیں۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۔ اوپر والی آیت میں ان لوگوں کے توفیقِ توبہ سے محروم ہو جانے کی طرف جو اشارہ ہے یہ اسی کی دلیل ہے کہ یہ لوگ غور کرتے تو انہیں خود اندازہ ہو جاتا کہ ان کی بیماری اب

توفیقِ توبہ سے محرومی

اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ ان کے لیے توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے ہر بندے پر رحمت کرنا چاہتا ہے اس وجہ سے اس نے اس دنیا کا نظام اس طرح رکھا ہے کہ ہر شخص، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا سال میں ایک دو بار ضرور کسی نہ کسی ایسی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے جو اس کو توبہ اور اصلاح پر ابھارے۔ جو صاحبِ توفیق ہوتے ہیں وہ ان آزمائشوں سے سبق حاصل کرتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جو لوگ اپنے اعمال کی پاداش میں توفیق سے محروم ہو جاتے ہیں وہ ان آزمائشوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ چنانچہ یہ لوگ اب اسی حالت کو پہنچ چکے ہیں۔ اب کوئی ٹھوکر بھی ان کی آنکھیں کھولنے والی نہیں بنتی۔ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ میں ان کے دلوں کی قساوت کی طرف اشارہ ہے اور وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ میں ان کی عقلوں کے کند ہونے کی طرف۔ اس لیے کہ توبہ دل کا فعل ہے اور تذکر عقل کا۔ گویا ان کے اعمال کی سیاہی نے ان کی ان دونوں ہی چیزوں کو تاریک کر دیا ہے۔

مجلسِ نبوی سے منافقین کا فرار

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا۔ یہ تصویر ہے ان منافقین کے مجلسِ نبوی سے چپکے سے کھسک جانے کی۔ اہم اجتماعی مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مسلمانوں کو کسی نئی مہم کی تیاری اور اس سے متعلق قرآن کی تازہ ہدایات سے آگاہ کرنے کے لیے بلاتے تو آنے کو تو منافقین بھی شرماشرمی میں، محض دکھاوے کے لیے آ جاتے لیکن جب دیکھتے کہ کوئی مشکل مہم درپیش ہے، مجلس میں موجود رہے تو اس کی ذمہ داریوں میں حصہ لینا پڑے گا، تو آپس میں کن انکھیوں سے اشارے

شروع کر دیتے۔ مطلب یہ کہ اگر مسلمانوں میں سے کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو یہاں سے کھسک چلو۔ پھر مسلمانوں کی نظریں بچا کر، ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے یکے بعد دیگرے وہاں سے سٹک جاتے۔ منافقین کی اس روش کی طرف اس سے زیادہ تفصیل سے سورۂ نور میں اشارہ ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا ۚ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (نور ۶۲ - ۶۳)

سچے مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور جب وہ کسی اجتماعی معاملے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اس وقت تک وہاں سے نہیں ٹلتے جب تک وہ پیغمبر سے اجازت نہ حاصل کر لیں۔ جو لوگ تم سے اجازت لیتے ہیں وہی دراصل اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والے ہیں تو ایسے لوگ جب تم سے اجازت مانگیں اپنی کسی ضرورت کے لیے تو تم ان میں سے جس کو چاہو اجازت دے دیا کرو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت چاہو۔ اللہ غفور رحیم ہے۔ لوگو! جب رسول تم کو بلائے تو اس کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جیسا کہ تمھارا ایک دوسرے کو بلانا ہوتا ہے۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا رہا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جایا کرتے رہے ہیں تو جو لوگ نبی کے حکم سے اعراض کرتے رہے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ مبادا انھیں کوئی آزمائش پیش آجائے یا وہ ایک دردناک عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔

اللہ سے فرار اختیار کرنے والوں پر لعنت

صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُم بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ۔ یعنی جب انھوں نے اللہ اور رسول سے روگردانی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ یہ لعنت کی تعبیر ہے اور دوسرے الفاظ میں اس کا مدعا وہی ہے جو فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ کا ہے۔ اس حالت کو پہنچ جانے کے بعد آدمی کے دل پر مہر ہو جایا کرتی ہے اور آیت سے واضح ہے کہ یہ مہر آدمی کے خود اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ۔ یعنی جو لوگ اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں سے خدا کی تنبیہات کے بعد بھی کام نہیں لیتے ان کی ان صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ اس سمت میں موڑ دیتا ہے جس سمت کو وہ جانا چاہتے ہیں۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (۱۲۸ - ۱۲۹)

بعثتِ نبوی کے عظیم احسان کا بدلہ

یہ دونوں آیتیں آخری تنبیہ کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ پہلے اس عظیم احسان کی طرف توجہ دلائی ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ذریعہ سے تمام خلق پر عموماً اور اہل عرب پر خصوصاً فرمایا ہے۔ خطاب اگرچہ

عام ہے لیکن سیاق کلام دلیل ہے کہ روئے سخن انھیں لوگوں کی طرف ہے جو اس عظیم نعمت کی قدر کرنے کے بجائے اس کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھ رہے ہیں۔ فرمایا کہ تمھارے پاس ایک رسول تمھی میں سے آچکا ہے۔ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ کے الفاظ میں تمام محبت اور احسان کے جو پہلو مضمر ہیں ان کی طرف سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ یعنی تم میں سے شامت زدہ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ رسول ان کے لیے ایک مصیبت اور مصیبتوں کے دروازے کھولنے والا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو تم کو مصیبت اور ہلاکت میں مبتلا کرنے والی ہو اس کے دل پر نہایت شاق ہے۔ وہ تمھیں دنیا اور آخرت دونوں کی کلفتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ اور دونوں کی سعادتوں سے بہرہ مند دیکھنا چاہتا ہے اور اس کی ساری بھاگ دوڑ اور تمام تعلیم و تبلیغ اسی مقصد کے لیے ہے۔ لیکن جو لوگ اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھے بیٹھے ہیں ان کو اس کی وہ باتیں بہت گراں گزر رہی ہیں جو ان کو اپنے دنیوی مفادات کے خلاف نظر آتی ہیں حالانکہ اگر وہ اس دنیا کے بعد کی زندگی کی اہمیت کو جانتے ہوتے تو ان کو اندازہ ہوتا کہ پیغمبر کی یہ ساری بے قراریاں اور بے چینیاں اپنے لیے نہیں بلکہ خود ان کو ہر کرب اور ہر دکھ سے محفوظ رکھنے کے لیے ہیں۔

خلق کے لیے نبی صلعم کے جذبات

حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ یعنی وہ جو اس درجہ تمھارے درپے ہے تو اس میں اس کی اپنی کوئی غرض شامل نہیں بلکہ یہ صرف اس سبب سے ہے کہ وہ تمھارے ایمان و اسلام اور تمھاری صلاح و فلاح کا نہایت حریص ہے۔ جس طرح ایک شفیق باپ اپنی اولاد کے لیے ہر خیر کا متمنی اور حریص ہوتا ہے، اس چیز سے کبھی اس کا دل نہیں بھرتا، اسی طرح اللہ کا رسول تمھارے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں ہر خیر کا حریص اور متمنی ہے۔ پس حیف ہے ان لوگوں پر جو ایسی شفیق اور مہربان ہستی کی قدر نہ کریں۔

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ، رَءُوْفٌ، اور رَحِيْم کے فرق پر ہم دوسری جگہ روشنی ڈال چکے ہیں۔ ایک کے اندر دفع شر کا پہلو نمایاں ہے دوسرے کے اندر عطائے خیر اور پائدار رحمت کا۔ یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ کی صفات حسنیٰ میں سے ہیں جو بعینہٖ یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوئی ہیں جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ خلق کے ساتھ رأفت و رحمت کے معاملے میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بالکل صفاتِ الٰہی کے مظہر تھے۔ یہ ٹکڑا چونکہ بعینہٖ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ کی تفسیر و توضیح ہے اس وجہ سے حرف ربط یہاں نہیں ہے تاکہ کامل اتصال کا اظہار رہے۔

پیغمبر صلعم سے خطاب

فَاِنْ تَوَلَّوْا ...... الآیۃ۔ اس آیت میں خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمھاری بعثت کی شکل میں جو خیر عظیم ان کے لیے نازل فرمایا ہے اگر یہ ناقدرے اور ناشکرے لوگ اس کی قدر نہیں کرتے تو اس میں انھی کی تباہی ہے، تمھارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ تم ان کے ایمان و ہدایت کے حریص ہوئے اور ان کی دنیا اور آخرت کی صلاح و فلاح کے لیے بے چین ہوئے اس میں تمھارا نہیں بلکہ سر تا سر انھی کا نفع ہے۔ اگر یہ تمھاری قدر کرتے تو اپنی ہی دنیا اور آخرت سنوارتے لیکن یہ حقیقت ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو تم ان کی پروا نہ کرو بلکہ ان کو صاف صاف سنا دو کہ میرے لیے اللہ کافی ہے۔ یعنی میں تمھارا جو حریص ہوں

تو اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی لیے ہوں۔ تم نہیں آتے تو یہ نہ سمجھو کہ میں تنہا اور بے یار و مددگار رہ جاؤں گا۔ میری پناہ، میرا سہارا اور میری قوت و جمعیت میرا اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ میرا بھروسا اس پر ہے اور وہی اس عرش عظیم کا مالک اور خداوند ہے تو جس کا بھروسا اس عرش عظیم کے رب پر ہے اس کو دوسروں کی ناقدری اور بیزاری کی کیا پروا ہو سکتی ہے!

اس سورہ کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو آج بروز جمعہ ۹ بجے صبح حوالہ قرطاس ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

لاہور

۱۵ راگست ۱۹۶۹ء

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ الانعام - ۶

تفسیر سورۃ الاعراف - ۷

۱۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۷۲-۲۰۶ ۳۸۳

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت ۳۹۲

تفسیر سورۃ التوبۃ - ۹

خطاطی —— عبدالغفور کیلانی